اولیائے
رحمہم اللہ تعالیٰ
کرام نمبر
سیارہ ڈائجسٹ

صبر بہت بڑا خزانہ ہے

قیمت =/2550 روپے صرف
پاکستان میں پہلی بار سپر ایشیا کی پیش کش
واشنگ مشین بڑے روٹر اور سٹرائیک بار کے ساتھ
سپر ایشیا اپنی شاندار
روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اب
متعارف کراتے ہیں پرکشش، جدید ترین،
دیرپا اور بہترین واشنگ مشین نئی اور منفرد
خوبیوں کے ساتھ
ماڈل SA-220
واشنگ ٹب
کپڑوں کی بہترین صفائی کے لیے 7" کی بجائے 14" بڑا روٹر جو کہ 190 RPM کی
رفتار سے چلتا ہے جس کے باعث کارکردگی میں سو فیصد اضافہ۔
عام مشین میں بجلی کی کھپت 400 واٹ ہے جبکہ SA-220 میں بجلی کا خرچ
200 واٹ ہے۔ اس طرح بجلی کے خرچ میں 50% بچت۔
سپر ایشیا کا نام سکون اور اطمینان کا پیغام
سپر ایشیا محمد دین سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
SUPER asia
جی ٹی روڈ نزد لاہوری چونگی، گوجرانوالہ، پاکستان
فون: 53008 - 51408 ٹیلکس: 45337 SA MDS PK
SUMMIT
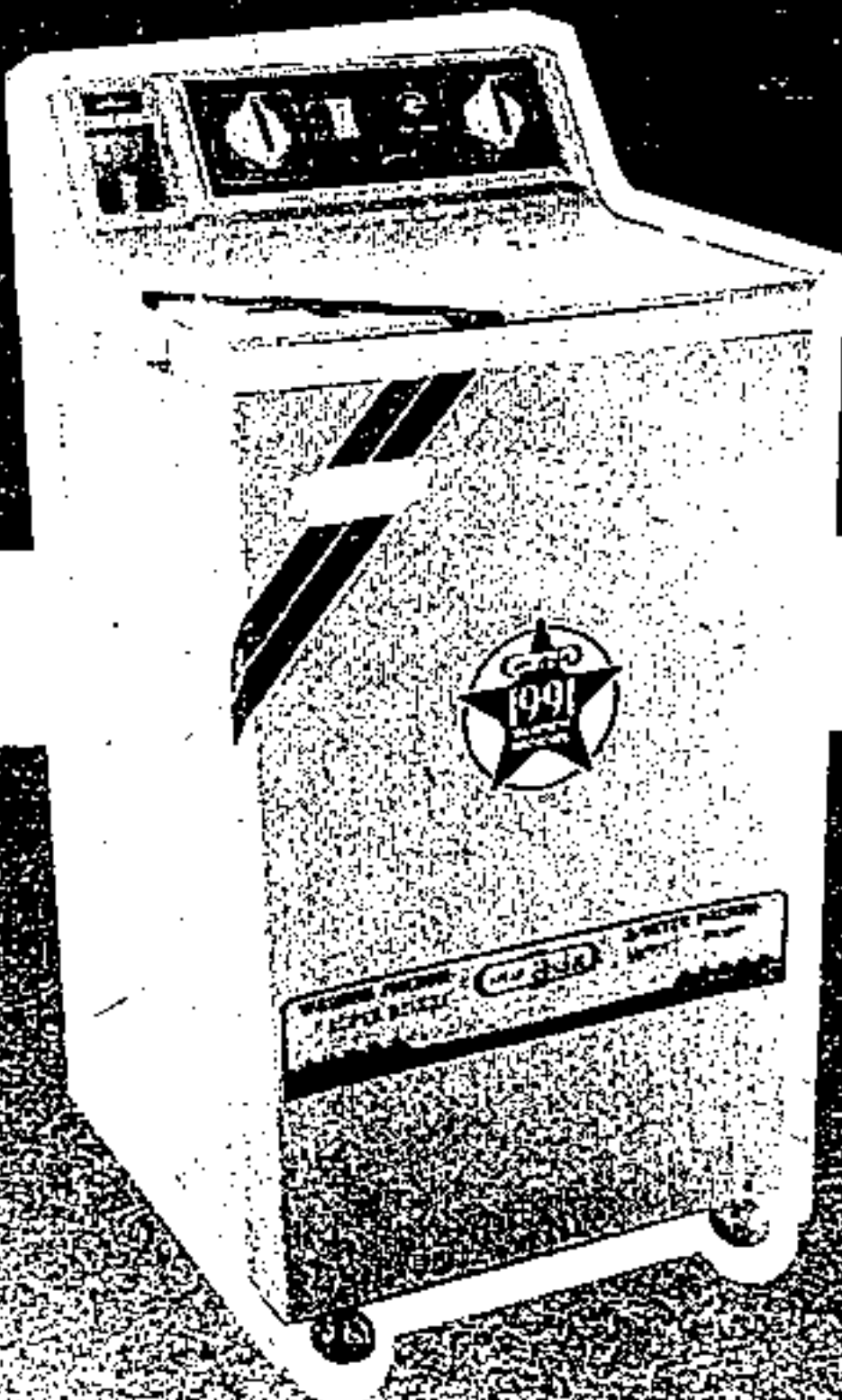
خصوصی شمارہ

اپریل ۱۹۸۶ء

سیارہ ڈائجسٹ

مینجنگ ڈائریکٹر

سلیمان یوسف

زیرِ ادارت

علی سفیان آفاقی

نائب مدیر

ندیم اُپل

خطاطی:- محمد اقبال طاہر۔ علی احمد

ڈائریکٹر انچارج: عثمان غنی

ناظمِ اشاعت:- امجد رؤف خان
شعبۂ ادارت
۱۸۹۔ ریواز گارڈن۔ لاہور
ٹیلی فون: ۷۳۵،۱۵۲

ناظم اشتہارات:- واجد علی (کراچی)
شعبہ اشتہارات
۱۸۹۔ ریواز گارڈن لاہور ۵،۱۵۲
۳۔ فاطمہ جناح روڈ کراچی
۵۱۶۵۱۰

اولیائے کرام نمبر

خصوصی شعبۂ ادارت

زیرِ ادارت

علی سُفیان آفاقی

نائب مُدیر

ندیم اپل

خصوصی معاونین : نواز رومانی ، مولوی عبدالکفیل ۔ محمّد ریاض قادری
عامر شہزاد ۔ جی۔ آر۔ اعوان ۔ عابد شکوہ

ڈیزاین : محمّد ارشد

خطاطی : محمّد اقبال طاہر۔ علی احمد ۔ محمّد ارشد۔ نعمت امین ۔ عبدالعزیز

پروسیس : فلک شیر

اہتمام : امجد رؤف خان

قیمت عام شمارہ ۲۴ روپے ۔ اولیائے کرام نمبر ۱۸۰ روپے

اس شمارے میں

اولیائے کرام نمبر کی تیاری میں مندرجہ ذیل دینی کتب سے استفادہ کیا گیا

عین الفقر
رودِ کوثر
طبقات الاولیاء
مآثر الاوا
مخزنِ فیض
افضل الفوائد
تاریخ فرشتہ
تاریخ ملتان
سفینہ اولیاء
مناقبِ سلطانی
احیائے علوم
تذکرہ صوفیائے بنگال
تذکرہ شاہ رکن عالم
حضرت مجدد الف ثانی
کشف المحجوب
رسائل جنید
تاریخ صوفیائے گجرات
تذکرۃ اولیاء
وفیاتِ الاعیان
سیرتِ بایزید
درس ولی
نفحات الانس
زہرۃ الابرار
تذکرہ خواجگانِ چشت

اولیائے کرامؒ کی تیاری میں مندرجہ ذیل دینی کتب سے استفادہ کیا گیا

...المعارف
...کلیم
...مشائخ چشت
...کلیمی
...نۃ الاصفیا
...اولیائے کرام
...صفیا
...الہدایت

مہر منیر
سوا السبیل
حیاتِ ولی
صوفیائے دکن
مخزن الغرائب
متاعِ فقیر
استاد العما
تذکرہ مشاہیر کاکوری

رسالۂ قشیریہ
سیرت العارفین
تذکرہ دولت شاہ
قراۃ الخیال
لطائفِ اشرفی
بشارت المریدین
تزکِ جہانگیری
منتخب التواریخ

دستک

مخالفِ اسلام قوتوں کی طرف سے یہ پراپیگنڈہ بڑے تواتر اور اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دُنیا میں اسلام تلوار کے زور پہ پھیلا ہے۔ غیر مسلم محققوں اور عالموں نے یہ الزام اتنی بار دہرایا کہ خود مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی اس کا شکار ہو گیا اور اُنہیں یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ دُنیا میں اسلام کی اشاعت جس تیزی سے عمل میں آئی اس کا ایک بڑا سبب غالباً مسلمانوں کی افواجِ قاہرہ کی فتوحات تھیں جنہوں نے عرب کے ریگستانوں سے نکل کر یورپ اور ایشیا کی عظیم ترین سلطنتوں کے دروازوں پہ دستک دی اور بالآخر اُنہیں تہہ و بالا کر دیا۔ یہ تاثر محض کم علمی اور اسلامی تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے قائم ہوا ہے اور افسوسناک بات تو یہ ہے کہ خود عام مسلمانوں نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ تاریخِ اسلام اور دوسرے غیر جانبدار مورخین کی تحریر کردہ کتابوں کا مطالعہ کریں اور یہ اندازہ لگائیں کہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں زیادہ حصہ اہلِ سیف، جنگجو فاتحوں کا ہے یا روحانی ہستیوں، صوفیوں اور اولیائے کرام نے اس مذہب کی خوبیوں کو تلوار کے بل پہ نہیں بلکہ اپنے عملِ صالح اور دِل میں اُتر جانے والی تعلیمات کی بنا پر دُنیا کے طول و عرض میں پھیلایا ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ساری دُنیا میں مسلمانوں کی آبادی سوا ارب کے لگ بھگ ہے۔ زبان سے کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ صدیوں کی محنتِ شاقہ اور عملِ صالح کی ذاتی مثالوں کے ذریعہ ان مردانِ حق آگاہ نے وہ تعلیمات عام کیں جنہوں نے لوگوں پہ تجلّیات کے ہزار عالم منکشف کر دیئے اور اُنہیں نگاہِ آشنائے روشنا کر دیا۔ یہ وہ شخصیات ہیں جن کے طفیل آج اسلام ایک عظیم عالمگیر مذہب کے طور پہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ مجاہدے اور نفس کشی میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے شہروں اور آبادیوں کی رونقیں اور آسائشیں ٹھکرا کر ویرانوں اور جنگل بیابانوں کو اپنی رہائش کا مرکز بنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ویرانے آباد و پُر ہجوم بستیوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے لوگوں کے سامنے عملِ صالح، علم و عمل کے ذاتی نمونے پیش کیے۔ یہ ظاہری اور باطنی اسرار و رموز کے مردِ میدان تھے علم، عقل، وفا، عشق و زہد کے پیکر تھے۔ استغنا اور توکل ایسا کہ شاہی آسائشیں اور دُنیاوی ناز و نعم چھوڑ کر ریگستانوں اور ویرانوں میں چراغ روشن کر دیئے لیکن پائے ثبات ایسا کہ جابر و قاہر سلاطین بھی اُنہیں ہراساں نہ کر سکے۔ تزکیۂ نفس مجاہدۂ باطن کے ان غازیوں نے اپنے اندر کی دُنیا پہ فتح پا کر باہر کی دُنیا کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ بادشاہانِ عالم ان سے خوف کھاتے تھے لیکن یہ خود خدا سے خوف کھاتے تھے اور یہی ان کی عظمت، بزرگی اور بلندی کا راز تھا۔

دُنیا میں اسلام اگر طاقت اور تلوار کے زور پہ پھیلا ہوتا تو آج دُنیا کی نصف سے زائد آبادی مسلمان اور کلمہ گو ہو کیونکہ مسلمانوں کی افواجِ فاتح نے ایک زمانے میں سارے عالم کو زیر و زبر اور مسخر کر لیا تھا لیکن مسلمان سلاطین اور ملوک نے اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق کبھی غیر مسلم آبادیوں کو کسی دباؤ یا کسی لالچ اور رشوت کے ذریعے بھی ان کا آ

مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ دور کیوں جاتے ہیں، خود برِ صغیر پاک و ہند کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجئے مسلمان حکمرانوں نے اس ملک پر صدیوں تک حکومت کی ہے اور مقامی آبادی ان کی مکمل مطیع اور وفادار تھی۔ اگر مسلمانوں نے تلوار کے زور پر مذہب پھیلانے کی کوشش کی ہوتی تو آج ہندوستان کی تاریخ یکسر مختلف ہوتی اور اس ملک میں غیر مسلم ڈھونڈنے سے بھی نہ دستیاب ہوتے، لیکن صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ یہی حال دوسرے ممالک کا بھی ہے جہاں مسلمانوں کے طویل دورِ حکمرانی کے باوجود بعض مقامات پر تو مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔

دراصل ہندوستان اور دوسرے ممالک میں اسلام کی ترویج و اشاعت صوفیاء، اولیائے کرام اور نیک بزرگ ہستیوں کی مرہونِ منت ہے جنہوں نے اس مقصدِ بلند کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور علم و عمل کی ایسی روشن مثالیں قائم کیں کہ شاہوں کی تعمیر کردہ سربفلک اور سنگین عمارتیں آج ناپید ہو چکی ہیں مگر ان اولیاء اور صوفیاء کی یادوں کے چراغ آج بھی روشن ہیں اور وہ زندۂ جاوید حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں جہانوں کی دولت سمیٹ کر اپنی جھولیوں میں بھر لی ہے، وہ اس عالم میں بھی محبوب و معروف ہیں اور دوسرے عالم میں بھی ان کے لیے ثوابِ عظیم اور حیاتِ جاوداں کی مسرتیں اور نعمتیں مہیا ہیں ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جسکو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ادارہ "سیارہ ڈائجسٹ" اس بار قارئین کی خدمت میں "اولیائے کرام نمبر" کا نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان شاء اللہ ہمارے "چودہ صدیاں نمبر" "قرآن نمبر" اور "رسول نمبر" کی طرح "اولیائے کرام نمبر" بھی قبولِ عام حاصل کرے گا۔

یہ نمبر روشن ضمیروں اور اللہ کے نیک بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ تلاش کے لیے نکلیں تو معلوم ہو گا کہ ان کی تعداد سینکڑوں ہزاروں میں ہے لیکن آغازِ کار کے طور پر محدود صفحات پر یہ نمبر پیشِ خدمت ہے۔ موقع ملا اور ضرورت محسوس ہوئی تو اس کا دوسرا حصہ بھی آپ کے پیشِ نظر ہو گا۔

اولیائے کرام اور صوفیاء کی تعداد اَن گنت ہے جنہوں نے دینِ اسلام کی آبیاری کی اور کروڑوں انسانوں کو کفر و ضلالت کے اندھیروں سے نجات دلا کر دین کی روشنی دکھائی۔ ان تمام برگزیدہ شخصیات کے تذکرے کے لیے ایک انتہائی ضخیم نمبر درکار ہے اور ادارہ "سیارہ ڈائجسٹ" مستقبل میں اس موضوع پر مزید خصوصی نمبر پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اس سمت میں یہ خشتِ اوّل ہے۔ زیرِ نظر شمارے کے لیے ادارے نے خصوصی تحقیق کا اہتمام کیا اور اس مقصد کے لیے ایک ادارتی بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا، جسکی عرق ریزی کا نچوڑ قارئین کرام کے سامنے موجود ہے اور توقع ہے کہ آپ اس بارے میں ہمیں اپنی آراء اور قیمتی مشوروں سے نوازیں گے تاکہ آئندہ ان کو پیشِ نظر اور ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ جن مصنفین نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ادارہ اُن کا دلی سپاس گزار ہے۔

علی سفیان آفاقی

نزلہ زکام اور کھانسی کا ایک سبب
دھواں اور دھول!
سُعالین
ان بیماریوں سے صحت یابی کا اصول
Sualin
سڑکوں پر دھواں، گلی کوچوں میں دھول اور
ماحول میں آلودگی سے نزلہ، زکام، گلے کی خراش اور کھانسی
کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ سعالین کا استعمال ان شکایات سے محفوظ رہنے کی
اچھی تدبیر بھی ہے اور مفید علاج بھی۔
سُعالین ہمارے ماحول، مزاج اور آب و ہوا سے مطابقت رکھنے والی مفید و مؤثر
جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ نزلہ زکام، کھانسی
اور گلے کی خراش سے آپ کو عارضی افاقہ کے بجائے مکمل آرام پہنچاتی ہے۔
گھر ہو یا دفتر، قیام ہو یا سفر، سُعالین ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے۔
جڑی بوٹیوں کا مرکب
سُعالین
نزلہ، زکام اور کھانسی کا مفید علاج
ہمدرد
دیانت داری خود اعتمادی پیدا کرتی ہے

حمد
باری تعالیٰ

تُو ہے کونین کا مالک میرے اللہ کیا لکھوں !
مَیں حیران ہوں کہ کن الفاظ میں حمد و ثنا لکھوں

زمین یا آسمان ہر شے پہ تیری حکمرانی ہے
تجھے قیوم مولا کبریا ربّ العلیٰ لکھوں !

مجھے روزِ قیامت تیری بخشش پر بھروسہ ہے
اِدھر اپنے گناہوں پر بھی شرمندہ ہوں کیا لکھوں

تُو ناداروں کا داتا ، بے سہاروں کا سہارا
مقدس ذات کو ٹوٹے دِلوں کا آسرا لکھوں

تیرا احسان کیا کم ہے محمّد سا نبی بخشا
مَیں تیرے بعد اپنے دِل پہ نام مصطفیٰؐ لکھوں

تری شانِ کریمی کے مَیں سَو سَو بار صدقے جاؤں
جو ہیں احسان مجھ ناچیز پر لا انتہا لکھوں

لطیف بے نوا کے حال پر اپنا کرم فرما
مَیں کس کلکِ شکستہ سے یہ حرفِ مدعا لکھوں

لطیف ملک
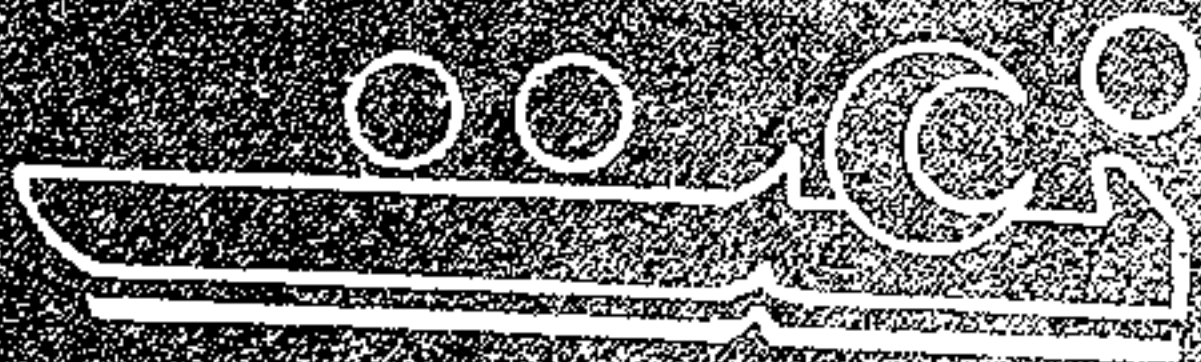
بارگاہِ نبوی میں جو پذیرائی ہو
گنگ جذبوں کو عطا قوتِ گویائی ہو

اپنی معراج کو پہنچی ہے میری فکر و نظر
اور کس اوج کی اب روحِ تمنائی ہو

میری آنکھیں تو ہیں انوارِ حرم سے روشن
دل میں بھی اُن کی ضیا سے چمن آرائی ہو

زندگی مدحِ پیمبر میں بسر ہو ایسے
نعت میرے لیے سرچشمۂ رعنائی ہو

جو نہ لرزے صفِ باطل کے مقابل آکر
میرے ایمان کو عطا ایسی توانائی ہو

حفیظ تائب

یہ نعت مدینہ میں حاضری کے دوران لکھی گئی

اہلِ نظر کے لیے

اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ محبّت کے لیے
اہلِ ارشاد، اہلِ فیض، اہلِ فراست کے لیے

اہلِ دانش، اہلِ درد، اہلِ درایت کے لیے
اہلِ ادبت، اہلِ جذب اہلِ انابت کے لیے

اہلِ نور، اہلِ شعور، اہلِ شہادت کے لیے
اہلِ فقر، اہلِ فنا، اہلِ فتوّت کے لیے

اہلِ ظرف، اہلِ ضمیر، اہلِ ذکاوت کے لیے
اہلِ ترک، اہلِ تمنّا، اہلِ حسرت کے لیے

اہلِ حق، اہلِ یقین، اہلِ امانت کے لیے
اہلِ صدق، اہلِ ولا، اہلِ ولایت کے لیے

اہلِ تمکیں، اہلِ سُکر، اہلِ سکینت کے لیے
اہلِ معنیٰ، اہلِ لفظ، اہلِ عبارت کے لیے

اہلِ اسرار، اہلِ کشف، اہلِ کرامت کے لیے
اہلِ شوق و اہلِ ذوق و اہلِ ہمّت کے لیے

اہلِ قرار، اہلِ امر، اہلِ امامت کے لیے
اہلِ ذکر و اہلِ فکر و اہلِ فطنت کے لیے

اہلِ راز، اہلِ رُموز، اہلِ ریاضت کے لیے
اہلِ سوز و اہلِ ساز و اہلِ صُحبت کے لیے

اہلِ ناز، اہلِ نیاز، اہلِ نزاکت کے لیے
اہلِ ہوش و اہلِ جوش و اہلِ جودت کے لیے

اہلِ حال، اہلِ کمال، اہلِ کہانت کے لیے
اہلِ جدّت کے لیے اہلِ روایت کے لیے

اہلِ خواب اہلِ خیال، اہلِ خطابت کے لیے
اہلِ حیرت کے لیے اہلِ حرارت کے لیے

عبدالعزیز خالد
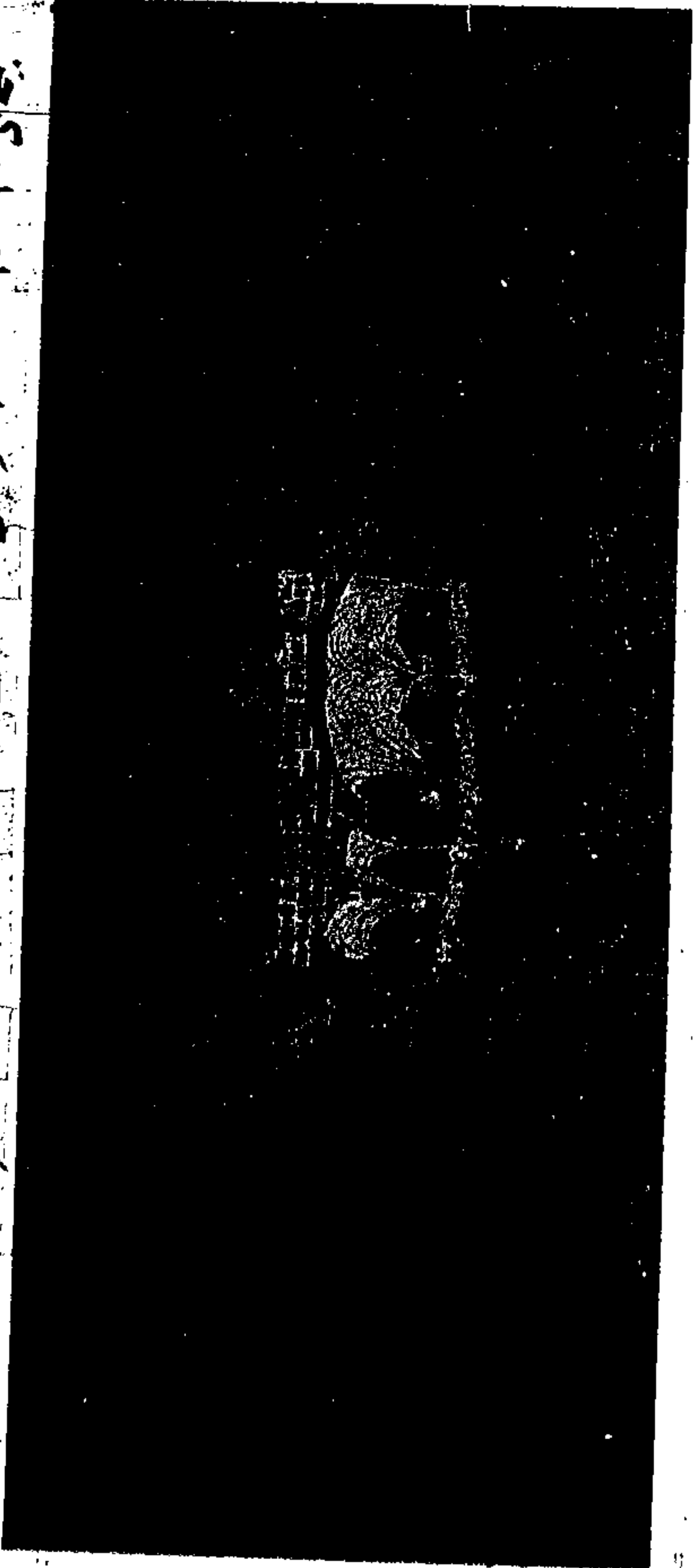
کاروبار کے سلسلہ میں سعودیہ سے سفر کرکے عمرہ کی سعادت حاصل کیجئے۔
خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دوران سفر
جدہ میں قیام کرتے ہیں۔ عمرہ کی
سعادت حاصل کرنے کے لئے مکہ معظمہ
جاتے ہیں اور مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس
کی زیارت سے فیضیاب ہوکر اللہ اور اسکے
نبیؐ آخر الزماں کی خوشنودی حاصل
کرتے ہیں۔ اس مقدس سفر کے لئے سعودیہ
آپ کو اپنے وائڈ باڈی طیاروں پر خوش آمدید
کہتی ہے۔ جنہیں آپ پاکیزہ ماحول،
اور آرام و آسائش کا گہوارہ پائیں گے۔
ریزرویشن کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا سعودیہ سے براہ راست رجوع کیجئے:
کراچی: سعودیہ بلڈنگ مولوی تمیزالدین روڈ۔ فون: (دس لائنیں) ۵۱۳۱۲۲، ۵۱۵۰۳۵
سعودیہ کارگو بلڈنگ کراچی ایرپورٹ۔ فون: ۴۸۰۸۹۵، ۴۸۱۲۳۳، ۴۸۱۷۱۳
لاہور: فون: ۳-۳-۳۰۵۳۱۱
اسلام آباد: فون: ۳-۲-۸۲۷۳۵۱ اور ۸۲۵۲۸۸
حیدرآباد: فون: ۳-۲۳۳۰۲-۲۳۷۶۸
السعودية

غالباً یہ ۵۵۲ ہجری کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا مگر وہ بزرگ یکایک اُٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ جو شخص وہاں حاضر ہوا وہ بھی پانی کا لوٹا بھر کر بزرگ کے پیچھے پیچھے چلا آیا لیکن انہوں نے کچھ توجہ نہ فرمائی۔ چلتے چلتے یہ بزرگ فصیلِ شہر کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ شہر سے باہر نکل گئے۔ مذکورہ شخص بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ چند قدم چلے تھے کہ ایک عظیم الشان شہر نظر آیا۔ آپ اس میں داخل ہو کر ایک مکان کے اندر چلے گئے۔ وہاں چھ شخص بیٹھے تھے۔ وہ از راہِ تعظیم کھڑے ہو گئے اور آپ کو سلام کیا۔ مکان کے ایک کونے سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ آواز بلند ہو گئی۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اِس کونے سے ایک میت کندھے پر اٹھا کر چلا گیا۔ پھر ایک نصرانی وضع کا شخص آپ کے سامنے حاضر ہوا۔ اُس کا سر برہنہ تھا اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ بزرگ نے اس شخص کے سر اور لبوں کے بال تراشے۔ پھر اسے کلمہ شہادت پڑھایا اور ان چھ اشخاص سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"میں بحکمِ الٰہی اس شخص کو متوفی کا قائم مقام کرتا ہوں۔ ان اشخاص نے بیک زبان کہا" ہمارے سر آنکھوں پر۔" پھر آپ اِس شہر سے باہر تشریف لے آئے۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ بغداد کی شہر پناہ آ گئی۔ پہلے کی طرح اس کا دروازہ خود بخود کھل گیا اور آپ اپنے دولت کدہ پر تشریف لے آئے۔

صبح ہوئی اور وہ شخص اُن بزرگ سے درس لینے بیٹھا اور بزرگ کو قسم دے کر رات کے واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ آپ نے فرمایا "پہلے عہد کرو کہ جب تک میں زندہ ہوں اِس واقعہ کا اظہار کسی سے نہ کرو گے۔ اُس شخص نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا جس پر بزرگ نے فرمایا رات کو جس شہر میں ہم گئے تھے اُس کا نام نہاوند تھا جو بغداد سے دُور دراز فاصلہ پر واقع ہے۔ مکان میں جو چھ آدمی تھے وہ ابدالِ وقت ہیں۔ جس شخص کے کراہنے کی آواز تم نے سُنی وہ ساتواں ابدال تھا۔ اس وقت اس کا عالمِ نزع تھا۔ جب وہ واصل بحق ہو گیا تو اُس کی میت حضرت خضر علیہ السلام اُٹھا کر لے گئے۔ جس آدمی کو میں نے کلمہ شہادت پڑھایا وہ قسطنطنیہ کا رہنے والا ایک عیسائی تھا۔ میں نے اللہ کے حکم سے مرحوم ابدال کی جگہ اسے ساتواں ابدال مقرر کیا۔

وہ شخص جو بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا شیخ ابوالحسن بغدادی تھے اور جس بزرگ کی خدمت میں انہوں نے حاضری دی وہ شیخ عبدالقادر جیلانی تھے۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ وہ یکم رمضان المبارک ۴۷۰ھ کو ایران کے موجودہ صوبہ مازندران کے مشہور شہر گیلان میں پیدا ہوئے۔ بعض مورخین نے آپ کا سنِ پیدائش ۴۷۱ھ بھی تحریر کیا ہے۔ لیکن جب ایک مرتبہ حضرت غوث الاعظم سے اس سے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے صحیح سنِ پیدائش تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب میں بغداد آیا تو میری عمر اٹھارہ سال تھی اور شیخ تمیمی نے اسی سال داعیِ اجل کو لبیک کہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غوث الاعظم کا سنِ پیدائش

شائع ہوتا تھا۔

اولیائے اُن کی آمد کی اطلاع اُن کی ولادت سے پہلے دے دی تھی۔ قطبِ دوراں شیخ ابوبکرؒ بن ہوار نے ایک دن اپنی مجلس میں شیخ عزاز سے کہا۔ "عراق میں ایک ایسا مردِ خدا پیدا ہوگا جو اللہ اور اُن کے بندوں کے نزدیک بے حد رُتبے کا حامل ہوگا۔ اُس کی سکونت بغداد میں ہوگی۔ وہ کہے گا کہ میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔ اس کے زمانے کے اولیاء اس کی بات مانیں گے۔ اُس کے دَور میں اُس جیسا کوئی نہیں ہوگا۔

آپ کی پیدائش پر آپ کی والدہ ماجدہ کا ارشاد ہے۔

"میرے فرزند عبدالقادر جب پیدا ہوئے تو وہ رمضان شریف کے دنوں میں دُودھ نہیں پیتے تھے۔ ایک مرتبہ ۲۹ شعبان کو مطلع صاف نہ تھا۔ ابر کی وجہ سے لوگ چاند نہ دیکھ سکے۔ صبح لوگ میرے پاس پُوچھنے آئے کہ آپ کے بچّے نے دُودھ پیا یا نہیں۔ مَیں نے کہلا بھیجا نہیں پیا جس سے انہیں معلوم ہوا کہ آج رمضان المبارک کی پہلی تاریخ ہے۔

حضرت غوث اعظمؒ نے سادات کرام کے ایک مقدس گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں ہر وقت قال اللہ و قال الرسولؐ کی صدائیں گونجتی تھیں۔ ان کے نانا سیّد عبداللہ صومعیؒ اور والد سیّد ابوصالحؒ اولیائے کامل تھے۔ اسی طرح اُن کی والدہ ماجدہ سیّدہ ام الخیر فاطمہؒ اور پھوپھی سیّدہ عائشہ عارفات ربانی تھیں۔ ان تمام ہستیوں کا شمار علو مرتبت عابد و زاہد اور منکسر المزاج بزرگانِ دین میں ہوتا تھا۔

حضرت غوث الاعظمؒ نے زمانۂ طالب علمی میں جس حیرت انگیز صبر و استقامت کے ساتھ تکالیف کا مقابلہ کیا اُس کی مثال اس چھوٹے سے واقعہ سے مل سکتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ پر بھوک کا شدید غلبہ ہوا۔ چلنے کی طاقت نہ رہی تو بغداد کی ایک مسجد میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک ایرانی نوجوان گرم گرم روٹیاں اور بھنا ہوا گوشت لے کر مسجد میں آیا اور کھانے بیٹھا۔ اچانک آپ کی نگاہ اس جانب اُٹھی لیکن شانِ غیرت غالب آئی اور استغفار پڑھ کر آپ نے مُنہ پھیر لیا۔ ایرانی نوجوان نے آپ کو کھانے میں شریک کرنا چاہا لیکن آپ نے انکار کر دیا مگر جب اس نے بہت اصرار کیا اور قسمیں دیں تو حضرت غوث الاعظمؒ نے مجبور ہو کر اُس کی دعوت قبول فرمائی لیکن لقمہ اُٹھاتے ہی اُنہیں کچھ خیال آیا۔ آپ نے اُس طالب علم سے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لاتے ہیں" روزگار کی تلاش میں جیلان سے آیا ہوں" طالب علم نے جواب دیا۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں جیلان کا رہنے والا ہوں"۔ نوجوان نے پھر سوال کیا" آپ جیلان کے ایک نوجوان طالب علم عبدالقادر سے واقف ہیں" آپ نے فرمایا "میرا ہی نام عبدالقادر ہے"۔

یہ سُن کر ایرانی نوجوان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور شرمندگی کے لہجے میں بولا۔

"معاف کیجیے گا مَیں نے آپ کی امانت میں خیانت کی ہے"۔ اس پر حضرت نے متحیّر ہو کر واقعہ پوچھا۔ طالب علم نے عرض کیا کہ "مَیں تلاش روزگار میں جب جیلان سے بغداد روانہ ہوا تو آپ کی والدہ ماجدہ نے مجھے آپ کے لیے آٹھ دینار دیتے تھے۔ بغداد پہنچ کر آپ کو کئی دن تلاش کیا۔ اس اثنا میں میرے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ خرچ ہو گئی اور کہیں روزگار نہ ملا۔ جب فاقہ کشی پر نوبت آئی تو مَیں نے آپ کی امانت میں سے ایک دینار خرچ کر کے اپنے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اصل میں یہ کھانا آپ کے روپیہ سے خریدا گیا ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ محبوب سُبحانی نے آبدیدہ ہو کر پروردگار کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے شدید آزمائش کے طور پر آپ کو غیر کا شرمندۂ احسان نہیں کیا۔ اس کے بعد آپ نے ایرانی طالب علم کو دلاسا دیا اور اس نے سات دینار جو آپ کی خدمت میں پیش کیے تھے ان میں سے صرف جزو قلیل اپنے لیے رکھ کر باقی رقم اس کو مراحمت فرما دی۔

سیّدنا غوث الاعظمؒ بغدادِ معلیٰ میں جب تعلیم ختم فرما چکے تو عبادات و مجاہدات کی محنت شروع فرما دی۔ آپ ہر وقت اس قدر شدید ریاضت فرماتے کہ دیکھنے والوں کو آپ پر ترس آ جاتا اور وہ مضطرب ہو کر گھبرا جاتے مگر آپ کو اپنے شغل میں ایسی محویت ہوتی کہ کسی طرف توجہ ہی نہ فرماتے۔

خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں عراق کے جنگلوں میں بیس سال تک پھرتا رہا۔ دن رات عبادتِ الٰہی کے سوا کوئی اور کام نہ کرتا لہٰذا سالہا سال تک بے شمار راتیں آنکھوں میں گزر گئیں اور میں نے پلک بھی نہ جھپکائی۔ نیند کا غلبہ آتا تو ایک پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور پورا کلام ختم کر ڈالتا اور پھر تازہ دم ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتا۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں کئی سال ویرانوں میں رہا۔ وہاں میری خوراک صحرائی کھجوریں اور لباس سُوت کا ایک جُبّہ تھا۔ مَیں ننگے پاؤں جنگلوں کے کانٹوں میں چلتا پھرتا تھا۔ میرے تلوے چھلنی ہو گئے تھے۔ زمانۂ شباب میں لوگوں پر جذبات غالب ہوتے ہیں مگر میں جوانی پر قابو پا چکا ہوں۔

ایک بار لوگوں نے شیخ عبدالقادرؒ سے کہا کہ ہم آپ کی طرح روزے رکھتے ہیں آپ ہی کی طرح نماز پڑھتے ہیں اور آپ ہی کی طرح ریاضت کرتے ہیں لیکن آپ جیسا مرتبہ ہمیں نہیں ملتا۔ اس پر شیخ نے جواب دیا "تم لوگوں نے اعمال میں مزاحمت کی ہے تو کیا خدا کی نعمتوں میں مزاحمت کر سکتے ہو۔ واللہ میں کبھی نہیں کھاتا۔ یہاں تک کہ مجھے کہا جاتا ہے کہ تجھے میرے حق کی قسم کھا اور میں کبھی پانی نہیں پیتا۔ یہاں تک کہ مجھ سے کہا جاتا ہے" تجھے میرے حق کی قسم ہے پی لو گر میں کبھی کوئی کام نہیں کرتا یہاں تک کہ مجھے کہا جاتا ہے تجھے میرے حق کی قسم ہے یہ کام کر۔"

شیخ عبدالقادرؒ کے القاب میں سے ایک "محی الدین" ہے۔ اُن کا یہ لقب اُن کے والد نے تجویز نہیں کیا تھا اور نہ خود انہوں نے اپنا یہ لقب رکھا تھا بلکہ کسی خاص واقعہ کی وجہ سے اس زمانے کے اصحاب اصلاح انسان کے لقب دیا تھا۔ روایت یہ ہے کہ آپ نے عالم رویا میں ایک نحیف و ضعیف بیمار کو دیکھا جو کہ اُٹھنے سے معذور تھا۔ آپ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ تندرست ہو گیا۔ جب اس تنومند ہو جانے والے نحیف سے اُس کا نام پوچھا تو اس نے کہا کہ میں تمہارے دادا کا "دینِ اسلام" ہوں۔ دوسری صبح سے لوگ آپ کو "محی الدین" کہنے لگے۔ یہ واقعہ ہے کہ آپ نے یہ خواب دیکھا تھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ کو محی الدین کہا جانے لگا لیکن راویوں نے بعض واقعات حذف کر دیئے ہیں۔ یہ رویا ایک اشارہ ربانی تھا۔ عالم خواب میں شفقتِ ایزدی نے آپ کے سپرد احیائے دین کا فریضہ کیا تھا۔ غالباً یہ رویا بھی بغداد کے سفر کی محرک ثابت ہوئی۔

اس سفر میں آپ سے ایک زبردست کرامت کا ظہور ہوا۔ آپ کی والدہ نے آپ کی عبائے دلق میں چالیس اشرفیاں سی دی تھیں اور رخصت ہوتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ ہمیشہ سچ بولنا اور ہر معاملہ کی بنیاد راست بازی پر رکھنا۔ آپ کا قافلہ ہمدان تک تو خیریت سے پہنچ گیا لیکن جب یہ قافلہ ہمدان سے آگے ترتنک کے سنسان کوہستانی علاقہ میں پہنچا تو قزاقوں کے ایک جتھے نے اس قافلہ پر حملہ کر دیا۔ قافلہ کے لوگوں میں ان خونخوار قزاقوں کے مقابلہ کی سکت نہیں تھی۔ قزاقوں نے خوب لوٹ مار کی۔ اس ہنگامہ میں شیخ عبدالقادرؒ اطمینان سے ایک جانب کھڑے رہے۔ لڑکا سمجھ کر کسی نے آپ سے تعرض بھی نہیں کیا۔ اتفاق سے ایک قزاق کی نظر آپ پر پڑی تو اُس نے آپ کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ لڑکے تیرے پاس کیا ہے؟ آپ نے بغیر کسی خوف و ہراس کے جواب دیا۔ میرے پاس چالیس دینار ہیں۔ قزاق بولا کہاں ہیں؟ آپ نے اُسے بتایا کہ یہ میری عبا میں بغل کے نیچے سیئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ کی بات کو مذاق سمجھ کر آگے بڑھ گیا۔ پھر آپ کے پاس ایک اور قزاق آیا۔ اس سے بھی اسی قسم کی گفتگو ہوئی تو یہ دونوں آپ کو اپنے سردار احمد بدوی کے پاس لے گئے۔ سردار نے پوچھا لڑکے سچ بتلا تیرے پاس کیا ہے؟ آپ نے پوری صداقت کے ساتھ پھر وہی جواب دیا۔ سردار نے آپ کی عبا کو پھاڑا تو اس میں سے واقعی چالیس دینار نکل آئے۔

سردار نے انتہائی حیرت کے عالم میں آپ کو مخاطب کر کے کہا "لڑکے تم کو معلوم ہے کہ ہم قزاق ہیں، رہزن ہیں اور قتل و غارت گری ہمارا پیشہ ہے، پھر بھی تم کو ہم سے خوف نہیں آیا۔ اس پر آپ نے فرمایا میری والدہ ماجدہ نے گھر سے چلتے وقت مجھے نصیحت فرمائی تھی کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ میں اپنی والدہ ماجدہ کی نصیحت کو کیسے فراموش کر دیتا۔ صرف چالیس دینار کی خاطر اپنا عہد کیسے توڑ دیتا۔ یہ الفاظ نہیں تھے بلکہ حق و صداقت کے ترکش سے نکلے ہوئے تیر تھے۔ جو احمد بدوی کے سینہ میں پیوست ہو گئے۔ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے ندامت نے دل کی شقاوت اور سیاہی دھو ڈالی اور وہ بولا آفرین ہے کہ تم نے اپنی ماں کی نصیحت یاد رکھی اور اپنے عہد کا اتنا پاس کیا مگر حیف ہے مجھ پر کہ اپنے پروردگار سے کیے ہوئے عہد کا پاس نہیں کرتا اور اپنے خالق کی نصیحت کو فراموش کر دیا۔ اس کے ساتھیوں نے یہ دیکھا تو اُن کے دل بھی پگھل گئے اور سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"سردار تو رہزنی میں ہمارا قائد تھا اور اب توبہ میں بھی ہمارا پیشرو اور سردار ہے۔ کہتے ہیں یہ تمام لٹیرے اور قزاق فوراً اولیاء و ابدال میں شامل ہو گئے۔"

ایک بار شیخ عبدالقادرؒ اپنے تین بیٹوں عبدالرزاق، عبدالوہاب اور عیسیٰ کے ہمراہ جمعہ کی نماز کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں سلطان کے لیے شراب کے تین مشک بھیجے جا رہے تھے۔ مشکوں کی نگرانی کے لیے کوتوال اور دوسرے عمال ساتھ تھے۔ شیخ نے انہیں رُکنے کا حکم دیا لیکن وہ نہیں رُکے اور جن گدھوں پر مشکیں رکھی تھیں انہیں اور تیزی سے ہنکانے لگے۔ شیخ نے گدھوں کی طرف ایک قہر آلود نظر ڈالی اور اُن سے کہا "رُک جاؤ" گدھے پتھروں کی طرح جم کر رہ گئے۔ عمال انہیں ڈنڈوں سے مار رہے تھے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور کوتوال سمیت سب کو قولنج کا درد ہو گیا۔ وہ درد کی وجہ سے بُری طرح زمین پر لوٹنے لگے۔ وہ زور زور سے توبہ استغفار بھی کر رہے تھے۔ توبہ کے بعد اُن کی حالت کچھ ٹھیک ہو گئی اور شراب کی بُو سرکے کی بُو میں بدل گئی۔ انہوں نے

مٹکے کھول کر دیکھے تو اُن میں شراب کی جگہ سرکا بھرا ہوا تھا۔ شیخ عبدالقادر خاموشی سے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ سلطان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ شیخ کے خوف سے رونے لگا۔ بعد میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہونا اس نے اپنا معمول بنا لیا۔

اخبار الاخیار میں حضرت علامہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں حضرت غوث الاعظمؒ کا ارشاد ہے کہ ابتدا میں مجھے نیند اور بیداری دونوں حالتوں میں وعظ کہنے کا حکم تھا اور جب مجھ پر تکلم نے اس حد تک غلبہ کیا کہ میں بے اختیار ہو گیا اور سکوت پر قادر نہ رہ سکا تو وعظ کہنا شروع کر دیا۔ حضرت غوث اعظمؒ نے جب وعظ کی ابتدا فرمائی تو اس وقت وعظ میں چند اشخاص ہوا کرتے تھے لیکن کچھ دن بعد حاضرین کی کثرت ہونے لگی اور پھر اتنا ہجوم وارد ہوا کہ بیٹھنے کی جگہ نہ رہتی تھی۔ جب جگہ کی تنگی زیادہ محسوس ہونے لگی تو شہر کی عیدگاہ کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا اور وہاں مجلس وعظ منعقد ہونے لگی لیکن کچھ عرصہ بعد وہ جگہ بھی حاضرین کی کثرت و ہجوم کے باعث تنگ ثابت ہوئی کیونکہ بے شمار لوگ سوار اور پیادہ آتے تھے اور جگہ نہ ملنے پر مجلس کے چاروں طرف کھڑے ہو جاتے تھے یہاں تک کہ حاضرین مجلس کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ گئی۔ حضرت علامہ محدث دہلوی نے دوسری روایت بیان فرمائی ہے کہ حضور غوث پاک نے ارشاد فرمایا کہ ابتدا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے خواب میں مشرف ہوا۔ آپ دونوں نے مجھے وعظ کہنے کا حکم دیا اور اپنا اپنا لعاب دہن میرے مُنہ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد مجھ میں گویائی کی طاقت بڑھ گئی اور کلام کا دروازہ کھل گیا۔

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات کی کثرت پر مورخین کا اتفاق ہے۔ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات کی حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی کرامت مُردہ دلوں کی مسیحائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی۔ آپ کا وجود اسلام کے لیے ایک بادِ بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی اور عالم اسلام میں ایمان اور روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ شیخ عمر کیسانی کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام قبول نہ کرتے ہوں اور رہزن، خونی اور جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں۔ جبائی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے زمانہ سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں۔ نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے۔ میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں۔ عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

غوث اعظم کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ مشائخ آپ کے مدرسہ میں جھاڑو دیتے اور چھڑکاؤ کرتے تھے۔ جب آپ کی اجازت ہوتی تو زانوئے ادب طے کر کے آپ کے سامنے بیٹھتے۔ مشہور ولی اللہ شیخ علی بن ابی نصر الہیتیؒ گاہے گاہے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی جائے رہائش زریران سے سیدنا غوث اعظم کی خدمت میں بغداد آیا کرتے تھے۔ بغداد کے قریب پہنچتے تو اپنے ساتھیوں سے فرماتے دریائے دجلہ میں غسل کر لو اور اپنے دل کو خطرات سے پاک کر لو کہ ہم سلطان الاولیاء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ بغداد میں داخل ہوتے تو لوگ ان کی آمد کی خبر سن کر دوڑے دوڑے اُن کی خدمت میں آتے۔ وہ فرماتے شیخ عبدالقادر کے دروازے کی طرف بھاگو۔ میں تو اُن کا ایک ادنیٰ نیاز مند ہوں۔ جب سیدنا غوث اعظم کے مدرسہ کے دروازے پر پہنچتے تو اپنا جوتا اُتار دیتے اور باریابی کی اجازت چاہتے۔ جب آپ پکارتے تو مودبانہ حاضر ہو جاتے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ بغداد میں آیا تو شیخ عبدالقادر اپنے مدرسہ کی چھت پر صلوٰۃ الضحیٰ پڑھ رہے تھے۔ جب میں نے اُوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو میں نے رجالِ غیب کی چالیس صفیں کھڑی پائیں۔ ہر صف میں ستر رجال تھے۔ میں نے ان سے پوچھا آپ لوگ بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔ انہوں نے جواب دیا جب تک سید عبدالقادر نماز سے فارغ ہو کر ہمیں اجازت نہیں دیں گے ہم نہیں بیٹھیں گے کیونکہ وہ ہمارے سردار ہیں۔

حافظ ابوالخیر نے ۵۰۳ھ میں اپنے شاگردوں کو بتایا کہ ایک بار ہم شیخ محی الدین عبدالقادر کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ وہاں عراق کے بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء بھی موجود تھے۔ شیخ عبدالقادر کرسی پر تشریف فرما تھے اور کہہ رہے تھے کہ "آفتاب مجھے سلام کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ سال میرے پاس آتا ہے اور مجھے سلام کہتا ہے اور مجھے ان باتوں کی خبر دیتا ہے جو اس کے دوران میں رونما ہوں گی۔ دن مجھے سلام کہتا ہے اور جو جو واقعہ اُس دن ہو گا اس کی خبر دیتا ہے۔ خُدا کی عزت کی قسم! نیک بخت اور بدبخت میرے سامنے لوح محفوظ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ میں خُدا کے علم اور مشاہدے میں غوطہ لگانے والا ہوں۔ میں تم سب پر خُدا کی حجت ہوں اور زمین پر اللہ کے رسول کا نائب اور وارث ہوں۔ میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔ یہ نعرہ

سُن کر شیخ بن الہیتی کھڑے ہو گئے۔ شیخ بن الہیتی کے جلال اور جذب سے پورا بغداد لرزتا تھا مگر وہ کرسی پر آ چڑھے اور انہوں نے عاجزی سے جوتے پر اپنی گردن رکھ دی اور شیخ عبدالقادر کا قدم اپنی گردن پر رکھ لیا۔ محفل میں جتنے بھی اولیا موجود تھے اُن سب نے عاجزی سے اپنی گردنیں جُھکا لی تھیں۔ سائیں دُور کے بہت سے اولیا نے مختلف مقامات پر شیخ عبدالقادر کا یہ قول کشف سے معلوم کر لیا تھا اور جو جہاں تھا وہیں اس نے اپنی گردن اُن کے احترام کے لیے جُھکا دی تھی چنانچہ ابوسعید قیلوی نے قیلویہ میں بتایا کہ جب شیخ عبدالقادر نے یہ الفاظ ادا کیے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں تجلی کی اور رسُول اللہ کی طرف سے انہیں مقربین ملائکہ کے ہاتھوں خلعت پہنچی۔ متقدمین اور متاخرین اولیا میں سے جو زندہ تھے وہ اپنے جسموں کے ساتھ اور جو مُردہ تھے وہ اپنی رُوحوں کے ساتھ ملائکہ اور رجال الغیب تمام شیخ عبدالقادر کی مجلس گھیرے ہوتے تھے یہاں تک کہ اُن کے جمِ غفیر سے تمام اُفق بھر گیا تھا۔ زمین پر کوئی ولی ایسا نہیں تھا جس نے اُس وقت اپنی گردن نہ جُھکا دی ہو۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ شیخ عبدالقادر مسجد میں مصروفِ عبادت تھے کہ اچانک انہیں مسجد کے ستون پر کوئی شے رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسی دوران ایک بڑا سانپ شیخ عبدالقادر کے سامنے پھن لہرانے لگا۔ انہوں نے بلا کسی خوف کے سانپ کو ہاتھ سے ہٹا دیا اور سجدے میں چلے گئے۔ پھر جب وہ التحیات پڑھنے بیٹھے تو سانپ اُن کی ران سے ہوتا ہوا گردن سے جا کر لپٹ گیا مگر جب انہوں نے سلام پھیرا تو سانپ وہاں موجود ہی نہ تھا۔ اس سے اگلے روز شیخ عبدالقادر کو ایک اور انوکھا واقعہ پیش آیا۔ وہ مسجد کے باہر ایک قریبی میدان سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک ایسا شخص نظر آیا جس کی آنکھیں بلّی سے ملتی جلتی تھیں البتہ قد غیر معمولی طور پر لمبا تھا۔ شیخ کو واقعی یقین ہو گیا کہ یہ کوئی جن ہے اس پر اس شخص نے اعتراف کیا کہ سچ مچ وہ جن ہے جسے گزشتہ روز انہوں نے سانپ کے رُوپ میں دیکھا تھا۔ جن کا کہنا تھا کہ اس نے متعدد اولیا کو آزمایا مگر اُن کی طرح کوئی بھی ثابت قدم نہ نکلا۔ کچھ اولیائے کرام تو اُسے دیکھ کر سخت گھبرا گئے تھے اور بعض دلی طور پر بہت خوفزدہ ہو گئے تھے مگر وہ واحد اولیا ہیں کہ جن کا ظاہر و باطن ایک جیسا رہا۔ اس کے بعد جن نے شیخ عبدالقادر سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے ہاتھ پر توبہ کروائیں۔ شیخ نے جن کی بات مان لی بعد میں شیخ عبدالقادر نے ایک مجلس میں فرمایا کہ انسانوں کی طرح جنوں اور فرشتوں کے بھی مشائخ ہوتے ہیں مگر اللہ نے میرا رتبہ بڑا رکھا ہے۔ مجھے بلند مقام عطا کیا ہے میں سب کا شیخ ہوں۔ بعض مورخین کے مطابق شیخ عبدالقادر اپنی اولاد سے کہتے تھے کہ مجھ میں، تم میں اور تمام مخلوق میں اس قدر دُوری اور فاصلہ ہے جتنا کہ زمین اور آسمان میں ہے۔ مجھے کسی پر اور کسی کو مجھ پر قیاس کرو۔

حضور غوث اعظم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار دورانِ وعظ آپ کو چھینک آئی اور آپ نے تحمید فرمائی۔ اس کے جواب میں یرحمک اللہ کا غلغلہ سارے مجمع کی طرف سے ایسا بلند ہوا کہ خلیفہ مستنجد باللہ جو اُس وقت اپنے مقصورے پر تھا گھبرا گیا کہ کہیں غنیم کی فوج تو نہیں آ گئی۔ لوگوں نے بتایا کہ مجلس وعظ کے اس عظیم اجتماع نے تشمیت کی ہے۔ حضرت شیخ سلاطین وقت کو جائز تصور کرتے تھے اس لیے کہ ان کی حکومت علیٰ نہج خلافت راشدہ باقی نہیں رہی تھی۔ وہ طرح طرح سے رعایا سے مالیہ وصول کرتے اور اُس کو بیت المال اور عام مسلمانوں کی امانت کے بجائے اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے اور اُسے اپنی ہی خواہش اور ہوس کے مطابق عیش و عشرت کی زندگی پر خرچ کرتے تھے۔ اُن کے محل محلاتِ قیصر و کسریٰ کی شان و شوکت کا نمونہ بن چکے تھے۔ اسی بنا پر حضرت شیخ ”امراء و سلاطین“ سے کسی قسم کا میل جول اور ربط نہیں رکھتے تھے اور افراد و قوم کو خدا ترسی اور شرعی زندگی گزارنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ خلیفہ مستنجد باللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اشرفیوں کے دو تھیلے نذر میں پیش کیے۔ شیخ نے اسے قبول نہ فرمایا۔ خلیفہ کی طرف سے جب اصرار بڑھا تو شیخ عبدالقادرؒ نے دونوں تھیلوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر نچوڑا تو ان کے اندر سے خون ٹپکنے لگا۔ اس پر شیخؒ نے ارشاد فرمایا ”اے ابوالمظفر! تم اللہ سے شرم نہیں کرتے کہ اس طرح اُس کے بندوں کا خون چوستے ہو۔“ یہ سُن کر مستنجد باللہ پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ غش کھا کر گر گیا۔

سیدنا غوث اعظم کی کرامات کی کثرت پر تمام مورخین کو مکمل طور پر اتفاق ہے۔ شیخ علی بن ابی نصر الہیتی“ کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں کسی شخص کو شیخ عبدالقادر جیلانی سے بڑھ کر صاحب کرامت نہیں پایا۔ جب بھی کوئی شخص آپ کی کرامت دیکھنا چاہتا دیکھ لیتا۔ ایک بار کوئی عورت اپنے بیٹے کو لے کے شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی ”اے حضرت میرا یہ بیٹا آپ سے قلبی طور پر وابستہ ہے۔ میں بیٹے کے حق سے دستبردار ہو کر اسے آپ کی نذر کرتی ہوں آپ اسے قبول فرمالیجیے۔ عبدالقادر جیلانی نے اسے قبول فرما لیا۔ کافی عرصہ بعد جب یہ عورت اپنے بیٹے سے ملنے آئی تو اُسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اُس کا بیٹا بھوک اور شب بیداری کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا ہے۔ لڑکے کی ماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ اُسے کھانے کے لیے فقط جَو کی روٹی کا ایک ٹکڑا دیا

جاتا ہے تو وہ سخت طیش کی حالت میں شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت وہ کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے اور اُن کے سامنے خالی برتن میں مُرغ کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ عورت نے نہایت ترش لہجے میں شیخ سے کہا "آپ خود تو مرغن غذا کھاتے ہیں اور میرا بیٹا جَو کی روٹی کھاتا ہے" شیخ عبدالقادرؒ چند لمحے خاموش رہے اور پھر انہوں نے ہڈیوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا۔ اللہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو ایک بار پھر زندہ کرنے والا ہے۔ عورت یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ مرغ زندہ ہو گیا اس پر شیخ نے عورت سے کہا "جس وقت تیرا بیٹا اس مقام پر پہنچ جاتا ہے گا تو اُسے اجازت ہو گی کہ جو چاہے کھائے۔ اسی طرح شیخ محمد صادق شیبانی سے روایت ہے کہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے والد لاولد تھے۔ اُن کی بیوی حضرت غوث اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے اولاد کے لیے دُعا کرنے کی درخواست کی۔ شیخؒ نے اُن کے حق میں دُعا کرنے کے بعد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد تمہیں بیٹا عطا کرے گا۔ قدرت خُدا کی دیکھیے کہ وہ اُسی شب حاملہ ہو گئیں مگر مقررّہ مدت کے بعد لڑکے کی جگہ لڑکی پیدا ہوئی۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کو جب اس بات کی اطلاع پہنچائی گئی تو آپ نے اطلاع لانے والے سے فرمایا "اچھی طرح جا کر دیکھو وہ لڑکا ہے لڑکی نہیں ہے۔ گھر جا کر دیکھا گیا تو واقعی لڑکا تھا۔ پھر آپ نے اس لڑکے کا نام شہاب الدین تجویز فرمایا اور کہا کہ خُدا کے فضل سے یہ طویل عُمر پائے گا اور اپنے وقت کا بزرگِ کامل ہو گا۔ شیخ عبدالقادرؒ کے فرمان کے مطابق شہاب الدین عمر اپنے وقت کے ولی کامل ثابت ہوئے اور انہوں نے طویل عُمر پائی۔

اِسی طرح ابوسعد کا بیان ہے کہ اُن کی کنواری بیٹی فاطمہ ایک روز اچانک مکان کی چھت پر سے غائب ہو گئی۔ کافی کھوج لگایا گیا مگر اس بابت کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا۔ چنانچہ مَیں ہر طرف سے مایوس ہو کر شیخ عبدالقادرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ کچھ دُور کرخ کا جنگل واقع ہے آج رات تم وہاں چلے جانا اور پانچویں ٹیلے کے قریب زمین پر اپنے گرد ایک دائرہ کھینچ کر وہاں بیٹھ جانا۔ جس وقت تم دائرہ کھینچو تو یہ الفاظ پڑھنا۔ باسم اللہ فیہ عبدالقادر رضی اللہ عنہ' جب کافی رات گزر جائے گی تب جنّوں کی ایک جماعت تمہارے پاس آئے گی جن کی صورتیں بہت خوفناک اور ڈراؤنی ہوں گی مگر تمہیں ہمت سے کام لینا ہو گا۔ پھر اگلی صبح جنّوں کا سردار ایک لشکر کے ہمراہ تمہارے پاس آئے گا اور وہ تم سے وہاں آنے کا مقصد پوچھے گا۔ تم جنّوں کے سردار سے کہہ دینا کہ مجھے عبدالقادر نے بھیجا ہے اور اس کے ساتھ ہی تم اُس کے سامنے اپنی بیٹی کا واقعہ بیان کر دینا۔ ابوسعید کا بیان ہے کہ جب مَیں شیخ صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے پانچویں ٹیلے کے پاس دائرے میں بیٹھ گیا تو خوفناک قسم کے چہرے چاروں اطراف سے میری جانب بڑھنے لگے مگر اُن میں سے کسی نے بھی دائرے کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کی۔ تمام رات مہیب قسم کے چہرے جماعتوں کی صورت میں دائرے کے قریب آتے رہے اور مختلف طریقوں سے مجھے خوفزدہ کرتے رہے مگر شیخ کی ہدایت کے مطابق مَیں ہمت کر کے ڈٹا رہا۔ پھر اگلی صبح جنّوں کا سردار خچر پر سوار ہو کر میرے پاس آیا اور مجھ سے میرے آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ مجھے شیخ عبدالقادر نے اُس کے پاس بھیجا ہے۔ شیخ کا نام سُنتے ہی وہ خچر سے نیچے اُتر آیا اور زمین کو بوسہ دیتے ہوئے دائرے کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس کے ساتھی بھی آس پاس بیٹھ گئے۔ میں نے سردار کو اپنی لڑکی کے غائب ہونے کا واقعہ من و عن بتا دیا۔ اس پر سردار نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بولو یہ کام کس کا ہے مگر سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا جس پر سردار نے انہیں چھان بین کے لیے روانہ کر دیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ ایک جن کو پکڑ لائے اُن کے ساتھ میری گمشدہ لڑکی فاطمہ بھی تھی۔ مجھے اُن جنّوں کی زبانی معلوم ہوا کہ میری بچی کو اُٹھانے والے جن کا تعلق ختن کے علاقے سے ہے۔ سردار نے اس سے کہا اے بدبخت تُو نے قطب کی رکاب کے نیچے سے چوری کر کے ہم سب کو نادم کر دیا ہے جس پر جن نے جواب دیا "سردار مجھے یہ لڑکی اتنی اچھی لگی کہ میں اسے اُٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ مزید اپنی صفائی میں میرے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں ہے۔ ابوسعد کا بیان ہے کہ سردار نے میری بیٹی کو میرے حوالے کر دیا اور مذکورہ جن کی گردن اُڑا دینے کا حکم دیا۔ پھر سردار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شیخؒ سے میری طرف سے معافی مانگ کر یہ عرض کرنا کہ میں اس واقعہ کے بارے میں بےخبر تھا۔ جنّوں کے سردار نے شیخؒ کے بارے میں بتایا کہ وہ اُن کے انتہائی فرمانبردار ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنّوں وانس پر غلبہ دیا ہے کیونکہ وہ سب کے شیخ اور دستگیر ہیں۔

لوگ آپ کو محی الدین بھی کہتے تھے۔ ایک بار کسی شخص نے جب آپ سے اس بابت دریافت کیا تو اس پر شیخ عبدالقادر جیلانی نے اس شخص کو ایک واقعہ سُنایا جو کچھ اس طرح سے تھا ایک روز آپ بغداد کی طرف ننگے پاؤں نکل آئے وہاں انہیں ایک انتہائی بیمار اور لاغر شخص دکھائی دیا جو کمزوری اور نقاہت کے باعث اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ شیخ عبدالقادر کا کہنا ہے کہ اس شخص نے مجھے اپنے قریب آنے کے لیے کہا۔ جب میں قریب گیا تو اس شخص نے کہا کہ آپ مجھے بٹھا دیجیے۔ مَیں نے انہیں احتیاط کے ساتھ زمین پر بٹھا دیا جس کے ساتھ ہی اس شخص کا جسم تندرست و توانا ہو گیا اور چہرے پر بھی کسی قسم

مسٹر برائٹ
کہتے ہیں
فلپس بلب
دیرپا ہیں
زیادہ روشنی دیتے ہیں
بجلی کے خرچ میں بچت کرتے ہیں
ضروری ہے کہ تین خصوصیات کسی بلب میں صحیح
تناسب کے ساتھ موجود ہوں۔
اکثر بلب میں ان میں سے ایک یا دو خوبیاں تو ہوتی ہیں مگر تینوں
بیک وقت موجود نہیں ہوتیں۔ درحقیقت ہمارے بلب کی تیاری
میں ۹۰ سال سے زیادہ عرصے کی فلپس کی مہارت شامل
ہے۔ اس لئے فلپس بلب میں تمام خصوصیات بہترین تناسب
کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ دیرپا، زیادہ روشنی اور بجلی
کے خرچ میں بچت۔ یہی وجہ ہے کہ فلپس سے بہتر بلب
دستیاب نہیں۔ آپ اس سے کمتر کیوں خریدیں؟
دنیا میں ہر تیسرا بلب فلپس کا
تیار کردہ ہے۔
فلپس
بلب بہتر ہے
PHILIPS
فلپس
14-83
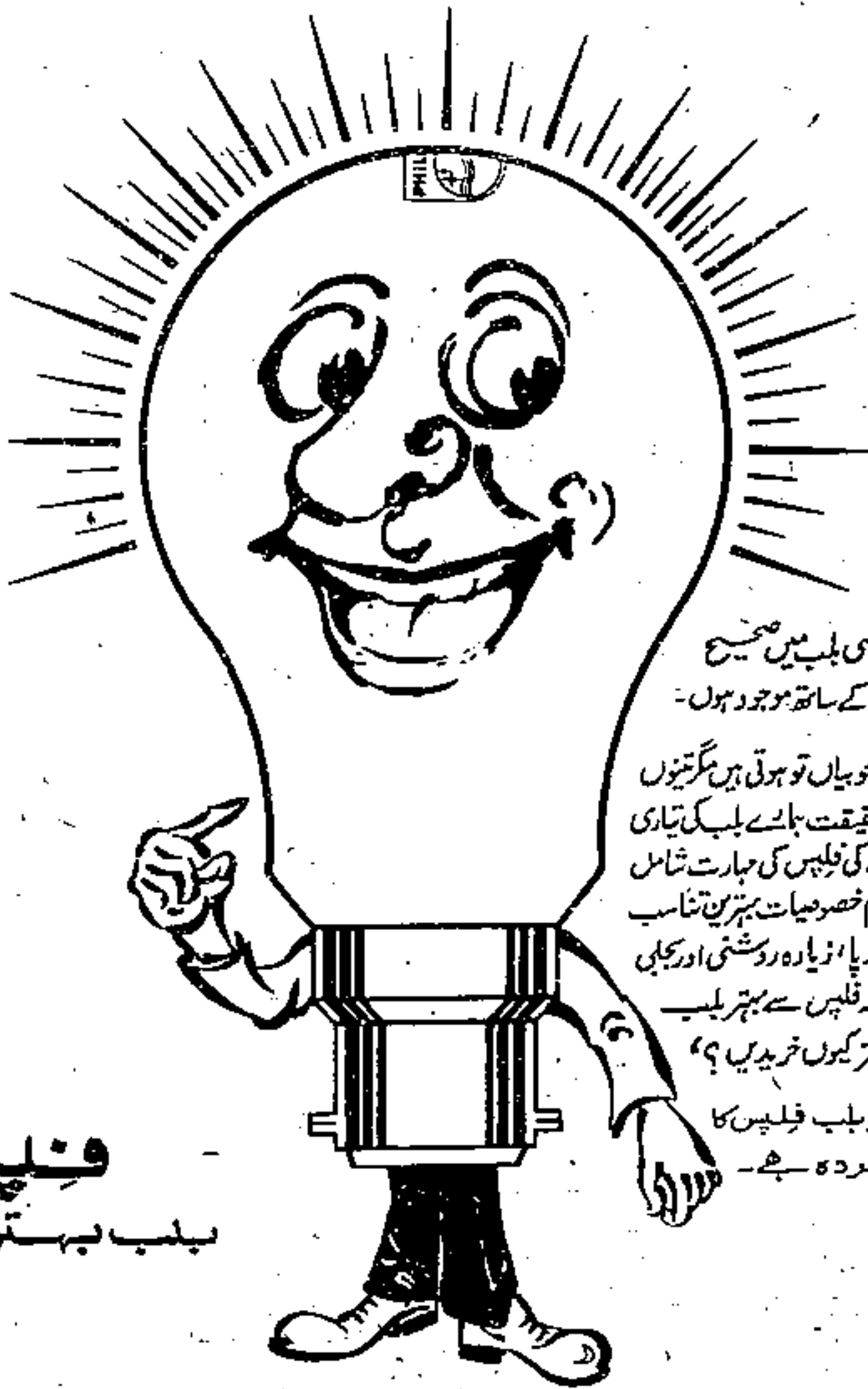
کی بیماری کے آثار باقی نہ رہے۔ میں یہ دیکھ کر خاصا خوفزدہ ہوا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میری پریشانی اور گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے وہ شخص بولا عبدالقادر! میں دین ہوں شاید تم مجھے پہچان نہیں سکے میری حالت بہت خراب ہو چکی تھی مگر آپ کی وجہ سے مجھے نئی زندگی میسر آگئی ہے۔ اتنا واقعہ سنانے کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا کہنا ہے کہ میں اس شخص کو چھوڑ کر ایک جامع مسجد میں آگیا تو وہاں ایک اور شخص مجھے ملا جس نے مجھے جوتی لاکر دی اور انتہائی عاجزی سے بولا "میرے سردار محی الدین" پھر تھوڑی دیر بعد جب میں نماز سے فارغ ہوا تو لوگ عقیدت و احترام کے جذبے سے میری جانب بڑھنے لگے وہ میرے ہاتھ چومتے اور بلند آوازیں کہتے اے محی الدین تم پر سلامتی ہو۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کا کہنا ہے کہ اس واقعہ سے قبل کسی نے مجھے محی الدین کے نام سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ شیخؒ ہزاروں افراد کی مجلس میں موجود تھے اس وقت شیخ علی بن الہیتی بھی ان کے قریب ہی چبوترے کے نیچے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ شیخ صاحبؒ چند لمحے خاموشی سے حاضرین مجلس کی باتیں سنتے رہے اور پھر اچانک انہیں خاموش رہنے کی ہدایت فرمادی جس پر ساری مجلس میں سناٹا چھاگیا۔ اس کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانی چبوترے سے نیچے اترے اور شیخ علی بن الہیتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ اس کے چند ہی لمحوں بعد شیخ علی بن الہیتی نیند سے بیدار ہوگئے۔ عبدالقادر جیلانیؒ نے ان سے دریافت کیا کیا تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے "ہاں دیکھا ہے" شیخ الہیتی نے جواب دیا اس پر شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا بس اسی لیے میں تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ شیخ نے پھر دریافت کیا تم سے حضور نے کیا ارشاد فرمایا۔ شیخ الہیتی نے کہا کہ مجھے آپ کی خدمت کا موقع دیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد جب شیخ علی بن الہیتی کے معتقدین نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے شیخ عبدالقادر کی اس قدر تعظیم کیوں کی تب انہوں نے فرمایا کہ میں نے جو کچھ خواب میں دیکھا تھا عبدالقادر نے وہی کچھ عالم بیداری میں دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس روز مجلس میں موجود سات آدمی وجد کی حالت میں اللہ کو پیارے ہوگئے اس کے علاوہ کئی افراد کو غشی کی کیفیت میں ان کے گھروں تک پہنچایا گیا مگر وہ بھی جانبر نہ ہو سکے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ حضرت غوث اعظم کی بے باکی اور حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ اس دور کے سلاطین اور امرا کے ایوانوں میں زلزلہ آجاتا تھا۔ آپ کی پاک ذات اور شخصیت کا وقت کے حاکم بھی احترام کرتے تھے کوئی طبقہ، جماعت یا گروہ ایسا نہ تھا جو کہ آپ کے دائرہ اصلاح سے باہر ہو۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ معروف کا حکم دیتے تھے اور منکر سے روکتے تھے۔ وزراء، قاضیوں، خلفاء اور عوام الغرض کہ سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ کام بھری مجلسوں میں اور بر سر منبر ہوتا تھا۔ اگر کوئی خلیفہ کسی ظالم کو حاکم بناتا آپ اس پر نکیر کرتے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت آپ کو حق گوئی سے نہیں روک سکتی تھی۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ المقتفی لامر اللہ نے ابن مرجم الظالم کو بغداد کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ اس فیصلے سے رعایا میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ اس واقعہ کے بارے میں جب امام غوث اعظمؒ کو معلوم ہوا تو انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر خلیفہ وقت کو کچھ یوں مخاطب کیا۔

"تم نے ایک ایسے شخص کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا ہے جو سخت ظالم ہے مگر سوچو کہ جب تم اپنے خدا کے دربار میں پیش ہوگے تو کیا جواب دوگے۔"

کہا جاتا ہے کہ عبدالقادر جیلانی کے یہ الفاظ سن کر خلیفہ وقت کانپ اٹھا اور اس قدر اشکبار ہوا کہ اس کا دامن تر ہوگیا اور اسی وقت ابن مرجم الظالم کو قاضی کے عہدے سے برطرف کر دیا۔

حضرت غوث اعظم ہر قسم کے دنیاوی لالچ سے بے نیاز تھے۔ خلفائے بنو عباس و امرائے سلطنت کو آپ حلقہ بگوش کا شرف حاصل تھا فیاضی کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ نے تجارت کا پیشہ بھی اپنا رکھا تھا اور اس سے جو لاکھوں روپے آتے تھے اس سے اللہ کے غریب بندوں کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ حضرت غوث اعظم کے ایک جلیل القدر معاصر حضرت شیخ معمر جرادہؒ فرماتے ہیں ——— کہ شیخ عبدالقادر جیسا خلیق فراخ دل، پابند عہد باوفا اور بامروت انسان میری نظروں سے نہیں گزرا۔ وہ اپنی عظمت روحانی و فضیلت علمی کے باوجود بہت ہی متواضع تھے۔ جو عمر میں بڑے ہوتے اُن کی عزت کرتے اور چھوٹوں سے شفقت فرماتے اور ان سے عجز و انکساری کے ساتھ پیش آتے تھے لیکن بادشاہوں، وزیروں اور وقت حاکم کی تعظیم کے لیے آپ کبھی نہ اٹھے اور نہ کبھی کسی سلطان کے دروازے پر تشریف لے گئے۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ غریبوں، مسکینوں اور بے آسرا لوگوں میں بیٹھ کر مجھے بے پناہ مسرت ہوتی ہے۔ امیروں کی ہم نشینی کی آرزو ہر شخص کو ہوتی ہے مگر ان غریبوں کی محبت کسے نصیب ہوتی ہے۔ ایک شخص انتہائی خستہ حالی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے دریافت کرنے پر اس ملول شخص نے کہا "آج میں دریا کے کنارے گیا

ملاح سے کہا کہ وہ مجھے کشتی میں بٹھا کر دُوسرے کنارے تک پہنچا دے لیکن اُس نے میری درخواست ماننے سے انکار کر دیا۔ ابھی اُس شخص نے اپنی بات مکمل نہیں کی تھی کہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تیس دینار بطور ہدیہ پیش کیے۔ آپ نے فوراً وہ تیس دینار لے کر اس مفلس شخص کو دیتے ہُوئے کہا اب اس ملاح کے پاس جا اور اسے کہہ دے کہ آئندہ کبھی کسی فقیر کا سوال رَد نہ کرنا۔ پھر شیخؒ نے اپنی قمیص بھی اتار کر اس شخص کی نذر کر دی۔ وہ شخص جب اسے لے جانے میں تامل ہوا تو اُس سے پھر بیس دینار دے کر خرید لی۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی بہت رقیق القلب، خدا ترس اور مجیب الدعوات تھے۔ آپ کے مکارم اخلاق عیاں تھے، بُرائی سے دُور رہتے۔ مقبول بارگاہِ الٰہی تھے۔ کسی شخص کو تکلیف اور دُکھ میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دُوسروں کی راحت کے لیے خود کو تکلیف میں مبتلا کر کے بھی فرحت محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ آپ حج پر روانہ ہوتے۔ راستہ میں حلہ نامی ایک قصبے میں قیام فرمایا جہاں مفلسی کے اعتبار سے ایک بُوڑھا شخص کچھ زیادہ ہی ابتر حالت میں تھا۔ آپ سیدھے اُس کے مکان پر تشریف لے گئے جو کہ ایک خستہ حال کٹیا تھی جس کی دیواریں گر چکی تھیں اور پردے کے لیے بوسیدہ چادریں لٹکی ہوتی تھیں۔ اس جھونپڑی میں تین افراد پر مشتمل کنبہ رہتا تھا۔ یعنی ایک بُوڑھا خود تھا دوسری اس کی بیوی اور تیسری اُن کی بیٹی تھی۔ آپ نے صاحبِ خانہ سے مکان میں رہنے کی اجازت طلب فرمائی۔ جیسا کہ روایت ہے کہ عرب لوگ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں بھی مہمانوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں۔ بُوڑھے نے بھی اہلاً وسہلاً کہا اور یوں شیخؒ اُن کے کٹیا نما مکان میں ٹھہر گئے۔ اُدھر اسی دوران تمام علاقے میں آپ کی آمد کی خبر پھیل گئی اور تمام اہلِ علاقہ تحائف وغیرہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ کئی امیر لوگوں نے آپ کو اپنے ہاں چلنے کی دعوت دی لیکن آپ نے معذرت ظاہر کی لیکن انہوں نے سونا چاندی، مویشی اور غلہ وغیرہ کی صورت میں جو نذرانے آپ کو پیش کیے آپ نے وہ سب اپنے میزبان کی نذر کر دیئے۔ پھر اس سے اگلی رات آپ مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ چند ہی برسوں میں وہ بُوڑھا شخص اپنے علاقے کا امیر کبیر اور اہلِ ثروت شخص بن کر سامنے آیا۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ظاہری علوم وفنون کے ہر شعبہ میں کامل تھے مگر اللہ نے ان کو علم وعرفان میں وہ درجہ عطا فرمایا تھا جو کہ کاملوں میں کم کو عطا ہوتا ہے۔ وہ سراپا ایمان ویقین تھے۔ وہ صرف حال سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے گفتار ورفتار سے لوگوں کے دلوں میں عظیم انقلاب برپا ہوتا تھا۔ وہ اسلام کے داعیٔ اکبر تھے۔ سلفی المذہب تھے۔ فقہ حنبلی کے پیرو اور شارح تھے۔ غنیۃ الطالبین فقہ حنبلی پر حضرت کی مشہور کتاب ہے۔ کتاب وسنت محمدی حضرت کے دین مذہب، فکر ونظر، وعظ وارشاد کا مرکز ومحور ہے۔ حضرت کا طریقۂ احسان بھی تمام تر کتاب وسنت وتعلیماتِ نبویؐ پر مبنی ہے جس میں فلسفہ وکلام اور وحدت الوجود کی بحثوں کو مطلق دخل نہیں ہے۔ حضرت کا اصل کمال سوز ویقین حضور وشہود اور سنت وملتِ محمدی سے والہانہ عشق وشیفتگی، دل سوزی اور خلق اللہ کے لیے بے پناہ محبت وشفقت کا جذبہ ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی کا گھرانہ زاہدوں اور عابدوں پر مشتمل تھا۔ مشہور ہے کہ ایک بار جیلان میں سخت قحط پڑا۔ لوگوں نے بارانِ رحمت کے لیے نمازِ استسقا ادا کی مگر اس کے باوجود خدا کی رحمت جوش میں نہ آئی۔ جیلان کے مشائخ اور علمائے کرام شیخ عبدالقادر جیلانی کی پھوپھی کے گھر تشریف لے گئے اور اُن سے بارش کی دُعا کرنے کو کہا۔ انہوں نے فوراً صحن میں جھاڑو دی اور پھر فلک کی طرف مُنہ اُٹھا کر کہا "اے میرے رب جھاڑو میں نے دی ہے رحمت کے موتی تُو برسا دے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی لمحے اس زور کی بارش ہوئی کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ ایک بار لوگوں نے شیخؒ سے دریافت کیا کہ انہیں اس بات کا کب احساس ہوا کہ وہ ولی ہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا "میں دس سال کی عمر میں جب گھر سے مکتب جایا کرتا تھا تو میرے استاد میرے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے" ولی کے لیے جگہ فراخ کر دو تاکہ وہ اس پر بیٹھ سکے۔" پھر ایک روز کوئی اجنبی شخص آیا جسے میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میں نے فرشتوں سے سُنا ہے عنقریب اس لڑکے کی بڑی شان ہو گی۔ یہ دیا جائے گا روکا نہیں جائے گا۔ یہ محجوب نہیں ہو گا اور اس سے مکر نہیں کیا جائے گا۔ پھر میں نے اس شخص کو چالیس سال بعد پہچانا۔ وہ ابدالوں میں سے ایک تھا جبکہ میں اُس وقت کمسن تھا۔ جب میں محلے کے دُوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا قصد کرتا تو کوئی غیبی آواز قریب سے پکار کر مجھے کہتی" ہمارے پاس آؤ" یہ آواز صرف مجھے سنائی دیتی تھی اور میں ڈر کر ماں کی اوڑھنی میں پناہ لے لیا کرتا تھا۔ آج بھی میں تنہائی کے عالم میں وہ آواز سُنتا ہوں۔ آج بھی کوئی کہتا ہے ہمارے پاس آؤ۔ پھر جوانی میں بھی مجھے اس آواز کی بازگشت سنائی دیتی تھی مگر آواز دینے والا میری نگاہوں سے پنہاں ہی رہتا تھا۔ مجاہدے کے دِنوں میں جب مجھ پر غنودگی طاری ہوتی تھی تو کوئی مجھ سے کہتا "عبدالقادر ہم نے تمہیں سونے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ بے شک ہم اس وقت بھی تمہارے دوست تھے جب تم کچھ بھی نہ تھے اور اگر تم اب کچھ ہو گئے ہو تو کہیں ہم سے

غافل نہ ہو جانا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا دل بے حد گداز تھا۔ آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑتے تھے۔ وہ اللہ سے ڈرنے والے اور اس کا خوف و خشیت رکھنے والے تھے اور ان کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ دریائے دجلہ میں بہت زبردست سیلاب آیا اور پانی دریا کے کناروں سے اُچھل کر بغداد کی جانب بہنے لگا۔ اہلِ بغداد گھبرا اُٹھے اور سیدنا غوثِ اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کے لیے التجا کی۔ حضرت غوثِ اعظم نے اسی وقت اپنا عصا لیا اور لوگوں کے ہمراہ چل پڑے۔ دریا کے کنارے پہنچ کر انہوں نے اپنا عصائے مبارک وہاں گاڑ دیا اور فرمایا بس یہیں رُک جاؤ۔ اس کے ساتھ ہی طغیانی تھم گئی اور سیلاب کا پانی اُترنا شروع ہو گیا اور دریا کا بہاؤ معمول پر آ گیا۔

سیدنا غوثِ اعظمؒ کی تعلیمات، کرامات اور عادات و خصائل کی جھلک آج تک کسی اور ولی اللہ میں نہیں ملی۔ وہ سچ مچ پیروں کے پیر اور اولیاؤں کے اولیا تھے۔ غالباً یہ چھٹی صدی ہجری کے آخر کی بات ہے کہ ایک روز شیخ صدقہ بغدادی اچانک پکار پکار کر کہنے لگے۔ ایسا کوئی نہیں ہے جو مجھ جیسا ہے۔ یہ بات کسی نہ کسی طرح خلیفہ وقت تک پہنچ گئی۔ جن کے حکم پر شرعی حد کے مطابق سزائے موت سُنا دی گئی لیکن ابھی جلاد نے اُن کا سر قلم کرنے کے لیے تلوار سونتی ہی تھی کہ اُس کا بازو شل ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے خلیفہ پر سخت ہیبت طاری ہوئی اور اُس نے فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے معافی طلب کی اور ان کی رہائی کا فی الفور حکم صادر کیا مگر شیخ صدقہ کو اس سزا یا رہائی سے کسی قسم کی خوشی یا خوف محسوس نہ ہوا۔ وہ قید خانے سے نکل کر ایک بار پھر بغداد کے گلی کوچوں میں نکل آئے۔ یہاں انہوں نے ایک عجیب منظر یہ دیکھا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایک مدرسے کی طرف رواں دواں ہیں۔ شیخ صدقہ بھی ہجوم میں شامل ہو گئے۔ وہ ابھی تک وطیرہ حیرت میں پڑے ہوتے تھے اور بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ ایسا کوئی نہیں جو مجھ جیسا ہو میرا کوئی ہم پلہ نہیں ہے مگر جب وہ اس مدرسے کے صحن میں داخل ہوتے تو انہیں ہوش آ گیا اور اب وہ اس حیرت میں تھے کہ یہ کونسی جگہ ہے اور یہاں اس قدر لوگ کیوں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ہر طرف تسبیح و تہلیل اور درود و سلام کی بازگشت گونج رہی تھی پھر یکایک حاضرینِ مجلس پر ایک ہیبت ناک قسم کی خاموشی سی طاری ہو گئی۔ شیخ صدقہ بغدادی نے دیکھا کہ مدرسے کے حُجرے سے ایک دُبلے پتلے بزرگ برآمد ہوتے ہیں۔ اُن کا قد درمیانہ رنگ گندمی داڑھی لمبی اور سینہ خاصا فراخ تھا۔ ان بزرگ کو دیکھتے ہی وہاں پر موجود سینکڑوں افراد نے اپنے دامن چاک کر ڈالے۔ یہ منظر شیخ صدقہ کے لیے یقیناً بہت عجیب و غریب تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر حیرت میں ڈوبے جا رہے تھے کہ ان بزرگ نے نہ کوئی کلام کیا نہ قاری کو قرأت کا حکم دیا پھر لوگوں پر یہ ردِ عمل کیونکر ہوا مگر اُسی لمحے اس بزرگ نے شیخ صدقہ بغدادی کو ایک نظر دیکھ کر رعب دار آواز میں کہا "میرا ایک مرید صرف ایک قدم میں بیت المقدس سے یہاں آ گیا ہے۔ اس نے میرے ہاتھ پر توبہ کی ہے۔ یہ گریبان چاکی دراصل اُسی کی ضیافت ہے۔ شیخ بغدادی نے دل میں خیال کیا کہ جو شخص ایک ہی قدم میں بیت المقدس سے بغداد پہنچ جاتے وہ اس بات سے توبہ کرتا ہے۔ اس مقام اور مرتبے پر پہنچنے کے بعد اُسے بھلا کسی پیر کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے مگر اسی دوران بزرگ نے ایک بار پھر باآواز بلند کہا جو شخص وقت کی لگام کھینچنے پر قادر رہنے کے باوجود مجھ سے رجوع نہ کرے وہ اس امر کا محتاج ہوتا ہے کہ میں اُسے خدا کی محبت کا راستہ دکھاؤں۔ بزرگ عالمِ جلال میں منبر پر کھڑے ہو کر بولتے چلے گئے۔ میری تلوار مشہور ہے میری کمان چلّے پر اور میرا تیر کمان پر چڑھا ہوا ہے۔ میرا نیزہ صائب اور میرا نیزہ بے خطا ہے۔ میرا گھوڑا زین کسا ہے اور میں خدا کی روشن آگ ہوں۔ میں وہ بحر ہوں جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ میں صبر میں رہ کر بھی کلام کرنے والا ہوں۔ میں محفوظ ہوں اور ملحوظ ہوں پہاڑوں کے رہنے والے لوگو تمہارے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ گرجا والو تمہارے گرجا گھر گئے تم خدا کی طرف آؤ میں خدا کے احکامات میں سے ایک ہوں مجھ سے ایک دن اور ایک رات میں ستر مرتبہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے تجھے اپنے لیے پسند کیا تاکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے پرورش پائے۔ کہا جاتا ہے کہ بزرگ کا خطاب سُن کر شیخ صدقہ بغدادی دیوانوں کی مانند ہجوم کو چیرتے ہوتے منبر تک پہنچے اور بزرگ کے قدموں پر سر رکھتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ یہ نیک بزرگ شیخ عبدالقادر جیلانی ہی تھے جن کے جمال و جلال کے سامنے کوئی دوسرا ولی اللہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ آپ کی ہیبت و جلال کا یہ عالم تھا کہ مجالس میں ہزاروں افراد کی موجودگی کے باوجود وہاں کسی کے سانس لینے کی آواز نہیں آتی تھی۔ دورانِ وعظ کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے بھی ہل جاتے یا کوئی سرگوشی کرے البتہ وعظ کی اثر انگیزی سے اگر کوئی شخص آہ و زاری کرتا یا وجد و حال کی کیفیت میں آ جاتا تو وہ الگ بات تھی۔ اگر آپ کا نامہ مبارک کسی خلیفہ کے پاس آتا تو وہ اُسے چوم کر آنکھوں سے لگاتا اور آپ کی تحریر پر پورا پورا عمل کرتا۔ نہ صرف مکتوبات میں بلکہ آپ خلفا کی غلط حرکات پر بھی انہیں سختی سے ٹوکتے اور منع فرماتے تھے لیکن آپ کی بے مثال قبولیتِ عامہ کی وجہ سے کسی خلیفہ کی مجال نہ تھی کہ آپ پر ٹیڑھی نگاہ ڈالے۔ بڑے بڑے سلاطین اور امرا آپ کی مجالس میں حاضر ہوتے اور انتہائی ادب سے دو زانو ہو کر آپ کے سامنے بیٹھتے۔ آپ بسا اوقات انہیں سخت الفاظ میں نصیحت بھی فرماتے جسے وہ نہایت ادب

Treet I
PLATINUM
Single Fixed Head Disposable Razor
Ideal for soft, delicate skin.
Many more smooth, safer shaves
than any ordinary double-edge blade.
Treet II
PLATINUM
Twin Fixed Head Disposable Razor
Twin-blade set at prefixed angle for
closer, smoother, safer shaves.
Treet II
PLATINUM
Twin Fixed Head Cartridge
Fits all fixed head razors.
Treet II
PLATINUM
TWIN FIXED HEAD
5
The price yet another plus

خاموشی اور توجہ سے سنتے تھے۔

شیخ عمر بزاز کا بیان ہے کہ ایک روز میں عبدالقادر جیلانیؒ کی معیت میں نمازِ جمعہ کی غرض سے جا رہا تھا کہ راستے میں کسی شخص نے آپ کو سلام
کیا حالانکہ اس کے برعکس پہلے آپ جس گلی کوچے سے بھی گزرتے تھے ہجوم آپ کی زیارت کے لیے اُمڈے چلے آتے تھے۔ میں بہت حیرت میں تھا کہ آخ
کیا ہے۔ ابھی میں دل کی بات زبان پر بھی نہ لایا تھا کہ شیخؒ نے میری طرف دیکھ کر تبسم فرمایا جس کے ساتھ ہی ہر سمت سے لوگ سلام و زیارت کے لیے
پھر عبدالقادر جیلانیؒ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا کیوں بزاز تیری یہی خواہش تھی۔ تمہیں شاید یہ علم نہیں کہ بفضلِ خدا لوگوں کے دل میری مٹھی میں ہیں ا
چاہوں انہیں اپنی طرف پھیر لوں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا کہنا ہے کہ میں دینی علوم کی تکمیل کے بعد تیس برس تک عراق کے جنگلوں، بیابانوں میں گھوم
رہا۔ نہ مخلوق مجھے جانتی تھی نہ میں مخلوق کو جانتا تھا۔ میرے پاس جن اور بھوت پریت وغیرہ آیا کرتے تھے۔ میں انہیں اللہ کا کلام پڑھایا کرتا تھا۔ کبھی
شیطان بھی میرے پاس آتا تھا اور مجھے دھمکی دیتا تھا کہ اگر میں یہاں سے نہ گیا تو وہ میرا بہت بُرا حشر کرے گا مگر جب میں اُسے طمانچہ مارتا تو وہ بھ
جاتا۔ پھر میں لاحول پڑھتا تو وہ جل جاتا۔ ایک مرتبہ تو شیطان انتہائی خوفناک صورت کے ساتھ میرے سامنے آیا۔ اُس کی بُو ہزاروں میل تک پھیلی
تھی۔ پھر وہ انتہائی مکاری سے کہنے لگا "میں تمہارے قدموں میں رہ کر تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تم نے میری ذرّیت کو تھکا مارا ہے۔" میں
سختی کے ساتھ وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا مگر اُس نے انکار کر دیا پھر اُسی لمحے کوئی غیبی ہاتھ ابلیس کے اُوپر آن کر پڑا اور وہ وہیں زمین میں دھنستا چ

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ ایک روز صبر و استقامت اور ایثار کے موضوع پر حاضرینِ مجلس کو درس دے رہے تھے کہ اچانک خاموشی اختیار کر لی
حیرت میں پڑ گئے کہ الٰہی ماجرا کیا ہے پھر اگلے ہی لمحے آپ نے آسمان کی جانب انگلی اُٹھائی اور حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوتے فرمایا "صرف سو دینار
ہیں۔" آپ کا ارشاد سُننا تھا کہ بے شمار لوگ سو سو دیناروں کی تھیلیاں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے مگر آپ نے صرف ایک شخص سے سو د
لیے اور ایک خادم کو حکم دیا کہ یہ رقم لے کر مقبرہ سونیزہ پر جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک بوڑھا شخص بربط بجاتا ہوا نظر آئے گا اسے یہ دینار دے کر واپس چلے آ
آپ کا حکم بجا لایا اور فوراً مقبرہ سونیزہ پر پہنچ گیا جہاں سچ مچ ایک بوڑھا بربط بجا رہا تھا۔ خادم نے سو دینار اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے مگر بوڑھا ایک
چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ جب دوبارہ ہوش میں آیا تو خادم نے اُسے بتایا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے تجھے یاد فرمایا ہے۔ بوڑھا فوراً اس کے ساتھ
جب دونوں حضرت عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے بوڑھے سے فرمایا کہ وہ اپنا قصہ بیان کرے۔ بوڑھا بولا "اے حضرت
عالمِ شباب میں نہایت عمدہ گایا بجایا کرتا تھا۔ مجھے بربط نوازی پر کمال حاصل تھا۔ لوگ میری آواز کے شیدائی تھے مگر جب میں بڑھاپے کی دہلیز پر
ہوا تو میری مقبولیت میں کمی آ گئی۔ میں نے دل شکستہ ہو کر فیصلہ کیا کہ اب صرف مُردہ لوگوں کو اپنا گانا سنایا کروں گا۔ اسی لیے میں نے شہرِ خموشاں پر
اختیار کر لی اور وہیں پر گانے بجانے لگا۔ ایک روز میں حسبِ معمول وہاں پر گانے میں مصروف تھا کہ اچانک ایک قبر سے آواز آئی "اے شخص تو کب
ہوتے لوگوں کو اپنا نغمہ سناتا رہے گا اب تو اپنے اللہ کی جانب رجوع کر۔" یہ سُن کر میرے اوپر سخت خوف اور لرزہ طاری ہو گیا اور میں عالمِ بے خو
اس قسم کے اشعار پڑھنے لگا "اے میرے رب میرے پاس یومِ حشر کے لیے کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ میرے دل میں تیری رحمت
امید ہو۔ میرا بڑھاپا روزِ محشر تیری بارگاہ میں میری شفاعت کرے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ تو اس پر نظر کر کے مجھے اپنے دامنِ رحمت میں جگہ عطا ف
یہ واقعہ سنانے کے بعد وہ بوڑھا حضرت عبدالقادر جیلانی سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ "حضور یہ اشعار میری زبان پر تھے کہ آپ کے خادم نے آ کر میری
سو دینار رکھ دیئے۔ اب میں گانے بجانے سے توبہ کرتا ہوں اور اپنے خدا کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنا بربط اسی وقت توڑ پھو

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ماہ ربیع الثانی ۵۶۱ھ کے اوائل میں سخت علیل ہو گئے۔ دراسی کیفیت میں غالباً ۹ ربیع الآخر کو نوے سال سات ماہ کی
حقیقی سے جا ملے۔ برصغیر پاک و ہند میں ان کا عرس ہر سال گیارہ اور سترہ ربیع الآخر کو منعقد کیا جاتا ہے۔ دورانِ علالت جب آپ کے صاحبزادے
وصیت فرمانے کو کہا تو آپ نے فرمایا خدا کے علاوہ کسی سے امید نہ رکھنا اللہ سے ڈرتے رہنا، اس کی عبادت کو شعار بنانا، توحید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا
اللہ کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرنا۔ ایک روایت کے مطابق بیٹے کو وصیت فرمانے کے بعد آپ حالتِ علالت میں کھڑے ہو گئے اور حاضرینِ مجلس
ہٹنے ہوئے بولے "کھڑے ہو جاؤ جگہ دو اور آداب بجا لاؤ کیونکہ رحمتِ الٰہی کا نزول ہو رہا ہے اس کے چند لمحات بعد انہوں نے حاضرین کو
السلام و رحمتہ اللہ کہا اور پھر اپنی جگہ بیٹھ کر آہستہ آہستہ آنکھیں بند کر لیں جس کے ساتھ ہی آفتابِ طریقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

رابعہ بصری

مذہبی زندگی کے کمال کی مثالیں اولیاءِ کرام ہی کے نفوسِ قدسیہ میں ملتی ہیں۔ شخصیت کی نشوونما میں جتنا دخل ان شخصیات کے اثر و نفوذ کو ہے اور کسی چیز کو نہیں۔ اولیاء کرام کے حالات کا مطالعہ ہی پسندیدہ سیرت پیدا کرنے میں مؤثر ہے۔ اولیاءِ کرام بلاشبہ نہ صرف صاحبِ کرامت ہوتے ہیں بلکہ صاحبِ علم و عمل بھی ہوتے ہیں۔ تقویٰ اور طہارت کی سعادت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک شریعت کی حدود سے تجاوز کرنا کفر اور خدا کی محبت میں جان دینا عین اسلام ہوتا ہے۔ ان ہی اوصاف کی بدولت مخلوقِ خدا ان کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ خداوندِ عالم اپنے ان نیک بندوں میں بلا کی جاذبیت اور دل کشی اور کشش پیدا کر دیتا ہے۔ غرضیکہ اولیاءِ کرام کی ذات و برکات اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

یہی وہ پاک نفوس ہیں جنہیں اللہ کی راہ میں فنا ہو کر بقا ملتی ہے۔ یہ مشعلِ نور ہیں، سوز و سازِ عشق و محبت، خلوص و اخلاص اور صفا، لطف و عطا کا پیکر ہوتے ہیں۔ تحمل اور توکل و قناعت اُن کی دولت ہوتی ہے۔ نامساعد حالات میں رہ کر بھی تسلیم رضا اور شکر بجالانا اُن کا شیوہ ہوتا ہے۔ آزمائشوں اور امتحانِ خداوندی میں استقامت اور ثابت قدمی اُنہی کو عطا ہوتی ہے۔ یہ ہر کس و ناکس کے مقدر کی بات نہیں۔

غالباً یہ واقعہ ۹۷ ہجری کا ہے کہ ایک بزرگِ خدا کے گھر اللہ تعالیٰ نے بیٹی پیدا کی۔ اندھیری یخ بستہ رات، چراغ تیل سے خالی، گھر میں ضروریات کی اشیاء ناپید اور عنقا۔ غرض کہ گھر ہر لحاظ سے خالی لیکن دلِ یقین، توکل سے مالا مال تھا جس کی وجہ سے بندۂ خدا بالکل آزردہ خاطر نہ ہوا۔ نہ اُس نے کسی کے آگے دستِ سوال دراز کیا۔ نہ زبان پر حرفِ شکایت لایا۔ خالق کی رضا پر شاکر ہو کر اس نے بارگاہِ خداوندی میں اپنا سر سجدہ میں رکھ کر ثابت قدمی اور حوصلہ کی دُعا کی۔ اسی دم عالمِ غنودگی میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سرفراز ہوا۔ حضورؐ نے اس کو یہ نوید سُنائی کہ تیری یہ بیٹی اندھیروں میں روشن چراغ ہے۔ تو جا اور حاکمِ وقت کو ہمارا پیغام دے کہ تُو نے اپنے معمولات کے مطابق آج ہم پر درود نہیں بھیجا۔ لہٰذا کفارہ کے طور پر وہ تمہیں

چار سو درہم دے دے اور تو اس سے اپنی ضروریات پوری کرے۔
عالمِ بیداری پر اس مردِ بزرگ کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اُس کو اپنی پریشانیوں اور تیرہ بختیوں اور تنگ دستیوں کا صلہ اُس کی توقع سے بڑھ کر ملا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ چار سو درہم عالمِ کسمپرسی میں مل جانا گراں بہا خزانہ سے کم نہ تھا۔ اسی دم اُس نے حاکمِ وقت کو پیغامِ رسالت مآبؐ جا پہنچایا۔ حاکم اپنی کوتاہی پہ گھبرایا اور سجدۂ شکر بجالایا کہ محسنِ انسانیت نے اُس ناچیز کو یاد کیا۔ اور ساتھ ہی پیغام رساں کا بھی مشکور ہوا اور اُس کو حسبِ حکم چار سو درہم ادا کئے پریشان حال شخص آسودہ خاطر ہوکر گھر لوٹا اور زچہ و بچہ کی ضروریات کو پورا کیا۔ اُس کو اپنی بچی کی خوش قسمتی پر ناز تھا اور یہ خوش بخت وہ قلندرہ تھیں جن کو زمانہ رابعہ بصریؒ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ وہ بزرگ تھیں جن کی زیارت کو کعبہ خود چل کر آیا۔

حضرت رابعہ بصریؒ کو وہ مقام ولایت حاصل ہوا جس پر بڑے بڑے ولی رشک کرتے تھے۔ آپ کا خدا پر اتنا یقین تھا کہ آپ نے کبھی کسی ضرورت کے لیے غیر اللہ کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ ایک مرتبہ آپ کئی روز سے فاقہ سے تھیں آپ کی کن نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر کہیں سے پیاز میسّر ہو جائے تو وہ آپ کے لیے سالن تیار کر دے۔ اس توکل پر کہ خدا پیاز کی دستیابی کے اسباب ضرور پیدا فرمائے گا اس نے ہانڈی چولہے پر چڑھا دی اسی انتظار میں ایک پرندہ اپنی چونچ میں کہیں سے پیاز لے کر آیا اور ہنڈیا میں ڈال دیا۔ کنیز کے مطلع کرنے پر آپ نے وہ سالن کھانے سے انکار کر دیا کیونکہ اس طرح پیاز کا آنا شیطانی ف بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ خدا کو پیاز دینا ہوتی تو وہ اُس کے اسباب پیدا کر سکتا تھا۔ اُس کے بعد انھوں نے آخری سانس تک پیاز استعمال نہ کی۔

توکل اور تسلیم و رضا خاصۂ اولیاء کرام ہوتا ہے۔ آپ کے پاس ایک دفعہ دو درویش تشریف لائے اور کھانے کے لیے رو طلب کی۔ اس وقت گھر میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ آپ نے دونوں روٹیاں دسترخوان پر رکھوادیں۔ اسی وقت دروازے پر ایک ف آگیا حضرت رابعہؒ نے اس فقیر کو زیادہ مستحق جانا اور روٹیاں اُس کو دے دیں۔ اور مہمانوں کے ساتھ خود روٹیوں کی خدا کی طرف سے کا انتظار کرنے لگیں۔ مہمان درویش کے تقاضے کے جواب میں فرمایا کہ خدا کا وعدہ ایفا ہونے میں بالکل دیر نہیں لگتی۔ اسی وقت ا کنیز اٹھارہ روٹیاں لے کر آئی۔ آپ نے اُس سے فرمایا کہ یہ خوان ہمارے لیے نہیں ہے اس کو واپس لے جاؤ۔ کنیز نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ خوان آپ کے لیے ہے لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا کہ یہ ہمارے لیے نہیں ہے واپس لے جاؤ اور جس کے ہے اس تک پہنچاؤ۔ کنیز اصرار کرتی رہی اور درویش بھی بضد تھے کہ اس خوان کو قبول کر لینا چاہیے مگر اُس ولیہ نے ایسا کرنے سے کر دیا۔ کنیز واپس گئی اور مالکہ سے تمام قصہ کہہ سنایا۔ مالکہ واقعی شرمندہ ہوئی اور کہا کہ رابعہ نے بالکل درست کہا ہے اور اُس خوان میں دو روٹیوں کا اضافہ کر کے دوبارہ اُن کی خدمت میں بھیجا۔ اِس مرتبہ شمار کرنے پر رابعہ بصریؒ نے خوان قبول کیا ا کہ یہ واقعی ہمارے لیے ہے۔ آپ کو اس بات پر یقینِ کامل تھا کہ خدا تعالیٰ ایک کے بدلے دس دینے کا وعدہ ضرور پورا کر آپ نے دو روٹیاں سائل کو دی تھیں لہٰذا اللہ نے جب تک بیس روٹیاں نہ دیں آپ نے اس خوان کو منظور نہ کیا۔ یہ یقی کامل ایمان کی دولت خدا اُن کو ہی عطا کرتا ہے جو اُس کے مقرب و محبوب بندے ہوتے ہیں۔

حضرت رابعہ بصریؒ کو اللہ نے بڑے بڑے بلند مرتبے عطا فرمائے ہیں۔ آپ کو خدا سے اتنی محبت اور عشق تھا کہ ہر آز انھوں نے خندہ روئی سے قبول کیا۔ زمانۂ طفولیت میں آپ کو ایک زر خرید لونڈی کی حیثیت سے زندگی گزارنی پڑی جس شخص کی ملکیت میں تھیں وہ بڑا شقی القلب انسان تھا وہ آپ کے مرتبہ اور مقام سے ناآشنا تھا۔ آپ سے اتنی مشقت کہ آپ کی کئی نمازیں قضا ہو جاتیں لیکن آپ حرفِ شکایت لب پر نہ لاتیں۔ ایک دن آپ کنویں سے پانی لا رہی تھیں اس آپ ایامِ جوانی میں داخل ہو چکی تھیں لیکن کنیز ہونے کی وجہ سے پردہ نہ کر سکتی تھیں اس لیے راستے میں ایک بدمعاش کے پیچھے لگ گیا۔ آپ نے رفتار تیز کر دی مگر وہ پھر بھی آپ کے سامنے آگیا۔ آپ اس خیال سے کہ غیر محرم کی نظر اُس

گئی ہے۔ آپ بے ہوش ہوگئیں۔ گرنے سے آپ کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ درد کی شدت سے آپ بے حال ہوگئیں مگر آپ نے اس کو خدا کی مرضی اور رضا سمجھا اور زبان پر ذرا برابر بھی شکوہ کے الفاظ نہ لائیں۔ اُس وقت آپ کو غیب سے آواز آئی کہ اے رابعہ نہیں وہ مقام عطا ہوگا جس پر ملائیکہ اور مقرب فرشتے سبھی تجھ پر رشک کریں گے۔ اس پر آپ کو وہ درد بھی پیارا لگنے لگا۔ آپ عالم وارفتگی میں بار بار ہاتھ کو چومنا شروع کر دیا۔ شکرانے کے طور پر آپ نے روزہ رکھا لیکن سفاک مالک کی مشقت جوں کی توں رہی۔

وہ اتنا ظالم آدمی تھا کہ وہ بجائے اس کے کہ رابعہؒ کے روزے کا کوئی خیال یا احترام کرتا، کام میں اس قدر مصروف رکھتا کہ ایک کام کے ختم ہوتے ہی دوسرا کام بتا دیتا۔ اتنی محنت اور مشقت کے باوجود رابعہ بصریؒ ساری رات یادِ خدا اور عباداتِ الٰہی میں گزارتیں۔ ایک رات مالک کسی کام سے اُٹھا اور اُس کی نظر اُس کوٹھڑی پر پڑی جس میں رابعہ کا قیام تھا۔ اُس نے دیکھا کہ رابعہؒ سر بسجود ہیں اور ایک معلق نور اُن کے سر پر فروزاں ہے اور رابعہ ہر طرف سے بے نیاز خشوع وخضوع کے ساتھ اپنے رب کی عبادت میں مصروف تھیں۔ آپ عرض کرتی جاتیں اور روتی جاتیں کہ میرے مولا اگر تو نے مجھے غیر کا محکوم نہ بنایا ہوتا تو میں اپنا دن بھی تیری عبادت میں گزارتی اور رات بھی۔ لیکن یہ مشقت وملازمت بھی تیری عنایت ہی ہے۔ اسی وجہ سے میں ہر ستم کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہوں۔

مالک نے یہ حالت دیکھی تو اُس کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ ساری رات جاگتا رہا اور اپنا چین وقرار کھو بیٹھا۔ صبح سویرے رابعہؒ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گزشتہ ایام اور سلوک کی معافی مانگنے لگا اور اُن کو آزاد کر دیا اور جہاں وہ چاہیں جانے کی اجازت دے دی اور التجا کی کہ اگر آپ میرے پاس رہیں تو میں ساری زندگی آپ کی خدمت میں گزار دوں گا مگر آپ نے اُسی وقت وہ کوٹھڑی چھوڑی اور جنگل کی طرف چل دیں اور اُس دن سے اُنھوں نے وہ ریاضت وعبادت کی جس کی مثال دینا ممکن نہیں۔ اسی عبادت اور مقام کی وجہ سے شیخ فریدالدین عطارؒ نے آپ کو مریم ثانی اور یکے از خاصانِ خدا کہا ہے۔ آپ کی خدمت میں بڑے بڑے ابرار اور اکابرین حاضری دیتے تھے۔ آپ ایک ہزار نفل روزانہ ادا کرتی تھیں۔ طویل ریاضت وعبادت کے بعد آپ نے حج کا ارادہ کیا اور خدا کے گھر میں حاضری دینا چاہی لیکن یہاں بھی خدا کو اُن کی آزمائش مقصود تھی۔ آغازِ سفر میں ہی اُن کا گدھا مر گیا۔ قافلہ والوں نے سواری ودیگر امداد کی پیش کش کی مگر آپ نے قبول نہ کی۔ آپ نے خدا کے آگے گریہ وزاری کی کہ اے رب العالمین میں کمزور ہوں، عورت ہوں اور تیرے دیدار کی پیاسی ہوں تو نے میری تشنگی میں اضافہ کر دیا۔ مجھے اپنے پاس بُلانے کی بجائے اس بیابان میں تنہا چھوڑ دیا۔ ابھی وہ خدا سے محوِ گفتگو ہی تھیں کہ گدھا زندہ ہوگیا۔ آپ بہت خوش ہوئیں اور عرض کی کہ میرے معبود میری لاج ہمیشہ ایسے ہی رکھنا۔ مجھے اپنا قرب اسی طرح عطا کرنا ورنہ میں تیرے لیے جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا جانتی ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے گدھے پر دوبارہ سامان لادا اور مکہ کے لیے عازمِ سفر ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کے انوار اور تجلیوں سے نوازی گئیں۔

اسی زمانے میں بصرہ کے حاکم محمد بن سلیمان ہاشمی نے شادی کا ارادہ کیا اور لوگوں سے کسی ایسی خاتون کے متعلق پوچھا جو نادرِ روزگار ہو اور جس کے چہرے کی روشنی چاند کو بھی ماند کر ڈالے۔ لوگوں نے رابعہ کا نام لیا۔ اس پر رابعہ کو شادی کا پیغام بھیجا۔ آپ نے جواباً کہا کہ لوگوں کے کہنے سے تو نے مجھے پیغام بھیجا ہے لہذا تو معافی کا حقدار ہے مگر یاد رکھ تیری موت قریب ہے اور بعد از موت تو حشرات العرض کے کھانے کا سامان ہوگا۔ یہ جواب سُن کر بادشاہ اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا اور اپنی بقیہ عمر استغفار اور عبادت میں گزار دی۔

رابعہ بصریؒ نے تمام عمر شادی کے بغیر گزاری۔ وہ بھی دیگر اہل اللہ کی طرح اپنی زندگی عبادت وریاضت میں گزارنے کی قائل تھیں۔ ازدواجی رشتے عبادت میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں اور وہ لمحہ بھر کے لیے بھی خدا سے دوری پسند نہ کرتی تھیں۔ رابعہ بصریؒ سے اللہ تعالیٰ نے ایسی ایسی کرامتیں ظاہر کروائیں جو بہت کم اولیاء کرام کو نصیب ہوئیں۔ وہ اپنے دور کی قافلہ سالار

ئے روزگار تھیں۔

یک مرتبہ ایک ڈاکو آپ کے گھر آیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں بڑے بڑے امراء اور رؤساء آتے ہیں، لہٰذا یہاں پر زر و جواہر لازمی ہوں گے مگر گھر کا کونا کونا چھاننے کے باوجود اُس کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ واپس جا رہا تھا کہ اُس کو رابعہ بصری کی شیریں گفتار نے روکا۔ انھوں نے سوال کیا کہ تم چور ہو؟ ڈاکو نے غصّے میں جواب دیا۔ ہاں۔ آپ نے کہا تو یہاں سے خالی ہاتھ مت جانا۔ ڈاکو بولا یہاں کیا رکھا ہے جو میں لے جاؤں۔ میں زر و جواہر کو لوٹنے والا ہوں اور وہ یہاں موجود نہیں۔ رابعہ بصری مسکرائیں اور کہا کہ وضو کر کے میرے حُجرے میں دو رکعت نماز ادا کر لو۔ دیکھنا یہاں سے تم اتنا کچھ لے جاؤ گے کہ ساری زندگی اتنا مال تمہیں نہیں ملا ہوگا۔ چور نے لالچ میں آ کر نماز وضو کر کے ادا کرنا شروع کر دی۔ ادھر رابعہ بصری نے دُعا کرنا شروع کی کہ میرے رب یہ شخص میرے دروازے پر آیا تھا مگر اس کو کچھ نہیں ملا۔ میں اس کو تیرے دروازے پر لے آئی ہوں۔ اُدھر ڈاکو نے نماز ادا کرنا شروع کی۔ اُس کو اتنا سرور ملا کہ اُس نے دو رکعت نماز کے بعد مزید دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر مزید دو رکعت پڑھیں حتیٰ کہ وہ ساری رات عبادت میں مشغول رہا۔ صُبح رابعہ بصریؒ نے دیکھا کہ وہ سر بسجود ہو کر گریہ زاری کر رہا ہے، اپنے عیوب کا اعتراف کر رہا ہے گناہ پر شرمندہ ہے، معافی مانگ رہا ہے، استغفار کر رہا ہے اور خدا کو اُس کی گریہ زاری اور استغفار اتنی پسند آئی کہ اُس نے اُس کی تمام گزشتہ خطائیں معاف کر دیں اور وہ رابعہ کے حُجرے میں سے ولی بن کر نکلا۔ یہ دیکھ کر رابعہ بصری نے خدا سے عرض کی اے میرے مولا تو نے اپنے گناہگار بندے کو معاف کر دیا۔ اُس کو پہچان کر اعلیٰ مقام عطا کیا اُس کو قبول کیا میں بھی تمہاری عاجز بندی ہوں مجھ کو بھی قبول فرما میری کوتاہیوں کو معاف فرما دے۔ خدا نے جواب دیا۔ رابعہ تو کیا سوچتی ہے تیری وجہ سے ہی تو میں نے اُس کو معاف کیا اور اُس کی توبہ قبول کی اور اُس کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔

رابعہ بصریؒ نے سب کچھ خدا سے براہِ راست حاصل کیا۔ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے تمام ارشادات پر مکمل عمل کیا اور جو شخص حضورؐ کی اطاعت کرتا ہے اُس کو معجزات میں کچھ نہ کچھ ضرور خدا عطا کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے معجزات انبیاء کرام سے رُونما ہوتے ہیں جب کہ کرامات اولیاء کرام کی طرف سے ہوتی ہیں۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے تمام علوم و اسرار اطاعت رسول کی وجہ سے خدا سے حاصل کیے۔ آپ اکثر روزہ سے رہتیں، شریعت و طریقت کے عرفان کے باوجود آپ بڑی اور کڑی آزمائشوں سے گزریں۔ آپ نے محبوب کی رضا کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیا تھا۔ آپ نے ایک دفعہ سات یوم اور سات راتوں کا روزہ رکھا۔ افطاری کے وقت آپ نے خیال کیا کہ آئندہ ہفت روزہ بھی اسی تسلسل میں گزار دیں تو کتنا ہی اچھا ہو۔ لیکن نفس امارہ بے چین ہوا۔ اسی دم کہیں سے کھانا آ گیا آپ نے نفس کو ملامت کیا اور کہا کہ انتظار کر میں چراغ روشن کر لوں پھر تیری بھوک ختم کروں گی۔ ابھی چراغ روشن بھی نہ کر پائیں تھیں کہ بلّی نے خوان اُلٹ دیا۔ نفس صرف پانی سے پیاس بجھانے پر مُصر ہوا مگر پانی انڈیلنے سے پہلے ہی آبخورہ ٹوٹ گیا، نفس بے چین ہوا۔ اس آزمائش میں اللہ نے رابعہ سے سوال کیا رابعہ ہمارا غم اور نفس طلب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اگر تو کہے تو ہم اپنا غم واپس لے لیتے ہیں اور تمہیں دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کر دیتے ہیں مگر رابعہ نے انکار کیا، دُنیاوی آسائشوں سے مُنہ موڑ لیا۔ خدا کے سوا ہر اُمید اور سہارے سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ہر نماز کو زندگی کی آخری نماز سمجھا۔ زندگی بھر گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی، خدا سے محبت اور شیفتگی کا یہ عالم زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہا۔ اور ہر معاملہ توکل اور رضا پر چھوڑنے والے کشتیٔ حیات پر کبھی بھنور میں نہیں پھنستے اُن کو کنارہ ضرور مل جاتا ہے لیکن آزمائشوں سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے۔

رابعہ بصریؒ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ تنہائی اور گوشہ نشینی میں گزارہ۔ آپ اکثر کہا کرتی تھیں کہ میں کبھی تنہا نہیں رہی ہر لمحہ اللہ تعالیٰ میرے ہمراہ ہوتا ہے۔ میں خدا کا جلوہ دیکھتی ہوں، اُس کو پہچانتی ہوں۔ کیونکہ جب تک معبود کو پہچان نہ لیا جائے عبادت کیونکر ہو سکتی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ خدا کی عبادت صرف اُس کی رضا اور خوشنودی کے لیے کرنی چاہیے۔ جہنم

جنّت کے خوف وطلب سے بالاتر ہو کر کی گئی عبادت ہی انسان کو مقامِ محمود تک پہنچاتی ہے۔ آپ فرمایا کرتی تھیں کہ جنّت اور دوزخ کے علاوہ تیسرا بھی مقام ہے جو کہ دیدارِ خدا ہے اور اس کے لیے بھی ریاضت کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے صرف خدا طلبی کے لیے عبادت کی۔ آپ اکثر خدا سے دُعا کرتیں کہ مولا مجھے اپنے جمال کی دید سے سرفراز فرما۔ غیب سے ندا آتی رابعہ گھبراؤ مت تجھے ایسی قربت عطا ہوگی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوگی۔ بلاشبہ ہم تم سے کلام کریں گے اور تم ہمارے ساتھ ہم کلام ہوگی۔

آغازِ شباب میں حضرت رابعہ کے حُسن جمال کا بہت چرچا تھا مگر غلامی سے آزادی اور شبینہ روز عبادتوں کے طویل سلسلہ کے بعد آپ کے چہرے پر خدا نے طہور و پاکیزگی کا ایک نقاب ڈال دیا تاکہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خود بخود جھک جائیں۔ گورستان میں ایک شب کسی نوجوان نے آپ کا نورانی چہرہ دیکھا جو رات کی تاریکی میں مثلِ مہتاب تھا۔ وہ آپ کی شخصیت سے ناواقف تھا۔ لیکن آپ کو غیر مرئی مخلوق سمجھ کر وہاں سے چل دیا۔ کچھ روز بعد بصرہ کے بازار میں اُس کو آپ دوبارہ دکھائی دیں تو وہ فوراً آپ کے پیچھے ہولیا اور چلتا چلتا اُن کے دروازے تک پہنچ گیا۔ گھر کا دروازہ کھُلا، کمرے میں چراغ روشن تھا۔ اقرار وانکار کے خیال سے بے نیاز ہو کر نوجوان اپنا حالِ دل سُنانے کے لیے کمرے میں داخل ہوگیا۔ جب اُس نے رابعہ بصری کو خُدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز پایا۔ خدا کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہوئے دیکھ کر نوجوان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اُس کی زبان گنگ ہوگئی۔ آپ نے پلٹ کر دیکھا اور آنے کا سبب پُوچھا لیکن اُس نوجوان نے اشارے سے بتایا کہ اُس کی زبان کام نہیں کررہی۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تیرا دِل بھی کام کرنا چھوڑ دے یہاں سے چلا جا۔ اُس نے آنکھوں سے التجا کی کہ میری گویائی لوٹا دی جائے مگر آپ نے فرمایا کہ اگر تو میرے ساتھ کوئی زیادتی کرتا تو مَیں تمہیں معاف کر دیتی۔ مَیں خدا کی عابد ہوں میرا معاملہ خدا کے ساتھ ہے تو نے معافی مانگنا ہے تو خدا سے مانگ یہ کہہ کر آپ دوبارہ سجدہ میں گر گئیں۔ وہ نوجوان بھی سجدہ ریز ہو کر استغفار کرنے لگا۔ طویل گریہ زاری کے بعد خدا نے اُس کی زبان واپس لوٹا دی مگر اس پر توبہ کا ہی ورد رہا۔ بصرہ کے بازار سالہا سال اس مجذوب کے نعروں سے گونجتے رہے۔ سردی گرمی میں وہ دیوانہ وار استغفار کے نعرے لگاتا رہا اور بصرہ کا پورا شہر اُس کے فلک شگاف نعروں سے گونج اُٹھا۔ آخر ایک دن خاموشی ہوگئی، وہ مجذوب کسی نامعلوم جگہ پر چلا گیا اس کا پھر کوئی پتہ نہ چلا وہ مجذوب یہی مذکورہ نوجوان تھا جو رابعہ کی بدولت ہی دربارِ خداوندی میں مقرب ٹھہرا۔ آپ اکثر یہ شعر پڑھتی رہتی تھیں کہ دُنیا ایسے دوست کی طرح ہے جو بظاہر دوست ہے لیکن اندر سے دشمنِ خاص ہے لیکن اس کی پہچان گہری نظر سے کی جاسکتی ہے۔

حضرت حسن بصری اپنے زمانے کے کامل ولی تھے۔ ان کے وعظ اور زورِ بیان کی بہت شہرت تھی۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں دُور دراز سے لوگ اُنکی تقریر سُننے آتے لیکن آپ جب تک رابعہ تشریف نہ لاتیں وعظ شروع نہ کرتے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے کہا۔ لاکھوں افراد پر آپ ایک بڑھیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اُس کے انتظار میں دوسروں کا خیال نہیں رکھتے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاتھی کا شربت چیونٹی کے برتن میں کیسے سماسکتا ہے۔ رابعہ بصری اور حسن بصری رات بھر جاگ کر حقیقت اور معرفت کے موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ ہم مرد و زن کے خیال سے بالاتر ہو کر معرفت کے اسرار پر گفتگو کرتے ہیں لیکن صُبح کے وقت مَیں اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ مفلس اور رابعہ کو کہیں زیادہ مخلص پاتا ہوں۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے طویل عُمر کے باعث بہت سارے مجاہدات، خیر اور تقویٰ کے کام سرانجام دیئے اسی لیے آپ سوختۂ عشق اور اُمّ الخیر کہلاتی ہیں۔ آپ فرمایا کرتی تھیں کہ جام، شراب اور ندیم کے لیے مَیں چوتھی چیز وارفتۂ محبت ہوں۔ سُرور کے جام میں نے اس قدر نوش کیے ہیں کہ جس طرف نظر اُٹھاتی ہوں اُس کو دیکھتی ہوں اور جہاں ہوتی ہوں وہی ذاتِ پاک میرے ساتھ ہوتی ہے۔ آپ اپنی گریہ زاری اور شب بیداریوں کے باعث ولایت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔ آپ کو عُمر بھر یہی خوف دامن گیر رہا کہ آخری دم وقتِ وصال کہیں مَیں محبوب کے قرب سے محروم نہ ہو جاؤں۔ آپ ہر وقت فرماتیں کہ میرے مالک! چاند، ستارے، سمندر، دریا، شجر و حجر سب تیرے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ مَیں بھی تیرے آگے سجدہ کرتی ہوں۔ تُو نے سب کا انجام مقرّر

فرمایا ہے میرا بھی انجام مقرر فرما دے۔ ان کا جسم جوں جوں کمزور ہوتا گیا اُن کا دل مضبوط اور بیدار ہوتا گیا۔ عمر بھر وہ بہت کم کھاتی تھیں بسا اوقات اتنی نقاہت پیدا ہو جاتی کہ نماز پڑھتے پڑھتے گر جاتیں۔ وہ یہ بات شدت سے محسوس کرتیں کہ مُحب اور محبوب کے درمیان ایک دیوار ہے جو ہٹ جائے تو دوری ختم ہو جائے گی۔ آپ کے بیماری کے ایام میں شہر بھر کے لوگ آپ کی خدمت میں ٹوٹ ٹوٹ کر حاضر ہوتے اور آپ کی دعائیں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتے۔ جب بھی کوئی دعا کی درخواست کرتا تو آپ فرماتیں میں کمزور اور ناتواں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں جس کو اپنے انجام کا کوئی پتہ نہیں۔ وہ یہ خیال اپنے دل میں لاتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں کہ لوگ اِن کو اپنے اور خدا کے درمیان وسیلہ نہ سمجھ لیں۔ وہ ہر شخص کو عبادتِ الٰہی کی ہدایت کرتیں۔ قربِ خداوندی کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ اِن کے مختصر سامان میں کفن ہر وقت تیار سامنے رہتا۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کے کفن دفن کے اسباب اور انتظام بالکل عام آدمیوں کی طرح کیے جائیں اور اُن کو اس طرح سپردِ خاک کیا جائے کہ اُن کی قبر بھی ممکنہ حد تک چھپی رہے۔ آخری ایام میں اُنھوں نے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا۔ بہت کم سویا کرتی تھیں۔ اینٹوں کے چبوترے پر ہی نماز پڑھتیں اور اسی پر ذرا سا ستانے کے بعد دوبارہ عبادت میں مشغول ہو جاتیں۔

۱۸۵ھ ہجری میں ایک دن لوگوں کو درسِ معرفت دینے میں مشغول تھیں کہ سنائی آئی۔ انھوں نے اپنے سامنے مُسکرا کر دیکھا۔ سامعین' ارادت مندوں اور مشائخ کو جگہ چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ جب سب لوگ باہر آ گئے تو حجرے کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اس طرح آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ نے خدا کی شان میں کبھی گستاخی نہ کی۔ مخلوقِ خدا سے تو درکنار خدا سے بھی کبھی کچھ نہ طلب کیا۔

عشق وہی سمجھ سکتا ہے جو عاشق بنا ہو۔ طلب انسان کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ دل اظہار نہیں کر سکتا۔ عقل اقرار سے پابند ہو جاتی اور دل کی وارفتگی دیدنی ہوتی ہے۔

ابو سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ دل کو اس وقت تک سنبھالے رکھنا چاہیے جب تک اسرار کا عیاں وہ ذات پاک خود نہ کرے اور اُس کے بعد جو مسرت اور سکون حاصل ہوتا ہے وہی حقیقی ہوتا ہے اور یہ صرف رابعہ بصریؒ کے نصیب میں بھا جو اُسے عطا ہوا۔

یہ مرتبۂ بُلند جسے ملا مل گیا
ہر دائمی کے واسطے دار و رسن کہاں

حضرتِ حق سبحانہ و تعالیٰ جادۂ شریعتِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر استقامت نصیب فرما کر کلیتہً اپنی جنابِ قدس کی جانب متوجہ کر دے ---- اُمید ہے کہ تعلقاتِ گوناگوں اور توجہاتِ پراگندہ جو بظاہر غلبہ پا گئے ہیں وہ "مانع نسبتِ باطن" نہ ہوں گے، پھر بھی (مزید) کوشش کریں کہ جمعیتِ اسبابِ ظاہری نسبتِ باطن میں خلل انداز نہ ہونے پائے اور مقصود تک پہنچنے سے نہ روک سکے ---- دنیا اور مافیہا اِس بات کے لائق نہیں ہیں کہ کوئی اُن کو عمرِ گرامی صرف کر کے حاصل کرے ---- عمر کوتاہ ہے ---- خواب خرگوشس کب تک ---- ؟

موت سے پہلے اگر کچھ کر لیا تو بہا، ورنہ خرابی در خرابی ہے ---- سبق باطن کو عزیز رکھنا اور جو چیز اس کے منافی ہو اُس کو اپنا دشمن تصور کرنا چاہیے۔

(حضرت مجدد الف ثانیؒ)

شام قریب تھی۔ رات کی تاریکی ہر شے کو آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ خراسان کی پتھریلی عمارتیں کسی دیو قامت عفریت کی مانند سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ ان عمارتوں کے ساتھ ساتھ ایک شخص عجیب سے حُلیے میں ہر چیز سے بے نیاز اپنے آپ میں گم چلا جا رہا تھا۔ بوسیدہ سا موٹا اور کھُردرا ٹاٹ نما لباس بدن پر تھا۔ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں لوٹا تھا۔ راہ گیر اس نوجوان کو اپنے افکار میں گم دیکھتے، حیرت کرتے اور پاس سے گزر جاتے۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ نوجوان جب ذرا گنجان آبادی کے قریب آ پہنچا تو اس نے سر اُٹھا کر دائیں بائیں دیکھا۔ پاس سے ایک خچر سوار گزر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا اور انتہائی نرمی و حلیمی سے دریافت کیا "اے مہربان دوست، تجھ پہ اللہ کی رحمتیں نازل ہوں، کیا تو بتا سکتا ہے کہ یہاں کوئی سرائے بھی ہے؟"

خچر سوار نے اس صوفی منش کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "خدا تجھے بھی اپنی امان میں رکھے، وہ رہی سرائے!" پھر ذرا دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم بھی صوفی ہو؟"

اُس نوجوان نے حسرت سے جواب دیا "صوفی..... صوفی تو بڑی چیز ہے، میں تو ابھی اِس منزل سے کوسوں دُور ہوں۔"

خچر سوار ہنس پڑا اور کہنے لگا "واقعی تم ابھی صوفیت کی منزل سے کوسوں دُور معلوم ہوتے ہو۔ میں ابھی سرائے سے ہی آ رہا ہوں وہاں تمہیں بہت سے صوفی نظر آئیں گے۔ زرق برق لباس میں ملبوس، مرغن غذائیں کھاتے۔"

خچر سوار یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور یہ جوان سرائے کی طرف آہستہ آہستہ نرمی سے زمین پہ قدم رکھتا بڑھنے لگا۔ جونہی اس نے سرائے میں قدم رکھا وہاں اُسے لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے کئی چہرے نظر آئے جو خوشحالی اور بے فکری سے دَمک رہے تھے۔ جیسے ہی اُن کی نظر اِس مفلوک الحال جوان پر پڑی تو اُن میں سے ایک رعونیت سے اُس کی طرف بڑھا اور بڑی تمکنت سے پُوچھنے لگا "تم کون ہو؟"

اُس جوان نے اپنی روایتی حلیمی و نرمی سے جواب دیا "مسافر ہوں، شب بسری کے لیے ٹھہرنا چاہتا ہوں۔"

وہ سب قہقہے لگا کر ہنس پڑے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے "لگتا تو صوفی ہی ہے لیکن ہم میں سے نہیں ہے۔"

وہ جوان یہ سن کر خوشی سے اُچھل اٹھا اور جواب دیا "تم نے بالکل دُرست کہا۔ بے شک میں تم میں سے نہیں ہوں۔"

رات ہوئی۔ ایک صوفی نے اُس کے آگے سوکھی روٹی اور پانی لا کر رکھا اور خود اُس محفل میں جا گھسا جہاں اُس کے ساتھی مرغن غذائیں

جاتے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق میں مشغول تھے اور اُسے روکھی سوکھی روٹی پانی میں بھگو بھگو کر کھاتے دیکھ کر ہنستے اور کھائے ہوئے پھلوں کے چھلکے اُسے مارتے جاتے۔ مگر وہ جوان جو گھر سے بہت کچھ جاننے کی جستجو میں نکلا تھا جو اپنی انا کی بڑائی میں گم تھا اور اس نفسانی مرض کے علاج کے لیے، طمانیتِ قلب کی بازیابی کے لیے، اُسے جس معالج کی ضرورت تھی، وہ اُسے طنز و استہزا کے پیکر یہ صوفی نظر آئے، چنانچہ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ملامتوں اور صعوبتوں کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا رہا۔ تسلیم و رضا کی منزل کو پانے کے لیے نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے، اللہ کے نیک بندوں کے لیے، ان جاہلوں اور نادانوں کی صحبت امرت دھارا سے کم نہیں تھی اور اس کی تسکین کے لیے یہ علاج اللہ کی عنایت سے اُسے حاصل ہو گیا تھا۔

یہ جوان وہ صوفی تھا جس کے لیے خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ؎

گنج بخش فیضِ عالم مظہر نورِ خدا ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

یہ حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری تھے جنہیں خلقت گنج بخش کہتی ہے۔ اس ذات کو جو ایک دانہ بھی پاس نہیں رکھتا۔ جو خود سے کہتا ہے۔ "اے علی، اس بات کو دل میں نہ لا کر لوگ تجھے گنج بخش کہتے ہیں۔ گنج بخش تو وہ ذاتِ مقدس ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے۔ اُس کے ساتھ شرک نہ کر ورنہ تباہ کرے گا خود کو۔"

حضرت علی ہجویری کی طبیعت میں جستجو اور دل میں اجتہاد کا یہ عالم تھا کہ فکر کہیں ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ گیارہویں صدی کے ایک عظیم صوفی ختلی نامی کی صحبت میں رہ رہے تھے۔ ایک دن مرشد نے جو ہاتھ دھونے کے لیے نوجوان مرید کے آگے انہیں بڑھایا اور مرید نے پانی کی دھار ہاتھوں پر ڈالی تو یکایک دل میں خیال پیدا ہوا۔ "جب اس کائنات میں ہر کام کے پس منظر میں تقدیر ہی کارفرما ہے تو پھر آزاد لوگ مرشدوں کے طابع کیوں بنیں۔"

مرشد جو عرفان کی بلندی پر تھے، دونوں ہاتھ کھینچ کر متردد مرید سے مخاطب ہوئے۔ "علی! بے شک پوری کائنات تقدیرِ الٰہی کی پابند ہے لیکن یاد رکھو! خدا کا ہر حکم کسی وجہ کا پابند ہے۔ جب وہ کسی کو نوازنا چاہتا ہے تو اُس کے اسباب ویسے ہی پیدا کر دیتا ہے۔ تجھے خدا نے میرے پاس بھیجا۔ میں تمہیں خدا کی منشا کے مطابق وہ دوں گا جس کے تم طلب گار ہو۔"

نوجوان علی ہجویری یہ سن کر شرمندہ ہوئے مگر دل کی الجھن دور ہو گئی۔

تحصیلِ علم کی خاطر مشائخ کرام کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے کے لیے مختلف شہروں اور ملکوں کے سفر کیے اور سیر و سیاحت کے بعد جب آپ اپنے مرشد کے پاس واپس آئے تو اُنہوں نے لاہور جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے لاہور کی راہ لی۔ جب لاہور میں داخل ہوئے تو نزدیک سے ایک بڑھیا کو گزرتے دیکھا جو دودھ کا برتن سر پہ اُٹھائے جا رہی تھی۔ آپ نے اُسے اشارے سے روکا اور دودھ کی خواہش کی۔ بڑھیا سہم کر پیچھے ہٹی اور کہنے لگی "جس کے لیے دودھ لے جا رہی ہوں اگر اسے علم ہو گیا تو وہ اپنے سفلی علم کے بل بوتے پر ہمارے جانوروں کا دودھ ہی خشک کر دے گا۔"

آپ مسکرائے اور متاثر کن لہجے میں بولے "تم اس کی فکر نہ کرو۔ دودھ ہمیں دو، خدا برکت دینے والا ہے۔"

بڑھیا آپ سے متاثر نظر آنے لگی اور آپ کو دودھ دے دیا۔ رات کو بڑھیا نے جب جانوروں کا دودھ دوہا تو اُنہوں نے اتنا دودھ دیا کہ گھر کے سارے برتن ہی بھر گئے۔ جب اس کالے علم کے ماہر کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اُس نے سخت ترین مقابلوں کے بعد آپ کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے اُسے شیخ ہندی کا نام دیا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی تعلیمات اور اُن کے نظریات جاننے اور سمجھنے کے لیے ہمیں اُن مکتوبات سے بہت راہنمائی ملتی ہے جو اُنہوں نے مختلف امراء، سلاطین، مشائخ، اولیائے کرام اور دیگر اہلِ علم ہستیوں کے نام لکھے۔ مثلاً لالہ بیگ کے نام اُنہوں نے صادر فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری عزتِ اسلامی میں اضافہ کرے۔ قریباً ایک صدی سے اسلام کی عزت اور پستی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ بلادِ اسلام میں کفار صرف احکام کفر کے اجرا پر راضی نہیں ہوتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکل مٹ جائیں اور مسلمانوں اور مسلمانی کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ اُن

کی جرأت و بے باکی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی مسلمان شعارِ اسلام کے اظہار کی دلیری کرتا ہے تو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ذبیحہ گاؤ جو ہندوستان میں اسلام کے اعظم شعائر میں سے ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ کفار شاید جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو جائیں مگر ذبح گائے پر کبھی راضی ہونے کو تیار نہیں۔ ابتدائے بادشاہت ہی میں اگر مسلمانی رواج پذیر ہو گئی اور مسلمانوں نے کچھ حیثیت پیدا کر لی تو فبہا اور اگر عیاذاً باللہ سبحانہ معاملہ تعویق اور توقف میں پڑ گیا تو مسلمانوں پر سخت برے دن آ جائیں گے۔ الغیاث الغیاث ثم الغیاث الغیاث "اللہ کی بارگاہ" میں فریاد۔ فریاد پھر فریاد فریاد۔ دیکھئے کون صاحب ہمت اس دولت ترویج اسلام سے سرفراز ہوتا ہے اور کس شہباز کا ہاتھ اس دولت تک پہنچتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں حضور سید المرسلین علیہ علیٰ آلہٖ مع الصلوات افضلہا و من التسلیمات اکملہا کی متابعت پر ثابت قدم رکھے۔ والسلام۔

آپ کی کنیت ابوالحسن اور علی نام تھا۔ ہجویر اور جلاب غزنین کے دو گاؤں ہیں۔ زندگی کے ابتدائی ایام انہوں نے یہیں پر گزارے اسی لیے آپ کو ہجویری کہا جاتا ہے۔ مؤرخین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ آپ چار سو ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا سلسلہ نسب کچھ اس طرح سے ہے۔ علی بن سید عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمٰن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام حسن بن مرتضیٰ رضؓ

حضرت داتا گنج بخش نے روحانی کسب کمال کے لیے بیشتر اسلامی ممالک مثلاً عراق، شام، فارس، بغداد، آذربائیجان اور ترکستان وغیرہ کا سفر بھی کیا اور وہاں کے اولیائے کرام کی روح پرور صحبتوں سے بھی مستفیض ہوئے۔ خراسان میں آپ تین سو مشائخ سے ملے جن میں خواجہ علی بن الحسین، شیخ ابوطاہر مکشوف، خواجہ ابوجعفر، محمد بن علی اور شیخ احمد حماد سرقندی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منازل سلوک کے طے کرنے میں جو مجاہدے کیے ان میں سے ایک عجیب و غریب واقعہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

جمال الدین کے نام اپنے ایک مکتوب میں آپ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ تلونیات کا چنداں اعتبار نہیں۔ ان میں گرفتار نہیں ہونا چاہیے کہ کیا آیا اور کیا گیا، کیا کہا اور کیا سنا۔ مقصود تو دوسری چیز ہے جو گفت و شنید اور دید و شہود سے منزہ اور مبرا ہے۔ انسان کی ہمت بلند ہونی چاہیے۔ کرنے والا کام تو دوسرا ہے۔ یہ سب خواب و خیال ہے۔ خواب میں اگر کوئی شخص اپنے آپ کو بادشاہ دیکھے تو وہ نفس الامر میں بادشاہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کے خواب سے بلند مراتب کے حصول کی امیدواری مترشح ہوتی ہے۔ حضرت داتا گنج بخش ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ "شام" میں حضرت بلال حبشی رضؓ کے روضہ مبارک کے سرہانے سو رہا تھا کہ میں نے خواب میں خود کو مکہ معظمہ میں پایا اور دیکھا کہ سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہو رہے ہیں اور ایک ضعیف آدمی کو گود میں لیے ہوئے ہیں جیسے کوئی کسی بچے کو گود میں لیے ہوتا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر حضورؐ کی قدم بوسی کی اور میں حیران تھا کہ گود میں یہ بوڑھا شخص کون ہے۔ آپ کو میرے دل کی کیفیت معلوم ہو گئی اور فرمایا کہ یہ تیرا اور تیرے دیار والوں کا امام ہے یعنی ابوحنیفہ۔ اس خواب سے مجھ پر یہ ظاہر ہو گیا کہ امام ابوحنیفہ گو جسمانی طور پر فانی ہو چکے ہیں مگر احکام شرعی کے لیے ان کا وجود باقی اور قائم ہے اور ان کے حامل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔

عراق میں قیام کے دوران ایک موقع پر حضرت علی ہجویریؒ نے فرمایا کہ دنیا حاصل کر کے لٹا رہے تھے جس کسی کی کوئی ضرورت ہوتی انکی طرف رجوع کرتا۔ ایسے لوگوں کی خواہش پوری کرنے میں مقروض ہو گئے۔ ایک شیخ نے ان کو لکھ بھیجا کہ اے فرزند کہیں اس قسم کی مشغولیت میں خدا کی لگن سے دور نہ ہو جانا اور یہ مشغولیت ہوائے نفس ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص ہو جس کا دل تم سے بہتر ہو تو تم ایسے دل کی خاطر کر سکتے ہو مگر تمام لوگوں کے لیے دل کو پریشان نہ کرو کیونکہ اللہ خود ہی اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ اس پند و موعظت سے ان کو قلبی سکون حاصل ہوا اور خود آپ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں بھی اس کی تعلیم دی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مخلوق سے قطع تعلق کرنا گویا بلا سے چھوٹ جانا ہے۔ ایک انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی کی طرف نہ دیکھے تاکہ اس کی طرف بھی کوئی نہ دیکھے۔

اکثر اولیائے کرام اور بزرگان دین کے ساتھ بہت سی کرامات اور معجزات وابستہ ہوتے ہیں مگر حضرت علی احمد ہجویری نے خود اپنی

کتاب کشف المحجوب میں معجزات اور کرامات میں فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ معجزہ کا پھل غیر کی طرف لوٹتا ہے اور کرامت کا ثمرہ صاحب کرامت کے لیے ہوتا ہے اور نیز صاحب معجزہ، معجزہ کا یقین کر لیتا ہے اور ولی یقین نہیں کر سکتا کہ وہ کرامت ہے یا استدراج اور نیز صاحب معجزہ اللہ کے حکم سے شریعت کے اوامر و نواہی کی ترتیب میں تصرف کرتا ہے اور ولی صاحب کرامت کو بجز تسلیم اور قبول احکام کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس واسطے کسی وجہ سے ولی کی کرامت نبی کی شریعت کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر حضرت علی ہجویریؒ اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ مشائخ کے گروہ اور تمام اہل سنت والجماعت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر کسی کافر کے ہاتھ پر معجزہ اور کرامت کے مثل سے کوئی کام خلاف عادت ظہور میں آئے اور اس ظہور کی وجہ سے شبہ کے اسباب منقطع ہوں اور کسی شخص کو اس کے جھوٹ میں شبہ نہ ہو تو جائز ہے جیسا کہ فرعون نے چار سو سال تک عمر پائی اور اس کو اس دوران کوئی بیماری لاحق نہ ہوئی تھی اور پانی اس کے پیچھے اونچا ہوتا تھا جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو پانی بھی ٹھہر جاتا تھا اور جب چلتا تھا تو پانی بھی چلنے لگتا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کے دعویٰ میں عقلمندوں کو شبہ نہیں پڑتا تھا اس لیے اس نے دعویٰ خدائی کا کیا ہوا تھا اور عقلمند اس حالت میں بحال اضطراری ہوتے ہیں اس لیے کہ خداوند تعالیٰ جسم اور مرکب نہیں ہوتا اور اگر ایسے ہی کام اور اس کے مانند اور بھی بہت فرعونوں سے ظاہر ہوتے تو بھی عقلمندوں کو ان کے دعوے کے جھوٹا ہونے میں شبہ نہ ہوتا اور وہ جو صاحب شداد ارم اور نمرود کے بارے میں روایت کرتے ہیں اس قبیل سے ہے۔ اس کا قیاس بھی اسی پر کرنا چاہیے اور اسی کی مثل سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ آخر زمانہ میں دجال آئے گا اور خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے داہنے اور بائیں ایک ایک پہاڑ چلتا ہو گا۔ داہنے طرف کے پہاڑ پر عمدہ عمدہ نعمتیں ہوں گی اور بائیں طرف کے پہاڑ پر طرح طرح کے عذابوں اور عقوبتوں کا سامان ہو گا اور خلقت کو اپنی الوہیت کی دعوت دے گا اور جو اس کی دعوت کو منظور نہ کرے گا اس کو طرح طرح کے عذابوں میں جکڑے گا اور خداوند تعالیٰ اس کی گمراہی کے سبب خلقت کو مارے گا اور جہاں بھی مطلق حکم چلاتے ہوئے ہو گا اگرچہ ان کی بجائے سو گنا خلاف عادت افعال کا اس سے ظہور ہو مگر عقلمند کو اس کے جھوٹا ہونے پر کوئی شبہ پیدا نہ ہو گا۔"

آگے چل کر حضرت داتا گنج بخشؒ اسی موضوع پر کشف المحجوب میں رقم فرماتے ہیں کہ ایک روز صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! پہلی امتوں کے عجائبات سے کوئی عجیب بات ہم کو سنائیے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم سے پہلے تین آدمی کہیں جا رہے تھے جب رات کا وقت ہوا تو انہوں نے ایک غار میں قیام کیا۔ جب رات کا کچھ حصہ گزرا اور اس وقت پہاڑ سے ایک پتھر لڑھک کر غار کے منہ پر مثل سرپوش کے قائم ہوا اور وہ تینوں متحیر ہوئے۔ ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ یہاں سے رہائی حاصل ہونی مشکل ہے۔ ہاں ایک چیز ہمیں رہائی دلا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے نیک اعمال کو بیان کر کے خدا کی بارگاہ میں انہیں بطور شفاعت پیش کریں۔ ایک نے کہا کہ میرے ماں باپ زندہ تھے اور میرے پاس دنیا کے مال سے چند بکریاں تھیں ان کے علاوہ اور کوئی چیز میرے پاس نہ تھی اور انہیں بکریوں کا دودھ پلایا کرتا تھا اور میں ہر روز لکڑیوں کا ایک گٹھا لا کر بازار میں فروخت کرتا اور اس کی قیمت سے اپنے ماں باپ کے لیے کھانا خرید کر لایا کرتا تھا۔ ایک رات دیر سے پہنچا اگر بکریوں کا دودھ دوہ کر کھانا اس میں بھگو دیا اور ایک پیالہ بھر کر ان کی طرف کھلانے کے لیے آیا تو وہ میرا انتظار کر کے سو چکے تھے۔ میں نے انہیں اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ پیالہ ہاتھوں میں لے کر اس جگہ کھڑا ہو گیا کہ جب بیدار ہوں گے اسی وقت کھانا کھلاؤں گا۔ نیند سے بے آرام کرنا اچھا نہیں اور میں نے خود بھی کوئی چیز نہ کھائی تھی۔ بس وہیں انتظار میں کھڑے کھڑے صبح ہو گئی۔ جب والدین بیدار ہوئے تو میں نے ان کو کھانا کھلایا اور بعد میں خود کھانا کھایا۔ غرض یہ کہ بار خدایا اگر میرا یہ عمل تیری بارگاہ میں منظور ہے تو پتھر میں سے شگاف ڈال دے۔ پیغامبر حضورؐ فرماتے ہیں کہ اسی وقت وہ پتھر جنبش میں آیا اور اس میں شگاف ہو گیا۔

دوسرے آدمی نے کہا کہ میرے چچا کی لڑکی تھی۔ میں اس کے جمال کا عاشق ہو گیا۔ میں نے کئی دفعہ اپنی خواہش کے پورا ہونے کی درخواست کی مگر اس نے مسترد کی۔ میں نے ایک بار موقع پا کر اس کے پاس ایک سو بیس دینار بھیجے تاکہ ایک رات مجھ سے خلوت کرنے والی ہو مگر جب میں اس کے قریب آیا تو میرے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور دینار

بھی واپس نہ لیے۔ اُس نے عرض کی کہ بارِ خدایا اگر میرا عمل تیری بارگاہ میں قبول ہُوا ہے تو اس پتھر میں شگاف فرما دے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس وقت پتھر پھر جنبش میں آیا اور پہلے کی نسبت شگاف میں زیادتی ہُوئی مگر اتنا شگاف نہیں تھا کہ جس سے باہر نکل سکتے۔ اس پر تیسرے آدمی نے کہا کہ میرے پاس مزدوروں کی ایک جماعت تھی۔ وہ میرا کام کیا کرتے تھے۔ جب کام ختم ہو گیا تو سب مزدوروں نے مزدوری وصول کر لی مگر ایک مزدور بلا کسی وجہ کے غائب ہو گیا۔ مَیں نے اس کے پیسوں کی ایک بکری خرید لی۔ دوسرے سال دو ہو گئیں اور تیسرے سال چار ہو گئیں۔ ہر سال وہ بڑھتی تھیں۔ چند سالوں میں بہت سا مال جمع ہو گیا۔ پھر وہ مزدور بھی آ گیا اور کہنے لگا کہ مَیں نے ایک سال تیری مزدوری کی تھی اب مجھے میری مزدوری دے دو تا کہ مَیں اپنی حاجت میں اسے صرف کروں۔ مَیں نے اسے کہا کہ یہ تمام بکریاں اور مال تیری ہی ملکیت ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ سے تمسخر مت کر۔ مَیں نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ان سب کا تُو ہی مالک ہے۔ مَیں نے تمام مال اس کے آگے لگایا اور وہ لیکر چلا گیا۔ عرض کی کہ خدایا اگر مَیں نے یہ عمل تیری رضامندی کے لیے کیا تھا تو پتھر کو اتنی مقدار میں ہٹا دے کہ ہم باہر نکل سکیں۔ پیغامبر صلّی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ پتھر اس وقت غار کے مُنہ سے علیحدہ ہو گیا اور ان تینوں نے نکل کر اپنے گھروں کا راستہ لیا۔"

ایک اور مقام پر حکایت بیان کرتے ہیں کہ بصرہ میں ایک رئیس اپنے باغ میں گیا اور اس کی آنکھ اپنے مُسار کی حسینہ پر پڑی۔ اس کے خاوند کو اس رئیس نے کسی کام کے لیے باہر بھیج دیا اور اس عورت سے کہا کہ تمام دروازے بند کر دو۔ اُس عورت نے کہا کہ مَیں تمام دروازے بند کر سکتی ہوں مگر ایک دروازہ بند نہیں کر سکتی۔ رئیس نے کہا کہ ان دروازوں کے علاوہ اور کونسا دروازہ ہے کہ جسے تُو بند نہیں کر سکتی اُس نے کہا کہ یہ دروازہ ہمارے اور خُدا کے درمیان ہے۔ وہ رئیس پشیمان ہُوا اور اُس نے اس فعلِ قبیح سے توبہ کر لی۔

مختصر یہ کہ حضرت علی ہجویری نے ولی کی ولایت اور کرامت پر جو مفصل بحث کی ہے اُس کا لبِ لباب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کچھ بندوں کو اپنا دوست بنا لیتا ہے اور اُن کی صفات یہ ہیں کہ وہ دنیاوی مال و دولت سے بے نیاز ہو کر صرف ذاتِ خداوندی سے محبت کرتے ہیں۔ جب دوسرے لوگ ڈرتے ہیں تو وہ نہیں ڈرتے اور جب دوسرے غمزدہ ہوتے ہیں تو وہ نہیں ہوتے اور جب ایسے لوگ دُنیا میں نہیں رہیں گے تو قیامت آ جائے گی۔

حضرت علی ہجویری نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں بعض اولیائے کرام کی اور بھی بہت سی کرامات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ذوالنوّی مصریؒ فرماتے ہیں کہ مَیں ایک دفعہ ایک جماعت کے ساتھ کشتی میں سوار تھا۔ مَیں اس کی صحبت کی خواہش رکھتا تھا مگر اس کی ہیبت مجھے اس کی صحبت سے باز رکھ رہی تھی۔ مَیں اس سے کلام کی طاقت نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ زمانہ کا بہت ہی نادر انسان تھا اور کوئی بھی وقت اپنی عبادت سے خالی نہ چھوڑتا تھا۔ ایک روز ایک جوان کا ایک بدرہ جواہرات کا کشتی میں گُم ہو گیا اور جواہرات کے بدرہ کے مالک نے اس درویش صورت پر تہمت لگائی اور اُنھوں نے اس پر ظلم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ مَیں نے اہلِ کشتی سے کہا کہ تمہیں اس کے ساتھ ایسی بات روا نہیں رکھنی چاہیئے۔ پہلے مجھے خود اپنے طور پر اس سے دریافت کر لینے دو۔ مَیں نے اس درویش کو جا کر نرمی سے کہا کہ ان آدمیوں کا خیال تجھ پر ہو چکا ہے اور مَیں نے ان کو سختی اور ظلم کرنے سے روک دیا ہے۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے اپنا مُنہ آسمان کی طرف کیا اور پھر مَیں نے مچھلیوں کو پانی کی سطح پر اس شان سے دیکھا کہ ان میں سے ایک ایک کے مُنہ میں جوہر تھا۔ اس درویش نے ایک مچھلی کے مُنہ سے ایک جوہر لے کر مرد کو دے دیا اور جب کشتی کے آدمیوں نے دیکھا اتنے میں اُس مرد نے پانی کی سطح پر اپنا پاؤں رکھ کر چلنا شروع کر دیا۔ پس جس شخص نے بدرہ چرایا تھا وہ اہلِ کشتی میں سے تھا۔ اُس نے بدرہ نکال کر اس کے مالک کے سامنے پھینک دیا اور تمام اہلِ کشتی شرمسار ہوئے۔"

حضرت علی ہجویریؒ خود فرماتے ہیں کہ ولی اللہ وہی ہوتا ہے جو ہر طرح کے لوب لالچ اور نفس کی حرص سے آزاد ہو۔ اسرارِ خداوندی سے آگاہ ہو اور اس سے کرامت ظاہر ہو سکتی ہو۔

حضرت علی ہجویری تمام زندگی تعلقاتِ زناشوئی سے پاک رہے۔ خود فرماتے ہیں کہ ایک سال تک کسی سے غائبانہ عشق رہا مگر جب

برکھا رت میں ذائقے کی نئی بہار

روح افزا لیموں

برسات کی آمد سے گرمی کی شدت میں کمی ضرور آجاتی ہے
گرمی اور اس کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس موسم میں بھی
روح افزا کا استعمال جاری رکھنا صحت مندی ہے!

موسم کی تبدیلی کے باعث بدلتے ہوئے
ذائقے کی تسکین کے لیے اس میں
لیموں کا تازہ رس شامل کر کے خوش ذائقہ
روح افزا سکنجبین کا لطف اٹھائیے۔

رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال

روح افزا

مشروبِ مشرق

ہمدرد

Adarts - HRA-12/91

پیغام آیا ہے۔ وہیں اُس کے پیے حکم بھی تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے شاہی لشکر کو فیض یاب کرے مگر وہ نوجوان بازید محمد عشق حقی
اتنا ڈوب چکا تھا کہ اُس نے شاہی دربار میں یہ عریضہ بھیجا کہ "میں نے اپنی آئندہ زندگی صرف اور صرف خدا کی راہ میں وقف کر دی
چنانچہ میں اب ہر ذمہ داری اور ہر خدمت سے سُبک دوش ہونا چاہتا ہوں۔"

چار و ناچار اُس کی یہ درخواست منظور کر لی گئی مگر ہند کے حاکم شاہجہان کے اصرار پر اپنی معاشی کفالت کے لیئے اُسے شور کو
کے نزدیک ایک جاگیر قبول کرنا ہی پڑی۔ جو بازید نے وہاں کی ایک خانقاہ اور مدرسے کے اخراجات کے لیے وقف کر دی۔

گھر والوں کو جب بازید کی طویل گمنامی کے بعد اتہ پتہ معلوم ہُوا تو وہ اُسے واپس لانے کے خواہش مند ہُوئے مگر بازید محم
زوجہ بی بی راستی جو ایک پرہیزگار اور دُنیاوی آرائشوں سے پاک خاتون تھیں۔ اُن پر واضح کیا کہ "اب وہ کبھی نہ آئیں گے۔
ہم خدا کی رضا سے اس فانی دُنیا کو ترک کر چکے ہیں۔ میرے پاس اللہ کی ایک مقدس امانت پرورش پا رہی ہے۔ جو مادرزا
ہوگا اور جسکا ظہور چناب کے علاقہ میں ہوگا۔ سو تم اُنہیں واپس لانے کا خیال ترک کر دو بلکہ مجھے بھی اُن کے پاس پہنچا دو۔"
چنانچہ جلد ہی بی بی راستی اپنے شوہر بازید محمد کے پاس شورکوٹ پہنچ گئیں اور شورکوٹ کی فضا اللہ ہُو! اللہ ہُو کے وردسے
گی۔ دونوں میاں بیوی دن رات اللہ ہُو کا ورد کرتے۔ پھر ایک دن اُن کے اللہ ہُو! کے ورد میں ایک نوزائیدہ بچے کی معصوم کلکا
کی گونج بھی ہم آہنگ ہو گئی اور اللہ کی امانت ظاہری حالت میں بی بی راستی کی آغوش میں ہمکنے لگی۔
وہ معصوم بچہ جسکی آنکھوں میں ستاروں کی چمک تھی اور پیشانی چاند کی طرح روشن اُس کے فطری اور پیدائشی جوہر، شیر خوا
ہی چمکنے لگے۔ ماں عبادت یا تلاوت میں مشغول ہوتی تو اس یقین کے ساتھ کہ بچہ اُس کی مصروفیات میں حارج نہیں ہوگا اور اُ
سی جان کا یہ عالم تھا کہ رمضان کے دِنوں میں دودھ پینے سے اجتناب برتنے لگا۔ اُس کی شخصیت میں ایسی عجیب سی مقناطیسی کش
کہ جس پر نظر ڈالتا اُس میں ایک حیرت انگیز تغیر رونما ہو جاتا اور پھر خود بخود بنا کسی تبلیغ و ترغیب کے کلمۂ شہادت پڑھ کر وہ حلقہ
میں آجاتا۔ یہ ایک عجیب و غریب صورتحال تھی۔ جس سے غیر مسلم بے حد خائف تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے باہمی صلاح مشورے
بچے کے باپ بازید محمد سے درخواست کی کہ جب بھی آپ کا بچہ اکیلا یا آپ کے ہمراہ باہر نکلے۔ براہِ مہربانی منادی کرا دیا کریں تا
ہم مذہب بھائی اُس سمے خود کو اس بچے کی نظروں سے دُور رکھ سکیں۔ بازید محمد نے مسکرا کر خندہ پیشانی سے اُنہیں اُن کے مطا
اثبات میں جواب دیا اور پھر فضا وہ عجیب منظر دیکھتی کہ جب بھی اُس بچے کے باہر نکلنے کا اعلان ہوتا غیر مسلم خود کو اپنی پناہ گاہ
چھپا لیتے کہ کہیں حق کا یہ ناقابلِ تردید نور اُن کے باطل نظریے پر اثر انداز نہ ہو۔
وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ بچہ شعور کی منزلیں طے کرتا، جذب و مستی میں غرق پروان چڑھتا رہا۔ ایک دن وہ خدا کی یاد
شورکوٹ کے نواح میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اُس پر بے خودی سی چھا گئی۔ ایک بے نام سی پُرسکون کیفیت میں اُس نے
نورانی چہرہ دیکھا۔ جس نے اپنائیت سے اُسے پکڑ کر قریب بٹھایا اور پھر بڑے دلنشیں انداز میں اُسے آگاہ کیا کہ "میں علیؓ
ہوں"۔ بچہ کم عمر تو تھا لیکن کم علم نہیں۔ اُس نے جو علیؓ کو یوں سامنے دیکھا تو قریب تھا کہ وہ وفورِ مسرت سے خود کو اُن پر نث
حضرت علیؓ نے اُس پر توجہ مرکوز کر کے اُس میں حوصلہ پیدا کیا اور فرمایا "فرزند! آج تم رسولؐ کے دربار میں طلب کیے گئے ہ
اور پھر جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ہر شے ساکت ہو گئی ہوا اور بچے نے لمحوں میں خود کو آنحضورؐ کی بارگاہ میں خود کو پایا جہاں
فاروقِ اعظمؓ اور عثمان غنیؓ بھی موجود تھے۔ رسول اللہؐ نے بچے سے پہلے خود بیعت لی پھر اُسے حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا اور
معصوم کی دُنیا ہی بدل گئی۔ جوانی کی منزل میں قدم رکھا تو سُلطان العارفین شیخ سلطان باہو کے نام سے مشہور ہوئے۔
حضورؐ سے شرفِ ملاقات کے سبب سُلطان باہو اب ہر وقت اہرلحہ حق کے مشاہدوں سے مشرف اور ذاتِ وحدۃ لاش
کے جاہ و جلال میں مست رہتے۔ اولیا کے مقبروں پر حاضری دیتے۔ زندہ مشائخ کے پاس جاتے۔ خدا کی واحدنیت کا پرچار ک
رات دل میں اللہ کی محبت کی جوت جگائے اللہ ہُو اللہ ہُو کا ورد کرتے رہتے۔

سلطان باہو نے کسی قسم کا کتابی علم تو حاصل نہیں کیا تھا لیکن اُن کے سینے میں روحانی علم کا ایک سمندر موجزن تھا۔ فقر، تصوف، معرفت کے ملفوظات کا ذخیرہ ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ شریعت۔ طریقت اور حقیقت جیسے مشکل اور نازک موضوعات پر لاتعداد تصانیف اُن کی ہیں۔ اپنی ایک کتاب میں فرماتے ہیں "لوگو! میں نے جو کچھ دیکھا، ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا جو سر میں ہوتی ہیں اور اس ظاہری دیکھا اور مشرف ہوا۔"

شیخ سلطان نے علوم کے حصول کے لیے کوچہ گردی اور صحرانوردی کا سلسلہ اختیار کیے رکھا۔ آپ تجسس کی مسافت کے راستوں کو مختلف درویشوں اور فقیروں سے ملے، لیکن کوئی بھی آپ کی کسوٹی پر پورا نہ اترا۔ علم کے سفر میں، آپ نے لاتعداد فقرا سے بغداد حبیب اللہ قادری کا تذکرہ سُنا تو اُن سے ملاقات کی خواہش دل میں مچلی۔ سو اس شوق کی تکمیل کی خاطر آپ نے ہندوستان سے کا طویل سفر طے کرنے کے لیے رختِ سفر باندھا اور بغداد جا پہنچے۔ شاہ حبیب اللہ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو دیکھا خانقاہ درویشوں اور خدام سے بھرے ہیں اور لوگ جوق در جوق۔ ایک جانب ہلکی آنچ پر رکھی پانی سے بھری دیگ میں ہاتھ ڈالتے جاتے ہیں اور مُرادیں پاتے ہیں۔ آپ نے خاموشی سے یہ سب منظر دیکھا اور چُپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئے۔ دفعتہً شاہ حبیب اللہ کی نظر اُن پر پڑی تو نے سلطان باہو سے کہا۔ "تیری ظاہری حالت سے تو دکھائی دیتا ہے کہ تُو طویل مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے پھر اب خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ اُٹھ.... تُو بھی دیگ میں ہاتھ ڈال کر اپنی مراد پا۔"

سلطان باہو نے خاموشی سے اُن کی بات سُنی اور ادب سے بولے "مجھے کشف و کرامت کے یہ کھلونے متاثر نہیں کرتے اور نہ میری ہی ہے جو اس طرح بر آئے۔ میں وہ مقام پانا چاہتا ہوں جہاں ذاتِ حق کے سوا کوئی نہ ہو۔ حق باہو۔ یا ہو۔"

شاہ حبیب اللہ نے چونک کر اُن پر نظر ڈالی اور کہا۔ "درویش بے شک تیری آواز بلند تر ہے لیکن کیا تو جانتا ہے کہ بُلند آرزو کی کے مراحل کتنے کٹھن ہیں۔"

بے شک۔" سلطان باہو نے عزم سے کہا۔ "میں نے یہ طویل مسافت بے سبب طے نہیں کی۔ آپ حکم دیجئے۔"

شاہ حبیب کچھ دیر تک آپ کے چہرے پر نظریں جمائے آپ کو دیکھتے رہے پھر بولے "اچھا۔ فی الحال پانی بھر" یہ کہہ کر اُنہوں نے کو بُلایا۔ جس نے ایک مشکیزہ لا کر آپ کے حوالے کر دیا۔ شاہ باہو نے وہ مشکیزہ تھاما اُسے پانی سے بھرا اور لے جا کر حوض میں حوض ایک ہی مشکیزہ سے لبالب پانی سے بھر گیا۔ شاہ حبیب سمیت حاضرین نے حیرت سے اُسے دیکھا چنانچہ اگلے لمحے شاہ حضرت باہو سے مخاطب ہوئے "آزمائش کے لیے خود کو آمادہ پاتا ہے؟" آپ نے فوراً آمادگی ظاہر کی۔ شاہ حبیب نے پوچھا "تیرے لی دنیاوی مال و اسباب بھی ہے کیا؟"

آپ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاہ حبیب برجستہ بولے "درویش اور دُنیاوی مال کا آپس میں کیا تعلق؟ ایک میان میں دو تلواریں کیسے رکھی جا سکتی ہیں؟ ایک دل میں دو محبتیں جمع کرنا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر سلطان باہو تقریباً بھاگتے ہوئے خانقاہ سے نکلے اور بغداد سے نکل کر ہندوستان کی طرف گامزن ہوئے۔ گھر جا کر اُنہوں مال و زر اکٹھا کیا اور باہر پھینک دیا۔ حتیٰ کہ پنگھوڑے میں لیٹے اپنے شیر خوار بچے کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی بھی اُتار کر باہر اگلی صبح پھر وہ طویل مسافت طے کر کے بغداد پہنچے اور سیدھے خانقاہ میں گئے۔ درویش شاہ حبیب نے اُنہیں دیکھتے ہی اُٹھ استقبال کیا اور بولے۔ "بے شک تم نے دنیاوی مال سے تو نجات حاصل کر لی مگر ابھی اپنی عورتوں سے آزادی حاصل نہیں کر پائے۔ بیوں سے کس کا حق ادا کرنے کا ارادہ ہے؟ بیویوں کا حق ادا کرو گے یا خدا کا؟"

یہ سُننا تھا کہ سلطان باہو بنا کچھ کہے، آرام کیے بغیر ایک بار پھر اپنے طویل سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ منزلوں پر منزلیں سر کرتے وہ گھر والدہ نے اُسے دیکھتے ہی پہلے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ ایک پرہیزگار نیک خاتون تھیں۔ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بیٹا آج کس نیت

اپنے ایک مرید کے زانوں پر رکھے سو رہے تھے۔ ریت پر سونے سے اُن کا لباس اور جسم خاک آلود ہو گیا۔ مرید نے جو مُرشد کو اس حال میں دیکھا تو دل ہی دِل میں تاسف کا اظہار کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کاش میرے پاس زر و جواہر ہوتے تو آج اپنے پیر کو یوں زمین پر نہ سُلاتا۔ سُلطان باہو نے اُسکے زانوں سے سر اُٹھا کر پُوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟" مرید نے جو محسوس کیا تھا اور پھر جو سوچا تھا سب آپ کو کہہ سُنایا۔ آپ نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور کہا "ذرا آنکھیں تو بند کر۔" مرید نے حُکم کی تعمیل کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک باغ بے مثل ہے۔ ہر سو مہکتی فضا ہے اور ایک حسین و جمیل لڑکی جواہرات میں لدی پھندی اُس سے کہہ رہی ہے "مجھ سے نکاح کر لو۔" مرید نے دھیمے لہجے میں کہا "دُور ہو کمبخت۔ کیوں مجھے مُرشد کی نظروں سے گرانا چاہتی ہے۔" اور پھر اُس کی آنکھیں خود بخود کھُل گئیں اور پلکیں شرم سے جُھک گئیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے اُس سے پُوچھا "کیا دیکھ رہا تھا؟" مُرید نے سب حال کہہ سُنایا۔ آپ نے پوری بات سُننے کے بعد کہا "تو کیسا ہے۔ ابھی تو دولت کی طمع کر رہا تھا۔ وہ دُنیا ہی تو تھی۔ تُو نے اُسے ہی ٹھکرا دیا۔" مرید نے سر جُھکائے کہا۔ مُرشد خادم زر و جواہر کا نہیں فقر کا خواہش مند۔" آپ نے اِس کے حق میں دُعا کی۔

سُلطان باہو نے ۱۱۰۲ ہجری میں وفات پائی۔ آپ کے مزار پر جذب و مستی کا غلغلہ ہوتا ہے۔ ہر سُو خوشبو کے جھونکے چلتے ہیں اور تاریک راہوں کے بھٹکے مسافر آپ کے مزار پر ہدایت کی راہ پانے ہزاروں کی تعداد میں روزانہ آتے ہیں۔ باہو کسی کو بھی محروم نہیں لوٹاتے۔ سبھی آنکھوں میں مشعلیں روشن کر کے ہی واپس پلٹتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کے فیوض کا چشمہ آپ کے وصال کے بعد بھی لوگوں کی پیاس بجھاتا رہا لوگ فیض یاب ہوتے رہے۔ مثلاً ڈیرہ اسماعیل خان کے حاکم ہوت بلوچ کا واقعہ اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ کم عقل شخص ایک خوبصورت لڑکے پر فریفتہ ہو گیا اور اُس کے ساتھ شادی کا ارادہ کر بیٹھا۔ لوگوں کے لعن طعن سے بچنے کی خاطر اُسنے مولویوں سے فتویٰ لینے کی ٹھانی۔ قرعہ فال نور محمد موچی کے نام پڑا جو سُلطان باہو کے سلسلے سے تھے۔ اُس نے مولانا نور کو بلایا اور قتل کی دھمکی دے کر اپنے حق میں فتویٰ دینے کے لیے کہا لیکن وہ انتہائی بے خوفی سے کہنے لگے "ہوش میں آ۔ بدمست شخص۔ مرد کے لیے لڑکی سے بیاہ حلال ہے تُو لڑکے سے شادی رچانے چلا ہے۔ کیوں خود پر ظلم کرتا ہے۔ حرام کام سے باز آ۔"

ہوت بلوچ کو اس جواب کی اُمید نہ تھی وہ غُصّے سے آگ بگولا ہو گیا اور آپ کو گرفتار کرا کے جیل میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی جتا دیا کہ سورج کی روشنی تبھی دیکھ سکو گے جب میرے حق میں فتویٰ دینے کے لیے خود کو آمادہ پاؤ۔ مولانا نور محمد نے اُسے تو کوئی جواب نہ دیا البتہ قید خانے پہنچ کر جہاں اللہ سے مدد مانگی وہاں پنجابی میں ایک نظم فریادی لہجے میں لکھ کر سُلطان باہو کی روح سے رجوع کیا۔ اُس کی فریاد رائیگاں نہ گئی۔ ہوت بلوچ، شاہی فوجیوں کے معزول ہو کر قید خانے میں ہی چل بسا اور نور محمد آزاد کر دیے گئے۔

- اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا تمہیں اچھا تصور کرے تو اپنی تعریف اپنی زبان سے نہ کرو ——— پاسکل
- تصویر، تصور اور شے کے درمیان کوئی چیز ہوتی ہے ——— [illegible]
- دُنیا میرا مُلک ہے اور اچھائی میرا مذہب ——— تھامس پین
- کتاب لکھنی ہو تو مصنف ایک منصوبہ بناتا ہے۔ یہ بات منصوبے کے سبب سے آخر میں معلوم ہوتی ہے کہ کتاب شروع کہاں سے کی جائے ——— [illegible]
- پڑھا لکھا احمق، جاہل احمق سے بڑا احمق ہوتا ہے ——— مولیئر
- میں اچھی خوراک پر زندہ ہوں، اچھے الفاظ پر نہیں ——— مولیئر
- شریف آدمی وہ ہے جو کسی کو دُکھ نہ پہنچائے ——— [illegible]
- خالص آزادی سے اچھے آدمیوں کے سوا کوئی محبت نہیں کرتا۔ عام لوگ خالص آزادی کے نہیں ہر کام کی کھلی آزادی کے خواہاں ہوتے ہیں ——— [illegible]

ایرانی

صوبے قومس کے شہر بسطام میں ایک حجرہ موبدان تھا۔ اس میں ایک بہت ہی عابد وزاہد اور نیک نفس بزرگ رہتے تھے۔ جن کا نام شیخ عیسیٰؒ تھا۔ اُن کی زوجہ محترمہ اُمید سے تھیں۔ اُن کو یہ بات شدت سے محسوس ہوتی کہ جب بھی وہ کوئی مشتبہ غذا الاعلمی میں کھا لیتیں تو اُن کو عجیب قسم کی بے کلی اور بے چینی سے دوچار ہونا پڑتا اور جب تک وہ غذا اُن کے پیٹ سے باہر نہ آجاتی اُنکی طبیعت بے قرار ہی رہتی بعض اوقات تو اُن کو حلق میں اُنگلی ڈال کر وہ غذا باہر نکالنی پڑتی۔ اس کیفیت کو وہ بہت شدت سے محسوس کرتی تھیں۔ بچے کی ولادت میں ابھی چند ماہ باقی تھے کہ شیخ عیسیٰ اس دارِفانی سے رحلت فرما گئے۔ باپ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والا یہ یتیم بچہ آئندہ زندگی میں روحانیت کی کن بلندیوں کو چھوئے گا اور سلطان العارفین کہلائے گا اس بات سے کوئی بھی واقف نہیں تھا کہ یہ بچہ کون تھا۔ اس کو کیا مقام ملا یہ بعد کی آنے والی دُنیا نے دیکھا اور رہتی دُنیا تک اُس کا نام روشن رہے گا۔ یہ یتیم بچہ حضرت بایزید بسطامیؒ تھے۔ آپکو بزرگانِ دین میں وہ مقام حاصل ہے جو فرشتوں میں جبرئیلؑ کو حاصل ہے۔ توحید کے معاملات اور مسائل میں تمام بزرگوں کی انتہا آپ کی ابتداء ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ حضرت کے گلستان میں جو پھول لوگوں نے دو سو سال کی محنتِ شاقہ سے حاصل کیے وہ میں نے اپنی اوائل عُمری میں ہی حاصل کر لیے۔ بزرگان کی متفقہ رائے ہے کہ بایزیدؒ کے مراتب تک کوئی اور نہیں پہنچا۔

آپ نے مکتب میں داخل ہوتے ہی قرآن مجید کی آیات سے استدلال حاصل کرنا شروع کر دیا۔ آپ خدا کے اس فرمان کو کہ "میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو" پڑھ کر بہت زیادہ بے چین ہوئے اور والدہ سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا۔ والدہ نے کہا کہ میں تم کو خدا کے سپرد کرتی ہوں تم خدا کا شکر ادا کرو اور علم کی تلاش کرو۔ علم کی تلاش میں آپ نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں خاک چھانی۔ بہت سے علماء اور مشائخ حضرات سے ظاہری اور باطنی علوم سیکھے۔

وہ مسلسل تیس سال شام کے صحراؤں اور میدانوں میں پھرتے رہے۔ اس مدت میں آپ نے ۱۱۰ علماء اور مشائخ سے فیوض حاصل کیے۔ آپ کے اساتذہ میں امام جعفرؓ بھی شامل ہیں۔ آپ نے اپنے اساتذہ کی طرف کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ بہت جلد کامل ہو گئے۔ امام صاحب کے حکم سے آپ واپس بسطام لوٹے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بلاشبہ میں نے اساتذہ اور علماء سے علوم دینوی اور دُنیاوی سیکھے ہیں۔

لیکن درحقیقت یہ راہنمائی اور فیض مجھے اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ دیگر مشائخ اور بزرگوں نے علم اپنے جیسے لوگوں اور بزرگوں سے سیکھا تبھی ان کا علم باقی نہیں رہا جبکہ میں نے علم خدا سے حاصل کیا اس لیے میرا علم زندہ ہے۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک کہ "جو شخص اس چیز پر عمل کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے تو اسے خدا ایسے علم کا وارث بنا دیتا ہے جو اُسے معلوم نہیں ہے" کی تفسیر تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے علم کا ماخذ خدا کی بخشش ہے۔

آپ کرامات ظاہر کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے ساتھ کافی مدت رہا، پھر آپ سے بددل ہو کر جانے لگا۔ آپ نے اس طرح جانے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اتنی مدت ساتھ رہنے کے باوجود اس شخص نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا تم نے مجھے ــــ خلافِ سنت اور خلافِ شریعت کبھی کوئی کام کرتے دیکھا۔ جواب ملا۔ بالکل نہیں۔ آپ اس پر سختی سے پابند ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اس سے بڑی اور کیا کرامت ہوگی۔

آپ ہمیشہ مسجد کی خدمت کرتے۔ آپ نے چالیس سال تک مسجد کی صفائی ستھرائی کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت لرز جاتے کہ مبادہ کہیں میں ناپاک تو نہیں ہوں کہ اس طرح میرے جانے سے مسجد آلودہ نہ ہو جائے۔ آپ کے مجاہدات بہت سخت تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ آدھی رات کو ارادہ کیا کہ میں بقیہ رات عبادت ــــ کروں گا جبکہ نفس نے مخالفت کی اس پہ آپ نے قسم کھائی کہ میں اپنے نفس کو ایک سال تک پانی سے محروم رکھوں گا۔ چنانچہ ایک سال آپ نے پانی کے بغیر گزارا۔ بقول مولانا روم "پانی کا بکثرت استعمال سستی اور کاہل کا باعث بنتا ہے"۔

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جناب بایزید بسطامی کے مجاہدات اور نفس کُشی کے متعلق اپنے مریدین کو بتلایا کرتے تھے کہ اسلام نام کے طور پر تو بہت آسان ہے لیکن اس کے کام اور پابندیاں بہت مشکل ہوتی ہیں بایزید فرماتے کہ جب میں مسلمان ہوں۔ لوگ مجھے مسلمان سمجھتے ہیں تو میں مسلمان ہونے کا حق کیوں نہ ادا کر دوں۔

جب حضرت بایزید خراسان کی سیاحت میں مصروف تھے تو آپ کو حج کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ آپ ہر قدم پر نفل ادا کرتے کرتے کعبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حج کے بعد آپ نے خیال کیا کہ میں خدا کے گھر گیا ہوں لیکن گھر والا مجھے کہیں نظر نہیں آیا لہٰذا میرا حج قبول نہیں ہوا۔ دوسرے سال بھی اسی طرح ہوا لیکن تیسرے سال آپ بہت خوش ہوئے کہ اب کی مرتبہ مجھے گھر والا ہی چار سُو نظر آیا اور گھر نظر نہیں آیا۔

حضرت بایزید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے مکہ جاتے تو مدینہ نہ جاتے کہ یہ خلافِ ادب ہے کہ مدینہ کی زیارت مکہ کے ماتحت رکھی جائے بلکہ وہ مدینہ باقاعدہ اہتمام کے ساتھ جاتے۔

آپ کے ایثار کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حج پر روانہ ہو رہے تھے کہ ضرورت مند آ گیا۔ آپ سے کہا کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے آپ نے فرمایا۔ میرے پاس ۲۰۰ دینار ہیں اور میں حج پر روانہ ہو رہا ہوں۔ اُس نے سوال کیا کہ میں ضرورت مند ہوں آپ یہ رقم مجھے دے دیں اور میرے گرد طواف کر لیں آپ کا حج ہو جائے گا اور میری ضرورت پوری ہو جائے گی۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔

نفس کُشی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو عمر بھر سیب کھانے کی آرزو رہی لیکن صرف اس وجہ سے نہیں کھایا کہ اس سے نفس کو تسکین حاصل ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ ایک عقیدت مند سیب لایا آپ نے حاضرین میں تقسیم کر دیئے اور فرمایا کہ اگر میں نفس کی آرزو پوری کر دوں تو یہ مجھ پر غالب آ جائے گا اور میں کچھ بھی نہ رہوں گا۔ جو شخص نفس کی آرزو پوری کرے وہ ہیچ ہے اس کے عمل میں سستی واقعی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک عقیدت مند کہیں سے بہت ہی خوبصورت سیب لایا غالباً اُس کو معلوم تھا کہ حضرت کو سیب بہت پسند ہیں۔ آپ نے سیب دیکھا اس کی رنگت اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ کس قدر لطیف سیب ہیں، ساتھ ہی خیال آیا کہ اللہ کا نام لطیف ہے اور یہ نام سیب کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ بہت پشیمان ہوئے۔ اس کے بعد عمر بھر سیب کو چھوا تک بھی نہیں۔

حضرت بایزید ایک مرتبہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر حاضر تھے درود و سلام کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی عالم

میں غنودگی طاری ہو گئی۔ آنحضرتؐ کا دیدار ہوا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ بایزید اُٹھو اور جا کر اپنی ماں کی خدمت کرو۔ آپ اُسی وقت بسطام کے لیے روانہ ہو گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا آپ کی آمد کی خبر سُن کر لوگ آپ کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے۔ آپ کا نفس اس طرح والہانہ استقبال پر بہت خوش ہوا۔ آپ نے فوراً روٹی کھانا شروع کر دی۔ لوگ آپ سے بدظن ہو کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بعد میں آپ نے اپنے خاص مریدین کو بتلایا کہ یہ لوگ کس قدر ظاہر بین ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے۔ آپ جس وقت اپنے گھر پہنچے اس وقت آدھی رات ڈھل چکی تھی آپ کی والدہ محترمہ مناجات اور ورد و وظائف میں مشغول تھیں اور دُعا کر رہی تھیں کہ یا اللہ میرے لختِ جگر کو واپس بھیج دے۔ آپ نے فوراً دروازے پر دستک دی اور کہا کہ والدہ میں آپ کا بیٹا بایزید ہوں اور واپس آ گیا ہوں۔ آپکی والدہ آپکی جدائی میں بینائی سے محروم ہو چکی تھیں اور ان کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔ اُنہوں نے فوراً آپ کو کلیجے سے لگا یا۔ اُس کے بعد بایزید کہیں نہیں گئے۔ ماں کی خدمت کرتے رہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ماں کی خدمت اور رضا جوئی ہر کام پر فوقیت رکھتی ہے۔ جو کچھ باہر جا کر مجاہدوں اور ریاضتوں میں تلاش کرتا رہا وہ ماں کی خدمت میں مل گیا۔ آپ نے والدہ کی بہت خدمت کی۔ ایک رات کو آپ کی والدہ نے پانی مانگا گھر میں پانی موجود نہیں تھا۔ آپ دریا سے پانی لینے چلے گئے واپس آئے تو والدہ سو چکی تھیں آپ اس خیال سے والدہ کے سرہانے رات بھر پانی پکڑے کھڑے رہے کہ مبادا والدہ جاگ جائیں اور پانی نہ پی سکیں۔ آپ کے ہاتھ سخت سردی کی وجہ سے ٹھٹھر گئے لیکن آپ اس وقت تک کھڑے رہے جب تک آپکی والدہ کی آنکھ نہ کھلی اور اُنہوں نے پانی نہ پی لیا۔ آپ کی والدہ نے ایک مرتبہ رات کو بایزید کو کہا کہ کمرے کا آدھا دروازہ کھول دو۔ آپ ساری رات دروازے کے پاس کھڑے رہے۔ کہ کہیں آدھا دروازہ بند نہ ہو جائے اور والدہ کی حکم عدولی نہ ہو۔ آپ نے ماں کی خدمت کر کے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کے ایک مدت سے متلاشی تھے۔

آپ نے خدا سے ایک دُعا کی کہ جب تک تو کسی ایسے کامل بندے کو نہیں بھیجے گا جو مجھے میری حقیقت سے آگاہ کرے میں اس وقت تک جنگل میں پڑا رہوں گا۔ آپ تین دن اور تین راتیں اسی طرح لیٹے رہے چوتھے روز ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر آیا۔ آپ نے اونٹ کو دیکھا تو اُس کے پاؤں زمین دھنسنے لگی۔ اس پر سوار نے نہایت غصّے کے عالم میں کہا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی کھلی آنکھ کو بند کر لوں اور بند آنکھ کو کھول لوں تاکہ بایزید سمیت پورا بسطام غرق ہو جائے۔ آپ حیران ہوئے اور اس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو اُس نے بتلایا کہ جب تم نے کسی کامل شخص کو خدا سے طلب کیا، میں تقریباً یہاں سے تیس ہزار میل دُور تھا اور یہاں تیرے پاس آیا ہوں اور تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ اپنے دل کی نگرانی کرو۔

ایک رات حضرت بایزید بسطامی عبادت میں مصروف تھے کہ آپ کا حجرہ ایک دم منوّر ہو گیا۔ آپ حیران ہوئے اور فرمایا کہ اگر تو یہ شیطان کی کارستانی ہے تو میں اُس کے قریب میں آنے والا نہیں اور اگر یہ نورِ مقربین کی جانب سے ہے تو میں اُس کو اپنی خوش نصیبی خیال کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ آپ کو عبادت میں سکون نہیں آ رہا تھا آپ گھبرا گئے گھر والوں سے دریافت کیا کہ گھر میں کوئی چیز تو نہیں ہے۔ پتہ چلا ایک انگور کا گچھا موجود ہے۔ آپ نے اُس کو فوراً خیرات کر دینے کا حکم دیا۔ اس پر اُن کے اوپر انوار کی بارش ہونے لگی اور عبادت کا مزا دوبالا ہو گیا۔ آپ ہی کے متعلق ایک غیر مسلم نے کہا تھا کہ اسلام اس کا نام جو بایزید کو حاصل ہے تو اُس کی مجھ میں طاقت نہیں اور اگر اسلام وہ ہے جس کے تم سب لوگ نمائندے ہو تو مجھ کو اُس پر اعتماد نہیں ہے۔

کسی شخص نے حضرت بایزید سے سوال کیا کہ آپ کا مرشد کون ہے آپ نے فرمایا ایک بوڑھی عورت کیونکہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا۔ ایک بڑھیا سر پہ آٹا اُٹھائے آ رہی تھی تھکاوٹ اور پیراں سالی کی وجہ سے وہ بوجھ اُٹھانے سے قاصر تھی چنانچہ مجھے کہا کہ میں یہ اس کے گھر پہنچا دوں۔ اسی اثناء میں ایک شیر آ گیا اور بایزید فرماتے ہیں کہ میں نے آٹا شیر کی کمر پر رکھ کر بڑھیا سے کہا کہ آٹا تو یہ شیر تمہارے گھر پہنچا دے گا مگر اس سلسلہ میں لوگوں سے کیا کہیں گی۔ اس پر بڑھیا نے جواب دیا کہ میں کہوں گی کہ آج جنگل میں میری

مُلاقات ایک خودنما ظالم سے ہُوئی۔ بایزید سٹپٹائے اور کہا کہ نیک خاتون تُو نے مجھے خودنما ظالم کیوں کہا۔ اس پر بڑھیا نے کہا کہ جب شریعت نے شیر کو مکلف نہیں بنایا تو تم اپنا بوجھ ایک غیر مکلف کی پشت پر کیوں لاد رہے ہو۔ یہ سراسر ظلم ہے تم ایسا کر کے لوگوں پر اپنی کرامت ظاہر کر رہے ہو اور اس کا نام خودنمائی ہے آپ فرماتے ہیں کہ مَیں نے بڑھیا سے ایسی نصیحتیں اور عبرت حاصل کی اور ایسی باتیں ظاہر کرنے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

آپ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ آپ کے پاس عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ عورتیں نہیں ملائکہ ہوتے ہیں جو میرے ساتھ عبادت کے خواہش مند ہیں مَیں نے کہا مجھ میں اتنی طاقت کیا کہ مَیں آپ کے ساتھ ذکر کر سکوں میرے انکار کے باوجود وہ وقتاً فوقتاً میرے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور اپنی خواہش دہراتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آپ کے ذکر میں کب طاقت آئے گی۔ آپ نے جواب دیا روزِ جزا اور سزا کے دن جب یہ مرحلہ سر ہو جائے گا اور مَیں عرش کا طواف کرتا ہوا اللہ اللہ کے نعرے لگا رہا ہوں گا۔

حضرت بوتراب بخشیؒ نے اپنے ایک مرید کو جو ریاضت کے اعتبار سے بہت زیادہ بلند مرتبہ پر تھا کو بایزید کی صحبت اختیار کرنے کے لیے کہا اور فرمایا کہ جب تک تُو بایزید سے فیض حاصل نہیں کرے گا تیری تکمیل ممکن نہیں۔ اُس نے جواباً عرض کیا کہ مَیں جن مراحل کو سر کر کے خداشناسی جانتا ہوں بایزید مجھے کیا بتلا سکیں گے۔ حضرت بوترابؒ نے فرمایا جس پیمانے پر تُو نے خدا کو پہچانا ہے وہ نامکمل ہے۔ حقیقی دیدار بایزید کی توجہ سے ممکن ہے۔ کیونکہ روزِ قیامت خداوند کریم ایک تجلی ساری مخلوق پر ڈالے گا اور ایک تجلی صرف حضرت صدیق اکبرؓ پر ڈالے گا۔ یہ سُن کر وہ مُرید بوتراب کے ساتھ ہو لیے جب بایزید کے حجرے تک پہنچے تو بایزید پانی لینے کی غرض سے جنگل کی طرف گئے ہُوئے تھے۔ مرید نے بایزید کو آتے دیکھا نظریں چار ہوئیں اور وہ ہیبت سے اس قدر لرزہ براندام ہوا کہ وہیں پڑا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ بوتراب بخشیؒ نے بایزید سے کہا حضرت آپ نے تو ایک نظر میں اس کا کام تمام کر دیا۔ آپ نے فرمایا اس میں کشف کا ایک مقام خالی رہ گیا تھا جو اُس کو اس وقت حاصل ہُوا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکا۔

بایزید چالیس سال مسجد میں مقیم رہے اس مدت میں انہوں نے مسجد کی دیوار کے سوا کسی چیز سے ٹیک نہیں لگائی۔ چالیس سال عام انسانوں جیسی غذا چکھ کر بھی نہیں دیکھی۔ فرماتے تھے کہ میرا رزق اُوپر سے آتا تھا اور مَیں صرف اپنے دل کی نگرانی کرتا رہا۔ اس کے بعد غور کیا تو معلوم ہُوا کہ ہر سمت بندگی اور خدائی نظر آئی۔ پھر مَیں نے مکمل تیس سال خدا کی جستجو میں گزار دیئے۔ پھر خدا کو طالب اور خود کو مطلوب پایا۔ تیس سال سے میری یہ کیفیت رہی کہ جب بھی خدا کا نام لینا چاہتا تو زبان کو دھو لیتا۔

بایزید پر وجد کی کیفیات طاری ہوتیں اور آپ لوگوں میں کھڑے ہو کر ایسی باتیں کرنا شروع کر دیتے۔ جو عام فہم سے بالاتر ہوتیں اور لوگ ان کو شرک سے تعبیر کرتے اور کفر کے فتویٰ صادر کر دیتے۔

ایک مرتبہ آپ نے بسطام شہر میں ایک بہت بڑے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو تمام اسرار و رموز الٰہی سے سرفراز فرما کر تمام موجودات سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا مَیں نے خدا کے نُور اور اپنے نُور کا مشاہدہ کیا لیکن میرا نُور تاریک اس کا نُور روشن ہے۔ مَیں کم تر ہوں۔ وہ مصفا اور مشفا ہے جبکہ میرے اندر کثافت ہے۔ میری عبادات اس کے حکم سے ہیں جبکہ فاعل خدا کی ذات ہے۔ وہ جب کسی کو کام کرنے کا حکم دے تب ہی وہ کام ہو سکتا ہے۔ مجھے میری ہستی کی فنا نے بقا عطا فرمائی۔ اس طرح مجھے ازلی علوم سکھائے گئے۔ میری آنکھوں کو نُور عطا ہُوا۔ مجھے سب کے ساتھ رکھ کر بھی سب سے جُدا کر دیا گیا۔ مجھے وسائل کے بغیر تمام وسائل حاصل ہو گئے لیکن مَیں نے ان چیزوں سے قطع نظر ہو کر اپنے وجود کو اس کے وجود کے بغیر ناپسند جانا پھر شریعت اور اعتدال کی حدود سے نکل جانے کا حکم ہُوا مَیں بھی یہی چاہتا تھا۔ میری تمنا بر آئی اور میری ذات نقص و عیب سے پاک ہو گئی۔ اس پر لوگوں نے کفر کے فتوے لگا دیئے۔ قاضی حسین بن عیسٰی نے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ آپ نے اُس کو مخاطب کر کے کہا اے بزرگ تُو قاضی ہی نہیں ایک مدرسہ کا ناظم اعلیٰ بھی ہے، لیکن تُو نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں الفاظ تھے علم نہیں
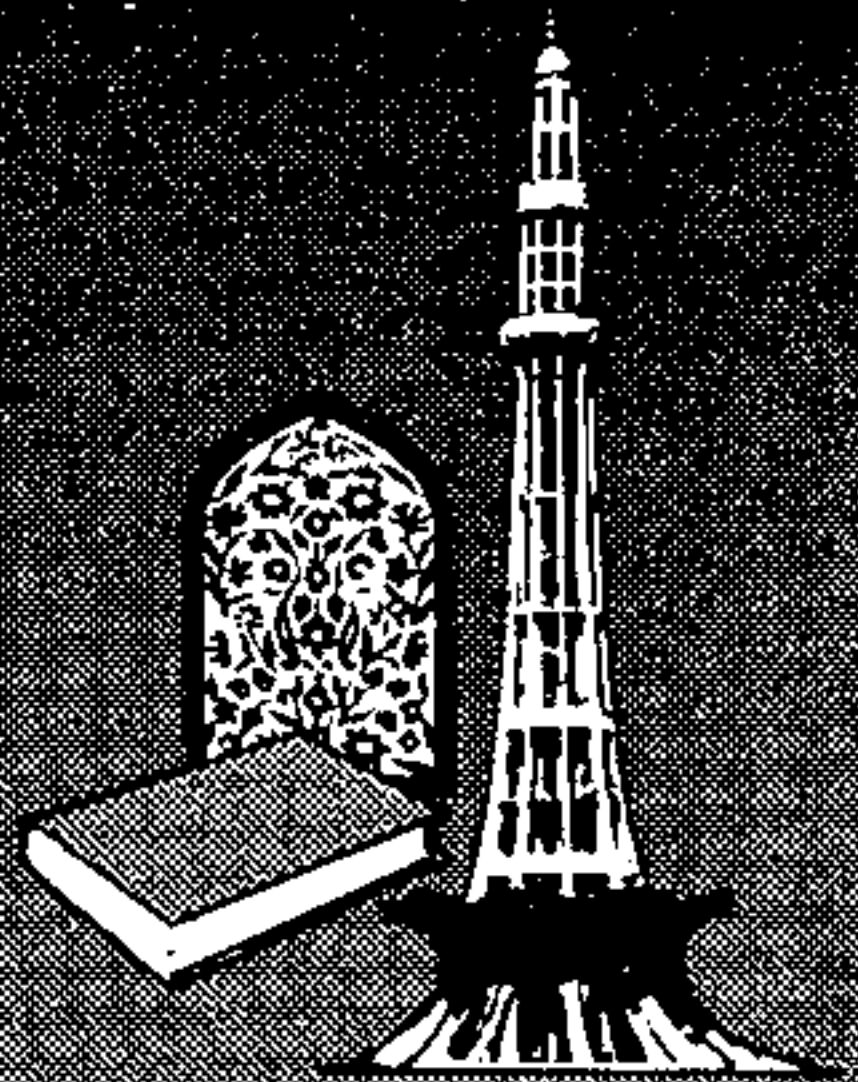
اللہ نے مجھے علم دیا۔ میرے قلب کی تاریکی اور میرے نفس کی کثافت دُور کر دی۔ اللہ نے میری حیات اور مجھے اپنے فضل و کرم میں ملبوس کر دیا۔ میں نے اللہ سے صرف اللہ کو طلب کیا۔ اس نے مجھ پر اپنی رحمت کی بارش نازل فرمائی اور صاحب کرامت بنا دیا۔ اس طرح میں نے حق دیکھ لیا اور پا لیا۔ آپ کی طرف دیکھ کر قاضی عیسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو بایزید نے فرمایا کہ حسین بن عیسیٰ سُن میں نے تیس سال وحدانیت کے علوم حاصل کیے۔ تیس سال الوہیت کی فضا میں پرواز کی۔ اس طرح میں چار ہزار مراتب طے کرنے کے بعد اولیا کے مقام تک پہنچا اور میں نے محسوس کیا کہ ولایت کی انتہاء نبوت کی ابتداء ہے اور نبوت کی کوئی انتہاء نہیں۔ اس کے بعد مجھ کو بہشت و جہنم اور ملائکہ سے مشاہدہ کروایا گیا۔ مجھے انبیاء سے نیاز حاصل ہوا۔ میری رُوح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر پہنچی، چہار سُو نور کے حجابات تھے سو میری رُوح آنحضورؐ کے دیدار سے محروم رہی۔ مجھ پر ہیبت اور غشی طاری ہو گئی۔ ہوش آنے پر میں نے در حضور کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ اس طرح مجھے خدا تک رسائی ہوئی۔ قاضی شہر آپ پر کوئی فتویٰ صادر نہ کر سکا۔ اُس کی عقل و خرد بیکار ہو گئی۔ آپ کی باتیں قاضی کی سمجھ سے بالا تھیں وہ آپ سے نظر ملانے کی ہمت خود میں نہیں پا رہا تھا لیکن حاکم بالا نے آپ پر حد لگانے کا حکم دیا تھا۔ وہ ماننا بھی ضروری تھا، چنانچہ اُس نے عرض کی کہ بایزید آپ بسطام چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ آپ کی باتیں میرا دل سمجھ رہا ہے لیکن یہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح یہ لوگ آپ کو بُرا کہنے سے بچ جائیں گے۔ آپ نے قاضی کی بات تسلیم کر لی اور فوراً شہر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ اور فرمانے لگے اے شہر تو کتنا اچھا ہے اور میں کتنا بُرا ہوں۔

اسی طرح بایزید وجد کے عالم میں بعض اوقات ایسے کلمات زبان سے ادا کر دیتے کہ سننے والا اُن کے ایمان پر شک کرنے لگ جاتا اور اُن کے مرتد اور کافر ہونے کا خیال کرنے لگ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو سات مرتبہ بسطام سے نکالا گیا۔ پھر اُن کی خدا رسیدگی کی وجہ سے لوگ اُن کو واپس بسطام لے آتے۔ آپ کو اس بات کا شدت سے احساس رہتا کہ میری عبادت میں کہیں خلل نہ پڑے۔ آپ اس وجہ سے اپنے گھر کے در و دیوار کے تمام سوراخ بند کر دیتے۔ عموماً اپنا سر زانو میں لیے رکھتے۔ ایک مرتبہ آپ نے تیس سال تک کسی سے بات نہیں کی۔

ایک دفعہ آپ کے مُنہ سے نکل گیا کہ میں پاک ہوں اور آپ اپنی شان کی بڑائی بیان کرنے لگے۔ جب وجد تمام ہوا تو آپ نے عقیدت مندوں سے کہا کہ اگر آئندہ میں اس قسم کے کلمات کہوں تو مجھ کو قتل کر دینا، چنانچہ دوسری مرتبہ جب آپ نے اسی قسم کی باتیں کیں تو مجمع آپ پر تلواریں لے کر ٹوٹ پڑا مگر جب لوگ تلواریں چلاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ تلواریں پانی پر چل رہی ہیں اور چاروں طرف لاتعداد بایزید نظر آنے لگے۔ جب لوگ بے بس ہو گئے تو یہ صورت حال خود بخود ختم ہو گئی۔ لوگوں نے آپ سے اس بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ سب کرشمۂ خدائی ہے۔ اس میں میرا اپنا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آپ نے عمر بھر سخت سے سخت مجاہدے کیے۔ ضبطِ نفس کی وہ مثالیں پیش کیں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آپ نے زندگی بھر عبادت و ریاضت میں گزارے۔ لاتعداد مرید ہوئے۔ لیکن کسی سے کچھ طلب نہ کیا۔ جب لوگ آپ کی کرامات و عبادات سے متاثر ہونے لگتے آپ کوئی نہ کوئی ایسا کلمہ کہہ جاتے یا کوئی ایسا عمل سرزد کر دیتے جس سے لوگوں کا اعتقاد متزلزل ہو جاتا۔ آپ مطمئن ہو جاتے کہ لوگوں سے آپ کی جان کی خلاصی ہوئی۔

آپ نے کرامات دکھانے سے حتی المکان گریز کیا لیکن بعض اوقات خود بخود کرامات سرزد ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ بارش نہیں ہوتی تھی۔ چرند و پرند بھوک و پیاس کا شکار تھے۔ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ سے دُعا کی درخواست کی۔ آپ نے خدا سے عرض کیا کہ اے مولا! لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ میں کامل بندہ ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں گنہگار ہوں۔ اُسی لمحہ آسمان سے چھاجوں پانی برسنے لگا۔

ایک دفعہ ایک شخص بایزید کے خلاف تھا آپ کے پاس آیا اور کہا مجھے خدا کے رموز سے آگاہ کیجئے۔ آپ نے فرمایا فلاں پہاڑ پر چلے جاؤ۔ وہاں میرا ایک دوست ہے اُس کو ملو۔ وہ فوراً اُس پہاڑ پر پہنچا۔ وہاں ایک کالا اژدہا بیٹھا تھا وہ اُس کی ہیبت سے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا عجیب آدمی ہو۔

خلق کی رموز سے ناواقف ہو اور خالق کی رموز جاننے کی کوشش کرتے ہو۔ وہ شخص بہت نادم ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ شخص مجذوب ہو گیا۔
ایک بار ایک بزرگ "ابوسعید شیخ" آپ کا امتحان لینے کی غرض سے آئے۔ آپ نے فرمایا تم اپنے ایک ہم نام ابوسعید راعی کے پاس چلے جاؤ وہ میرا مرید ہے۔ تمہارے سوالوں کا جواب دے دے گا۔ شیخ ابوسعید اپنے ہم نام ابوسعید راعی کے پاس پہنچے۔ ابوسعید راعی نے پوچھا کیا کام ہے آپ نے فرمایا انگور درکار ہیں، حالانکہ اس وقت انگور موجود بھی نہ تھے اور نہ ہی انگوروں کا موسم تھا۔ چنانچہ ابوسعید راعی نے چھڑی کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا اپنے پاس رکھا دوسرا ابوسعید شیخ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ سے چھڑی کے ٹکڑوں کو زمین میں نصب کر دیا چند لمحوں کے بعد دونوں ٹکڑوں پر انگور کی سبز بیلیں نمودار ہوئیں اور پھر دونوں پر انگور لگ گئے۔ ایک پر سرخ انگور تھے اور دوسرے پر کالے انگور لگ گئے۔ شیخ ابوسعید نے اس کی وجہ پوچھی آپ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ مجھے صدق و یقین کا درجہ حاصل ہے جبکہ تم کو امتحان منظور تھا۔ اس لیے خدا نے ان انگوروں کی رنگت میں قلبی صورتحال نمایاں کر دی۔ وہ بڑے نادم ہوئے اور آئندہ اس قسم کی آزمائشوں سے تائب ہو گئے۔

بایزید اپنی دعاؤں میں ہمیشہ خدا سے دوری اور جدائی کے خاتمہ کا ذکر کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ بخشش اور استغفار کرتے رہتے تھے آپ کو خدا پر کامل بھروسہ تھا۔

۲۶۱ھ شعبان المعظم کی ۱۵ تاریخ کو آپ کا وصال ہوا۔ آپ نے عمر بھر روزے رکھے۔ قرآن مجید کو لاتعداد مرتبہ مکمل کیا۔ راتوں نماز اور نوافل پڑھے۔ آپ کو سلطان العارفین کا درجہ حاصل ہوا۔

خواجہ معین الدین چشتی

دورِ غلامی میں ہند کا برطانوی وائسرائے لارڈ کرزن کہا کرتا تھا کہ "میں نے اپنی زندگی میں دو ایسے بزرگ دیکھے ہیں جو اپنی وفات کے بعد بھی لوگوں کے دلوں پر اس طرح حکمرانی کر رہے ہیں کہ جیسے بہ نفسِ نفیس اُن کے درمیان موجود ہوں۔ اُن میں سے ایک تو مُغلیہ حُکمران اورنگ زیب عالمگیر ہے اور دوسرے خواجہ معین الدین اجمیریؒ"۔

اورنگ زیب عالمگیر کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کے بارے میں لارڈ کرزن کا کہا سچ ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضرت معین الدین چشتیؒ کی مقبولیت کے بارے میں اُس کا قول حرف بحرف حقیقت ہے۔

سُلطان الہند، خواجہ معین الدین اجمیریؒ جو برصغیر کے عوام کے دلوں پر خواجہ غریب نوازؒ کے نام سے حُکمرانی کرتے ہیں۔ ایک فضل و کمال میں یکتا، قطب المشائخ بزرگ کامل درویش تھے۔ عُمر کے پہلے پندرہ سولہ سال کا عرصہ اپنے حال میں مست و سرشار ہو کر گزارا۔ نہ حال پر نظر نہ مُستقبل کی فکر۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ منزلِ مقصود میں تھے۔ لہٰذا باپ کا چھوڑا ہوا ترکہ، جو کہ ایک باغ اور پن چکی پر مشتمل تھا، کو سنبھالا۔ صُبح سے شام تک باغ کی نگہداشت کرنا۔ پرندوں سے پودوں کو بچانا یا پھر پن چکی سے کام لینا۔ یہی مشاغل تھے یہی روزگار تھا۔

ایک دن معمول کے مطابق باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے۔ سورج سوا نیزے پر تھا۔ سخت گرمی میں، محنت مشقت کے اس کام سے جسم پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے سُرخ تھا۔ اپنے آپ مگن دل جمی سے کام میں مشغول تھے کہ اچانک مردِ قلندر، نام جن کا ابراہیم قندوزی تھا، باغ میں داخل ہوئے۔ نوجوان کو باغ کی نگہداشت میں یوں جو مصروف پایا تو چہرے پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ پھر چُپ چاپ خاموشی سے ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر غور سے اُسے دیکھنے لگے۔ اچانک نوجوان کی جو نظر شہر کے مشہور قلندر پر پڑی تو سب کام چھوڑ کر فرطِ محبت و عزت و احترام سے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کیا۔ ابراہیم قندوزی نے قلندرانہ انداز میں جواب دیا اور پھر اُسی خاموشی سے سر جُھکا کر بیٹھ گئے جس طرح باغ میں داخل ہوئے تھے۔ نوجوان قلندر کی معراج سمجھتا تھا۔ تصوّف کی اصطلاح میں قلندر اُسے کہتے ہیں جو تصوّف میں منتہی ہوتا ہے۔ نوجوان کم عمر تو تھا لیکن اتنا کم علم نہیں۔ وہ قلندر کے مرتبے کو کچھ نہ کچھ تو جانتا ہی تھا۔ سو دوبارہ پلٹا۔ انگوروں کی بیل سے ایک رس بھرا

خوشہ انگوروں کا توڑ کر فرطِ عقیدت سے بزرگ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ادب سے بولا۔

"حضرت! انگور نوش فرما کر اس خادم کو شرف بخشیں۔"

قلندر نے ایک نگاہ نوجوان پر ڈالی جس میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ وہ بے خود سا ہونے لگا۔ بزرگ نے اُس کے بڑھے ہاتھوں سے انگوروں کا خوشہ لیا اور چند انگور توڑ کر کھا لیے۔ نوجوان وہیں عقیدت سے اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اُس بزرگ نے اپنی بغل سے کوئی چیز نکالی۔ کچھ خود چبائی اور باقی جو بچی وہ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "لے تو بھی کھا۔"

نوجوان جھوٹی چیز کو بے چوں وچرا لے کر کھانے لگا۔ نجانے وہ شے کیا تھی کہ جس کا حلق سے اُترنا ہی تھا کہ نوجوان کی دُنیا ہی بدل گئی۔ وہ باغ جو کل تک اُسے اپنے درخشاں مستقبل کا امین نظر آتا تھا خاردار جھاڑیوں سے زیادہ اہم نہ لگا۔ ہر چیز حقیر سی نظر آنے لگی۔ طبیعت میں ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی۔ دِل عشقِ الٰہی اور رسولؐ کی محبت سے معمور ہوگیا۔ نگاہوں میں دُنیا کی ہر چیز حقیر لگی۔ قلندر تو اپنا کام کر کے چلتا بنا' نوجوان کا سکون غارت ہوگیا۔ دِل ہر چیز سے اُچاٹ ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر تحصیلِ علم اور راہِ نجات کی خاطر سمرقند و بخارا کی راہ لی۔ قرآن حفظ کیا۔ ظاہری علوم حاصل کیے پھر دِل تو آتش سوزاں میں اسی بُری طرح پھنکنے لگا کہ کسی پل چین نہ رہا۔ جب کچھ عِلم نہ تھا تو سب ٹھیک تھا۔ جب علم حاصل ہوا تو طبیعت میں ایک بے نام سی بے چینی بڑھ گئی۔ راہ نوردی عشق کی تلاش تھی، مردِ کامل کی راہنمائی چاہتے تھے۔ مردِ کامل کی تلاش میں کوچہ گردی وصحرا گردی شروع کر دی جگہ جگہ کی خاک چھانتا یہ نوجوان جب نیشا پور کے نزدیک ایک بستی ہارون (جسے لوگ ہرون بھی کہتے ہیں) میں داخل ہو تو اس جگرِ سوختہ کو وہاں ایک ایسے مردِ کامل مل ہی گئے جو فضل وکمال میں فائق ترین تھے۔ یہ عثمان ہارونیؒ تھے۔ وہ نوجوان اب دن رات اُن کی صحبت میں رہنے لگا۔ آخر ایک دِن بے تاب ہو کر عثمان ہارونیؒ سے گویا ہوا۔ "یا حضرت اَب ضبط کا یارا نہیں خادم کو شرفِ بیعت سے نوازنے کا کرم فرمائیے۔"

عثمان ہارونیؒ نے شفقت سے پاس بٹھایا اور سینے سے لگا کر فرمانے لگے۔ "جا.... اَب جا کر وضو کر کے آ اور دو رکعت ادا کر۔ نوجوان جو شرفِ بیعت کے حصول کے لیے بیتاب تھا فوراً حکم کی تعمیل کے لیے اُٹھا اور جیسا کہا حکم بجا لایا۔ عثمان ہارونیؒ نوجوان کو دیکھا جو پھرتی سے اُن کے ارشادِ حکم کی تعمیل کے بعد مزید ہدایات کا منتظر تھا۔ دوبارہ حکم دیا کہ جاؤ قبلہ رو ہو کر سو بقر پڑھو۔ اس حکم کی تعمیل کے بعد نوجوان پھر آن حاضر ہوا۔ اَب کے اکیس بار درُود شریف پڑھنے کا حکم جاری ہوا۔ جب نوجوان اس سے بھی عہدہ برآہ ہوگیا تو عثمان ہارونیؒ نے اُس نوجوان کا ہاتھ تھاما اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "آج سے تجھے اللہ سپرد کیا۔" پھر نوجوان کے بڑھے بال تراشے سر پر کلاہ رکھی اور حکم دیا "اَب سورۂ اخلاص کا ہزار بار ورد کر اور پھر ایک دن اور رات مجاہدے میں گزار کر ہمارے پاس آنا۔"

مطیع اور فرمانبردار نوجوان بزرگِ کامل کے حکم کے مطابق واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور پورے خشوع وخضوع کے ساتھ حکم کی تعمیل میں مشغول ہوگیا اور پھر عثمان ہارونیؒ کی خدمت میں آکر عقیدت سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ مُرشد نے گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ کچھ دیر اُسے دیکھتے رہے پھر حکم دیا "اُوپر دیکھ۔" اُوپر دیکھا تو نظریں درمیان میں حائل وسعتوں کو عبور کرتی جن حدود وہ یہ نوجوان بیان نہ کر سکا گھبرا کر نیچے دیکھا تو نظریں تحت الثریٰ میں اُترتی چلی گئیں۔ نوجوان نے گھبراتے ہوئے حیرت زدہ ہو کی طرف دیکھا جو مسکراتے ہوئے مُرید کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور اُس کی کیفیت میں یہ حیرانگی کا تغیّر دیکھ کر لطف اندوز ہو تھے۔ نوجوان کو یُوں جو حیران وپریشان اپنی سمت دیکھتا پایا تو اپنی دو اُنگلیوں کے درمیان میں فاصلہ پیدا کر کے اُس کی بڑھایا اور حکم دیا "اب ان اُنگلیوں کے درمیانی فاصلے میں دیکھ۔"

اب جو نوجوان نے اُنگلیوں کے درمیانی حصہ میں دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا۔ اُس کے سامنے ایک عجیب وغریب منظر جسے ماورائے عقل وگمان ہرگز تسلیم نہ کر سکتی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنی ہی دُنیا جیسی ہزار ہا دُنیائیں کو ان اُنگلیوں کے در

فاصلے میں دیکھ رہا تھا۔ نوجوان سراسیمہ ہو کر بولا" حضرت..... یہ کیا ہے؟"
عثمانؒ نے کہا" بس..... اب تیرا کام ختم ہوا اور یہ جو تم نے ابھی دیکھا اٹھارہ ہزار وہ دنیائیں تھیں جن کا ابھی انسان کو علم نہیں"۔ اس کے بعد یہ نوجوان مُرید عثمان ہارونیؒ کا ہی ہو کر رہ گیا۔ شب و روز آپ کی صحبت میں گزارا کرتا۔ ظاہری و باطنی علوم کا حصول انہی کے طفیل تھا۔ سو عزت کا یہ حال تھا کہ آگے مُرشد ہوتا اور پیچھے سعادت مند نوجوان مُرید۔ نوجوان مُرید کی یہ سعادتمندی دیکھ کر عثمان ہارونیؒ نے ایک دن فرمایا۔

معین الدّین محبوبِ خدا است
و مرا فخر است برمُریدیٔ او

یہی معین الدین آگے چل کے خواجہ معین الدّین چشتیؒ کہلائے۔
کچھ عرصہ کے بعد آپ کے دل میں روضۂ رسولؐ کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مزارِ اقدس پر حاضری دی۔ ابھی مدینہ میں ہی تھے کہ خواب میں رسول اللہ سے شرفِ مُلاقات حاصل ہوا۔ آپؐ خواجہ غریب نواز کو خواب میں ہندوستان کی طرف جانے کی ہدایت فرماتے ہوئے کہہ رہے تھے:" معین الدّین ہم نے تمہیں اللہ کی رضا و منشا سے سُلطان الہند مقرّر کیا ہے اب تم اپنے مُرشد سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر کے وہاں چلے جاؤ"۔
اگلے دن خواجہ چشتیؒ نے اپنا یہ خواب عثمان ہارونیؒ کو سُنایا۔ عثمان ہارونیؒ کو بھی خواب میں اس قسم کی ہدایت مل چکی تھی۔ سو انھوں نے بصد خوشی اجازت دی۔ عثمانؒ نے جن کا چہرہ اپنے مُرید کی اس عزت افزائی سے خوشی سے تمتما رہا تھا۔ خواجہ سے کہا" تم نے ہندوستان نہیں دیکھا۔ ذرا آنکھیں بند کرو تاکہ تمہیں اس اجنبی سرزمین کی سیر کرا سکیں"۔
حضرت خواجہؒ نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے مُرشد عثمانؒ کے فیضِ روحانی سے ہندوستان کے ان مقامات کو دیکھا جہاں آپ کو تشریف لے جانا تھا۔
ہندوستان اُس زمانے میں دُنیا بھر میں بُت پرستی کا سب سے بڑا گہوارہ تھا۔ کفر کے اندھیروں میں ڈوبی اس سرزمین پر اگرچہ اسلام کی روشنی خواجہ چشتیؒ سے پہلے پہنچ چکی تھی مگر ابھی تک اسلام کو وہ غلبہ حاصل نہ ہوا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ سُلطان محمود غزنوی جو آندھی و طوفان کی طرح ہندوستان کے باطل خداؤں اور ان بُت پرستوں پر خدا کے قہر کی طرح ٹوٹا تھا اور جس نے کُفر کی سرزمین پر اسلام اور بُت پرستی کا عظیم الشان معرکہ سومنات کے علاقہ میں جیتا تھا اب اس دُنیا میں نہیں تھا۔ اُس کی اولاد نے باپ کی فتوحات کو صحیح طور نہ سنبھالا اور محمود غزنوی جس کے دم قدم سے ہندوستان کے بُت پرستوں کے کلیجے کانپتے تھے اُس کے منظر سے ہٹتے ہی ہندوؤں نے پھر پَر نکالنا شروع کر دیے اور جلد ہی وہ غزنی کی مسلمان سلطنت کے دائرہ سے اپنا بڑا حصہ نکال سکنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد کے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ لاتعداد جنگیں لڑیں مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔
خواجہ معین الدّین چشتیؒ جن دنوں ہندوستان پہنچے اُن دنوں مشہور راجپوت حکمران پرتھوی راج اپنی دو لاکھ سپاہ اور تین ہزار ہاتھیوں کے بل بوتے پر مسلمان حاکم شہاب الدین غوری کی بارہ ہزار سپاہ کو شکست دے کر ترائن کے محاذ پر کامیابی حاصل کر چکا تھا اور اس کامیابی کے نشے میں بدمست وہ کسی بپھرے ہاتھی کی طرح ہندوستان میں نشۂ کبر و پندار میں دندناتا پھر رہا تھا۔
خواجہ معین الدّین چشتیؒ نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی جس دربار میں سب سے پہلے حاضری دی وہ گنج بخش علی ہجویریؒ کا مزارِ اقدس تھا۔ یہاں آپ نے چلہ کشی کی اور پھر ملتان تشریف لے گئے۔ ملتان جو اُن دنوں ہندوستان میں علم و ادب کا گہوارہ تھا آپ نے وہاں ہندوستان میں بولی جانے والی معروف زبانیں سیکھیں۔ کچھ عرصہ ملتان میں قیام کے بعد آپ دِلّی تشریف لے گئے اور پھر اجمیر کا رُخ کیا۔

اجمیر اُن دنوں ہندوستان میں بڑی اہمیت کا شہر تھا۔ یہ پرتھوی راج کی حکومت کی راج دھانی تھی۔ اجمیر میں داخل ہوتے ہی آپ نے جس جگہ کو اپنے قیام کے لیے پسند فرمایا وہ اتفاق سے پرتھوی راج کے اُونٹوں کی جائے قیام نکلی۔ پرتھوی راج کے ساربانوں نے جب ایک مسلم کو اپنے راجہ کی زمین پر یوں قبضہ کر کے بیٹھے دیکھا تو اُنھیں ٹوکنے لگے کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دیں۔ خواجہ صاحبؒ نے بے نیازی سے جواب دیا: "بھائیو! اتنا بڑا میدان ہے تمہارے راجہ کے اُونٹ کہیں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ پھر مجھ غریب کو کیوں تنگ کرتے ہو؟" مگر وہ ساربان مسلسل ضد میں کہتے رہے کہ نہیں اگر راجہ کو علم بھی ہو گیا کہ ایک بے دین اُس کی زمین پر ڈیرا جمائے بیٹھا ہے تو نجانے وہ کیا کر ڈالے۔ آخر جب ساربان حد سے زیادہ بڑھنے لگے تو خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اُس جگہ سے اُٹھتے ہوئے ساربانوں کو مخاطب کیا۔ "لو بھئی ہم تو اُٹھ کے جا رہے ہیں، تم بٹھا لو اب اپنے راجہ کے اُونٹوں کو مگر خدا معلوم وہ بھی ہماری طرح اُٹھ سکیں گے یا نہیں۔" آپ تو یہ کہہ کر اُٹھ کے چل پڑے اور ساربان آپ کی بات کے مفہوم سے ناآشنا اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

حضرت خواجہؒ نے اپنے ساتھیوں سمیت اناساگر نامی جگہ پر جا کر قیام کیا جو بعد میں اولیاء مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُدھر مہاراجہ پرتھوی راج کے اُونٹ میدان میں ایسے بیٹھے کہ اُٹھنا ہی بھول گئے۔ لوگوں کے ہاتھ ایک عجیب تماشا لگ گیا۔ شہر بھر کے لوگ میدان میں اکٹھے ہو گئے اور شاہی ساربانوں کی اُن مضحکہ خیز کوششوں کو دیکھنے لگے جو وہ اُونٹوں کو اُٹھانے کے لیے کر رہے تھے۔ راجہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ سو وہ بھی موقعہ پر پہنچ گیا۔ جب کسی طور بھی اُونٹ اپنی جگہ سے نہ ہلے تو بالآخر ساربانوں کو حضرت خواجہؒ کے الفاظ یاد آ گئے جو اُنھوں نے میدان سے اُٹھتے ہوئے کہے تھے۔ اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے مہاراجہ سے ذکر کیا۔ پرتھوی راج یہ سُن کر جہاں حد سے زیادہ خوفزدہ ہو گیا وہیں ساربانوں پر بھی آنکھیں نکالیں اور کہنے لگا جاؤ اُنہی بزرگ سے جا کر معافی مانگو اور عزت و احترام سے اُن کی جو خواہش ہو پوری کرنا۔ ساربان کانپتے کانپتے آپؒ کے پاس پہنچے اور آپ کے قدموں میں گر کر معافی کے طلبگار ہوئے۔ آپ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "تمہارے راجہ کے اُونٹ اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اب کیا تم بیٹھنا چاہتے ہو۔ جاؤ ..... جا کر اپنا کام کرو۔" ساربان گھبرا کر کھڑے ہوئے اور میدان کی طرف دوڑ لگا دی جہاں واقعی اُونٹ میدانوں میں کھڑے تھے۔ اس واقعہ کے بعد خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شہرت علاقہ بھر میں پھیل گئی۔

انا ساگر، جہاں خواجہ نے اپنا نیا ٹھکانہ بنایا تھا۔ اس جگہ ہندوؤں کے لاتعداد مندر تھے۔ یہ جگہ انا دلیو نامی راجہ نے بنوائی تھی۔ خواجہ صاحب نے اسی جگہ کو اپنی تبلیغ کے لیے منتخب کر لیا اور یہیں بیٹھ کر کفرستان میں نورِ حق سے اُجالا کرنے لگے۔ آپ کی پُراثر تبلیغ اور پھر دینِ حق کی کرامات سے اِردگرد کے لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ یہ صورتحال دیکھ کر علاقے کے مندروں کے پنڈتوں سمیت عام متعصب ہندوؤں میں تہلکہ مچ گیا اور اُنھوں نے پرتھوی راج کو اس کے خلاف کارروائی کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا۔

پرتھوی راج میں اتنی عقل تو بہر حال تھی ہی کہ وہ ایک مسلمان صوفی سے جھگڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ عیار فطرت کا شخص تھا اُس نے سوچا یہ مسلم صوفی جو کرامات دکھاتا ہے ان کا مقابلہ کسی ایسے ہی بندے سے کروانا چاہیے۔ اُس نے اس سما میں اجمیر کے سب سے بڑے مہنت رام دلیو کو حکم دیا کہ "جا اُن درویش اور اُن کے مریدوں سے مل۔ یہ لوگ تو مجھے جاسوس سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہو نہ ہو ایسا نہ ہو کہ ہم غفلت میں مارے جائیں اور یہ اسلامی راج کی راہ ہموار کر کے چلتے بنیں۔ تو جا اُن کو ٹٹول اور کسی طرح اجمیر سے بھی نکال دے۔ اگر طاقت بھی استعمال کرنا پڑے تو اُوش کرنا۔"

رام دلیو پنڈتوں اور پجاریوں کے ایک ہجوم میں بڑی شان سے گردن اکڑائے خواجہ کے آستانے کی طرف بڑھا اور جب اُن کے روبرو پہنچا، خواجہ نے اپنی ایک ہی نگاہ اُن پر ایسی ڈالی کہ اس بزرگ کامل کی نگاہ کو باطل کا جگمگا سہہ نہ سکا اور
ہی ملے اس ٹولے کا سردار رام دلیو مہنت آپ کے قدموں میں گرا اسلام کی امان میں آ لیے ۔ رد کر رہا تھا۔ آپ نے اُسے جلد

میں لانے کے لیے کلمۂ توحید پڑھایا اور اُس کا نام شادی دیو رکھ دیا۔

رام دیو کے مسلمان ہوتے ہی ہندوؤں اور خود راجہ کے دل میں آپ کا خوف جڑ پکڑ گیا۔ ہندوستان میں شعبدہ بازی عام تھی۔ وہ لوگ آپ کو بھی ایک ساحر سمجھنے لگے اور خیال کرنے لگے کہ آپ اپنی انہی ساحرانہ قوتوں کے بل بوتے پر ہندوؤں کو مسلمان کر رہے ہیں چنانچہ راجہ نے سوچا جس طرح زہر زہر کا تریاق ہوتا ہے اسی طرح اس مسلمان ساحر کے مقابلے پر کوئی ساحر ہی لایا جائے تاکہ لوہا لوہے کو کاٹ سکے۔ اُس زمانے میں اجمیر اور آس پاس کے علاقوں میں جے پال نامی ساحر کا بڑا چرچا تھا۔ راجہ نے اُسے فوراً اجمیر طلب کیا اور خواجہ غریب نوازؒ کے مقابلے کے لیے آمادہ کرنے لگا۔ بدی کا یہ جیتا جاگتا نمونہ جے پال تو خوش ہی ایسے شیطانی کاموں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ جھٹ تیار ہوا اور اس شان سے مقابلے کے لیے نکلا کہ خود تو مرگ چھالے پر سوار ہوا میں اُڑتا پھر رہا تھا اور چیلے گروہ کے نیچے درندوں پر سوار خواجہؒ کی سرکوبی کے لیے کمربستہ — ہو کر جا رہے تھے۔ خواجہ غریب نوازؒ نے انھیں دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو اُن کے شر سے بچانے کی خاطر ایک حصار کھینچ کر اس میں محفوظ کر لیا۔ اب جے پال اور اس کے چیلے اپنے ہتھکنڈوں سے پورا زور صرف کرنے لگے کہ کسی طرح اس حصار کو توڑ دیں مگر کامیاب نہ ہو سکے جب اُن کا زور کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو خواجہ غریب نوازؒ نے اپنی کھڑاؤں اُتاری اور ہوا میں اُچھال دی۔ کھڑاؤں ہوا میں بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ جے پال کی کھوپڑی اس کی پہنچ میں آگئی۔ چنانچہ عین جے پال کے سر پر پہنچ کر کھڑاؤں نے منڈلانا شروع کر دیا اور جے پال کے سر پر ضربیں لگانے لگی۔ جے پال نے ہر ممکن کوشش بچنے کی اختیار کی مگر کھڑاؤں کہاں رُکنے کا نام لینے والی تھی۔ بالآخر تکلیف کی شدت سے عاجز آکر جے پال فوراً مرگ چھالہ سمیت زمین پر اُترا اور آپ کے قدموں میں گر کر اعتراف شکست کیا۔ ساتھ ہی اسلام قبول کرنے کا خواہش مند ہوا۔ خواجہ غریب نواز نے اُسے معاف کرتے ہوئے مسلمان کیا اور اسلامی نام عبداللہ رکھا۔

جے پال کے مسلمان ہوتے ہی لوگوں نے جوق در جوق اسلام قبول کرنا شروع کر دیا اور وہ بستی جہاں کبھی مندروں کی گھنٹیاں گونجا کرتی تھیں اب اذان کی آواز سے فیض یاب ہونے لگی۔ پرتھوی راج اس صورتحال سے بہت جزبز ہوا۔ بہت دفعہ اُس نے چاہا کہ خواجہ صاحب کے خلاف کوئی سخت قدم اُٹھائے لیکن پھر اُس کی ماں آڑے آجاتی اور اُسے سمجھاتی کہ ان بزرگوں سے مت اُلجھو۔ ان کے پاس ماورائی طاقتیں ہیں۔ ہم تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں ان سے چھیڑ خانی کر کے اپنا آپ تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ پرتھوی راج ماں کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اُسے یہ احساس بھی تھا کہ ماں کے دلائل حقیقت پر مبنی ہیں مگر جے پال اور پھر ہندوؤں کی کثیر تعداد کا مسلمان ہونا ایسا اُمر نہ تھا کہ وہ اسے آسانی سے بھلا پاتا۔ چنانچہ اُس نے پھر ایک منصوبہ بنایا اور ایک شخص کو خواجہؒ کے پاس اسلام قبول کرنے کے بہانے بھیجا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ موقع ملتے ہی آپ کو زہر دے دے۔ وہ شخص انعام کے لالچ میں اُسی وقت آپ کے دربار میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

آپ نے اُس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور ناراض ہوتے ہوئے کہا "بدبخت تجھے اسلام سے کیا غرض تیری جو تمنا ہے وہ پوری کر اور چلتا بن۔" یہ سُن کر اُس شخص کی تھرتھری چھوٹ گئی اور رو رو کر آپ سے معافی مانگنے لگا۔ ساتھ ہی اُس نے دینِ حق قبول کرنے کا سچے دل سے اقرار کیا اور دیر تک اپنی ناپاک سوچ پر توبہ کرتا رہا۔

یہ ایک خاموش اور پُراسرار جنگ تھی بلکہ آج کے زمانے کی اصطلاح میں اسے سرد جنگ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ پرتھوی راج کھل کر سامنے نہیں آرہا تھا مگر اندر ہی اندر آپ کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے تھا اور یہ اُس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ہر معرکہ میں خواجہ صاحبؒ کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتا آرہا تھا۔ خواجہ صاحب نے پرتھوی راج کو یوں مسلسل تنگ کرتے پایا تو ایک جارحانہ قدم اٹھاتے ہوئے اُسے اسلام کی دعوت دے ڈالی۔ راجہ پرتھوی جس کے آباؤ اجداد بتوں کے نام لیوا تھے اور اس پر فخر کرتے تھے آپ کی اس جسارت اور دلیری پر غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ نفرت اور حسد کی آگ میں وہ دن رات جلنے لگا۔ وہ دیکھا کرتا تھا

کہ راجہ ہونے کے باوجود اُس کے گرد لوگوں کا وہ ہجوم، وہ عقیدت مندی کے مظاہرے نہیں ہوتے جن میں خواجہ غریب نوازؒ گھرے ہوئے ہیں۔

پرتھوی راج نے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں اپنا ایک سردار بھیجا جس نے آپ کو پرتھوی راج کی طرف سے یہ پیغام پڑھ کر سنایا کہ "آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ جتنی جلد ہو سکے اجمیر چھوڑ کر کہیں بھی تشریف لے جائیں۔

خواجہؒ نے راجہ کا پیغام سنا مگر اثر کوئی نہ لیا لیکن جب نامہ بر مسلسل آپ کے چہرے کی طرف جواب کی امید لیے دیکھتا رہا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔"

پرتھوی راج کو یہ جواب ملا تو وہ اس کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ جھنجھلا کر اُس نے خواجہؒ پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے مہاراجہ کی ہتکِ عزت کی ہے کیونکہ مہاراجہ نے جب ایک شخص کو اُن کے پاس اسلام قبول کرنے بھیجا تو خواجہؒ نے اُس کی نیت پر شبہ کا اظہار کیا اگرچہ بعد میں انھوں نے اُسے مسلمان تو کر لیا لیکن پہلے انکار کر کے راجہ کی اہانت ضرور کی۔ چنانچہ وہ اور ان کے رفقا اسی وقت اجمیر کی حدود چھوڑ کر چلے جائیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس حکم پر ذرا بھی توجہ نہ دی اور ایک شانِ بے نیازی سے گویا ہوئے "تین دن کی بات ہی کیا ہے جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔"

مہاراجہ کا ایلچی اس گول مول جواب کو لے کر جب پرتھوی راج کے سامنے پہنچا تو راجہ بھی اس کا مفہوم نہ سمجھ سکا لیکن دل میں خیال کرنے لگا کہ شاید خواجہؒ نے تین دن کی مہلت مانگی ہے۔

ہندوستان سے دور شکست خوردہ شہاب الدین غوری راجہ پرتھوی کے ہاتھوں شکست کے بعد انتہائی افسردہ اور غمگین بیٹھا مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ اسے اپنی ناکامی کا انتقام لینا تھا مگر اپنے وسائل پر نظر ڈال کر پھر رہ جاتا کہ اس مٹھی بھر سپاہ سے ہندو راجہ کی کثیر سپاہ سے اُن کی اپنی زمین پر لڑنے جانا تو خودکشی ہی کہی جائے گی۔ اسی غمزدگی اور ملولی کی کیفیت میں اُس نے رات ایک خواب دیکھا کہ ایک بزرگ اُسے کہہ رہے ہیں "غوری..... اٹھ ہندوستان کا تخت و تاج تیرا انتظار کر رہا ہے"

شہاب الدین غوری جو پہلے ہی انتقام کی آگ میں بھڑک رہا تھا اس خوش کن خواب کو دیکھ کر ہمت و جذبہ کے ساتھ دوبارہ ہندوستان پر حملے کی تیاری کا حکم دیا اور برق رفتاری سے ہندوستان کی طرف کوچ کرنے لگا۔

اُدھر پرتھوی راج جو ابھی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اسلام قبول کرنے کے پیغام کو پا کر غصّے سے کھول رہا تھا۔ اُسے ایک اور اہانت آمیز پیغام موصول ہوا۔ یہ شہاب الدین غوری کی طرف سے اُس کا قاصد لے کر آیا تھا جس میں سلطان نے لکھا تھا۔

"سرہند اور بھٹنیر کا علاقہ مسلمانوں کی ملکیت ہے تم اسے خالی کر کے اُسی طرح اطاعت گزار بن کر رہو جیسے سلطان محمود غزنوی اور اُس کی اولاد کے باج گزار بن کر رہے ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں تم سے بزورِ شمشیر یہ علاقے لیے جائیں گے اور تمہیں عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

پرتھوی راج اس پیغام کو پا کر غم و غصہ سے آگ بگولا ہو گیا اور حقارت سے شہاب الدین کے فرمان کو پھاڑ کر قاصد کے ہاتھ کہلوا بھیجا۔ "اگر تم سرزمین ہند سے اسی وقت نہ نکل کھڑے ہوئے تو میرے قہر سے نہ بچ سکو گے۔"

حضرت خواجہؒ کے بموجب تیسرے دن ترائن کے مقام پر پھر ایک خوفناک گھمسان کا رن پڑا اور پرتھوی راج اپنی سپاہ سمیت مسلمانوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر فرار ہو گیا مگر مسلم لشکر نے اُس کا پیچھا کیا اور گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ شہاب الدین غوری ایک فاتح کی حیثیت سے اجمیر میں داخل ہوا اور جب اُسے معین الدین چشتیؒ سے شرفِ ملاقات ہوئی تو انھیں دیکھ کر وہ حیرت سے اُچھل پڑا اور بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلا۔ "آپ..... آپ ہی وہ بزرگ کامل ہیں جنھوں نے مجھے ہندوستان پر فتح کی بشارت دی تھی۔"

حضرت خواجہؒ نے مسکرا کر شہاب الدین کو سینے سے لگایا اور اُسے نصیحت کی "دیکھو اپنے بندوں کا تجھے اللہ نے خادم مقرر
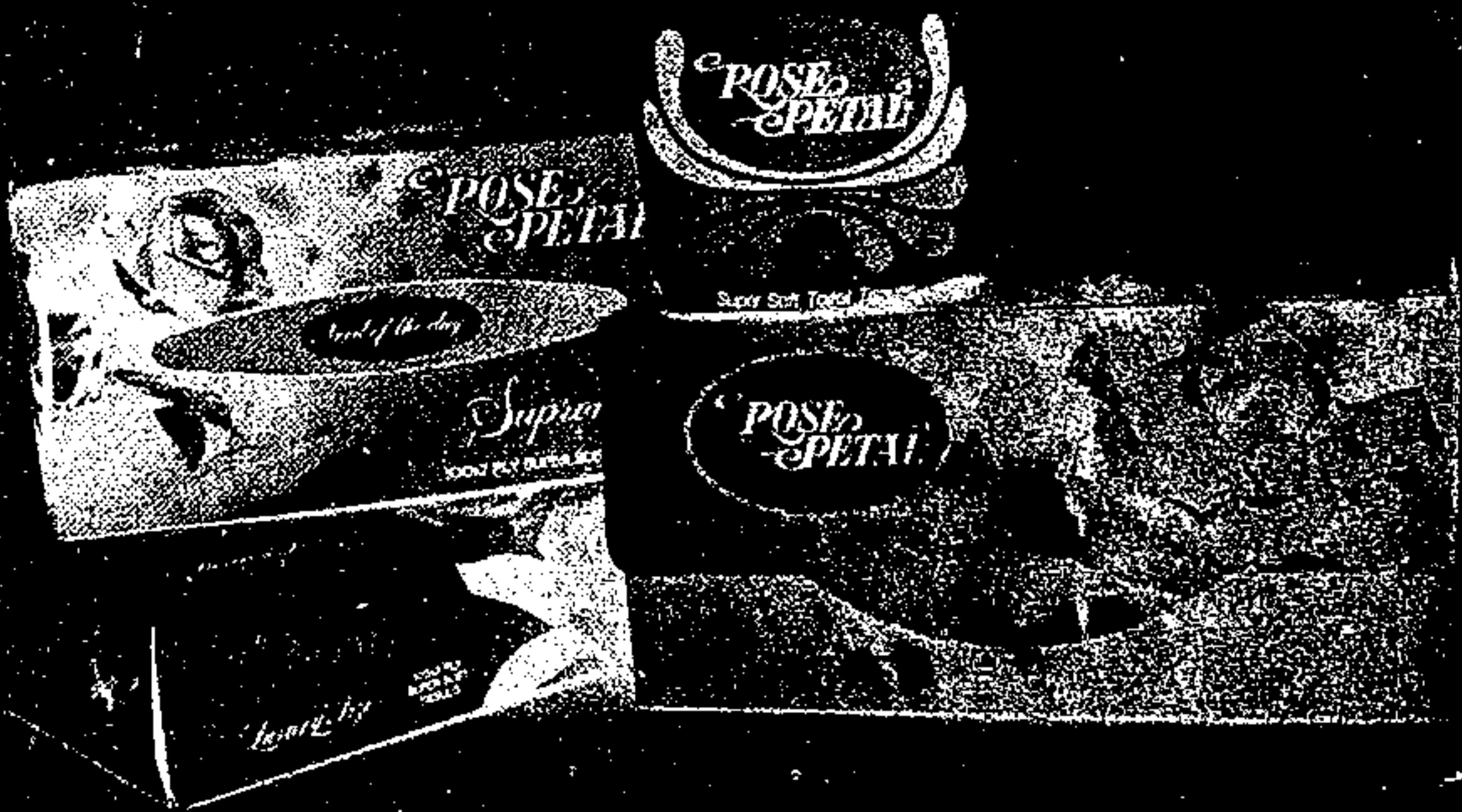
ہے: ہمیشہ عدل و انصاف سے حکمرانی کرنا اور اپنے کسی قول و فعل سے خدا کے بندوں کو دکھ نہ دینا۔ پرتھوی راج کا لڑکا نیک ہے، اُسے تو اجمیر کا حاکم بنا دے اور وہ بھی تیرا اطاعت گزار بنا رہے گا۔" سلطان نے آپ کی نصیحتوں پر حرف بحرف عمل کیا اور اجمیر کی حکمرانی راجہ پرتھوی کے لڑکے کو سونپ کر آگے چل پڑا۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کی عظمت و بزرگی کے سبھی قائل رہے اورنگ زیب عالمگیر آپ کا بہت مداح تھا، وہ آپکے آستانہ مبارک پر کئی بار حاضری دیتا اور اپنی والہانہ چاہت و عقیدت کا اظہار کرتا۔

حضرت خواجہؒ نے اپنی پوری زندگی تبلیغ و اشاعت میں بسر کردی۔ آپ نے دین اسلام کے عُروج کی خاطر ہند میں دن رات کام کیا اور اسلام کے نور سے کفر میں گھری سرزمین ہند کو منور کیا۔ حضرت خواجہؒ پچاس برس ہندوستان میں رہے۔ یہاں کی رُسومات کا بغور مطالعہ کیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ یہاں کے باشندوں میں موسیقی کا بڑا دخل ہے اور یہ راگ رنگ کے دیوانے لوگ ہیں۔ ہندوؤں کے مندروں سے دل فریب محور کن موسیقی گونجتی رہتی ہے۔ چنانچہ آپ نے بھی موسیقی سے تبلیغ کا کام انجام دینے کا سوچا۔ آپ نے محفل سماع کی بُنیاد ڈالی۔ اس طرح ہندوؤں کے دل پسند طریقے سے اسلام کا مؤثر پیغام انتہائی دل نشین انداز میں اُن تک پہنچنے لگا۔ یہی محفل سماع آہستہ آہستہ قوالی کی شکل اختیار کرگئی۔

آپ کہا کرتے تھے " لوگو! تم میں ضعیف ترین شخص وہ ہے جو ایک بات کہے اور پھر اُس پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔"

ایک بار آپ نے فرمایا " بُت پرستی کا دوسرا نام خود پرستی اور نفس پرستی ہے۔ جب تک انسان ان سے چھٹکارا نہیں پاتا وہ خدا پرستی کی منزل سے دُور رہتا ہے۔"

" متوکل وہ ہے جو مصائب اور تکالیف سے بے حال ہو جائے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔"

حضرت معین الدین چشتیؒ ترانوے سال کی عمر میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا سنِ وفات ۶۳۶ھ ہے۔

"یاجوج و ماجوج"

بائبل اور اسلامی روایات، دونوں کے مطابق یاجوج و ماجوج کا تعلق قدیم دُنیا کے شمال مشرقی حصّے سے ہوگا۔ قیامت سے پیشتر یہ لوگ اچانک اپنے علاقے سے باہر آئیں گے اور دُنیا کو تباہ و برباد کرتے ہوئے جنوب کی سمت آگے بڑھیں گے اور آخر کار اسرائیل کی سرزمین پر انہیں تباہ کر دیا جائے گا۔ اسلامی روایات میں یاجوج و ماجوج کا تذکرہ بڑی تفصیل سے دوہرایا گیا ہے اور اسے حضرت عیسیٰ کے دوبارہ ظہور سے منسوب کیا گیا ہے۔ یاجوج و ماجوج گنتی میں لاتعداد اور بے شمار ہوں گے حتیٰ کہ دریائے دجلہ اور فرات کا تمام پانی پی کر ختم کر دیں گے۔ کرۂ ارض کے تمام باشندوں کو ہلاک کرنے کے بعد وہ اپنے تیر آسمان کی طرف چلائیں گے جس پر اللہ تعالیٰ غضب ناک ہو کر اُن کے نتھنوں، گردنوں اور کانوں پر کیڑوں مکوڑوں کی بارش کر دے گا یہاں تک کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اُن کی لاشوں کی بدبو سے کرۂ ارض میں تعفن پھیلے گا، چنانچہ پرندوں کا ایک بڑا غول آئے گا اور ان کی لاشوں کو چونچوں سے اٹھا کر سمندر میں پھینک دے گا۔

یاجوج و ماجوج تین قسم کے ہوں گے۔

۱۔ چیڑ کے درختوں کی مانند لمبے ۲۔ لمبائی اور چوڑائی دونوں میں یکساں ۳۔ اپنے جسموں کو اپنے کانوں سے ڈھانپے ہوئے

(بحوالہ تاریخ طبری۔ مسعودی، ادریسی)
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

قدیم زمانے میں دلّی کی جامع مسجد سے گیارہ میل آگے جاتے تو ایک چھوٹا سا قصبہ مہرولی کے نام سے راہ میں پڑتا تھا جسے گردشِ زمانہ نے جہاں دلّی جیسے وسعت پذیر شہر کے ہاتھوں اس کی اپنی انفرادی حیثیت سے محروم کیا وہاں اس کی اپنی علیحدہ شناخت بھی چھن گئی اور آج ہندوستان کے ہر خاص و عام میں وہ جگہ جو کبھی مہرولی کہلاتی تھی، قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اس جگہ کو برصغیر کی اس ماوراءالنہری شخصیت نے اپنی آخری آرام گاہ کے لیے منتخب کیا جسے دنیا قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام سے جانتی ہے۔

قطب الدین بختیار کاکی وہ صوفی منش درویش اور صاحب کمال ہستی تھیں کہ جنہوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں عرفان کی وہ بلندی حاصل کی جو ان کے ہم عصر طویل عمریں گذارنے اور سخت ریاضتوں کے باوجود بھی نہ پا سکے۔

آپ کے پیدائشی اور فطری جوہر بچپن میں ہی کھل کر سامنے آنے لگے۔ ہر وقت خاموش چپ چپ رہنا۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کیے رکھنا۔ ہم عمر ساتھی کھیل کود اور شرارتوں میں مگن ہوتے اور آپ ان سے ہٹ کر نجانے کن فکروں میں ڈوبے سب سے بے نیاز اپنے آپ میں گم ہوتے۔ باپ کے سائے سے محروم تھے، لیکن بیوہ ماں نے اپنی طرف سے آپ کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہ آنے دی۔ پانچ سال کے ہوئے تو ماں نے تعلیم و تربیت کی خاطر آپ کو محلّے کے مدرسے میں داخل کرانے کا سوچا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق ایک طباق شرنی اور چھوہاروں سے بھرا اور بچے کو غلام کے ساتھ طباق سمیت مدرسے کی طرف روانہ کر دیا۔

غلام ابھی آپ کو لے کر بمشکل چند فرلانگ ہی چلا ہوگا کہ اچانک ایک بزرگ اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور پوچھا "کہاں لے جا رہے اس بچے کو؟"

غلام بزرگ کے جاہ و جلال اور دبدبے سے سہم گیا اور بمشکل منہ سے جواب دینے کے قابل ہوا تو بولا "مدرسے میں داخل کروانے جا رہا ہوں"

اجنبی بزرگ کے چہرے پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا اور انہوں نے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اسے بھلا مدرسے کا مولوی کیا پڑھائے گا۔ میرے ساتھ آؤ میں اس بچے کو اس کے اصل استاد کی طرف پہنچاؤں جسے خدا نے مقرر کیا ہے"

غلام نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر اس طرف قدم بڑھانے لگا جس طرف وہ بزرگ اسے لیجانا چاہتے تھے، بچہ یہ سب دل چسپی سے دیکھتا ساتھ جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ اس دور کے مشہور بزرگ اور عالم کے گھر پہنچ گئے۔ جو ابوحفص کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اجنبی بزرگ نے ابوحفص کے سامنے بچے کو کیا اور بولے "ابوحفص آج سے یہ بچہ تیرے حوالے کیا جاتا ہے اس کی تعلیم و تربیت میں کسر اٹھا نہ رکھنا"

وہ بزرگ تو یہ کہہ کر چلتے بنے اور غلام حیران پریشان بچے کے ساتھ وہیں کھڑا رہ گیا۔ معاً ابوحفص نے یہ سکوت توڑا اور غلام سے پوچھا "یہ بزرگ کون تھے؟"

غلام جو اب تک سوچ رہا تھا کہ آخر کیوں ایک اجنبی بزرگ کے ساتھ بچے کو بجائے مکتب لے جانے کے یہاں لے آیا ہے۔ کہنے لگا "میں تو انہیں بالکل نہیں جانتا" اور پھر انہیں وہ پورا واقعہ کہہ سنایا کہ کس طرح راہ میں ملے تھے اور انہیں یہاں لے آئے۔ ابوحفص مسکرا پڑے اور دبی دبی مسکراہٹ سے بولے "اچھا تو خضر علیہ السلام نے میرے سپرد کوئی برگزیدہ شخصیت کی ہے" غلام خضر علیہ السلام کا نام سن کر ہکا بکا ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگا۔

ابوحفص نے پھر بچے کی طرف توجہ مرکوز کی، جو اس سارے عرصہ میں خاموش ہی بیٹھا رہا تھا۔ انہوں نے بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے نزدیک کیا۔ پھر قریب رکھی تختی اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا "ہاں تو بچے، کہاں سے تمہاری تعلیم کا آغاز کریں؟"

بچہ معصومیت سے بولا "سبحان الذی اسری....."

ابوحفص نے جو لکھنے کے لیے ہاتھ تختی کی طرف بڑھایا تھا حیرت سے واپس کھینچ لیا اور بولے "لیکن یہ تو پندرھویں پارے کا سبق ہے اس سے پہلے کے چودہ کون پڑھے گا!"

بچے نے بدستور سادگی سے سر جھکائے جواب دیا "جب میں ماں کے پیٹ میں تھا تو انہوں نے قرآن پڑھنا شروع کیا ابھی وہ چودہ پارے ہی دہرا پائی تھیں کہ میری پیدائش ہو گئی اس طرح پندرھواں پارہ میں نہ سیکھ سکا" ساتھ ہی بچے نے الف۔ لام سے لے کر رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کے آخر تک سنا دیا جہاں چودھویں پارے کا اختتام

ابوحفص نے جو بچے کی یہ قابلیت دیکھی تو عش عش کر اٹھے اور ان کا دل مسرت سے سرشار ہو گیا کہ وہ ایک عظیم بچے کی تعلیم کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

چنانچہ جلد ہی بچے نے بقیہ سولہ پارے بھی ختم کر دیئے۔

وقت اپنا سفر ختم کرتا رہا اور بچہ شعور کی منزلیں طے کرتا جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکا تھا۔ علوم ظاہری و باطنی سے منور کیے نوجوانی کے آغاز ہی میں زبردست ریاضت، مجاہدے میں مشغول ہو گیا اور قطب الدین کے نام سے معروف ہوا۔ نوجوان قطب الدین جب رات کو تکیے سے پشت لگاتا تو ہزاروں بار درود شریف کا ورد کرتا تاوقتیکہ آنکھیں نیند سے بوجھل نہ ہو جائیں اور تلاوت کا پابند

ماں جو بچپن سے لے کر جوانی تک قطب الدین کی پرورش پوری دل چسپی اور لگن سے کرتی آ رہی تھی اب اپنے آخری فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی تھی اپنے اس فرض مادری کی تکمیل کی خاطر اس نے بیٹے کی شادی ایک حسین و جمیل نیک سیرت لڑکی سے کر دی حسین پری پیکر سے بیٹے کا بیاہ کر کے ماں کو یہ بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ بیٹا جو اس دنیا میں اس کا واحد سہارا ہے اسے چھوڑ کر کہیں نہ جا سکے گا کیونکہ کچھ عرصہ سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ بیٹا اسے چھوڑ کر کہیں نکلنے والا ہے۔ بعد کے کچھ عرصہ میں کسی حد تک درست بھی نکلا۔ قطب الدین اس حسین بیوی میں اس حد تک مگن ہو گئے کہ سالہا سال کی ریاضت کے بعد رات کا وقت بیوی اور اس طرح اپنے اس معمول سے ہٹ گئے جو وہ شروع سے اختیار کیے آ رہے تھے چنانچہ شادی کے بعد یہ تیسرا دن تھا

نے درود شریف پڑھنے کا ناغہ کیا۔

ایک دن فجر کی نماز کے بعد ابھی آپ نے تلاوت شروع کی ہی تھی کہ ایک بزرگ شرف ملاقات کے حصول کے لیے آگئے۔ آپ نے انہیں بلا کر ساتھ بٹھایا اور پوچھا "ہم سے کوئی خاص کام ہے"!

وہ بزرگ جو قطب الدین کے پڑوسی بھی تھے۔ شرمائے شرمائے سے لہجے میں بولے "حضرت بات تو کچھ ایسی ہے کہ کہتے جھجک محسوس ہو رہی ہے" آپ نے انہیں حوصلہ دلایا تو وہ بزرگ بولے "حضرت! رات کو بندے نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ میری نظروں کے سامنے ایک عالیشان پُرشکوہ عمارت ہے اور اس کے چاروں اطراف انسانوں کا اژدہام ہے محل کے اندر سے ایک نورانی چہرہ بزرگ باہر آتا ہے جو لوگوں سے پیغام وصول کرتا اور دوبارہ اندر چلا جاتا ہے میں نے یہ سب حیرت سے دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے؟ آخر جب الجھن بڑھی تو ایک آدمی کو روک کر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

اس آدمی نے غلام کو بتایا کہ یہ عالیشان عمارت جو تم دیکھ رہے ہو۔ قصرِ رسول ﷺ ہے جس میں حضور ﷺ خود تشریف فرما ہیں اور یہ درمیانی عمر کا بندہ جو پیغام اندر لے جا رہا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔

میں نے بھی اشتیاق سے آگے بڑھ کر اپنا پیغام حضرت عبداللہ کے حوالے کیا کہ حضور ﷺ کا غلام آپ کے دیدار کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ میرا پیغام لے کر اندر چلے گئے اور میں بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی حضرت مسعودؓ محل سے باہر نکلا اور مجھے آکر بتایا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ابھی تجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ ہمارا دیدار کر سکو تو واپس جا۔ اور اپنے پڑوسی قطب الدین سے پوچھ کر کیا بات ہے پچھلی تین راتوں سے تیرا تحفہ ہمیں نہیں موصول ہو رہا"۔

یہ خواب سن کر حضرت قطب الدین کی حالت بگڑ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سینے میں غم کا طوفان برپا ہو گیا۔

ایک طرف حسین بیوی تھی، دوسری طرف رسولِ مقبول ﷺ کی محبت۔ اور پھر اس جنگ میں خاتم النبیین ﷺ کی محبت جیت گئی۔ آپ فوراً اندر گئے بیوی کو طلاق دی، حق مہر ادا کیا اور پھر گھر بار وطن چھوڑ کر بغداد روانہ ہو گئے۔ آج پھر آپ کو خضر علیہ السلام کی تلاش تھی۔ آج ان بچپن کی نسبت کہیں زیادہ خضر علیہ السلام کی راہنمائی کی ضرورت تھی۔

چنانچہ کوچہ کوچہ قریہ قریہ سترہ سالہ نوجوان گھومتا ہوا جب شیخ شہاب الدین، شیخ برہان الدین چشتی جیسے بزرگوں کی صحبت میں پہنچا تو سبھی رشک بھری نظروں سے اسے تکتے اور اس درزادولی کی قسمت کو حسرت سے دیکھتے یہیں حضرت قطب الدین کی خواجہ چشتی سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے والہانہ انداز میں خواجہ صاحب سے فرمایا "حضرت! اب برداشت نہیں ہوتا۔ مزید صبر کی تاب نہیں۔ ناچیز کو شرفِ غلامی سے سرفراز فرمائیں"۔

خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کے والہانہ پن کو دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے آپ کو شرفِ مریدی بخش کر بختیار کا خطاب دیا۔

اس کے بعد خواجہ صاحب اجمیر چلے گئے اور قطب الدین بختیار کو اپنی خلافت بخش کر انہیں بغداد میں ہی چھوڑ دیا۔

حضرت قطب الدین بختیار عراق، شام اور عرب کی سیاحت پر نکل کھڑے ہوئے۔ دورانِ سفر انہیں اطلاع ملی کہ ان کے مرشد خواجہ معین الدین چشتی اجمیر میں فروکش ہیں تو انہوں نے ہندوستان جانے کی ٹھانی۔

ہندوستان پر ان دنوں سلطان شمس الدین التمش کی حکمرانی تھی۔ جو ایک پرہیزگار اور نیک انسان تھا۔ ہندوستان کے سفر میں آپ کا پہلا پڑاؤ ملتان میں ہوا۔ جہاں حضرت بہاؤ الدین زکریا کا قیام تھا۔ آپ بہاؤ الدین سے جا کر ملے اور کچھ دن ان کے ساتھ قیام کیا۔

انہی دنوں ملتان پر تاتاریوں کے حملے کا اندیشہ ہر فرد کو دامن گیر تھا۔ اور یہ شبہ یقین بن کر اس وقت آشکار ہوا جب تاتاریوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے قلعے کے باہر تا حدِ نظر رنگ برنگے خیموں کا ایک جنگل تھا جن کے درمیان لمبے بالوں، خونخوار چہرے والے تاتاری ہتھیاروں سے لیس گھوم پھر رہے تھے۔ شہر بھر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

شہر کا ناظم تھر تھر کانپتا حضرت بہاؤ الدین زکریا کے حضور آیا۔ اور دہائی دینے لگا۔ کہ کوئی لمحہ جاتا ہے جب تاتاری وحشیانہ قوت سے ملتان

پر دعا دا لول کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے لہٰذا حضرت بہاؤ کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔
حضرت قطب الدین بختیار جو بہاؤ الدین زکریا کے ساتھ ہی بیٹھے تھے انہوں نے جب ناظم ملتان کی یہ آہ و بکا سنی تو اُٹھے اور اسے مخاطب کیا، " وہ تاتاری ہیں کہاں؛ ہمیں دکھاؤ تو ذرا کہ وہ غول ہے کدھر۔"
حاکم شہر امید بھری نظروں سے آپ کو دیکھتا شہر کی فصیل پر لے گیا اور آپ کے سامنے تاتاری لشکر کی تعداد اور مستقبل میں پیش آنے والے اس کے ہاتھوں تباہی کا نقشہ بیان کرنے لگا۔ آپ حاکم شہر کی باتوں سے بے نیاز غور سے تاتاری لشکر پر نظریں جمائے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر وہ حاکم شہر کی طرف مڑتے ہوئے بولے "ایک تیر چلے میں رکھ کر پوری قوت سے دشمنوں کی طرف چھوڑ دو"
حاکم شہر نے جو یہ انوکھا حکم سنا تو اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا اور ڈرتے ڈرتے مخاطب ہوا، "جناب والا! یہ کیا آپ فرما رہے ہیں میرے پاس قلعے میں اتنی سپاہ نہیں کہ میں اس خونخوار لشکر کا مقابلہ کر سکوں۔ اب اگر میں تیر پھینک کر اس غول کو چھیڑتا ہوں تو یہ بپھر کر ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔"
حضرت بختیار بے نیازی سے بولے "تم نے ہم سے مردانگی تھی سو ہم جو کہتے ہیں اس پر عمل کرو اگر ارادہ نہیں ہے تو تم جانو تمہارا کام۔"
حاکم شہر نے سوچا اگر اس حکم پر عمل نہیں کرتا تب بھی بربادی لازم ہے اگر عمل کر کے اس وحشی غول کو چھیڑتا ہوں تب بھی ہونا وہی ہے جو نہ چھیڑ کر بنتا پڑتی ہے تو کیوں نہ اس نوجوان بختیار کی ہدایت پر عمل کروں جو ہو گا یہ صوفی خود ہی سنبھال لے گا چنانچہ اس نے ایک تیر ترکش سے نکالا اور چلے میں رکھ کر بھرپور قوت سے لشکر کی سمت کھینچ کر چھوڑ دیا۔ تیر فضا میں لہراتا سیدھا ایک منجنیق پر جا لگا۔ منجنیق چکنا چور ہو گئی۔ آس پاس کھڑے وحشی لشکری سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا ہوا ہے اور ابھی وہ اس پر حیرت کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ دفعتاً ایک طوفان باد و گرد کا اٹھا کہ جس نے پورے لشکر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ساتھ ہی زور دار بارش شروع ہو گئی اور کچھ دیر بعد جب مطلع صاف ہوا تو سامنے وہ میدان تھا جہاں کچھ دیر قبل تاتاریوں کا ٹھاٹھیں مارتا ایک وحشی لشکر ملتان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔
ملتان کا حاکم فرط جذبات اور عقیدت سے آپ کے قدموں میں گر گیا۔ آپ نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور فرمایا "نادان ہمارا نہیں خدا کا کر اور بندگان خدا کی خدمت کر جنہیں تمہارے سپرد کیا گیا ہے"
کچھ دن ملتان قیام کر کے آپ نے دہلی کے لیے رخت سفر باندھا۔ دلی پہنچ کر آپ وہاں کے ایک نامور بزرگ حضرت قاضی ناگوری کے ہاں قیام کیا۔ حمید ناگوری جو ہر اعتبار سے آپ کے مرشد معلوم ہوتے تھے، نے اس طرح آپ کی عزت و تکریم شروع کی کہ لوگ حیرت سے دیکھتے اور سوچتے کہ حمید کو کیا ہو گیا ہے مرشد ہو کر مریدوں کی طرح قطبؒ کی عزت کرتے ہیں مگر سمجھنے والے سمجھ گئے کہ کوئی تو بات ایسی ہے بختیار میں جو حمید الدین جیسا بزرگ بھی ان کا مرید بننے میں فخر محسوس کرتا ہے۔
دلی میں رہتے جب قطب الدینؒ کو خاصے دن ہو گئے تو انہوں نے خواجہ چشتی کے نام ایک نامہ بھیجا کہ بندہ آپ سے ملاقات کی غرض سے دلی تک آن پہنچا ہے مگر تاہنوز شرف ملاقات سے محروم ہے کچھ دن بعد خواجہ معین الدین چشتی کا پیغام ملا جس میں انہوں نے قطب الدین بختیار کاکی کو ہدایت کی کہ وہ ابھی دلی میں ہی رہیں کیونکہ دلی کی ولایت تمہیں بخشی جاتی ہے جہاں تک مجھ سے ملاقات کا سوال ہے تو ہمارا روحانی قرب تمہیں ہمیشہ حاصل رہے گا اگر ظاہری ملاقات کے خواہش مند ہو تو وہ بھی ضرور ہو گی تم ذرا انتظار کرو۔
خواجہ چشتی کا پیغام پا کر مجبوراً قطب الدین دلی میں ہی ٹھہر گئے آپ کی عظمت کا شہرہ اور علم و فضل کا چرچا ہر سو پھیلا ہوا تھا لوگوں کا ایک ہجوم آپ کے پاس ہر وقت اکٹھا رہتا۔ آپ دن رات لوگوں میں گھرے تنگ آ گئے تھے، مگر دہلی سے نکل بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ خواجہ چشتی کا حکم اس ارادے میں حائل ہوتا تھا۔
دلی کا تاجدار سلطان شمس الدین التمش بھی ہفتہ میں دو بار آپ کے پاس حاضری دینے لگا۔ وہ آپ سے بڑا متاثر تھا۔ اس کی اس کوشش میں صرف ہوتا کہ آپ کوئی نہ کوئی عہدہ سنبھال لیں لیکن آپ اس کی ہر کوشش کو ٹھکرا دیتے۔ پھر بھی سلطان التمش باز نہ آیا اور اپنے خاص آدمی کے ہاتھ بہت سا نقد روپیہ آپ کی خدمت میں بھجوایا کہ اسے قبول کر لیں کیونکہ انسانی ضروریات بہرحال زندگی

ہوتی ہیں۔ لیکن آپ نے انکار ہی میں سر ہلایا۔ جب بادشاہ کے اس خاص بندے نے پرزور اصرار جاری رکھا تو آپ نے وہ بوریا جس پر تشریف فرما تھے۔ اس کا ایک کونا اٹھا کر شاہی دربار کے فرد سے فرمایا "ادھر دیکھ.... میرے بوریے کے نیچے" اس شخص کو جب بوریے کے نیچے زر وجواہر کا ایک ایسا ڈھیر زمین میں دبا نظر آیا جس کی حد تک نظر نہ آتی تھی تو وہ یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا حضرت بختیار نے فرمایا "کیوں... اب بھی تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے انسانی ضروریات کی تکمیل کی خاطر کسی چیز کی ضرورت ہے؟" اللہ تعالیٰ غیب کا علم اپنے دوستوں کے تعرف میں دے دیتا ہے جس کے بعد انہیں دنیاوی زر وجواہر کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ شخص یہ سن کر چپ چاپ واپس پلٹ گیا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی میں ہی دوسری شادی کر لی مگر ضروریات کو انہوں نے اب بھی محدود رکھا ہوا تھا تنگ دستی و عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ التمش نے بہت دفعہ انہیں جاگیر وغیرہ دینے کے لیے اصرار جاری رکھا مگر آپ نے اسے قبول کرنے میں ہر بار ہی تامل کا اظہار کیا آپ کے پڑوس میں ایک بنیا رہتا تھا۔ اکثر اس کی دکان سے ضروریات زندگی ادھار پر آجایا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ اس بنیے کی بیوی حضرت قطب کی زوجہ سے کہنے لگی، "بہن! تمہیں ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے جو ہمارے پڑوس میں ہونے کے سبب تم لوگ فاقوں سے بچے ہوئے ہو۔" آپ کی بیوی نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں البتہ آپ کے پاس آکر یہ تمام بات کہہ سنائی۔ پورا واقعہ سن کر آپ نے اپنی بیوی سے فرمایا "دیکھو.... آئندہ اس بنیے کی دکان سے کبھی کوئی چیز نہ منگانا۔ جب بھی کھانے کی ضرورت محسوس ہو۔ طاق کا پردہ ہٹا کر کاک (ایک قسم کا تنوری نان) حاصل کر لیا کرو۔"

اس کے بعد جب بھی آپ کو بھوک محسوس ہوتی طاق میں سے کاک نکال کر نوش فرما لیا کرتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے اس طرح آپ کاکی کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔

آپ اپنی عبادت میں اس قدر محو ہوتے کہ دنیا بھر سے لاتعلق ہو کر استغراق کے عروج پر پہنچ جاتے۔ ایک دن گھر میں بیوی کے رونے کی آواز سنی تو حیرت سے مریدوں کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے "یہ کیوں رو رہی ہے! جاؤ پوچھو کہ اس طرح بین کرنے کی نوبت آگئی۔" مرید جو صورت حال سے باخبر تھے انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا آخر ان میں سے ایک ہمت کر کے آگے بڑھا اور بولا "حضرت! آپ کے لڑکے کا انتقال ہو گیا ہے۔" آپ نے یہ سن کر اپنی حالت میں کسی قسم کا تغیر نہ لاتے ہوئے فرمایا "اوہ... اچھا.. اگر ہمیں معلوم ہوتا تو ہم اس کے لیے دعا کرتے ہمیں تو اس کی علالت کے بارے میں خبر ہی نہ ہو سکی" یہ کہہ کر پھر اپنی عبادت میں مشغول ہو گئے۔

ایک مرتبہ دہلی میں ایسا خوفناک طاعون پھیلا کہ لوگ دانے دانے کو ترس گئے۔ بھوک سے لوگوں کے مرنے کی خبریں آنے لگیں سلطان التمش نے اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اپنے بھانجے سعد الدین کے ذمہ یہ کام سپرد کر دیا کہ وہ شاہی گودام سے اناج نکلوا کر اس کی روٹیاں پکوا کر عوام میں بانٹے۔ سعد الدین نے منوں کے حساب سے آٹا نکلوایا اور مختلف نانبائیوں کے ذمہ یہ کام لگا دیا کہ وہ دن رات روٹیاں پکا پکا کر قحط زدہ عوام کیلئے ڈھیر کرتے جائیں۔ اتفاق سے ایک نانبائی کے ہاتھوں چند روٹیاں انجانے میں جل گئیں۔ سعد الدین غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا، "ملک میں پہلے ہی قحط کی صورتحال ہے اوپر سے تم اپنی غفلت سے دونوں پر روٹیاں جلاتے جا رہے ہو۔" چنانچہ اس جرم میں اس غریب کو گرفتار کر کے قید خانے کی طرف لے جانے لگا۔ لوگوں کا ایک مجمع بھی تماش بینوں کی صورت میں ساتھ ہو لیا اچانک راہ میں چلتے حضرت بختیار شاہ کاکیؒ کی نظر اس مجمع پر پڑی تو انہوں نے قریب آکر ایک شخص سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے اس شخص نے آپ کو پورا قصہ کہہ سنایا۔ حضرت کاکیؒ یہ سن کر مجمع میں داخل ہو گئے۔ لوگوں کے ہجوم نے جو آپ کو مجمع میں داخل ہوتے دیکھا تو خود بخود راستہ چھوڑنا شروع کر دیا۔ آپ نہایت اطمینان سے لوگوں کے درمیان سے گزرتے سعد الدین کے پاس جا پہنچے۔ آپ نے سعد الدین سے فرمایا "کیوں اس غریب کو ناحق پریشان کرتا ہے روٹیاں جلی ہیں نان، اگر تجھے وہی جلی روٹیاں صحیح حالت میں مل جائیں تو کیا اس شخص کو تو چھوڑ دے گا!"

سعد الدین یہ سن کر ہنس پڑا اور بولا "حضرت! بزرگ ہونے کے ناطے میں آپ کی عزت کرتا ہوں مگر بات ایسی کریں جسے

عقل تسلیم کرے۔ بھلا یہ جلی جھلسی روٹیاں کس طرح دوبارہ ٹھیک ہو سکتی ہیں بھلا مُردہ بھی کبھی زندہ حالت میں کوئی لایا ہے۔؟"
حضرت کاکی نے اس کی یہ بات سنی تو سہی مگر جواب دینا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے نانبائی کی طرف مڑ کر پوچھا "تیسرا تنور کدھر ہے؟ جلی ہوئی روٹیاں لے کر میرے ساتھ وہاں چل"
سعدالدین نے کچھ آپ کی عظمت اور بڑائی کا احساس کیا اور کچھ وہ آپ کے دعویٰ کو پرکھنے کا خواہش مند تھا سو اس نے اعتراض نہ کیا اور نانبائی کو عارضی طور پر رہا کر کے جلی روٹیوں سمیت اپنے تنور تک جانے کی اجازت دے دی۔
تنور پر پہنچ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے نانبائی کے ہاتھوں سے جلی ہوئی روٹیاں لیں۔ سعدالدین اور لوگوں کا مجمع حیرت سے آپ کو دیکھ رہا تھا کہ آخر آپ ان جلی روٹیوں کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں جو یہ اپنی درست حالت میں آجائیں گی۔ حضرت کاکی سب سے بے نیاز روٹیاں اٹھا کر آگے بڑھے اور دوسرے لمحے روٹیاں دہکتے ہوئے تنور میں ڈال دیں۔
سعدالدین یہ دیکھ کر ہنس پڑا اور لوگوں کی طرف منہ کر کے بولا "چلو قصہ ختم..... رہی سہی کسر ان بزرگوار نے پوری کر دی" ادھر نانبائی بھی دل ہی دل میں خوش ہو گیا کہ حضرت کاکی کے اس فعل سے وہ بھی اس کے جرم میں شریک ہو گئے ہیں۔ اب اس کے بچاؤ کی کوئی امید نکل سکتی ہے۔
حضرت کاکی نے کچھ دیر بعد تنور کا منہ کھولا اور نانبائی کو حکم دیا "جا اپنی روٹیاں تنور میں سے نکال کر سعدالدین کو دے دے" نانبائی نے حکم کی تعمیل کی اور روٹیاں نکالنے لگا۔ تمام روٹیاں بالکل صحیح، سنکی اور پکی نکل آئیں۔
حضرت کاکی نے سعدالدین کی طرف دیکھا اور مخاطب ہوئے "سعدالدین! اپنی روٹیاں لے اور راہ پکڑ۔ اس نانبائی کی جان چھوڑ اور یاد رکھ خدا نے تجھے اپنے بندگان کا خادم مقرر کیا ہے اور تو اپنے کسی فعل سے بندگان خدا کو دکھ نہ پہنچا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو خدا کی پکڑ میں آ جائے۔" یہ کہہ کر آپ چل دیے لیکن سعدالدین آپ کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلنے لگا۔ گھر پہنچ کر جب آپ نے اس سے دریافت کیا "اب کیا بات ہے؟" سعدالدین دست بستہ ہو کر مخاطب ہوا "یا حضرت! خادم اپنے سابقہ رویئے پر نادم ہے اور آپ کے حلقہ عقیدت مندوں و خدمت گزاروں میں شامل ہونے کا خواہش مند ہے"
آپ نے جواب دیا "دنیاوی دولت اور درویشی کا آپس میں کیا میل! جب تک تیرے گھر میں یہ چیزیں موجود ہیں تو درویشی کے ادب میں کیسے آسکتا ہے!"
سعدالدین یہ سن کر خاموشی سے واپس ہوا اور دوسرے دن پھر سر جھکائے آن حاضر ہوا اور کہنے لگا "حضرت میں اپنا سب کچھ مندوں میں بانٹ آیا ہوں۔ اب تو نظر کرم کریں"۔
پاس ہی قاضی حمیدالدین ناگوری بھی تشریف فرما تھے انہوں نے قطب بختیار سے کہا "حضرت کاکی یہ نہیں مانے گا۔ آپ کو اسے حلقہ مریداں میں شامل کرنا ہی پڑے گا۔"
چنانچہ سعدالدین مرید کر لیے گئے۔
ایک دن سلطان التمش اپنی سپاہ کے ساتھ حضرت بختیار سے ملنے اُن کے حجرے پر گیا۔ سپاہ حجرے سے باہر ہی رک گئی اور شاہ ہند حجرے میں داخل ہو کر آپ کے روبرو ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت حضرت بختیار کاکی کے ایک طرف حمیدالدین بیٹھے تھے اور دوسری طرف سعدالدین۔ کچھ دیر بعد سلطان التمش نے آپ سے کچھ کھانے کے لیے مانگا۔ حضرت بختیار کاکی نے فوراً گرما گرم کاک سلطان کے آگے پیش کر دیا۔ سلطان عزت و احترام سے وہ لیا لیکن پھر پوچھا "حضرت روٹیاں ہی کھاؤں گیا۔
حضرت بختیار کاکی نے پاس بیٹھے حمیدالدین ناگوری کی طرف دیکھا وہ مرشد کا اشارہ سمجھتے ہوئے اُٹھے اور اس جگہ جا کھڑے ہوئے جہاں وضو کیا جاتا تھا کچی مٹی کا فرش تھا۔ وضو کے مسلسل پانی گرنے سے وہ جگہ کیچڑ سے بھر چلی تھی۔ حمید ناگوری نے وہ کیچڑ اٹھا

لیجا کر سلطان کے سامنے رکھی روٹیوں پر ڈال دیا سلطان نے حیرت سے کیچڑ کو دیکھا لیکن حضرت بختیار کاکی کی کرامات سے واقف تھے لہذا بے چون وچرا روٹی کے ساتھ اسے کھانا شروع کیا لیکن جونہی پہلا نوالہ حلق سے اترا تو ایک انتہائی لذیذ ذائقے کا احساس ہوا کیچڑ ایک ذائقے دار حلوے میں تبدیل ہو چکا تھا سو سلطان التمش نے بڑے شوق اور رغبت کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد انہوں نے اپنے بھانجے کی طرف نظر ڈالی جو حضرت بختیار کاکی کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ سلطان نے اسے مخاطب کیا "کیوں سعد! تو نے بھی حضرت سے کچھ فیض کیا یا یونہی وقت ضائع کرتا چلا آ رہا ہے"۔

سعد الدین نے مسکرا کر ماموں کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر بغل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو ہاتھوں میں انتہائی خوشبو دار تازہ پان تھا۔ سعد نے وہ پان سلطان ہند کی طرف بڑھایا۔ پان کھا کر سلطان بہت خوش ہوا۔ پھر اس نے حضرت بختیار سے درخواست کی کہ اس کی سپاہ کو بھی اپنے اس تبرک سے نوازیں۔ چنانچہ پھر پوری شاہی سپاہ نے حضرت بختیار کے حجرے سے کھانا کھایا اور آخر میں ---- سعد الدین تنبولی کے نام سے مشہور ہوئے۔

ہندوستان کے سرکاری شیخ الاسلام کا انتقال ہوا تو سلطان التمش نے چاہا کہ حضرت بختیار کاکی یہ عہدہ سنبھال لیں لیکن آپ نے صاف انکار کر دیا۔ آپ سے مایوس ہو کر سلطان التمش نے یہ عہدہ ایک اور بزرگ نجم الدین مغری کو پیش کیا جو سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی کے پیر بھائی بھی تھے انہوں نے عہدہ تو قبول کر لیا لیکن اپنا مرتبہ گھٹا لیا۔ ایک طرف وہ شیخ الاسلام ہونے کے باوجود مریدوں کے جھگڑے سے محروم تنہا تنہا سے ہوتے اور دوسری طرف حضرت بختیار کاکی کا یہ عالم تھا کہ ان کے در پر مریدوں کا ہر وقت ہجوم رہنے لگا۔ نجم الدین کو یہ بہت ناگوار گذرا اور آپ سے نفرت کرنے لگے جس میں حسد کا مادہ بھی تھا۔

کچھ عرصہ بعد خواجہ معین الدین چشتی کا دہلی آنا ہوا تو جہاں وہ حضرت بختیار کاکی کو شرف ملاقات بخشنے گئے وہیں اپنے پیر بھائی نجم الدین سے بھی ملنے پہنچے۔ نجم الدین اپنے گھر میں توسیع کرا رہے تھے۔ جیسے ہی انکی نظر خواجہ غریب نواز پر پڑی تو جلدی سے منہ موڑ لیا۔ حضرت خواجہ کو اس بات کا بہت رنج ہوا۔ انہوں نے نجم الدین کو مخاطب کیا "نجم الدین! کیا شیخ الاسلام کا عہدہ پا کر تجھ میں اتنا غرور آ گیا ہے کہ ہم سے نظریں چرانے لگا ہے"۔ نجم الدین نے تلخی سے کہا "یا حضرت! مجھ میں بھلا کس چیز کا غرور ہو گا۔ میں تو اب بھی آپ کی ویسی ہی عزت و احترام کرتا ہوں جیسا کیا کرتا تھا ہاں البتہ آپ میں تبدیلی ضرور آ گئی ہے اب آپ پہلے جیسے مخلص نہیں رہے ایک تو اپنے چہیتے مرید قطب الدین کو دہلی کی ولایت عنایت کر دی اور جب دہلی آئے تو شرف میزبانی بھی اسی کو بخشا۔ اب آپ ہی بتائیں اس رویہ پر کوئی کیا کہے؟ بدل میں گیا ہوں یا نظریں آپ نے پھیر لی ہیں"۔

حضرت معین الدین یہ شکایتیں سن کر بہت غمزدہ ہوئے اور کہا "جیسے تیری مرضی میں قطب الدین کو ساتھ اجمیر لیے جاتا ہوں تو خاطر جمع رکھ"۔

یہ کہہ کر آپ قطب الدین کے پاس گئے اور کہا "بختیار چل... تو میرے ساتھ اجمیر چل۔ یہاں تیرے حاسد تجھے چین سے نہ بیٹھنے دیں گے"۔ حضرت بختیار اپنے مرشد کی دل وجان سے عزت کرتے تھے۔ سو اسی وقت ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ادھر دلی کے لوگوں کو جب آپ کا اجمیر کی طرف جانے کا علم ہوا تو ان میں صف ماتم بچھ گئی۔ لوگ زار وقطار رونے لگے سلطان التمش اور شہریوں نے جب گڑگڑا کر آپ سے فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے کہا تو حضرت خواجہ کا دل پسیج گیا اور انہوں نے قطب الدین کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

شیخ الاسلام نے جب یہ دیکھا تو حسد کی آگ پھر سینے میں بھڑک اٹھی لیکن مجبور تھے اوپر سے سلطان التمش، جلال الدین تبریزی قطب الدین کاکی کے بھی گہرے دوست تھے بڑی عزت کرنے لگا۔ یہ غم بھی شیخ الاسلام کو کھائے جا رہا تھا۔ ایک دن جو شیخ الاسلام نے دیکھا کہ تبریزی اپنے ایک نوجوان غلام زادہ سے پیروں کے تلوے سہلوا رہے ہیں تو حسد کے مارے جل گیا۔ حضرت تبریزی نے بھی ان کی حالت کا اندازہ لگا لیا۔ اور انہیں مزید تنگ کرنے کے لیے کہا "شیخ اگر تم اور شیخ آ جاتے تو اس لڑکے کو میرے پیروں کے تلوے سہلنے کی بجائے پہلو میں بیٹھا دیکھتے"۔

شیخ الاسلام یہ دلیری سہہ گئے مگر چند دن بعد سلطان کے دربار میں ایک عورت دُہائی دیتی آئی کہ حضرت تبریزیؒ نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اور میں ان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ اس خبر نے ایک تہلکہ مچا دیا۔ سلطان نے پریشانی کے عالم میں علماء کو طلب کیا۔ انہی میں شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی بھی تھے آپ نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جو کچھ تیرے ساتھ بیتی ہے سب صاف صاف سچائی کے ساتھ اس مجمع کے سامنے دُہرا دے ورنہ تیرا انجام خدا کی رضا و منشا سے بے حد بھیانک نکلے گا"

وہ عورت یہ بات سن کر سہم گئی اور فر فر سب بتا دیا کہ حضرت تبریزیؒ کا کوئی قصور نہیں بلکہ مجھے ایسا کرنے کو شیخ الاسلام نے لکھا تھا۔ سلطان التمش یہ سن کر غصہ سے باہر ہو گیا مگر قطب الدین بختیار کاکیؒ کے سمجھانے پر اسے سزا تو کوئی نہ دی البتہ اسے عہدے سے فوراً ہٹا دیا۔

حضرت بختیار انتہائی تنگ دستی اور عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ سوائے خوراک کے وہ کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ کرتے حضرت بختیار کاکی کا ایک دس سالہ بچہ بھی تھا وہ جب دوسروں کو یوں عیش کرتے دیکھتا اور اپنی حالت پر غور کرتا تو رنج والم میں مبتلا ہو جاتا۔ ایک دن جو ایک مُرید نے مرشد کے صاحبزادے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو وجہ پوچھی۔ بچہ تھا علم نہیں رکھتا تھا کہ کسی کے سامنے کیا بات کرنا مناسب ہے اور کیا نہیں۔ مرید سے اپنی تنگ دستی کا اظہار کر بیٹھا۔ اس مرید نے جو اپنے مرشد کی تنگ دستی کا یہ عالم سنا تو اگلے دن ضروریاتِ زندگی لا پھندا آپ کے حضور آن حاضر ہوا اور وہ چیزیں آپ کی نذر کیں اور انتہائی لجاجت سے کہنے لگا "غلام سخت شرمندہ ہے جو آپ کی حالت سے بے خبر رہا بخدا اگر غلام کو اس کا علم ہوتا تو آپ کو یہ پریشانی نہ اٹھانا پڑتی"

حضرت بختیار نے فوراً وہ چیزیں واپس کیں اور انتہائی رنج والم میں خدا سے کہنے لگے "اے پروردگار! جس نے میرے گھر کا بھید کھولا تو اس کی گردن توڑ دے"

شام ہوئی تو قطب الدین بختیار کاکی کے گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ قطب الدینؒ نے مریدوں سے صورت معلوم کروائی تو علم ہوا کہ ان کا چھت سے سر کے بل گرنے سے گردن کا منکا ٹوٹنے کے سبب جان بحق ہو گیا ہے۔ آپ نے یہ سُن کر افسردگی سے فرمایا "اچھا! تو وہ یہ تھا۔ کاش! مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں ایسی بات منہ سے نکالتا ہی کیوں لیکن خیر اب تو جو ہونا سو ہو چکا شاید اس میں بھی کوئی خدا کی مصلحت ہو"

محفل سماع برپا تھی ماحول پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ قوال بار بار لہرا کر یہ شعر ادا کرتا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

حضرت بختیار شعر سنتے جاتے اور وجد میں آتے جاتے۔ حالت اتنی غیر ہوئی کہ بے ہوش ہو گئے تین دن مسلسل اس حالت میں رہے آپ کا حال متغیر ہوتا رہا بالآخر آپ باون ۵۲ سال کی عمر میں (۶۳۴ھ) کو وصال فرما گئے۔

آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ مریض کی عیادت کرنے والا جنت کے باغوں میں جا بیٹھتا ہے اور وہ جب اٹھتا ہے تو رات تک ستر ہزار فرشتے اس پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں۔ مسلمان بھائی کے حق میں سے ہے کہ اس کے جنازے کے ہمراہ جائے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ جو شخص جنازے کے ساتھ جائے گا اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا اگر وہ میت کے دفنانے تک ٹھہرا رہے، تو اس کے لیے دو قیراط ہے۔

فریدالدین مسعود

نے ایک خدارسیدہ ، نیک پارسا خاتون کے گھر میں جنم لیا تو صاحب عرفان لوگوں نے ماں کو خوشخبری سنادی کہ یہ لڑکا آگے چل کر روحانیت اور تصوف کے میدانوں میں بہت بلند مقام اور نام پیدا کرے گا۔ اس کا نام دُنیا کے گوشے گوشے میں علم و عرفان اور نیکی کی علامت بن کر چمکے گا۔ یہ فریدالدین ہی تھے جنہوں نے آگے چل کر برصغیر پاک و ہند میں ایک اللہ والے بزرگ کے طور پر شہرت حاصل کی اور صوفیائے کرام کی صف میں داخل ہونے کے بعد اُنہیں شیخ کبیر فرید گنج شکر کا خطاب ملا۔ فرید گنج شکر وہ بزرگ ہیں جنہیں خواجہ قطب الدین کاکی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری جیسی ہستیوں کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔ ۲۲ویں واسطے سے ان کا شجرۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے مل جاتا ہے۔ ان کے والدین ملتان کے قریب ایک جگہ کھوتوال میں قیام پذیر تھے۔ یہ خاندان درحقیقت کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان میں وارد ہوا تھا اور فریدالدین مسعود کے آباؤ اجداد نے سکونت کیلئے ملتان کے علاقے کا انتخاب کیا تھا۔ کھوتوال کے مقام پر ۵۸۴ھ میں بابا فرید نے جنم لیا۔ ان کی پیدائش کے بارے میں بھی عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ شکم مادر میں تھے تو ایک رات اُن کی والدہ محترمہ مصلے پر بیٹھی تہجد کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ نصف شب کے قریب ایک غیر مسلم چور ان کے مکان میں داخل ہوا۔ ظاہر ہے اس کا ارادہ چوری کر کے مال و اسباب سمیٹ لے جانا تھا مگر جب اس نے ایک خاتون کو خداوند دو عالم کے حضور سر بسجود دیکھا تو اس منظر سے بہت متاثر ہوا۔ بہت دیر تک وہ کھڑا خدا کی اس نیک ہستی کو خشوع و خضوع سے مصروف عبادت دیکھتا رہا اور اس کے دل پر اس منظر نے گہرا اثر ڈالا۔ چور نے قوت ارادی کو اس کام میں لا کر اپنی توجہ اس طرف سے ہٹائی اور عورت کو مصروف عبادت چھوڑ کر گھر کے دوسروں کمروں کے سامان کو سمیٹنے کا ارادہ کیا مگر جب اُس نے دوسرے کمرے کی طرف جانے کے لیے اپنا رُخ موڑا تو اُسے ایک انوکھے روح فرسا تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کی بصارت جاتی رہی اور وہ اندھا ہو گیا ہے۔ کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود چور کی نگاہوں کے سامنے سیاہ اندھیروں کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مل کر دوبارہ کھولیں مگر اس بار اندھیرا پہلے سے بھی زیادہ گھٹا ٹوپ تھا۔ وہ کمرے کی کوئی چیز نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ چور یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اچانک اس طرح بینائی سے محروم ہو جائے گا اور دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ چور کے سامنے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ اپنے ارادۂ فاسد کو ترک کرے اور اس اللہ کی نیک بندی سے امداد کا طالب ہو۔ جس کے گھر میں چوری کی نیت کرنے کی بنا پر وہ اپنی قوت بینائی کھو بیٹھا

تھا۔ وہ ہاتھ باندھ کر اس عفیفہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور گڑگڑایا: "میں تمہارے گھر میں چوری کے لیے آیا تھا مگر یک بیک اندھا ہو گیا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ میری زندگی کے ان اندھیروں کو صرف تم ہی دُور کر سکتی ہو۔ خدا کے لیے اپنے معبود سے دُعا کرو کہ وہ میری خطا بخش دے اور مجھے میری بصارت واپس دے دے۔ میں تم سے بھگوان کی سوگند کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ساری زندگی چوری سے تائب ہو جاؤں گا۔"

بابا فرید کی والدہ عبادت میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں کہ نہ تو انہیں چور کی آمد کا علم ہو سکا اور نہ ہی کچھ دیر تک وہ اس کی درخواست پر کان دھر سکیں۔ جب چور نے بار بار گڑگڑا کر اپنی التجا دوہرائی تو ان کا ارتکاز ٹوٹا اور انہوں نے اپنے سامنے ایک نامحرم شخص کو ایستادہ دیکھ کر مُنہ چھپا لیا۔ چور کی استدعا انہوں نے سن لی تھی مگر وہ اس بات پر حیران تھیں کہ انہوں نے تو خدا سے لو لگانے کے بعد اپنے گھر کی حفاظت کے مسئلے کو اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ اس چور کو چوری سے روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے شاید اپنی رحمت کے فرشتے بھیجے ہوں گے۔ وہ ایک رحمدل اور خدا ترس خاتون تھیں۔ چور کے اس اعتراف کے باوجود کہ وہ چوری کی نیت سے ان کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے دُعا کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی اور سجدے میں جا کر نہایت لجاجت کے ساتھ خدا سے دُعا کی کہ وہ اپنے اس گمراہ بندے کو معاف کر دے اور اس کی بینائی اُسے واپس کر دے۔ خدا کی رحمت جوش میں آئی ہوئی تھی اور پھر اسے اپنے اوپر توکل کرنے والی اس خاتون کی بات رکھنا بھی مقصود تھا۔ چنانچہ شانِ رحمت نے یہ معجزہ دکھایا کہ چور کی بینائی واپس آ گئی اور وہ ایک بار پھر دُنیا کو دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس وقت تو چور شرمسار اور نادم ہو کر واپس لوٹ گیا مگر اس واقعے نے اسے اتنا متاثر کیا کہ دوسرے ہی دن وہ ان خاتون کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔ اس چور کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا اور پھر عمر بھر اس نے اس گھر کی خدمت گزاری کی جہاں سے اسے آنکھوں کی اور ایمان کی روشنی حاصل ہوئی تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ سے یہ فقرہ منسوب کیا جاتا ہے کہ انسان ماں کے پیٹ ہی سے برا یا اچھا پیدا ہوتا ہے۔ گویا نیکی اور برائی پیدائشی طور پر ورثے میں حاصل ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی نسل سے تعلق رکھنے والے اس بچّے کی پیدائش پر لوگوں نے اس بات کا ٹھوس ثبوت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ چور کا واقعہ پوشیدہ نہ رہ سکا۔ چور دوسرے ہی دن آ کر اسلام قبول کر چکا تھا اور سارے قصبے میں اس کرامت کا چرچا تھا۔ جاننے والے جان گئے کہ اس عابدہ اور زاہدہ کے شکم میں پرورش پانے والا بچہ یقیناً آگے جا کر بہت محیر العقول کارنامے سرانجام دے گا۔ اس کا دوسرا ثبوت بھی جلد ہی مل گیا۔ ہوا یہ کہ بابا فرید کی والدہ کے ہمسائے میں رہنے والوں نے اپنے صحن میں بیری کا ایک پیڑ لگا رکھا تھا۔ ایک دن تیز ہوا چلی تو کچھ بیر جھاڑی سے ٹوٹ کر زمین پر گر گئے۔ بابا فرید کی والدہ محترمہ نے زمین سے اُٹھا کر یہ پکے ہوئے بیر کھانے کی کوشش کی مگر ابھی بیر حلق سے نیچے بھی نہیں اُترا تھا کہ انہیں شدید دردِ شکم نے گھیر لیا۔ یہاں تک کہ وہ درد سے بے تاب ہو گئیں۔ انہیں اس وقت تک سکون نہ ملا جب تک قے کے ذریعے وہ بیر باہر نہ نکل گیا۔ خاتون نے اس واقعے کا تذکرہ بھی کسی سے نہ کیا مگر انہیں یقیناً واثق ہو گیا کہ خداوند کریم یہ نہیں چاہتا کہ وہ کوئی ایسی چیز کھائیں جسے سو فیصد رزقِ حلال نہ کہا جا سکتا ہو۔ اس واقعے کے بعد وہ خود بھی بہت زیادہ احتیاط برتنے لگیں۔ کچھ عرصے بعد جب فرید الدین مسعود چھوٹا بچہ تھا ان کی والدہ نے یہ داستان بیٹے کو سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ جب تم پیٹ میں نشوونما پا رہے تھے تو میں نے ہمیشہ رزقِ حلال اور نیک خوراک ہی استعمال کی۔ ایک بار جب نادانستگی میں بلا اجازت کسی کے بیر کھانے کی کوشش کی تو وہ بھی حلق سے نیچے نہیں اُتر سکے۔

ماں نے بیٹے کا نام فرید الدین مسعود رکھا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق بچّے کی دینی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ فرید الدین پڑھائی میں تیز اور ذہین تھا یہاں تک کہ چند ہی سال میں اس کی استعداد اپنے اساتذہ کے ہم پلہ ہو گئی۔ فرید الدین مسعود نے اٹھارہ سال تک اپنے آبائی قصبے کھوتوال اور ملتان میں تعلیم حاصل کی اور آغازِ عمر ہی سے ان کی نیکی اور دیگر اوصاف کا چرچا ہونے لگا۔ یہیں پر ایک دن ان کی ملاقات بختیار کاکی سے ہوئی جو ان دنوں ملتان آئے ہوئے تھے۔ شاید وہ بھی غیب کے اشارے پر ہی ملتان آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب وہ ملتان ایک مجلس سے خطاب کر رہے تھے تو فرید الدین مسعود سے ملاقات ہوئی اور ان کے دل پر عجیب اثر ہوا۔ انہوں نے فرید الدین پر توجّہ کی اور نتیجہ

لگا کر نوعمر فرید اُن کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا اور اُن کی روحانی غلامی کے دائرے سے پھر کبھی باہر نہیں نکل سکا۔ کچھ عرصے خواجہ بختیار میں زندگی گزارنے کے بعد فرید کو مرشد سے ہدایت ملی " فرید علم کی تلاش میں کمر بستہ ہو کر سفر پر جا۔ علم ہی انسان کو مکمل انسان بناتا ہے۔ رہے علم زاہد شیطان کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے۔"

بابا فرید نے اپنے مرشد کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر قندھار کا سفر اختیار کیا جہاں دُنیائے رُوحانیت و تصوف کے نادر روزگار اصحاب محفل سجائے ہوئے تھے۔ قندھار میں ان دِنوں اللہ کے جن نیک بندوں کا چرچا تھا ان میں شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری اور شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی بھی شامل تھے۔ بابا فرید نے پانچ سال تک ان بزرگوں کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور تحصیل علم و عرفان کرتے رہے، لیکن اصل نعمت انھوں نے اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکی سے ہی حاصل کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار بابا فرید حضرت بختیار کاکی کی خانقاہ میں قیام پذیر تھے۔ ان ہی دنوں حضرت خواجہ معین الدین چشتی بھی اسی جگہ تشریف فرما ہوئے اور خانقاہ میں مہمان رہے۔ خواجہ بختیار کاکی نے اپنے تمام شاگردوں اور خلفاء کو خواجہ معین الدین چشتی سے ملاقات کے لیے حاضر کیا مگر ان میں بابا فرید شامل نہ تھے۔ وہ ان دِنوں اسی خانقاہ کے ایک حجرے میں چلہ کشی میں مصروف تھے۔ جب خواجہ معین الدین چشتی تمام خلفاء سے ملاقات کر چکے تو خواجہ بختیار کاکی سے دریافت فرمایا۔

"کیا کوئی اور مرید یا خلیفہ بھی ملاقات سے رہ گیا ہے ؟"

انہوں نے عرض کی " مسعود نامی ایک مرید حجرے میں ہے مگر وہ چلہ کشی میں مصروف ہے اس وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔"

خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا " اگر وہ مصروف ہے تو کیا ہوا۔ ہم خود اس سے ملاقات کے لیے اُس کے پاس جائیں گے۔" یہ فرمایا اور خواجہ بختیار کاکی کے روکنے کے باوجود حجرے میں بابا فرید کے پاس پہنچ گئے۔ بابا فرید نے یک بیک دُنیائے تصوف کے آفتاب و ماہتاب کو اپنے سامنے جلوہ گر دیکھا تو آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ بے اختیار مؤدب کھڑے ہو گئے۔ مسلسل فاقہ کشی اور چلہ کشی کے باعث انتہا درجے کی کمزوری اور نقاہت کا عالم طاری تھا پھر بھی احترام سے باز نہ آئے۔ اُٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے قدموں میں گر گئے اور بچشم نم اس بات پر ندامت کا اظہار کیا کہ ان کی پیشوائی اور احترام کی خاطر کھڑے ہونے سے معذور ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی نے اُنہیں بے اختیار سہارا دے کر اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ بابا فرید کے سینے میں روشنی مُنتقل ہو گئی اور نقاہت دُور ہو گئی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے بابا فرید پر ایک نظر ڈالی اور پھر ازراہِ سفارش خواجہ بختیار کاکی سے مخاطب ہو کر فرمایا " اس کو اب اور کب تک ریاضت میں مصروف رکھو گے۔ اسے جو کچھ دینا ہے دے کر رشاد کا کام کرو۔"

خواجہ بختیار کاکی نے فرمایا " حضرت آپ کی موجودگی میں بھلا میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں کہ اُنہیں کچھ دے سکوں۔ آپ ہی اس پر کرم کی نگاہ فرمائیں۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا " بختیار اس کا تعلق تم سے ہے اس لیے جو کچھ پائے گا تم ہی سے پائے گا۔ ہم درمیان میں مداخلت کرنے والے کون ہوتے ہیں ؟"

حضرت خواجہ معین الدین چشتی بابا فرید پر اتنے مہربان ہوئے کہ اللہ کے حضور قبلہ رُو ہو کر ان کے حق میں دُعا فرمائی اور اُنہیں صاحب علم و عرفان و آگہی بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دُعا گو ہوئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی دُعاؤں ہی کا اثر تھا کہ کچھ عرصے بعد بابا فرید کو قطب ابدال یا قطب اکبر کا مقام حاصل ہُوا جو ایک بلند و برتر مقام اور مرتبہ تھا۔ تصوف کی دُنیا میں مدارج اور رُتبے ہوتے ہیں۔ اس کی اصطلاح میں قطب وہ ہوتا ہے جو ولی سے برتر ہو اور اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی ولی کو اسکی ولایت سے معزول کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرا ولی مقرر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ قطب ابدال اور قطب اکبر کا درجہ قطب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ وہ قطب کو بھی معزول کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ بابا فرید کو آگے چل کر قطب اکبر کا بلند مرتبہ حاصل ہُوا۔

بابا فرید نے جن بزرگوں کی صحبت پائی تھی ان میں روحانی کسب بھی کیا اور دینی تعلیم بھی حاصل کی۔ ایک زمانے میں جب وہ قندھار میں قیام فرما تھے حضرت خواجہ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی نے اُن سے فرمایا تھا کہ اے فرزند درویشی اختیار کرنا اور اسے نبھانا آسان نہیں ہے۔

پردہ پوشی کا دوسرا نام ہی درویشی ہے۔ محض خرقہ پوشی کو درویشی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔"

بابا فرید اپنے روحانی مرشد خواجہ بختیار کاکی کی خدمت اقدس میں کافی عرصے مقیم و حاضر رہے۔ مرشد کی وفات کے بعد ان کا در چھوڑا اور اجودھن تشریف لے گئے۔ یہ وہی مقام ہے جسے آجکل پاک پتن کہا جاتا ہے۔ بابا فرید اس مقام پر جلوہ فرما ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ اس علاقے میں جہالت عام ہے۔ لوگ بنیادی انسانی خصوصیات اور شعور تک سے ناواقف اور بے بہرہ ہیں۔ پھر یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ اس علاقے کے لوگوں کو بزرگوں اور زاہدوں کی صحبت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ لوگ خود بھی ایسے درویشوں اور نیک لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور عام طور پر ان سے بدسلوکی، درشتی اور بداخلاقی سے پیش آیا کرتے تھے جسکی وجہ سے اگر کسی بھولے بھٹکے درویش کا گزر اس علاقے سے ہو بھی جاتا تھا تو وہ طویل قیام کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ پھر یہ تمام علاقہ حشرات الارض سے بھرا ہوا تھا۔ زہریلے سانپ، بچھو اور دوسرے کیڑے مکوڑے کھلے بندوں جنگلوں اور میدانوں میں گھومتے پھرتے اور بھولے بھٹکے انسانوں کو لقمۂ اجل بنا دیتے۔ بابا فرید نے ان تمام باتوں کے پیش نظر اس علاقے کو رشد و ہدایت کے لیے پسند فرمایا اور یہیں قیام فرما ہوئے۔

کچھ عرصے قیام پذیر رہنے کے بعد آس پاس کے علاقوں میں آپ کی نیکی اور کرامات کی شہرت پھیلنے لگی اور لوگ جوق در جوق آکر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ زہریلے کیڑے مکوڑے تو آپ کی برکت سے اس علاقے کو چھوڑ کر ہی رخصت ہو گئے اور خلق خدا کو ان کے آلام سے نجات ملی۔ رفتہ رفتہ آپ کے مریدوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ کون تھا جو ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کی کرامات اور اخلاق و عادات سے متاثر نہ ہوتا۔ آپ کی تعلیمات اس کے دل کو مسخر کر لیتیں اور پھر وہ آپ کا بندۂ بے دام بن کر رہ جاتا۔

کہتے ہیں کہ اجودھن کا قاضی آپ کی کرامات اور مقبولیت دیکھ کر دشمن ہو گیا اور مختلف طریقوں سے آپ کو تکلیف پہنچانے کی تاک میں رہنے لگا۔ وہ طرح طرح بابا فرید کو تنگ کرتا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تنگ آکر اس علاقے سے ترک سکونت اختیار کر جائیں مگر بابا فرید اسکو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بابا فرید اکثر اوقات دو دو گھنٹے تک طویل سجدوں میں رہتے۔ ایسے عالم میں موسم سرما کی شدت سے بچانے کی غرض سے آپ کے مرید آپ پر گرم کپڑے یا پوستین وغیرہ ڈال دیا کرتے۔ ایک روز جب مرید بابا فرید کے سجدے سے سر اٹھانے کے منتظر تھے تو ایک قلندر اندر داخل ہوا۔ اس نے بابا فرید کو سربسجود دیکھا تو اظہار ناراضگی کیا اور بلند آواز سے ان کی شان میں کلمات بے ادبی کہنے لگا۔ مرید سانس روکے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ قلندر کی بے ادبی اور گستاخی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ بابا فرید کے کانوں تک بھی اسکی آواز پہنچ گئی۔ آپ نے سجدے سے سر اٹھائے بغیر فرمایا "کوئی ہے؟"

حضرت نظام الدین بھی اس وقت حاضرین میں شامل تھے، باادب ہو کر بولے "حضور آپ کا غلام نظام الدین خدمت میں حاضر ہے"

آپ نے دریافت کیا "جو قلندر اندر آیا ہے کیا اس کی کمر میں زنجیر بندھی ہوئی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "جی ہاں"۔

پوچھا "اس کے کانوں میں ہاتھی دانت کے سفید حلقے بھی موجود ہیں؟"

جواب ملا "حضرت بے شک ایسا ہی ہے"

قلندر اس موقعہ پر گھبرا گیا مگر اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔ بابا فرید کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی "نظام الدین۔ کیا اس کی کمر میں چھری بھی بندھی ہوئی ہے؟"

"جی ہاں"

"تو پھر اس شخص سے کہو کہ اگر بہتری چاہتا ہے تو یہاں سے چپ چاپ چلا جائے ورنہ پچھتائے گا۔"

قلندر اب اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ مزید گفتگو کی تاب نہ لا سکا اور تیزی سے سر پر پیر رکھ کر بھاگ گیا۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ شرارت اجودھن قاضی نے کی تھی۔ اس نے قلندر کو معقول رقم بطور انعام عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا بشرطیکہ وہ بابا فرید کی زندگی کا چراغ گل کر دے مگر آپ کی جلالت کی تاب نہ لا سکا اور فرار ہو گیا۔

الوداع سکری خشکی الوداع
زنکوڈن
شیمپو کے ۲ کام
بالوں سے سکری خشکی کا خاتمہ
اور ریشم جیسے نرم ملائم خوبصورت بال
○ زنکوڈن شیمپو میں شامل زنک پاریتھیون ZINIC PYRITHIONE نہ صرف
بالوں سے خشکی کا مکمل علاج کرتا ہے بلکہ تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ EMOLLIENT
یعنی خاص کنڈیشنز بالوں میں نئی چمک دمک پیدا کرتے ہیں۔
○ زنکوڈن شیمپو میں دلفریب خوشبو آپ کے قرب
کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔
○ خشکی دور کرنے کے علاوہ اتنا نرم و لطیف کہ آپ روزانہ
زنکوڈن شیمپو استعمال کر سکتے ہیں۔
○ زنکوڈن شیمپو ضرور آزمایئے!
بالوں سے خشکی کو الوداع کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں
کہ آپ بالوں کی خوبصورتی کو الوداع کہہ رہے ہیں۔
ZINCO-DAN
New Conditioning
rich lathering
ZINCO-DAN
SHAMPOO
Contains Zinc Pyrithione and Emollient
New Conditioning
rich lathering
ZINCO-DAN
SHAMPOO
MAKES HAIR CLEANER FRESHER & MORE MANAGEABLE
حسینی
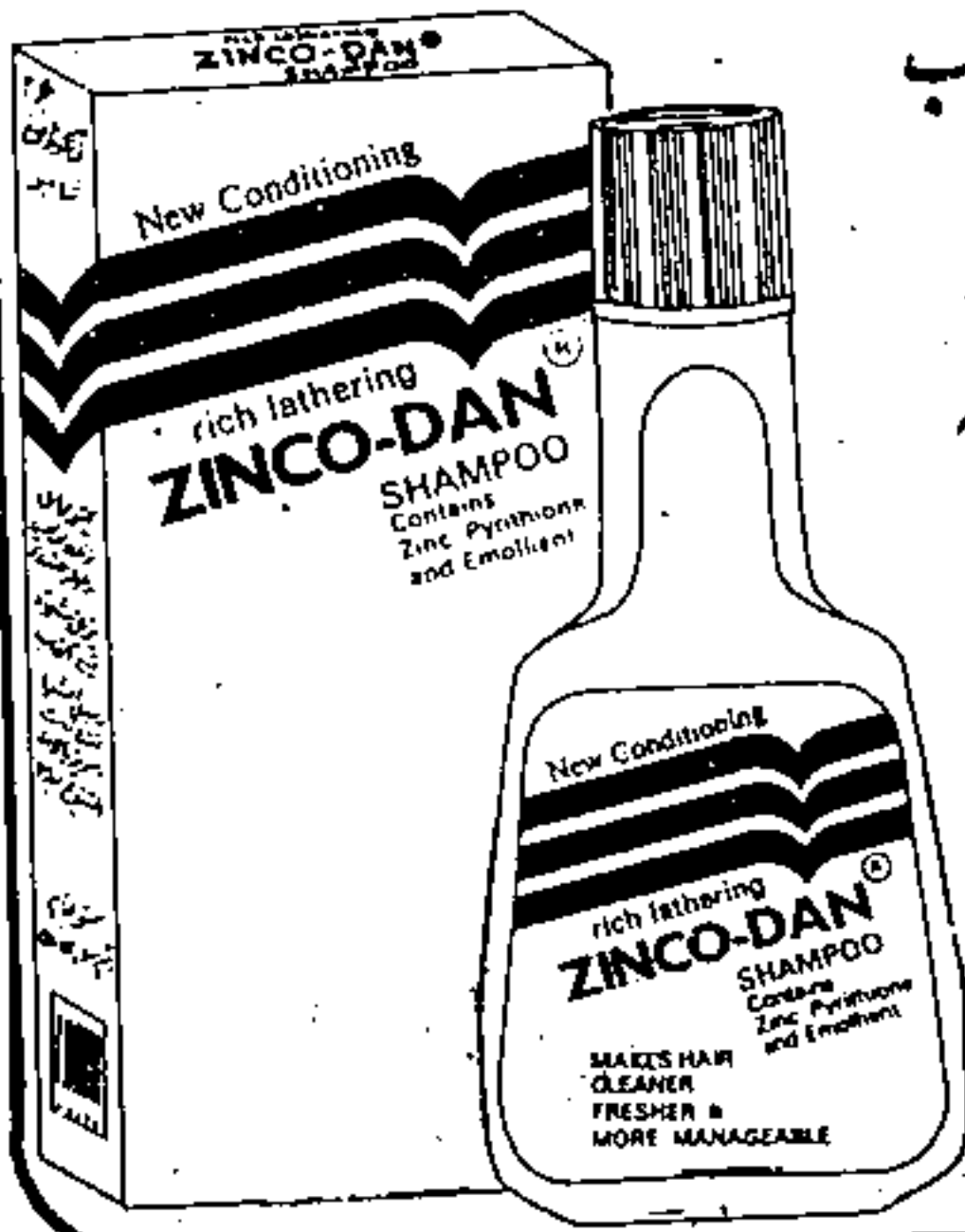
کہتے ہیں کہ جب قاضی کی یہ کوشش ناکام ہوگئی تو اُس نے دوسرے طریقے اختیار کیے۔ شہر کے حاکم کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ بابا فرید خلق خدا کو حاکم کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں اور لوگوں میں بے چینی اور بدامنی پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ حاکم نے بھی قاضی کی باتوں میں آکر بابا فرید اور اُن کے مریدوں اور لواحقین کو ستانے کا عمل شروع کر دیا۔ بابا فرید تو ان حرکات سے بے پروا تھے مگر لواحقین فکر مند ہوگئے۔ وہ خوفزدہ ہو کر سوچنے لگے کہ اگر یہی عمل رہا تو کچھ عرصے بعد ان لوگوں کی ہمتیں اتنی بڑھ جائیں گی کہ عزت و آبرو اور جان کی حفاظت کرنا بھی دوبھر ہو جائے گا، چنانچہ جب حاکم کی چیرہ دستیاں حد سے بڑھ گئیں تو ایک دن آپ کے صاحب زادے بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حاکم کی شکایت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے مظالم سے زندگی وبال ہو چکی ہے اور اس کی گستاخیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ بابا فرید خاموشی سے ان کی شکایت سنتے رہے۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا عصا زمین پر مارا۔ کہتے ہیں کہ اسی لمحے حاکم شہر شدید دردِ شکم میں مبتلا ہو گیا۔ حکیموں اور ویدوں نے بہتیرا علاج کیا مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ یہاں تک کہ اسے احساس ہو گیا کہ اس پر یہ عذاب بابا فرید کی وجہ سے نازل ہوا ہے۔ اُس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ اسے فی الفور بابا فرید کی خدمت میں لے چلیں۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی مگر حاکم شہر یہ مسافت طے کر کے بابا فرید کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ اجودھن کے قاضی اور دوسرے لوگوں کو حقیقتِ حال کا علم ہوا تو کانپ کر رہ گئے۔

بابا فرید اربابِ حکومت اور برسرِ اقتدار و اختیار لوگوں کی صحبت کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ حتی الامکان ان کی صحبت سے دُور رہتے تھے۔ جب آپ نے شہرت حاصل کی اور آپ کی کرامات کا چرچا دُور دراز تک پھیل گیا تو بہت سے اُمرا اور بادشاہ بھی آپ کے معتقد ہوگئے اور آپ کو دُنیاوی آسائشیں اور عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچانے کی درخواست کی مگر آپ نے بالکل توجہ نہ دی اور اُن سے بالکل متاثر نہ ہوئے۔ آپ کی زندگی کا مقصدِ اولین اسلام کی تبلیغ اور دین کی اشاعت تھا جس میں آپ شب و روز مصروف رہا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے کلام میں اتنی تاثیر تھی اور آپ کے اعمال لوگوں کو اتنا زیادہ متاثر کرتے تھے کہ وہ بے اختیار اسلام کے حلقے میں داخل ہو جاتے تھے۔ آپ نے اشاعتِ اسلام کے نیک فریضے کو اس خوبی سے ادا کیا کہ اسلام کو پھیلانے کے سلسلے میں جو کامیابی آپ کو حاصل ہوئی تھی اتنی کامیابی آپ کے مرشد خواجہ بختیار کاکی کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ پنجاب میں گاؤں کے گاؤں آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔ کئی بااثر قبائل نے اسلام کی دعوت قبول کی اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ بعد کے پنجاب میں مسلمانوں کی عددی اکثریت کا بہت بڑا سبب بابا فرید گنج شکر کی تبلیغ شخصیت بھی ہے۔

بابا فرید کو دُنیاوی نعمتوں اور زر و جواہر سے مُطلق دلچسپی نہ تھی اور آپ ان سے مکمل طور پر بے نیاز تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار سلطان ناصر الدین محمود نے اپنے نائب سلطنت غیاث الدین بلبن کے ذریعہ آپ کی خدمت میں چار دیہات کی ملکیت کا تحفہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ نقد روپیہ بھی پیش کیا۔ جب غیاث الدین بلبن نے یہ تحائف آپ کی خدمت میں پیش کیے تو آپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "مجھے ان کی ضرورت ہے؟"

بلبن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضرت سلطان نے نقد روپیہ درویشوں کے لیے روانہ کیا ہے اور چار دیہات کی جاگیر آپ کی اولاد کے لیے نذر کی ہے۔"

آپ نے نقد روپیہ اسی وقت خانقاہ کے درویشوں میں تقسیم کر دیا اور جاگیر کے کاغذات بلبن کو واپس کر دیئے اور فرمایا کہ درویش کی اولاد کو ان اشیا کی محتاجی نہیں ہے۔ یہ جاگیر ان کو دو جو اس کے طلب گار ہیں۔"

پھر آپ نے اپنا قول دہرایا کہ "بادشاہوں اور امیروں کی صحبت فقیروں کے لیے ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔"

نائب سلطنت غیاث الدین بلبن آپ سے اتنا مرعوب و متاثر ہوا کہ کچھ عرصے بعد جب اس نے سلطان ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد سنبھالی تو بابا فرید کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی لیکن شاہِ وقت سے یہ قرابت داری بھی بابا فرید کے شب و روز میں تبدیلی پیدا نہ کر سکی بلکہ اس کی بجائے خود شہزادی نے فقر و فاقہ کی زندگی اپنالی اور ایک درویش کے ساتھ اپنے آپ کو اسی سانچے میں ڈھال لیا۔

بابا فرید کو شیرینی بہت پسند تھی اور شکر آپ کی پسندیدہ تھی۔ اس بارے میں ایک روایت بھی مشہور ہے۔ ایک بار شکر کے بیوپاری

پر شکر کی بوریاں لادے ہوئے آپ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ان سے تھوڑی سی شکر خریدنی چاہی مگر وہ بوریوں میں سے مختصر مقدار میں شکر فروخت کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے بہانہ بناتے ہوئے کہا کہ ان بوریوں میں شکر نہیں نمک ہے۔"

آپ مسکرائے اور فرمایا: "ٹھیک ہے۔ نمک کہتے ہو تو نمک ہی ہوگا۔"

کہتے ہیں کہ یہ بیوپاری جب اپنی منزل پر پہنچے اور بوریوں کو کھول کر دیکھا تو ان میں واقعی شکر کی جگہ نمک بھرا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ کرامت ہو نہ ہو بابا فرید کی ہے چنانچہ پشیمان ہو کر واپس بابا فرید کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی "یا حضرت ہم بہت شرمسار ہیں کہ ہم نے آپ کے سامنے جھوٹ بول دیا تھا۔ ان بوریوں میں واقعی شکر ہی تھی جو اب نمک میں تبدیل ہو چکی ہے۔ از راہ کرم ہمارا قصور معاف فرمائیں اور اس کو دوبارہ شکر میں تبدیل کر دیں تو نوازش ہوگی۔"

بابا فرید نے ان کی غلطی کو درگزر کر دیا اور ان کے لیے دعا فرمائی جس کے نتیجے میں یہ نمک دوبارہ شکر میں تبدیل ہو گیا۔

آپ کو گنج شکر کے الفاظ سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ کو بچپن ہی سے شیرینی سے بہت رغبت تھی۔ جب آپ کی والدہ نماز پڑھنے میں معروف ہوتیں تو اس سے پہلے ہی کسی فرزند کے لیے مصری کی ڈلیاں نکال کر جائے نماز کے نیچے رکھ لیا کرتیں، جہاں سے ننھا فرید الدین مصری نکال کر کھا لیا کرتا۔ کئی بار ایسا ہی ہوا کہ والدہ مصری رکھنا بھول گئیں مگر آپ جب بھی جائے نماز کا کونہ اٹھاتے اس کے نیچے سے مصری کی ڈلیاں دستیاب ہو جاتیں۔ ایک اور روایت بھی مشہور ہے کہ آپ کی زبان سے اگر مٹی بھی چھو جاتی تو شکر بن جاتی کیونکہ آپ کو شکر پسند تھی اور اللہ اپنے محبوب بندے کی خواہش کو ٹالنا نہیں چاہتا تھا اور اسی وجہ سے آپ گنج شکر کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بابا فرید فرمایا کرتے تھے کہ قناعت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں ہے۔ جس شخص کو قناعت کی دولت حاصل ہے اسے پھر کسی اور چیز کی حاجت نہیں ہے۔ قناعت کے بارے میں آپ کا فلسفہ یہ تھا کہ جو چیز انسان کو حاصل ہو اس پر ناز نہ کرے اور جو حاصل نہ ہو اس کا غم نہ کرے۔ یہی قناعت کی تعریف ہے۔

حضرت مالک بن دینار کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ـــــــ اپنی قناعت پسندی پر بہت نازاں تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار وہ کسی درویش کے مہمان ہوئے مگر جب روٹیاں سامنے آئیں تو آپ کو اندازہ ہوا کہ ان میں نمک نہیں ہے۔ مالک بن دینار سے نہ رہا گیا اور بولے: اگر ان روٹیوں میں نمک ہوتا تو کتنی مزیدار ہوتیں۔"

درویش کے گھر میں فقر کے باعث نمک موجود نہ تھا نہ اس کو خریدنے کے لیے پیسے تھے مگر اس کی بیٹی مالک بن دینار کی یہ بات سن کر گھر کا لوٹا اٹھا کر دکان دار کے پاس لے گئی اور لوٹا گروی رکھ کر نمک لے آئی۔ مالک بن دینار نے نمک کو دیکھا تو فرمانے لگے "درویش کو تھوڑے پر ہی قناعت کر لینی چاہیے۔ میرے لیے یہ نمک ہی بہت کافی ہے۔"

درویش کی بیٹی سے خاموش نہ رہا گیا۔ بولی گستاخی معاف اگر آپ میں قناعت ہوتی تو مجھے گھر کا لوٹا دکاندار کے پاس گروی نہ رکھنا پڑتا۔ گزشتہ ستر برس سے ہم لوگ نمک کے بغیر گزارہ کر رہے ہیں اس لیے کہ ہمارے پاس نمک کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ پھر تم کس قناعت پر ناز کرتے ہو؟"

مالک بن دینار نے سنا تو نادم ہوئے اور معذرت طلب کی اور خدا کے حضور میں توبہ کی۔

بابا فرید گنج شکر کے خلفاء میں دو حضرات بہت نمایاں اور آپ کے محبوب تھے۔ ان میں ایک سید علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری تھے جو آپ کے حقیقی بھانجے بھی تھے۔ ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ بھائی کی خلافت ان کے بیٹے صابر کے حصے میں آئے۔ جب بابا فرید نے علی احمد صابر کو قطب کے درجے پر فائز کیا اور انہیں پروانہ دے کر ہانسی کے قطب حضرت جمال الدین کے پاس روانہ کیا تو انہوں نے صابر کلیری کو دیکھ کر زیادہ گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ ادھر رات بھی زیادہ گزر چکی تھی اس لیے فرمایا: "اس وقت چراغ موجود نہیں ہے صبح سویرے پروانے پر مہر ثبت کر دوں گا۔"

صابر کلیری نے چراغ منگوایا اور درخواست کی کہ اسی وقت مہر لگا دیجئے۔ ہوا کی وجہ سے چراغ بجھ گیا تو صابر کلیری نے اپنی انگشت شہادت

پر دم کر کے پھونکا۔ کہتے ہیں کہ انکی انگشت شہادت چراغ کی مانند روشن ہو گئی۔

حضرت جمال الدین ہانسوی کو ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ فرمایا "تم صاحب جلال اور گرم مزاج ہو۔ عالم جلال میں کسی وقت بھی لوگوں کو جلا کر راکھ کر سکتے ہو۔ اس لیے تمہارا پروانہ منظور نہیں کر سکتا۔" یہ کہا اور فرمان قطبیت پھاڑ دیا۔

صابر کلیری کو ناگوار گزرا۔ غصے میں آکر فرمایا "اگر آپ نے فرمان قطبیت چاک کر دیا تو میں نے بھی آپ کے سلسلۂ قطبیت کو چاک کر دیا۔ آپ اپنے خاندان میں آخری قطب ہوں گے۔"

صابر کلیری واپس پاکپتن پہنچے اور بابا فرید کے سامنے ساری روداد بیان کی۔ ساتھ ہی فرمایا کہ جمال ہانسوی نے فرمان قطبیت پھاڑ دیا ہے اب کیا ہو گا؟"

بابا فرید نے فرمایا "احمد علی! جس فرمان کو جمال نے چاک کر دیا ہے فرید میں طاقت نہیں کہ اسے سی سکے۔"

بعد میں حضرت نے قطبیت کا فرمان حضرت نظام الدین اولیاء کے نام جاری کیا اور حضرت جمال ہانسوی نے اس پر اپنی مہر ثبت کرنے میں قطعی تاخیر نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ مہر ثبت کرنے کے بعد آپ نے یہ شعر بھی لکھ دیا۔

کہ گوہر سپردی بہ گوہر شناس　　ہزاروں درود و ہزاروں سپاس

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابا فرید نے جمال ہانسوی کے عمل کی تائید فرمائی اور اپنے بھانجے کو بھی ان کی ناپسندیدگی کے سامنے طرف داری اور حمایت سے نہیں نوازا۔

بابا فرید کے چند اقوال حسب ذیل ہیں:۔

- "غنی وہ ہے جو قانع ہو۔"
- "جو بات کہو سوچ سمجھ کر کہو۔"
- "خود ہی اپنا پردہ کھول دے تاکہ دوسرے تیری پردہ دری نہ کر سکیں۔"
- "عقل مند وہ ہے جو کسی چیز پر غرور نہ کرے۔"
- "ٹھنڈے آدمیوں میں گرم باتیں بیان مت کرو۔"
- "اللہ تعالیٰ سے اپنے معاملات درست رکھو۔ وہ جو کچھ دیتا ہے اسے کوئی واپس نہیں لے سکتا اور جو واپس لیتا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اس کے دربار میں سفارش اور رشوت کی رسائی نہیں ہے۔"
- "دشمن پر کبھی بھروسہ مت کرو۔"
- "جو خود سے ڈرے اس سے ڈرنا چاہیئے۔"
- "نفس شیطانی انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جس کسی نے اس کا کہا مانا سمجھو وہ دین اور دنیا دونوں سے گیا۔"
- "نہ اتنے تلخ ہو کہ لوگ تم سے دور بھاگیں اور نہ اتنے میٹھے بنو کہ لوگ ہضم کر لیں۔ درمیانی راہ سب سے بہتر ہے۔"

بابا فرید گنج شکر نے محرم کی پانچ تاریخ کو پاکپتن میں انتقال فرمایا۔ یہ دوشنبے کا دن تھا اور ہجری کا ۶۵۹ سال۔ آپ کے مبارک کی وجہ سے پاکپتن اب پاکپتن شریف کہلاتا ہے۔ ہر سال آپ کا عرس دھوم دھام سے منایا جاتا ہے جہاں دنیا بھر سے لوگ نذر عقیدت پیش کرنے آتے ہیں۔

برِصغیر کے جلیل القدر بزرگ حضرت بابا فرید گنج بخش شکرؒ اپنے حجرہ مبارک میں فکرمندی سے سر جھکاتے، بیوہ بہن کے آگے سکوت اختیار کیے بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی سر اُٹھا کر پریشانی سے ایک نظر بہن کی طرف بھی ڈال لیتے جو انہیں امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ بیٹا جوان تھا اور ماں کی خواہش تھی کہ بیاہ دے گی تو اپنے عظیم القدر بھائی فریدؒ کی صاحبزادی کے ساتھ۔ بابا فریدؒ بہن کی چاہت سمجھتے تھے جو بھائی کے ساتھ رشتہ مزید مضبوط بنانا چاہتی تھی مگر انہیں بھانجے کی جلالی کیفیت اور گرم مزاجی کا بھی خوب علم تھا۔ بیٹی کو ناز و نعم سے پالا تھا۔ اب اگر انکار کرتے ہیں تو بیوہ بہن کو اس کا احساس ہوتا کہ شاید بھائی یتیم بھانجے کو داماد بنانا نہیں چاہتا۔ یا اپنی بیٹی کو جو شاہِ ہند غیاث الدین بلبن کی نواسی بھی لگتی تھی اسے غریب بیوہ بہن کی بہو بنانا ناقابلِ اعتنا خیال کرتے ہیں۔ بہن جو بھائی کو یوں مسلسل غور و فکر میں مبتلا دیکھ رہی تھی جذباتی سی ہو گئی اور غصے میں کہا "فریدؒ کیا میرا بیٹا علی احمد تمہارا خون نہیں ہے۔ تمہارا بھانجا نہیں لگتا۔ پھر یہ سوچ کیسی؟ یہ فکر و پریشانی کاہے کی؟"

بابا فریدؒ نے نرمی اور آزردگی سے کہا "بہن! تم میرے تامل کو غلط معنی پہنا رہی ہو۔ بخدا میں علی احمد اور اپنی بیٹی میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ لیکن مجھے مستقبل پر بھی نگاہ رکھنا پڑتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری اولاد پر کسی قسم کی تکلیف و غم کا سایہ پڑے۔ تم تو ماں ہو۔ کیا تم بیٹے کی جلالی فطرت سے آگاہ نہیں ہو؟ اگر تم رشتے پر بضد ہی ہو تو ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن آنا جان لو اس شادی کا انجام اچھا نہیں نکلے گا۔ علی احمد کو یہ شادی راس نہیں آسکتی۔ اُس کا جلال تمہاری بہو کو ہلاک کر دے گا۔"

لیکن بہن جو بھائی کی ہاں سے ہی خوشی سے سرشار ہو گئی تھی، بابا فریدؒ کی ان باتوں پر توجہ ہی نہ دی اور بڑی چاہ سے بہو کو بیاہ کر گھر لے آئی لیکن ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ بابا فریدؒ کا کہا حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ شاہِ ہند کی نواسی اور بابا فرید کی بیٹی جب علی احمد سے یکجا ہوتی تو شوہر کی جلالی کیفیت کو چار ماہ بھی سہہ نہ سکی اور خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

جلالی طبیعت کے مالک گرم مزاج یہ علی احمد حضرت علاؤ الدین علی احمد یا صابر کلیریؒ کے نام سے اولیاء میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ میں غصہ کا عنصر اتنا زیادہ تھا کہ لوگ آپ سے دُور دُور رہتے۔

سات سال کی عمر تھی کہ باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ بیوہ جوان ماں نے شوہر کی وفات کے بعد ہرات میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ معاشی حالات بھی ایسے نہ تھے کہ تن تنہا بیٹے کی پرورش کرتیں۔ گھر میں تنگ دستی نے شوہر کی زندگی میں ہی راہ دیکھ لی تھی۔ سو ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھ کر انہوں نے اپنے

عظیم بھائی بابا فریدؒ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ جو ہندوستان کے ایک شہر اجودھن میں قیام پذیر تھے۔ ہرات سے اجودھن (پاکپتن) تک کا فاصلہ خاصا طویل اور دشوار گزار تھا مگر حالات کی مجبوری نے انہیں اس سفر کو طے کرنے کی ہمت دے ہی دی چنانچہ گھر کو تالا لگایا اور بیٹے کو ساتھ لے کر ہندوستان چل کھڑی ہوئیں۔

بھائی نے بہن کا انتہائی پرتپاک استقبال کیا۔ بھانجے کو شفقت سے لے کر گود میں بٹھایا اور چاہت بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔ ماں کی ممتا کو بھی سکون ملا کہ کوئی تو اپنا ہے جو اس کی اولاد کو باپ کا پیار دینے والا ہے۔

بڑے بڑے کان، چوڑی پیشانی، اونچی ناک اور ہم عمر بچوں سے کہیں زیادہ لمبے ہاتھ رکھنے والا یہ معصوم سا بچہ جب بھی بابا فریدؒ کے سامنے آتا وہ اُسے بغور دیکھتے۔ آخر ایک دن اُنہوں نے بھانجے کو قریب بُلایا۔ بہن بھی ساتھ بیٹھی تھی۔ آپ نے بہن سے کہا "ذرا اس کا کُرتا تو اُتارنا" بہن نے بھائی کا عجیب حکم سنا پہلے تو حیرت زدہ ہوئی، پھر آگے بڑھ کر بچے کے جسم سے کپڑا اتارنے لگی۔ آپ نے بچے کو نزدیک کر کے اس کی پُشت کی طرف دیکھ کر کچھ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ بہن حیرت سے کھڑی آپ کو دیکھتی رہی۔ بالآخر بچے کی پشت پر آپ کو بالوں کا ایک بے ترتیب سا گچھا نظر آ گیا۔ جسے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں خوشی کی لہر اُبھری اور چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ انہوں نے بھانجے کو پیار کیا۔ پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے قمیض پہنا کر رخصت کر دیا۔

بچے کے جاتے ہی آپ بہن کی طرف مُڑے اور بولے "یہ نشان جو علی احمد کی پشت پر ہے جانتی ہو کس چیز کا ہے؟"

بہن نے نفی میں سر ہلایا اور بھائی کی طرف دیکھنے لگیں۔

بابا فریدؒ نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا "میرا بھانجا ولی اللہ بنے گا۔ یہ ولیوں کی نشانی ہے۔ بہن تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تمہارا بیٹا خوش قسمت ہے۔"

یہ سُن کر آپ کی بہن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل غم سے بوجھل ہو گیا۔ غمزدہ اور ملول سے لہجے میں بولی "خوش قسمت..... میرا بیٹا خوش قسمت ہے" پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر خوش قسمتی کے معنی یہ ہیں کہ میرا بچہ بچپن میں ہی باپ کے سائے سے محروم ہو جائے۔ اُس کی زبان 'باپ' کہنے کی لذت سے نا آشنا ہو تو واقعی میرا علی احمد خوش قسمت ہے۔"

وقت گزرتا رہا اور علی احمد اپنے ماموں بابا فریدؒ سے روحانی تربیت پاتا رہا۔ مختصر سے عرصہ میں اس بچے نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو اُس کی عمر کے بچے ایک طویل عرصہ کے بعد بھی حاصل نہ کر پاتے۔ حضرت فریدؒ نے بھی بچے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

ایک دن اچانک علی احمد کی ماں کو اپنے گھر، اپنے شہر ہرات کی یاد ستانے لگی۔ جہاں اس کی زندگی کا ایک طویل عرصہ گزرا تھا۔ ہرات۔ جس سے اُس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں، یاد آنے لگا۔ آخر ایک دن انہوں نے بابا فرید سے اس کی اجازت چاہی کہ وہ اپنا گھر جا کر دیکھنا چاہتی ہیں۔ پُرانے ساتھیوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ بابا فریدؒ نے انہیں تو جانے کی اجازت دے دی مگر علی احمد کو ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا اور بہن پر واضح کیا کہ اس سے بچے کی تعلیم و تربیت پر اثر پڑے گا۔ علی احمد اب گیارہ سال کا ایک سمجھدار بچہ تھا۔ ماں نے اُسے اکیلا چھوڑنے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ پھر بھی بھائی سے ممتا بھرے اور درد مندانہ لہجے میں کہا "بھائی! میرے بیٹے نے کمسنی میں ہی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اس ننھی سی جان نے بہت دُکھ جھیلے ہیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آپ کے پاس چھوڑ کر جا تو رہی ہوں۔ لیکن اب آپ ہی اسے میری ممتا اور باپ کا پیار دینے کے پابند ہیں۔ میں اتنا چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا میرے پیچھے کسی قسم کے فکر و غم میں مبتلا نہ رہے اور نہ کبھی بھوکا رہے۔"

حضرت بابا فریدؒ لبوں پہ ہلکا سا تبسم بکھیرے، ماں کی ممتا کی اس بے چینی اور پریشانی کے عالم کو دیکھ رہے تھے۔ پھر مسکرا کر بولے "بہن..... علی احمد میرا بھی خون ہے۔ میں تمہارے درد کو سمجھتا ہوں لیکن تم بے فکر ہو کر ہرات کا سفر کرو۔ تمہارا بیٹا مکمل سکون سے رہے گا۔" یہ کہہ کر آپ نے علی احمد کو بلوایا اور بہن کے سامنے ہی اُسے مرید کیا۔ پھر لنگر خانے کا انتظام بھی بھانجے کے سپرد کر کے بہن سے مخاطب ہوتے "اب تو تم خوش ہو"

ماں مطمئن و شادماں ہو کر ہرات کے لیے رختِ سفر باندھنے لگی۔ اور بیٹا حضرت بابا فرید گنج بخش شکرؒ کے زیرِ سایہ پروان چڑھتا رہا اور تعلیم و روحانی تربیت میں دوسروں بچوں سے یکتا حیثیت حاصل کرتا چلا گیا لیکن جسمانی حالت کا یہ عالم تھا کہ دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔

ایک طویل عرصہ کے بعد ماں جب ہرات سے اجودھن پہنچی تو بیٹے کی حالت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ نوجوان بیٹے کو ضعف اور نقاہت سے لرزاں دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے اسی وقت بیٹے کو ساتھ لے کر بابا فرید کے پاس گئیں۔ رنج و الم اور صدمے و جذبات کی شدت سے زبان سے

الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔ پھر بھی بے ربط جملوں میں حضرت فریدؒ کے سامنے شکوہ کرنے لگیں کہ "بھائی کیا میں اپنے بن باپ کے بیٹے کو اس لیے آپ کے پاس چھوڑ گئی تھی کہ اس کا یہ حال کر دیں۔ میں نے تو چلتے چلتے آپ سے بار بار تاکید کی تھی کہ میرے علی احمد کو بھوکا نہ رکھیے گا۔"

بابا فریدؒ نے شاید بارہ سال بعد بھانجے کو غور سے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ سامنے ہڈیوں کا پنجر کھڑا تھا۔ پھر بہن سے مخاطب ہوتے "بہن.... بخدا ہم نے اسے کھانے سے محروم نہیں رکھا اور تم تو اس بات کی خود گواہ ہو کہ ہم نے تمہارے سامنے ہی اسے لنگر خانے کا انتظام سونپا تھا۔ یہ لنگر خانے کا مالک تھا۔ جسے چاہتا دیتا جسے چاہتا محروم رکھتا جو چاہتا جس مقدار میں کھاتا اسے کسی نے کیا روکنا تھا۔ کون اس کا ہاتھ پکڑنے والا تھا۔"

ماں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ بیٹے نے سر جھکاتے دھیرے سے کہا "ماں، ماموں نے مجھے لنگر خانے کا انتظام سنبھالنے کو کہا تھا یہ تو اجازت نہ دی تھی کہ ہم اُس میں سے کچھ کھا سکتے۔"

بابا فریدؒ نے پیار و شفقت سے بھانجے کو دیکھا اور دریافت کیا "پھر تم اتنے سال کہاں سے کھاتے پیتے رہے ہو؟"

بھانجا بدستور سر جھکائے بولا "نباتات، گھاس، جڑیں وغیرہ۔"

یہ سُن کر بابا فریدؒ پر رقت طاری ہو گئی اور بھانجے کو کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے بولے "علی احمد..... تم نے صبر کی انتہا کر دی۔ تم صابر ہو۔ بخدا تم صابر ہو۔" اس کے بعد سے یہ نوجوان علی احمد صابر کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ظاہری اور باطنی عُلوم کے حصول کے بعد علی احمد دن رات مجاہدے اور ریاضت میں بسر کرنے لگے اور اس میں اتنی شدت پیدا کر لی کہ دُنیا سے ناطہ ہی توڑ لیا۔ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ ہر شے سے بیگانہ ہو کر خالقِ حقیقی کے عشق میں ایسے ڈوبے کہ آس پاس کی ہر چیز حقیر دکھائی دینے لگی۔ لوگوں سے بات چیت ترک کر دی۔ طبیعت میں گرم مزاجی اور جلال کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ زبان میں اتنی تاثیر پیدا ہوئی کہ لفظ مُنہ سے نکلا نہیں اور کام ہو گیا۔ لوگ ان کے جلال سے ڈرنے لگے اور آپ کے قریب آنے سے گھبراہٹ میں مبتلا ہو جاتے۔ آپ کی طبیعت میں یہ گرم مزاجی اور جلد بازی کا عنصر بابا فریدؒ کے علم میں بھی تھا۔ اور وہ آپ کے روحانی کمال اور ارتقاء سے بھی بخوبی واقف تھے۔

ایک دن حضرت بابا فرید گنج بخشؒ نے اولیائے کرام اور دُوسرے ہم عصر بزرگانِ دین کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے علی احمد صابرؒ کو بُلا کر آپ کے سر پر کلاہ رکھی اور دلی کی ولایت عنایت کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ یہ پروانہ تقرری تبھی قابلِ قبول ہو گا جب اس پر شیخ جمال ہانسویؒ کی مہر ثبت ہو گی۔

چنانچہ اگلے دِن حضرت صابرؒ ہانسی کے لیے روانہ ہوتے اور شیخ جمالؒ کی خانقاہ میں اس شان سے داخل ہوتے کہ ڈولے میں بیٹھے جاتے ہیں اور جب حضرت شیخ آپ کو دیکھ کر استقبال کے لیے ڈولے کے نزدیک آئے تو حضرت صابرؒ نے اُن کی پرواہ نہ کرتے ہوتے ڈولے کو آگے بڑھنے دیا اور پختہ فرش پر جا اُترے۔ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو بُرا محسوس تو ہوا مگر ضبط کر گئے۔ سو دوبارہ پلٹے اور حضرت صابرؒ کے پاس جا کر اُن سے مصافحہ کیا۔ اور انہیں عزت و احترام سے ایک جگہ بٹھایا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ دونوں بزرگانِ دین نے اکٹھے نماز ادا کی۔ اور پھر خانقاہ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ حضرت صابرؒ نے بابا فریدؒ کا فرمان کھول کر حضرت جمال ہانسویؒ کے سامنے پھیلایا اور عرض کی "حضرت اس پر مہر ثبت کر دیں" جمال ہانسویؒ نے اندھیرے میں فرمانِ قطبیت کو دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ صاف نظر نہ آیا۔ خانقاہ میں ابھی چراغ نہیں جلا تھا اور ہر سُو اندھیرے کا عالم تھا۔ چنانچہ آپ نے اندھیرے کا عذر کرتے ہوتے کہا "حضرت صابرؒ..... تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ آپ صبح تک انتظار کریں۔ صبح سویرے میں اس پر مہر ثبت کر دوں گا۔"

حضرت صابرؒ نے جواب دیا "تامل نہ کیجیے۔ آپ چراغ منگوا کر مہر ثبت کر دیں۔"

حضرت جمالؒ نے بے دلی سے ایک مرید کو آواز دی اور چراغ لانے کو کہا۔ مُرید کچھ دیر بعد چراغ لا کر آپ کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اُس کے جاتے ہی چراغ گُل ہو گیا۔

جمال الدین بے دلی سے بولے "علی احمد..... صبر کرو..... صبح فجر کی نماز پڑھتے ہی مَیں مہر لگا دوں گا۔"

لیکن علی احمد تو اس وقت بہت جلدی میں تھے۔ صبح تک کا انتظار نہ کر سکتے تھے۔ سو انگلی پر کچھ پڑھ کر پھونکا تو انگلی سے روشنی پھوٹنے لگی اور

اردگرد کا ماحول منوّر ہوگیا۔ حضرت علی احمدؒ نے جمال ہانسویؒ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا" حضرت اب تو آپ کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ روشنی کا بندوبست بھی کر دیا ہے میں نے۔ بس اب آپ مہر ثبت کر کے اپنا کام پورا کریں۔"

یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت جمال الدین ہانسویؒ بھی غصے میں آگئے اور سخت طیش کی حالت میں بابا فریدؒ کے فرمان کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر ڈالا اور پھونک مار کر ہوا میں اڑا دیا۔ حضرت علی احمد نے یہ سب حیرت سے دیکھا۔ اچانک جمال ہانسویؒ آپ کی طرف مڑے اور غصے میں کہا" یہ گرم مزاجی ؟ یہ جلد بازی ؟ بخدا تم تو دہلی والوں کے لیے عذاب سے کم ثابت نہ ہو گے۔ بھلا دہلی والے اس گرم مزاجی کے کہاں عادی ہیں۔"

حضرت علی احمد نے جو یوں فرمانِ فریدؒ کو پھٹتے دیکھا تو غصے میں آگ بگولہ ہو گئے اور زور زور سے پاؤں ٹپکتے ہوئے فرمایا" آپ نے ماموں فریدؒ کا فرمان چاک کیا تو ہم نے تمہارا سلسلۂ قطبیت چاک کر دیا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت احمد علیؒ کا کہا حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ آپ کے ارشادِ جلالی کے بعد جمال ہانسوی کے بڑے صاحبزادے کا انتقال ہوگیا اور چھوٹے صاحبزادے باوجود اعلیٰ تعلیم و روحانی تربیت کے، خلافت سے محروم رہے۔

سہارنپور میں رڑکی کے قریب ایک قصبہ کلیر نام کا تھا۔ اپنے وقت میں اس کا شمار بڑے بڑے شہروں میں کیا جاتا تھا۔ حضرت جمال ہانسویؒ کی وفات کے بعد حضرت فرید گنج بخش شکرؒ نے آپ کو دوبارہ ایک فرمانِ ولایت حاصل کیا۔ اس مرتبہ یہ دہلی کی بجائے کلیر کا دیا گیا۔

جمعہ کا دن تھا۔ کلیر کی جامع مسجد نمازیوں سے آہستہ آہستہ بھرنا شروع ہو گئی۔ حضرت صابرؒ اپنے ساتھی جمال روغن اور بہاالدین کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرنے کلیر کی جامع مسجد پہنچے اور خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ کلیر کی جامع مسجد میں یہ رواج تھا کہ ہر نمازی کی جگہ اُس کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ جب بھی مسجد میں داخل ہوتا اُسے اپنی جگہ خالی ملتی۔ حضرت صابرؒ اور اُن کے ساتھیوں کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ سو وہ تینوں جس جگہ کو خالی سمجھ کر بیٹھتے تھے ان کے مالک آتے تو مجبوراً اُٹھ کر انہیں ایک دوسری خالی جگہ جا کر بیٹھنا پڑتا۔ تھوڑی دیر بعد اُس جگہ کے وارث پہنچے تو پھر اُن اصحاب کو اُٹھنا پڑا۔ حضرت صابر اس صورتِ حال سے بہت دل برداشتہ ہوتے مگر ضبط کرتے رہے۔ آپ کے ساتھی جو آپ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے وہ بار بار گھبرا کر آپ کے چہرے پر نظر ڈالتے اور بے چینی کے آثار پا کر خود بھی پریشان ہو جاتے۔ آخر بہاالدین برداشت نہ کر سکے اور کھڑے ہو کر مجمع کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے اور پھر انہیں حضرت صابرؒ کے مرتبے سے آگاہ کیا۔ مگر وہ لوگ بھی شاید شرپسند مزاج کے تھے۔ انہوں نے اس کا نوٹس ہی نہ لیا کہ وہ دونوں کیا کہہ رہے ہیں اور حضرت صابرؒ کون ہیں۔ کس نے اُنہیں اس شہر کی ولایت دی۔ اسی جمعہ کے اجتماع میں کلیر شہر کا امیر قیام الدین بھی شامل تھا۔ وہ ایک گستاخ اور انتہائی تنک مزاج طبیعت کا مالک تھا۔ اُس نے جب جمال روغن اور بہاالدین کو یوں چلا چلا کر لوگوں کو حضرت احمد علی صابرؒ کے رتبے سے آگاہ کرتا پایا تو وہ اپنی فطرت کے مطابق گستاخانہ انداز میں قدم اٹھاتا آپ کے نزدیک آن کھڑا ہوا اور بولا" حضرت اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آپ ولی ہیں ؟"

حضرت صابرؒ نے نرمی سے اُسے سمجھایا کہ" دیکھو مجھے حضرت فریدؒ نے اس شہر کی ولایت عنایت کی ہے اور یہ اُن کا فرمانِ قطبیت بھی میرے ہمراہ ہے۔" یہ کہہ کر آپ نے بابا فریدؒ کا فرمان کھول کر امیرِ شہر کے آگے رکھا۔ اُس نے ایک شانِ بے نیازی سے اُس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور بولا" نہیں تو آپ اپنے عمل سے دکھائیں کہ آپ واقعی ولی ہیں یا کوئی شعبدہ باز۔ جب تک آپ ہمیں کوئی کرامت نہ دکھائیں گے ہم یقین کرنے والوں میں سے نہیں۔"

حضرت علی احمد نے بڑی مشکل سے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا" پوچھو..... کیا پوچھنا چاہتے ہو، کونسی کرامت دیکھنا چاہتے ہو تم لوگ۔"

امیرِ شہر ڈھٹائی سے بولا" حضرت چند ماہ پہلے میری بکری کھو گئی تھی۔ وہ دن جاتے اور آج کا دن آتے میری بکری کا علم تک کسی کو نہیں۔ اگر آپ میری بکری کی بابت کچھ سُراغ لگا سکیں تو ہم آپ کو ولی مان لیں گے۔"

حضرت صابرؒ کچھ دیر امیرِ شہر کو کھڑے گھورتے رہے۔ پھر اُس سے دریافت کیا۔

"تمہاری بکری کا نام کیا تھا؟" "حرمنہ" امیرِ شہر نے جواب دیا۔

نام معلوم کر لینے کے بعد آپ نے بلند آواز سے کہا" حرمنہ کے کھانے والو..... تم لوگ جہاں بھی ہو اسی وقت جامع مسجد میں حاضر ہو جاؤ۔"

ابھی آپ کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ لوگوں کی ایک مختصر سی جماعت جو تقریباً ۲۵، ۲۶ افراد پر مشتمل تھی دوڑتی ہوئی جامع مسجد میں داخل ہوئی نے انہیں حیرت و دلچسپی سے دیکھا خود اُن افراد کے چہروں پر بھی حیرانگی اور پریشانی کے سائے چھائے ہوتے تھے۔ آپ نے انہیں دیکھتے ہوئے سخت لہجے

پوچھا "کیوں... تمہی نے امیر شہر کی بکری چرا کر کھائی ہے۔" یہ سن کر اُن لوگوں نے جھٹ انکار میں سر ہلایا۔ آپ نے غصے میں فرمایا "اگر تم نے سچ سچ نہ بتایا تو تمہارے جھوٹ کا پردہ چاک کرنے کیلئے میرے پاس اور بھی ذرائع ہیں۔

یہ سن کر اُن میں سے کچھ لوگ بگڑ کر آپ سے مخاطب ہوئے کہ "حضرت جب آپ ہم سے درست بات نہیں اگلوا سکے تو اب دھمکیوں کے ذریعے کیوں ہم سے اپنے مطلب کی بات کہلوانا چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر آپ نے غصے میں پکارا "حرمنہ..... حرمنہ تم کہاں ہو؟ جو کچھ تمہارے ساتھ شہر کے ان دروغ گو شیطانوں نے کیا وہ تم بلند آواز سے یہاں دہراؤ۔" اور پھر جواب میں باری باری سبھی بولتے چلے گئے کہ کس نے حرمنہ کا کتنا گوشت کھایا اور ہڈیاں کہاں دفنائی تھیں۔

لوگ حیرت سے کھڑے یہ سب ماجرا دیکھ رہے تھے۔ حاکم شہر بھی اب کسی حد تک آپ سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ اچانک قاضی شہر مجمع کو چیرتا حاکم شہر کے پاس آن کھڑا ہوا اور اُسے کہنے لگا "حضور آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئے ہیں۔ کیا آپ ساحری اور کرامت میں تمیز نہیں کر سکتے؟ یہ شخص ولی نہیں جادوگر ہے۔ آپ ایمان کی سلامتی چاہتے ہیں تو اس کی ساحرانہ باتوں سے بچیں۔" قاضی شہر کے یہ جملے سن کر شہر کے حاکم کے دل میں بھی اب وسوسے پیدا ہونا شروع ہوتے۔ چنانچہ وہ آپ سے کوئی بات کئے بنا وہاں سے کھسک گیا۔

حضرت صابرؒ شہر والوں کے اس رویے سے سخت دل برداشتہ ہو گئے۔ اور تمام حالات لکھ کر بابا فریدؒ کو روانہ کر دیئے۔ بابا فریدؒ نے جواباً قاضی شہر اور حاکم شہر کو خطوط لکھے مگر انہوں نے ہر مرتبہ بابا فریدؒ کا نامہ چاک کر کے اُس کا مذاق اُڑایا۔

اب بابا فریدؒ نے بھی اس کو سنجیدگی سے لیا اور کلیر والوں کی روش سے تنگ آ کر بھانجے کو لکھ بھیجا "علی احمد صابر..... برضائے خُدا کلیر بکری تمہاری ولایت میں ہے۔ چاہو تو اس کا گوشت کھاؤ پسند کرو تو دُودھ پیتے رہو۔"

ماموں کا یہ خط پا کر حضرت احمد علی صابرؒ بہت خوش ہوتے اور فرمان پر عمل درآمد کرنے کی ٹھانی۔

اتفاق سے جُمعہ نزدیک تھا۔ آپ نے جُمعہ کے دن کا انتظار کیا اور نمازِ جمعہ کے وقت مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس مرتبہ کلیر کے لوگوں نے آپ سے پھر وہی برتاؤ کیا۔ ابھی آپ مسجد میں بیٹھنے بھی نہ پاتے تھے کہ اُٹھا دیئے گئے اور یہ عمل اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ آپ مسجد سے باہر نہ نکل گئے۔

مسجد میں لوگ سنتیں پڑھنے میں مشغول تھے۔ پھر امام نے خطبہ دیا اور خطبے کے بعد آپ نے جلال میں جوش بھرے انداز میں مسجد سے کہا۔

"مسجد! آج تک تو لوگ یہاں نماز پڑھنے آتے رہے ہیں۔ لیکن تم نے ایک مرتبہ بھی نماز ادا نہیں کی۔ آج تو بھی نماز پڑھ اور سجدہ کر۔"

یہ حکم ملنا تھا کہ مسجد کے در و دیوار ہلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے مسجد زمین بوس ہو کر تمام نمازیوں کو اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔ کلیر والوں نے آپ کو جو دُکھ پہنچائے تھے اور بابا فریدؒ کے فرمانوں کے ساتھ جو گستاخانہ رویہ اختیار کیے رکھا تھا اُس کی سزا انہیں یہ ملی کہ شہر میں زبردست طاعون پھیلا اور دنوں میں کلیر تباہی و بربادی کا ایک بھیانک نقشہ پیش کرنے لگا۔

کلیر کی تباہی کے بعد آپ بہت بے چین رہنے لگے۔ کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور ایک ویرانے میں جا کر گولر کے درخت کے نیچے اپنا مسکن بنا کر وہیں عبادت و ریاضت شروع کر دی۔ مگر اب بھی آپ کی گرم مزاجی اور جلالی طبیعت میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی تھی۔ لوگ آپ کے پاس جاتے ڈرتے تھے اور گھبرا کر دُور دُور ہی رہتے۔

ایک دن حضرت صابر حسب معمول درخت کے نیچے بیٹھے عبادت میں مشغول تھے کہ اُن کے کانوں میں کسی کے خوش الحانی سے تلاوت کرنے کی آواز پہنچی۔ ایک طویل عرصہ کے بعد آپ نے کوئی انسانی آواز سُنی تھی۔ سو جستجو کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ بالآخر ایک درخت کے نیچے آپ کو بابا فریدؒ کا مرید شمس الدین بیٹھا تلاوت کرتا نظر آیا۔ آپ بھی اُس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ اور وجد میں آ گئے۔ جب شمس الدین نے تلاوت ختم کر کے سر اٹھایا تو اپنے سامنے حضرت صابرؒ کو موجود پا کر گھبرا گیا لیکن آپ نے نرمی سے فرمایا "شمس..... گھبراتا کیوں ہے رے۔ ہم تجھ سے بہت خوش ہیں۔"

شمس الدین یہ سن کر مطمئن ہو گیا اور آپ کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ ایک دن آپ نے اُسے پانی لانے کے لیے بھیجا تو شمس الدین بڑی دیر سے پانی لایا۔ آپ غصہ ضبط نہ کر سکے اور ناراضگی سے بولے "ایک پیالہ پانی لانے میں اتنی تاخیر؟ شمس کیا تجھے دکھائی نہیں دیتا۔ اندھا ہو گیا ہے پانی نظر نہیں آیا تھا کیا؟

شمس الدین سے جونہی پیالہ لے کر آپ بیٹھے، شمس درد و غم سے چلا پڑا "حضور... میں تو اندھا ہو گیا" یہ دیکھ کر حضرت صابرؒ کو بھی افسوس ہوا اور سجدے میں گر کر پروردگار سے عرض کی۔

"اے واحد رب العالمین..... شمس تو تیرے اس گناہ گار بندے کا دوست ہے۔ اس اُجاڑے میں واحد ساتھی۔ تو اس کے حال پر رحم فرما" دعا ختم ہوئی اور شمس الدین اللہ کی مہربانی سے دوبارہ بینا ہو گیا۔

حضرت علاؤالدین علی احمد صابر پیا" کا ۱۳ ربیع الاول ۶۹۰ھ میں وصال ہوا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظم عبدالقادر جیلانیؒ سے تعلق رکھتا تھا۔

کہتے ہیں آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے جلال و غصہ کا یہ عالم تھا کہ لوگ آپ کے مزار پر بھی جانے گھبراتے تھے۔ اگر کوئی شامت کا مارا وہاں بھولے سے چلا بھی جاتا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا یا پھر اور کوئی بڑا نقصان کروا لیتا۔

آخر ایک مرتبہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی حضرت صابرؒ کے مزار پر گئے اور فرمایا "حضرت اب تو جلال میں کمی فرمائیں۔ لوگوں نے آپ کے اس جلال کی وجہ سے ہی زندگی میں آپ سے دوری رکھی۔ اب وصال کے بعد بھی آتے گھبراتے ہیں۔ اب تو بندگانِ خدا پر رحم فرما کر انہیں جمال سے نوازیں۔"

چنانچہ رات کو خواب میں حضرت گنگوہیؒ نے دیکھا کہ حضرت صابرؒ بنفسِ نفیس موجود تھے اور فرما رہے تھے عبدالقدوس ہم نے تیری درخواست پر اپنے جلال میں کمی کر دی ہے۔ لوگ اب ہمارے مزار پر حاضری دینے شوق سے آئیں۔

اسوۂ ابراہیمؑ کی قندیل

اسوۂ ابراہیم علیہ السلام ہمیں۔ سکھاتا ہے کہ وقت کے نمرودوں سے کس طرح ٹکر لی جاتی ہے اور ان کے قدموں تلے پامال ہونے والی انسانیت کو نجات دلانے کے لیے کس طرح اپنی زندگی خطرے میں ڈالنی پڑتی ہے۔

یہ اسوہ بتاتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی خاطر گھر بار، عزیز و اقارب اور دوست ساتھی چھوڑنے پڑیں تو کس حوصلے کے ساتھ چھوڑنے چاہییں۔ یہ اسوہ سبق دیتا ہے کہ بندۂ مومن کس طرح اپنے خالق و مالک کی رضا اور حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ یہ اسوہ بتاتا ہے کہ دعوتِ حق کو سربلند کرنے کے لیے کتنی محنت، عرق ریزی اور تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کہ اس راہ میں کتنے صبر آزما اور کٹھن مراحل پیش آتے ہیں اور ان مراحل سے گزرنے کے لیے کیسے مضبوط یقین و ایمان اور بلند حوصلے کی ضرورت ہے۔ پھر اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مومن کا اپنے اللہ سے عشق و محبت اور اس کی وفاداری اور اطاعت کا معیار کیا ہے اور وہ اس معیار پر کس طرح پورا اتر سکتا ہے۔

یہ ہیں نور کی وہ کرنیں جو اہلِ ایمان روشنی کے اس مینار سے حاصل کر کے اپنی زندگی کو جذب و سوز بخش سکتے ہیں اور عصر نو کے شب و روز پلٹ سکتے ہیں اور یہ جو ہر سال عیدِ قرباں منائی جاتی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ ملتِ ابراہیمؑ کے دل میں اسوۂ ابراہیمؑ کی قندیل روشن و تابندہ رہے۔

(آباد شاہ پوری)

حُلیہ سے وہ نوجوان دیوانہ سا دکھائی دیتا تھا۔ بکھرے بال گرد و غبار سے اٹا وحشت زدہ سا چہرہ لیے دیوانہ وار مستانہ نعرے بلند کرتا چلا جا رہا تھا۔ جسم پر پہنا ہوا خرقہ یوں جھول رہا تھا جیسے کسی مداری نے اوٹ پٹانگ سا لباس پہن رکھا ہو۔ یہی راہ چلتے لوگ حیرت سے اُسے دیکھتے پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتے۔ انہی راہ گیروں میں اُس نوجوان کا ایک پرانا استاد شیخ فتح اللہ بھی تھے۔ انہوں نے جب اپنے لائق اور ہونہار شاگرد کو اس حال میں دیکھا تو حیرت میں پڑ گئے کہ آیا یہ واقعی انہی کا شاگرد ہے۔ وہ ذہین شاگرد جس کی ذہانت اور علم دوستی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جو اپنی ابتدائی عمر میں ہی قابلِ تعریف کُتب کا مصنف بن چکا تھا۔ جس کی صرف کے موضوع پر لکھی کتابوں کو وقت کے کاملِ فن اساتذہ نے یہ کہہ کر سراہا تھا کہ "علم میں یہی ایک کتاب کافی ہے" چنانچہ اُس نوجوان کو اس دیوانگی کے عالم میں دیکھ کر استاد جتنی بھی حیرت محسوس کرتا کم تھی۔ اگلے لمحے بڑھ کر انہوں نے اپنے شاگرد کو جا پکڑا اور حیرت و درشتی سے کہا "یہ کیا مداریوں کی سی حالت بنا رکھی ہے؟" نوجوان نے جو اُستاد کو دیکھا تو آنکھوں میں لمحہ بھر کو آشنائی کی چمک پیدا ہوئی جو اگلے ہی لمحے ماند پڑ گئی پھر بے رُخی سے جواب دیا "میں مداریوں میں سے نہیں ہوں۔" استاد نے اس کا نوٹس لیے بغیر تاسف بھرے انداز میں کہا۔ "افسوس! ہم تو تمہاری قابلیت اور طباعی کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے اور تم ہو کہ ہمیں جھٹلانے کے درپے ہو۔ دیوانوں کا بھیس بدلے ہمیں جھوٹا ثابت کرتے پھر رہے ہو۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہو۔ یا یونہی دیوانگی میں دن گزار رہے ہو؟" نوجوان شاگرد نے لہرا کر جواب دیا "پڑھ رہا ہوں.... پڑھ رہا ہوں... میں حیرانی کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر دیوانہ وار ایک طرف کو دوڑ لگا دی اور چند لمحوں بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا اور شیخ فتح اللہ اپنے شاگرد کی حالت پر دُکھ کا اظہار کرتے آگے بڑھ گئے۔

یہ نوجوان جس کی اس کے استاد بے پناہ عزت کرتے اور اس کی قابلیت کی مثالیں پیش کرتے تھے۔ تاریخ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے نام سے مشہور ہوا۔ ۸۶۰ ہجری میں ردولی کے ایک مشہور عالم شیخ اسماعیل کے ہاں پیدا ہوتے۔ باپ نے بیٹے میں چھپی فطری و پیدائشی خوبیاں پہچان لیں۔ سو دُوسری اولاد سے بڑھ کر چاہا اور تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا۔ اور بیٹے نے بھی ثابت کر دیا کہ باپ کی نظر نے دھوکہ نہیں کھایا تھا۔ باپ کی اس توجہ کو عبدالقدوس نے رآئیگاں نہ جانے دیا اور ہونہار اولاد کی طرح باپ کے اندازوں اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر طالب علمی کے زمانہ میں ہر لمحہ مطالعہ میں صرف کیا کتابوں سے عشق پیدا کیا۔ رات کو عبادت کی خاطر جاگتے۔ دن بھر علوم ظاہری حاصل کرتے اور رات کو اپنے خالق حقیقی وحدہٗ لاشریک کے آگے سجدے میں گرے اُس کی ثنا پڑھتے۔ علم و ادب کے دائرے میں پروان چڑھتے، پھلتے پھُولتے رہے۔ شیخ اسماعیل نے بھی بیٹے کی اس عبادت اور علمی جذبہ

کو مسرت و رشک سے دیکھا۔ بیٹے کو دیکھتے تو آنکھیں منور ہو جاتیں۔

یہ سلسلہ تشفی بخش طور پر جاری تھا کہ ایک دن اچانک عبدالقدوس ؒ کے سینے میں نجانے کیسی آگ بھڑکی کہ جذب کی غیر معمولی کیفیت طاری ہو گئی۔ وجد کے عالم میں کپڑے پھاڑے اور دیوانہ وار نعرے بلند کرتے باہر نکل آتے۔

ماں کو جب بیٹے کی حالت کا علم ہوا تو صدمے سے نڈھال ہو گئیں۔ شوہر فوت ہو چکا تھا اور بیٹے نے دیوانہ بن کر بیوگی کا صدمہ پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ وہ روتی ہوئی اپنے بھائی قاضی دانیال کے پاس گئیں اور بیٹے کی حالت کا ذکر رو رو کر بیان کیا۔ قاضی دانیال بھی بھانجے کا حال سن کر آبدیدہ ہو گئے۔ شہر کے حاکم تھے۔ فوراً کارندوں کو بھیج کر بھانجے کو بلایا۔ قریب بٹھا کر نرمی سے پوچھا "قدوس یہ کیا حالت بنا رکھی ہے رے۔ ماں کو کیوں تنگ کرتا ہے اور یہ تعلیم کیوں چھوڑ دی۔ یاد رکھو اگر یہی حال بناتے رکھا تو ہم تجھے سخت سزا دیں گے۔"

قدوس ؒ نے یہ سن کر چلا چلا کر کہنا شروع کر دیا "ہم سزا لیں گے، ہمیں سزا دو سخت سزا دو۔" اس اثنا میں کہیں سے گیت کی آواز آئی۔ گانے کا عبدالقدوس ؒ کے کانوں میں پڑنا تھا کہ وجد میں آ گئے۔ حالت غیر ہو گئی۔ ماموں نے جو بھانجے کا یہ حال دیکھا تو دکھ سے بہن سے کہا "بہن! پریشان نہ ہو۔ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دو۔ آبادیاں اس کے لیے زنجیر بن گئی ہیں۔ یہ قیس بن چکا ہے۔ صحرا ہی اس کے مرض کا واحد علاج ہے۔ کچھ نہ کہو اسے۔"

عبدالقدوس ؒ کو اب بالکل کھلی چھٹی مل چکی تھی۔ سارا وقت مجذوبوں اور قلندروں کی صحبت میں رہتے۔ مگر کسی پل قرار نہ تھا۔ سینے میں آگ بھڑکی تو بجھنے کا کسی طور نام نہ لے رہی تھی۔ ہر پل بے چین ہر لحظہ بے قرار عشق دیوانہ وار سفر کرتا رہا۔ بے خود سے ہو کر کبھی کہاں نکل جاتے کبھی کدھر کا رخ کرتے۔ ایک دن اسی بے خودی و بے قراری میں دیوانہ وار کہیں بھاگے جا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کی راہ روک لی اور پوچھا "شیخ۔۔۔ یہ راستہ تو رودلی سے باہر کی طرف جاتا ہے۔ کدھر کا ارادہ ہے؟"

قدوس ؒ نے جوش میں اسے سامنے سے ہٹا کر کہا "ہٹ جا ہمارے راستے سے...... ہم خدا کے شہر جا رہے ہیں....." "اچھا!" وہ شخص آپ کی بات سن کر مسکرا پڑا اور کہا "شیخ خدا کے شہر جانا ہے تو شیخ احمد عبدالحق کی درگاہ میں جا۔"

شیخ عبدالحق چشتی سلسلے کے مشہور بزرگ تھے۔ ان کی درگاہ رودلی میں ہی تھی۔ جہاں ان دنوں ان کا پوتا شیخ محمد سجادہ نشین تھا۔

راہ گیر کی بات نے عبدالقدوس ؒ پر اس قدر اثر کیا کہ یک بیک دوبارہ رودلی کی طرف پلٹے اور دیوانہ وار درگاہ کی طرف دوڑنے لگے اور درگاہ کے در پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ شیخ عبدالحق کی خانقاہ میں داخل ہوتے ہی ان کی حالت میں تغیر سا رونما ہوا۔ طبیعت میں رچی بے قراری کسی حد تک زائل ہونے لگی۔ چنانچہ اب آپ کا بیشتر وقت درگاہ میں ہی گزرنے لگا۔ شیخ عبدالحق کی روح سے فیوض حاصل کرنے لگے جس نے آپ کے وجود میں پھیلی بے چینی و بے قراری ختم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ چنانچہ اب زیادہ تر درگاہ میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے۔ کبھی دل کی تپش بڑھنے لگتی تو ویرانوں میں نکل جاتے۔ آبادیوں سے دور سنسان وادیوں میں جاتے اور عبادت کرتے۔ مختلف بزرگان دین کے مقبروں پر حاضری دیتے اور جب بے خودی طاری ہوتی اور تہجد کا وقت قریب آ جاتا تو شیخ عبدالحق "حق ہو..... حق حق حق" کی صدا بلند کرتے تو غفلت سے بیدار ہوتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

شیخ عبدالحق کی درگاہ کے سجادہ نشین شیخ محمد نوجوان تھے اور قدوس ؒ کے ہم عمر بھی۔ سو شیخ عبدالقدوس ؒ کو آپ سے محبت تو تھی لیکن وہ عقیدت نہ تھی جو کسی مرید کو مرشد سے ہوتی ہے۔ کیونکہ شیخ قدوس فیض یاب تو براہ راست شیخ عبدالحق سے ہی ہو رہے تھے۔ اس لیے اب بیعت کے معاملے میں تامل سے کام لے رہے تھے۔ وہ شیخ محمد کے ہاتھوں جب بھی بیعت کا سوچتے دل مطمئن نہ ہوتا۔ پھر مصیبت یہ تھی کہ جب بھی دل میں کسی اور کے ہاتھ بیعت کرنے کا خیال جڑ پکڑتا اور وہ درگاہ سے نکلنے لگتے تو شیخ عبدالحق راہ روک کر پوچھتے "قدوس..... تو کدھر چلا..... تو ہمارا ہے..... ہمیں چھوڑ کر کہاں جاتا ہے۔"

جب بار بار یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ایک دن حضرت قدوس جھنجلا کر تڑپ کر بولے "حضرت اگر میں کسی اور کے ہاتھوں بیعت کروں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مجھے آپ سے چھین لے گا۔ میں آپ کا ہوں آپ کا رہوں گا۔"

"آپ کی بات سُن کر شیخ عبدالحق نے جواب دیا" قدوس ..... دُوسروں سے بیعت لے گا۔ کیا ہم مردہ ہیں؟" یہ کہتے ہی انہوں نے خود کو قدوس کے سامنے ظاہر کر دیا۔ حضرت قدوس یہ دیکھ کر لرز گئے۔ لیکن شیخ عبدالحق اُن کی حالت سے بے نیاز اُن کا ہاتھ تھام کر اپنے پوتے شیخ محمد کے پاس لے گئے اور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب کی مرتبہ آپ نے بھی عاجزانہ انداز میں شیخ محمد کا ہاتھ تھام کر اُسے بوسہ دیا اور انکساری کے انداز میں کہا" شیخ! مجھے تھام لیجیے۔"

حضرت شیخ محمد نے مُرشد ہونے کے باوجود آپ سے مریدوں والا برتاؤ نہ کیا۔ بلکہ عزت و احترام سے پیش آتے اور ہم رُتبہ رفیق کی طرح آپ کے ساتھ مل کر عبادت و ریاضت کرتے۔ شیخ قدوس نے بھی اپنے مریدی کے اس ابتدائی دور میں سخت مجاہدے کیے۔ نفس کو مارا، پیٹ کی طلب کو ٹھکرا، شیخ عبدالحق کے مزار پر خود جھاڑو دیتے۔ پانی بھر کر لاتے اور جھاڑ پونچ کرتے۔ قلبی حدت کو دُور کرنے کے لیے راتوں کو ریاضتوں میں بسر کرتے اور دن رات عبادت میں مشغول رہتے۔

ایک دن، جب حضرت عبدالقدوسؒ اور حضرت شیخ محمدؒ درگاہ میں بیٹھے وظائف میں مصروف تھے۔ درگاہ زائرین سے بھری تھی۔ ہر سُو مقدس سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا اور وظائف کا غلغلہ ہر آواز پر حاوی تھا۔

ناگاہ شیخ عبدالحقؒ کا روضہ شق ہوا اور آپ ظاہری حالت میں مزار سے باہر نکلے۔ لوگ اس منظر کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ شیخ قدوسؒ اور شیخ محمدؒ تعظیم سے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عبدالحقؒ آگے بڑھ کر قدوسؒ کے پاس آن کھڑے ہوتے اور یہ شعر پڑھا۔

مرا زندہ پندار چوں خویشتن   من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

یہ سُن کر شیخ عبدالقدوسؒ کی حالت غیر ہو گئی اور لرزہ اندام ہو کے آپ کے قدموں میں گر گئے۔ شیخ عبدالحق نے نرمی اور شفقت سے آپ کو اُٹھایا اور کہا" قدوس..... آج سے ہم نے تجھے اللہ تک پہنچا یا۔"

اس واقعہ کے بعد نہ صرف [illegible] بلکہ [illegible] تمام [illegible] حضرت شیخ عبدالقدوس کا شہرہ عام ہو گیا۔ لوگ حیرت اور تجسس کے مارے آپ کو دیکھنے آتے۔ لوگوں میں [illegible] عبدالحق کے مزار پر ایک درویش رہتا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک گدڑی لٹکی رہتی ہے جو پیوندوں سے بنائی گئی ہے۔ وہ درویش پیوند [illegible] ڈھونڈتا ہے۔ دھجیاں اکٹھی کر کے انہیں پاک کرتا ہے اور پھر انہی دھجیوں کو ٹوپی اور گدڑی میں ٹانک دیتا ہے۔

شیخ عبدالقدوس خدا کی عبادت [illegible] مُسلسل مصروف رہتے۔ لیکن اس کے باوجود وقت نکال کر عبادت کے ساتھ ساتھ اساتذہ و شیوخ کی خدمت بھی نہایت عقیدت و احترام سے کرتے۔ دن [illegible] اکثر وقت پانی لانے، لکڑیاں کاٹنے، جھاڑو دینے اور کپڑے دھونے میں گزر جاتا۔ چناتی کے لیے گارا بنانے تو اس حد تک اپنے کام میں محو ہو جاتے کہ کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ ایسے میں اساتذہ اپنے اس سعادت مند شاگرد کو خود اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا دیتے۔

حضرت شیخ محمدؒ کی بڑی بہن ایک عابدہ اور صالح خاتون تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی سے ایک ایسے شخص سے بیاہی گئی جو ہرگز آپ کے قابل نہ تھا۔ جتنی آپ نیک، پاکباز اور عبادت گزار تھیں اتنا ہی وہ شخص کینہ خصلت اور بداعمال تھا۔ چنانچہ اُن کی زندگی جہنم کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ حضرت شیخ محمدؒ اور اُن کی والدہ اُم کلثوم بیٹی کی حالت دیکھتیں اور اُس کی ازدواجی زندگی کی اس ناموافقت پر دُکھ سے کُڑھتی رہتیں۔ اس تلخ تجربے کے بعد وہ عہد کر چکی تھیں کہ چھوٹی بیٹی کو بیاہیں گی تو کسی نیک اعمال شخص کے ساتھ اور وہ بھی اُس شخص کے ساتھ جس کے متعلق شیخ عبدالحق کی تائید ہو۔"

انہی دنوں اُن کے گھر کی ایک کنیز جب حضرت عبدالقدوسؒ سے حضرت شیخ محمدؒ کے دُھلے کپڑے لینے گئی تو حضرت قدوس کو دیکھ کر شرارت بھرے لہجے میں بولی" حضرت..... اب تو آپ جیسے جوان شادی کر کے باپ بنے پھرتے ہیں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ ساری عمر ایسے ہی گزار دیں گے یا کچھ" "

حضرت عبدالقدوس کنیز کی یہ بات سُن کر مسکرا پڑے اور بولے" بی بی! تم تو اچھی طرح مجھے جانتی ہو۔ بھلا مجھ جیسے شب و روز گزارنے والے درو یش کو بیٹی کون دے گا اور پھر میں خود اپنی اس آزاد زندگی کو کیوں کھو دوں۔ اہل و عیال کے جھنجھٹ میں پڑ کر کیوں غلامی کی زنجیریں پہن لوں۔ بی بی! تم اپنا مشورہ اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے اپنی آزادی کی اس لذت سے محروم کرنے کا منصوبہ نہ بناؤ۔ میں تو عمر بھر مجرد رہنا چاہتا ہوں۔ اب تک درد [illegible] اور بے فکری میں زندگی گزاری ہے جو باقی بچی ہے خدا کی رضا سے وہ بھی گزر جائے گی اور ایک دن گمنامی کے کسی گوشے

لیکن کنیز بھلا کہاں چھوڑنے والی تھی۔ مفت مشورے دینا اُس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ سوچاتے جاتے کہہ گئی "حضرت میں تو کہتی ہوں آپ اپنے پیر شیخ محمدؒ کی چھوٹی بہن سے عقد کرلیں۔ ماشاءاللہ شادی کے قابل ہے۔ آپ کی اور اُس کی جوڑی بھی اچھی رہے گی۔"

یہ بات شیخ عبدالقدوس کے دل کو لگی۔ اور اُن کے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہوگئی۔ انہی دنوں وہ اپنے ایک مربی کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ بات آپ نے اُن کے سامنے کہی تو وہ بھی خوش ہوگئے اور کہنے لگے "حضرت.... اگر اجازت ہو تو میں آج ہی آپ کی طرف سے شادی کا پیغام لے کر حضرت شیخ محمدؒ کے گھر جاتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ مجھے ان کے در سے ناکام نہیں لوٹائے گا۔"

حضرت عبدالقدوس نے ہنس کر انہیں اپنی رضامندی کا اشارہ دے دیا۔

اس واقعہ سے چند دن قبل ایک رات ام کلثوم نے رات خواب میں دیکھا کہ اُن کے بیٹے شیخ محمدؒ کا مرید حضرت قدوس وجد کی حالت میں سماع میں ہے اور اُن کا ایک پاؤں بھی ٹوٹا ہوا ہے اور ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہی تھیں کہ شیخ عبدالحق خواب میں ہی نمودار ہوتے اور کہا "بہو! اس بچے کو اپنے سائے میں لے لو۔ یہ معصوم اور شریف اللہ کا اور میرا پیارا ہے۔ اس کی پرورش دل و جان سے کرنا۔"

اگلی صبح اُم کلثوم بیدار ہوئیں تو انہیں رات کا خواب اچھی طرح ازبر تھا۔ مسرت سے اُن کا چہرہ کھلا جاتا تھا۔ کافی دنوں سے وہ چھوٹی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں پریشان تھیں۔ بڑی صاحبزادی کا انجام دیکھ چکی تھیں اس لیے دُودھ کا جلا ہونے کے سبب چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتی تھیں سو جب شیخ عبدالحق نے اُنہیں چھوٹی پوتی کے لیے بر کا عندیہ دیا تو خوش ہوگئیں۔ عبدالقدوسؒ کے پاؤں کا ٹوٹنا اس بات کی علامت تھا کہ آپ درویش ہیں۔ خُدا کے سوا ہر چیز سے بے نیاز۔ صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلانے والے۔ پرہیزگار متقی۔ جن کا کام صرف [illegible] صرف عبادت کرنا اور خدائے برحق و واحد کی حمد و ثنا میں زندگی بسر کرنا ہے۔ اور عبدالحقؒ کا یہ کہنا کہ "بہو اسے اپنے سائے میں لے کر اچھی طرح پرورش کرو۔" اس بات طرف اشارہ ہے کہ وہ انہیں داماد بنالیں۔

جس دن سے اُم کلثوم نے یہ خواب دیکھا تھا تب سے بے چین تھیں کہ [illegible] چلتے۔ پھر ایک دن ربِ عظیم اُن کی یہ مشکل حل کر دی اور حضرت قدوسؒ کے مربی آپ کی طرف سے بیاہ کا پیام [illegible] والدہ سے تمام واقعہ سُن چکے تھے۔ سو جھٹ پیغام منظور کر لیا گیا۔

شادی کی تاریخ طے کر دی گئی جو آہستہ آہستہ کر کے نزدیک آگئی۔ شہر میں مشہور ہو گیا کہ آج [illegible] انے درویش کا بیاہ ہے۔ شادی والے دن بھی حضرت قدوسؒ نے اپنی مصروفیات نہ بدلی۔ بلکہ حسبِ معمول جھاڑو دینے اور پانی بھرنے میں مصروف [illegible] ہے۔ رسومات کی ادائیگی کے [illegible] قریبی رشتے دار آپ کے پاس آئے اور نہلا دھلا کر نیا لباس پہنایا اور پھر برات کی شکل میں یہ لوگ آپ کو حضرت شیخ محمدؒ کے گھر لے گئے۔ شہر کے لوگ بھی علاقے کے مشہور درویش کی شادی کی خبر سُن کر جوق در جوق شیخ محمدؒ کے گھر پہنچنا شروع ہوگئے۔ نکاح پڑھایا گیا۔ جلوے کا وقت آیا تو گھر میں آئی لڑکیوں نے ہندی میں یہ گیت چھیڑ دیا ؎

کہر کہ کھول دبناشہ دیکھا لوری — اس گھونگھٹ ری کارن شہ ہاتھ مروری

گیت سُننا تھا کہ حضرت عبدالقدوس پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ دیر کے لیے وہ بھول گئے کہ آج وہ کس رُوپ میں کس جگہ بیٹھے ہیں اسی بےخودی میں کھڑے ہوگئے اور وجد میں آ کر بیش قیمت نیا جوڑا پھاڑ ڈالا اور دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔

آپ کی یہ حالت دیکھ کر شادی میں آئی عورتیں تاسفانہ انداز میں اُم کلثوم سے بولیں "بہن .... تجھے چھوٹی بیٹی کے لیے اور کوئی بَر نہ ملا تھا دیوانے درویش کے ساتھ اس کی قسمت پھوڑ ڈالی۔ ابھی تو بڑی بیٹی کا گھر بھی آباد نہ ہوسکا اور چھوٹی کو بھی اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔" اُم کلثوم سب کچھ خندہ پیشانی سے سُنا اور اطمینان سے لبوں پر تبسم سجاتے بولیں "ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس کام میں اُس کی رضا تھی سو ہو گیا۔"

حضرت عبدالقدوسؒ نے شادی تو کرلی مگر اپنے اندر تبدیلی نہ لا سکے۔ اب بھی وہی حال تھا۔ اکیلے تھے تو کھانے پینے کا کبھی خیال نہ کیا۔ بیوی تب بھی [illegible] ش رکھی۔ فقر و فاقے میں دن گزارتے۔ بیوی صابر تھی دو دو چار چار دن فاقوں میں گزار دیتی مگر اُف نہ کرتی۔ حضرت قدوس کو راہِ خدا ملتے مگر جو پیدا [illegible] یں بانٹ دیتے۔ آباؤ اجداد کی طرف سے اچھی خاصی جائیداد مل سکتی تھی مگر کبھی اس طرف دھیان نہ دیا۔

بیلتے۔ تکالیف اُٹھاتے اور خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔ اللہ کے سوا ہر کسی سے ترکِ تعلق اختیار کر رکھا تھا۔ رشتہ دار تھے۔ آپس میں میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے۔ چونکہ آپ نے کبھی اُن سے تعلق نہ رکھا تھا سو انہوں نے بھی آپ کو بھلا دیا۔ شادیاں ہوتیں یا کوئی اور تقریبات، تب ایسے موقعوں پر رشتہ دار ایک دوسرے کے گھر خوان بھیجتے اور آخر میں یاد آتا کہ شیخ قدوسؒ کا گھر تو رہ ہی گیا۔ مگر یہ خیال بھی آنا جب کچھ بھی نہ بچا ہوتا۔ لیکن شیخ عبدالقدوس بے نیازی و بے گانگی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ صرف اللہ سے لو لگاتے رہے۔

سکندر لودھی کا زمانہ تھا۔ ۹۰۷ ہجری کا دور۔ شیخ حسام الدین ایک بزرگ کامل گزرے ہیں۔ ایک دن سکندر نے آپ سے کہا "حضرت آپ کی کرامات دیکھتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو کچھ نہ کچھ اس کا صلہ دیا جائے۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ کو کس چیز کی آرزو ہے۔"

شیخ حسام الدین نے فرمایا "میرے ذمے احتساب کا شعبہ دے دیں اور ساتھ کام کرنے کے لیے مختصر سی جماعت۔ تاکہ میں دین میں منکرات و بدعات پھیلانے والوں کا قلع قمع کر سکوں۔" چنانچہ سکندر لودھی نے اُن کی خواہش کے مطابق جو انہوں نے مانگا تھا دے دیا۔ شیخ حسام الدین دربار سے رخصت ہو کر گجرات، دکن، مالوے کے دورے پر گئے۔ وہاں کے معاشرے کا جائزہ لیا اور اسلام میں جو بدعات پھیل چکی تھیں اُن کو ختم کیا۔ اور تمام علماء و شرفاء سے اقرار کروایا کہ آئندہ وہ اسلام میں کسی بدعت کو پروان نہ چڑھنے دیں گے اور نہ خود اس میں اضافہ کریں گے۔

اس کامیاب اور تفصیلی دورے کے بعد جب دلّی دربار میں اس کی رپورٹ دی تو بادشاہ بھی آپ کی کارکردگی جان کر خوش ہوا اور کہا کر وہ اپنا کام جاری رکھیں۔

دلّی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد حضرت حسام الدین اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر ملتان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ وہاں آپ نے بے انتہا کام کیا اور دین میں سے بدعات کا خاتمہ کرنے کے لیے دن رات کوشاں رہے۔ یہاں تک کہ کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے پانی پت جانے کا ارادہ کیا۔ پانی پت میں آپ کو حضرت عبدالقدوسؒ کے بارے میں جان کاری حاصل ہوئی تو ساتھیوں سے کہا "بھائیو..... پہلے ہمیں گنگوہ چل کر حضرت عبدالقدوس کو تائب کرنا چاہیے۔ وہ خود کو قطب الاقطاب کہلواتے ہیں اور بعض غیر شرعی امور کے پابند ہیں۔ زندگی وجد و حال میں بسر کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہیں سیدھا راستہ دکھا کر ہی آگے بڑھیں۔"

چنانچہ قافلے کا اگلا پڑاؤ گنگوہ تھا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے حضرت عبدالقدوسؒ کو پیغام بھجوایا کہ وہ شریعت حضور اکرمؐ کی تائید کریں۔ اور سرود، وجد، حال کی محفلوں سے دُور رہیں۔ آپ نے جو حسام الدین کا یہ پیغام پایا تو خندہ پیشانی سے جواب بھجوایا "حضرت ہمیں اقرار ہے کہ ہم غیر شرعی کاموں میں ملوث ہو گئے ہیں۔ اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی سے روگردانی کسی طور مناسب نہیں سو ہم اللہ کے حضور توبہ استغفار کرتے ہیں اور آئندہ بچنے کی دعا مانگتے ہیں۔" چنانچہ اس کے بعد آپ نے واقعی چند دن سماع کے بغیر گزارے۔ لوگ جو آپ کو اچھی طرح جانتے تھے کہ سماع کے بغیر تو آپ کا گزارا نہیں۔ آپ اس حال میں آپ کو دیکھتے تو حیرت کا اظہار کرتے۔ ساتھ ہی دبی دبی آوازیں یہ بھی کہہ جاتے کہ حضرت سکندر لودھی کے محتسب اعلیٰ سے خائف ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس نوعیت کی باتیں حضرت عبدالقدوس کے کانوں میں بھی پڑی تھیں مگر انہوں نے اس پر مطلق توجہ نہ دی۔

ابھی آپ کو سماع سے دُور ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات جب تہجد کی خاطر اُٹھے تو آپ کے کانوں میں ایک عورت کے دوہا کی آواز آئی۔ شیخ قدوس نے جو دوہے کے درد بھرے بول سُنے تو وجد میں آ گئے اور دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ ضبط کا یارا نہ رہا۔ وجد کی حالت میں رقص کرتے جاتے اور دیوانہ وار نعرے لگاتے جاتے۔ پھر جب ذرا اعتدال میں آئے تو حضرت حسام الدین کو کہلوا بھیجا۔

"حضرت..... میں تو آتش زدہ لکڑی کی مانند ہو چکا ہوں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک آتش زدہ لکڑی کی آتش سے جنگل میں نہ خشک لکڑی بچ سکتی ہے اور نہ ہی تر۔ جو چیز گرفت میں آتی ہے اسی کو جلا ڈالتی ہے۔ تو مولانا اگر آپ میری یہ کیفیت دُور کر سکتے ہیں تو بے شک میں آپ کا احسان مند ہوں گا۔"

یہ پیغام پا کر حضرت حسام الدین نے اپنے ایک بندے کو بھیج کر معلوم کروایا کہ جا کر دیکھو تو شیخ قدوس اس وقت کس حالت میں ہیں۔" وہ بندہ گیا اور دیکھ کر آنے کے بعد حضرت حسام سے بولا "حضرت وہ تو وجد کی کیفیت میں بے خود ہوئے دیوانہ وار رقص کر رہے ہیں۔" حضرت حسام نے اپنے چند بزرگان کو اکٹھا کیا اور ایک ہاتھ میں دُرّا لے کر آپ کی خانقاہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ لیکن جونہی آپ کو وجد کی حالت میں ایسے جلالی

انداز میں دیکھا تو دفعتاً آپ میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور پھر اچانک شیخ حسام الدین کی حالت میں ایک تغیر رونما ہوا۔ کہاں وہ حضرت عبدالقدوس کو سیدھا راستہ دکھانے دُرّے سمیت آئے تھے اور کہاں یہ حالت کہ خود بھی بے تابی سے دستار اتار پھینکنے کے بعد ایک بلند آواز نعرہ لگا کر پروانے کی مانند شیخ عبدالقدوس کے گرد گھومنے لگے۔

لوگوں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا جب حسام الدین صحیح حالت میں آئے تو لوگوں نے پوچھا "حضرت..... یہ کیا ہو گیا تھا آپ کو؟ آپ کس مقصد کی خاطر آئے تھے اور کیا کر کے جا رہے ہیں تو حسام الدین تھکے تھکے سے انداز میں بولے "ہم..... ہم غلطی پر تھے۔ ہم تاریکی میں تھے آج ہمیں اُجالا نصیب ہوا ہے۔ اب تک ہم اندھیرے میں بھٹک رہے تھے۔" شیخ قدوس جو سنبھل چکے تھے اور آپ کے نزدیک ہی ٹھہرے تھے نرمی سے آپ کی بات سن کر بولے "حسام الدین..... روشنی تو ابھی بہت دُور ہے۔ لیکن اطمینان رکھ ایک روز وہ تمہارا مقدر بنے گی۔" یہ کہا اور سب کو حیرت زدہ چھوڑ کر اپنی عبادت گاہ میں داخل ہو گئے۔

ایک رات جو شیخ قدوس کے ایک خلیفہ نے کشف دیکھا تو حیران رہ گیا کہ اتنی رات گئے آپ مطالعہ میں مصروف ہیں۔ حجرے میں چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی میں آپ اُسے کتاب کھولے بیٹھے نظر آئے۔ اگلی صبح خلیفہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا "حضرت رات آپ نے بڑی مشقت اٹھائی کہ رات بھر چراغ جلائے پڑھتے رہے۔"

یہ سُن کر حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور آپ نے خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "نہیں..... میں کہاں رات جاگتا رہا ہوں۔ ارے بھئی ہم تو رات بھر آرام سے سوتے رہے۔" خلیفہ نے یہ سُن کر حیرت سے آپ کو دیکھا اور تذبذب میں پڑ گیا اُسے یقین نہیں آرہا تھا رات خود اُس نے اپنی آنکھوں سے شیخ قدوس کو حجرے میں چراغ جلائے پڑھتے دیکھا تھا۔ آپ نے جب خلیفہ کو یہ متذبذب دیکھا تو متبسم ہو کے کہا "خلیفہ یہ بات اچھی طرح جان لے کہ اولیاء جو دُنیا کے سامنے نیند میں ہوتے ہیں بظاہر ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ جاگ رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی نیند بھی عبادت میں شمار ہوتی ہے۔" پھر کچھ دیر توقف کے بعد کہنے لگے "اگرچہ یہ حکم انبیاء کرام کے لیے ہے مگر انبیاء کے اتباع کی وجہ سے اولیاء بھی اس سے فیض یاب ہو جاتے ہیں لیکن اولیاء نیند کے بعد اُٹھ کر وضو کی تجدید ضرور کرتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء کے لیے مخصوص حکم میں خود کو پورے کا پورا شریک نہیں کرتے۔"

پانی پت کا ایک شخص برسات کے موسم میں حضرت بُوعلی قلندر کے مزار پر حاضری دینے گیا تو روضے میں داخل ہوتے ہی حیرت سے وہیں رُک گیا روضے میں اس نے دیکھا کہ قلندر کا سر مبارک تو روضہ میں ہی ہے لیکن انہوں نے اپنا ایک پاؤں باہر نکال کر ایک اور بزرگ کے زانو پر رکھا ہوا ہے وہ بزرگ اُن کی پائنتی کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ چہرے سے جلال ٹپکتا تھا اور جس کی پیشانی سے نور ٹپک رہا تھا۔ چنانچہ وہ شخص حیرت سے وہیں کا کھڑا رہ گیا۔ اچانک اُن بزرگ کی جو نظر اُس شخص پر پڑی تو وہ آہستہ سے اُٹھے اور اُس شخص کا ہاتھ تھام کر اُسے قلندر کے پاس لاتے اور اُس کو جُھکا کر قلندر کے قدموں میں ڈال دیا۔ پھر اچانک قلندر اور بزرگ دونوں اُس شخص کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور وہ حیرت زدہ کھڑا رہ گیا۔ بزرگ کی شکل اُس کے دل و دماغ میں چھپاں ہو کر رہ گئی۔ بہت دیر دماغ پر زور ڈالتا رہا کہ آخر قلندر کے ساتھ بزرگ کون تھے؟ لیکن وہ جان نہ سکا ہاں البتہ بزرگ کی صورت اُس کے دل پر نقش ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کے سات سال بعد جب وہ کرنال کسی کام سے گیا تو بزرگ کامل کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ تھے جسے اُس نے قلندر کے مزار پر دیکھا تھا سو حیرت و اشتباہ سے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ لوگوں نے اُسے جواب دیا یہ بزرگ کامل حضرت عبدالقدوس ہیں۔

سکندر لودھی کا دورِ حکومت تھا۔ سن ۸۹۷ ہجری کا وقت۔ لودھی دربار کا ایک امیر بادشاہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار چھوڑ گیا۔ حالات کی گردش میں ایسا آیا کہ جون پور گیا مگر وہاں بھی کسی قسم کی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو بدقسمتی سوچوں میں گم ہو گیا کہ اب کہاں جاؤں؟ کہاں قسمت آزماتے؟ کس بادشاہ شہزادے کا در دیکھے؟ انہی سوچوں میں تھا کہ اچانک اُس کے دل میں آیا کہ آج تک میں بادشاہوں اور شہزادوں کے پاس جاتا رہا ہوں لیکن فیض کسی سے حاصل نہیں ہوا۔ اب کی مرتبہ کیوں نہ کسی بزرگ اور درویش کے حضور حاضری دوں شاید اللہ کے ان نیک بندوں کے طفیل میرے حالات پلٹا کھا جائیں اور آسیب میں لکھی یہ غم و پریشانی دُور ہو جائے۔ سو یہ ارادہ کر کے چل کھڑا ہوا اور گنگوہ تا پھر تا رودولی آیا

انتہائی پرتپاک خیرمقدم، کُشادہ ٹرائی اسٹار اور ۷۳۷ ایس میں سفر کے ساتھ بین الاقوامی اور مشرقی کھانوں کا انتخاب۔

دُوسرے سال بھی ایگزیکٹو ٹریول میگزین لندن کے قارئین نے گلف ایئر کو نمبر 1 قرار دیا ہے۔

کراچی: ۵۱۵۳۳۳، ۵۱۵۵۱۴، ۵۱۱۹۵۰، ۵۱۱۵۳۹، ۵۲۲۳۶۰
لاہور: ۳۰۲۱۱۱ راولپنڈی: ۶۵۳۱۳
سیالکوٹ: پی ایس اے: ۶۵۳۳۲ پشاور: پی آئی اے: ۷۵۱۰۹، ۷۵۵۰۹

طیران الخلیج
GULF AIR
Spread your wings

ابوظبی۔ عمان۔ ایتھنز۔ بحرین۔ بنکاک۔ بمبئی۔ قاہرہ۔ کولمبو۔ دہلی۔ ظہران۔ دوحہ۔ دبئی۔ ہانگ کانگ۔
جدہ۔ کراچی۔ کویت۔ لارناکا۔ لندن۔ منیلا۔ مسقط۔ پیرس۔ راس الخیمہ۔ ریاض۔ سلالہ۔ شارقہ۔ تیونس۔

Placed by MNJ

پہنچ کر اُس نے لوگوں سے دریافت کیا "بھائیو..... حالات کا ستایا ایک بدنصیب انسان ہوں۔ رُوٹھی قسمت کو منانے خُدا کے نیک بندوں کی دُعاؤں کا خواہش مند ہوں۔ کیا اردولی میں کوئی بزرگ حق ہیں جن کے سامنے رو رو کر اپنا حال سُناؤں اور اُن سے سفارش کراؤں کہ اللہ مجھے وقت کے اس گرداب سے نکال کر سکون بخشے۔"

لوگوں نے اس پریشان حال شخص کو دیکھا۔ تکالیف اور مصائب جس کے چہرے سے صاف پڑھے جاتے تھے۔ سو انہوں نے اُس سے ہمدردی کا برتاؤ کیا اور اُسے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ سے ملنے کی نصیحت کی۔

عُمر خان یہ سُنتے ہی حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی بزرگی تقدس اور تقویٰ سے بہت متاثر ہوا۔ دل نے کہا عُمر یہی وہ بزرگ ہیں جن کے طفیل تمہارے حالات بدلتے دیر نہ لگے گی۔ سو اُسی وقت آپ کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر ہچکیوں کے درمیان فریاد کرنے لگا "حضرت میری مدد کیجئے۔ مجھے تھام لیجئے۔ تارک الدنیا ہوں۔ نہ گھر بار رہا ہے نہ ٹھکانہ۔ آپ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں۔ اپنے دامن میں جگہ دے کر اس غریب کو مصائب کے سائے سے دُور کریں۔"

شیخ عبدالقدوسؒ اُس بدنصیب کی اس حالت پر بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ ہمدردی سے سرشار ہو کر بولے "نادان اُٹھ..... بے صبرا کیوں ہوا جا رہا ہے۔ جب اللہ کی اس زمین پر میرے لیے جگہ ہے تو تمہارے لیے کیوں نہ ہوگی۔ ہر بشر اللہ کے نزدیک برابر ہے۔ جا بے فکر ہو کر جا تیرا کشکول کبھی خالی نہ رہے گا۔ جا خُدا کی عبادت کر اور اُسی سے مدد مانگ۔ ہم کون ہوتے ہیں نادان تجھے غموں و مصائب سے بچانے والے۔ ہر فعل کا صرف خُدا واحد ہی سزاوار ہے جس کی مرضی کے بغیر پتا تک نہیں ہل سکتا۔"

آپ کی باتیں سُن کر عُمر خان کو تسلی ہوئی۔ دل نے کہا عُمر خان اب تیری بدنصیبی کے دن ٹل گئے اور ابھی اُسے اس خوش امیدی میں دو چار روز ہی گزرے تھے کہ سکندر لودھی کی طرف سے تحفے و تحائف کے انبار کے ساتھ اُسے دربار طلب کیا گیا۔ اور عزت و احترام کے قول و قرار کا وعدہ کیا گیا۔ عُمر خان یہ جان کر خوشی سے بے تاب ہو گیا اور عقیدت سے پُرنم آنکھیں لیے آپ کے پاس آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا "حضرت آج آپ کے طفیل مجھے یہ عزت و مرتبہ دوبارہ حاصل ہوا ہے۔ میں آپ سے جُدا نہیں ہونا چاہتا آپ میرے ساتھ شاہ آباد (ضلع کرنال) چلیں اور وہاں قیام فرما کر بزرگِ خُدا کو فیض پہنچائیں۔

آپ نے اُس کی بات مان لی اور شاہ آباد جا کر علم و عرفان کی شمع کی روشنی سے شاہ آباد کو منور کیا۔ رشد و ہدایت کے چشمے جاری کیے۔ طالب دُور دُور سے پروانوں کی مانند آنے لگے اور آپ کے اردگرد جمع رہتے۔

ایک طویل عرصہ شاہ آباد میں قیام کیے آپ کو گزر چکا تھا علم و ہدایت کی جو شمع آپ نے روشن کی تھی اُس سے ہزارہا لوگوں نے اپنے باطن کی ڈھلی تاریکی کو منور کیا۔ ایک دن آپ کی اہلیہ نے کشف میں دیکھا کہ خراسان سے ایک آگ اُٹھی ہے جو ہر چیز کو جلاتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔

پھر آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ جس قدر جلد ہو سکے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لو کوئی مصیبت نازل ہُوا ہی چاہتی ہے۔

اور پھر جلد ہی تیموری سلسلے کے بابر بادشاہ نے ہندوستان پر ایسی یلغار کی کہ سامنے آئی چیز کو خاک کی طرح اُڑاتا ہندوستان کا مختار کل بن گیا۔ ان حالات میں جب ہر طرف نفسانفسی کا عالم تھا۔ بستیاں تباہی و بربادی سے دوچار تھیں آپ شاہ آباد چھوڑ کر گنگوہ آ کر رہنے لگے۔

شیخ عبدالقدوسؒ فارسی اور ہندی کے شاعر کی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ نثر میں بھی کئی کتب تحریر کیں۔

شیخ قدوس ایک صائم الاہر عابد تھے۔ عبادتوں میں آپ کو نماز، ذکرِ الٰہی اور قرآن کی تلاوت سے گہرا شغف تھا۔ شدید سردی اور برف باری سے پاؤں اور پنڈلیاں پھٹ جاتیں پھر بھی نماز پڑھتے رہتے۔ چار سو رکعتیں دن کو اور اتنی ہی رات کو ادا کرتے۔ لیکن خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ موسم کی شدت سے بے نیاز عبادتِ الٰہی میں تندہی سے مصروف رہتے۔

آپ نے چوراسی سال کی طویل عُمر پائی اور ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۴ ہجری کو اس دُنیا سے پردہ اختیار کر لیا۔ آپ کا مزار گنگوہ ضلع سہارن پور میں بھی لوگوں کے نزدیک ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔ چار سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود تاریخ میں آپ کی یہ آواز آج تک محفوظ ہے۔

شریعت لا معبود الا اللہ، طریقت لا مقصود الا اللہ ..... اور حقیقت لا موجود الا اللہ

مصاجبین خاص والئ ریاست گجرات کو مسلسل تسلیاں دے رہے تھے مگر اُن کے تسکین آمیز کلمات حاکم وقت کے لختِ جگر کی بیماری دُور نہیں کر سکتے تھے۔ برہمن مندروں میں گھنٹیاں بجا کر اپنے دیوتاؤں کو [پکا]رتے تھے۔ باباگرونانک کے ماننے والے سکھ پجاری اجتماعی دُعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔ مسلمانوں کی تو حالت ا[س قدر خراب تھی کہ ...]ن سے اپنے نیک نفس والی کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ دیکھا نہیں جاتا۔ شیخ شاہ عالم کئی کئی گھنٹے تک سجدہ ریز رہتا۔ [جب اضطر]ابت حد سے گزر جاتی تو بے اختیار اس کے ہونٹوں کی قید سے آزاد ہونے والے الفاظ قریب کھڑے غمگین اور افسردہ لوگ[وں کو سنا]ئی دیتے۔

"اے زمین و آسمان کے مالک تو نے اپنے لامحدود فضل و کرم سے اِس بندۂ ناچیز کو اعلیٰ منصب پر فائز کیا ہے۔ [آج تیر]ا عاجز اور ذلیل بندہ تیری رحمت کا سوال کرتا ہے۔ مولا کریم ساری کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ گئی ہیں۔ ساری [دعائیں خ]الی جاچکیں۔ دُنیا والوں کا ہر دروازہ کھٹکھٹایا جاچکا ہے مگر ہر طرف سے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اپنے اس گنہ[گار اور غ]لامی بندے کی خطائیں معاف کرکے میری دُعا کو قبولیت کا شرف بخش دے۔ دواؤں کو اذنِ تاثیر عطا کرکے بے قرار با[پ کے د]ل کو قرار سے نواز دے۔"

عاجزی اور انکساری بلکہ انتہائی لاچاری کے عالم میں گریہ زاری کرنے والے حاکم گجرات شیخ شاہ عالم کی آنکھ روتے رو[تے لگ گئ]ی ہے۔ خواب میں ایک درویش نورانی چہرہ لیے ہاتھ میں عصا تھامے محبت بھری نظروں سے تکتے دکھائی دیئے۔ ان کے انداز [سے شیخ شا]ہ صاحب پر سکتہ طاری ہوگیا۔ پھر ملتجیانہ انداز میں دست بستہ ہو کر پیارے بیٹے کی بیماری کا ذکر کیا۔ درویش حلاوت آمیز انداز میں [بو]لے "شاہ عالم اُٹھو اپنے گھر آنے والی خدائی رحمت اور نعمت کا استقبال کرو۔" یہ فرما کر وہ نورانی صورت تو غائب ہوگئی اور شاہ [صاحب گھ]ر والوں کی ملی جلی آوازوں سے بیدار ہوگئے۔

[انہوں نے] نظر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے والے دروازے سے ایک چیتھڑوں میں ملبوس فرشتہ صورت بزرگ آتے دکھائی دیئے۔ آتے ہی قریب [المرگ ل]ڑکے کی مرض کی شدت سے تپتی ہوئی پیشانی پر دستِ شفقت پھیرا اور مٹی کا پیالہ زندگی سے مایوس مریض کے ہونٹوں سے

لگالیا۔ بس پھر کیا تھا دستِ شفقت پھیرنے اور پانی کے چند قطروں کے حلق سے نیچے اُترتے ہی زندگی کی بجھتی ہوئی شمع کی لَو تیز ہو گئی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں شاہ عالم کا بیمار بیٹا صحت یاب ہو گیا۔

یہ مردِ بزرگ جس نے شاہ عالم والیٔ گجرات کے گرانقدر عطیات ایک شانِ بے نیازی سے ٹھکرا دیئے یہ چارہ ساز، غمگسار، ولی، عامل، امام عادل اور درویشِ کامل سید نعمت اللہ شاہ صاحب تھے جن کے پیالے سے چند قطرۂ آب پیتے ہی شاہ عالم کے پیارے بیٹے سید جلال موت سے نبرد آزما رہنے کے بعد تندرست ہو گئے۔

سید نعمت اللہ شاہ ایک نیک نفس، روشن ضمیر، صاحبِ کمالات، مردِ میدان، علومِ ظاہری کے عالم بے بدل، مکاشفات و مشاہدات کے کامل جلیل القدر بزرگ سید امیر عطاء اللہ کے ہاں مغلیہ فرماں روائے ہند اکبر کے آخری سالوں میں پیدا ہوئے۔ بوقتِ ولادت آپ کی پیشانی سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ایسے بخت والے لختِ جگر کی پیدائش سے سید عطاءاللہ صاحب جامے میں پھولے نہ سمائے، انہوں نے فرزندِ ارجمند کی ولادت کی خوشی میں مٹھائی سے بھرا ہوا تھال لے کر وقت کے عظیم المرتبت مشہور درویش نظام الدین نارنولی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

نظام الدینؒ نے ان سے معذرت کے انداز میں فرمایا "امیر صاحب! آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ فقیر شادی اور غمی کی چیزوں کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ کھانا تو دور کی بات ہے؟"

ایسا سخت اور کھرا جواب سن کر امیر عطاءاللہ نے دوبارہ عرض کی "لیکن حضرت یہ شیریں چیز تو آپ ضرور کھائیں گے مگر یہ کیا؟ حضرت صاحب تو سر جھکائے اللہ سے لو لگائے مراقبے میں جا چکے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد نظام الدین صاحب نے فرمایا "بے شک یہ تو مجھے کھانا ہی پڑے گا۔ ہم ابھی اس حقیقت سے آگاہ ہوئے ہیں کہ خدا کے نزدیک اس فرزندِ نیک بخت کا مرتبہ بہت بلند ہے اور آنے و[illegible] رحمتِ ایزدی اور مظاہرہ خداوندی کا پرتو بنے گا۔

[illegible] مرشد کی باتیں سن کر میر صاحب کی خوشی کا مت پوچھیے۔ اس نعمتِ غیر مترقبہ پر خدا کا شکر بجا لائے، اگر گھر میں ایک واقعہ [illegible] کرنے کے لیے تیار تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بچہ جس کی عمر ابھی ایک دن بھی پوری نہیں ہوئی تھی اپنے ستر کو ہاتھوں میں دھ[illegible] اللہ اللہ پکار رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر ساری حقیقت بیان کی جسے سن کر انہو[ں نے کہا] عطاءاللہ مبارک ہو، تیرا بیٹا اپنے زمانے کا شمس العارفین کہلائے گا۔ عالمِ کشف میں اس کا نام نعمت اللہ تجویز کیا گیا۔

آپ نے بعد میں ثابت کر دیا کہ آپ واقعی اللہ کی عظیم نعمت ہیں۔

[چا]ر سال کی عمر میں ذہانتِ خداداد کی بدولت قرآن مجید پڑھ لیا اور اس کے ساتھ ہی سایۂ پدری سے محروم بھی ہو گئے۔ والد [صاحب] کے بعد نظام الدینؒ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے لگے۔

[آ]پ نے وہاں تصوف کے تمام علوم پر عبور حاصل کیا۔ انہی دنوں ایک خوشگوار واقعے نے لوگوں کو آپ کی جانب متوجہ کر لیا، ہر کس و ناکس کی زبان پر آپ کا ذکر ہونے لگا۔

ہوا یوں کہ ایک دن کسی سرکاری نمائندہ نے آپ کے پیر و مرشد کی بارگاہ میں حاضری دی۔ مرشد کے دربار کے سبھی لوگ ماسوا آپ کے اس سرکاری منصب دار کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔

سلام و دعا کے بعد سرکاری کارندے نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ زمینداروں سے مالگزاریاں وصول کرنے پر تعینات ہے۔ ر[ا]ہ علاقے کا ایک سرکش اور بدخصلت زمیندار کافی عرصے سے واجب الادا مالگزاری کی رقم نہیں دے رہا۔ جس کی بنا پر حکومت کی طر[ف] کئی بار سرزنش بھی ہو چکی ہے۔ علاقے کے صاحبِ حیثیت لوگ بھی اسے رقم ادا کرنے کا کہہ چکے ہیں مگر اس کے کانوں پر جوں تک [نہیں رینگتی]

رکھتی۔ بلکہ اُلٹا ہماری بے عزتی کر دیتا ہے۔

یہ سُن کر آپ نے چیں بجبیں ہو کر زمیندار کا نام اور اتہ پتہ دریافت کیا۔ اس پر حاضرین میں سے اکثر کے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کئی ایک نے تو آپ کو دبے لفظوں میں اس کام سے باز رہنے کی درخواست بھی کی۔ جسے سُن کر آپ کی کشادہ پیشانی پر بل پڑ گئے اور برہمی سے کہا: میں ضرور اس ناہنجار اور نابکار کے پاس جاؤں گا۔ اور اس سے مالگزاری کی رقم لے کر آؤں گا۔"

یہ سُن کر دوسرے صاحب نے کہا: اگر جانا ہی ٹھہرا تو اپنے ساتھ پولیس کے کچھ سپاہی لے جائیں کیونکہ یہ زمیندار لوگ بہانے سے اپنی زمینوں پر لے جا کر قتل کر دیتے ہیں۔ عین ممکن ہے ایسی ہی سازش کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دے اور انہیں واپس آنا بھی نصیب نہ ہو۔"

"آپ لوگ اپنا کام کریں اور اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھیں۔ ہم ضرور جائیں گے۔ موت و حیات کا مالک آسمانوں پر ہے۔" آپ نے غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آپ اپنے مُرشد کی رضامندی سے اس زمیندار کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ زمیندار گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا کسی سے تیز لہجے میں باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ڈانٹ ڈپٹ بھی۔ جونہی اس کی نظر آپ پر پڑی بات درمیان ہی میں چھوڑ کر بے تابی سے آپ کی طرف لپکا۔ قریب آ کر سلام کیا اور دست بوسی کے بعد آپ کو اپنے ہاں تشریف لے جانے کے لیے کہا۔ آپ نے فرمایا: "ہم تمہارے گھر نہیں جا سکتے۔ تم صرف اتنا کرو کہ مالگزاری کی واجب الادا رقم فوری طور پر میرے حوالے کر دو ورنہ خیر نہیں ہوگی۔" آپ کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

چال میں لڑکھڑاہٹ، چہرے پر گھبراہٹ اور گفتگو میں ہکلاہٹ کے آثار نمایاں تھے، فوراً اندر گیا اور رقم لا کر آپ کے حوالے کرتے ہوئے اتنی زحمت کرنے پر معافی کا درخواست گزار ہوا۔ آپ نے وہ رقم بعینہٖ لا کر اس سرکاری افسر کے حوالے کر دی۔ یہ دیکھ کر سارے حاضرینِ مجلس ہکا بکا رہ گئے۔

اس واقعہ کے بعد زمیندار خود ہی لوگوں کو سنایا کرتا تھا کہ پہلے تو میں نے رقم نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ایک بہت بڑا اژدہا پھنکارتا ہوا نگلنے کے لیے میری طرف بڑھ رہا ہے۔

اس واقعہ سے آپ کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اس کم سنی میں لوگ آپ سے دُعا کراتے اور بامُراد ہو کر لوٹتے تھے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ آپ نے ہر کہیں آنا جانا بند کر دیا۔ اس کے برعکس لوگ اب بھی دُعا کے لیے آتے جس سے آپ کو بہت کوفت ہوتی۔ پھر ایک اندھیری رات میں مُرشد کی اجازت سے ایک کمان تیروں سے بھرا ہوا ترکش، ایک اشرفی اور رائج الوقت پانچ سکے لے کر وہاں سے نکل گئے۔ رات بھر چلنے کے بعد وہ ایک دریا کے کنارے جا پہنچے چونکہ کشتی کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے برلب دریا مصلیٰ بچھا کر یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ نہ جانے کتنی دیر تک ایسی حالت میں رہتے کہ لوگوں کی اُونچی اُونچی آوازوں سے یادِ الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نظر اُٹھا کر دیکھا تو پانچ سو کے قریب لوگوں کو شور مچاتے ہوئے دریا کی طرف دوڑتے پایا۔ آپ خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ آخر عقدہ یوں کھلا کہ ان میں سے آدھے ہندو ہیں اور باقی مسلمان۔ دونوں فریقین اپنے اپنے مذہب کی حقانیت پر دلائل دے رہے ہیں۔

آپ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھے اور ہاتھ سے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ مسلمان تو آپ کے اشارے سے خاموش ہو گئے مگر بدبخت ہندو برابر بولتے رہے، ستم بالائے ستم آپ پر پھبتیاں بھی کسنے لگے۔ جنہیں آپ نے نہایت تحمل سے سُن کر برداشت کیا۔ پھر ہندوؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ اگر تمہارا مذہب سچا ہے تو تمہارا کوئی ایک مذہبی رہنما اس طوفانی دریا کے عین بیچ میں سطح آب پر کھڑے ہو کر عبادت کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہو تو ہم تیار ہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنا مصلیٰ اُٹھایا اور دریا کے عین وسط میں بپھری ہوئی موجوں پر کھڑے ہو کر اطمینان سے نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر ہندو پنڈت تو وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا، جبکہ باقی لوگوں نے

آپ کی کرامت سے متاثر ہو کر کلمہ پڑھ لیا۔ ابھی لوگ مسلمان ہونے میں مصروف ہی تھے کہ وہی شکست خوردہ پنڈت واپس لوٹ آیا اور آتے ہی للکارتے ہوئے کہا۔ اگر آپ واقعی حق پر ہیں تو ابھی عین اسی وقت خربوزے حاضر کر کے دکھا دیں۔ آپ نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور لوگ دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔ جب ایک اجنبی شخص درختوں کی اوٹ سے تازہ خربوزوں سے بھرا ہوا تھال لے کر حاضر ہوا۔ حالانکہ وہ خربوزوں کا موسم نہ تھا۔ آپ نے مسکرا کر دوبارہ پنڈت کی طرف دیکھا۔ ایک ایک کر کے خربوزے تقسیم کیے اور خود ویرانے کی راہ لی۔

جنگلوں بیابانوں میں چلتے پھرتے حیدر آباد کے مضافات میں جا نکلے۔ اِن دِنوں شیخ محمدؒ کا بڑا چرچا تھا۔ آپ اُنکی طرف کھنچنے لگے۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو شیخ محمدؒ نے محبت سے پوچھا۔

"تمہیں کس چیز نے میرے پاس آنے پر مجبور کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ حضرت! میں علومِ باطنی اور علومِ الٰہی کی تحصیل کے لیے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔

"کیا علومِ ظاہری سے فارغ ہو گئے؟" شیخؒ نے دوبارہ استفسار کیا۔

"علمِ ظاہری حاصل تو کیا ہے مگر تکمیل نہیں ہوئی۔"

یہ سن کر شیخ نے فرمایا "سبحان اللہ! خدا کے ایسے بندے بھی ہیں جنہوں نے علمِ ظاہری حاصل نہیں کیا اور خدا کی طلب کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا حضرت! اسی لیے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ چنانچہ شیخ نے آپ کو حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا اور ادھر سے مطمئن ہو کر دولت آباد روانہ ہو گئے۔ دولت آباد کے حکیم جبرئیل کا علم و حکمت میں کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہایت شفقت سے مدیرانِ خاص میں جگہ دی۔

ایک دن آپکے استادِ محترم حکیم صاحب سرکاری صوبے دار سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے جس نے ان کا استقبال نہایت سردمہری سے کیا۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا "صوبے دار صاحب خیریت تو ہیں۔ نصیب دشمناں۔ کیا کچھ طبیعت ناساز ہے۔"

صوبے دار نے جواب دیا۔ میری طبیعت ذرا بھی خراب نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ کچھ دن پہلے میرے وزیر کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو صالح ہونے کے ساتھ ساتھ دیانت دار، قابلِ اعتماد اور عقل مند بھی ہو۔ بس اسی فکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

حکیم صاحب نے چہکنے والے انداز میں کہا۔

"اگر میں اس مسئلے کو حل کر دوں تو؟"

"اگر آپ یہ کر سکتے ہیں تو دیر کاہے کی میں آپ کا تاحیات احسان مند رہوں گا۔"

گھر آکر حکیم صاحب نے آپ کو بلا بھیجا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک دم پوچھا۔

"کیوں میاں صاحب زادے میں کیسا آدمی ہوں؟"

"آپ کی خوبیاں احاطۂ تقریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔ میں کس طرح اور کس زبان سے بیان کروں۔"

شاگردِ رشید کی جانب سے تسلی بخش جواب پا کر قدرے ڈھارس بندھی اور اچانک یہ بتا کر آپ کو چونکا دیا کہ میں آپ کو دولت آباد کا وزیر لگوانا چاہتا ہوں۔"

استاد کی بات سن کر آپ ٹکٹکی باندھے ان کے چہرے کی طرف تکنے لگے۔ رات تک مزید کوئی بات چیت نہ ہوئی جیسے ہی سیاہ رات نے اپنی چادر تنی اور اہلِ خانہ سو گئے تو آپ نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور اس گھر سے نکلنے کے لیے چلے گئے۔ دوران سفر قریہ خلد کے پاس ایک گھنے جنگل میں جا ڈیرا جمایا۔ اور ایسے یادِ الٰہی میں مشغول ہوئے کہ تن کا ہوش نہ رہا۔ تن پر جو لباس تھا وہ تار تار ہو کر رخصت ہو گیا۔ جنگلی درختوں کے پتوں اور چھال نے لباس کی جگہ لے لی۔ یاد میں یادِ الٰہی کی گرمی ایسی تھی کہ سردی اور برسات آپ کا کچھ بھی نہ

بگا ڑسکی۔سولہ سال اسی حالت میں گزار دیئے۔جب وہاں سے نکل کر انسانوں کی بستی میں آئے تو بستی والے خوفزدہ ہو گئے۔چند دن اسی بستی میں قیام فرما کر دوبارہ مرشد کی خدمت میں پہنچ گئے۔یہاں بھی دل نہ لگا تو خاندیس کی راہ لی۔

راستے میں ایک گاؤں میں سے گزر ہوا۔گاؤں کے باہر میلے کا سا سماں تھا۔لڑکیاں لڑکے مختلف ٹولیوں میں بٹے اپنی اپنی زبان میں بھجن گا رہے تھے۔مندر سے چھن چھنا چھن کی سُریلی آوازسے ماحول میں ایک عجیب طرح کا رس گھلا ہوا تھا۔لوگ اپنے اپنے حال میں مست بھنگڑا ڈال رہے تھے۔اچانک مندر کی طرف سے سہمی آواز آپ کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔یہ آواز کسی جوان لڑکی کی تھی۔آپ نے مندر کے اندر جھانک کر دیکھا۔وہاں کوئی اور ہی منظر تھا۔پنڈت نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس دودھ لانے والی لڑکی پر دست درازی شروع کر دی۔پہلے پہل تو وہ برداشت کرتی رہی۔پھر جیسے ہی پنڈت نے حد سے بڑھنا چاہا اُس لڑکی نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ساتھ ساتھ وہ مہاراج کے مذہبی مرتبے،بُزرگی اور عمر کا واسطہ دیا۔لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا کہ آج اس پر شیطان سوار ہے۔لڑکی کسی عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔جب دیکھا کہ پنڈت صاحب پر مکمل طور پر شیطانیت غالب آچکی ہے اور کسی طور اپنے بُرے ارادے سے باز نہیں آنے والے تو وہ ہرن کی طرح قلانچیں بھر کر باہر کو دوڑ پڑی۔پنڈت بھی غافل نہیں تھا۔اس نے اسے دبوچ لیا۔

اچانک زناٹے دار تھپڑ نے پنڈت کے چودہ طبق روشن کر دیئے اور دن کے وقت تارے نظر آگئے۔لڑکی اس کی آہنی گرفت سے آزاد ہو کر مندر کے دروازے پر کھڑی ہانپ رہی تھی اور اندر پنڈت جی کی یادگار پٹائی ہو رہی تھی۔اگر آپ بروقت پہنچ کر اسے نام نہاد پنڈت کے چنگل سے لڑکی کو آزاد نہ کرتے تو عین ممکن تھا کہ وہ اس انسان نما بھیڑیے کی درندگی اور بربریت کا شکار ہو جاتی۔اب پنڈت جی کی گھونسوں،مکوں اور لاتوں کے تابڑ توڑ حملوں سے تواضع ہو رہی تھی۔شور وغل کی بلے ہنگم آوازیں یک لخت تھم گئیں اور خاموشی کے ساتھ ہی بے شمار لوگوں کا ریلا مندر میں گھس آیا۔لڑکی کے کپڑے اپنی عزت اور عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے تار تار ہو گئے تھے۔حال حقیقت سے آگاہ اور انسانیت سوز منظر دیکھ کر سارا مجمع بھڑک اُٹھا اور بپھرے ہوئے ہجوم نے پنڈت کی وہ پٹائی کی کہ اسے جان کے لالے پڑ گئے۔منت سماجت کر کے جان چھڑائی اور وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر گیدڑ کی طرح ایسے بھاگا کہ پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔

سارا ہجوم آپ کو چاروں طرف سے گھیرے عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔کئی ایک نے دودھ سے بھری ہوئی بالٹیاں آپ کے قدموں میں رکھ دیں۔باقی لوگ آپ کے ہاتھوں پہ وارفتگی کے عالم میں بوسے پہ بوسے دینے لگے۔بڑی مشکل سے آپ نے ان کو روکا۔پھر فرمانے لگے۔

"عورت خواہ کسی مذہب کی ہو اسکی حفاظت کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔تم پر یہ بات بھی واضح کرتا جاؤں کہ یہ لڑکی قسمت والی ہے اور ایک دن وہ آئے گا جب مسلمان ہو گی اور اس کے ہاں ایسا ولی اللہ پیدا ہو گا جسکے رشد و ہدایت اور علم و عرفان کی شعاعوں سے تاریک دلوں میں روشنی ہو گی۔اور زمانہ فیض یاب ہو گا۔" پھر جلالی انداز میں دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے فرمایا "جاؤ سارے دلاھر دُور ہو گئے۔آسمانی روشنی پھیل گئی۔بھیڑیا زنجیروں میں جکڑا گیا اور گھٹا کھل کر برسے گی۔" اس وقت تو لوگ آپ کی ان باتوں کو نہ سمجھ سکے۔سمجھتے بھی کیسے۔آپ کی باتیں ان کی ناقص عقل سے بالاتر تھیں۔کچھ ہی عرصے بعد وہ سارا علاقہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔اور اس لڑکی کے بطن سے ایک ایسے ولی کامل قطب دوراں نے جنم لیا جنکی مساعی جمیلہ سے ڈیرہ غازی خاں اور گردونواح کے ہزاروں بسنے والے اُجڈ لوگ مسلمان ہو گئے۔

آپ لوگوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر اپنی راہ ہو لیے۔چلتے چلتے گجرات پہنچ گئے۔گجرات کے سابق والی شیخ عالم شاہ اس دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ان کی جگہ ان کا وہی بیٹا جس کے لیے آپ مسیحا ثابت ہوئے تھے۔اب علاقے کا حاکم تھا۔اس نے آپکی شاندار پذیرائی کی۔آپ وہاں سکونت پذیر ہو گئے۔

یہ نورالدین جہانگیر کا دور تھا۔ ایک دن جہانگیر نے گجرات جانے کا ارادہ کیا تو اس پاس کے علاقوں میں دھوم مچ گئی۔ سید جلال بھی جہانگیر کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ بادشاہ گجرات میں داخل ہوا تو سبھی استقبال کرنے کے لیے گئے۔ سوائے سید نعمت اللہ صاحب کے۔ حتیٰ کہ آپ اپنے حجرے سے باہر تک نہ نکلے۔ چونکہ آپ کا شہرہ دُور دُور تک پھیل چکا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ بات بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ جہانگیر نے فوراً اپنے دیندار افسرِ اعلیٰ کو طلب کر کے دریافت کیا کہ اس علاقے میں واقعی ایک ایسی ہستی موجود ہے جسکا دُور دُور تک کوئی ثانی نہیں۔ اسے ظاہری علوم پر عبور بھی حاصل ہے قربِ الٰہی کی دولت سے مالامال بھی۔ افسر نے دست بستہ ہو کر عرض کی، حضور والا!! اس وقت ایک ہی ہستی ایسی ہے جسکا دُور دُور تک کوئی ثانی نہیں اور نہ اس کے ظاہری و باطنی علوم کا کوئی کنارہ۔

جہانگیر نے اشتیاق بھرے لہجے میں دوبارہ پوچھا۔

"وہ بزرگ کہاں ملیں گے؟"

افسر دوبارہ گویا ہوا۔ جہاں پناہ! مخدومنا سید نعمت اللہ صاحب اپنے سید جلال کے روحانی مُرشد ہیں اور انہی کی سرپرستی میں چلنے والی خانقاہ میں رہائش پذیر ہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ سید جلال سے کہہ دینا کہ وہ ہماری مُلاقات کرا دے۔ یہ کہا اور جہانگیر اپنے خیمے میں چلا گیا۔

افسر وہاں سے اُٹھ کر سید جلال کے ہاں آیا اور تذبذب کے عالم میں سارا ماجرا کہہ سُنایا۔

یہ سُن کر سید جلال بھی سکتے میں آگئے۔ سوچوں نے آن گھیرا۔ طرح طرح کے وسوسے سر اُبھارنے لگے۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد اللہ کا نام لے کر اُٹھے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ کچھ دیر تو گومگو کی حالت میں غوطے کھاتے رہے پھر جرأت کر کے کہنے لگے: حضور اگر آپ کی اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔"

"بابا یہ سُلطانی دربار نہیں، فقیر کی کُٹیا ہے۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ اس میں شرم کیسی، ندامت کیوں اور خجالت کس لیے۔" آپ نے نہایت دھیمے انداز میں فرمایا۔

یہ اُمید افزا جواب پا کر سید صاحب دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے پھر چھلکتے جام کی طرح ذرا آواز پیدا کر کے عرض کی۔ "حضرت! بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ سے شرفِ مُلاقات حاصل کرے۔ عاجز نے وعدہ کر لیا ہے۔ آپ کے اخلاق کریمانہ سے اُمید کرتا ہوں کہ شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔"

"نہیں بابا ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم بادشاہ سے ہرگز ملنا پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ درویش کے مسلک کے خلاف ہے اور درویش کو اپنی درویشی عزیز ہے۔"

اِدھر جہانگیر نے یہ حوصلہ شکن جواب سُن کر کہا: "میں نے بھی یہ طے کر لیا ہے کہ اُن سے ضرور مُلاقات کروں گا۔ خواہ قیامت قیامت ٹوٹ پڑے یا آسمان گر جائے۔"

جیسے ہی سید صاحب نے جہانگیر کا اٹل جواب سُنا وہ سرتا پا لرز گئے۔ دل میں سوچا دیکھئے بادشاہ کی ضد کہاں تک پوری ہوتی ہے پھر خود ہی درخواست کی۔ حضور والا۔ بات کو زیادہ نہ بڑھایئے درویش کو اس کے حال پر چھوڑ دیجئے کیونکہ فقیر کی برہمی سلطنت کا سبب بن سکتی ہے۔"

جہانگیر نے کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایسے مردِ کامل کو بھلا ناراض کرنے کی کون سوچ سکتا ہے۔" ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سید جلال صاحب کے زیرِ انتظام چلنے والی خانقاہ پر جا کر فاتحہ خوانی کریں اور ساتھ ہی سید نعمت اللہ صاحب سے مُلاقات بھی۔"

اعلان کے بعد بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ خانقاہ میں حاضری کے لیے پہنچ گیا۔ مزار شریف پر فاتحہ خوانی کے بعد اس حجرے کا رُخ کیا جہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے جہانگیر نے خود دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا مگر سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہ

ہوا۔ خالی کمرا بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور سید نعمت اللہ کا دُور دُور تک نشان نہ تھا۔

مُلاقات نہ ہونے کا جہانگیر کو بے حد ملال اور قلق تھا پھر بھی اس امر میں مشیت ایزدی خیال کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ جہانگیر کے رُخصت ہونے کے بعد سید جلال بھاگم بھاگ حجرے میں پہنچے اور حجرے کے اندر کا نقشہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ سید جلال نے آپکو جائے نماز پر ذکر الٰہی میں مشغول پایا۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر محبت اور عقیدت سے بوسہ دیتے ہوئے عرض کی۔

" حضرت جہانگیر کہنے کو تو بر صغیر کا بادشاہ ہے مگر طبیعت میں عاجزی، انکسار اور فروتنی اس قدر پائی ہے کہ آپ جیسے اللہ کے نیک بندے کے آستانے پر جبہ سائی کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ حضور مُلاقات کا شرف بخش دیں تو کیا حرج ہو گا "

" حرج ہے۔ بہت بڑا حرج ہے۔ ہم اس حرج سے واقف ہیں۔ سید جلال آپ تو اچھے بھلے دانا و بینا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ کی صحبت سے بچنا چاہیئے اگر بادشاہ کی صحبت کا اثر ہم پر ہو گیا تو درویشی چھن جائے گی اور ہماری صحبت کا اثر بادشاہ پر ہو جائے اس سے بادشاہت مسیت اور ملک تباہ ہو جاتا ہے "

ان ارشادات عالیہ سے آپکی وسعتِ معلومات اور رموز تصوف پر عبور ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے تصوف کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔

" تصوف نیک خوئی کا نام ہے۔ نفسِ امارہ اور حرص و ہوا کی غلامی سے آزادی پانا۔ باطل کے مقابلے میں جرأت و مردانگی دکھانا دُنیاوی تکلفات سے بے نیاز رہنا اور اسرار کی محفلوں سے کنارہ کشی کرنا تصوف کا منشا و مدعا ہے "

وقت گزرتا رہا۔ آپ اپنے فیوض و برکات سے عوام النّاس کو مستفید کرتے اور علم و عرفان کے موتی بکھیرتے رہے۔

جس ماحول میں آپ نے آنکھ کھولی تھی ایسے ماحول میں بندگان خدا کو راہِ راست پر لانے والے کے لیے ضروری تھا کہ عالم و عارف ہو۔ اس کا یقین اور ایمان پہاڑ کی طرح محکم۔ اس کا صدق و وفا، بے غرضی اور فقر کامل ہو۔ آہنی عزم کا مالک اور حالات کا غلام نہیں بلکہ آقا ہو۔ آپ ان تمام اوصافِ جمیلہ سے متصف بزرگ تھے۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے نہ جانے جہانگیر کو کیا سُوجھی کہ درباری اور ملکی علماء و فضلاء بُلا کر حکم دیا کہ قرآن پاک کا ترجمہ فارسی میں ایسے طریقے سے کیا جائے کہ عربی متن اور فارسی ترجمہ کے الفاظ برابر برابر ہوں۔ علماءِ وقت اور فضلاءِ زمانہ فوراً اس کام میں جُت گئے۔ کئی مہینے مسلسل کام ہوتا رہا اور اس سعئ لاحاصل کا نتیجہ صفر رہا۔ بالآخر سب نے مجبور ہو کر اپنی بے بسی اور بے ضابطی کا اظہار کر دیا۔ جہانگیر کا پارہ چڑھ گیا۔ غصے سے لال بھبھوکا ہوتے ہوئے دھاڑ کر کہا۔

" اس کا تو یہ مطلب ہُوا کہ پورے ملک میں ایک بھی عالم نہیں بلکہ جاہلوں نے عالموں کا بھیس اپنایا ہوا ہے۔ نکل جاؤ میرے دربار سے نالائق کہیں کے "

جہانگیر کے سخت سخت الفاظ کی تلخ گونج نے دیر تک دربار پر سناٹا طاری رکھا۔ آخر ایک عالم نے جرأت کرتے ہوئے دوبارہ عرض کی۔

" بندہ پرور، ہماری نظر میں بس ایک ہی ایسی کامل و عالم ہستی ہے جو اس کام کو بطریق احسن انجام دے سکے اور وہ ہے نابغہ روزگار نادرِ زمانہ سید نعمت اللہ صاحب "

عالم کے بولے ہوئے الفاظ سے جہانگیر کے چہرے پر طمانیت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سید جلال کے نام فوراً ایک فرمان جاری کیا کہ وہ سید نعمت اللہ شاہ سے قرآن حمید کا ترجمہ فارسی زبان میں اس انداز سے کرائے کہ جتنے الفاظ عربی متن کے ہیں اُتنے ہی فارسی ترجمے کے ہوں "

مزید برآں سید جلال اس دفعہ بھی ناکام ہُوئے تو اُسے صوبے داری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ سید جلال یہ فرمان شاہی پڑھ کر بہت پریشان ہوئے۔ فرمان کیا تھا۔

فرمان حکم حاکم مرگ مفاجات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جسے پڑھتے ہی چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ بدحواسی کے عالم میں چلچلاتی دھوپ اور آتش بار آفتاب کی قہرمانیوں کی پرواہ کیے بغیر عتاب نامہ اٹھائے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی فرمان من وعن پڑھ کر سنایا۔

آپ نے سب کچھ پڑھ کر فرمایا " سید جلال! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ہم تمہاری خاطر ترجمہ ضرور کریں گے۔ دو ماہ کی قلیل مدت میں پورے قرآن پاک کا ترجمہ جہانگیر کی منشا کے عین مطابق کر کے سید جلال کے حوالے کر دیا۔ جہانگیر نے اس ترجمہ کو جگہ جگہ سے جانچا پرکھا، الفاظ گنے مگر ہر چیز بے عیب، شاندار، خواہش اور توقع سے کہیں بڑھ کر پائی۔ ترجمے کا معیار اس قدر بلند کہ جہانگیر نے چونکتے ہوئے کہا۔

" خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے اس امت میں ایسے ایسے فقید المثال اور علم وعرفان کے بحر ذخار پیدا کیے ہیں "

اس واقعہ سے آپکی خداداد ذہانت اور بلند علمی کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے تو اپنے غیروں نے بھی آپکی قابلیت، اعلیٰ مقام ومرتبہ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے، آپ کی کرامات علمی فضیلت اور بالغ نظری کی دھوم ملک کے گوشے گوشے تک پھیل گئی تھی۔ اس کے برعکس چند ایک ناکام حاسدین نے آپ کی بے داغ شخصیت پر کیچڑ اچھالنے کی ناپاک جسارت کی، حالانکہ وہ آپکے محاسن، عظمت وکرامت کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔
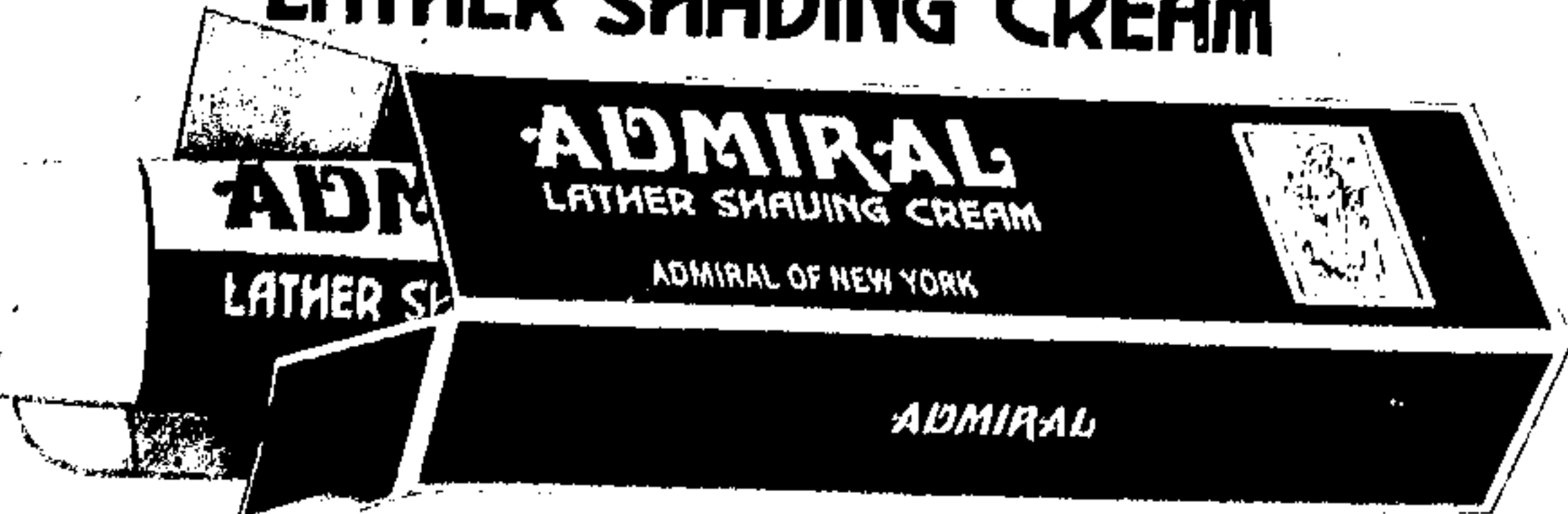
ارباب طریقت کا قول ہے کہ دُنیا میں صرف تین اہلِ اللہ ہوئے ہیں۔ شام میں عبداللہ جلاؒ، نیشاپور میں ابوعثمانؒ، اور بغداد میں ..... جنید بغدادیؒ۔

بغداد کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے جو بغرضِ تجارت ایرانی صُوبہ جبال کے ایک خوبصورت مگر سرد ترین شہر نہاوند سے ہجرت کر کے بغداد آن آباد ہوا تھا۔ اپنی محنت اور دیانت داری سے جہاں کاروبار وسیع کر لیا وہاں اس خاندان نے کاروبار میں ایمانداری کی وجہ سے پُورے بغداد میں ایک خاص شہرت بھی حاصل کر لی تھی۔ جنید بغدادیؒ کے والد قواریری (شیشہ گر) کہلاتے تھے اور بغداد کے امرا میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ نیک اور پرہیزگار انسان تھے۔ تجارت میں سنّتِ رسولؐ کا خیال رکھتے ہوئے دیانت داری کی مثالیں قائم کیں۔ ایک دن اپنی بیوی کے بھائی کو جو شیخ سقطیؒ کے نام سے بغداد میں مشہور بزرگِ کامل کے طور پر مشہور تھے۔ اپنے مال کی زکوٰۃ دینے گئے۔ شیخ سقطیؒ پیشے کے اعتبار سے مسالہ فروش تھے۔ اسی لیے اُن کے نام کے ساتھ سقطی لگا ہوا ہے۔ سقطی کے معنی ہیں مسالہ فروش۔ لیکن تجارت کی نسبت زیادہ وقت اور توجہ اپنے خالقِ حقیقی کی عبادت میں صرف کرتے۔ سو معاشی حالات اکثر خراب رہتے۔ خاندان بھر میں صرف وہی تھے جو تجارت سے مُنہ موڑے اللہ سے لَو لگائے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہی وجوہات کے پیشِ نظر جنید بغدادیؒ کے والد جب اپنے مال پر عائد زکوٰۃ لے کر اُن کے پاس گئے تو اُنھوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ شیخ سقطیؒ کا انکار جنید بغدادی کے دِل پر تازیانہ بن کے لگا۔ دِل غم سے بوجھل ہو گیا۔ سوچ میں پڑھ گئے کہ کیا واقعی انھوں نے عمر بھر ایمان داری سے جو تجارت کی اور جائز منافع کمایا وہ اس حد تک نامُراد ہے کہ اللہ کے نیک بندے اُس کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں بلکہ صاف انکار کر دیتے ہیں۔ سوچتے سوچتے دِل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ جنید بغدادیؒ اُن دِنوں دو سال کے معصوم سے بچّے تھے۔ باپ سے بے پناہ پیار تھا۔ اَب جو والد کو یوں آنسو بہاتے دیکھا تو ضبط نہ کر سکے دوڑ کر باپ کے گلے جا لگے اور معصومیت سے پُوچھنے لگے۔ "بابا جان! کیا ہوا؟ کیوں آنسو بہا رہے ہیں آپ؟" باپ نے بیٹے کو دیکھ کر چہرے پر پھیکی سی مُسکراہٹ سجائی اور آنکھوں سے آنسو پُونچھتے ہوئے بولے۔ "جانِ پدر! تم نہ سمجھ سکو گے۔ تم بہت کمسن ہو۔ تم اپنے بابا کا درد نہ جان سکو گے۔" لیکن جنید بغدادیؒ نے اپنا اصرار جاری رکھا اور جب باپ نے محسوس کیا کہ یہ ننھا سا معصوم بیٹا جب تک وجہ

نہ جان لے گا پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں تو مجبوراً بتانے لگے کہ کس طرح آج وہ زکوٰۃ کا مال لے کر اُس کے ماموں کے پاس گئے تھے لیکن اُس نے صاف اِنکار کر دیا۔ گویا عُمر بھر جو مَیں اس بات پر نازاں رہا کہ مَیں اللہ اور رسولؐ کے فرمان کے مطابق حق حلال کی کمائی کما رہا ہوں، وہ اس قدر مشتبہ ہے کہ خدا کے نیک بندے اُس سے دُور رہنا پسند کرتے ہیں۔

باپ کی بات سُن کر جنید بغدادیؒ نے شگفتگی سے کہا "بس بابا جان ..... اتنی سی بات کے لیے آپ یوں رو رہے تھے۔ لائیں مجھے دیں زکوٰۃ کا وہ مال مَیں خود ماموں کے پاس لے جاتا ہوں۔" باپ نے بیٹے کے چہرے پر جو معصومیت میں لپٹی عزم کی یہ کیفیت دیکھی تو دل میں بیٹے کا پیار اُمڈ آیا اور چاہت بھرے لہجے میں بولے۔ "کیوں نہیں میرے بچّے ..... اگر تیرے ہاتھوں سے ماموں زکوٰۃ کا مال لے لیتا ہے تو اس سے بڑھ کر اور بات کیا ہوگی۔ میرے دل کو بھی قرار آ جائے گا۔" چنانچہ انھوں نے زکوٰۃ کا مال دے کر بیٹے کو شیخ سقطیؒ کے گھر کی طرف بھیج دیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے ماموں کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے شیخ سقطیؒ خود ہی باہر نکلے۔ باہر بھانجے کو کھڑا دیکھا تو فرطِ مسرت سے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پُوچھا۔ "جنید میرے بچّے آج تُو کیسے آ گیا ہے؟"

جنیدؒ نے سنجیدگی سے کہا "ماموں آپ نے بابا کو جو زکوٰۃ کا مال لوٹا دیا تھا وہ مَیں آپ کو دوبارہ دینے آیا ہوں۔" یہ سُن کر شیخ سقطیؒ کے چہرے پر درشتی کے آثار اُبھر آئے اور ذرا تلخی سے کہا۔ "جب مَیں ایک مرتبہ انکار کر چکا ہوں تو پھر تمہارے بابا نے تمہیں دوبارہ کیوں بھیجا ہے میرے پاس؟" جنیدؒ نے ماموں کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ "ماموں اسے آپ کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ خدا کے نام پر۔ اُس خدا کے نام پر جس نے آپ کو اپنے فضل سے نواز رکھا ہے اور میرے باپ سے عدل رکھا ہے۔"

شیخ سقطیؒ معصوم بھانجے کی زبان سے یہ بات سُن کر حیرت زدہ رہ گئے۔ انھیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ ننھی سی جان انھیں یہ سب سمجھا رہی ہے۔ پھر دِل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں باپ نے تو پڑھا کر نہیں بھیجا۔ سو یہ جاننے کے لیے انھوں نے جنیدؒ کو پیار سے گود میں بٹھاتے ہوئے پُوچھا۔ "جنید میرے بچّے ذرا مجھے سمجھا نا تو کہ خدا نے کس طرح مجھ پر اپنا فضل کر رکھا ہے اور تمہارے بابا پر عدل۔"

جنیدؒ نے یہ سُن کر ماموں کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ کہنے لگے۔ "ماموں! اللہ نے آپ کو پرہیز گار اور متقی بنا کر درویشی عنایت کی۔ یہ آپ پر خدا کا فضل ہی ہے جب کہ اُسی خدا نے میرے بابا کو دُنیاوی کاروبار میں اس قدر عرُوج عطا کیا کہ آج وہ اپنے مال پر خدا کے نام پر زکوٰۃ دیتے ہیں اور یہ اللہ کا عدل ہے۔ میرا باپ زکوٰۃ کا یہ مال حق داروں تک خُدا کے نام پر پہنچاتا ہے اب آگے حق داروں کی مرضی وہ اسے قبول کریں یا نہ کریں لیکن میرا بابا اپنا حق ادا کرتا رہے گا۔"

یہ سُن کر شیخ سقطیؒ کے چہرے پر حیرت و مسرّت کے تاثرات پیدا ہو گئے۔ بے خود ہو کر بھانجے کو آغوش میں بھر لیا بولے۔ "زکوٰۃ کا مال وصول کرنے سے پہلے میں کیوں نہ تمہیں اپنی ملکیت میں لے لوں۔"

اس طرح جنید بغدادیؒ بغداد کے ایک مشہور صوفی شیخ سقطیؒ کے زیرِ تربیت آ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد جنید کے والد انتقال ہو گیا تو شیخ سقطیؒ نے اُسے مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لیا۔ شیخ سقطیؒ ایک بزرگ کامل صوفی تھے اور صوفیا کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کے سربراہ حسن بصری تھے۔ حسن بصری کہا کرتے تھے۔ "اصل نیکی وہ ہے جو روح کی نیکی کہلائے۔ سچی کا صرف ایک دانہ ہزارہا نمازوں اور روزوں سے افضل ہے۔"

شیخ سقطیؒ وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے توحید کا پیغام تصوّف کے ذریعے عام کیا۔ آپ زہد و عبادت، بلندیٔ فکر اور توحید میں یکتا تھے۔ اپنے عہد کے جید ترین صُوفی تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ذہین بھانجے جنید کی تعلیم و تربیت میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ جنید کی روحانی تربیت آپ نے پُورے جوش و خروش سے سرانجام دی اور اُسے علماء اور اولیاء کی معیت

لے جاتے۔ علمی مباحثوں میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے۔ غرض جی جان سے بھانجے کی علمی و روحانی تعلیم کے لیے ہر لحہ خلوصِ دِل سے کوشاں رہے۔

جنید بغدادیؒ بچپن میں ہی غور و فکر کے عادی ہو چکے تھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ آپ اپنے ماموں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے اور پھر اچانک دورانِ گفتگو ہی ایکدم خاموشی اختیار کر لیتے۔ جب آپ کی یہ خاموشی طویل ہو جاتی تو آپ کے مُرشد تو مُرید کی حالت سے بخوبی واقف تھے اُسے تنہا چھوڑ کر باہر نکل جاتے۔ شیخ سقطیؒ کی تربیت میں رہ کر آپ علوم ظاہری و باطنی سے خوب فیض یاب ہوئے۔

آہستہ آہستہ آپ اپنی تعلیم مکمل کرتے جا رہے تھے لیکن آپ نے یہ مصمم ارادہ کر لیا تھا خواہ کچھ ہو جائے وہ اُس وقت تک مسندِ وعظ و ارشاد نہ سنبھالیں گے جب تک اُن کے ماموں مُرشد شیخ سقطیؒ حیات ہیں۔ یہ آپ کی سعادت مندی ہی تھی کہ اپنے مُرشد کے ہوتے ہوئے خود مسندِ ارشاد و عظ پر بیٹھتے۔ ایک مرتبہ شیخ سقطیؒ سے کسی نے مجلس میں سوال کیا کہ "حضرت کیا ایک مُرید کا رُتبہ اپنے روحانی مُرشد سے بھی بلند ہو سکتا ہے۔" تو شیخ سقطیؒ نے جواب دیا "ہاں .... کیوں نہیں .... مثلاً جنید کا رُتبہ مجھ سے بھی بلند ہے۔" جب کسی مُرشد کی اپنے مُرید کے بارے میں یہ رائے ہو تو اس مُرید کی علمیت و قابلیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن جنید بغدادیؒ ہرگز مُرشد کے ہوتے ہوئے مُرشد کا کام سنبھالنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ شیخ سقطیؒ انھیں بار بار ہدایت کرتے کہ وہ اب عام لوگوں میں جائیں۔ رُشد و ہدایت کی تعلیم دیں اور عام لوگوں کو صراطِ مستقیم سے آگاہ کریں لیکن جنید بغدادی ہر بار خاموش ہو جاتے۔ ادب کی وجہ سے مُرشد سے کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے اور خاموش رہنا بھی بے ادبی خیال کرتے۔ اسی کشمکش و پنج میں شب و روز کٹ رہے تھے کہ ایک دن اچانک جنید بغدادیؒ نے خواب میں دیکھا کہ خاتم النبیین محمدؐ بنفسِ نفیس تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ "جنید تجھے خدا نے خلق کی نجات کے لیے چُنا ہے اُٹھ سُستی نہ کر۔ تیری زبان ہی خلق کے لیے راہ نجات ہے۔"

نیند سے بیدار ہو کر جنید بغدادیؒ نے خواب کو یاد کیا تو مسرت و انبساط سے سرشار ہو گئے انھیں اپنی قسمت پر ناز تھا کہ وہ سرکارِ دو عالمؐ کی دید کا نظارہ کر چکے ہیں ساتھ ہی یہ احساسِ فخر بھی دِل میں پیدا ہوا کہ حضورؐ نے انھیں شرفِ دید سے نوازا ہے۔ جب کہ اُن کے مُرشد اس سے محروم رہے ہیں۔ گویا مُرشد کی موجودگی میں مُرید کو شرفِ دید سے نوازنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب مُرشد اور مُرید کے درمیان حدِ ادب ختم ہو چکی ہے۔ ابھی وہ خوشی کے عالم میں یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے شیخ سقطیؒ کا ایک شاگرد کھڑا تھا۔ آپ نے احترام سے اُسے اندر آنے کے لیے جگہ دی لیکن اُس نے جواب دیا "حضرت میں اس وقت آپ کے لیے شیخ سقطیؒ کا پیغام لایا ہوں۔ آپ براہ مہربانی اُسے سُن لیں اور مجھے جانے کی اجازت دیں۔" آپ نے اثبات میں سر ہلایا تو شاگرد بولا "شیخ نے فرمایا ہے کہ جا کر جنید سے کہنا اب وہ میری بات غور سے سُنے۔ جب تمھیں ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ وعظ و نصیحت کا کام سنبھالے تو تم نے انکار کیا۔ بغداد کے شیوخ نے خواہش کا اظہار کیا لیکن تم پھر بھی انکاری رہے۔ حتیٰ کہ میں نے تمھیں اس کے لیے کہا لیکن تم نے میرا بھی کہنا نہ مانا اور ہمیشہ وعظ و نصیحت عام کرنے سے پہلو بچاتے رہے۔ اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا تھی لیکن میرے بچے اب کی مرتبہ تمھیں حضورِ عالمؐ نے حکم دیا ہے اور دیکھے حضورؐ کا کہا اس طرح مان کہ ہر کام پر آپؐ کے حکم کو ترجیح دے۔"

یہ سُن کر حضرت جنید بغدادیؒ کا سر شرم سے جُھک گیا۔ شاگرد کو رخصت کر کے واپس حجرے میں آن بیٹھے اور دل ہی دل میں نادم ہوتے رہے کہ وہ شیخ کے بارے میں کیا کیا سوچتے رہے۔ اپنی نادانی و غفلت پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ شیخ سقطیؒ کی عرفان کی بلندی سے آگاہ تک نہ ہوئے۔ جنھیں باطنی علوم کا ملکہ حاصل تھا چنانچہ شرمندہ شرمندہ سے نادم ہوتے حضرت شیخ سقطیؒ کے پاس گئے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ابھی آپ اپنی شرمندگی کے اظہار کے لیے الفاظ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ شیخ سقطیؒ ہونٹوں پر تبسم سجائے آپ سے مخاطب ہوئے۔ "میرے بچے! تجھے نادم ہونے کی ضرورت نہیں مجھے سب علم ہے۔ یاد رکھ جب روحانیت کے سفر کا آغاز ہوتا

ہے تو شیطان راہ میں طرح طرح کے جال بچھاتا ہے۔ یہ اللہ کا ہی احسان ہے کہ وہ جسے چاہے شیطان کے شر سے محفوظ کر لیتا ہے اور میری اپنے پروردگار سے دُعا ہے کہ وہ تمہیں ہر موڑ پر شیطان مُوذی کے شر سے محفوظ رکھے۔

اَب جنید بغدادیؒ نے وعظ و نصیحت کی مسند سنبھال لی تھی اور ان کی شہرت دن دونی رات چوگنی پھیلتی جا رہی تھی۔ چونکہ آپ کا بچپن شیخ سقطیؒ کے ہاں ہی گزرا تھا جہاں ہر وقت اولیا اللہ کا ہجوم رہتا تھا۔ چنانچہ جنیدؒ کو ان صُوفیا اور بزرگانِ دین سے ملاقات کے مواقع ملتے رہے اور آپ ان صُوفیا کی تعلیمات کو ذہن میں بٹھاتے گئے۔

ایک مرتبہ بچپن میں جب جنید بغدادی کی عمر صرف سات آٹھ سال تھی آپ شیخ سقطیؒ کے ساتھ حج پر تشریف لے گئے۔ حج کے عرصہ میں آپ شیخ سقطیؒ کے ساتھ مختلف مجالس میں بھی شرکت کرتے رہے۔ ایک دن آپ اپنے مُرشد کے ساتھ حرم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے چار صُوفیا کرام کو شُکر کے موضوع پر بحث میں مصروف پایا۔ آپ غور سے ہر صُوفی کے خیالات سُنتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ سبھی نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت شیخ سقطیؒ بھی بغور بھانجے پر نظر رکھے اُسے تک رہے تھے اور ساتھ ساتھ صُوفیا کی باتوں کو بھی سنتے جا رہے تھے۔ اس لیے جونہی وہ چاروں صوفیا جنہوں نے شُکر کے مسئلے پر اپنے اپنے خیالات پیش کئے تھے خاموش ہوئے تو شیخ سقطیؒ نے اپنے بھانجے جنیدؒ کو حکم دیا کہ تم بھی شُکر کے مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر بیان کرو۔ سبھی بزرگوں کی نظریں آپ پر جم گئیں اور سات آٹھ سالہ اس معصوم بچّے کو حیرت سے دیکھنے لگے جس کے سرپرست نے اُسے علمائے دین کے سامنے اپنا نظریہ پیش کرنے کے لیے کہا تھا۔ حضرت جنید بغدادی نے سر جُھکایا اور کہنا شروع کیا۔" بزرگو! میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں کہ میں شُکر پر اظہارِ خیال پیش کر سکوں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جب ہمیں ہمارا واحد پروردگار کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو ہم اُسے اپنے اللہ کی نعمت سمجھ کر اُس کا شُکر ادا کریں۔ کیونکہ وہی نعمتوں سے نوازنے والا ہے۔ وہی ہر نعمت کا منبع ہے۔ پس ہمیں اُسی کے احکام کی تعمیل میں خود کو وقف کر دینا چاہیے۔" مجلس میں موجود صُوفیا نے ایک معصوم بچّے کے مُنہ سے جب اس قدر واضح شُکر کی تشریح سُنی تو بُلند آواز میں پکار اُٹھے۔" بے شک یہ مفہوم برحق ہے شُکر کا۔ خدا کا شُکر ہے کہ اُس نے ہمیں ایک بچّے سے شُکر کی رمز سے آگاہ کرایا۔"

اسی طرح ایک مرتبہ ایک نوجوان حضرت شیخ سقطیؒ کے حضور حاضر ہوا اور رو رو کر کہنے لگا۔" حضرت مجھ سے ایک گناہِ عظیم ہو گیا ہے۔ اب کسی پل چین نہیں۔ خدا کے حضور معافی مانگتا ہوں، گڑگڑاتا ہوں لیکن دِل مطمئن نہیں۔ نجانے میری توبہ قبول بھی ہوئی گی کہ نہیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ مجھے توبہ کی حقیقت سے آگاہ کریں۔" شیخ سقطیؒ نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا" نوجوان! توبہ کا مطلب یہ تو نہیں کہ تُو اپنا گناہ ہی بھول جائے۔" یہ سُن کر نوجوان بیچارگی سے مزید رونے لگا اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُٹھا کر شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا" گویا میں گناہ کر کے ایک دلدل میں اُتر گیا ہوں۔ میرا نکلنا دُشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا میرا مقدّر بن چکا ہے۔" یہ کہہ کر پھر رونے لگا۔ شیخ سقطیؒ اُسے خاموشی سے دیکھتے جا رہے تھے۔ نوجوان نے آنسوؤں بھرا چہرہ اُٹھا کر دوبارہ لرزتی ہوئی آواز میں شیخ سے پُوچھا" شیخ! لیکن میں نے تو توبہ کا مطلب یہ سُنا ہے کہ آدمی اپنا گناہ بھلا دے۔ کیا یہ درست نہیں؟"

حضرت سقطیؒ کے ساتھ نوجوان کی اس بحث کے دوران جنید بغدادیؒ بھی تشریف فرما تھے۔ آپ اُن دِنوں زیرِ تربیت تھے۔ آپ بھی مسلسل توجہ سے نوجوان اور شیخ سقطیؒ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سُن رہے تھے۔ اس لیے جونہی نوجوان نے یہ پوچھا اس سے پہلے کہ شیخ سقطیؒ جواب دیتے آپ بول پڑے۔" نوجوان! تُو نے سچ ہی سُنا ہے۔ توبہ کا مطلب یہی ہے کہ انسان گناہ بھلا دے۔"

آپ کی یہ بات سُن کر حضرت سقطیؒ نے غصّے کے عالم میں جنید پر نظر ڈالی۔ جنید بغدادیؒ نے آپ کی نظروں کا مفہوم سمجھا اور سوچ سمجھ کر ادب سے بولے" مُرشد! میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بات برحق ہے کہ اگر ایک انسان کے اللہ سے تعلق خراب ہو جائے پھر وہ انسان توبہ و استغفار کے ذریعے اپنے پروردگار کو منا لے اور دِل میں مطمئن ہو جائے تو اس کا مطلب ہوا کہ تعلق دوبارہ استوار

سے استوار ہو گیا ہے۔ سو ایسے میں پرانے حالات بھلا دینا ہی بہتر ہوتا ہے اور اسی طرح اپنی پہلی حالت کا خیال دل میں لانا اچھا نہ ہو گا۔"

شیخ سقطیؒ نے آپ کی وضاحت سُنی تو سر جھکا کر اعتراف کر لیا اور کہا "جنید میرے بیٹے تم نے سچ کہا۔ میں واقعی غلطی پر تھا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کو شیخ سقطیؒ کے مکان پر جن بزرگانِ دین سے فیض یاب ہونے کا موقعہ ملا اُن میں ایک ابو عبداللہ الحارث ابن اسدالمحاسبی بھی تھے۔ محاسبی حضرت سقطیؒ کے گہرے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ محاسبی عرفان کی اُس بلندی پر تھے کہ حضرت سقطیؒ فرمایا کرتے تھے کہ "جب میری نظریں عرش تک پہنچتی ہیں تو میں اُس کی بلندی دیکھ کر تب بھی اندازہ نہیں لگا پاتا کہ محاسبی کس بلندی پر ہے۔" محاسبی جب بھی حضرت سقطیؒ کے گھر آتے تو جنید بغدادیؒ کے پیچھے پڑ جاتے اور ہر ممکن ترغیب دلانے کی کوشش میں رہتے کہ کسی طرح وہ بھی اُن کے ساتھ گھومنے پھرنے باہر نکلا کریں مگر جنیدؒ ہر مرتبہ انھیں ٹال دیتے اور یہ کہہ کر دامن بچا لیتے کہ "حضرت مجھے گوشہ نشینی میں ہی لذّت کا وہ احساس ہوتا ہے جو باہر نکل کر نہیں ہوتا۔" چنانچہ اس کے بعد محاسبی نے انھیں کبھی اس سلسلے میں مجبور نہ کیا۔ جنیدؒ نے انھیں اپنی روحانی تربیت کا مرکز بنا لیا۔ محاسبی کہا کرتے تھے کہ روح کی حفاظت کرو یہاں تک کہ اُسے آہستہ آہستہ اخلاقی پاکیزگی کے اُس معیار پر لے جاؤ جہاں خدا کی ذات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ اُن کے ایک دوست امیر حمزہ بغدادی محاسبی کے گھر آئے۔ محاسبی نے ایک پرندہ پال رکھا تھا جو اپنی سُریلی آواز میں گانے لگتا تھا۔ امیر حمزہ جو محاسبی کے گھر آن کر بیٹھے تو پرندہ حسبِ معمول ایک اجنبی کو دیکھ کر خوش الحانی سے گانے لگا۔ پرندے کی سریلی آواز حمزہ کے دل کو اس حد تک بھائی کہ وہ پکار اُٹھے۔ "واللہ یہ تو خدا ہے۔" محاسبی نے جو یہ سُنا تو غصّے سے کھول اُٹھے اور سخت طیش کے عالم میں خنجر لے کر امیر حمزہ کے پیچھے دوڑے۔ ساتھ ساتھ کہتے بھی جا رہے تھے کہ "حمزہ اگر تُو نے اپنے الفاظ واپس نہ لیے تو آج مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

حمزہ نے یہ سُن کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا: "حضرت اگرچہ میرے عقائد و نظریات اتنے ضعیف نہیں ہیں لیکن پھر بھی میری بات بدعقیدہ لوگوں کی مانند بن گئی جس کے لیے میں شرمسار ہوں اور اپنے کہے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

یہ سُن کر محاسبی نرم پڑ گئے اور کہا: "خدا کی قسم حمزہ بے شک تُو عقائد میں پختہ ہے اور مجھے اس پر یقین ہے لیکن تُو نے بات ہی ایسی کی کہ میں ضبط نہ کر سکا۔ مجھے ایسے لوگوں سے اور اُن کے نظریات سے سخت چڑ ہے جو اس لغو بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا پرندوں کے جسم میں حلول کر جاتا ہے۔ میں اُن احمقوں سے پوچھتا ہوں اگر ایک معمولی پرندہ عام سے سُر میں کوئی آواز نکال لیتا ہے تو اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی آواز نکل رہی ہے۔ نادانو! خدا تو ناقابلِ تسخیر قوت ہے وہ بھلا کیوں مجسّم ہو گا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کے شب و روز خالقِ حقیقی کی عبادت میں بسر ہوتے۔ آپ تزکیۂ نفس کے بعد سخت ترین مجاہدے کرتے اور ریاضتوں میں وقت صرف کرتے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے پورے تیس سال ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر عشاء کے بعد رات بھر اللہ اللہ کا ورد کرتے۔ آپ کی نگاہوں میں وہ تاثیر تھی کہ جس پر نظر ڈالتے اُس کی کایا ہی پلٹ جاتی۔ آپ کی نظریں جس پر پڑتیں وہ سخت گھائل ہو جاتا۔ جب حضورِ مقبول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے آپ کو خواب میں رُشد و ہدایت کرنے کی ہدایت کی تو آپ کے پہلے ہی وعظ میں لوگ آپ کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہوئے اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں گھروں کو پہنچائے گئے۔ آپ کی نگاہوں میں ایک عجب تاثیر تھی۔ اس لیے آپ ہر ممکن احتیاط برتا کرتے تھے۔

جنید بغدادیؒ نے علمِ کلام سے ہمیشہ خود کو بچائے رکھا۔ آپ خدا کو روحانی سوز اور اشک آلود آنکھوں سے تلاش کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ گویا آپ سقطیؒ، بایزید بسطامی اور ذوالنون مصری سے تعلّق رکھنے والے صوفی تھے۔ جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ خدا کی تلاش میں عقل روح کی راہنمائی کرے یہ مناسب نہیں۔ جنید بغدادیؒ ہی وہ شیخ ہیں جن کے ہاں ہمیں وحدت الوجود کا نظریہ واضح انداز میں ملتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے اس فلسفۂ توحید کو تیسری ہجری کے بغدادی علماء کفر کے مترادف قرار دیتے تھے اور ہر ممکن اس

کوشش میں رہتے کہ کسی طرح آپ کو نقصان پہنچائیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے خلیفہ بغداد کی مدد چاہی۔ خلیفہ آپ سے خوفزدہ تھا اس لیے علماء کی خواہش کے مطابق براہ راست آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک انتہائی لغو اور بے ہودہ طریقہ سوچا اور اُس وقت کے علماء سے اس کی تائید میں بیان لیا۔ چنانچہ ایک دن جب جنید بغدادیؒ عبادت میں مشغول تھے اور گڑگڑا کر اللہ سے اُس کی رحمتوں کے طلبگار تھے: آپ اپنی عبادت میں اس حد تک محو تھے کہ ایک اجنبی حسین لڑکی کو کمرے میں داخل ہوتا نہ دیکھ سکے۔ وہ لڑکی جو آپ کو عبادت میں اس طرح محو دیکھ کر آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ آپ کی عبادت کے دوران ہی آپ کو مخاطب کر بیٹھی اور کہنے لگی۔

"اے خوبرو نوجوان! میں بڑی دیر سے کھڑی تجھے خدا کی حمد و ثنا میں مصروف دیکھ رہی ہوں۔ تو میری طرف بھی ایک نگاہ ڈال۔ میں بھی خدا ہی کی تیار کردہ جمال کا ایک سراپا ہوں۔"

حضرت جنیدؒ جو عبادت میں محو تھے چونک کر پلٹے اور نگاہ اُٹھائی تو سامنے ایک زر و جواہر سے آراستہ انیس بیس سالہ شعلۂ جوالہ، آتشیں پرکالہ، غیرتِ ناہید و رشکِ حور، مخمور و مسحور دلکش لڑکی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ کھڑی آنکھوں میں سپردگی کی چمک لیے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

حضرت جنیدؒ بغدادی نے اُسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر نرمی سے بولے۔ "عزیزہ! بے شک کائنات کی ہر چیز میں میرے اللہ کا جمال اور اُس کی رحمت کا پَرتو ہے لیکن میں ایک درویش منش ہوں، فقیر۔ دُنیا کو چھوڑ چکا ہوں۔ تم جس چیز کی طالب ہو وہ تمہیں یہاں کہاں میسر آ سکتی ہے؟ تم دیکھ رہی ہو یہاں صرف خدا کے سوا اور کچھ نہیں۔"

لڑکی نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر بے تکلفی سے آپ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا: "نوجوان! تیرا یہ کہنا سچ ہے کہ یہاں خدا کے سوا کوئی نہیں تو پھر میں خدا سے مانگتی ہوں۔ خدا کی بارگاہ سے تو آج تک کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔"

حضرت جنید بغدادیؒ نے بڑی مشکل سے اُس لڑکی کی دیدہ دلیری برداشت کی اور پھر نرمی سے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اس وقت تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے خالی ہاتھ لوٹ جاؤ۔" لیکن اُس حسینہ پر ان باتوں کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور آپ کے نزدیک ہوتے ہوتے بولی "نوجوان میں تو گوہرِ مراد حاصل کیے بغیر نہ جاؤں گی۔"

اب کے حضرت جنید بغدادیؒ نے صاف صاف بات کرتے ہوئے کہا۔ "امیر المومنین کی کنیزِ خاص! کیا تو مجھے بے خبر سمجھتی ہے۔ تو اور تیرا خلیفہ خدا کو بے خبر جانتے ہیں۔ جو اپنے نیک بندوں کو یوں بُرائی میں دھکیل دے گا۔ میرا خدا تمہاری اور خلیفہ کے درمیان ہونے والی وہ سرگوشیاں بھی سُن چکا ہے جو تم نے مجھ سے غیر شرعی فعل کروانے کی خاطر کی تھیں۔ تم اور تمہارا امیر المومنین مجھ سے غیر شرعی فعل کروا کر میرا سر ہی کاٹنا چاہتے ہیں ناں لیکن جان لو کہ خدا ہی سب سے بڑا محافظ ہے اور میں اُس کی حفاظت میں ہوں۔"

یہ کہہ کر آپ نے جونہی لڑکی کی طرف نگاہ ڈالی وہ حسین و جمیل دوشیزہ فوراً ہی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔

اُدھر خلیفہ کو جو اپنے منصوبے کی ناکامی کا علم ہوا تو سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ ساتھ ہی جب اُس نے اپنی چہیتی اور حسین کنیز کا انجام سُنا تو دُکھ کے مارے آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور دوڑا دوڑا جنید بغدادیؒ کے پاس گیا اور شاکی لہجے میں کہنے لگا۔ "تم نے اپنی ریاضت کے جوش میں آکر میری کنیز کو راکھ میں بدل دیا۔ کیا یہ اچھا کیا تم نے؟"

یہ سُن کر جنید بغدادیؒ بولے۔ "خلیفہ اللہ کی رضا اسی میں تھی۔ جسے وہ بچانا چاہتا ہے وہ ہر صورت بچا لیتا ہے اور جو اللہ کی گرفت میں آنے والا ہو وہ بھلا کہاں بچ پاتا ہے۔"

خلیفہ یہ سُن کر بدستور درشتی اور شکایتی انداز میں بولا۔ "ابوالقاسم تو یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ جس خدا کی تو بات کر رہا ہے وہ غفور الرحیم ہے، رحم کرنے والا ہے، معاف کر دینے والا۔"

یہ سُن کر آپ بولے۔ "خلیفہ یہ میرا رحم ہی ہے کہ میں نگاہیں نیچی کیے تم جیسے ظالم شخص سے مخاطب ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں

ٹا کر تمہارے ان فضول سوالوں کے جواب دوں کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم اپنے ظالم کدے میں دوبارہ لوٹ جاؤ جو ابھی تک راکھ کا
ڈھیر ہونے سے بچا ہوا ہے۔"

خلیفہ یہ سُن کر کانپ گیا اور لرزتے قدموں سے واپس لوٹنے لگا۔ اُس کے مُڑتے ہی آپ نے اُس سے کہا" اور خلیفہ تم اور
ہمارے گمراہ علماء یہ اچھی طرح جان لیں کہ جب تک میں خدا کی حفاظت میں ہوں مجھے تم لوگ شریعت کی آڑ میں لے کر ہرگز سُولی
نہیں لٹکا سکتے۔ تم لوگ یہ بھول گئے ہو کہ میں جو بات کرتا ہوں وہ ہرگز میں خود سے نہیں کرتا۔ بھلا ایک ایسا بندہ جس کے ایک
ہاتھ میں شریعت اور دوسرے میں توحید ہو وہ بھلا خود سے کیا کہے گا۔ نادانوں میں تو وہ کہتا ہوں جو خدا کہلواتا ہے۔ لیکن میری
باتیں نہ تمہیں سمجھ آئیں گی نہ تمہارے عالموں کو۔ میری باتیں صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو شریعت کو بھی سمجھتے ہیں اور خدا کو بھی۔"
خلیفہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواباً کہے تو کیا کہے سو خاموشی سے پلٹ گیا۔ اُس میں بہرحال اتنی عقل تو تھی ہی کہ زندگی سے بیزاری
کا شوق نہ رکھتا تھا۔

شیخ سقطیؒ کا اصل موضوع توحید تھا۔ مُرشد کے خیالات سے حضرت جنیدؒ اتفاق کرتے تھے اور اسی نظریۂ توحید پر مکمل ایمان
رکھتے تھے جو شیخ سقطیؒ نے بتایا تھا۔ توحید کا یہ تصور شیخ سقطیؒ کو شیخ معروف کرخی سے حاصل ہوا تھا۔ جن سے ایک دن اُن کے
دوست نے پُوچھا" حضرت آپ کو دُنیاوی آسائشوں کو ترک کر کے عبادت کی طرف کس چیز نے مائل کیا؟ آخر دُنیاوی مشاغل ترک
کرنے پر کس چیز نے آپ کو اس حد تک آمادہ کیا کہ آپ بالکل ہی تارک الدُنیا ہو گئے ہیں؟" شیخ معروف کرخی دوست کی یہ بات
سُن کر خاموش رہے اور جواباً کچھ نہ کہا۔ تب دوست نے خود ہی اندازے قائم کرتے ہوئے پُوچھا" کیا میں اس کی وجہ موت کا خوف
تصور کروں؟"

معروف نے کہا" موت! ہونہہ موت کی کیا حقیقت ہے بھلا؟"
دوست نے سُن کر دوبارہ پُوچھا" پھر تو قبر کا خیال ہی آپ کو متاثر کر سکا ہو گا۔" اب کی بار معروف کرخی نے حیرت سے کہا۔
"قبر سے تمہاری کیا مُراد ہے؟" اب کی بار دوست نے سر ہلاتے ہوئے کہا" میں سمجھ گیا کہ تارک الدُنیا ہونے اور عبادت گزار
بننے کا خیال آپ کو صرف جنت کی خواہش اور جہنم سے بچاؤ کی خاطر ہوا۔"
معروف کرخی نے یہ سُن کر کہا" میرے دوست اچھی طرح جان لے کہ ہر بات خدا کے اختیار میں ہے۔ جب ہم اُن سے محبت
کریں، دِل میں صرف اللہ کو ہی بسا لیں، اُسی سے لو لگائیں، ہر دم اُسی کا ذکر کریں تو وہ پروردگار اپنے بندے کے دِل سے ان
سب کا خوف نکال دیتا ہے جسے تم جہنم جنت کے نام سے پُکارتے ہو۔ میں تو خدا کی عبادت صرف اور صرف اُس کی محبت کے لیے
کرتا ہوں۔ میرے دِل میں نہ جنت کی خواہش ہے نہ جہنم کا ڈر، یہ خدا کی چاہت ہے جو مجھے اُس کی طرف عبادت کے لیے مائل کیے
ہوئے ہے۔"

اور بھی وہ باتیں تھیں جنہیں بغدادی علماء نے شریعت کے منافی قرار دے رکھا تھا اور سقطیؒ اور جنیدؒ کو کفر کی حدود میں
داخل کر چکے تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ پر جن شخصیتوں نے گہرے نقش چھوڑے اُن میں ایک ابوجعفر الکرینی البغدادی بھی شامل تھے۔ آپ کی
علمیت اور قابلیت کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ حضرت جنید فرماتے ہیں کہ اُن کی وفات کے وقت میں اُن کے سرہانے بیٹھا آسمان
کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شیخ نے مسکرا کر کہا" جنید! بہت دُور دیکھ رہا ہے کس کی تلاش ہے تجھے؟" میں نے یہ سنتے ہی نگاہیں
جھکا لیں۔

شیخ نے دوبارہ کہا" بیٹے اب بھی تم بہت دُور دیکھ رہے ہو۔ میرے بچے کیا تُو ابھی تک نہیں جان سکا کہ خدا اپنے بندوں کے
بہت قریب ہے۔ اُس کی طرف توجہ کرنے کے لیے نہ تو اُوپر دیکھنے کی ضرورت ہے نہ نیچے گہرائی میں۔ خدا ہماری شہ رگ سے بھی

زیادہ نزدیک ہے۔"

ایک مرتبہ جنید بغدادیؒ اپنے حجرے میں مخصوص مُریدوں کو توحید کے موضوع پر درس دے رہے تھے۔ اب یہ آپ کا معمول ہی بن گیا تھا کہ جب سے لڑکی کے راکھ ہونے اور پہلی مجلس میں لوگوں کے جاں بحق ہونے کا واقعہ ہو چکا تھا آپ نے احتیاط کے طور پر صرف مخصوص شاگردوں میں ہی اُٹھنا بیٹھنا رکھا تھا، نہ سماع سنتے تھے نہ وجد کرتے تھے۔ چنانچہ اُس دن جب آپ بیٹھے مُریدوں کو توحید کا درس دے رہے تھے کہ ایک مُرید ضبط نہ کر سکا اور زور سے اللہ ہُو کا نعرہ بلند کیا۔ یہ سُن کر آپ نے سخت بیزاری کا اظہار کیا اور مُرید کو پاس بُلا کر ہدایت کی کہ آئندہ اس کم ظرفی کا مظاہرہ کرنے سے پہلے محفل سے اٹھ کر باہر نکل جائے تھوڑی دیر بعد آپ نے پھر وہیں سے سلسلہ شروع کیا جہاں سے مُرید کی دخل اندازی کے سبب سلسلہ ٹوٹا تھا۔

جوں جوں آپ درس دیتے جاتے اللہ ہو کا نعرہ لگانے والا مُرید بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ زبان پر قابو رکھنے کی بہت کوشش کرتا رہا مگر ضبط کا یارانہ نہ رہا اور پھر ایک دم کھڑے ہو کر اللہ ہُو اللہ ہُو پکارنے لگا۔ آپؒ کو اُس کی یہ دخل اندازی بہت بُری لگی اور دُکھ کے ساتھ مُریدوں سے کہا' کم ظرف لوگوں کو ایسی مجالس میں شرکت کرنا ہی نا چاہیے۔ مجھے افسوس ہوا اس نوجوان کی حرکت پر۔' یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے نوجوان پر نظر ڈالی تو وہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

ابوالحسین احمد بن محمد النوری یہ نام جنیدؒ کے دوستوں میں سرِفہرست ہے۔ نوری شیخ سقطیؒ کے بھی مُرید رہ چکے تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ اور نوری میں بڑی گہری دوستی تھی۔ ایک دن جنیدؒ نوری سے ملنے اُن کے حجرے میں گئے تو انھیں محسوس ہوا کہ جیسے حجرے میں روشنی کا سیلاب اُمڈ پڑا ہے۔ حیرت سے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ نوری اس حالت میں ہے کہ قرآن کی تلاوت میں محو ہے اور جسم سے روشنی اس قدر پھوٹ رہی ہے کہ پورا حجرہ منور ہو چکا ہے۔ آپ نے یہ منظر دیکھا تو خاموشی سے جا کر حجرے میں بیٹھ گئے۔ ابوالحسین جب تلاوت سے فارغ ہو کر مُڑے تو حضرت جنیدؒ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ حضرت جنیدؒ نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' احمد! اس تماشا کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں اس حال میں بیٹھا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی اور حجرے میں آجاتا تمہاری اس حالت کو دیکھ کر اُس کا کیا حال ہوتا۔"

ابوالحسین جن کے جسم سے ابھی تک یہ شعاعیں پھوٹ رہی تھیں مسکرا کر بولے" تماشا! کیسا تماشا جنید' بھلا چاند کی روشنی دیکھ کر کسی نے یہ کہا کہ چاند یہ کیا تماشا دکھا رہا ہے؟ کیا چاند کو یہ اختیار ہے کہ وہ طلوع ہو یا نہ ہو؟ میرا دل جب بھی میرے پر طلوع ہوتا ہے میں روشن ہو جاتا ہوں۔ جس طرح سورج چاند کو طلوع ہونے پر کوئی اختیار نہیں اسی طرح مجھے بھی اس ئی اختیار نہیں۔ یہ تو نور عطا کرنے والے کا کام ہے کہ اس بات کو جانے کہ آیا یہ تماشا ہے؟ کیا اُس نے یہ نہیں سوچا ہو گا جب لوگ اُسے تماشا کہیں گے تو اس تماشا دکھانے والے کو کیا کہیں گے۔"

یہ سُن کر حضرت جنیدؒ کی حالت غیر ہو گئی۔ ساری رات عبادت میں گزاری اور توبہ استغفار کرتے رہے۔ یہیں سے ابوال نوری کہلائے۔

جنید بغدادیؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے اخلاص کی تعلیم ایک حجام سے حاصل کی ہے۔ بچپن میں وہ اپنے مُرشد اور ماموں کے ساتھ مکہ حج کی خاطر گئے۔ مُرشد نے تلقین کر رکھی تھی کہ دیکھو خبردار جو روٹی کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ ایک دن جنید کہتے ہیں میرے بال بڑھے ہوئے تھے اور مجھے اُن سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں بازار نکلا دیکھا تو ایک حجام امیر آدمی بیٹھا بال بنوا رہا تھا۔ میں بھی حجام کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اُسے کہا' خدا کے نام پر میرے بال کاٹ دو۔" یہ سُن کر وہ حجام فوراً مڑا۔ امیر آدمی کی حجامت بنانا چھوڑ کر اُس نے مجھے عزت و احترام کے ساتھ یوں بٹھایا گویا میں اور امیر گاہک ہوں۔ پھر اُس نے بڑے سلیقے سے میرے بال کاٹے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے مجھے ایک کاغذ درہم لپیٹ کر دیئے اور کہا' یہ حقیر سا نذرانہ ہے قبول فرما کر عزت افزائی کریں۔" میں اُس حجام کے اس حسن سلوک سے بڑا

اور عہد کیا کہ جونہی مجھے کہیں سے کوئی مال ملے گا میں وہ اُس حجام کی نظر کروں گا۔ اتفاق ایک دن ایک بصرے کے شخص نے مجھے ایک تھیلی اشرفیوں کی دی۔ میں نے وہ تھیلی لی اور حجام کے پاس جاکر اُسے پیش کرتے ہوئے کہا: بھائی یہ تھیلی تمہارے اُس احسان کا نعم البدل تو نہیں ہوسکتی جو تم نے مجھ پر کیا تھا اگر تم اسے قبول کرلو گے تو مجھے دلی مسرت ہوگی۔"

یہ سن کر وہ حجام غصے میں بھڑک اُٹھا اور کہنے لگا "واہ میاں واہ! تم تو خدا کے نام پر تجارت کرنیوالے نکلے۔ میں نے اگر تمہاری کوئی خدمت کی تھی تو صرف خدا کی راہ میں۔ اب میں خدا کے نام پر کرنے والے کام کا معاوضہ لوں گا یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟"

جنید بغدادیؒ کے شاگردوں میں سے شبلی نامی شاگرد بہت مشہور ہوا وہ ایک زمانے میں حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز تھا۔ لیکن جب جنیدؒ کی محفل میں آیا تو آپ نے اُس میں سے حکمرانی کی بُوباس کو اس طرح کڑی آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر ختم کرڈالا کہ شبلی مرشد کی خواہش کے مطابق برس ہا برس گلی کوچوں میں بھیک مانگتا، خاک اُڑاتا زندگی بسر کرتا رہا۔ بغداد کی وہ راہیں جنہوں نے کبھی اُسے حاکم کی حیثیت سے خود کو روندتے اُسے دیکھا تھا اب اس حال میں بھی دیکھ رہی تھیں کہ خدا کی محبت میں سرشاری میں نیم برہنہ حالت میں کبھی ہنستا جارہا ہے کبھی روتا گھوم رہا ہے۔ لوگ حضرت جنید سے کہا کرتے تھے کہ "حضرت ہمیں سمجھ میں آسکا آخر ایک دلوانے کی بیعت سے آپ کو حاصل کیا ہوا؟"

یہ سُن کر جنیدؒ مسکراکر فرماتے: "اُس نے اپنی سرشاری مجھے دی ہے اس سے بڑھ کر میں اور کیا حاصل کرتا اُس سے۔"

ایک دن شبلی حسب معمول ہشاش بشاش جنید بغدادیؒ کے حضور پہنچے تو دیکھا کہ حضرت جنیدؒ خلافِ توقع کسی حد تک غمزدہ مغموم سے نظر آرہے ہیں۔ شبلی نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو کہا "لو! آج تو مسیحا خود ہی بیمار نظر آتا ہے۔"

حضرت جنیدؒ نے اُسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "شبلی! جسے جس کی تلاش ہوتی ہے وہ وہی پاتا ہے۔"

یہ سُن کر شبلی مستی میں سرشار قلندرانہ آواز میں بولے "نہیں.... ہرگز نہیں.... مُرشد یوں نہ کہو.... یوں کہو جو حاصل کرچکا وہ تلاش میں رہتا ہے۔"

یہ سُن کر جنید بغدادیؒ بے ساختہ بول اُٹھے: "شبلی! تجھ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں بے شک تم نے درست کہا۔ تو بالکل سچا ہے۔"

جنید بغدادیؒ تصوف کا درس دینے والے آخری شخص تھے۔ وسعتِ نظر، صدقِ دل اور اظہار مدعا کی اعلیٰ صلاحیتوں کے ان کے بعد کسی اور کا نام لینا شاید ہی کسی کو گوارا ہو۔

جنید بغدادیؒ دوستوں کے لیے مخلص دوست تھے۔ ہر دوست سے بے لوث اور عمر بھر کی دوستی نبھائی۔ آپ کو سفر کا کوئی خاص شوق نہ تھا حالانکہ اُس زمانے میں اولیاء کرام نے طویل سفر کیے۔ بچپن میں صرف ایک مرتبہ ماموں کے ساتھ حج کے لیے مکہ گئے تھے۔ بعد میں حج کے لیے آپ کا نظریہ تھا کہ صرف ایک حج ہی کافی ہوتا ہے بشرطیکہ اُسے حق کے ساتھ ادا کیا جائے۔ آپ حج کو ایک فرض قرار دیتے تھے اور اس حق میں نہیں تھے کہ بار بار حج کی خاطر سفر کیا جائے۔ آپ کہا کرتے تھے: "اگر کوئی حج اس طرح ادا کرے جیسا کہ حق ہے ادا کرنے کا تو وہ اتنا تھک جاتا ہے اور اُس کا دامن اتنا بھر جاتا ہے کہ پھر اُسے دوسرے حج کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

ایک رات حضرت جنید بغدادیؒ کا اچانک عبادت سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ بہت کوشش کی لیکن خود کو یادِ الٰہی میں گم نہ کرسکے۔ ہر کوشش ناکام ہوئی تو ناچار حجرے سے نکل کر باہر جانے لگے تو دیکھا حجرے کے دروازے پر ایک درویش بیٹھا ہے۔ معلوم ہوا کہ بے چینی اور بے قراری کا کیا کارن تھا۔ آپ نے اُس سے فرمایا: "اچھا تو تم میرا انتظار کر رہے ہو؟ تمہارے اس انتظار نے پوری رات کی عبادت ضائع کردی۔ خیر کہو! کس وجہ سے انتظار کررہے ہو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

درویش بولا: حضرت صرف اتنا بتا دیجیے کہ نفس کا علاج کیسے کیا جائے؟"

یہ سُن کر آپ بول اُٹھے: "نفس کو ہر سانس پر اس حد تک کچل کچل کر ختم کرڈالو کہ اُس میں اتنی طاقت ہی نہ رہے کہ وہ ایمان

کی شکل اختیار کرے"

ایک مرتبہ ایک عورت روتی دھوتی آپ کے پاس آئی اور رو رو کر کہنے لگی "حضرت میرا بچہ آج کل لاپتہ ہے، خدا سے دُعا کریں کہ وہ مجھے میرے بچے سے ملا دے، مَیں ممتا کی ماری کب سے اُس کی راہ دیکھ رہی ہوں مجھے کسی پل چین نہیں، سکون نہیں۔"

آپ نے اُس کی فریاد سے متاثر ہو کر کہا۔ "بہن! صبر کرو اللہ بڑا کارساز ہے۔" وہ عورت یہ سُن کر چل دی۔ لیکن دوسرے دن پھر پریشان حال آن موجود ہوئی اور دَرد بھرے انداز میں بولی "حضرت اَب صبر نہیں ہوتا۔ میرا بچہ میری ممتا کا سکون ہی جب مجھ سے دُور ہو تو مجھے سکون کہاں، صبر کیسے کروں؟"

یہ سُن کر آپ بولے "اچھا صبر نہیں رہا ضبط کا یارا چھوٹ گیا ہے تو جاؤ دیکھو تمہارا بیٹا گھر میں بیٹھا بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" یہ سُننا تھا کہ وہ عورت اُلٹے قدموں گھر کو دوڑی۔ دیکھا تو واقعی اُس کا بیٹا گھر بیٹھا تھا۔

خلیفۂ بغداد نے ایک دن اپنے ایک قاضی کی کسی جسارت پر اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا "تم میں بے ادبی کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ مَیں نے تم جیسا بے ادب شخص نہیں دیکھا۔" یہ سُن کر قاضی خاموش نہ رہ سکا اور بولنے کی ہمّت کر کے بول ہی اُٹھا "حضور مَیں مانتا ہوں کہ مجھ میں لاتعداد کمزوریاں ہیں۔ ہزارہا خامیاں ہوں گی لیکن مَیں بے ادب ہرگز نہیں، مَیں تو آدھا دن جنید بغدادیؒ کی خدمت میں گزارتا ہوں پھر مَیں بے ادب کیسے ہو سکتا ہوں؟"

حضرت شیخ ابوجعفر حدّاد کہا کرتے تھے "اگر دُنیا میں عقل کی کوئی ظاہری شکل ہوتی تو بلاشبہ دُنیا اُسے جنیدؒ کی شکل میں دیکھتی"

ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادیؒ کو خواہش محسوس ہوئی کہ کاش وہ شیطان مردُود کو دیکھ سکتے اور اُس سے دریافت کرتے کہ اے ملعون تجھے آخر کس چیز نے روکا تھا کہ تُو آدم کو سجدہ کرنے سے بازرہا اور زبردست فساد و فتنہ کا منبع بنا ہوا ہے۔

ایک دن آپ مسجد سے باہر نکل رہے تھے کہ دیکھا کہ ایک شریف صورت بزرگ عصا کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا اُن کی طرف آ رہا ہے، جب وہ قریب پہنچا تو آپ نے اُس کی پیشانی پر بزرگی کی علامتیں تو محسوس کیں مگر دل اُس کی قُربت سے وحشت زدہ ہوا جا رہا تھا۔

وہ بزرگ جُوں جُوں آپ کے قریب ہونے کی کوشش کرتا اُتنا ہی زمین اُسے پیچھے کی طرف کھسکا دیتی۔ نااُمید ہو کر وہ جنیدؒ سے بولا "جنیدؒ تو خوش قسمت ہے کہ تیرے خالق نے میرے اور تیرے درمیان ایک دیوار حائل کر دی ہے، مَیں وہی ہوں جس سے تُو آج کل ملنے کا خواہش مند ہے۔"

آپ کو جب یہ احساس ہوا کہ آپ شیطان لعین کے سامنے کھڑے ہیں تو فوراً غصّے اور دُرشتی سے بولے "ملعون تجھے آدم کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا تھا؟" شیطان یہ سُن کر بولا "تم تو خود عبادت گزار ہو عقل و شعور سے مالامال، مجھے یہ بتاؤ تمہیں یہ کہے کہ تُو غیر اللہ کو سجدہ کرو تو کیا تم اس کی بات مان لوگے۔"

جنید بغدادی سوچ میں پڑ گئے کہ آخر اُسے کیا جواب دیں۔ پھر بولے "تُو مردُود ہے ہی جھُوٹا اور نیک بندوں کو بہکانے والا۔ اگر تُو اپنے خالق کا حکم ماننے کا عادی ہوتا تو پھر اُس کے کسی حکم سے سرتابی کی مجال نہ کر پاتا۔" ابلیس نے جو یہ سُنا تو چیخ کر بولا "جنیدؒ تُو نے خدا کی قسم آج مجھے جلا ڈالا۔" اور پھر وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ اپنے مُرشد شیخ سقطیؒ کے ہمراہ بغداد میں گھوم رہے تھے کہ آپ کی نظر ایک شخص پر پڑی جسے لوگ دیوانہ دیوانہ کہہ کر پکارتے جا رہے تھے اور پتھر مار کر اُسے لہولہان کرتے جا رہے تھے۔ آپ نے یہ سب نفرت سے دیکھا۔ آپ نے اپنے ماموں سے پُوچھا "یہ لوگ کیوں اس کو پریشان کر رہے ہیں؟ اور کوئی مدد کو کیوں نہیں بڑھ رہا" شیخ سقطیؒ غصّے میں بولے "یہ بدبخت لا الٰہ الا اللہ پڑھ کر ہی ہوش کھو بیٹھا ہے اب بھی اگر محمد الرسول اللہ کہے تو کیا ہو سکتا ہے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ کہا کرتے تھے اُس شخص کو کوئی حق حاصل نہیں ہے جسے نہ تو قرآن کا علم ہو نہ احادیث پر عبور رکھتا ہو اور نہ فقہ کے متعلق معلومات ہوں۔ آپ جوں جوں اپنی روحانی نشوونما کا سفر طے کرتے گئے اس بات کا ہر ممکن خیال رکھا کہ کہیں سُنت رسولؐ سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ آپ کی پُوری کوشش یہی تھی کہ آپ کو حدیث و سُنت پر عبور حاصل ہو۔ آپ جانتے تھے کہ اگر شرعی تعلیمات سے دُور رہے تو یہ اس بات کے مترادف ہوگا کہ لوگ آپ کو پتھر ماریں اور رُسوا کریں۔

آپ کے مُرشد شیخ سقطیؒ نے آپ کو دُعا دیتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا: "جنیدؒ میری اللہ سے یہی دُعا ہے کہ تم ایک محدّث صُوفی ہو نہ کہ تمہیں لوگ صُوفی محدّث کہہ کر پکاریں"۔ چنانچہ آپ نے پہلے سُنت و حدیث کی تعلیم حاصل کی پھر تصوف میں عروج کے لیے ریاضتوں اور مجاہدوں کو اپنایا۔

بغداد کے اہلِ علم آپ کی علمیت و قابلیت سے پُوری طرح آگاہ تھے۔ اس لیے اہلِ علم آپ کے سامنے زبان کھولنے سے ڈرتے تھے۔ آپ لوگوں میں ایک محتاط اور بامروّت انسان کے طور پر مشہور تھے لیکن یہ بات سبھی کے علم میں تھی کہ جہاں تک دینی معاملات کا تعلق ہے آپ کسی کا لحاظ نہیں کرتے اور اس سلسلے میں صاف گوئی سے کام لینے کے عادی تھے۔

ایک دن جنید بغدادی بازار میں سے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک جگہ مجمع لگا ہوا ہے اور لوگوں کی بڑی تعداد مجمع میں کھڑے علماء کی بحث کو بڑے غور اور توجہ سے سُن رہی ہے آپ نے تجسّس میں مبتلا ہو کر لوگوں سے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں"

لوگوں نے آپ کو جواب دیا' حضرت! یہ بزرگ وہ لوگ ہیں جو ثابت کر رہے ہیں کہ خدا میں مخلوق کی کوئی صفت نہیں اور نہ ہی وہ عیب رکھتا ہے۔ ہر قسم کا عیب و نقص اُس سے دُور ہے۔"

یہ سُن کر آپ مُسکرا پڑے اور بولے" بھلا سفید کو سفید نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ کالا ... کالا ہی کہلائے گا اور سبھی کو اس کا علم ہے۔ پھر یہ لوگ کیوں کھڑے وقت برباد کر رہے ہیں۔ یہ تو خود اُن کی فصاحت و بلاغت میں عقلی نقص کی دلیل ہے۔ کیا انھیں اور کوئی کام نہیں؟"

حضرت جنید بغدادیؒ کہا کرتے تھے کہ ترکِ دُنیا کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ انسان موٹے کپڑے پہن لے یا جَو کی روٹی کھانا شروع کر دے۔ عالی شان گھروں سے مُنہ موڑ لے، جنگلوں کی راہ لے اور بیابانوں کو اپنا مسکن بنالے۔ یہ ہرگز درست نہیں اور نہ ہی کوئی باہوش انسان اسے ترکِ دُنیا قرار دینے کی ضد کرے گا۔

ترکِ دُنیا تو اسے کہتے ہیں کہ دُنیا میں رہو۔ لذیذ غذائیں کھاؤ لیکن جو ذائقہ محسوس ہو وہ جَو کی روٹی کا محسوس ہو۔ مخمل بھی پہنو تو ٹاٹ کا گمان ہو۔ بھرے پُرے بازاروں میں بھی سفر کرو تو یوں لگے کہ سنسان و بیابان ریگستان کا سفر کر رہے ہو۔

آپ فرمایا کرتے تھے" امن و سلامتی صرف اُنہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اُس کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہ جستجو کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہیں گناہوں سے دُور رہنے کی چاہ ہوتی ہے اور ایسی باتوں میں نہیں پڑتے جن سے اسلام نے منع کیا ہو۔ اور خود کو خواہ مخواہ کی مخالفت کے موقف میں نہیں لاتے۔"

ایک رات حضرت جنیدؒ کے پاؤں میں سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ جب درد آپ کی برداشت سے باہر ہو گیا اور کسی صورت ضبط نہ رہا تو سورہ فاتحہ پڑھ کر جو پاؤں پر پھونکا تو درد تو غائب ہو گیا مگر ساتھ ہی آواز آئی" جنید حیرت ہے تُو نے اپنے نفس کی خاطر ہمارے کلام کو استعمال کیا۔" یہ سُن کر آپ اس قدر نادم ہوئے کہ تمام عمر ایسا فعل نہ کیا اور خدا سے کچھ نہ مانگا۔ یہی کہا کرتے" ربّ العزت جیسا تُو چاہتا ہے وہ کرنے میں ہی میری عاقبت سنورتی ہے اور مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے۔"

جنید بغدادیؒ کو اپنے ایک مُرید سے بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ دوسرے مُرید اُسے حسد و رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتے۔ ایک روز آپ نے اپنے سبھی مُریدوں کو ایک ایک پھل دے کر کہا" یہ پھل کھاؤ لیکن ایسی جگہ جہاں تمہیں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ مُرید پھل لے کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب اُن کی واپسی ہوئی تو سبھی خالی ہاتھ واپس لوٹے، صرف وہی مُرید پھل لیے واپس آگیا جس سے آپ

بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اُس نے آتے ہی اپنے مُرشد سے کہا "حضرت مَیں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی جگہ چُھپ کر یہ پھل کھالوں اور آپ کے حُکم کی تعمیل ہو لیکن مَیں جس جگہ بھی جاتا وہاں خدا کی نظریں پہنچ رہی ہوتی تھیں۔ مجھے بہت تلاش کے باوجود بھی ایسی کوئی جگہ نہ ملی جہاں مَیں بیٹھ کر پھل کھا لیتا اِس یقین کے ساتھ کہ یہاں خدا موجود نہیں۔" یہ بات سُن کر تمام مُریدوں کے سر شرم سے جُھک گئے اور رشک سے تاب ہو گئے۔

ایک دن حضرت جنید کی آنکھ میں کچھ ایسا زخم پیدا ہوا کہ طبیب نے معائنہ کرنے کے بعد کہہ دیا کہ حضرت اب اس کا علاج یہی ہے کہ آپ اس آنکھ کو پانی سے بچا کے رکھیں۔ ورنہ پانی پڑنے کی صورت میں بینائی زائل ہونے کا امکان ہے۔ یہ سُن کر آپ مُسکرا پڑے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے "اِدھر تو نذرانۂ جاں لیے کھڑے ہیں اور یہ طبیب بینائی جانے سے ڈرا رہا ہے۔"

چنانچہ آپ نے اُس غیر مُسلم طبیب کی بات کا بالکل خیال نہ کیا اور وضو کر کے عشار کی نماز پڑھنا شروع کر دی اور حسبِ معمول ساری رات عبادت میں گزاری۔

اگلے دن جب وہ طبیب معائنے کے لیے آیا تو اُس نے حیرت سے آپ کی طرف دیکھا اور پوچھا "حضرت یہ آنکھ ایک ہی رات میں کیسے درست ہو گئی؟"

"وضو کرنے سے۔" جنید بغدادیؒ نے اطمینان بھرے لہجے میں اُسے جواب دیا۔ یہ سُن کر طبیب بہت شرمندہ ہوا اور صدقِ دل سے اسلام پر ایمان لے آیا۔

وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کی زبان پر اللہ کا ورد جاری تھا۔ آخری سانس میں آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور ہمیشہ کے لیے دُنیا سے پردہ کر کے خدا سے جا ملے۔

بروز شنبہ ۲۷ رجب ۲۹۷ ہجری کو آپ کا وصال ہوا۔ اُس دن بغداد پر ایک بیکراں سے سنّاٹے کا راج تھا۔ ہر شخص جہاں جس حالت میں بھی تھا عقیدت سے دوڑ کر آپ کے جنازے میں شریک ہوا۔ ہجوم گریہ وزاری کرتے آپ کو آپ کی ابدی آرام گاہ تک لے گئے۔

غوثِ اعظم پیر دستگیر حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ حضرت شیخ حسنی جیلانی کے ہاں ۸۶۲ ہجری میں وہ صاحبِ کرامت عجیب اور حیرت انگیز شخصیت نے جنم لیا کہ جس نے درویشی کے عالم میں بھی وہ نام پیدا کیا کہ بادشاہ تک اس کی ہمسری نہ کر سکے۔ اپنے جدِ اعلیٰ کے ہم نام شیخ عبدالقادر جیلانی ثانی سنِ بلوغت کو پہنچے تو بادشاہِ وقت کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ شیخ محمد حسن جیلانی چونکہ خود بھی بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس لیے اُن کی نرینہ اولاد بھی جوں جوں ہوشمندی کی منزل میں قدم رکھتی گئی، بادشاہ وقت کے دربار سے وابستگی اختیار کرتی گئی

دربار میں شمولیت اختیار کی تو مال و زر کی کمی نہ رہی۔ دولت کی وہ ریل پیل ہوئی کہ ادھر زبان سے حاجت بیان ہوئی اُدھر تکمیل کو پا گئی۔ بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہوتے تو درباری تقریبات میں شمولیت بھی لازم ٹھہری۔ شاہی دربار میں اہم تقریب ساز و آواز کی محفل ہوتی ہے۔ جس میں سلطنت کے مشہور و معروف اپنے فن میں یکتا مغنی شرکت کرتے۔ سازوں کی لے پر اپنی خوش آواز سے وہ جادو جگاتے کہ پورا ماحول اُن کے سنگیت سے جھوم اٹھتا۔ دلوں میں ہلچل برپا ہو جاتی۔ کان اس بات کے خواہش مند ہوتے کہ یہ سُریلی آواز ہمیشہ ہی گونجتی رہے۔

عبدالقادر ثانی بھی ان ہوش رُبا مدہوش محفلوں میں شرکت کرتے۔ ساز و آواز کی ان محفلوں میں تسکین محسوس کرتے۔ گھر آتے تو تب بھی ذہن میں وہ سریلی گھنٹیاں گونج رہی ہوتیں۔ خواہش پیدا ہوتی کہ کچھ دیر اور ان میں شرکت کریں۔ لیکن جب بادشاہ ہی محفل برخاست کر دیتا تو پھر اس کا جواز ہی کہاں رہتا۔ دوستوں سے بیان کرتے کہ کاش یہ محفل اتنی جلد نہ اٹھائی جاتی۔ دوست حیرت سے انہیں تکتے اور کہتے کیا ابھی بھی چاہ ہے۔ حالانکہ ساز و آواز کی وہ محفل تو خاصی دیر تک سجی رہی تھی۔ آپ ابھی بھی اُس سے لُطف اندوز ہونے کے خواہش مند ہیں؟

عبدالقادر ثانی نشے میں سرشار ہو کر کہتے "ہاں ہمیں اُس خوش الحانی کی مزید خواہش ہے جو ہماری رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے۔ مغنیوں کے مزامیر ہمارے وجود میں نشتر بن کر اس طرح چبھے ہیں کہ اُن کی چبھن سے ہم اپنے وجود کو سرشار پاتے ہیں۔

دوستوں نے یہ سُن کر ایک دوسرے کو مسکراتی آنکھوں سے دیکھا پھر گویا ہوتے "حضرت اگر آپ کی اس خوش الحانی سے طبیعت سیر نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ خود پر جبر کر کے اس آس میں بیٹھے رہیں کہ نہ جانے بادشاہ کب پھر اس رنگ و بُو کی محفل سجاتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہ سازوں کا خوش کُن سنگیت مغنیوں کی خوش الحانی اُس وقت تک آپ کے کانوں میں رس بن کر گھلتی رہے گی جب تک آپ چاہیں گے۔"

یہ سُن کر عبدالقادر نے سوالیہ انداز میں دوستوں کو دیکھا۔ دوستوں میں سے ایک آگے بڑھ کر بولا "حضرت ہمارا کہنے کا مطلب ہے کہ بے شک آپ بادشاہ جتنے وسائل تو نہیں رکھتے لیکن پھر بھی آپ اس حد تک دولت مند تو ہیں ہی کہ جو گویّے اور مزامیر آپ کو پسند ہیں انہیں منگوالیں۔ یہ خوش الحان لوگ مال و زر کے دیوانے ہوتے ہیں۔ آپ اس مد میں صرف فرمائیں وہ آپ کے اردگرد جمع ہوجائیں گے۔"

شیخ عبدالقادر نے یہ سُنا تو سر ہلانے لگے۔ بات صاف تھی۔ سمجھ میں آگئی۔ دُوسرے دن ہی بازار کا رُخ کیا جو ساز پسند تھے خریدے۔ گویّوں سے معاملات طے کیے اور ماہانہ مشاہرے پر رکھ لیا۔ اُس کے بعد یہ کیفیت ہوتی کہ آپ ہوتے اور ساز و آواز کا وہ ماحول جس کی آپ کو خواہش تھی۔

صوفی منش باپ دُکھ سے بیٹے کی یہ سب مصروفیات برداشت کرتے رہے۔ اُسے سمجھانا چاہتے لیکن پھر کچھ سوچ کر رہ جاتے۔ بیٹے کی عادات انہیں اندر ہی اندر ہلاتے رہی تھیں۔ زبان کھولنا چاہتے تھے لیکن پھر یہ سوچتے کہ شاید وقت ہی اسے کوئی سبق سکھائے۔ لیکن ایک دن کچھ ایسی صورتِ حال سامنے آئی کہ چُپ نہ رہ سکے۔

شیخ عبدالقادر کو کسی ضروری کام سے باہر جانے کا ارادہ ہوا تو سفر کی تیاری میں جہاں دُوسرا ضروری سامان اکٹھا کیا وہاں گویّوں اور ان کے سازوں کو بھی اسی فہرست میں شامل کرکے اونٹوں پر لدوا دیا۔ والد کو جب یہ خبر ملی تو بے چین ہوگئے۔ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ بیٹا سنگیت کا اس حد تک دیوانہ ہوگیا ہے کہ پل بھر کی جدائی بھی برداشت نہیں کرپاتا۔ غصے میں بے قابو ہوگئے۔ لیکن پھر ذرا تحمل سے کام لیا اور غصہ ضبط کرتے ہوئے بیٹے کو بلوایا اور پوچھنے لگے "عبدالقادر..... کیا میں نے جو کچھ سُنا ہے وہ واقعی درست ہے؟"

بیٹے نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ آج سے پہلے ایسی نوبت کبھی نہ آئی تھی کہ باپ نے عبدالقادر کو کسی قسم کی بازپرسی کے لیے بلایا ہو۔ چنانچہ حیرانگی سے بولے "کیا سُنا ہے آپ نے؟"

شیخ محمد حسنی غم کی تصویر بنے دُکھ بھرے لہجے میں بولے "یہی..... کہ اب تم موسیقی کے اس حد تک دلدادہ ہوچکے ہو کہ پل بھر کی جُدائی شاق گزرنے لگی ہے۔ سفر کو نکلے ہو تو ان گویّوں کو بھی ہمراہی بنالیا جو دن بھر تمہارے کانوں میں سازوں کی آواز ڈالتے رہتے ہیں۔ بیٹا مجھے بتاؤ کیا یہ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے قابلِ فخر بات ہے۔ ہم جس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں کیا اُس میں یہ گنجائش ہے کہ ہم ان شرمناک خرافات میں پڑ کر اپنا وقت برباد کریں۔ بیٹا یہ معیوب چیزیں ہمیں راس نہیں آسکتیں۔ تم کیوں ان کے پیچھے پڑ چکے ہو۔"

شیخ عبدالقادر نے والد کی تمام باتیں خاموشی سے سننے کے بعد مختصراً اتنا کہا "بابا جن چیزوں کو آپ معیوب اور شرمناک قرار دے رہے ہیں میرے نزدیک اُن کی کچھ اور ہی حیثیت ہے جو یقیناً ان کے بارے میں آپ کے افکار سے بلند ہے۔"

باپ نے یہ سُنا تو مایوسی سے بولے "اب تم جاسکتے ہو۔ تم نے کچھ کہنے کے لیے چھوڑا ہی کہاں ہے جو تمہیں مزید کچھ نصیحت کی جائے۔"

شیخ عبدالقادر نے لاپرواہی سے کندھے اُچکاتے اور باہر نکل آتے۔ جہاں قافلہ سفر کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اُونٹ مال و اسباب، گویّوں اور اُن کے سازوں سے لدے سفر کے لیے تیار امیرِ قافلہ کے منتظر تھے۔ چنانچہ جیسے ہی آپ نے اُونٹ پر بیٹھ کر اُسے آگے بڑھایا۔ قافلہ بھی چل پڑا۔ جہاں پڑاؤ کیا وہ مقام ساز و آواز سے گونجنے لگے۔ لوگ حیرت و دلچسپی سے ان میں شرکت کرتے اور خوش خوش واپس لوٹتے۔

لیکن جلد ہی شیخ عبدالقادر کا دل مزامیر اور گویّوں سے بھی اُچاٹ ہوگیا۔ وہ ایک بے نام سی بے کلی و بے چینی کا شکار رہنے لگے۔ دل یوں محسوس کرنے لگا گویا کسی شے کی کمی ہے اور اُس شے کی جستجو میں اس قدر بے کل ہوتے کہ ہر وقت پریشان پریشان سے دکھائی دینے لگے۔ باپ نے بیٹے میں یہ تغیر محسوس کیا تو خوش ہوتے کہ شاید بیٹا راہِ راست پر آرہا ہے۔ اب موسیقی میں وہ پہلے جیسی دلچسپی نہیں رہی۔ دوستوں نے جو شیخ کو یوں بے چین اور بیقرار دیکھا تو پوچھنے لگے۔ "حضرت کیا بات ہے۔ اب آپ گویّوں پر وہ پہلے جیسی توجہ نہیں دیتے۔ ہفتوں گزر گئے انہیں اپنے فن کا مظاہرہ کیے۔ دوبارہ آپ نے انہیں بلایا ہی نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہاں اتنی چاہ سے سُنا کرتے تھے کہ سفر میں بھی وہ ہمسفر بنالیے جاتے تھے اور کہاں اب یہ حال ہے کہ آپ بھُول کر بھی انہیں طلب نہیں فرماتے۔"

شیخ جیلانی اکتاہٹ سے بولے "کیا کروں۔ دل جو نہیں چاہتا۔ اب تو مجھے ان سازوں کی آواز سے ہی کراہیت محسوس ہونے لگی ہے جن

میں خود شوق سے چن کر خرید لایا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ دل کسی پل بھی چین میں نہیں آرہا۔ بس کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی چیز کی کمی ہے۔ کس چیز کی؟ یہ تو ہم بھی نہیں جان پاتے۔

ایک مردم شناس دوست آگے بڑھ کر بولا "حضرت اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ یہ سب ماحول کی یکسانیت کا نتیجہ ہے۔ آخر ایک انسان کب تک ایک ہی مشغلہ اختیار کیے رکھے۔ انسان فطری طور پر جدت پسند ہے۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ آپ جس طرح موسیقی کے دیوانہ وار خواہش مند تھے۔ اب روزانہ ایک ہی چیز بار بار دیکھ کر سن کر آپ کا دل بھر چکا ہے وہ وقتی اور عارضی تاثر تھا جو آپ کے ذہن پر سوار تھا۔ اب وہ تاثر ڈھل چکا ہے۔ بس اب آپ کو اس مشغلے سے گھن محسوس ہو رہی ہے۔"

آپ نے اپنے دوست کی تائید میں سر ہلایا اور بولے "بالکل ...... بالکل یہی بات ہے۔ مجھے اب موسیقی سے اس قدر اکتاہٹ محسوس ہونے لگی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن اب اس کا علاج آخر کیسے ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"شکار ....!" دوست نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"شکار؟" حضرت جیلانی نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں شکار ..... دوست بولا "شکار ہی وہ دلچسپ دل بہلانے والا مشغلہ ہے جو اکثر امراء اور حکام اُداسی میں اختیار کرتے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شکار سے آپ اس قدر لطف اندوز ہوں گے کہ ساز و آواز کی محفلوں میں صرف کیے گئے وقت کو بیکار گزارا ہوا وقت شمار کرنے لگیں گے۔"

شیخ جیلانی کو تو سکون اور صرف سکون کی چاہ تھی۔ ایسا سکون جس میں وہ خود کو خود پر چھائی بے نام سی اُداسی کو بھلا سکیں۔ چنانچہ دوست کی تجویز سن کر آپ نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "یقیناً اگر ایسا ہے تو ہمیں شکار کھیلنا چاہیے۔ ہم آج ہی شکار پہ جانے کی تیاری شروع کرتے ہیں۔"

شکار کی پہلی شرط تو جانوروں پرندوں کے وجود کا ہونا ہوتی ہے اور دوسری اہم شرط شکاری کتوں کی موجودگی کا ہونا ہوتی ہے۔ شکاری کتے اور شکار دو لازم و ملزوم چیزیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ دوستوں نے جھجکتے جھجکتے عرض کی "حضرت شکار کا سامان تو بازار سے خرید اجائے گا مگر ایک اور چیز جو شکار کا لطف دوبالا کر دیتی ہے بلکہ جس کے بغیر شکار کا تصور ہی ادھورا بلکہ بے نام سا رہ جاتا ہے وہ شکاری کتوں کی شمولیت ہے۔"

یہ سن کر شیخ جیلانی کو بھی ذرا پریشانی لاحق ہوتی اور فکر مندی سے بولے "کیا واقعی شکاری کتوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟"

دوستوں نے جواب دیا "حضرت شکار اور شکاری کتے ایک فعل کے دو نام ہیں۔ ان میں سے ایک نہ ہو تو دوسرا ادھورا رہتا ہے۔"

یہ سن کر کسی قدر تردد سے آپ نے شکاری کتوں کے حصول کی اجازت دے دی۔

چنانچہ شکاری کتوں کا بندوبست کیا گیا۔ زرِ کثیر خرچ کر کے ان کے مالکوں سے کتے حاصل کر کے ان کے لیے باقاعدہ رہائشی جگہ بنائی گئی۔ خوراک کا بندوبست کیا گیا۔

باپ جو بیٹے کی اس بات سے خوش ہو رہے تھے کہ اب وہ ساز و آواز سے دور رہنے لگا ہے جب کتے پالتے دیکھا تو ناخوشی کا اظہار کیا۔ بیٹے کو ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کرنے لگے "عبدالقادر ..... تو مسلمان ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم اسلام میں کتے پالنا ممنوع ہے۔ پھر تو کیوں ہر وہ قدم اٹھاتا ہے جو اسلام کے منافی ہو؟"

یہ سن کر عبدالقادر بے چارگی سے بولے "بابا میں کیا کروں۔ میں کس چیز سے دل بہلاؤں۔"

باپ نے بیٹے کی ناگفتہ حالت دیکھی تو یہ سوچ کر زیادہ اصرار نہ کیا کہ کہیں تنگی اس کے دماغ پر برا اثر نہ ڈال دے۔

شیخ زادے اب موسیقی سے منہ موڑ کر پوری دلچسپی سے شکار میں مشغول ہو گئے اور بہت جلد انہیں احساس ہو گیا کہ یہ تو بہت پُر لطف مشغلہ ہے ساز و آواز سے دل بھرنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی اور چیز سے اس حد تک لطف اندوز ہوتے تھے۔ لیکن اب بھی وہ کسی حد تک دل میں بے چینی سی محسوس کرتے۔ کبھی کبھی خیال آتا کہ وہ جو یہ سب کر رہے ہیں یہ تو ان کے دل کی بے چینی کا مداوا نہیں۔ لیکن پھر سوچتے آخر کسی شے کی

کی کا جو احساس ہوتا ہے وہ مجھے کیونکر معلوم ہو۔ کیسے میں سکون محسوس کروں۔

لیکن پھر ان خیالات کو دماغ سے جھٹک کر ندہی سے شکار میں مشغول ہو جاتے اور یہ سلسلہ اس حد تک چلتا رہا کہ اب اس سے بھی دل اُچاٹ ہونے لگا۔ شکار کا بھی مزا جاتا رہا۔

اُنہی دنوں اُن کے والد کے کسی عقیدت مند نے ایک خوبصورت بیش قیمت کپڑے کا تھان اُن کی نذر کیا۔ انہوں نے تھان کو دیکھا تو دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس قدر حسین کپڑا بیٹے کے تن پر ہی جچے گا۔ سو جیلانی کو بُلایا اور کپڑے کا تھان دیتے ہوئے بولے۔ عبدالقادر..... تم ابھی اسی وقت درزی کو بلوا کر اس سے اپنی پوشاک سلوالو۔"

بیٹے نے بھی اُس قیمتی تھان کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ لے کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

یک لخت نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ سوچا اگر یہ حسین کپڑا کتوں کو پہنا دیا جائے تو شکاری کتوں کی شان میں اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ خیال کا دل میں جڑ پکڑنا تھا کہ درزی کو بلوا کر حکم دیا کہ اس کپڑے سے ہمارے کتوں کی جھولیں تیار کر دو۔

درزی حکم کا غلام تھا۔ شیخ زادے کے حکم کو اگرچہ اُس نے بھی حیرت سے سُنا مگر تعمیل کر دی۔ چنانچہ جھولیں تیار کی گئیں اور کتوں کو پہنا دی گئیں۔ والد کے عقیدت مندوں نے جب یہ دیکھا کہ کتے قیمتی لباس پہنے گھوم رہے ہیں تو سخت افسوس کا اظہار کیا۔ ایک مرید تو شیخ جیلانی کے سامنے ہی بول اٹھا "واہ..... واہ..... ایسا کپڑا تو انسانوں کو بھی میسر نہیں جیسا شیخ زادے کے کتے زیب تن کیے ہوتے ہیں۔ خدا کی شان اسی کو تو کہتے ہیں۔"

مرید کے طنز کو سُن کر آپ جھنجلا گئے اور اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔

کچھ دن بعد حضرت جیلانی حسنی کو یہ معلوم ہوا تو سخت دُکھ محسوس ہوا۔ فوراً بیٹے کو بلوایا اور بولے "یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم؟ تمہیں مخملی تھان اس لیے دیا تھا کہ خود سلوا کر پہنو اور تم نے ہمارا بخشا ہوا کپڑا کتوں کے تن پر سجا دیا۔ خوب عزت فرماتی ہے پدر کی۔"

عبدالقادر یہ سُن کر تڑپ اُٹھے اور درد بھرے لہجے میں بولے "بابا کتے بھی تو اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ اگر میں نے انہیں اچھا پہنا دیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

والد نے یہ سُنا تو طیش میں آ گئے اور شاید زندگی میں پہلی مرتبہ بیٹے کو سخت سُست کہا اور دیر تک اُسے ڈانٹتے رہے۔ عبدالقادر باپ کی ڈانٹ سُن کر سخت افسردہ ہو کر اُدھر سے چلے آتے۔ بیٹے کے جانے کے بعد والد نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور دُکھ سے کہنے لگے "افسوس یہ لڑکا تو مجھے کہیں کا نہ چھوڑے گا۔ میں نے اس کی بابت کیا کیا نہ سوچا تھا لیکن یہ تو میری ہر خواہش کو رد کرتے نکلا ہے۔ جو میں چاہتا ہوں اُس کا اُلٹ ہی کرتا ہے۔ نہ جانے اس کا کیا بنے گا۔ میرا دماغ تو ذرا برابر بھی کام نہیں کر رہا۔ خدا اس پر رحم فرماتے۔"

اسی رات عبدالقادر کے والد نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے جدِ اعلیٰ شیخ عبدالقادر جیلانی تشریف لاتے ہیں لیکن اس حال میں کہ چہرے سے رنجش ٹپک رہی تھی۔ آپ نے جو ان کو اس قدر رکبیدہ خاطر دیکھا تو پریشان ہو کر بولے۔

"بزرگوار کیا ہم سے ناراض ہیں؟"

شیخ عبدالقادر جیلانی غوثِ اعظم نے جواب دیا "ہاں..... ہمیں تم سے اس بات کی اُمید نہ تھی۔ تم نے آج ہمارے بیٹے کو ڈانٹ کر اچھا نہیں کیا۔ اگر تم نے اُسے سخت سُست کس کارن کہا؟ یاد رکھو عبدالقادر میرا بیٹا ہے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ اُس کے کچھ افعال تمہارے نزدیک ناپسندیدہ ہیں تو تم خاطر جمع رکھو۔ ہم خود ہی اپنے فرزند کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کا کوئی حق نہیں۔ میرے ہم نام فرزند ثانی کی تربیت میرے ذمے ہے۔ تم بے شک اپنے دوسرے بچوں پر توجہ دو۔ ہم خود ہی عبدالقادر ثانی کی تہذیب و ترتیب اور تعلیم و تربیت میں کریں گے۔"

یہ خواب دیکھ کر والد جب بیدار ہوئے تو سخت پریشانی کے عالم میں وقت گزارا۔ بے چینی اور بے قراری سے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ چنانچہ جونہی فجر کی نماز سے فارغ ہوئے بیٹے کو بلوایا اور اس سے کہنے لگے۔

"جانِ پدر..... کل جو کچھ ہوا تم اُسے بھول جاؤ۔ ہم نے غصّے کی شدّت میں تمہیں سخت سُست کہا یہ ہماری نادانی تھی۔ جس پر ہم شرمسار ہیں۔ عبدالقادر بیٹا ہم تمہیں اس بات کا پورا یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ تم جو کچھ کرو گے جو کچھ کہو گے ہم ہرگز اُس میں رخنہ نہ ڈالیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ ہمیں معاف کر دو۔"

عبدالقادر نے جو باپ کے مُنہ سے یہ باتیں سُنیں تو شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ اور تقریباً رو دینے والے انداز میں بولے "بابا یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ باپ ہو کر بیٹے سے معافی مانگ رہے ہیں۔ بابا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ اگر مجھے ٹوکتے ہیں تو یقیناً آپ میری بھلائی کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ میں آپ کی باتوں پر عمل نہیں کرتا تو اس کی وجہ وہ بے سکونی ہے جو میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔ ورنہ نافرمانی کا میرے دل میں خیال تک نہیں۔ بخدا آپ ایسی باتیں ہرگز آئندہ مجھ سے نہ کریں۔ آپ تو مجھے شرمندہ کیے دے رہے ہیں۔"

باپ نے پدرانہ شفقت سے بیٹے کو دیکھا اور خاموش ہو کر گردن جھکاتے سوچوں میں گم ہو گئے۔

عبدالقادر اس کے بعد دوبارہ اپنے مشغلوں میں مصروف ہو گئے۔ آپ کی روش میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہی شکار کے پروگرام بنتے۔ شکاری کتوں کے ساتھ جنگلوں میں بھٹکنا۔ شکار کی تلاش میں سارا سارا دن مارے مارے گھومنا یا پھر مزامیر اور گویّوں کی محفلیں برپا کرنا۔

لیکن یہ سب کچھ کر کے بھی آپ مطمئن نہیں تھے۔ ہر دم یہی خیال رہتا تھا جیسے اُنہوں نے کچھ کھو دیا ہو۔ کیا کھویا ہے؟ یہ نہ جان سکے۔ اور اس جستجو میں اُلجھنیں اور فکریں دامن گیر کیے شکار کھیلتے رہتے۔ اسی طرح ایک دن شکار کی تلاش میں جنگل کا چپہ چپہ چھان رہے تھے کہ ایک جھاڑی میں سے تیتر کی آواز سنائی دی۔ آواز کیا تھی درد میں ڈوبی پُرسوز لَے تھی۔ جس نے سبھی کے دلوں پر اس حد تک اثر کیا کہ ہر شخص خاموشی سے وہیں تھم گیا جہاں تھا۔ تیتر اپنی پُرسوز آواز میں بولتے بولتے اچانک خاموش ہوا تو سبھی نے تھکن محسوس کی۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ کسی طرح شیخ زادہ واپسی کا ارادہ کرے مگر آپ نے مال و اسباب اُتار کر وہیں ڈھیر کرنا شروع کر دیا جہاں تیتر کی آواز سُنی تھی۔ ناچار ساتھی بھی آپ کے ساتھ ہی وہیں بیٹھ گئے۔ آپ کے والد کے چند مرید بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اُن میں سے ایک آپ کے قریب آن بیٹھا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا "حضرت کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ آپ کس خاندانی نسب کے چشم و چراغ ہیں؟ آپ کا مرتبہ کس قدر بلند ہے۔ آپ کتنے بڑے انسان ہیں۔ پھر یہ لاپرواہی کی زندگی کیوں اختیار کر رکھی ہے۔"

آپ نے مرید کی بات سُن کر اُکتاہٹ سے کہا "یہاں ہم جو کچھ ہیں ہمیں خُوب معلوم ہے۔ ہم اچھی طرح علم رکھتے ہیں کہ اپنے نسب نامے کی رو سے ہمارا کیا مرتبہ ہے۔"

ابھی آپ بات پوری بھی نہ کر پاتے تھے کہ اُسی تیتر کی سوگوار سی پُردرد سوز بھری آواز دوبارہ گونجی اور آپ سب سے بے خبر ہو کر اُس کی آواز کے سحر میں ڈوب گئے۔

اتنے میں نہ جانے کہاں سے ایک خستہ حال بزرگ سامنے آ گئے۔ پہلے تو انہوں نے سب کو بغور دیکھا پھر حضرت ثانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگے "خُوب حضرت یہاں تشریف فرما ہیں۔ خُوب صاحبزادے تیتر کی آواز سُنی جا رہی ہے؟"

عبدالقادر ثانی نے چونک کر اُلجھے ہوتے انداز میں اُس عجیب حلیہ میں بزرگ کو دیکھا اور پوچھا "ہاں تیتر کی آواز سُن رہا ہوں۔ پھر؟"

درویش نے مسکرا کر آپ کا جواب سُنا۔ پھر آپ کے ساتھیوں کی طرف مڑتے ہوتے بولے "تم سب جو یہاں موجود ہو اچھی طرح میری بات گرہ میں باندھ لو۔ بہت جلد تم دیکھو گے کہ یہ صاحبزادے جو اس قدر غور سے تیتر کی پُرسوز آواز سُن رہے ہیں ایک دن یہ بھی اسی تیتر کی طرح آہ و زاری کرنے لگیں گے۔ تم بھی دیکھنا بہت جلد ایسا ہو گا۔ میں بھی دیکھوں گا۔"

درویش کی آواز میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کیا سحر اُس کی باتوں میں پوشیدہ تھا کہ عبدالقادر کا وجود بھڑک ہی تو اُٹھا۔ یوں بیقرار ہوتے گویا جسم میں الاؤ جل رہا ہے۔ ضبط کی بہت کوشش کی لیکن نہ جانے وہ کیسی آگ تھی جو درویش کی باتوں سے اُن کے سینے میں بھڑک اٹھی تھی۔ جو بجھنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ چنانچہ فوراً ساتھیوں کو حکم دیا کہ کوچ کی تیاری کرو۔ ہم ابھی اسی وقت واپس جائیں۔

اس حکم نے سب کو ہی تو حیرت زدہ کر دیا۔ کہاں شیخ زادے کے وہ ارادے کہ مستقل ہی پڑاؤ کی شکل میں ڈیرے جمائے بیٹھے تھے کہاں یہ حا
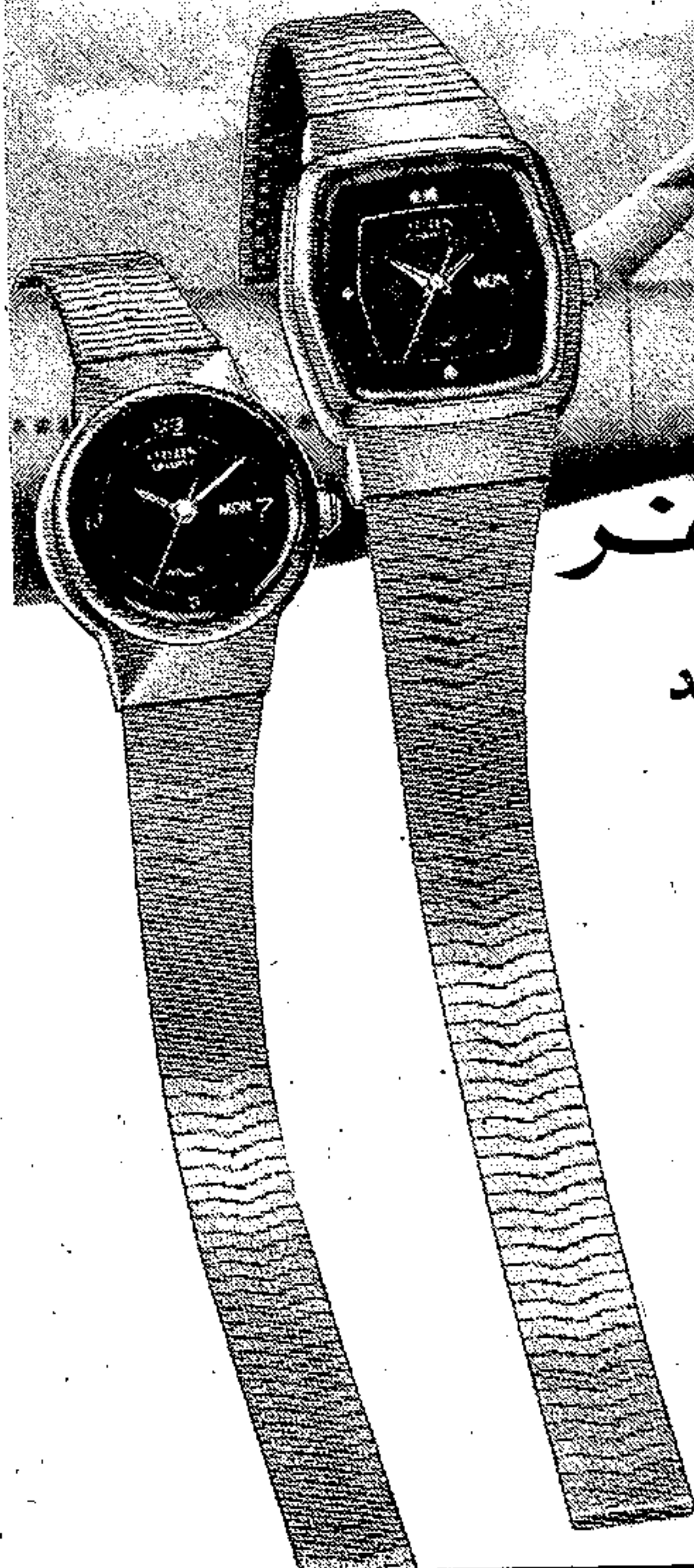
کہ اچانک ہی رخصتِ سفر باندھنے کا حکم دے رہے تھے۔

عبدالقادر نے جو یوں ساتھیوں کو حیران پریشان اپنی صورت تکتا پایا تو جھنجلا کر برہمی سے بولے "کیا تم نے سنا نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ شکل دیکھنا بند کرو اور واپسی کی تیاری کرو۔ مجھے اور شکار نہیں کھیلنا۔ بس جتنی جلد ہو سکے واپس کا سفر شروع کرو۔"

چنانچہ لوگوں نے فوراً سامان سمیٹا۔ شکاری کتوں کو تابو میں کیا اور واپسی کا آغاز ہو گیا۔

واپس آ کر آپ نے ایک دم خاموشی سادھ لی۔ چُپ چاپ رہنے لگے۔ اپنے آپ میں گم نہ جانے کن خیالوں میں سرگرداں تھے کہ اس پاس کا ہوش ہی نہ رہا۔ ہر چیز سے لاتعلق اور بے نیاز دوست حیران تھے کہ آخر شیخ زادے کو ہوا کیا ہے۔ باپ بھی بیٹے کی حالت میں رونما ہونے والے تغیر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دوستوں نے جب یہ دیکھا کہ شیخ زادے تو مسلسل ہی بے رُخی اختیار کیے بیٹھے ہیں تو ایک دن آپ سے کہنے لگے "حضرت بہت دن ہوئے آپ نے گویوں کو طلب نہیں فرمایا۔ وہ بیچارے اس غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ نہ جانے اُن سے کیا خطا ہوئی ہے جو حضور یوں اُن سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔

آپ نے دوستوں کی یہ بات سُن کر اُسی وقت گویوں کو بُلایا اور اُن سے کہنے لگے "ہمیں افسوس ہے ہم اب مزید تم لوگوں کو زحمت دینا نہیں چاہتے۔ تم لوگ جہاں جانا چاہتے ہو بڑی خوشی سے جا سکتے ہو۔"

گویوں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ وہ یہ کیا سُن رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پریشانی سے آپ کو دیکھتے ہوئے پوچھا "حضرت کیا واقعی آپ وہ فرما رہے ہیں جو ہمارے کان سُن رہے ہیں۔ کیا واقعی اب ہماری ضرورت نہیں رہی؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں تم بالکل صحیح سُن رہے ہو۔ اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں رہی۔"

ایک گویّا بولا "حضرت کیا آپ نے ہمارے فن میں کوئی نقص پایا؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں.... تمہارے گانے میں بالکل فرق نہیں آیا۔ فرق تو ہمارے مزاج میں پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن تم یہ باتیں نہ سمجھ سکو گے۔"

گویّے بالکل مایوس ہو گئے اور غمزدہ و ملول سی کیفیت میں رخصت ہو گئے۔ گویوں کے جاتے ہی آپ نے اپنے ملازموں کو مزامیر لانے کو کہا۔ جب وہ مزامیر اُٹھا لائے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ "انہیں توڑ ڈالو۔"

ملازموں نے حیرت سے آپ کو دیکھا اور جھجکتے ہوئے بولے "حضرت یہ تو بہت بیش قیمت اور پھر آپ کے پسندیدہ ہیں۔ ہم بھلا انہیں توڑ ڈالیں۔"

آپ نے غصّے اور افسوس سے فرمایا "نادانو جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ انہوں نے ہمیں بہت دھوکہ دیا ہے۔ بے شک یہ بہت قیمتی ہیں ان پر کافی زر و مال خرچ ہوا ہے۔ اس کا مجھے اتنا افسوس نہیں جتنا دکھ اس بات کا ہے کہ ہم ان خرافات میں مشغول ہو کر اپنا جو قیمتی وقت برباد کر چکے ہیں وہ اب کہاں سے لائیں گے؟ لیکن اب ہم مزید بربادی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ سرانجام دو۔"

لیکن ملازم اب بھی ہچکچاہٹ سی محسوس کر رہے تھے۔ تب آپ نے آگے بڑھ کر اُن مزامیر کو خود اپنے ہاتھوں سے ریزہ ریزہ کر ناشروع کر دیا اور انہیں توڑ پھوڑ کر ہی دم لیا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنے دوستوں سے مخاطب ہوئے اور بولے۔

"دوستو! جیسا کہ تم نے دیکھ ہی لیا کہ میں اب پہلے جیسا شیخ زادہ نہیں رہا۔ میں اپنے وجود میں وہ جذب و کیف کی کیفیت محسوس کر رہا ہوں جس کے لیے برسوں سے سرگرداں تھا۔ مجھے وجد و حال کی وہ کیفیت نصیب ہوتی ہے کہ اب اس کے سامنے میرے تمام سابقہ مشاغل ہیچ ہیں لہٰذا اب میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ تم سب کی دوستی نبھا سکوں۔ اس لیے آپ بھی اب مجھے چھوڑ دیں۔ میں اب ہرگز آپ کی دوستی کے لائق نہیں رہا۔ آپ کوئی دوسرا دوست ڈھونڈ لیں۔"

دوستوں نے یہ سنا تو رنج سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے آپ سے مصافحہ کرتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے بعد شکاری کتوں کی باری آئی۔ وہ کتے جن پر آپ نے کثیر سرمایہ خرچ کیا تھا انہیں آپ کے حکم کے مطابق جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔
اب آپ کی حالت ایسی تھی کہ لوگ یقین ہی نہ کر پاتے تھے کہ یہ وہی پہلے والے شیخ زادہ ہیں۔ سر کے بال صاف کرا کے دنیا داری سے منہ موڑ کے خدا کے ذکر و فکر میں اس حد تک مشغول کہ دنیا سے ہی لاتعلقی اختیار کر لی۔
والد نے جو بیٹے کا یہ حال دیکھا تو خوشی سے کھل اٹھے بالآخر بیٹا راہِ راست پر آن ہی لگا تھا۔ غوث اعظم نے جو کچھ خواب میں فرمایا تھا اس کی تصدیق ہو گئی۔
مخدوم عبدالقادر ثانی نے دنیا داری کیا چھوڑی کہ دنیا داری کا ہر نشان خود سے جدا کرنے میں مشغول ہو گئے اور اس کی شروعات تو انہوں نے دوستوں اور اپنے مشاغل کو خیر آباد کہہ کر کر دی تھیں اب بادشاہ کی نوکری بھی چھوڑ دی۔ شاہی ملازمت کیا چھوڑی کہ بادشاہ کا عتاب مول لیا۔ بادشاہ نے جو یوں آپ کو بلاوجہ ملازمت سے سبکدوش ہوتے دیکھا تو آپ کو کہلوا بھیجا کہ حضرت آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ شاہی منصب دوبارہ قبول کر لیں۔ کیونکہ آپ نے اس سے دستبرداری کی کوئی معقول وجہ تو بیان فرمائی نہیں۔
آپ نے بھی بادشاہ کو صاف صاف بیان کر دیا کہ چاہے کچھ ہو جاتے وہ تو اب کسی صورت شاہی منصب کو قبول کرنے سے رہے۔ بادشاہ اسے اپنی ہتک نہ سمجھے بلکہ بندہ کو معذور سمجھ کر درگزر سے کام لے۔
بادشاہ بھی بے بس اور مجبور تھا۔ اب بھلا وہ آپ کے خلاف کس بات کی بنیاد پر قدم اٹھاتا۔ سو خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔
مخدوم عبدالقادر ثانیؒ اپنے خالق کے عشق میں ایسے ڈوبے کہ اپنی ذات کو بھلا بیٹھے۔ دن رات سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں بسر کرنے لگے۔ نماز استغراق یا پھر نماز اور مراقبہ یہ تھے شب و روز معمول۔
آپ کے والد اچانک بیماری کی لپیٹ میں ایسے آئے کہ جلد ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انہوں نے بیماری کے دوران ہی آپ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ آپ کے والد کا لوگوں نے بہت سوگ منایا۔ بادشاہ نے بھی دکھ کا اظہار کیا۔ جیسے ہی آپ کے والد کی وفات کو چند دن گزرے شاہی دربار سے ایک شخص تھیلوں میں بند رقم آپ کی طرف لایا اور کہنے لگا "بادشاہ نے یہ رقم آپ کے لیے بھیجی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کے والد کو بادشاہ کے دربار سے وظائف ملا کرتے تھے۔ اب چونکہ آپ اُن کے جانشین قرار پاتے گئے ہیں اس لیے بادشاہ نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ وظائف آپ کے والد کی زندگی میں انہیں ملا کرتے تھے وہ اب آپ کو روانہ کر دیتے جائیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے۔ ہاں اگر آپ کو وظائف کی رقم کم معلوم پڑے تو آپ اُس سے بادشاہ کو آگاہ کر سکتے ہیں۔ تاکہ بادشاہ آپ کی خواہش کے مطابق ان وظائف میں اضافہ کر سکے۔"
آپ نے وظائف لانے والے شخص سے کہا "دیکھو تم بادشاہ سے جا کر کہو جو وظائف ہمارے والد کی زندگی میں انہیں ملتے رہے ہیں ہم چاہتے ہیں اب اُن کے بعد ان وظائف کا سلسلہ بھی ختم کر دیا جاتے۔ چنانچہ ہم بادشاہ کے بھیجے گئے وظائف کو قبول نہیں کرتے۔ نہ ہی ہمارا اب ان سے کوئی سروکار ہو گا۔ ہمیں کسی صورت اس رقم کی چاہ نہیں۔"
بادشاہ نے یہ سنا تو اُسے یہ باتیں بہت گراں گزریں۔ اُس نے دوبارہ اسی شخص کو آپ کے پاس بھیجا اور کہلوایا "حضرت آپ شاید مال و زر کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں ورنہ آپ انہیں یوں لاپرواہی سے نہ ٹھکراتے۔ مال و زر وہ چیزیں ہیں جنہیں انسان اپنے پاس رکھنے کا خواہشمند رہتا ہے۔ آپ انہیں قبول ضرور فرما لیں۔ ہاں اگر آپ ان وظائف کو اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے زیر استعمال نہیں لانا چاہتے تو جیسے آپ کی مرضی آپ ویسے ہی کریں۔ لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہیں گے کہ یہ مال و زر حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے میں نمایاں کام سر انجام دیتا ہے۔ آپ اللہ لوگ ہیں۔ آپ کے پاس حاجت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ لہٰذا آپ اُن حاجت مندوں اور ضرورت مندوں پر اس مال کو خرچ کریں۔ اس سے مجھے خوشی و اطمینان حاصل ہو گا کہ میں کسی درویش کے کام تو آ سکا۔"
لیکن آپ نے بادشاہ کے خاص آدمی کو مال سمیت دوبارہ یہ کہلوا بھیجا۔
بادشاہ آخر کیوں نہیں سمجھ پا رہا کہ درویشی اور مال تو الگ الگ چیزوں کے نام ہیں۔ بھلا درویش کو مال و زر سے کیا کام۔ جہاں تک

حاجت مندوں کا سوال ہے تو حاجت مند ہر جگہ ہوتے ہیں اور نہایت کثیر تعداد میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا بادشاہ اگر واقعی بندگانِ خدا کی خدمت
کا جذبہ رکھتا ہے تو یہ مال خود اپنے ہاتھوں سے دربار میں آنے والے حاجت مندوں کو دے دے۔"
بادشاہ کو یہ پیغام ملا تو وہ سخت برہم ہوا۔ وہ خیال کرنے لگا کہ شاید عبدالقادر جیلانی کا یہ طرزِ عمل اس لیے ہے کہ وہ اس طرح اپنی انا
کی تسکین چاہتے ہیں۔

چنانچہ بادشاہ نے آپ کو لکھا "میں خُوب جانتا ہوں کہ آپ نے جو یہ طرزِ عمل بنا رکھا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ شاہی دربار کا منصب چھوڑنا
وظائف قبول کرنے سے انکار کرنا، یہ سب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آپ اپنی انا میں اس حد تک گم ہیں کہ اس کی تسکین کی خاطر بلا سوچے
سمجھے ہر جائز و ناجائز کام کر رہے ہیں۔ ورنہ آپ جیسے دانش مند صوفی یہ افسوسناک کھیل شروع کرنے سے قبل اچھی طرح سوچ لیتے کہ بادشاہ
وقت کو جو یوں ناراض کیا جا رہا ہے اُس کے نتائج کیا نکلا کرتے ہیں۔ اگر آپ کو ان کے بارے میں علم نہیں تو ہم بہت جلد آپ کو دکھا دیں گے
ایک بادشاہ کو ناراض کر کے دُوسرا انسان کس حد تک خود کو مصائب میں مبتلا کر لیتا ہے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے درباریوں اور دُوسرے حکام کو یوں تاثر دینا شروع کیا کہ جیسے وہ عبدالقادر سے سخت ناراض ہے۔ لہٰذا اگر
کوئی دُوسرا یہ چاہتا ہے کہ وہ بیک وقت بادشاہ اور عبدالقادر جیلانی کا ساتھ دے تو وہ دو گھوڑوں کی سواری کے انجام سے باخبر رہے۔ چنانچہ
لوگوں نے بادشاہ کی ناراضگی کا خطرہ مول لینا گوارہ نہ کیا۔ اور صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی کہ لوگ اب آپ کے پاس آنے سے کترانے لگے۔ یافت
سلسلہ بند ہو گیا اور آپ کی زندگی بادشاہ کے اس طرزِ عمل سے اجیرن ہو گئی۔ ہر طرف کھنچاؤ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

ادھر بادشاہ کے مخبر بھی پل پل کی خبر اُسے پہنچا رہے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ آپ کی مالی حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ
تک کی نوبت آگئی ہے تو انہوں نے فوراً بادشاہ کو ان حالات سے آگاہ کیا تاکہ اگر وہ چاہیں تو ان حالات میں آپ سے جو چاہے منوا لے۔
اب آپ کی حالت بہت نازک تھی۔ ہر طرف سے مایوسی کا سامنا تھا۔

چنانچہ بادشاہ نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور آپ کو ایک نامہ بھیجا جس میں اُس نے تحریر کیا "عبدالقادر آپ کسی زمانے
ہمارے دربار سے وابستہ تھے۔ پھر نامعلوم وجوہات کی بناء پر آپ نے شاہی منصب ٹھکرا دیا اور دربار سے اپنی وابستگی اس طرح ختم کی کہ
مطلع تک نہ کیا۔ پھر آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ کو اُن کا جانشین بنایا گیا۔ چونکہ آپ کے والد کو دربارِ شاہی سے وظائف ملا کرتے تھے
لیے اصُولاً ان کے جانشین مقرر ہونے کے بعد یہ وظائف آپ کو وصول کرنا تھے مگر جب ہم نے یہ وظائف آپ کو روانہ کیے تو آپ نے انہیں بھی واپس
آپ نے قدم قدم پر ہماری مخالفت کی۔ لیکن میں اب بھی آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور آپ کو معاف کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ حالانکہ آپ
جو تقصیرات ہیں انہیں کوئی بھی بادشاہ فراموش نہیں کر سکتا۔ لیکن میں آپ کو صرف ایک شرط کے بدلے معاف کرنے کو تیار ہوں اور وہ شرط یہ
کہ آپ دوبارہ ہمارے دربار سے وابستہ ہو جائیں اور اپنا شاہی منصب سنبھال لیں۔ اگر آپ اس پر رضامند ہیں تو میں بھی آپ کی کوتاہیوں
صرفِ نظر کرنے کو تیار ہوں۔"

بادشاہ کا خط پا کر آپ سمجھ گئے کہ بادشاہ کو کن حالات نے یہ خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بادشاہ کو لکھا۔
"اے دُنیاوی بادشاہ ہم تو اُس شہنشاہ کے دربار سے وابستہ ہو چکے ہیں جو اس پوری کائنات کا مختارِ کل ہے۔ پھر بھلا ہم ایک
دُنیاوی بادشاہ سے کیوں وابستگی لگائیں۔ ہم اپنے شہنشاہ کے در کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ خواہ اس کے لیے ہمیں کتنا ہی مصائب و
تکالیف کی چکّی میں پسنا پڑے۔"

بادشاہ کو جان لینا چاہیے کہ ہم نے خالقِ حقیقی کے عشق کا جو لباس پہنا ہے وہ لباس بادشاہی عشق نے عنایت کردہ اُس لباس سے کہیں
دلنشیں ہے جو بادشاہ ہمیں دینا چاہتا ہے۔"

آپ کا یہ جواب بادشاہ کو لاجواب کر دینے کے لیے کافی تھا۔ سو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ ویسے بھی وہ ایک شریف الطبع بادشاہ تھا۔ وہ
کے رُتبے سے واقف تھا اسی لیے عزت و احترام سے پیش آنے کی کوشش میں رہتا۔ لیکن دربار میں ہزارہا اقسام کے انسانوں سے اُس

بلا تردّد ، بغیر سوال

فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس

میں

زرِ مبادلہ لگائیے

آپ کے سرمائے پر بہترین منافع

زرِ مبادلہ کی ایک نئی دستاویز

حکومت پاکستان نے فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹس کے اجراء کا اعلان کر دیا ہے۔ اجرائی یکم اگست ۱۹۸۵ء سے شروع ہے۔

یہ سرٹیفکیٹس پاکستان میں اور پاکستان کے باہر اجرائی مراکز Offices of Issue یعنی بینک دولت پاکستان کی تمام شاخوں، پاکستان میں موجود تمام غیر ملکی بینکوں کی شاخوں اور اندرون و بیرون ملک پاکستانی بینکوں کی تمام نامزد شاخوں کے ذریعے فروخت کئے جا رہے ہیں۔

قواعد و ضوابط اور اجرائی مراکز Offices of Issue کی فہرست بینک دولت پاکستان نے الگ مشتہر کر دیئے ہیں۔

نمایاں خصوصیات:

- پاکستان میں اور پاکستان سے باہر پاکستانی اور غیر ملکی باشندے صرف زرِ مبادلہ کے عوض کسی بھی مقدار میں خرید سکتے ہیں۔
- خریدار کا نام درج کرنے یا ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔
- منتقلی کسی تحریری کارروائی کے بغیر ہوگی جس کی تحویل میں سرٹیفکیٹ ہوں گے وہی مالک تسلیم کیا جائے گا۔
- کبھی بھی کسی بھی مقدار میں درآمد یا برآمد پر کوئی پابندی نہیں۔
- منافع پر پاکستان میں انکم ٹیکس معاف ۔۔ دولت ٹیکس معاف۔
- پاکستانی بینکوں میں ضمانت کے طور پر قابلِ قبول۔
- مکمل رازداری۔
- زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی سے استثنیٰ۔
- پاکستان میں کسی وقت بھی اجرائی مرکز سے پاکستانی روپے یا زرِ مبادلہ میں، اور پاکستان سے باہر کسی بھی وقت اجرائی مرکز سے زرِ مبادلہ میں بھنائے جا سکتے ہیں۔
- پاکستان میں بھنائی ہوئی رقم زرِ مبادلہ میں پاکستان سے باہر کسی کو بھی ارسال کی جا سکے گی۔
- پاکستانی روپے میں بھنانے کی صورت میں متعلقہ اجرائی مراکز ایک سرٹیفکیٹ جاری کریں گے۔ اور اس رقم کی بابت ٹیکس حکام کوئی سوال یا تفتیش نہیں کریں گے۔
- ان میں سرمایہ کاری کے وسائل پر محکمہ انکم ٹیکس کوئی سوال یا تفتیش نہیں کرے گا۔

مختلف مالیت کے سرٹیفکیٹس بھنانے پر واجب الادا رقم حسب ذیل ہوگی جو سرٹیفکیٹس کے حامل کی صوابدید پر پاکستانی روپے یا مساوی غیر ملکی زرِ مبادلہ میں ادا کی جائے گی۔

تاریخ اجرائی کے بعد مدت	مالیت				
	روپے ۵۰۰/-	روپے ۱,۰۰۰/-	روپے ۵,۰۰۰/-	روپے ۱۰,۰۰۰/-	روپے ۱۰۰,۰۰۰/-
ایک سال سے کم	۵۰۰/-	۱,۰۰۰/-	۵,۰۰۰/-	۱۰,۰۰۰/-	۱۰۰,۰۰۰/-
ایک سال سے زائد	۵۶۲/۵۰	۱,۱۲۵/-	۵,۶۲۵/-	۱۱,۲۵۰/-	۱۱۲،۵۰۰/-
دو سال سے زائد	۶۵۵/-	۱,۳۱۰/-	۶,۵۵۰/-	۱۳,۱۰۰/-	۱۳۱,۰۰۰/-
تین سال سے زائد	۷۶۰/-	۱,۵۲۰/-	۷,۶۰۰/-	۱۵,۲۰۰/-	۱۵۲,۰۰۰/-

نہایت منافع بخش بچت کا ذریعہ

اجرائی مراکز کے نام اور پتوں کی تفصیلی معلومات اندرون اور بیرون ملک موجود پاکستانی بینکوں کی تمام شاخوں اور غیر ممالک میں قائم تمام پاکستانی سفارت خانوں سے دستیاب ہیں۔

اگر کوئی وضاحت درکار ہو تو اجرائی مراکز یا سیکریٹری، بینک دولت پاکستان، سینٹرل ڈائریکٹوریٹ، آئی۔ آئی۔ چندریگر روڈ کراچی سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

وزارتِ خزانہ

حکومتِ پاکستان

پڑتا رہتا تھا۔ جن میں چغل خور بھی ہوتے جو بادشاہ کو ہر دم آپ سے بھڑکائے رکھتے۔ بادشاہ انسان تھا۔ کبھی کبھی وہ ان کے بہکاوے میں آکر آپ کو اس قسم کے خط لکھ دیا کرتا تھا۔ مگر اُس کی اکثر کوشش یہی ہوتی کہ وہ آپ سے کبھی گستاخی کا سزاوار نہ ہو۔

یہ بادشاہ تاریخ میں سکندر لودھی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی دربار سے مخدوم عبدالقادر کے ایک بھائی بھی وابستہ تھے۔ چغل خور اکثر انہیں بھائی کے خلاف بھڑکاتے رکھتے۔ اُن سے کہا جاتا "میاں تم تو بہت ہی بھولے نکلے تمہارا حق مارلیا گیا مگر تمہارے لبوں سے شکایت کے طور پر ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ یہ تو کم ہمتی ہوتی ناں۔ بھلا باپ کی خلافت پر آپ سے زیادہ اور کس کا حق ہوسکتا تھا لیکن لے اڑے آپ کے بھائی اور آپ ہیں کہ خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ ایک تو آپ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور دوسرے آپ ہیں کہ تماشا دیکھتے جارہے ہیں کچھ کرنے کا نام نہیں لے رہے۔

لیکن عبدالقادر ثانی کے بھائی بھی ان چغل خوروں سے بہت حد تک واقف تھے۔ باتیں سُن تو لیتے مگر پھر ہنس کر انہیں ٹال دیتے۔

چغل خوروں نے جو یہ دیکھا کہ شیخ زادے پر ہماری کسی بات کا ہی اثر نہیں ہو رہا تو اب کی مرتبہ انہوں نے بادشاہ کو پکڑنے کا فیصلہ کیا اور بادشاہ سے کہنے لگے "حضور والا کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ آپ کی رعایا میں ایسے سرکش لوگ بھی ہیں جو آپ کی توہین کرنے سے بھی نہیں چوکتے؟"

بادشاہ نے سوالیہ انداز میں اُن کی طرف دیکھا تو ایک چغل خور آگے بڑھ کر کہنے لگا "حضور والا ہمارا اشارہ شیخ عبدالقادر ثانی کی طرف ہے۔ وہ درویش ہیں تو آپ ظل اللہ۔ انہیں کبھی کبھار تو آپ کے پاس آنا چاہیے۔ لیکن ہم بہت دنوں سے محسوس کر رہے ہیں کہ گویا وہ شاہی دربار میں آنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

بادشاہ بولا "ہاں کہہ تو تم صحیح رہے ہو۔ ہم خود بھی عبدالقادر کے اس طرز عمل سے بہت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔"

یہ سُن کر ایک چغل خور بولا "حضور والا شاید اُن کی درویشی کا لحاظ کیے ہوتے ہیں لیکن حضور یہ درویش لوگ بھی بڑے درجے کے دُنیادار ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دربار کے لوگ بھی جاتے ہیں اور اپنے حق میں دُعائیں کراتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں سُنا گیا ہے کہ دربار کا ایک امیر اُن کے پاس جاکر اس دُعا کا خواہش مند ہوا کہ آپ اُسے بادشاہی ملنے کی دُعا دیں۔"

بادشاہ نے پوچھا "پھر تم نے کیا دیکھا؟ دُعا دی انہوں نے؟"

چغل خور بولا "جب ایک شخص جاتے ہی اسی مقصد کے لیے کہ اپنے مرشد سے دُعا کرا کے ہی دم لے گا تو پھر کیوں نہ انہوں نے دُعا کی ہوگی ضرور کی ہوگی۔"

بادشاہ کو اب ان باتوں سے اُکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ اس نے بے رُخی سے کہا "جو کچھ جی چاہے وہ لوگ کرتے رہیں ہیں کیا کہ وہ درویش ہیں دُعا دیں یا بددُعا۔ میرا اُن پر کوئی اختیار تو ہے نہیں اور نہ میں ایسے لوگوں سے اُلجھنا چاہتا ہوں۔"

ایک چغل خور نے جو یوں بادشاہ کو ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو جھٹ آگے بڑھ کر کہنے لگا "حضور کو کیا ضرورت ہے کسی سے اُلجھنے کی۔ بندہ کے پاس ایک ایسی تجویز ہے کہ حضور والا ایک تو عبدالقادر کا زور بھی ٹوٹ جائے گا اور جو اُمراء ان سے دعائیں کرانے جاتے ہیں وہ بھی وہاں جانے سے رہ جائیں گے۔"

بادشاہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "اچھا ایسی کون سی تجویز ہے۔ ہم بھی تو ذرا سُنیں۔ اس نے جواب دیا "حضور اگر آپ عبدالقادر کی جگہ میں موجود اُن کے بھائی کو خلیفہ بنادیں اور جانشینی انہی کے نام کرادیں تو پھر لوگ بھلا کیوں عبدالقادر کے پاس جانے لگیں گے۔"

بادشاہ کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اس نے چغل خور کو انعام دیتے ہوتے کہا "واقعی تم نے یہ کام کی بات کی ہے۔"

اور پھر زور شور سے اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لیے کارروائی کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا جانے لگا۔

ابھی بادشاہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیاری ہی کر رہا تھا کہ ایک شخص کاغذات کا پلندہ اٹھاتے ہاتھ میں بادشاہ کے نام ایک خط لئے آن حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اختصار سے لکھا ہوا خط پڑھا یا اُس میں بادشاہ کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا۔

"بادشاہ سلامت شاید ابھی تک درویشوں کا مزاج نہیں سمجھ سکے۔ بھلا درویشوں کو شاہی جاگیروں اور مال و زر سے کیا دلچسپی ہوسکتی

جہاں تک سجادہ نشینی کا سوال ہے تو وہ بھی ہم خالی کرتے ہیں۔ بادشاہ جنہیں چاہے عطا کر دے۔ ہم ذرا بھی شکایت نہ کریں گے۔"
بادشاہ نے یہ سُنا تو گھبرا گیا۔ خوفزدہ ہو کر اُس نے آپ کے نام پیغام لکھوایا" جملہ فرامین جو حضرت نے آج واپس بھیجے ہیں وہ آپ کو دوبارہ
بھیجے جا رہے ہیں۔ مخدوم نے یہ کیسے جان لیا کہ ہم اُن کے خلاف کسی کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ گو کسی نے تجویز تو پیش کی تھی لیکن ہم نے اُسے
قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کبھی ہمارے ہاں قدم رنجہ ضرور فرمائیں۔" لیکن آپ نے کبھی دہلی دربار میں قدم نہ رکھا۔
آپ کے ہاتھوں میں وہ تاثیر تھی کہ اپنے جدِ اعلیٰ غوثِ اعظمؒ کی طرح جس مریض کو بھی اپنے دستِ مبارک سے چھو لیتے وہ صحت یاب ہو جاتا۔
ایک دن جوش سے آپ کے مُنہ سے نکل گیا" اللہ نے ہمیں وہ نعمت دی ہے کہ ہم جسے چاہیں ہاتھ لگا کر صحت یاب کر دیں۔"
اور واقعی آپ کی ہاتھوں کی تاثیر کے چرچے عام تھے۔ اور لگتا ہے بگا ہے اس کی تصدیق بھی ہوتی جا رہی تھی کہ اچانک شہر ایک مصیبت
میں مُبتلا ہو گیا۔
مریضوں میں پہلے پسلی کا درد اُٹھتا جو آہستہ آہستہ اس حد تک شدت اختیار کر لیتا کہ مریض درد سے بے حال ہو جاتا۔ پسلیوں کی مالش کروائی
جاتی لیکن افاقہ نہ ہوتا اور آخر میں مریض ہی چل بستا۔
اسی شہر میں ایک اور درویش غیاث الدین لنگاہ بھی رہا کرتے تھے۔ آپ کے مرید دن رات اس بات کا جاپ کرتے کہ ہمارے ہی مرشد
بلند تر ہیں اور ان کا رتبہ عبدالقادر سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب غیاث الدین لنگاہ انہیں اس سے منع فرماتے تو مرید آپ کی بات یہ کہہ کر رد
کر دیتے۔" حضرت آپ جس قدر عاجزی و انکساری کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ عرفان کی کس بلندی پر ہیں
اور عبدالقادر ثانی آپ سے کس قدر کم تر ہیں۔"
اسی مرض کے مریض جب غیاث الدین لنگاہ کے پاس لائے گئے تو وہ مشکل میں پڑ گئے۔ مشیتِ ایزدی کے پابند تھے۔ اور اس معاملے
میں خود کو دستِ پا سمجھتے تھے۔ لہٰذا مریض کو کیا جواب دیتے۔ خُدا کے آگے گڑگڑا کر دُعا کرتے۔" اے اللہ تُو نے یہ مجھے کس امتحان میں لا ڈالا ہے۔
مجھ سے کرامت کا اظہار چاہتے ہیں۔ میں انہیں یہی سمجھاتا ہوں کہ میں بھی تمہاری طرح کا ہی ایک انسان ہوں۔ لیکن وہ مجھ سے بد دل
ہوتے جا رہے ہیں۔
اُدھر عبدالقادر ثانی کے مرید بھی اپنے مریضوں کو آپ کے سامنے لانے لگے۔ ساتھ ہی وہ غیاث الدین لنگاہ پر چوٹ بھی کرتے کہ جب
ان میں کچھ ہے ہی نہیں تو پیری کا ڈھونگ کیوں رچاتے ہوتے ہے۔ آپ اس پر ناگواری کا اظہار کرتے۔ مریض کو دیکھتے اُس کی مرض آپ کی
سمجھ سے باہر تھی۔
چنانچہ رات کو خُدا کے حضور مدد کے لیے گڑگڑا کر دُعا مانگی۔ کافی دیر تک رو رو کر دُعا مانگتے رہے۔ رات کی نہ جانے کون سی ساعت میں
آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضور اکرمؐ خود آتے ہیں اور فرما رہے ہیں" عبدالقادر ہم نے غیاث الدین کو بانس کا ایک ٹکڑا دیا ہے۔ وہ اس
ٹکڑے کو تم جس مریض کو لگاؤ گے وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ براہِ راست تمہیں اس لیے نہیں دیا گیا کیونکہ غیاث الدین کے مرید اُس سے بد دل
ہوتے جا رہے تھے۔"
بیداری کے بعد آپ سیدھے غیاث الدین کے پاس پہنچے اور ان کے تمام ارادت مندوں کی موجودگی میں بانس کا ٹکڑا طلب کیا۔ پھر
سورہ اخلاص دس بار پڑھ کر پھونکی۔ اور اس ٹکڑے کو ہر مریض کے ساتھ مس کرنا شروع کر دیا۔ ٹکڑے کا مریض کو چھونا تھا کہ وہ
تندرست ہو جاتا۔
اور ملتان میں سب کی زبانوں پر اب اس بانس کے ٹکڑے کا ذکر تھا۔ ہر دو بزرگوں کے مرید بھی اپنے اپنے مُرشد کے مقام سے آگاہ
ہو کر دل ہی دل میں اپنے کہے پر شرمندہ تھے۔
مرضِ طاعون نے اس بُری طرح شہر کا رُخ کیا کہ آبادیوں کی آبادیاں چٹ کرنے لگا۔ ہر سُو جنازے ہی جنازے اُٹھتے دکھائی دیتے۔
لوگ گھر چھوڑ کر دُوسرے مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے۔

عبدالقادر جس جگہ وضو کیا کرتے تھے وہاں سبزہ اُگ آیا اور پھر نہ جانے کس مُرید کے دل میں آیا کہ اُس نے وہ سبزہ کھانا شروع کر دیا۔ گھاس کا بطورِ دوا استعمال ہونا تھا کہ وہ مُرید بھلا چنگا ہو گیا۔ اب تو ہر ایک کے علم میں یہ بات آگئی اور پھر مریضوں نے سبزے پر ٹوٹنا شروع کر دیا۔ سبزہ ختم ہوا تو مٹی کھانا شروع کر دی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ طاعون کا ہر مریض یہاں سے فیض یاب ہوا۔ اس طرح لوگوں نے آپ کو عبدالقادر ثانی کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

آپ نے اپنی زندگی قرآن اور سنتِ رسُولؐ کے مطابق بسر کی۔ جب تک زندہ رہے اپنے اعمال کی بدولت غیر مسلموں کو متاثر کر کے مُسلمان کرتے رہے۔ اسلام اور انسانوں کی خدمت ہی آپ نے اپنا شیوہ بنالی تھی۔ لوگ غربت سے امارت کی طرف عروج کرتے ہیں اور آپ عشقِ الٰہی میں اس طرح داخل ہوتے کہ امارت سے غربت کی طرف مراجعت فرمائی۔

اس طرح ۹۴۰ ہجری میں تاریخ کی یہ حیرت انگیز شخصیت وفات پاگئی۔

صحابہ اور حدیث

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا زمانہ ختم ہوا تو حدیث ابھی سینوں میں محفوظ تھی۔ حدیث کو پھلنے پھولنے کا اور دیار و بلاد میں پھیلنے کے مواقع ابھی حاصل نہ ہوئے تھے۔ اس لیے کہ حضرت عمر فاروقؓ صحابہ کو مدینے سے باہر جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپؓ نے صرف چند صحابہؓ کو کسی مصلحت کے پیشِ نظر باہر جانے کی اجازت دی تھی خلافتِ عثمانی کا زمانہ آیا۔ صحابہ کو مدینے سے باہر جانے کی اجازت مل گئی۔ لوگ دینی احکام سیکھنے کے لیے ان کے محتاج تھے۔ نوجوان صحابہؓ کی جانب لوگوں کا خصوصی میلان تھا۔ عمر رسیدہ صحابہؓ روز بہ روز کم ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں نے بزرگوں سے حدیثیں جمع کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ طلبِ حدیث کے لیے دور دراز کا سفر کر کے بزرگ صحابہ کے یہاں پہنچتے اور حدیثیں سیکھتے۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک صحابی کے بارے میں پتہ چلا کہ ان کو ایک حدیث یاد ہے، جو میں نے حضورؐ سے نہیں سنی تھی۔ چناں چہ میں نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر سامان سفر باندھا۔ پورا مہینہ سفر کرنے کے بعد شام پہنچ کر حضرت عبداللہ بن انیس انصاریؓ سے ملا۔ میں نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو حقوق العباد کے بارے میں ایک حدیث یاد ہے جو میں نے آنحضورؐ سے نہیں سنی۔ مجھے ڈر تھا کہ حدیث سننے سے پہلے میری یا آپ کی موت واقع نہ ہو جائے۔" عبداللہ بن انیس انصاریؓ کہنے لگے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

"لوگ قیامت کے دن غیر مختون خالی ہاتھ جمع ہوں گے۔" صحابہ نے عرض کی "کیا بات ہوگی؟" فرمایا "ان کے پاس کوئی چیز نہ ہوگی پھر اللہ تعالیٰ ان کو پکاریں گے جس کو دور و نزدیک والے سب سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں جزا و سزا دینے والا ہوں۔ کوئی جہنمی اس وقت تک دوزخ میں نہیں جائے گا جب تک اس سے قصاص کا مطالبہ کرنے والے جنتی کو اس جہنمی سے قصاص نہ دلادوں۔ اسی طرح کوئی جنتی جنت میں داخل نہ ہوگا، جب تک میں اس سے قصاص کا مطالبہ کرنے والے جہنمی کو اس جنتی سے بدلہ نہ دلوا دوں۔ حتیٰ کہ میں ایک تھپڑ کا بھی بدلہ دلواؤں گا۔" صحابہ نے عرض کیا "ہم تو وہاں غیر مختون خالی ہاتھ ہوں گے، پھر قصاص کیوں کر دیں گے؟" رسول اللہؐ نے فرمایا "نیکیاں دے کر (اگر ہوں) ورنہ دوسرے کی برائیاں اٹھا کر"

ابراهیم تبولی اپنے مریدوں کو بڑی مہربانی اور محبّت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے خود بہ نفسِ نفیس اُن کے حجروں میں جاتے قلبی واردات اور مکاشفات میں ان کی راہ نمائی کرتے۔ ایک مرید کے متعلّق حضرت کو معلوم ہوا کہ وہ زہد و رکوع اور عبادت و ریاضت میں افضل و اعلےٰ ہے لیکن درجے میں کم تر و ناقص ہے آپ نے ایک روز اس سے اس کی اس حالت کے متعلق دریافت کیا۔ مرید نے جواباً عرض کی۔ سیدی! مجھ کو اس روحانیت کے کارزار میں اپنا ہوش بھی نہیں میں نہیں جانتا کہ مجھ کو کیوں ناقص و کمتر درجہ ملا ہے میں اطلاً آپ بھی بھول چکا ہوں۔

ابراهیم تبولی نے فرمایا کہ کیا تجھ کو تیرا باپ بھی یاد نہیں ہے اس نے کہا حضرت بہت یاد ہے وہ مجھ سے رنجیدہ تھا اور اسی رنجش کے عالم میں وہ راہیِ عدم ہو گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تمہیں اس کی قبر کی پہچان ہے اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا آپ کی خانقاہ میں آنے سے قبل کوئی جمعرات ایسی نہ ہوتی جب میں اس کی قبر پر نہ گیا اس لیے مجھے قبر کی خوب پہچان ہے لیکن میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ والدِ گرامی مجھ پر راضی نہیں ہیں۔ چنانچہ اس دل گرفتگی کے باعث ہی میں نے آپ کے دامنِ رحمت میں پناہ لی ہے۔

سیدی ابراہیم نے مرید کو دل گیر پایا تو فرمایا اگر تم مجھے اپنے والد کی قبر پر لے چلو تو ہو سکتا ہے میں ان کو تم سے راضی کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس طرح پیر مرید دونوں گورستان پہنچے اور قبر کی نشان دہی کی گئی۔ اس پر ابراہیم تبولی نے مرید سے فرمایا میں نے علوم باطنی براہِ راست آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیے ہیں اور بعض اوقات مشیتِ ایزدی کے اشاروں پر ہمیں ممنوع حدود سے باہر آنا پڑتا ہے چنانچہ آج کا واقعہ تم کسی کو نہ بتلانا۔

ابراہیم تبولی قبر کی طرف بڑھے اور مرید کے باپ کو اس طرح آواز دی جیسے وہ سامنے کھڑا ہو مرید حیران ہو گیا' اس کا والد سر پر سے خاک جھاڑتا ہوا حضرت کے سامنے کھڑا ہو گیا اور عرض کی حضرت ناچیز کے لیے کیسے تکلیف کی اور میرے لیے کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا ہمیں معلوم ہوا کہ تم اپنے فرزند سے رنجیدہ ہو اور اس وجہ سے وہ اپنی تمام مقبول بندگان خدا والی صلاحیتوں کے باوجود خدا کے اکرام سے محروم ہے اس کو معاف کر دو مرید کے والد نے ابراہیم تبولی اور کچھ غائب از نظر لوگوں کو مخاطب و گواہ بنا کر کہا کہ میں نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا۔

ابراہیم نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح وہ دوبارہ قبر میں داخل ہو گیا۔ قبرستان سے واپسی پر ایک سن رسیدہ خاتون آہ وزاری

کرتی ہوئی ابراہیم تبولی کے پاس جا رہی تھی لیکن اس نے جب یہ دیکھا کہ ابراہیم خود اس کی طرف چل کر آ رہے ہیں۔ وہ ایک دل خراش چیخ مار کر زمین پر گر گئی۔ آپ کو اس کی اس حالتِ زار کا بہت دکھ ہوا۔ آپ آب دیدہ ہو گئے۔ اس کو سہارا دے کر اٹھایا اور اس گریہ زاری کی وجہ پوچھی وہ رقت سے بولی کہ کچھ فرنگی میرے بچے کو اغوا کر کے لے گئے ہیں آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ وہ سامنے جو لڑکا آ رہا ہے۔ کیا وہ تمہارا ہے بڑھیا نے مڑ کر دیکھا اور بولی بالکل یہی میرا بچہ ہے اور دیوانہ وار لڑکے سے لپٹ گئی۔ آپ نے اپنے ساتھی مرید سے کہا دیکھو! اللہ نے اپنے بندوں کی دعا کتنی جلدی قبول کی ہے ابھی دعا لبوں کے اندر ہے اور نیت ہی دیکھ کر استجابت ہو گئی ہے۔

یہ وہ ابراہیم تبولی تھے جو اپنے سن آغاز میں قاہرہ کے حسینیہ محلہ کی جامع مسجد کے باہر بازار میں چنے فروخت کیا کرتے تھے یہ کم سن بچہ چنوں کا خوانچہ سامنے رکھے جھوم جھوم کر درود شریف کا وظیفہ کرتا اور اپنے معمول میں اس قدر مگن ہو جاتا کہ اس کو اپنے ارد گرد اور کاروبار کا کوئی خیال نہ رہتا۔ اس خواہش میں وہ شدت تھی کہ درود پاک کی رفتار میں رفتہ رفتہ تیزی آنے لگتی اور اس روز تو اس جذب اور شیفتگی کے ساتھ کم سن بچہ درود شریف پڑھ رہا تھا کہ گویا وہ اپنے کاروبار کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس کا دل یہ چاہتا تھا کہ یہ چنے جو کاروبار کی شکل میں میری ریاضت اور شوق و لگن میں رکاوٹ ہیں۔ میں مفت تقسیم کر دوں۔ لیکن یہ کرنا بھی بڑا مشکل تھا۔ روزی کے اسباب کو ختم کرنا یا ٹھکرانا بھی خلاف شریعت ہے۔ ابھی وہ اپنے خیالوں میں غرق تھا۔ اور درود شریف کے ورد میں مگن تھا کہ اس کے کانوں میں قریبی مسجد کے قاضی معز الدین کی آواز پڑی کہ بچے آج تمہارے درود شریف کی صدائیں بڑی مدھم ہیں۔ ہونٹ چپ ہیں۔ کلام جاری ہے ابراہیم یہ سوچ رہے ہیں کہ آج اگر آنحضرت یہاں سے گذریں اور مٹھی بھر چنے ہی نذرانہ کے طور پر قبول فرمالیں تو کتنی بڑی سعادت ہو گی اس کو قاضی معز الدین کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ بار بار بلانے پر ابراہیم قاضی معز الدین سے مخاطب ہوئے اپنی مدھم آواز سے وظیفہ پڑھنے کی وجہ بیان کی کہ یہ میری مادرِ محترم کا حکم ہے۔ وہ فرماتی ہیں تم درود شریف کا وظیفہ پڑھتے ہو۔ لوگ اس سے متاثر ہو کر تمہارے چنے خرید لیتے ہیں۔ یہ ریاء ہے تمہیں وظیفہ دل سے پڑھنا چاہیے اور صدائے کاروبار زبان سے لگانی چاہیے۔ کیونکہ رزقِ حلال اور کسب کمال صفتِ پیغمبری ہے میں آپ والدہ کی نصیحت اور ہدایت پر عمل پیرا ہوں۔ قاضی معز الدین بولے بیٹا! میں بھی تمہیں یہی بات سمجھانا چاہ رہا تھا۔ لیکن ابراہیم جتنا اپنی طبیعت کو اپنے بس کرتے اتنا ہی بے بس ہوتے جا رہے تھے انہوں نے کہا کہ قاضی معز الدین مجھے معلوم ہے کہ سرکارِ دو عالم آپ کی قرأت سننے یہاں تشریف لاتے ہیں۔ اور اسی لیے زور سے درود شریف پڑھتا ہوں کہ میری آواز ان کے کانوں میں پڑ جائے۔ اور ان خوش نصیبوں میں شامل ہو جاؤں جن کا پیغمبر خدا کی نگاہ میں لطف و کرم ہے۔ قاضی صاحب نے یہ باتیں سنیں تو ابراہیم تبولی سے کہا، تمہاری عمر بہت چھوٹی ہے تمہیں تعلیم اور متعلم کی ضرورت ہے۔ ابراہیم نے عرض کی میں تو چنے فروخت کرنے والا ہوں۔ کیا کوئی ایسا عالم ہے جو مجھے تعلیم کے ساتھ سرورِ کائنات کے دیدار سے بھی ہمکنار کر دے۔ قاضی صاحب نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ دیدارِ حبیب کے لیے تعلیم کی نہیں جذب، شیفتگی، لگن و شوق کی ضرورت ہے جواباً ابراہیم نے کہا کہ پھر مجھے لگن اور شوق کو تعلیم پر فوقیت دینا ہو گی۔

یہ کہانی اس پیدائشی ولی کی ہے جس کو نہ کہیں سے خرقہ خلافت ملا نہ اس کو استادوں اور معلموں کی ضرورت پڑی سرکارِ دو عالم خود اس شیخ کو طریقت کی تعلیم دی۔ آپ نے درود شریف کا ورد جاری رکھا۔ اس میں آپ کو اندیشہ ہوا کہ آپ کی نمازیں بھی کہیں ضائع نہ ہو جائیں کیونکہ ذکرِ مصطفےٰ آپ کو اس قدر بے خود کر دیتا کہ آپ کو کسی بات کا ہوش تک نہ رہتا تھا۔ آپ کی والدہ آپ کو نماز کے لیے فوراً آگاہ کرتیں اور مسجد روانہ کرتیں۔ لیکن لمحہ بہ لمحہ، زینہ بہ زینہ آپ کی رقت میں اضافہ ہوتا جاتا۔ آپ جب درود شریف پڑھتے یوں محسوس ہوتا کہ زمین آسمان شجر، حجر، بشر و جن، چرند و پرند سب آپ کے ساتھ ذکرِ حبیب میں غرق ہیں آپ اب ان کیفیات میں داخل ہو چکے تھے کہ آپ کا شہر میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک روز بعد از نماز فجر اپنی والدہ کو خدا کے سپرد کر کے تنِ تنہا جنگل کی طرف نکل گئے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ اس میں آپ کو درود شریف کا ورد کرنے کا وہ لطف آیا جو آبادی میں عنقا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اب آبادی میں رہنے سے بہتر ہے کہ ویرانے میں اپنا مسکن بنایا جائے۔ جہاں وہ ہوں اور ذکرِ حبیب ہو۔ آپ کو نہ اپنے کھانے پینے کی فکر تھی، نہ اوڑھنے بچھونے کی۔ آپ کو عجیب و غریب وسائل سے رزق حاصل ہو جاتا۔ آپ نے بس اپنا مقصود درود شریف بنا لیا تھا۔ ایک طویل عرصہ آپ نے صحراؤں اور ویرانوں میں

ن رات اور سورج کے طلوع و غروب سے آپ بالکل بے خبر تھے۔ رات بھر نوافل اور درود شریف کے وِرد میں مشغول رہتے لیکن ابھی تک
ن کو جاگتی آنکھوں سے حضورؐ کا دیدار نہیں نصیب ہوا تھا۔ اسی شوق میں غرق ایک دن وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی۔
مت کعبہ موضوع گفتگو تھا۔ آپ کی زہد و ریاض والی شکل دیکھ کر ایک بزرگ نے پوچھا۔ اے اجنبی! تو ان ویرانوں میں خدا کا نام لیتا ہے
تمہیں اپنے نوافل اور نماز ادا کرتے وقت کعبہ کی سمت کا اندازہ کس طرح ہوتا ہے آپ نے جواباً عرض کی کہ میں اندازوں سے سمت کا تعین
تا ہوں بس اس پر اس بزرگ نے کہا کہ تم نے اپنی ساری نمازیں ضائع کر دیں۔ نمازی نماز ادا کرتا ہے تو کعبہ اس کی نگاہوں کے سامنے
تا ہے۔ اس پر اس کی حیرت کی انتہا ہو گئی کہ کعبہ تمام حاضر لوگوں کے سامنے موجود تھا آپ اس رات بہت روئے۔ خدا سے عرض کی،
ے معبود! تو اگر اس بزرگ کی خاطر کعبہ کا دیدار کرا سکتا ہے تو اس ناچیز کو بھی اپنے محبوب کا دیدار کرا دے میں خوابوں کی بجائے چشمِ حقیقت
سے تیرے محبوبؐ کا ہاتھ تھام کر تیری طرف آنے کا خواہش مند ہوں۔ دعا مانگتے جاتے اور روتے جاتے۔ اس کے بعد آپ نے اس
یہ زاری سے درود شریف پڑھنا شروع کیا کہ صحراء و نخلستان اور کوہسار و میدان تھر تھرانے لگے۔ قریب تھا کہ درخت جل کر راکھ ہو
تے۔ آپ نے اپنے کندھوں پر ایک نرم و نازک ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ فضا معطر و منور ہو گئی۔ چہار سُو چاندنی پھیل گئی۔ ابراہیم سمجھتے کہ
واب ہے مگر یہ حقیقت تھی۔ آپ کے مُنہ سے بے اختیار نکلا کہ اللہ تیرے علاوہ کوئی لائقِ عبادت نہیں۔ محمدؐ تیرے رسول ہیں۔ یہ کہہ کر
ب نے پلٹ کر دیکھا تو حضورِ آپ کے سامنے تھے قبل اس کے کہ ابراہیم غش کھا کر گر جاتے آپ کو سرکارِ دو عالمؐ نے اٹھایا اور اپنے
ن سینے سے لگا لیا۔

ابراہیم نے اس طرح علم و عرفان کے خزانے حاصل کیے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے آپ نے اپنے آپ کو نور کے چشمہ
کنارے پر کھڑا پایا۔ آپ حضور سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ بہت کچھ سننے کے متمنی تھے لیکن آپ کو حکم ملا۔ تمہیں تمہاری توقع کے مطابق
ب پھل گیا ہے۔ اور دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ آقائے دو عالمؐ نے آپ کو خلقِ خدا کی خدمت و راہبری کے لیے قاہرہ جانے
حکم دیا۔ یوں ایک مدتِ دراز کے بعد آپ قاہرہ واپس آئے۔ آپ کی والدہ اس عرصہ میں واصلِ حق ہو چکی تھیں۔ آپ کی منزلت و فضیلت
کر اہلِ قاہرہ حیران رہ گئے۔ حصولِ ہدایت کی خاطر وہ اس خوانچہ فروش کے ارد گرد جوق در جوق جمع ہونے لگے۔

آپ نے حضور کے حکم سے برکہ حاج میں اپنے لیے حجرہ اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ کاروانِ حجاز یہاں پر رُکتے، آرام کرتے اور آگے سفر
روانہ ہوتے۔ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیم عارف و زاہد بیٹے والوں کے لیے تمہاری خانقاہ ایک پرسکون عبادت گاہ
ثابت ہوگی اور مصر پہ ایک نازل ہونے والا عذاب تمہاری اس خانقاہ کی بدولت لوگوں سے ٹل جائے اور جبتک یہ خانقاہ آباد رہے مصر بھی
رہے گا۔

ابراہیم تبولی فرماتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے سیّد احمد بدوی اور میرے درمیان اخوت کا رشتہ قائم کیا ہے سیّد احمد بدویؒ تمام ولیوں
سے فوقیت لے گئیں بزرگ ہیں۔ قائم نام کا ایک وزیر آپ کے مقام سے حسد کرتا تھا اس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ابراہیم تبولی اور ان
خانقاہ مکینوں کو اتنا تنگ کرو کہ یہ لوگ اس جگہ سے کُوچ کر جائیں میں اس جگہ پر محل تعمیر کراؤں گا۔ اس پر غلاموں نے عمل درآمد شروع
آپ نے پہلے پہل تو شر پسندی کو حتی الامکان گوارا کیا۔ پھر آپ نے اپنا ایلچی قائم وزیر کے پاس بھیجا اور اس کو اپنی روش سے باز آنے کو
ان پر وہ زیرِ خندہ ہو کر بولا۔ ابراہیم تبولی! تم میرے پہلے اقدام سے ہی خوفزدہ ہو گئے ہو۔ اگر کچھ ہوتا تو مجھے مفلوج کر دیتے یا میرے
ازوؤں میں مبتلا کر کے مجھے اپاہج بنا دیتے۔ پھر اس نے اپنے کارندوں سے کہا جاؤ! اور ابراہیم تبولی سے کہو کہ خانقاہ ابھی خالی کر دے
ان حجروں کو میں اصطبل میں تبدیل کر دوں گا۔ ابراہیم تبولی نے یہ بات سنی تو جلال میں آگئے اور فرمایا ہم تیر چلاتے ہیں، مفلوج نہیں کرتے
آپ نے سہ مرتبہ دہرایا۔ اس کے بعد مخلوقِ خدا نے دیکھا وزیر اتنی لرزہ خیز اور عبرت ناک موت مرا کہ برسوں بعد بھی اس کی کیفیتِ نزع
لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

آپ نے اپنی خانقاہ کے ارد گرد سایہ دار درخت اور پھول و پھلدار پودے لگا رکھے تھے جو جنتِ ارضی کا سماں پیدا کرتے تھے۔ سبزہ زاری

کا یہ عالم تھا کہ چند چرواہوں کو اپنی بکریوں کے لیے یہ سبزہ زار بہت پسند آگئے ۔ انہوں نے اس جگہ پر بزورِ بازو قبضہ جمانا چاہا ۔ ابراہیم تبولی کی
مزاحمت پر انہوں نے دس خونخوار کتے ان پر چھوڑ دیے ۔ کتے شیروں کی طرح بھاگے اور آپ پر حملہ آور ہونے ہی کو تھے کہ قریب پہنچ کر ان
کے خوف سے ان کی گردنیں جھک گئیں ۔ آپ نے فرمایا ۔ یہاں سے واپس ان لوگوں کے پاس جاؤ جنہوں نے تمہیں میری طرف بھیجا ہے
کہنا تھا کہ کتے اسی خونخواری اور تیز رفتاری سے اپنے مالکان کی طرف بھاگے اور وحشیانہ انداز میں ان پر حملہ آور ہوئے ۔ افضا چیخوں سے
گونج اٹھی اور چرواہوں کا کام تمام ہوگیا ۔

آپ کی کرامات انسان کو حیران کر دیا کرتی تھیں ۔ فرعون گڑھی کے قریب ایک باغ میں آپ کا قیام تھا کہ فوجیوں کا ایک دستہ شراب
کے مٹکے اٹھائے باغ میں داخل ہوا اور شراب نوشی کے ساتھ شور وغل کرنے لگے ۔ آپ نے اپنے مریدان کو مخاطب کر کے فرمایا ان گم
کو کون ہدایت کی راہ دکھائے گا ۔ ایک درویش اٹھے اور اجازت طلب کر کے اس دنیا وما فیہا سے بے خبر گروہ میں گھس گئے ۔ ان لوگو
پر چشمِ جلال ڈالی ۔ ایسا کرنا تھا کہ ان لوگوں نے شراب کے گھڑے توڑ ڈالے اور ایک دوسرے پر ڈنڈا باری کرنا شروع کر دی اور ا
دوسرے کو لہولہان کر دیا ۔ جب تمام فوجی سپاہ ایک دوسرے کو ہلکان کر چکے تو ابراہیم تبولی کے قدموں میں گر کر معافی مانگی ۔ آپ نے
انھیں نہ صرف معاف کر دیا بلکہ دعائے خیر بھی دی ۔

آپ کو خلوت کی عبادت بالکل پسند نہیں تھی آپ اپنے مریدوں کو بھی ایسا کرنے سے روکا کرتے تھے آپ فرماتے " دنیا میں رہ کر
کی دلچسپیوں کو دیکھ کر لذتوں اور ترغیبوں پر فتح حاصل کرنا عین عبادت ہے ۔ الّو کی طرح اندھیرے کا انتخاب کرنا تو پرلے درجے کی بز
ہے آپ فرماتے جو اندھیرے کو اجالے پر ترجیح دیتے ہیں خدا ان پر رحم کرے ۔

آپ کا کوئی مرید جب بھی دنیا سے آزادی حاصل کر کے عبادت کرنا چاہتا تو آپ منع فرماتے ۔ شرعی احکام کی بجا آوری کی ترغیب
نکاح اور دنیا کی دیگر ذمہ داریوں سے نبھاہ کو افضل ترین عبادت قرار دیتے ۔ جو مرید اس حد تک خدا کی راہ میں آگے نکل جاتا کہ اس کی وا
نظر آتی اور وہ بشری تقاضوں کا اہل نہ رہتا ۔ اس کی عبادت میں مخل ہو کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر فرماتے ۔ اللہ کی عبادت اس طرح کرو
اس کا حق ہے ۔

آپ نے عمر بھر شادی نہ کی ۔ حالانکہ آپ نے طویل عمر پائی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے زندگی میں ایک بار بھی غسلِ جنابت نہ کیا تھا ۔ آ
کہ میں شریعت کے احکام سے واقف ہوں مگر مجھے معلوم ہے کہ میری نسل مجھ پر ہی تمام ہو جائے گی اسی لیے آپ نے تمام عمر کڑی ریاضت
میں صرف کی ۔ بعض لوگوں کو آپ کا یہ طریقہ کار پسند نہ تھا ۔ آپ ان کو خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے کہ میں زہر کی بوتل کی طر
بندوں کی سمجھ کی دسترس سے باہر ہوں ۔ لہذا مجھ کو دنیا اور دنیا والوں سے کوئی معاملہ و علاقہ نہیں ۔

ایک دفعہ قاہرہ کے رئیس ابن البقری نے ایک شخص سے اسکی گائے چھین لی ۔ غریب شخص کی گائے اس کی اور اس کے اہلِ خانہ
تھی وہ فریاد لے کر ابراہیم تبولی کے پاس پہنچا ۔ آپ فوراً ابن البقری کے گھر پہنچے وہ اپنے پیر ابن الرفاعی کے حلقہ میں بیٹھا تھا جو
آپ کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ آپ گائے کے لیے آئے ہیں ۔ پیر ابن الرفاعی نے گائے غصب کرنا جائز قرار دے دیا ۔ آپ
سے کہا یہ تیرا کیسا پیر ہے جو انسانی آزار کی اجازت دیتا ہے کیا تیرا مرشد انسانوں کو اپنے مداری باپ کے بندر ، ریچھ اور کتے سمجھتا ہے
کی چابک پر ناچتے تھے ۔ ابن البقری کو آپ کی بات پر یقین نہ آیا لیکن اس نے جب نظر اٹھائی تو سامنے بندر ، ریچھ اور کتے دف پر
تھے ۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر ابن الرفاعی ابراہیم تبولی کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگا کر معافی مانگنے لگا ۔ اس پر ابن البقری اور اس کے
باڑے سے گائے کھول کر ننگے پاؤں مالک کے گھر پہنچاتے گئے اور عمر بھر ابن البقری اس گائے کے مالک کی کفالت کرتا رہا ۔

ابراہیم تبولی اپنے مریدین کو اپنے بچپن کے واقعات اکثر سناتے کہ جب میں خوانچہ میں چنے فروخت کیا کرتا تھا اور رسالہ
شریعت کا ورد کرتا ۔ ایک روز مجھ پر ایسی حالت طاری ہو گئی کہ میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا ۔ لوگ میرے ورد و شریعت کا ورد
اور میرا خوانچہ سکوں سے بھر گیا ۔ کب چنے فروخت ہوئے ، کیسے فروخت ہوئے مجھے کچھ علم نہ تھا جب میں ہوش میں آیا تو گھر واپس

نے کہا بیٹا! میں نے سنا اب تو چنوں کی بجائے درود شریف فروخت کرتا تھا۔ ابراہیم فرماتے ہیں میں اپنی غلطی کے بارے میں سوچنے
قاصر تھا۔ ہاں والدہ نے حکم دیا کہ اپنی زبان سے کہو کہ وہ چنے بیچے اور دل سے کہو کہ وہ درود شریف پڑھے آپ نے اس حکم کی بجا آوری
کا عہد کر لیا۔ لیکن ایسا کرنے پر فرماتے ہیں میں اختیار نہیں رکھتا تھا جو کچھ ہوتا بے خودی میں ہوتا تھا اور جب میں ایسی صورتِ حال سے دوچار
ہوا کہ ضبط ممکن ہی نہ رہتا تو میں شہر سے جنگل میں نکل کھڑا ہوتا کہ والدہ کی حکم عدولی سے بھی بچوں اور لوگوں میں تماشہ بھی نہ بنوں۔
قصبہ حصن کیفا کے ایک بزرگ شیخ جمال الدین یوسف ابراہیم تبولی کے متعلق ہزاروں میل دُور بیٹھے سُنا کرتے تھے ایک دن اپنا گھر بار
چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مریدین میں شامل ہو گئے۔ جمال الدین نے اپنی زندگی آپ کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ اور
عزیز ترین مریدین گئے اور کئی سال آپ کی خدمت میں رہے اور گھر والوں کی مطلق خبر نہ لی۔ ایک روز آپ کو والدین اور برادر و خواہر کی یاد
ستایا۔ وطن کی گلیاں اور بازار دوست احباب بے اختیار یاد آنے لگے۔ یہ اشتیاق اس قدر بڑھا کہ عبادت متاثر ہونے لگی۔ اس زمانے
قافلوں کے ذریعے سفر کیا جاتا تھا۔ شیخ جمال الدین نے اپنی مشکل مرشدِ عالی سے بیان کی۔ دل کی بے قراری کا بھی ذکر کیا۔ سفر کی دشواری
تذکرہ کیا۔ ابراہیم تبولی نے مسکرا کر اپنے مرید کی باتیں سنی اور فرمایا میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں تمہارے اعزاء و اقرباء سے ملا دے۔ شیخ جمال
حجرے میں عبادت کے لیے داخل ہوئے تو ان کو یوں لگا جیسے وہ اپنے آبائی شہر کے بازار میں کھڑے ہوں۔ وہی لوگ وہی ماحول،
بستی، وہی مکان آپ کو پہلے تو یہ سب باتیں جاگتے میں خواب نظر آئیں لیکن جب آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے شیخ جمال الدین کو پہچان لیا
کوئی مصافحہ کر رہا ہے کوئی معانقہ کر رہا ہے پھر آپ کو یقین ہوا کہ میں واقعی اپنے وطن میں پہنچ چکا ہوں سالوں کی دوری کے بعد جب والد
بہن بھائیوں کو آپ کی آمد کا علم ہوا وہ بہت خوش ہوئے۔ آپ کی خاطر مدارات ہونے لگی، دعوتِ طعام ہونے لگی مگر آپ تو اس کر
سفر پر حیران تھے لیکن آپ نے کسی کو یہ سربستہ راز نہ بتلایا۔ اس کے لیے کئی دروغ مصلحت آمیز بھی بولنے پڑے مگر آپ نے راز کو
گھر والے آپکی شادی پر مُصر تھے مگر آپ نے اپنے مرشد کی اجازت کے بغیر شادی کرانے سے انکار کیا اور مسجد میں درس و تد
کا کام شروع کر دیا۔ اور نو مہینہ کی مدت میں انہوں نے اپنے علاقہ کو علم و عرفان کا گہوارہ بنا دیا۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا ان
اندر عجیب سی بے قراری پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ابراہیم تبولی کے لیے ان کا دل بے چین ہو گیا تھا۔ انہوں نے واپس مرشد کی خانقاہ میں
کا ارادہ کیا لیکن والدین کی محبت رکاوٹ بن رہی تھی آپ کی قوتِ برداشت جب جواب دینے لگی تو آپ کے گھر والے مجبور ہو گئے
ان دنوں کوئی قافلہ جانے والا نہیں تھا۔ شیخ جمال الدین نے قافلہ کا انتظار کیے بغیر سفر کا آغاز کر دیا۔ ابھی وہ ایک منزل بھی نہ چلے
گئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ابراہیم تبولی کی خانقاہ سے ملحق اپنے حجرہ میں پایا۔ مگر آپ کے ساتھی مریدین نے آپ کی بالکل پذیرائی
آپ کو بہت دکھ ہوا آپ نے اپنے پیر بھائیوں کے ساتھ انکی بے رُخی کی شکایت کی کہ میں اتنی دور سے آیا ہوں آپ لوگوں نے مجھ
تک نہیں کیا۔ وہ سب ہنسنے لگے اور شیخ جمال الدین کے متعلق مشہور کر دیا کہ ان کا دماغ لوٹ گیا ہے آپ نے تمام ماجرا ابراہیم تبولی
سنایا۔ وہ فرمانے لگے دیکھو! تمہارے وطن جانے اور وہاں سے آنے کا سارا قصہ ایک سربستہ راز ہے تم نے اس راز کو افشا کرنے کی
کوشش کی تو لوگوں نے تمہیں پاگل قرار دے دیا۔ تمہاری زندگی ان پُر اسرار منازل طے کرنے کے لیے ہے۔ اور تم ان
ظاہر کرو گے تو وہ مقام تمہیں کیسے حاصل ہوگا جس کے لیے تم کوشاں ہو۔ آج میں زندہ ہوں کل میرے بعد کون تمہاری پشت پناہی
کا۔ تم نے نو ماہ وطن میں گزارے تدریس کا کام کیا والدین و اعزاء کے ساتھ وقت بسر کیا۔ یہ تم جانتے ہو تمہارے ساتھی تو تمہارے متعلق
ہیں کہ تم حجرے میں عصر کی نماز پڑھنے گئے تھے واپس آ گئے ہو۔ اس پر شیخ جمال الدین نے سکوت اختیار کیا مگر تین سال بعد جب ان
والدین ان کو ملنے برکہ حاج آئے تمام درویشوں نے ان کے اعزاز میں ضیافت دی۔ وہاں شیخ جمال الدین کے وطن آنے اور
قصہ چھیڑ دیا گیا اور راز افشاء ہوا۔ اب لوگوں نے ابراہیم تبولی سے عرض کرنا شروع کی کہ انہیں بھی ایسی راہ دکھائی جائے جس سے شیخ جمال
سفر کے مرحلے تمام ہوئے اور ان کا حال ہماری نظروں سے مستور رہا۔
آپ نے مریدوں کی باتیں سن کر فرمایا۔ ہر چیز اس وقت تک پوشیدہ رہتی ہے جب تک اندر کے جمال کو دیکھنے کی بینائی پیدا نہ ہو

اندر وہ بینائی پیدا کرو تو یہ صلاحیت خود بخود تم میں پیدا ہو جائے گی پردے خود بخود تمہاری نظروں کے سامنے سے اُٹھ جائیں گے۔ اسرار کے دروازے از خود تمہارے اوپر وا ہو جائیں

آپ ہی کے زمانے میں دو قبیلے بنو وائل اور بنو حرام ہوا کرتے تھے بنو وائل قبیلہ اپنے آپ کو افرادی قوت اور طاقت کے بل بوتے پر بنو حرام سے برتر سمجھتا تھا اور ہر وقت ظلم و تشدد کا بازار گرم کیے رکھتا۔ ایک دفعہ بنو وائل نے بنو حرام پر حملہ کر دیا۔ بنو حرام کی لُٹی پٹی مستورات و اطفال اور بوڑھوں نے ابراہیم تبولی کی خانقاہ میں پناہ لی۔ آپ نے بنو وائل کے سردار کو پیغام بھیجا کہ تکبر اور طاقت کا غرور اللہ کو ناپسند ہے بزرگی اور برتری صرف خدا کو حاصل ہے۔ عزت اور ذلت اس ـــ کے ایماء پر تقسیم ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنے قبیلے کو بنو حرام کی تباہی سے نہ صرف باز کرو بلکہ اُن کو اِن کے علاقے میں امن و سکون سے رہنے دیا جائے۔ سردار نے آپ کا پیغام سنا تو چراغ پا ہو گیا۔ اس نے قاصد کی بڑی اہانت کی۔ قاصد نے اس کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا نیکی اور بدی کے فرق سمجھائے۔ سردار بجائے کچھ سمجھنے کے انتہائی غضبناک ہوا اور کہا کہ تم واپس چلے جاؤ اور اپنے مرشد سے کہنا کہ شکر کرو کہ تمہیں ہم نے یہاں خانقاہ میں رہنے دیا ہوا ہے اگر تم آئندہ ہمارے معاملات میں دخل انداز ہوئے تو تمہیں ہماری طاقت کا اندازہ ہے ہی۔ ہم جب تک مدینے کے حوضوں میں اپنے گھوڑوں کو پانی نہ پلا لیں گے ہماری کاروائیاں نہیں رک سکتیں۔ ابراہیم تبولی نے سردار کا جواب سنا۔ اس وقت آپ کے پاس بنو حرام کے بچے بوڑھے اور خواتین ـــ سب بیٹھے تھے وہ سب گریہ زاری کرنے لگے آپ نے اِن کو تسلی دی کہ اللہ تعالےٰ غرور سے نفرت کرتا ہے آج بنو وائل کی تمام جائیدادیں، چراگاہیں اور گھوڑے خدا نے تمہارے تصرف میں دے دیئے ہیں ادھر آپ کے مُنہ سے یہ بات نکلی اُدھر خبر آئی کہ وائل قبیلہ کے سردار کو اسی قبیلہ کے کسی شخص نے خنجر کے وار سے ہلاک کر دیا ہے اور قبیلہ دو گروہوں میں بٹ گیا ہے دونوں فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے شام سے پہلے وائل قبیلہ کے چند لوگ رہ گئے باقی آپس میں ہی کٹ کٹ کے مر گئے۔ رات سے پہلے بنو حرام اپنے علاقے میں واپس چلے گئے اور بنو وائل کی تمام املاک و جائیداد بنو حرام کو مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہوئی۔

آپ اکثر و بیشتر رؤساء اور امراء اور بادشاہوں کے پاس تبلیغ حق کی غرض سے جایا کرتے تھے ان کو شرعی طرز پر زندگی گذارنے کی تلقین کرتے مگر کبھی کسی مرید کو ساتھ نہ لے جاتے۔ مریدوں کو ہمیشہ آپ نے خانقاہ میں رہنے کا حکم دیا اور فرماتے خانقاہ کا موسم خوشگوار ہے اس میں آسودگی ہے جب کہ امراء کے محل قید خانے اور کھانے زہر کی مانند ہوتے ہیں لہٰذا ان قید خانوں میں میں اکیلا جاؤں گا۔ اور زہر کو میں ہی برداشت کر سکتا ہوں تم لوگوں میں اس کی برداشت نہیں ہے۔

آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ کو دمشق سے گراں قدر عبائیں اور جُبّے نذرانے کے طور پر بھیجے گئے آپ اُن بھیجنے والوں کے دل رکھنے کے لیے ان عباؤں کو پہن لیا کرتے مگر اوپر رسہ لپیٹ لیتے تاکہ جسم کو ان لباسوں کی ملائمیت اور نرمی سے سکون نہ میسر آئے اور زمین کھودنا شروع کر دیتے۔ اور اس وقت تک کھودتے رہتے جب تک ان ریشمی لباسوں کا حال مزدوروں کے لباسوں جیسا نہ ہو جاتا۔

ایک عورت آپ کے پاس اپنے لڑکے کو لے کر حاضر ہوئی اور اس کی تعلیم و تربیت کرنے کی آپ سے گذارش کی۔ آپ نے فرمایا کہ جن لڑکوں کے ہاتھ کٹے ہوئے ہوں ان کے لیے میری خانقاہ میں کوئی جگہ نہیں اس نے عرض کی کہ میرے لڑکے نے تو کبھی چوری نہیں کی اس کے ہاتھ سلامت ہیں اس پر آپ مسکرائے اور لڑکے کو تعلیم دینا شروع کر دی لیکن لڑکے نے اچھی تعلیم کے باوجود چوریاں کرنی شروع کر دیں اور اس کے ہاتھ بالآخر کاٹ دیئے گئے۔

مصر میں ایک دفعہ قحط پڑ گیا۔ ابراہیم تبولی کی خانقاہ پر ہزاروں کے حساب سے لوگ روزانہ کھانا کھاتے تھے ایک عیسائی قافلہ یروشلم حضرت عیسیٰ کی برکتیں حاصل کرتے جا رہا تھا۔ ان زائرین نے روٹی کی خوشبو محسوس کی اور خانقاہ کی طرف چل پڑے ان کی عمدہ کھانے سے تواضع کی اور پھر ان کے لیے روزانہ عمدہ کھانوں کا حکم تھا ایک روز منتظم خانقاہ نے عرض کی کہ آج ہمارے پاس کوئی رقم نہیں ہے آپ نے آنکھیں بند کیں اور پھر فرمایا کہ فلاں کھجور کے درخت کے نیچے سے مطلوبہ رقم لے آؤ۔ منتظم بتلائی ہوئی جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سونے اور ہیروں کے

ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ وہ جتنی رقم درکار تھی لے آیا اور آکر ابراہیم تبولی سے عرض کی، وہاں تو بہت سونا اور ہیرے ہیں ہم یہ دولت لوگوں میں بانٹ دیں تاکہ ہر شخص متمول ہو سکے۔ آپ نے منع فرمایا اور کہا خدا کے کاموں میں مت دخل دو صرف اتنی رقم لے آؤ جو یروشلم کے مہمانوں کی تواضع اور زادِ راہ کے لیے کافی ہو جائے۔ منتظم کی تشفی نہ ہوئی اس نے ابراہیم تبولی کو بہت مجبور کیا مگر آپ نہ مانے وہ آپ سے بلا اجازت خزانے کی طرف گیا۔ لیکن جب وہاں پہنچا تو ریت او رمٹی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس پر وہ بہت شرمندہ ہوا۔

ابراہیم تبولی بہت خوش قسمت انسان تھے ان کو براہِ راست حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل ہوئی انہوں نے ایک ہی دروازہ پکڑا اور فضیلت اور بلند درجات حاصل کیے۔ آپ نے بھی دیگر اولیاء کی طرح بہت سی مشکلات کا سامنا کیا لیکن آپ کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی۔ آپ کو اللہ تعالٰے نے درود شریف کے صدقے میں مقامِ محمود عطا فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرپرستی اور اتالیقی عطا فرمائی۔

آپ نے اسی سال عبادت و ریاضت اور کشف و کرامات میں گزارے۔ عمر بھر درس و تدریس اور خلقِ خدا کی خدمت کیلئے کوشاں رہے آپ نے ۸۸۰ھ میں اپنی گدھی پر سفر کا ارادہ کیا لوگوں نے منزل پوچھی۔ آپ نے سکوت فرمایا۔ آپ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے اور مقام اسدود پر جاکر قیام کر لیا یہیں آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ پردہ کرنے کے بعد بھی اپنی خانقاہ میں مقیم مریدین کی راہ نمائی فرماتے رہے اور یہ عالی مقام صرف ان کو درود شریف کی برکت سے حاصل ہوا۔

ایک بار رسولِ مقبولؐ نے کسی شخص کو نہایت بامعنی کہانی سُنائی فرمایا:

"ایک شخص کے تین دوست تھے۔ یہ شخص سخت بیمار پڑا اور جب مرنے کے قریب پہنچا تو اپنے ایک دوست سے دریافت کیا۔ دوست اس مشکل وقت میں تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

دوست نے بے بسی سے عرض کیا۔ "جناب خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ میں نے آپ کا ہمیشہ ہر بُرے وقت میں ساتھ دیا ہے اور عمر بھر خدمت کرتا رہا ہوں لیکن افسوس کہ موت کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

اُس شخص نے اپنے دوسرے دوست کو طلب کیا اور اُس سے مدد طلب کی۔ دُوسرے دوست نے بے بسی سے عرض کیا۔ "اس مشکل وقت میں تیں اتنی ہی مدد کر سکتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ آپ انتقال فرما جائیں تو آپ کو نہلا دُھلا کر آپ کو کفن پہنا دُوں اور خوشبویات میں بسا کر کسی عمدہ سی قبر میں دفن کر کے مزار پھولوں سے ڈھانپ دوں۔"

اُس شخص نے اپنے تیسرے دوست سے پوچھا۔ "بولو تم میرا کس حد تک ساتھ دے سکتے ہو؟"

تیسرے شخص نے جواب دیا۔ "جناب آپ بالکل فکر نہ کریں میں موت کے بعد بھی آپ کا ساتھ دُوں گا۔ قبر میں آپ کے ہمراہ اُتروں گا اور جب قیامت کے دن آپ قبر سے نکلیں گے تو اس وقت بھی میں آپ کے ساتھ ہی ہوں گا۔"

یہ قصہ سُنانے کے بعد آپؐ نے دریافت کیا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ یہ تین دوست کون ہیں؟"

سُننے والے نے ادب سے نفی میں گردن ہلا دی۔ "یا رسولؐ اللہ! غلام نہیں جانتا۔"

آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "پہلے دوست کا نام مال، دوسرے کا عیال اور تیسرے کا اعمال ہے۔"

حسین ابن منصور

ھو اُن دو رُوحوں کی مانند ہیں جنہوں نے ایک بدن میں سما کر ایکتا کر لی ہو۔
جب وہ مجھے دیکھتا ہے مَیں اُسے دیکھتا ہوں۔
مَیں اُسے دیکھوں تو وہ مجھے تکتا ہے۔
میرے انگ انگ میں پھیلی نسوں میں بہتے لہو کے ساتھ وہ جاری وساری ہے۔
ان آنسوؤں کی مانند جو میری آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔
ضمیر قلب میں یوں سما گیا ہے۔
رُوح بدن میں جذب ہو جیسے
اے اللہ تیری رُوح اور میری رُوح یوں اکھنڈ ہو گئی ہیں جیسے آبِ زلال میں شراب۔
جب کسی شے کا لمس تجھے محسوس ہوتا تو اُس لمس کا احساس مجھے بھی ہوتا ہے۔
کیونکہ تُو اور مَیں ایک ہی تو ہیں۔ ہر حال میں ایک رہنے والے۔

رات کے بیکراں اُداس سناٹے میں جب درد سے بھری پُرسوز آواز فضا میں گونجی تو ان اشعار میں چھپے فساد، فتنوں سے گہری نیند میں ڈوبی آنکھیں اس آہ وزاری سے کھل گئیں۔

کانوں نے سُنا، ذہن نے یقین نہ کیا اور دل غم وغصہ سے بے قابو ہو گیا۔ سُننے والے آہستہ آہستہ آواز کے اور نزدیک تر ہوتے گئے۔ جستجو میں تحقیق کے لیے لیکن جوں جوں یہ اشعار پڑھنے والا وجد میں آتا گیا اُس کے الفاظ بیباکی و نڈرپن کی ہر حد کو توڑ کر جراٗت مندی کا وہ مظاہرہ کرنے لگے کہ دُنیا والے طیش میں آ گئے۔ انہوں نے بھلا کب کہاں اس قدر بیباکی دیکھی تھی۔ یہ حق گوئی بھلا اس سے اُن کے کان کب آشنا تھے۔

چھپ کر سُننے والے جب بالکل ہی نہ جان سکے کہ کہنے والا یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کس کیفیت میں کہہ رہا ہے؟ وہ طیش میں بول اُٹھے۔
"یہ بدبخت تو کفر بول رہا ہے۔ اس کے ذہن پر یقیناً ابلیس سوار ہے۔ یہ کافر بن گیا ہے۔"

دوسرا فوراً اس کی مخالفت میں بولتا ہے: "یوں بلا سوچے سمجھے کسی کو کافر بنانا کہاں کا انصاف ہے؟" تیسرا بولتا ہے: "بالکل..... پھر یہ تو مقام کی اُس کیفیت میں ہے جہاں دوئی کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بھلا ہم جیسے جو اس منصب کے کسی صورت لائق نہیں کہ کسی کو کافر قرار دے سکیں۔ کیوں اُسے کافر بناتے ہیں؟"

ایک اور بڑھ کر کہتا ہے: "ہاں یہ فقہا کا مسئلہ ہے کہ اسے کیا قرار دیتے ہیں۔"

بحث طول پکڑتی گئی۔ لوگوں کی جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک حمایت میں اور ایک مخالفت میں۔ ہر دو کا انجام..... ہم خیالی کوسوں دُور، لیکن وہ بیباک نڈر انسان سب سے بے نیاز اپنی ہی دھن میں اشعار پڑھتا جا رہا تھا۔

یہ جراًت مندانہ اظہارِ خیال کرنے والی بے باک و حق گو ذات تھی جسے دُنیا آج انا الحق حسین ابنِ منصور کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ۲۲۴ ہجری میں پیدا ہونے والا یہ نڈر و بیباک صوفی اپنے افکار اور کردار میں کس قدر کھرا، سچا، صاف گو تھا کہ اُس کی تندی اور تیزی دیکھ کر بڑے بڑے عصر خوف زدہ ہو گئے۔ وہ ہم عصر صوفی درویش جو اُس سے متفق تھے۔ اُس کے ہم عقیدہ تھے۔ اُس کی اس کیفیت سے واقف تھے۔ اُس کی سچائی کے معترف تھے مگر انجام سے خوفزدہ تھے۔ مصائب و تکالیف کے دَور کو دیکھ رہے تھے جو لمحہ بہ لمحہ اُس حق پرست کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اُس سزا سے اپنا دامن بچانا چاہتے تھے جو اس حق گو کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ اُس سے ہم خیالی اور ہم مشربی سے برات کا اظہار کرنے میں ہی عافیت محسوس کرتے تھے۔

حسین ابنِ منصور ایرانی شہر بیضا میں پیدا ہوئے اور نوعمری میں عراقی شہر واسط آ بسے۔ واسط والوں کے نزدیک وہ ایک عجیب و غریب نوجوان تھا۔ ہم عمروں سے بالکل علیحدہ جُدا۔ نوجوانی کے تقاضوں سے دامن بچائے خاموش طبع۔ چُپ چاپ سا رہنے والا۔ نظریں جُھکا کر راستے سے گزر جانا اس حال میں کہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر۔ انجان۔ نجانے کس فکر میں غلطاں و پیچاں۔ اپنی ذات میں گم رہنے والا۔ جسے کھویا کھویا سا دیکھ کر احساس ہوتا کہ جیسے کسی شے کی جستجو ہی اُسے ادھر اُدھر لیے پھرتی ہے۔ اُس کے چہرے پر پھیلی بے چینی و بیقراری، اُس کے چال کے اضطراب سے ہم آہنگ ہوتی۔ لوگ اُسے خاموشی سے دیکھتے۔ دلچسپی محسوس کرتے۔ نزدیک ہونے کی کوششیں کرتے۔ اُس کے بارے میں جاننے کی جستجو میں رہتے، لیکن وہ سب سے الگ تھلگ اپنے آپ میں مگن رہنے والا دُور دُور رہتا۔ لوگ اُس کی اس کیفیت پہ ہنستے، افسوس کرتے مگر وہ ان سب کے ردِ عمل سے بے نیاز لوگوں کی ہنسی یا افسوس سے بے اثر اپنے حال میں مست رہتا۔ تنگ آ کر لوگ کبھی کبھی پھبتی بھی کسنے سے باز نہ آتے، لیکن مجال ہے جو اُس شخص کے چہرے پر یا اُس کے حال میں کوئی تغیر رُونما ہو۔ وہ ان سب باتوں سے بے نیاز تھا۔ لاتعلق رہنا چاہتا تھا، چنانچہ لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ نوعمر نوجوان اُن کی کسی بات کا اثر قبول ہی نہیں کرتا۔ نہ اُن کے طیش دلانے والے طرزِ عمل پہ غصہ کا اظہار کرتا ہے نہ اُن کی طرف سے باتیں کرنے کی پیش رفت کا حوصلہ افزا جواب دیتا ہے تو اُنھوں نے بھی آہستہ آہستہ اُسے تنگ کرنا پریشان کرنا چھوڑ دیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ لوگ اُس کی ذات سے مکمل طور پہ ہی غافل ہو گئے تھے بلکہ اب بھی جب وہ اُن کے سامنے سے گزرتا وہ اپنی پُرانی دلچسپی کا اظہار کرتے۔ حیرت کرتے کہ آخر اس نوجوان کو انسانوں کے کس درجے میں لائیں۔

یہ شہر کے وسط میں آباد بازار کی ایک روئی کی دُکان ہے۔ جس کا مالک بے چینی سے دُکان کے دروازے کے سامنے بیقراری سے چکر لگا رہا ہے۔ اُس کی اس اضطرابی کیفیت سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کہیں جانا چاہ رہا ہے مگر پھر خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا، اچانک اُس دُکاندار کی بے چین نظریں شہر کے واحد اپنی ذات میں گم صُم رہنے والے نوجوان پہ پڑیں۔ وہ فوراً اُس کی طرف لپکا اور بازو سے پکڑ کر بولا: "حسین..... مجھے تم سے ضروری کام ہے۔ ذرا میری دُکان تک تو آنا۔" نوجوان خاموشی سے دُکاندار کے ساتھ اس کی دُکان پر آ پہنچتا ہے۔ دُکان کے دروازے پہ پہنچ کر وہ شخص عاجزی سے کہتا ہے: "حسین..... مجھے ایک بہت ضروری کام سے بازار جانا ہے لیکن دُکان کو اکیلا چھوڑ کر جاتے خوف محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں لوگوں کا مال بھرا ہے۔ اگر کوئی روئی اُٹھا کر لے جائے تو میں تو ڈوب گیا نا۔ اے شریف النفس نوجوان تو مجھ پہ اتنا احسان کر دے کہ جب تک میں دُکان پہ نہ آؤں تو میری دُکان کی رکھوالی کرتا رہ۔"

یہ سُن کر وہ نوجوان حسین ابن منصور نے اپنی فطری بے نیازی سے سر جھکا کر کہا "کیوں نہیں ..... تم اطمینان سے اپنے کام کو جا سکتے ہو۔ مطمئن ہو کر جاؤ میں تب تک تمہاری دُکان کی رکھوالی کرتا رہوں گا۔"

یہ سُن کر دُکاندار کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت چھائی۔ وہ خوشی سے بولا "حسین خدا تیرا بھلا کرے تُو نے اس وقت مجھے بڑی مشکل سے بچا لیا ہے" پھر جاتے جاتے کہتا گیا۔ "میں بھی کیا کروں..... ایک تو گاہکوں کی طرف سے پریشانی جو روئی دھنکی ہوئی لینے آ پہنچیں گے اور روئی کو پرانی حالت میں دیکھ کر میرے سر پر سوار ہوں گے۔ اوپر سے یہ کام یہاں نہیں پہنچوں گا تو اپنا نقصان کرالوں گا" پھر زیر لب بڑبڑاتا ہوا دکان سے باہر نکل گیا "کوئی بات نہیں گاہکوں کو سمجھا دوں گا کہ شام کسی وقت اپنا سودا لے لیں گے۔"

دُکاندار کو گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اچانک وہ اپنا کام مکمل کر کے آتا دکھائی دیا، لیکن دُکان میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر وہیں دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا۔ حیرت سے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے وہ عجیب و غریب نوجوان کھڑا روئی کے ساتھ انوکھا سا سلوک کر رہا تھا۔ وہ اپنی پُر اثر آواز میں روئی سے کہتا جا رہا تھا "روئی الگ ہو جائے ..... بنولے علیحدہ ہو جائیں" اور اُس کی آواز میں نجانے کیا تاثیر تھی کیا اثر تھا کہ نگاہوں کے سامنے وہ انوکھا سا سحر انگیز دلکش منظر تھا کہ روئی اور بنولے علیحدہ علیحدہ ہو کر الگ الگ جگہ ڈھیر ہوتے جا رہے تھے۔ دُکاندار انگشت بدنداں ہو کر حسین کے معصومانہ چہرے پر نگاہ ڈالتا پھر روئی کے اُس ڈھیر پر نظر ڈالتا جہاں سے روئی اور بنولے علیحدہ ہو کر ڈھیری کی صورت میں ایک دوسرے کی مخالف سمت ڈھیر ہوتے جا رہے تھے۔ دُکاندار نے یہ منظر دیکھا تو تاب نہ لا سکا پھر بڑھ کر حسین ابن منصور کے قریب گیا اور اُس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر حیرت و خوف سے بولا "حسین..... یہ کیا کر رہا ہے؟ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔"

ہاتھ کے لمس سے حسین نے پیچھے مُڑا اور دُکاندار کو دیکھ کر کہا۔ "جناب آپ جاتے جاتے کہہ گئے تھے کہ مجھے روئی دھنکنے کا موقع نہیں ملا اب گاہک مجھے آ کر تنگ کریں گے۔ تو میں نے سوچا کہ آپ کو اس پریشانی سے بچا لوں اور پھر یہ کونسا اتنا مشکل اور مشقت طلب کام تھا جو میں نہ کر سکتا تھا۔"

یہ سُن کر دُکاندار حیرت و خوف کے ملے جُلے تاثرات سے بولا "حسین..... لیکن یہ تو جادو تھا۔ خدا کی قسم ایک دم جادو کی مانند۔ کیا تم۔ یہ جادو وادو جانتے ہو؟"

لفظ جادو سُن کر اُس نوجوان کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے پھر وہ دَرد بھرے لہجے میں بولا۔ "حضرت یہ جادو نہیں تھا اسے جادو نہیں کہتے۔ میں تو اسی کوشش میں ہی سرگرداں ہوں کہ جس طرح روئی کے اس ڈھیر سے روئی اور بنولے علیحدگی اختیار کرتے جا رہے ہیں اسی طرح میں بھی اپنی ذات سے روئی یک مشت علیحدہ کر کے نکال دوں۔ کاش مجھ سے یہ ہو سکتا۔ میں یہ کر سکتا۔"

نوجوان کی یہ باتیں اُس دُکاندار کے علم میں تو نہ پڑیں اور نہ ہی وہ انہیں صحیح طریقے سے سُن سکا۔ ہاں البتہ اب اُسے اس نوجوان سے ایک عقیدت سی ہو چلی تھی۔ اُس نے اپنی سمجھ کے مطابق حسین ابن منصور کی عزت کی اور پھر ہنس کر بولا "حسین اگر تم بُرا نہ محسوس کرو تو میں تم سے ایک گزارش کروں؟"

"گزارش..... کرو گزارش" نوجوان نے حسب بے اثر آواز میں لاتعلقی سے پوچھا۔

دُکاندار کی ہمت بندھی تو اُس نے کسی قدر شوخ لہجے میں کہا "حسین تم نے میری روئی دُھنک کر میری جو پریشانی دُور کی ایک تو میں اُس کے لیئے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور دوسری بات یہ کہ چونکہ تم نے میری روئی دھنک دی اس لیے اگر میں تم کو آج حسین ابن منصور حلاج کہوں تو تم بُرا تو محسوس نہیں کرو گے۔"

نوجوان نے اُس کی پوری بات سُنی اور پھر بے نیازی سے دُکان سے باہر نکل کر اپنی راہ ہو لیا اور دُکاندار نے مُڑ کر دھنکی ہوئی روئی کو ایک مرتبہ پھر حیرت زدگی سے دیکھنا شروع کر دیا پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، لیکن یہ بات اس قدر عجیب و حیرت انگیز تھی کہ راز نہ رہ سکی اور جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ وہ لوگ جو حسین کو پہلے ایک دیوانہ قرار دے کر اُس پر

اُچٹتی سی نظر ڈالتے تھے وہ بھی اب اُسے غور سے دیکھنے لگے۔ لوگوں کی اکثریت اب اُس پر مزید گہری توجہ مرکوز کرنے لگی۔ وہ اس آس میں اُسے دیکھتے کہ شاید کوئی اور کرامت وہ دکھا سکے لیکن وہ نوجوان تو ان سب کے احساسات سے بے خبر کسی اور ہی آگ میں جل رہا تھا۔ کرب و اذیت میں مبتلا وہ حسینِ ابن منصور تو دوئی مٹانے کی فکر میں تھا۔ ذاتِ احدیت کے وجود میں گم ہوجانے کی کوشش میں تھا۔ اور جب اُس نے محسوس کیا کہ یہاں رہ کر وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر پا رہا تو اُس کی بے چین نظریں کوئی دوسرا مقام تلاش کرنے لگیں۔ اس فکر اور کوشش میں سرگرداں اُس بیقرار کی نظریں اہواز صوبے کے شہر تستر پر پڑیں۔ تستر جہاں ایک نہایت مشہور و معروف بزرگ اصاحبِ عرفان ذات سہل بن عبداللہ کی رہائش تھی۔ چنانچہ اُس نے تستر کا رُخ کیا اور عبداللہ کی صحبت میں رہنا شروع کیا۔ ہر دم اُن کے ساتھ رہنا اس سوچ میں کہ شاید دِل میں بھڑکی آگ کو بجھا سکیں۔ اندر کی شوریدگی کو کم کر سکیں مگر یہاں بھی اس کی بیقرار طبیعت کو قرار نہ آسکا جس کی جستجو میں وہ یہاں تک آیا تھا وہ اب بھی اُس سے بہت دور تھی۔ منزل کا کہیں نام و نشان نہ تھا شب و روز گزرتے جا رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دِل میں پروان چڑھتی شوریدگی جوان ہوتی گئی۔

خانقاہ کے سہل بن عبداللہ نے بھی اس بے چین نوجوان پہ گہری نظر رکھی۔ وہ اِس کے حال سے واقف ہوئے تو اُس خطرے کو بھی بھانپ گئے جو اس نوجوان کی ذات میں چھپا تھا۔ جس سے یہ نوجوان جل کر بھسم ہوسکتا تھا۔ اُنہیں اس نوجوان پر ترس آیا۔ خلوت میں بُلا کر کہنے لگے۔

”حسین ہم محسوس کرتے ہیں کہ جیسے تم یہاں خوش نہیں ہو۔ تم ہماری صحبت سے مطمئن نہیں ہو۔ نہ ہی تم ہماری صحبت سے فیض حاصل کرتے ہو۔ ہم تمہاری اس اندرونی جوش و جذبے کی کیفیت کو سمجھ نہیں سکے کہ تم کیا چاہتے ہو۔“

یہ سن کر وہ نوجوان بولا ”حضرت میں سمجھا نہیں کہ آپ میری کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟“

سہل بن عبداللہ بولے ”دیکھو...... ہمیشہ ایسی باتوں سی راز دار باتوں سے خود کو کہنے سے محفوظ رکھو جن کا دل میں القا تو بے شک ہوتا ہے لیکن برسرِ عام کہنا جائز نہیں ہوتا۔ ان کے اظہار و انکشاف کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو تم برسرِ عام کہتے پھر رہے ہو کیا تمہارا یہ طرزِ عمل مناسب ہے؟ کیا تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہیئے؟“

حسین نے پوچھا ”حضرت آپ صاف صاف کیوں نہیں پوچھتے۔ کونسی باتیں؟ آخر وہ کونسے راز ہیں جو میں منکشف کرتا پھر رہا ہوں۔“

حضرت سہل بن عبداللہ اس کی طرف غور سے چند لمحے دیکھتے رہے۔ پھر سر جھکا کر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں نرمی سے بولے ”حسین.... ہر وہ راز..... ہر وہ انکشاف جو اللہ اپنے راز داں بندوں پر منکشف کرتا ہے۔ کیا تم اسے مناسب سمجھتے ہو کہ وہ راز عام لوگوں پر عیاں کر دیا جائے۔ نہیں ہرگز نہیں..... حسین ابن منصور یہ ہرگز قابلِ تعریف فعل نہیں۔ یہ تو جذباتیت ہوگی۔ نری جذباتیت۔ یہ تو ایک قسم کی کم ہمتی ہوگی۔ مرشد مرید کو اپنا ہمراز بناتا ہے اور مرید، مرشد کے رازوں کو ایک عالم پہ عیاں کرتا پھر رہا ہے کیا تمہارا یہ طرزِ عمل کسی صورت بھی قابلِ قبول ہے؟“

یہ سن کر حسین ابن منصور کے چہرے پر تلخی پھیل گئی۔ ان کی آواز پُرجوش ہوگئی اور وہ جرأت مندانہ بیباک لہجے میں بولے ”حضرت یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کا خیال ہے کہ مجھ سے اگر ایسا فعل سرزد ہوتا ہے تو کیا اس میں میرا کوئی دخل ہے؟ ہرگز نہیں..... یہ قطعی خام خیال ہے۔ میرا اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں۔ نہ میرے ارادوں کا اس میں کوئی دخل ہے۔“

سہل بن عبداللہ بولے ”حسین..... اب مجھے نہیں معلوم کہ تم ذہنی طور پہ کس چیز سے متاثر ہو۔ آیا تم جبریہ سلسلے کے ماتحت ہو قدریہ مسلک سے تعلق رکھتے ہو لیکن تمہاری باتوں سے یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ تم جو کچھ کرتے پھر رہے ہو یا جو کچھ کہتے رہتے ہو وہ تمہیں ج ثابت کرتا ہے۔“

یہ سن کر حسین ابن منصور گھبرائے اور تلخی سے بولے ”حضرت..... مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ جو کچھ میرے دل پر گزرتی ہے وہ پو میں رکھوں۔ میں وارداتِ قلبی کو چھپا نہیں سکتا۔ روحانی انکشاف کو دوسروں سے اوجھل نہیں رکھ سکتا اور میرا یہ فعل صدیٰ صد اس پر

عالم کی خواہش کے عین مطابق ہے جو مجھے ان رازوں میں ان انکشافات میں شریک کرتی ہے۔ وہ خود نہیں چاہتا کہ اس کا راز راز رہے۔ سو میں اس کے حکم کے مطابق اس کا ہر راز سب پر عیاں کرتا پھر رہا ہوں۔"

سہل بن عبداللہ نے حیرت و ناگواری سے اس نوجوان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جو اپنی دلی کیفیت سے پُرجوش ہو چکا تھا۔ پھر بولے، "حسین یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں کس طرح خدا کی رضا و منشا کا علم ہوا؟ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ پروردگار جس نے تمہیں اپنے رازوں کا امین بنایا ہے وہ تمہیں ان کو برعام پھیلانے کی اجازت دیتا ہے؟"

حسین ابن منصور نے جواب دیا: "حضرت یہ بالکل سامنے کی بات ہے۔ وہ خدا خود چاہتا ہے کہ اس کے راز دنیا زنہ رہیں۔ اگر وہ یہ چاہتا کہ جو راز دنیا میں عام نہ ہو تو وہ مجھے جہاں ان رازوں سے واقف کرتا ہے وہاں وہ مجھے اس کا بھی حوصلہ دیتا ہے کہ میں ان رازوں کو سینے میں دبائے رکھنے کا پابند رہتا۔ وہ تو عالم الغیب ہے۔ اسے ہر چیز کا علم ہے کہ کیا ہوتا ہے کس کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ اگر میں اس کے راز فاش کر رہا ہوں بقول آپ کے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس حد تک لاعلم ہے کہ مجھ پر اپنے رازوں کا انکشاف کرتے سمے بھول گیا یا اس کے علم میں ہی نہ آیا کہ میں جو کمزور و ناتواں اس کا تخلیق کردہ بندہ ہوں کس طرح ان رازوں کا بوجھ سہہ سکوں گا۔ انہیں ایک عالم پر فاش کر دوں گا۔"

سہل بن عبداللہ نے جو یہ تیز طرار گستاخ و بیباک انداز دیکھا تو گھبرا گئے۔ ان کا وجود اس گستاخ جملے کو ہی سن کر کانپ گیا اور وہ بھرائی آواز میں بولے "بس..... بس حسین ابن منصور اس سے پیشتر کہ تم اپنی زبان سے کفر کے مزید کلمات ادا کرو۔ میں ہی تمہارے سامنے سے ہٹ جاتا ہوں۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں جو تمہاری اس گستاخانہ گفتگو کو سہہ سکے۔ مجھ میں اتنی تاب ہرگز نہیں۔ خدا تم پر رحم فرمائے۔"

اس گفتگو نے جہاں سہل بن عبداللہ کو حسین ابن منصور سے دل برداشتہ کر دیا، وہاں حسین ابن منصور بھی، حضرت عبداللہ سے مایوس ہو گئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہاں بھی وہ خود کو پہچان نہیں سکتے۔ خود کو بے چینی و بے قراری کے گرداب سے نکال نہیں سکتے تو انہوں نے یہ ڈیرہ بھی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ سہل بن عبداللہ کی اس خانقاہ سے مایوس و نامراد ہو کر وہ بصرے جا پہنچے۔

بصرہ ان دنوں عمر بن عثمان مکی کی قیام گاہ بنا ہوا تھا۔ عمر بن عثمان مکی وہ برگزیدہ شخصیت تھیں کہ اپنے عہد کے بزرگان دین کو شرف مریدی بخش کر ایک عالم میں شہرت اختیار کر چکی تھیں۔ چنانچہ جب حسین ابن منصور آپ کے حضور پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی عمر بن عثمان چونک پڑے۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ ہاں البتہ انہیں قریب بٹھا کر حاضری کا سبب ضرور پوچھا۔ حسین بولے "حضرت میں شرف مریدی کے لیے آپ کی خدمت میں پہنچا ہوں۔"

عثمان مکی نے توجہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا "پہلے کہاں تھے؟ کس کی صحبت میں وقت گزارا ہے؟"

حسین نے جواب دیا: "اہواز کے شہر تستر سے آ رہا ہوں۔ حضرت سہل بن عبداللہ کی صحبت میں وقت گزار رہا ہوں۔"

حسین سے پوچھا گیا: "پھر..... پھر کیوں ان کی صحبت چھوڑ کر یہاں آن پہنچے ہو۔ آخر ان میں کیا خامی تھی جو تم مطمئن نہیں ہو سکے اور ہماری خانقاہ میں حاضری دینے آئے ہو؟"

حسین بولے: "حضرت ان کی سب سے بڑی خامی تو یہی تھی کہ وہ بہت مصلحت اندیش ہیں اور وہ اپنے اس خول میں اس حد تک بند ہیں کہ مجھ جیسا صاف گو ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ وہ خاموش طبع ہیں سست رو ہیں اور میں تیز رو۔ ہم دونوں میں آگ اور پانی کی سی مثال ہے۔ زمین و آسمان کا فرق ہے پھر بھلا میں کس طرح ان کی صحبت میں رہتا۔ کیسے ہم دونوں یکجا رہتے؟"

عثمان مکی نے اس تیز طرار نوجوان کو دیکھ کر کہا "میاں کچھ بھی ہو تم ادھر بھی ٹکتے نظر نہیں آتے۔ تمہارے وجود میں جو بے قراری تمہیں اس در سے بھی لے جائے گی۔ تمہارے اندر جو آگ بھڑک رہی ہے ایک دن تمہیں وہی آگ بھسم کر ڈالے گی۔ تم خود ہی اپنی آگ میں جل مرو گے۔"

پھر ذرا توقف کے بعد پوچھا "اچھا حسین ابن منصور ذرا ہمارے ایک سوال کا جواب تو دینا لیکن سوچ سمجھ کر۔"

حسین نے کہا "کیجئے سوال۔"

عمر بن عثمان بولے: "حسین فرض کرو حاکم وقت یا امیر المومنین تمہیں اپنا ہم راز بناتے ہیں۔ تمہیں اعتماد میں لے کر چند راز تم پر کھول دیتے ہیں، ساتھ ہی کہہ دیتے ہیں کہ حسین ہم نے تم پر اعتماد کیا۔ تم ان رازوں کو اپنی حد تک رکھنا اور ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچانا۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہمارے ان رازوں کا ایک عالم میں چرچا کرتے پھرو۔ اگر ایسا ہوا تو تمہیں اس کی کڑی سے کڑی سزا جو موت بھی ہو سکتی ہے دی جائے گی۔ تب اے حسین ابن منصور تم کیا کرو گے؟"

حسین نے بیباکی سے جرأت مند لہجے میں کہا: "اس صورت میں میں تو ان رازوں میں ہر ایک کو شریک کر ڈالوں گا۔"

عمر بن عثمان نے حیرت سے اس نڈر نوجوان کو دیکھا پھر ناگواری سے بھرے غصہ آمیز لہجہ میں پوچھا: "کیا مطلب؟ گویا تم ان رازوں کو اپنے سینے میں نہیں رکھ سکو گے؟"

حسین نے مطمئن سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا: "حضرت مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ دانش مند بھی میری بات کی گہرائی کو نہیں پا سکے۔ مجھے آپ یہ بتائیں اگر وہ راز جو حاکم وقت یا امیر المومنین مجھ پر عیاں کرتے ہیں وہ اس قدر ہی چھپا کر رکھنے والا ہے تو پہلی غلطی اگر اسے غلطی کہا جا سکتا ہے تو وہ حاکم وقت یا امیر المومنین مجھے اس میں شریک کر کے کرتے ہیں۔ وہ یہ کیوں خیال نہیں کرتے کہ جس راز کو وہ خود سینے میں نہ رکھ سکے تو دوسروں سے ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ وہ ان رازوں کو سینے میں دبائے رکھیں گے۔ جہاں تک سزا کا سوال ہے تو حضرت میں تو ہر وقت سر شمشیر کے نیچے دینے کو تیار ہوں لیکن اس صورت میں مجھے اس بات کا مکمل یقین ہوگا اور میرا اس پر ایمان ہوگا کہ جس پاداش میں حاکم وقت یا امیر المومنین مجھے قتل کر رہے ہیں اس جرم کا اعادہ خود وہ پہلے ہی کر چکے ہیں مجھ پر ان رازوں کو افشا کر کے سو اس صورت میں میں بے گناہ ہی مارا جاؤں گا۔ میرا جرم وہی ہوگا جس کا ارتکاب خود حاکم وقت یا امیر المومنین سے ہو چکا ہے۔"

یہ سن کر عثمان بھی ناگواری سے دوسری طرف منہ کر کے بولے: "تو واقعی گستاخ ہے۔ اسی لیے سہل بن عبداللہ کے پاس نہیں ٹک سکا۔ بھلا وہ تجھے کیسے برداشت کرتے۔ تیری باتوں سے تو لہو کا رنگ چھلکتا ہے۔ پھر بھی ہم تجھے اپنی صحبت میں رکھنا چاہیں گے۔ اس امید پر کہ شاید تم اپنی اس نادانی سے نکل سکو اور تمہاری جان بچ جائے۔ تمہارے دامن سے جو فتنے چمٹے ہوئے ہیں شاید ہمارے اس طرز عمل سے وہ تجھ سے الگ ہو جائیں۔ کاش ایسا ہو۔"

حسین ابن منصور نے خاموش ہو کر ان کی ہر بات سنی اور پھر بغیر شکریہ ادا کیے خاموشی سے ایک ادائے بے نیازی سے ان کی خدمت میں رہنے لگے۔

لیکن عمر بن عثمان کی صحبت بھی ان کے لہجے سے وہ بیباکی اور جرأت مندی نہ چھین سکی جس کا وہ اب تک مظاہرہ کرتے آ رہے تھے۔ عمر بھی اب محسوس کر رہے تھے کہ اس مرید کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ اس کا لہجہ روز بروز گستاخانہ تلخی آمیز ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی زبان جرأت و جسارت کی تمام حدود پھلانگ کر جو دل میں آتا ہے سر عام کہتی جاتی ہے۔ انہوں نے کئی بار حسین کو بلا کر ٹوکا اور زور دیا کہ وہ ایک حد میں رہے۔ اس طرح نہ سر عام زبان کو بے قابو کیے رکھے لیکن وہ کہاں ماننے والا نوجوان تھا۔ وہ اپنی ہی حالت میں گم جو ہوتا کہہ آتا کسی بات کو راز نہ رکھتا۔

مشہور تھا کہ عمر بن عثمان کے پاس تصوف کی کچھ نادر کتب بھی تھیں۔ ایسی کتب جن میں تصوف کے راز ہائے سربستہ دفن تھے۔ جن میں نشانات کا سمندر بلند تھا۔ چنانچہ جب حسین کے علم میں بھی اس کی بابت آیا تو انہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کتب کے حصول کو اپنا مقصد بنا لیا۔ خود مرشد کے علم میں بھی یہ بات تھی کہ مرید آج کل کن چکروں میں ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس معاملے میں پوری طرح ہوشیار رہتے۔ ضرورت سے زیادہ ہی ان کی رکھوالی کا کام سرانجام دیتے تھے۔

ادھر حسین ابن منصور کو بھی اب اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ دال گلنی مشکل ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی جستجو ترک کر کے صاف صاف لینے کی ٹھانی اور ان گراں مایہ مسودات تک رسائی کے لیے سیدھے مرشد کے سامنے جا پہنچے اور عاجزی سے عرض کیا: "حضرت میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس جو مسودات ہیں آپ انہیں مجھے عنایت کر کے فیض یابی کا موقع دیں۔ صرف چند دنوں کے لیے مرحمت فرما دیں۔ میں مطالعہ

کرکے آپ کو واپس کردوں گا۔"

مرشد کو جو حسین کی کوششوں سے آگاہ تھے۔ اس طرح امید نہیں تھی کہ مرید جستجو میں ناکام رہ کر یوں آن کر مدعا بیان کرے گا۔ چنانچہ انہوں نے یہ سب عرض سن کر خفگی سے کہا۔ حسین! کیا تم نہیں جانتے کہ تم ابھی مبتدی ہو۔ مبتدی اُسے کہتے ہیں جو ابھی منزل سے دور ہو۔ اُس منزل سے جہاں تمہیں ان مسودات کے مطالعے کا حق ملے گا پھر بھلا ہم کیسے تمہیں وہ مسودات تھما دیں۔ تم پہلے ہماری آزمائش میں تو پورے اُترو۔ ضبط کا یارانہ تو پیدا کرو۔ تاکہ ہم پورے اطمینان سے تمہیں یہ مسودات تھما سکیں اس یقین کے ساتھ کہ ہم نے کسی ـــ غلط ہاتھوں میں یہ گراں مایہ مسودات نہیں پکڑائے۔"

یہ سن کر حسین بھی تلخی سے بولے۔ "جیسا آپ خیال کریں۔ اگر آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ میں اُن مسودات تک پہنچ حاصل کرسکوں تو میں بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور نہ ہی مجھے اس کی خواہش ہے۔"

حسین کی اس برہمی کیفیت سے مرشد پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے جو مرید کو اس آس پر صحبت میں رہنے کی اجازت دی تھی کہ شاید اُن کے وجود میں گھلی حد سے زیادہ تلخی و بیباکی کم ہوجائیگی۔ وہ ہرگز نہیں ختم ہوئی بلکہ اس کے وجود میں تو بے چینی نے اور اضافہ کر ڈالا ہے۔ انہوں نے حیرت و افسوس کے ساتھ مرید کو دیکھا جو سجدے میں گرا آہ و فریاد کر رہا تھا۔ وہ دُکھ سے مُرید کی دُعا سن رہے تھے جو کہہ رہا تھا۔

"اے رب والعالمین ..... آخر تیرے بندے مجھ سے بدگمان کیوں ہیں۔ کیا میں تمہاری نافرمانی کی جرأت کرسکتا ہوں؟ اے پروردگار تو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ نہ میں جو کچھ کرتا ہوں اُس میں میرے ارادوں کا کوئی دخل ہوتا ہے۔ تُو تو دِلوں کا حال جانتا ہے۔ میں وہی تو کرتا ہوں جو تُو چاہتا ہے۔ تُو ہی تو مجھے اس بات پر مجبور کرنے والا ہے کہ میں تمہارے راز جو میرے دل میں ہیں وہ افشا کردوں۔ اے میرے خالق اگر تُو بھی ان بندوں کی طرح سوچتا ہے، تو پھر مجھے بتا تو نے مجھ جیسے کمزور اور مجبور ناتواں انسان کو کیوں اس بار سے لادا ہے۔ تُو تو عالم الغیب ہے تُو تو بندے کی ہر کیفیت سے آگاہ ہے کیا تو میری استطاعت سے لاعلم تھا۔ تُو نہیں جانتا تھا کہ میں اس بوجھ کو سہہ بھی سکوں گا یا نہیں۔ اور پھر اگر تُو نہیں چاہتا تو مجھ جیسا کمزور انسان تیرے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے اتنا بڑا قدم کیوں کر اُٹھائے ہوئے ہے۔"

عمر بن عثمان یہ سن کر سرزنش کرتے ہوئے حسین سے بولے۔ حسین ..... لگتا ہے تُو تو گمراہ ہوچکا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ جو کہتے ہو۔ زبان سے ادا کرتے ہو آخر ان کے نتائج کیا نکلیں گے۔ تمہاری ان باتوں سے تو فساد کی بو آتی ہے۔ تم ایک عالم کو گمراہ کر لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے کہ تم خدا کی زمین پر شر پھیلاؤ وہ خود ہی تمہیں کوئی عبرتناک سزا دے چکا ہوگا۔"

عمر بن عثمان مکی کی ان باتوں سے اب تو حسین کا دل بھی اچاٹ ہوچکا تھا۔ اب وہ اس جگہ کو بھی چھوڑ دینے کی خوا تھے لیکن اس بات کا بھی تہیہ کر چکے تھے کہ وہ عثمان مکی کا مسودہ چوری کرکے ہی رہیں گے جسے انہوں نے اس قدر سنبھ ہوا ہے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ جس آگ میں وہ جل رہے ہیں یقیناً عثمان مکی بھی اس آگ میں جلتے ہوں گے لیکن ان کی حال اضطراب و بے چینی کیوں نہیں ٹپکتی۔ جس نے حسین کو آتش زیر پا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اب وہ پوری توجہ سے ان گراں مایہ مس تلاش میں سرگرم ہوگئے۔ آخر ایک دن انہیں اس کا موقع مل ہی گیا۔

حضرت عمر بن عثمان مکی کا ایک سادہ لوح سا مرید تھا۔ وہ بیچارا حسین ابن منصور کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اس کے گنج نامہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جسے عمر مکی دل و جان سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن موقع پا کر آپ نے اس سادہ جا پکڑا اور پوچھا: "پیرومرشد سے ملنا ہے کیا بتا سکتے ہو اس وقت وہ کہاں تشریف رکھتے ہوں گے؟"

سادہ لوح مرید نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مرشد کا یہ مرید کبھی کسی سے یوں مخاطب تو نہیں

ڈنٹونک کیلئے
امریکن ایوارڈ برائے کوالٹی
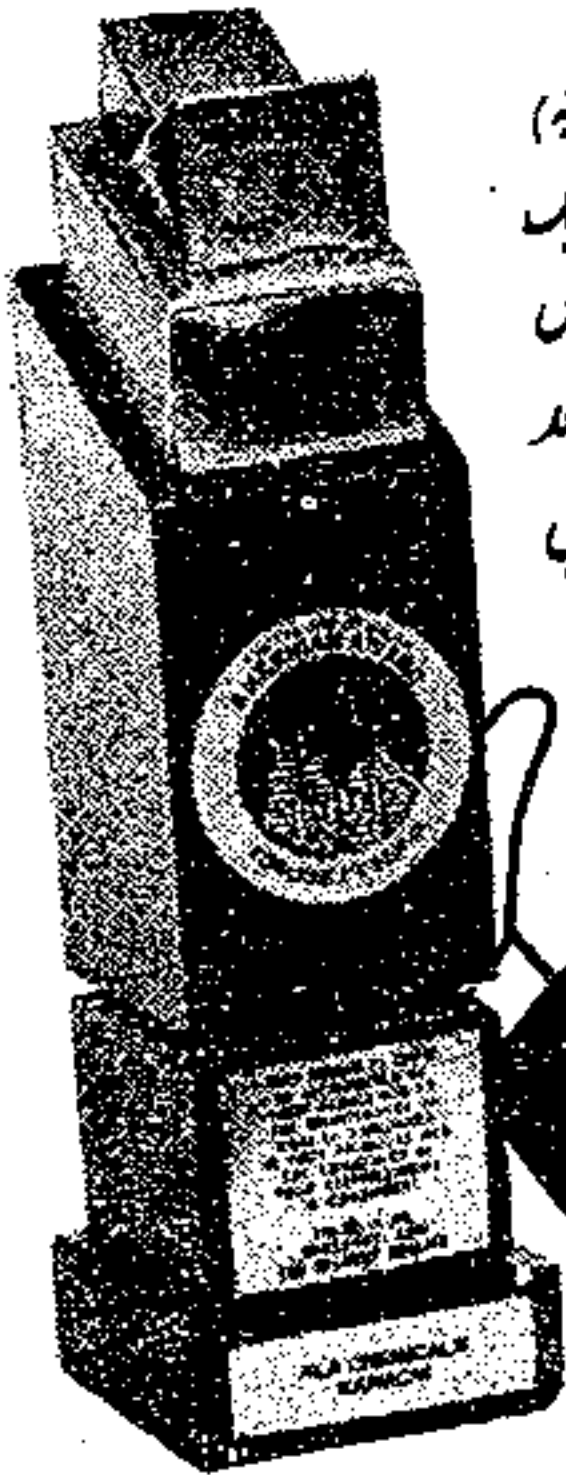
آج اُس سے مخاطب ہے پھر بھی بولا "ابنِ منصور.... مرشد تو ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے غسل خانے تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کچھ دیر ٹھہر کر آجائیں۔"

حسین ابنِ منصور نے افسردگی سے کہا "اے میرے سادہ دِل دوست.... مَیں جانتا ہوں کہ مُرشد آجکل مجھ سے سخت ناراض ہیں اور وہ یقیناً مجھ سے تو اب ملنا بھی پسند نہ کریں گے۔ اس لیے مَیں نے اب یہ ارادہ کر لیا ہے کہ یہاں سے کسی اور طرف کو کُوچ کر دوں۔ بھائی مَیں تمہارا احسان مند رہوں گا اگر تم مجھے اس بات کا موقعہ فراہم کر دو کہ مَیں جاتے ہوئے آخری مرتبہ پیر و مُرشد کی جائے نماز کو بوسہ دینے کی سعادت حاصل کر لوں۔"

وہ سادہ دِل شریف سا مُرید جھٹ تیار ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے حجرے سے باہر پہرے داری کا فریضہ سرانجام دینا شروع کر دیا اور حسین ابنِ منصور نے لپک کر جائے نماز کے نیچے سے وہ گراں مایہ مسوّدہ نکالا اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنے پیر و مُرشد کا ساتھ چھوڑ کر تیزی سے انجانی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

دوسری طرف عثمان مکیؒ وضو کے دوران اپنا پاؤں بھی دھوتے جاتے اور باآواز فرماتے بھی جاتے "افسوس صد افسوس..... بدبخت..... لے گیا۔ نادان لے کے ہی رہا۔ اپنی دُنیا خراب کر لی۔ زندگی کا سودا کر کے ہی رہا۔"

مُریدوں نے یہ سُن کر حیرت سے اُنہیں دیکھا مگر سمجھ نہ سکے کہ آخر مُرشد یہ کلمات کس کے لیے ادا کر رہے ہیں۔ آخر ایک نے ہمّت کر کے آگے بڑھ کر وضاحت چاہی تو عثمان مکیؒ بولے "ابنِ منصور کو کوس رہا ہوں۔ بدبخت ہمارا گنج نامہ چُرا بھاگا ہے۔ جس بات کا خطرہ تھا وہ سامنے آ ہی گئی۔ اب یہ ظالم خود پر ظلم کی انتہا کروا لے گا۔"

ایک مُرید نے ہمّت کر کے جسارت سے پوچھ ہی ڈالا کہ "حضرت جب آپ واقف ہی تھے کہ ایسا ہونا ہے۔ تب آپ نے بڑھ کر اُسے روک کیوں نہیں لیا؟"

عُمرؒ بن عثمان بولے "مَیں کیوں منع کرتا اُس بدبخت کو۔ اُس نے گستاخیاں کیں۔ غیر معمولی اسرار فاش کیے۔ اب گنج نامہ چُرانے کی ہمّت کی۔ آخر کچھ تو اُسے سزا ملے۔"

اِدھر کامیابی میں شاداں ابنِ منصور تیزی سے بغداد کی طرف گامزن تھے۔ وہ جلد سے جلد جنید بغدادی کی صحبت میں جانا چاہتے تھے۔

جس لمحہ کی جستجو میں حسین ابنِ منصور سرگرداں رہے وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ گنج نامہ نظروں کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ ابنِ منصور انتہائی شوق و دلچسپی سے اُس کا مطالعہ کرتے جا رہے تھے۔ اُس میں لکھا تھا۔

"جب ہم نے مٹی سے آدم کو تخلیق کیا اور پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ تم اُس کو سجدہ کرو تو سبھی نے ہمارے حکم کے آگے سر جھکایا اور آدم کو سجدہ کیا، لیکن ابلیس مردُود وہ ذات خبیث تھی جس نے انکار کیا کیونکہ وہ واقفِ اسرار تھا جبکہ فرشتے آدم کی تخلیق کے بھید سے ناآشنا۔ پھر ہم نے کہا دیکھو زمین کی تہہ میں ایک ایسا خزانہ ہم نے دفن کر رکھا ہے کہ جو بھی اِس کو تلاش کرنا چاہے۔ آگہی کا حصول کرنے کی جسارت کرے گا وہ یقیناً تباہ و برباد ہو جائے گا، لیکن ابلیس نے کہا علم و آگہی کا جو خزانہ مجھے حاصل ہے اُس کے بعد کسی خزانے کی خواہش نہیں لیکن مَیں پھر بھی ہر حال میں اُس خزانے کی جستجو کروں گا۔ سو ابلیس کو اُس کی اجازت اور مہلت دے دی گئی۔"

جُوں جُوں ابنِ منصور گنج نامہ سے فیض یاب ہوتے گئے اُن کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ وہ زیرِ لب بولے "گویا گنج عُمرؒ بن عثمان الںساقی ذہن کی تصنیف ہے۔ اِس کا لہجہ شاہد ہے کہ گویا انسان نہیں خدا خود مخاطب ہے لیکن پھر بھی یہ لوگ مجھے کیوں گردانتے ہیں؟ مَیں بھی تو یہی کہتا ہوں۔ یہی بات اُنہیں سمجھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔" پھر اُنہوں نے سر جھٹک کر خود سے کہا "مجھ میں اور اُن میں فرق ہے کہ مَیں منافق نہیں وہ منافق ہیں۔ میرے دِل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ کچھ بھی ہو میں منافق

کا جال ہرگز نہ پھیلوں گا۔ خواہ کچھ ہو مجھے سولی پر چڑھنا پڑے میں ہر حال میں حق بات صاف گوئی اور جرأت سے سب کے سامنے کرتا رہوں گا۔"

اگلے دن وہ جنید بغدادی کی صحبت میں پہنچے۔ جنید بغدادی وہ صاحب بزرگ تھے جنہیں اہل طریقت واضح انداز میں منفرد اہل اللہ کہا کرتے ہیں اور اس رتبہ پر بہت کم لوگوں کو فائز کرتے ہیں۔

جنید بغدادی کی صحبت میں پہنچ کر حسین ابن منصور ادب سے کھڑے ہو گئے۔ جنید بغدادی نے لمحہ بھر ان پر نگاہ جمائے رکھی پھر بے رخی سے بولے "ابن منصور تم ہمارے پاس کیا لینے آن پہنچے ہو؟"

حسین بولے "شیخ کی صحبت سے فیض یابی حاصل کرنے آن پہنچا ہوں۔"

جنید بغدادی نے بے رخی و درشتی سے کہا "ابن منصور افسوس ہم تجھے اپنی صحبت میں نہیں رکھ سکتے۔ تجھ جیسے دیوانے کیلئے ہماری محفل کے در بند ہیں۔ تم کہیں اور جا کر در آزماؤ۔ شاید کسی اور کا در تجھے کھلا ملے۔"

ابن منصور نے ذرا مایوسی سے کہا "آخر کیوں؟ مجھ سے کیا گناہ سرزد ہو گیا ہے جو آپ کا در میرے لیے بند ہے۔ وہ در جہاں سے کبھی کوئی مایوس نہیں لوٹا مجھے کیوں مایوس دھتکارا جا رہا ہے؟"

جنید بغدادی نے رکھائی سے کہا "تم جیسا متلون مزاج بھی تو آج تک ہمارے در پر نہیں آیا۔ آج سے پہلے تم نے سہل بن عبداللہ کو چھوڑا۔ عمر بن عثمان کے پاس رہنے لگے اور پھر ان سے جدا ہو کر یہاں آن پہنچے ہو اور ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ کیا کر کے آ رہے ہو۔ بھلا ایسے انسان کا کیا بھروسہ؟ نجانے تم کب کس حال میں ہمارا ساتھ چھوڑ کر کسی اور کی صحبت اختیار کرنے دوڑ پڑو۔ ابن منصور شاید تم نہیں جانتے کہ حسن صحبت کا تقاضا کیا ہوتا ہے۔ تم کیا جانو اسے ــــ تم تو ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہو اور حسن صحبت کا پہلا تقاضا ہی یہی ہوتا ہے کہ ہوش و حواس میں انسان ہو۔"

ابن منصور نے جنید بغدادی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "حضرت یہ سب انسانی صفات ہوشی و مدہوشی ایسی ہیں کہ میں خدا سے دعا کروں گا کہ وہ مجھے اپنی رحمت سے کام لے کر ان میں سرخرو کرے، لیکن پھر بھی میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ آپ اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ جب تک انسان اپنی انسانی صفات سے بالکل ہی عاری نہ ہو جائے انہیں نیست و نابود نہ کر ڈالے وہ اپنے خالق سے اپنے آقا سے پوشیدہ ہی رہتا ہے اور میں نہاں دستور رہنا کم از کم اپنے مالک کی نظروں میں نہیں چاہتا۔"

جنید بغدادی نے غصہ میں کہا "ابن منصور یہی تو تمہاری بھول ہے۔ تمہاری نادانی ہے جسے تم صحیح راہ سمجھ کر چل رہے ہو وہ بربادی کی طرف تمہیں لیے جا رہی ہے۔ تم تو ہوش و مدہوشی کے معاملے میں بالکل ہی غلط نظریہ رکھتے ہو۔ بھلا کیا یہ بھی انسانی اختیار کی بات ہے نادان انہیں محض اپنی کوششوں سے حاصل کرنا سب سے بڑی غلط فہمی ہے۔ ابن منصور..... کاش تو یہ سب سمجھتا۔ ہوش و حواس سے کام لیتا۔ کاش تو یہ سب جان سکتا کہ تیرے اقوال و فکر میں کسی قسم کی بھلائی نہیں یہ تو حماقت و دیوانگی ہے۔ محض حماقت و دیوانگی۔"

ابن منصور نے سب کچھ خاموشی سے سنا۔ انہیں سہل بن عبداللہ سے لے کر اب تک سب ہی ذہن نشین کراتے آ رہے تھے کہ وہ غلط راہ کے ہم راہی ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ سراسر دیوانگی کی علامتیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جنید بغدادی سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اٹھ کر آ گئے۔

اب کی بار حج کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی تو بغداد سے مکہ کی راہ لی۔ حج کرنے کے بعد مکہ سے پلٹ کر دوبارہ بغداد آ گئے اور خاموشی سے جنید بغدادی کی خدمت میں رہنے لگے۔ اس دوران انہوں نے ایک شادی بھی کر لی۔

ایک دن انہوں نے جنید بغدادی سے سوال کر ہی ڈالا کہ "حضرت آپ کے خیال میں مجھ سے جو یہ افعال سرزد ہوتے ہیں آخر ان کا ذمہ دار کون ہے؟"

جنید بغدادی نے انہیں غور سے دیکھا اور سوچا شاید اب حسین کو اپنی حالت پر رحم آ رہا ہے۔ وہ راہ بدلنا چاہتے ہیں سو انہوں نے فوراً جواب دیا "اپنے افعال کے تم خود ہی ذمہ دار ہو۔"

لیکن اگلے ہی لمحے حسین نے اُن کی تمام اُمیدوں کی نفی کرتے ہوئے کہا "لیکن جناب مَیں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے آپ کی اس بات سے بالکل اختلاف ہے۔ بھلا مَیں کیوں ناکردہ گناہوں کو اپنی گردن میں لٹکنے کی جگہ دوں۔ مَیں تو جو کچھ کرتا ہوں اور مستقبل میں جو کچھ کروں گا وہ سب من جانب اللہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے مَیں کسی طور بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ رکھنا بھی چاہوں تو مجھ سے ایسا نہ ہو سکے گا"

جنید بغدادیؒ غور سے سب کچھ سنتے رہے۔ مُرید پہ نظر ڈالے اُس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے رہے کہ آخر ابنِ منصور کس راہ پر ہے۔ کیوں نہیں سمجھ سکتا کہ راز کو راز ہی رکھنا مصلحت کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے فرمایا "ابنِ منصور... تو کچھ بھی کہے لیکن ہم بھی ایک بات تجھے بتانا چاہتے ہیں اور ہماری اس بات کو تو گرہ میں باندھ لے۔ اے بدنصیب تو جو کچھ کہتا پھر رہا ہے اس سے تو یقیناً کسی نہ کسی دھاتی چیز کو اپنے لہو سے رنگ کر ہی باز آئے گا۔ یہ ہمیشہ ذہن میں رکھنا"

ابنِ منصور بے خوفی و بے باکی سے بولے "حضرت مجھے بھی علم ہے کہ میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانے والا ہے۔ مَیں آپ کو بھی علمائے ظاہر کا پیراہن پہنے، خلیفۂ وقت کی طرف سے ملے حکم کے مطابق، مجبوراً اپنے خلاف فتوا صادر کرتا دیکھ رہا ہوں۔ مَیں اُس سُولی کو بھی دیکھ رہا ہوں جس پر میرا جسم سجے گا لیکن اے شیخ چاہے کچھ بھی ہو مَیں ہرگز منافقت کا جال نہیں اوڑھ سکتا جو کچھ دل میں ہے زبان پر لاتا رہوں گا چاہے اس سے کسی کے رازوں کے افشا ہونے کا ڈر ہو یا نہ ہو"

جنید بغدادی نے رحم بھری نظروں سے آپ کو دیکھا اور پھر خاموشی سادھ لی۔

جنید بغدادی سے مایوس ہو کر آپ ناراضگی سے بغداد چھوڑ کر تستر چلے آئے۔ آپ کی بے باکی و صاف گوئی کی وجہ سے ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا لیکن دوسری طرف علمائے ظاہر آپ سے سخت رنجش میں مبتلا ہو گئے۔ خود آپ کے مُرشد عمر مکی نے بھی آپ کے خلاف خطوط لکھ لکھ کر لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ غرض ایک طوفانِ حسد و معاندانہ کا تھا جس میں آپ کو پھنسا دیا گیا۔ ہر طرف سے مخالفت کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ آپ اس حد تک اس صورتِ حال سے عاجز آ گئے کہ دُنیاوی زندگی اختیار کر لی لیکن وہ آپ کے مزاج سے کہاں لگاؤ کھاتی تھی۔ سو جلد ہی اپنی پُرانی روش پر آ گئے۔

اس عرصہ میں آپ نے لاتعداد کتب بھی تصانیف کیں۔ ان تصانیف پہ آپ کو حلاج الاسرار کا خطاب دیا گیا۔

تستر میں طوفانِ مخالفت کی یلغار سے بچنے کے لیے آپ نے سیاحت کا پروگرام بنایا اور خراسان، برِصغیر اور جنوبی چین جہاں بھی گئے لوگوں نے آپ کا بھرپور گرم جوشی سے استقبال کیا۔ آپ اُن لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

ایک مرتبہ پھر حج کا خیال پیدا ہوا تو عقیدت مندوں سمیت مکہ کی راہ لی۔ عقیدت مندوں کے ہجوم میں آپ آہستہ آہستہ مگر بڑھ رہے تھے۔ مُریدوں کی اکثریت تھی اور زادِ راہ اس حد تک کم کہ ابتدائی دِنوں میں ہی ختم ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ فاقوں سے بے حال ہو گئے اور جب آپ کو بے نیازی اختیار کیے دیکھتے تو جھنجھلا کر رہ جاتے۔ آخر دل کی بات لبوں پر آئی تو شکا[یتی] انداز میں کہہ اُٹھے "حضرت یہ بھی خوب رہی آپ کے ہمراہ حج کا ارادہ کیا لیکن آپ کی اہلِ سفر والوں سے یہ بے اعتنائی تو دکھا[ئی] کہ مکہ تک پہنچنا نصیب ہو نہ ہو بھوک و فاقہ سے زمین کی تہہ میں ضرور جائیں گے"

یہ سُن کر آپ نے پہلے تو حیرت سے اپنے ساتھیوں کے چہروں پر چھائی فاقہ کشی کے آثار دیکھے۔ اپنی غفلت کا احساس ہوا

"اچھا... پھر اب تم کیا کھانا پسند کرو گے؟"

مُریدوں نے حیرت سے یہ سُن کر آپ کو دیکھا وہ آپ کی ذہنی کیفیت کی درستی کے بارے میں سوچنے لگے کہ بھلا یہ کیسے ممـ[ـکن] کہ عقیدت مند بھوک سے مرے جا رہے ہیں۔ آس پاس کھانے کو درختوں کی جڑیں تک میسر نہیں اور پوچھا جا رہا ہے تم کیا کھا[نا پسند] کرو گے۔ سبھی ایک دوسرے سے افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ اب کی مرتبہ خوب پھنسے۔ بجانے گھر بار کی شکل بھی دیکھنا نصیب ہو[گی یا نہیں]

آپ نے جب اہلِ قافلہ کو آپس میں باتیں کرتے پایا تو دوبارہ پوچھا "مَیں تم سے پوچھ رہا تھا کہ کیا کھانا پسند کرو گے"
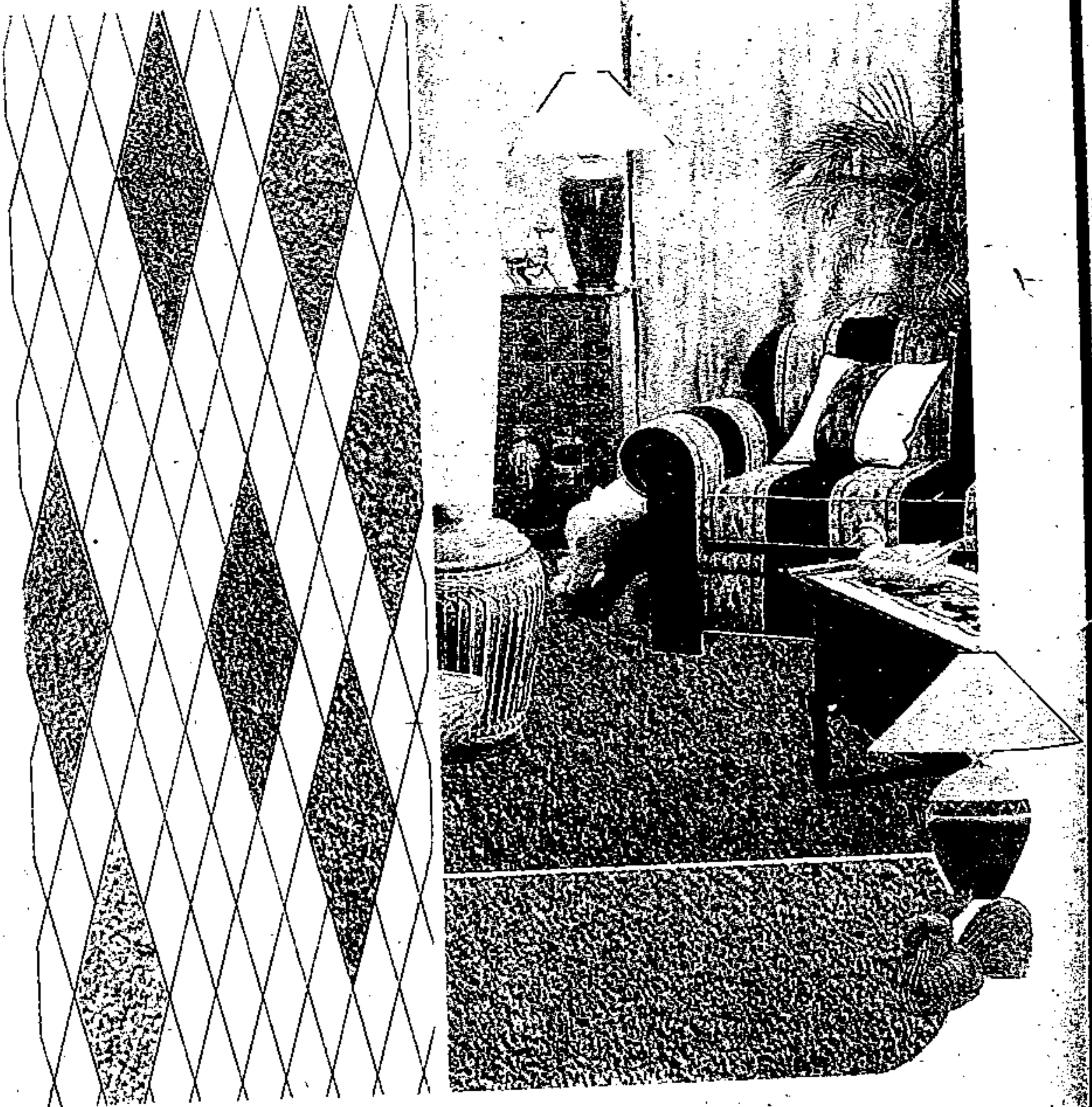
ایک مرید بھڑک ہی اٹھا اور کہنے لگا: "حضرت اگر ہماری پسند کا خیال ہے تو ہمیں اس وقت سری اور گرم روٹیاں کھانے کی خواہش محسوس ہو رہی ہے اگر اس بیابان و سنسان ریگستانی علاقے میں بندوبست کر سکتے ہیں تو کر دیں۔"

مرید کی یہ بات آپ سن کر مسکرا پڑے اور فرمایا: "جو تم مانگتے ہو تمہیں مل جائے گا۔ تم لوگ اطمینان سے چادر بچھا کر بیٹھ جاؤ۔"

عقیدت مندوں نے غیر یقینی کے انداز میں آپ کو دیکھا اور چادر بچھا کر بیٹھ گئے پھر لگے لمحے انہوں نے جو آپ کو ہاتھ پیچھے لیجا کر کچھ تھامتے اور پھر ہاتھ آگے کر کے ہاتھ میں تھامی سری اور روٹیوں کو اپنی طرف بڑھاتے دیکھا تو حیرت سے گنگ رہ گئے لیکن بھوک کے ہاتھوں بے تاب لوگوں نے جلد از جلد کھانا شروع کیا اور خوب سیر و شکم ہو کر ہی ہاتھ کھینچا۔

لوگوں کے لیے یہ ایک دلچسپ کرامت تھی۔ وہ آپ کی موجودگی میں ضروریات زندگی سے لاتعلق ہو گئے۔ سفر دوبارہ شروع ہوا تو ایک مقام پر عقیدت مندوں نے آپ سے خرمے کھانے کی خواہش کا تقاضا کیا۔ آپ نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔ "خرمے؟ خرمے یہاں کہاں! نہ تو خرموں والا باغ ہے نہ یہاں بازار جہاں سے خرمے خرید لیے جائیں۔"

مرید جو آپ سے کرامت کی اُمید رکھے ہوئے تھے بولے "حضرت ہمیں تو اپنی احتیاج عرض کرنا تھی۔ سو کر دی۔ وہ مطلوبہ شے کہاں سے ملے گی یہ ہم نہیں جانتے اور نہ ہم گناہ گار بندے یہ جاننا چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے "میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کتنی عقیدت ہے لیکن میں وہ وقت بھی دیکھ رہا ہوں جب تم ہی سے میرے کچھ ساتھی مجھ پر پتھر برسائیں گے۔ اپنی لعن طعن سے مجھے لہولہان کر ڈالیں گے۔ مجھے کافر قرار دیں گے۔"

یہ سن کر عقیدت مند یک وقت چلا کر بولے "حضرت یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ بخدا ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ بھلا ہم ایسا کیوں کریں گے؟"

یہ سن کر آپ نے فرمایا: "خیر تم میرے جسم کو یوں ہلاؤ جیسے پھلدار درخت کو پھل کی خاطر ہلایا جاتا ہے۔" مریدوں نے یہ عجیب و غریب حکم سنا۔ پہلے تو ہچکچائے۔ پھر آگے بڑھ کر آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو ہلانا شروع کر دیا۔ جوں جوں وہ آپ کے وجود کو ہلاتے جاتے آپ کے جسم سے خرمے یوں گرنے لگے جیسے کسی شجر سے گرتے ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہی آپ کے مرید خرموں کے ڈھیر کے پاس بیٹھے کھانے میں مصروف تھے۔

فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد آپ پھر دوبارہ مریدوں کے ہمراہ بغداد آ گئے۔ اب کی مرتبہ بغداد کی فضا بھی آپ کیلئے کوئی زیادہ سازگار نہ تھی۔ مخالفت عروج پر تھی۔ علمائے دین ایڑی چوٹی کا زور آپ کو کافر ثابت کرنے میں لگا رہے تھے۔ لوگوں کو آپ کے خلاف حد سے زیادہ بھڑکا دیا گیا تھا۔ لوگ آپ کو تنگ و زچ کرنے کی خاطر الٹے سیدھے سوالات کی بوچھاڑ کرتے۔ یہ اطلاعات جنید بغدادی تک بھی پہنچی۔ انہوں نے اس پر سخت دکھ اور غم کا اظہار کیا اور اپنی ناراضگی ظاہر کی۔ لیکن پھر خود سے بولے "ہم بھی کیا کر سکتے ہیں جو شخص خود کو تباہ کرنے پر کمربستہ ہو اسے کوئی کیوں کر بچا سکتا ہے۔ بھلا ایسا بھی کیا کہ ایک چیز پر جو ازل سے پردہ پڑا ہے تم اُٹھانے کے درپے ہو رہو۔ اگر اس فعل کے لیے مجبور ہو تو پھر سزا تو یقیناً ملے گی ہی۔ ہم بھلا کون ہوتے ہیں اس سزا سے بچانے والے"

حاسد اور نادان علماء جو ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑ چکے تھے۔ طرح طرح کے سوالات کر کے آپ کو زچ کیے ہوئے تھے ایک نے شرارتاً پوچھا "حضرت موسیٰ کے بارے میں کچھ عرض کریں۔"

ابن منصور بولے "پیغمبر تھے...... برحق خدا کے برگزیدہ پیغمبر۔"

اسی عالم نے دوبارہ پوچھا "اچھا فرعون کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

آپ نے جواب دیا "وہ بھی سچا تھا۔"

یہ سن کر لوگوں نے طنزیہ انداز میں قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ خوب.... حضرت آپ کے بھی کیا کہنے..... سنو بھائیو تم بھی ذرا

ابن منصور کی بات سنو۔ بدی بھی برحق ہے اور سچائی بھی حق ہے۔ ذرا ان سے پوچھو تو سہی یہ بات کیا ہوئی آخر؟"

ابن منصور بولے "تم لوگوں کو ہنسنے سے فرصت ملے تو میری بات غور سے سنو۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ خدا نے دو طرح کے لوگ پیدا کیے ہیں۔ ایک عام قسم کے۔ دوسرے خاص قسم کے۔ سبھی اپنے اپنے حصے کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔"

یہ سن کر ایک شخص غصے میں بھڑک کر بولا "یہ تو کیا بک رہا ہے کیوں ہمیں کفر کے کلمات سنا کر گناہ گار کر رہا ہے۔"

ابن منصور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "دیکھو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ خدا ہی ہر قسم کے لوگوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ وہی انہیں راستے کا پتہ بتانے والا ہے۔ حکمت ایک تیر ہے خدا تیر انداز اور مخلوق نشانہ....."

لوگوں نے اب آپ سے سخت بے چینی محسوس کی۔ وہ یہ ہم دکھائی دے رہے تھے کہ ایک شخص کھڑے ہو کر پوچھنے لگا "ابن منصور تمہارے نزدیک صبر کی کیا تعریف ہے؟"

ابن منصور بولے "صبر..... صبر کا مطلب ہے مصائب و تکالیف کی چکی میں پسنے والا اف تک نہ کرے۔ سولی پر چڑھا کر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جائیں مگر اس کے لبوں سے پروردگار کے لیے شکوہ نہ نکلے۔"

اچانک مجمع میں سے ایک شخص بول اٹھا "ابن منصور..... وہ وقت بھی دور نظر نہیں آتا جب صبر کا مفہوم ہم تجھے سولی پر لٹکتے دیکھ کر تمہارے طرز عمل سے سیکھیں گے۔"

لوگوں کے اس طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر حسین ابن منصور ایک دفعہ پھر حج کی نیت سے مکے چلے گئے اور اس مرتبہ بھی آپ کے ساتھ ایک ہجوم تھا اور آپ بھی اس ہجوم میں اکثر کی منافقت پر دکھ بھی محسوس کرتے اور افسوس بھی۔ وہ کہتے اگر لوگ مجھے سمجھ نہیں سکے میرے درد کا احساس نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مجھے کافر ہی قرار دینے لگیں۔ اس بات پر وہ اس قدر برہم تھے کہ ضبط کا یارانہ چھوٹا تو عرفات کے میدان میں ہزار ہا افراد کے سامنے بلند آواز میں خدا سے فریاد کرنے لگے۔

"اے اللہ تو بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے والا ہے۔ کیا میں بھی تیرے نزدیک کفر کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں۔
جو تیرے بندے مجھے کافر کہنے لگے ہیں۔ اگر افکار و نظریات واقعی کفر کے زمرے میں آتے ہیں تو میرے اس
کفر میں اور اضافہ فرما دے۔"

یہ سن کر لوگ تو بر استغفار کرنے لگے اور اب تو انہیں مکمل یقین ہو گیا کہ ابن منصور مسلمان نہیں رہا کافر ہو گیا ہے۔ وہ آپ سے علیحدہ ہو گئے اور آپ پر لعن طعن کرنے لگے۔

ایک مرتبہ آپ کو اپنے ایک دوست کا خط ملا جس میں اس نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ آخر ابلیس ہی کیوں آدم کو سجدہ کرنے سے منکر ہو گیا تھا۔ تو اس کے جواب میں آپ نے ایک بے باکانہ انداز میں جواب لکھ کر بھیجا جس کا مضمون کچھ اس طرح سے تھا۔

"من جانب ارحم الرحمین ——— بنام بندۂ خدا
تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ شیطان مردود نے آدم کو اپنے خالق کے کہنے کے باوجود سجدہ کیوں نہیں کیا۔
اگرچہ اس کا جواب اب تک لوگوں سے چھپایا جاتا رہا ہے جو کہ مناسب نہیں تھا اور نہ ہی ایسا یہ کوئی راز ہے۔
میں تمہیں آج اس سے آگہی دلواتا ہوں۔
ابلیس بہت بڑا موحد تھا اس نے اپنے رب کا بھی وہ حکم نہیں مانا جس سے شرک کی بو پائی جاتی تھی۔"

اس قسم کے خطوط لکھنے پر ہی ابن منصور نے اکتفا نہ کیا بلکہ ساتھ ہی یہ نعرہ بھی لگا دیا کہ "میں ہی وجود خداوندی ہوں۔" لوگوں نے جب "انا الحق" کا یہ نعرہ سنا تو کانپ کر رہ گئے۔ دور دور تک حشر برپا ہو گیا۔ علماء و مشائخ نے یہ سننا تھا کہ تھر تھرانا شروع کر دیا۔ نادان اور نااہل اس حد تک مشتعل ہو گئے کہ انہوں نے آپ پر سنگ باری شروع کر دی۔ جب معاملہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو مجبوراً خلیفۂ وقت کو اس میں مداخلت کرنا پڑ گئی اور اس نے مفاد عامہ کی بھلائی کی خاطر اپنے اس فعل کو جائز قرار دیتے ہوئے آپ کو گرفتار

کر لیا اور قید خانے میں ڈال دیا۔
حسین ابن منصور کی گرفتاری کوئی اتنا معمولی واقعہ نہ تھا جو پوشیدہ رہتا چنانچہ بغداد اور آس پاس کے دُور دراز علاقوں تک یہ خبر پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آپ سے ملاقات کرنے جیل خانہ آنے لگے۔ لوگوں نے ابن منصور کو قید میں دیکھا تو دل بھر آیا۔ غم و رنج کی کیفیت سے ابن منصور سے کہنے لگے۔
"ابن منصور..... اپنی جان پر رحم کھاؤ۔ کیوں خود کو عذاب میں مبتلا کیے دے رہے ہو۔ خلیفۂ وقت سمیت تمام علماء اور بزرگان دین تم سے خفا ہیں۔ کیوں تم اپنا لہجہ اس حد تک تلخ کرتے ہو کہ لوگوں کو تم پر اُنگلی اُٹھانے کا موقع ملے۔ حسین ابن منصور..... مان لو..... اب بھی وقت ہے تم انا الحق..... اور من جانب الرحم الرحمین کہنا بند کر دو۔ لاتعلقی کا اظہار کر دو۔ خلیفہ تمہیں چھوڑ دے گا۔
ابن منصور بولے " لوگو تم کیوں خواہ مخواہ مجھے حق راہ سے ہٹانے کے لیے کوشاں ہو۔ جاؤ تم لوگ اپنا کام کرو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں۔ یہی خدا کی رضا ہے تم اپنی ذمہ داریاں نبھاؤ میں اپنا فرض سرانجام دیتا ہوں۔"
چنانچہ لوگ مایوس ہو کر آپ کی طرف دکھ بھری نظروں سے دیکھتے واپس پلٹ گئے۔ اب اُنہیں یقین آگیا کہ یہ درویش اپنی گردن کٹوا کر ہی رہے گا۔ اس کے افکار و نظریات نے جو تہلکہ مچا رکھا تھا وہ اس بات کی صاف نشاندہی کرتا تھا کہ بہت جلد کچھ نہ کچھ ناخوشگوار واقعہ ہونے والا ہے۔
ایک رات عقیدت مند جو آپ سے ملنے قید خانے پہنچے تو حیرت زدہ رہ گئے وہاں نہ آپ کا قید خانے والا حصہ تھا نہ ہی آپ تھے۔ اُنہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سبھی کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت پائی جا رہی تھی۔ وہ تمام رات قید خانے کے نگرانوں نے اور مریدوں نے اس جستجو میں لگا دی کہ آخر آپ کدھر گئے اور یہ کس انداز سے غیر حاضر ہوئے ہیں کہ ساتھ ہی جگہ کو بھی لے گئے۔
اگلی صبح اُنہیں پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب اُن کی نظروں کے سامنے ابن منصور اپنی جگہ موجود تھے۔ لوگوں نے آپ کو دیکھا تو حیرت سے دریافت کیا "حضرت یہ کیا معاملہ ہے رات آپ قید خانے سمیت ہی اوجھل تھے۔"
ابن منصور بولے "ہاں رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس قید خانے میں شرفِ ملاقات بخشا تھا اور آپؐ کی موجودگی میں قید خانہ اپنی حیثیت کھو بیٹھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم تم لوگوں کی نظروں سے قید خانہ سمیت اوجھل تھے۔"
ایک مرید نے تصدیق چاہی "حضرت آپ چاہیں تو یہاں سے فرار باآسانی ہو سکتے ہیں۔"
آپ نے لحظہ بھر اُسے دیکھا پھر فرمایا "بے شک مٹی و پتھر کی بنی یہ دیواریں ہماری راہ نہیں روک سکتی، لیکن تحفظِ شریعت کی خاطر ہم ایسا قدم نہیں اُٹھا سکتے۔"
اور پھر ایک دن فیصلہ کا وقت آن پہنچا۔ خلیفہ نے حکم جاری کیا کہ آخری بار دوبارہ ابن منصور سے پوچھ گچھ کی جائے۔ اس پر جرح کرو کہ شاید وہ اپنی غلطی تسلیم کر لے اور جان بچا لے لیکن اگر وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرے تو علماء سے ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ لے کر قتل کر دیا جائے۔
چنانچہ خلیفہ کے حکم سے علماء قید خانے میں ابن منصور سے ملنے گئے اور ان پر جرح کرتے ہوئے بولے "ابن منصور کیا تم یہ خیال نہیں کرتے کہ خود کو انا الحق کہلاتے پھرو۔ گویا اس طرح تم نے اپنی خدائی کا دعویٰ کر دیا۔"
دوسرا بولا "ابن منصور پہلے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید تم پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہو، لیکن پھر تمہارے خطوط نے اور تمہارے نعرہ انا الحق نے ہم پر انکشاف کیا کہ تم تو اس سے بھی بلند سوچ رکھتے ہو اور خدائی کا دعویٰ کرنے لگے ہو۔"
حسین ابن منصور آخر تمہارا ان سب باتوں سے کیا مقصد ہے؟ کیا حاصل کرنا چاہتے ہو تم ان ذریعے سے؟"

ابن منصور نے سب الزامات بغور سے سُننے کے بعد جواب دینا شروع کیا۔

"میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم لوگ میری مخالفت میں اس حد تک نِکل جاؤ گے کہ مجھے خدا بننے کا الزام دینے لگو گے۔ کیا واقعی تم اس حد تک کم عقل و ناسمجھ ہو کر تم میری باتوں کی گہرائی میں نہ جا سکے۔ تم میرے نظریات کو نہ جان سکے۔ کیا تمہیں "سن الرحم الراحمین" کا مطلب ہی نہیں معلوم۔ نادانو! اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کاتب ہے اور میں خود آلۂ کتابت پھر بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں خدا بننے کا خواہش مند ہوں۔ خدا تم پر رحم فرمائے۔ تم ایک بے گناہ کے لہو سے بہت جلد اپنے ہاتھ سُرخ کرنے والے ہو۔ میں وہ منظر دیکھ رہا ہوں جب تم لوگ ناحق مجھے سُولی پر چڑھا کر ہی دم لو گے۔"

ابن منصور کا کہا سچ ثابت ہوا۔ علماء نے اور خلیفہ نے ابن منصور کی تمام تر تاویلات کو مسترد کرتے ہوئے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

چنانچہ اگلے روز آپ کو زنجیروں میں باندھ کر باہر لایا گیا اور مقتل گاہ کی طرف لیجایا گیا۔ راہ کے دونوں اطراف کھڑے شر پسند نادان اور ناسمجھ لوگ آپ کو پتھر مارنے لگے۔ انہی میں وہ شبلی نامی بزرگ بھی تھے جو جنید بغدادی کے سب سے چہیتے شاگرد تھے۔ وہ بھی حسین ابن منصور کو مارنے والوں میں شامل ہو گئے۔

آپ کو ٹکٹکی پر باندھا گیا اور پھر ایک جلاد صفت نوجوان خلیفۂ وقت کے حکم پر آپ پر کوڑے برسانے لگا۔ ہر کوڑے کی ضرب پر کوڑے برسانے والا ایک پُراسرار سی آواز سُنتا جو ابن منصور کو مخاطب ہوتی۔ وہ آواز بار بار منصور سے کہتی "اے ابن منصور دیکھ گھبرا مت جانا۔ خوفزدہ نہ ہونا"

تین سو کوڑے برس چکے مگر ابن منصور کے لبوں سے آہ تک نہ نکلی۔ اُف تک نہ کہا۔ آپ نے اُس وقت عربی میں یہ شعر پڑھنا شروع کر دیئے۔

میرا ندیم ذرا سا بھی ظالم نہیں۔

اُس نے مجھے وہ شراب پینے کو دی جو ایک میزبان مہمان کو دے سکتا ہے۔
اور جب جام پہ جام لنڈھائے جا چکے۔
تو اُس نے شمشیر اور کوڑا تھام لیا۔
اور بولا اس کے لیے یہی سزا ہے۔
یہ شخص اسی سزا کے قابل ہے اژدھے کے سامنے سخت گرمی میں۔
بھلا اسے شراب پینے کی جسارت ہوئی کیسے؟

پھر جلاد آگے بڑھا اس نے تلوار بلند کی اور ایک ہی وار میں آپ کے دونوں ہاتھ تن سے جدا کر دیئے آپ نے اُف تک نہ کی۔ اور بولے "کیا ہوا میرے باطنی ہاتھ تو محفوظ ہیں۔ اُنہیں کون کاٹ سکتا ہے"؟
پھر جلاد نے آپ کے دونوں پاؤں کاٹ دیئے۔ آپ بولے "میرے باطنی پاؤں تو محفوظ ہیں۔ وہ کس کی زد میں آسکتے ہیں بھلا۔ کون کاٹے گا اُنہیں"۔

اس کے بعد انتہائی ظالمانہ انداز میں آپ کی آنکھیں بھی نکال دیں۔ خون کے فوارے آپ کے جسم سے پھوٹ رہے تھے۔ آپ کا بدن لہو میں ڈوبا خدا کی بارگاہ میں جھکا جا رہا تھا اور آپ کے لب آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ "یکتا کی دوستی بھی یکتا ہی کر دیتی ہے"۔

اور پھر جب آپ کی زبان کاٹ گئی اور آخر میں آپ کی گردن بھی کاٹ دی گئی تو ہر طرف سے صدا بلند ہونے لگی "انا الحق! انا الحق!

دوسرے دن آپ کی لاش جلا دی گئی اور دجلہ کے دریا کے سپرد راکھ کر دی گئی۔

ابن منصور بلاشک مومن تھے۔ عارف و محب جو خدا کی وحدانیت پرستی کے بہت بڑا علمبردار تھے۔ پھر آخر اُنہیں اذیتوں بھری اتنی کڑی سزا کیوں ملی ——؟

صرف اس لیے کیونکہ انسان نے خود کو ان بلند و بالا پتھریلی دیواروں میں خود کو محبوس کر لیا جو اس نے خود اپنے لیے تیار کی تھیں۔ اقوال اور افعال کی پابندی اور افکار میں اظہار کی مجبوری یہ وہ بوجھ ہے جو انسان نے اٹھایا ہے جسے اٹھانے سے فرشتوں تک نے انکار کر دیا وہ اس بوجھ کی سزا سمجھتے تھے جو انسان نے اسے اٹھا کر بھگتنی شروع کی اور بھگت رہا ہے اور نجانے کب تک اسے اس کی یہ سزا بھگتنی ہے۔

ابن منصور کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کیا گیا کیونکہ وہ اپنے خالق کے رازوں کو راز نہ رکھ سکا۔ بر سر عام برملا اظہار کرتا رہا۔ اگر اُدھر تو یہ عالم ہے کہ موجودات کا ذرہ ذرہ انا الحق پکار رہا ہے، لیکن اسی انا الحق کہنے کی پاداش میں انسان کو سزا بھگتنی پڑی۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ ملک الموت ہر گھر میں روزانہ تین مرتبہ چکر لگا کر دیکھتے ہیں کہ کس کا رزق پورا ہو گیا ہے کس کی عمر پوری ہو گئی ہے۔ جس کا رزق پورا ہو جاتا ہے، اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور جب اس کے گھر والے اس کی موت پر روتے ہیں تو ملک الموت دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں۔ میرا کوئی گناہ نہیں مجھے تو اس کا حکم دیا گیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے نہ تو اس کا رزق کھایا۔ نہ ہی اس کی عمر گھٹائی۔ میں تمہارے گھروں میں بار بار آتا ہوں یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔
حضرت حسنؓ نے فرمایا اگر میت کے گھر والے ملک الموت کا کھڑا ہونا دیکھ لیں اور ان کی یہ باتیں سن لیں تو اپنی میت سے غافل ہو کر اپنے اوپر رونا شروع کر دیں۔

شیخ نور الحق وہ صاحب بزرگ ہستی ہیں جنہوں نے سرزمین بنگال میں اسلام کی شمع روشن کی۔ بنگال جو کفر کی فضا میں سانس لے رہا تھا وہاں آپ نے اللہ کی وحدانیت کا علم بلند کیا۔ خدا کے سرکش اور نافرمان بندوں میں اُن کے خالق کا نام پھیلانا ایک کٹھن کام تھا۔ لیکن آپ نے اسے اپنے مقصدِ حیات کے طور پر اپنایا اور اس پُل صراط کو پار کرنے میں لگ گئے جہاں تباہیاں، بربادیاں اور ہلاکتیں آپ کا مقدر تھیں۔ جہاں دُکھ ہی دُکھ تھے لیکن آپ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے تکالیف برداشت کرتے۔ اللہ کے نام کی روشنی سے کفر کے باطل اندھیروں میں اُجالا کرنے میں مصروف رہے۔ صبر و تحمل کی انتہا کر دی۔ ثابت قدم تھے لیکن دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیے خادم بن کر زندگی گزاری۔

۷۲۲ ہجری میں پیدائش ہوئی۔ دادا اسد لاہوری جن کا سلسلۂ نسب حضرت خالد بن ولیدؓ سے جا ملتا تھا بنگال کے شاہی دربار سے منسلک تھے۔ دادا کی خواہش تھی کہ پوتے کو اپنے رنگ میں رنگیں گے۔ بیٹا تو باپ کی منتخب کردہ راہ پر نہ چل سکا پوتا ہی سہی۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی پوتے نے جو رنگ ڈھنگ نکالے وہ باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کے تھے۔ علاء الدین وہ بزرگ ہستی تھی جنہوں نے باپ کی خواہش کے مطابق دربارِ شاہی سے وابستگی تو رکھی لیکن پھر دیر کر علیحدہ ہو گئے: "میری زندگی کی بنیاد کلمہ طیبہ پر ہے یعنی لا الہ الا اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر میں کیسے دربار۔ سرکار سے وابستہ رہوں جہاں دنیاوی بادشاہ الٰہ کی مانند نظر آتے ہیں۔ اور میں تو اللہ کو ہی معبود سمجھتا ہوں۔ میں سوائے اللہ کے دُوسرے تمام معبودوں سے دامن چھڑانا چاہتا ہوں۔ میں صرف ایک خدا کے آگے سجدہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں بقیہ ہزاروں سجدوں سے نجات چاہتا ہوں۔"

چنانچہ شاہی مُلازمت چھوڑ کر دینِ حق کی راہ میں زندگی وقف کر دی۔ دُور دُور سے طالبانِ حق، مرید اور ارادت مند آتے اور خانقاہ میں ایک ہجوم لگا رہتا۔ نور الحق بھی دادا کی خواہش کے برعکس کہ دربارِ شاہی میں کسی منصب کے حصول کے لیے تیاری کریں۔ باپ کی خانقاہ میں مریدوں اور ارادت مندوں کی دن رات خدمتوں میں وقت گزارنے لگے۔ لیکن سلسلۂ درس بھی جاری رہا۔ نور الحق کا ایک ہم سبق شہزادہ غیاث الدین بھی تھا۔ بعد میں بادشاہ بنا۔ وہ اپنے ہم جماعت نور الحق کو بہت دلچسپی سے دیکھتے۔ چپ چاپ رہنے والا، دوسروں کی نسبت منکسرانہ مزاج رکھنے والا یہ ہم عمر انہیں بہت بھایا۔ اس کوشش میں رہتے کہ کسی طرح آپ سے دوستی پیدا کریں لیکن نور الحق نجانے کیوں فاصلہ رکھتے۔ شہزادہ جوں قریب آتا آپ فوراً دُوری اختیار کرتے۔ شہزادے سے کترانے کی کوششیں کرتے۔ شہزادہ اُن کے اس رویے سے بڑی تکلیف محسوس کرتا۔ اس کی خواہش ہوتی کہ نور الحق کبھی اُس سے کوئی درخواست کریں، کسی چیز کی فرمائش کریں مگر نور الحق نے اُن کی کبھی یہ خواہش پُوری نہ کی۔

ایک دن شہزادہ غیاث الدین آپ کے پاس جا بیٹھا اور کہنے لگا "نورالحق ہم ایک جماعت میں ہیں۔ ہمارا یہ تعلق اگر تم چاہو تو زندگی بھر بھی قائم رہ سکتا ہے اور مجھے اس کی خواہش بھی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟"

نورالحق نے شہزادے کو حیرانگی سے دیکھا اور پوچھا "زندگی بھر کا تعلق ہم میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟"

شہزادہ بولا "نورالحق سیدھی سی بات ہے جب تم اپنی تعلیم مکمل کر لو تو ہمارے دربار سے وابستہ ہو جانا۔ کیونکہ تب تک ہم بادشاہ بن چکے ہوں گے۔"

نورالحق نے شہزادے سے پوچھا "لیکن تم نے یہ کس طرح سوچ لیا کہ ہم تحصیل علم کے بعد شاہی دربار سے وابستگی اختیار کرنا چاہیں گے؟"

شہزادہ بولا "پھر اس علم کے حصول کی کیا وجہ ہے؟ علم اسی لیے تو حاصل کیا جاتا ہے کہ اس سے دربارِ شاہی میں پائیں اور اچھا سا منصب سنبھالا جاتے۔ بھلا اس کے علاوہ اور مقصد ہو بھی کیا سکتا ہے۔ آپ جو اس طرح تحصیلِ علم میں لگن کا اظہار کر رہے ہیں یقیناً آپ بھی اس کے بعد اس علم سے اسی طرح فائدہ اُٹھانے کی سوچتے ہوں گے۔"

نورالحق بولے "شہزادے یہ آپ کی کم فہمی ہے۔ ہم علم کا حصول کسی درباری منصب یا بادشاہ کی قربت کے حصول کے لیے ہرگز نہیں کر رہے۔ ہم علم سے عرفان کی بلندی چاہتے ہیں۔ اپنی ذات کے عرفان کا حصول ہی ہمارے علم کی معراج ہے۔ درباروں اور بادشاہوں کا قرب حاصل کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں اپنے علم کو مٹی میں ہی ڈبو دوں۔ ذلیل و خوار کر کے رکھ دوں۔"

شہزادہ یہ سُن کر طیش میں آ گیا اور بولا "بس بس نورالحق تم سے مجھے ایسی کم عقلی کی امید نہ تھی۔ ایک عالم دولت و ثروت کو سجدہ کرتا ہے۔ میں خاندانی شہزادہ ہوں اور اللہ نے چاہا تو وہ وقت بھی دُور نہیں جب تم جیسے بہت سے ذی علم میری قربت کی خواہش رکھیں گے۔ اگرچہ تم نے اپنی باتوں سے میرے دل پر چوٹ لگائی ہے۔ تمہاری باتوں سے مجھے دُکھ بھی بہت پہنچا ہے لیکن ہم جماعت ہونے کے ناطے میں اپنی یہ پیشکش برقرار رکھتا ہوں۔"

شیخ نورالحق نے شہزادے کی باتیں سُنیں اور پھر مسکرا کر بولے "شہزادے خُدا آپ کو اپنی امان میں رکھے اور خوش و خُرم رہیں۔ لیکن مَیں اپنے اللہ سے یہی چاہوں گا کہ وہ مجھے بادشاہوں کے دربار سے دُور ہی رکھے۔"

سلسلۂ تدریس ختم ہوا۔ علاءالدین نے اپنے بیٹے نورالحق سے دریافت کیا "بیٹا اب تمہارے کیا ارادے ہیں۔ اگر تم چاہو تو اپنے بھائی اعظم خان کی طرح شاہی ملازمت اختیار کر لو۔"

لیکن نورالحق نے جواب دیا "پدرِ بزرگوار مَیں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی اور آپ کے مریدوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

علاءالدین یہ سُن کر خوشی سے جھوم اُٹھے پھر بھی اپنے صوفی مزاج بیٹے سے کہنے لگے "کیا تم جانتے ہو کہ جس راہ کا تم انتخاب کر رہے ہو وہ کس حد تک خاردار اور تکلیفوں سے پُر ہے۔ یہ راستہ مصائب کی دلدل ہے۔ کڑکتی دھوپ کا طویل سفر ہے کہیں چھاؤں نہیں۔"

بیٹے کا ایک ہی جواب تھا "ہاں میں سب جانتا ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں۔ میں اپنے اس فیصلے کے بھیانک آثار کی حقیقت سے بھی آگاہ ہوں۔ مجھے یہی راہ پسند ہے کیونکہ میں اس فانی زندگی کے اعمال کو اتنا دیرپا نہیں سمجھتا کہ وہ آخرت میں میرے کام آ سکیں۔ میں وہ کام کرنا چاہتا ہوں جو آخر میں مجھے خُدا کے آگے سرخرو کریں۔ عُقبیٰ میں میرا ساتھ دیں۔"

باپ نے بیٹے کے خیالات اور نظریات جانے تو خوش ہو کر بولے "نورالحق..... جانِ پدر خُدا تجھ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے تجھے بامراد کرے اور نیک پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔"

چنانچہ نورالحق اب باپ کی خانقاہ میں رہنے لگے اور وہاں موجود مریدوں، درویشوں اور ارادت مندوں کی خدمت کرنے لگے۔

اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک بھائی شاہی دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز ہے۔ باپ کے ہزار ہا مرید ہیں۔ عقیدت مند ہیں۔ جان نچھاور کر ارادت مندوں کا ہجوم باپ کے ہمراہ ہوتا ہے اور مخدوم زادہ مریدوں اور درویشوں کی خدمت کو ہی معراج سمجھتے ہوتے ان کے میلے کچیلے دھو خشک کر کے تہہ کرتا ہے اور ملازموں کی طرح اُن کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ جنگل سے سخت محنت و مشقت کے بعد کلہاڑی سے لکڑیاں چیر کر لا سر پر لکڑیوں کا گٹھا لادے واپس آتا ہے تو اس حال میں کہ پسینے سے چہرہ، جسم اور کپڑے بھیگے ہوتے ہیں۔ لوگ حیرت اور افسوس سے دیکھتے۔ اکھ کا

کرسٹی
شیمپو
(منی پیک)
Christy
Shampoo
Christy
A quality product from Christy
LATHER SHAVING CREAM
Christy
5 روپے کی بچت
کرسٹی شیمپو
کرسٹی شیونگ کریم کے
ہر پیک کے ساتھ مفت حاصل کریں

کر مخدوم زادے نے تو پڑھ کر ہی گنوا دیا۔ اگر یہی سب کرنا تھا تو علم کے حصول میں کیوں اتنا عرصہ گزارا۔ اگر لکڑیاں ہی چیرنا تھیں، کپڑے دھونا تھے تو تحصیلِ علم کی کیا ضرورت تھی۔

ایک دن نور الحق حسبِ معمول جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر انہیں باندھ رہے تھے کہ بڑا بھائی جو شاہی دربار سے وابستہ تھا وہاں سے گزرا گھوڑے پر سوار بھائی نے جونہی چھوٹے بھائی کو محنت و مشقت کرتے دیکھا تو دل بھر آیا۔ افسوس کا اظہار کرتے ہوتے بولا "نور الحق.... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

اعظم خان کو دیکھ کر نور الحق نے سلام کیا اور بولے "بھائی.... خانقاہ کے لیے لکڑیاں لیے جا رہا ہوں"۔

اعظم خان تلخی سے بولا "نور الحق.... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تعلیم انہی لکڑیوں کو چیرنے کے لیے حاصل کی تھی۔ کیا تمہیں اپنی تعلیم کی اہمیت کا ذرا برابر احساس نہیں۔ غیاث الدین شہزادہ جو تمہارا ہم جماعت رہ چکا ہے اکثر مجھ سے تمہارا ذکر کرتا رہتا ہے۔ وہ تمہیں کوئی منصب عطا کرنے کا خواہش مند ہے اور ایک تم ہو کہ اپنا سارا علم ان بیکار محنت و مشقت کے کاموں میں صَرف کر رہے ہو"۔

نور الحق بولے "بھائی اعظم.... میں جانتا ہوں کہ میں شہزادے کی وساطت سے اعلیٰ عہدہ حاصل کر سکتا ہوں یا پھر آپ کی معرفت یہ مقام حاصل کر لیتا ہوں۔ لیکن مجھے اس کی خواہش ہی نہیں تو میں کیوں دل پر جبر کرکے وہ کام کروں جس میں دل راضی نہیں"۔

نور الحق کی طرف غصے میں دیکھ کر اعظم خان بولا "افسوس تم نے ہمیشہ وہی کیا جو دل نے چاہا۔ کبھی کسی کی نصیحت پر کان نہ دھرا۔ اب اپنی تمام ترخوبیوں کو غارت کیے دے رہے ہو۔ عزت خاک میں ملاتے اُلٹے سیدھے کام کر رہے ہو۔ سمجھاتا ہوں تو کہتے ہو چند روزہ عزت کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ بہر حال تم جانو تمہاری باتیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم اندھا دھند والد کے نقشِ قدم پر جس طرح چل رہے ہو اس سے تمہیں کچھ بھی نہ حاصل ہو پاتے گا۔ خدا تمہارے حال پر رحم فرماتے"۔

شیخ نور الحق اپنے کام میں مشغول رہے۔ آٹھ سال تک لگاتار خانقاہ کی ضرورت کے مطابق جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر سر پہ لاد کے لاتے رہے۔ پھر والد کی طرف سے حکم ملا کہ علاقے کی عورتیں جہاں سے پانی گھڑوں میں بھر کر لاتی ہیں وہ جگہ مسلسل پانی گرنے سے کیچڑ میں لت پت ہو چکی ہے اور عورتیں اُس سے پھسل کر گر چکی ہیں۔ سو تم وہاں پہنچ کر اُن کے گھڑے پانی سے بھر بھر کر اُس کیچڑ زدہ علاقے سے خشک جگہ تک لا کے دیتے رہو۔ فرمانبردار بیٹے نے بلا چون چرا کیے باپ کے حکم کی تعمیل میں تندہی سے اپنا کام سرانجام دینا شروع کر دیا۔ چار سال تک آپ عورتوں کے گھڑے پانی سے بھر بھر کر انہیں خشک جگہ تک لے جا کر دیتے رہے۔ لوگ آپ کو اس حالت میں دیکھتے تو ہنستے اور آپ کا مذاق اڑاتے لیکن آپ سب سے بے نیاز اپنے کام میں ہی مصروف رہے۔ ہر چیز سے لاتعلق باپ کے حکم کی تعمیل میں مگن۔

وقت گزرتا رہا۔ علاء الدین نے آپ کو اپنی زندگی میں ہی اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ جب آپ کے والد کا انتقال ہوا آپ نے یہ جگہ سنبھال لی اور والد کی طرح اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔

یہ وہ دَور تھا جب بنگال میں باطل قوتیں جڑ پکڑتی جا رہی تھیں۔ مسلمان حکمران اپنی عاقبت نااندیشیوں اور آس پاس کے ہندو راجے مہاراجوں کی سازشوں سے کمزور سے کمزور تر ہوتے گئے۔ ہندو رعایا اور اہلکار اپنی مکار فطرت کے مطابق بظاہر تو وفاداری کا دم بھرتے تھے لیکن درپردہ اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف اپنے مذموم غلیظ ارادوں کی تکمیل کے لیے ہر ممکن سازش میں مصروف رہتے۔ آپ کو ان تمام حالات سے آگاہی تھی۔ لیکن آپ اپنا فریضہ انہماک سے انجام دیتے رکھا۔ تبلیغ و اشاعت کا کام آپ پورے جوش و خروش سے انجام دے رہے تھے۔ اور آپ کے اردگرد ہندو اسلام کے خلاف کے لیے دن رات جال بُننے میں مصروف تھے۔

ہندو اپنے مہاگرو چانکیہ کی اس اُپدیش کا بڑا خیال رکھتے کہ مُنہ پر رام رام کیے جاؤ اور جہاں موقع ملے گھاؤ لگانے سے باز نہ رہو۔ یہی عیاری و مکاری ہندو ازم کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ان دنوں گنیش نامی ایک ہندو اپنے گرو چانکیہ کے قول کے مطابق خود کو مسلمانوں کے لیے اُن کا سب سے بڑا مونس ثابت کرنے میں مشغول تھا۔ جبکہ وہ درپردہ اسلامی حکومت کے خاتمہ کے لیے زبردست کوششیں کر رہا تھا۔ لہجے میں مٹھاس گھولے خوش اخلاقی کا مجسمہ گنیش اندر سے کثافت اور کراہت زدہ عیار تھا اس سے سادہ لوح مسلمان بے خبر تھے۔ وہ اُسے اپنا خیر خواہ اور ہمدرد سمجھتے۔ شاہی دربار میں گنیش نے رسائی پیدا کر لی تھی براہِ راست بادشاہ جو اب سلطان غیاث الدین بن چکا تھا اس کا تعلق تھا۔ غیاث الدین کو بھی اس پر بڑا اعتماد تھا۔

اکثر مسلمان گنیش کی باطنی غلاظت سے آگاہ ہو چکے تھے لیکن گنیش کے اثر و رسوخ کے سامنے اُن کی بات سننے والا کوئی نہ تھا چنانچہ انہوں نے شیخ نورالحق کو گنیش کے کرتوتوں سے آگاہ کیا اور کہا "بادشاہ آپ کا ہم جماعت رہ چکا ہے۔ آپ اُسے اس ہندو خطرہ سے آگاہ کریں تاکہ وہ بروقت اس کا سدِباب کر کے محفوظ رہ سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ہندو سانپ اُسے ڈس کر چلتا بنے اور مسلمانانِ بنگال کسی مصیبت سے دوچار ہو جائیں۔ آج کل ویسے بھی ہندوؤں کے تیور اور عزائم بھلے معلوم نہیں ہوتے کینہ پروری میں اپنی مثال آپ یہ قوم نجانے مسلمانوں کے خلاف کیا بغض دل میں رکھے بیٹھی ہے۔"

شیخ نورالحق نے مریدوں کی بات سنی۔ آپ کو بھی کچھ کچھ حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تو آپ نے خود جانے کی بجائے دربار سے تعلق رکھنے والے شیخ معین الدین عباسی کے صاحبزادے شیخ بدرالاسلام کو بلایا جو اپنے عہد کے نامی گرامی عالم تھے اور بادشاہ اُن سے مختلف فقہی امور میں مدد لیا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے بادشاہ سے آپ کا کسی حد تک گہرا تعلق تھا۔ شیخ عبدالاسلام کے خانقاہ پہنچنے پر آپ نے اُنہیں اپنے پاس بلایا اور پوچھنے لگے۔ یہ گنیش کیسا آدمی ہے؟ اس کے بارے میں ہمارے پاس مسلسل شک و شبہ کے اظہار والی خبریں پہنچ رہی ہیں۔ لوگوں میں عام تاثر یہ ہے کہ گنیش اندر ہی اندر اسلامی سلطنت کے خاتمے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کر رہا ہے اور اُس کا پہلا قدم اس سلسلے کی تکمیل کے لیے شاہی افراد کا اعتماد حاصل کرنا ہے تاکہ بعد میں اُنہیں اعتماد کی ہی سزا دے سکے۔

شیخ بدرالاسلام نے مسکرا کر جواب دیا "حضرت جہاں تک گنیش کی ذات کا سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں وہ اتنا خطرناک نہیں جتنا بیان کیا جاتا ہے۔ ہر شخص جو شاہی دربار سے وابستہ ہو جاتے اور عروج حاصل کرے اُس کے بہت سے حاسد اور مخالفت کرنے والے جنم لے لیتے ہیں اور آپ کو بھی یقیناً گنیش کے کسی حاسد نے اُس کے خلاف ورغلایا ہو گا۔"

نورالحق بولے "بدرالاسلام خدا کرے گنیش کے بارے میں جو کچھ ہم نے سنا ہوا افواہ ہی ہو۔ لیکن معاملہ اسلامی حکمران کی زندگی کا ہے۔ جو یقیناً اتنی قیمتی ہے اس کی جان سے ہزار ہا مسلمانانِ بنگال کی جانوں کو تحفظ ملا ہوا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں احتیاط تو برتنا ہی ہو گی۔ دلوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ گنیش کے دل میں کیا ہے نہ آپ صحیح طور پر جان سکتے ہیں نہ میں۔ اس لیے اُس کی نگرانی اشد ضروری ہے۔ لوگ یوں خواہ مخواہ کسی میں بُرائی کبھی نہیں نکالتے۔ بات ہو تو پھیلتی ہے۔"

بدرالاسلام ادب سے بولے "جیسے حضرت چاہیں۔ میں آج ہی گنیش کی نگرانی شروع کرا دیتا ہوں اور اُس کے مشاغل کی تفصیلات معلوم کرواؤں گا کہ وہ کرتا کیا پھر رہا ہے۔ اگر کوئی خرابی نظر آئی تو پھر اُس کے سدِباب کے لیے بادشاہ کو آگاہ کیا جائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔" شیخ نورالحق سے ملاقات کے بعد بدرالاسلام نے گنیش کی چوری چھپے نگرانی شروع کرا دی۔

گنیش جو عیاروں کا عیار تھا فوراً بھانپ گیا کہ آج کل اُس کے ساتھ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ چنانچہ جلد ہی اُسے اپنی نگرانی کرائے جانے کا علم ہو گیا۔ وہ شیطان اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ کی نگرانی شک و شبہ دل میں پیدا کرنے اور پھر اسے مضبوط کرنے کا موجب بنے گی۔ چنانچہ اس بات کو ختم کر دیا جائے اور مسلمانوں کے دل میں جو بال برابر شک کا مادہ پیدا ہوا ہے وہ فوراً ختم کرنا ہی ضروری ہے۔

چنانچہ جلد ہی گنیش سرکاری عالم بدرالاسلام کی خدمت میں باادب ہو کر پہنچا اور درخواست کرنے لگا کہ میری دلی اچھا ہے کہ آپ جیسے مہان شخص کے ساتھ کچھ لمحے گزارا کروں۔ آپ مجھ پر مہربانی کر کے میرے لیے تھوڑا سمے نکالا کریں۔ شیخ بدرالاسلام نے پوچھا گنیش تم ہندو ہو تمہارا مذہب میرے مذہب سے بالکل متصادم ہے۔ میری زندگی اپنے مذہب کے اصولوں پر گزرتی ہے۔ جب تمہیں میرے مذہب سے ہی لگاؤ نہیں پھر اُن اصولوں کا مطالعہ کر کے کیا حاصل کرو گے۔"

گنیش عیاری سے بظاہر عاجزی سے بولا "شریمان جی میں وہ مکتی چاہتا ہوں جو اسلام کے طفیل حاصل ہوتی ہے۔ میں بڑے عرصے سے اسلام کو پرکھ رہا ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام مجھے اپنے مذہب سے کہیں زیادہ اچھا لگنے لگا ہے۔ اسلامی تعلیمات نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ من کہتا ہے کوئی دھرم سچا ہے تو صرف اسلام۔ اب اگر آپ میری رہنمائی کریں تو میں اسلام سے مکمل آگہی حاصل کر کے اسے قبول کر لوں۔"

سادہ لوح عالم گنیش کی پُرعیار گفتگو سمجھ ہی نہ سکا اور خوشی سے پھولے نہ سمایا کہ ایک اثر و رسوخ رکھنے والا ہندو اپنے مذہب سے تائب ہو کر اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ اس سے بڑی نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ گنیش بھی میٹھی میٹھی باتیں کر کے آپ کا دل موہتا رہا چنانچہ بدرالاسلام نے گنیش کی نگرانی ترک کر کے اس کی تعلیم پر خصوصاً توجہ دینا شروع کر دی۔

ایک دن گنیش بدرالاسلام کی محبت میں بیٹھا اسلام اور اسلامی تعلیمات پر مختلف سوالات کر رہا تھا اور بدرالاسلام اُس کی ہر ممکن تشفی کی خاطر آسان الفاظ میں اس کے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔ سوال پوچھتے پوچھتے اُس نے کہنا شروع کیا۔ "میں بہت دنوں سے ایک سوال پوچھنے کی اچھا کر رہا ہوں لیکن جب بھی آپ کے پاس آن بیٹھتا ہوں میرے ذہن سے وہ نکل جاتا ہے۔ آج یاد آیا تو سوچا آپ سے دریافت کر لوں۔"

حضرت شیخ بدرالاسلام بولے "ضرور اگر تمہارے ذہن میں کوئی اُلجھن ہو تو اُسے سلجھانا میرا کام ہے۔ تم شوق سے پوچھ لیا کرو۔"

یہ سن کر گنیش نے مکارانہ انداز میں پوچھا "شریمان اسلامی حکومت کس طرح کی ہوتی ہے؟" شیخ بدرالاسلام نے جواب دیا "اسلام میں حکمرانی کا اول کوئی تصور ہی نہیں۔ اسلامی علاقے کا نگران بادشاہ یا سلطان نہیں کہلاتا۔ بلکہ اُسے مسلمانوں کا امیر کہا جاتا ہے جو اُن کا خادم ہوتا ہے۔ شاہی محل نہیں راعی اور رعایا میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ارکانِ اسلام پر عمل کروانے کے لیے اسلامی قوانین کا نفاذ کیا جاتا ہے۔"

یہ سن کر گنیش بولا "اگر ایسی بات ہے تو پھر ہمارا سلطان غیاث الدین کیوں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتا۔"

بدرالاسلام نے جواب دیا "جہاں تک اس خطے میں اسلام کے نفاذ کا سوال ہے تو اس کے نافذ نہ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمان کی اقلیت۔ اقلیت کے قوانین اکثریت پر مسلط کرنا اسلام کے منافی ہے۔ اس کے لیے ہمیں پہلے یہاں اسلام کی تبلیغ کرنا پڑے گی تب جا کر یہاں اسلام نافذ کر سکتا ہے۔"

گنیش بولا "شریمان آپ کیسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہاں کا سلطان مسلمان ہے وہ زور بازو سے یہاں اسلام نافذ کر سکتا ہے۔"

بدرالاسلام بولے "ہرگز نہیں ہمارا اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اسلامی تعلیمات اور اسلام کا پیغام بزور شمشیر پھیلائیں۔"

گنیش عیاری سے بولا "شریمان جی یہ میں آپ کو کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلامی حکمران قوت رکھتے ہوتے بھی اسلام کو عروج نہ دے سکے۔ اگر آپ مدد کریں اور میں اسلام میں داخل ہو گیا تو پھر آپ دیکھیں گے کہ میں اسلام کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔"

شیخ نے دلچسپی سے گنیش کی باتیں سن کر اس پر اور زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ ساتھ ہی وہ شیخ نورالحق کو بھی اُس کے بارے میں بتاتے رہے آج کل گنیش کی سوچ کیا ہے۔

اب گنیش نے چند دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ باقاعدہ شیخ بدرالاسلام کی صحبت میں رہنا شروع کر دیا اور یوں غور سے وعظ سنتا گویا اُس دل پر اثر کر رہا ہے۔ اُدھر جب بادشاہ نے بھی گنیش کو شیخ کی صحبت میں دیکھا تو اُس پر اور زیادہ مہربان ہو گیا۔

اور پھر ایک دن سلطان غیاث الدین کے مرنے کی خبر نے ہر طرف تہلکہ مچا دیا۔ لوگ یقین کرنے کو تیار نہ تھے کہ ایک بھلا چنگا شخص کیوں اور کیسے اس دُنیا ... چ کر سکتا ہے۔ شیخ بدرالاسلام نے خبر کی تصدیق کے لیے محل جانا ضروری خیال کیا۔ محل کے دروازے پر کھڑے دربانوں نے آپ کو دیکھ راستے میں روک لیا اور پوچھنے لگے "شریمان جی کدھر کو منہ اٹھائے بلا روک ٹوک گھسے جا رہے ہیں۔"

یہ سن کر شیخ جھنجلا گئے اور بولے "تمہیں شاید علم نہیں کہ میں جب چاہوں محل میں حاضری دے سکتا ہوں اور پھر تم کون ہو مجھے روکنے والے۔ دربان کہاں گئے؟"

دونوں دربان یہ سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور بولے "شریمان جی آپ بھی بہت بھولے ہیں۔ تب میں اور اب میں بڑا فرق ہے۔ پہلے مسلم سلطان کا راج ہوتا تھا جس کے آپ سرکاری عالم تھے۔ لیکن اب یہاں گنیش جی کا راج ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گنیش بھی شور کی آواز سن کر محل سے باہر آ گیا اور آپ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر بے رُخی سے آپ کو محل میں محل کی فضا اب بالکل ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ اسے بدرالاسلام نے محسوس تو کیا لیکن گنیش سے کوئی سوال نہ کیا۔ محل میں بیٹھتے ہی آپ نے گنیش سے کہا "آخر سلطان کی موت کا کیا سبب ہے؟"

گنیش مکاری سے بولا "شریمان جی جیون موت تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ پرنتو میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ میرے ساتھ بیٹھے دسترخوان کر رہے تھے کہ اچانک ہی چل بسے۔"

شیخ بدرالاسلام نے گنیش کے لہجے پر غور کیا پھر کچھ توقف کے بعد بولے "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

گنیش نے جواب دیا "شریمان جی سلطان کے انتقال کے بعد اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں سلطنت میں افراتفری نہ پھیل جائے۔ چنانچہ اس

بچنے کی خاطر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی عنان حکومت سنبھال لوں۔"

شیخ بدرالاسلام نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "اور تمہارا وہ مسلمان ہونے کا ارادہ؟ اُس کا کیا بنا؟" یہ سُن کر گنیش کے حلق سے قہقہوں کا طوفان اُمڈ پڑا۔ اور رعونت سے بولا "حضرت کیسی باتیں کر رہے ہیں میں اور مسلمان ہو جاؤں۔ ملیچھ ہو جاؤں۔ بھلا ایسا سوچا کیونکر آپ نے؟"

یہ سُن کر بدرالاسلام کو شیخ نورالحق کے خدشات یاد آنے لگے جو انہوں نے اس شخص کے بارے میں کہے تھے۔ انہیں افسوس ہونے لگا کہ کاش وہ اس بدبخت ہندو کو پہلے سمجھ لیتے لیکن اب پچھتاوں کے سوا اور کیا رکھا تھا سو دُکھ سے سر جھکائے باہر نکل آئے۔

شیخ نورالحق کو بھی جب ان باتوں کا علم ہوا تو انہوں نے سخت دُکھ کا اظہار کیا۔

گنیش نے اب کُھل کر سامنے آنا شروع کر دیا۔ اُس نے سب سے پہلے شیخ بدرالاسلام کو جنہیں وہ گرو کہا کرتا تھا ناکردہ گناہوں کی پاداش میں قید کر ڈالا۔ اور پھر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ مسلمانوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا گیا۔ غرض مکار ہندو نے اپنی باطنی خباثت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اُس نے اس بات کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ کہ میں بھگوان کی مرضی سے اپنی اس سرزمین ہند کو ناپاک اور ملیچھ مسلمانوں سے پاک کر کے ہی چھوڑوں گا۔

جب گنیش کا ظلم و ستم حد سے زیادہ بڑھ گیا تو نورالحق کو اس کے سدباب کے لیے جونپور کے مسلمان حکمران سلطان ابراہیم شرقی کا خیال آیا جو اُس زمانے میں خاصا طاقتور اور رعب و دبدبے والا حکمران تھا۔ اُس پاس کی ریاستیں اُس سے خوفزدہ تھیں۔ ایسے میں نورالحق نے سوچا طاقتور ہی طاقت کی زبان سمجھتا ہے اور ابراہیم شرقی اتنا طاقتور تو ہے ہی کہ گنیش اُس کے ڈر سے اپنی غلیظ روش ترک کر دے۔ چنانچہ آپ نے فوراً اُسے ایک خط لکھا جس میں کہا گیا۔

"سلطان ابراہیم خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ یہ بات میں تمہارے علم میں لا رہا ہوں کہ مسلمان بادشاہوں کا فرض ہوتا ہے کہ اگر کہیں اسلام کے نام لیواؤں پر کہیں ظلم ہو رہا ہو تو وہ اُسے اپنی طاقت اور اثر و رسوخ سے بند کروائیں۔ یہاں کے راجہ گنیش نے جو آج سے پہلے محض ایک درباری تھا دغا و فریبی سے کام لے کر مسلمان بادشاہ کو زہر دے کر اُسے ہلاک کر دیا ہے اور اب اسلام پسند قوتوں کے ساتھ ناروا سلوک کیے ہوئے ہے۔ ایسے میں یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم مسلمانوں کو اس مکار شخص کے ظلم و ستم اور خواہ مخواہ کی اشتعال انگیزیوں سے نجات دلاؤ اور مجھے امید ہے کہ اس نیک کام میں اللہ کی مدد تمہارے ساتھ شامل حال رہے گی۔"

سلطان ابراہیم کو خط ملا تو اُس نے درباریوں سے صلاح و مشورہ کیا اور سبھی نے اُسے اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ اگر وہ اسلام کی خاطر اس مہم میں حصہ لے اور وہاں کے علماء کو اُس ناپاک کافر سے نجات دلاتے تو یہ اُس کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

چنانچہ سلطان ابراہیم شرقی نے فوراً لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ اُس کا لشکر سامان حرب سے لیس علاقے کا طاقتور ترین لشکر تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اس نے کوچ کیا سبھی نے اس شخص کے انجام پر افسوس کیا جس کی سرکوبی کے لیے یہ فوج جا رہی تھی۔

اُدھر راجہ گنیش کو بھی اس امر کی اطلاع مل چکی تھی۔ اُسے اب صاف نظر آ رہا تھا کہ ظلم و جبر اور مکر و فریبی کا یہ راج پاٹ جو وہ سنبھالے ہوئے ہے وہ زوال کا مہمان ہے۔ اس پریشانی کے عالم میں اُس نے اپنے دربار کے امراء کو طلب کیا اور اُن کے سامنے ابراہیم شرقی کے لشکر کا حوالہ دے کر کہا کہ بربادی ہمارا مقدر بن چکی ہے جو لمحہ بہ لمحہ ہمارے نزدیک آتی جا رہی ہے بچنے کی کوئی امید نہیں۔" یہ سُن کر سینا پتی بولا "مہاراج آپ اتنی مایوسی اچھی نہیں۔ آخر ہمارے پاس بھی سینا ہے۔ ہم کیوں چپ چاپ اُس مسلمان راج کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ یودھ کریں گے۔ بھگوان نے چاہا تو جیت ہماری ہی ہوگی۔"

لیکن راجے نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ابراہیم کی فوج سے مقابلہ کرنا گویا جان بوجھ کر خود کو آگ میں ڈالنا ہے۔ یہ تو آتم ہتیا ہی کہلائے گی جس کا میں خواہش مند نہیں۔ کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ وہ مسلمان راجہ واپس چلا جائے اور ہمارا راج پاٹ اُس کے ہاتھوں محفوظ رہے۔"

گنیش کی بیوی جو دیر سے سب کی باتیں خاموشی سے سُن رہی تھی، کہنے لگی مہاراج میرے ذہن میں ایک تجویز ہے جو اس بیرونی خطرے کو

روکنے میں صدفی صد کامیاب ہو سکتی ہے۔" گنیش نے حیرت سے بیوی کو دیکھا اور بے قراری سے بولا" پھر جلدی سے بتاؤ چپ کیوں ہو گئی ہو۔ میری
حالت دیکھ ہی رہی ہو۔ پل پل قیمتی ہے۔"

رانی نے پتی کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا" مہاراج میرے ذہن میں ایک ایسی ہستی ہے جو اس خطرہ کو ٹال سکتی ہے اور وہ ہیں شیخ نورالحق جنہیں
لوگ نور قطب عالم کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔" راجہ جو کسی قابلِ قبول ترکیب کی امید رکھے بیٹھا تھا یہ سن کر اس کا چہرہ اتر گیا اور کہنے لگا" بھولی عورت
جس شخص نے اس خطرہ کو پیدا کیا ہے اسی سے جا کر کہیں کہ اسے مار دے۔ ابراہیم کو اس حملے کی دعوت دینے والے شیخ نورالحق ہی تھے۔ اب بھلا وہ کیسے
مانیں گے کہ یہ خطرہ ٹل جائے۔" اس کی بیوی بولی" مہاراج مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے بہرحال اتنا یقین ہے کہ اگر اس خطرہ کو روکا جا سکتا ہے
تو سوائے نورالحق کے ذریعے ورنہ تباہی و بربادی جسے آپ نزدیک سے نزدیک تر ہوتا دیکھ رہے ہیں وہ واقعی آگے بڑھ کر ہمیں اپنی لپیٹ
میں لے لے گی۔"

راجہ دیر تک رانی کی بات سنتا رہا پھر آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ اور دوسرے دن وہ شیخ نورالحق کی خدمت میں سر جھکائے
جا حاضر ہوا اور آپ کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا" حضرت مجھے معاف کر دیں۔ میں وہی کروں گا جو آپ چاہیں گے۔"

شیخ نورالحق نے حیرت سے اسے دیکھا جو پاؤں پکڑے آپ کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔ گنیش نے جب یہ دیکھا کہ آپ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تو
اس نے کہنا شروع کیا" حضرت! ابراہیم کے اس حملے سے رعایا کا خون خرابہ ہوگا۔ تباہی و بربادی علاقے کا مقدر بن جائے گی۔ میں آپ کو یقین د
ہوں کہ آپ جو کہیں گے میں اس پر ہی عمل کروں گا۔"

آپ نے طیش کے عالم میں اس جھوٹے مکار اور سفاک راجہ کو دیکھا اور کہا" بدبخت! ہمیں تیری کسی بات کا یقین نہیں۔ تو وہی انسان ہے
جس نے دھوکے اور مکر فریبی سے پہلے مسلمان راجہ کو قتل کیا اور پھر خود بادشاہ بن کر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔"

راجہ نے اپنا سر آپ کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا" حضرت میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ بس آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں اسلام قبول کر
آپ کا یقین بڑھانا چاہتا ہوں۔" شیخ نورالحق نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ آپ نے اس کی بات پر یقین نہ کیا۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ
جو مکر و فریب کے پتلے ہوتے ہیں ہر بار دغا دیتے اور سانپ کی طرح ڈسنے والے بچھو خصلت قوم کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان پر اعتبار کرنا
خود کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ آپ نے اس کی آزمائش کی خاطر کہ یہ کتنا اپنے قول میں سچا ہے اسے کہا" نہیں ہم اب کی مرتبہ تمہیں بادشاہ بنتے
نہیں دینا چاہتے۔ ہاں اگر تم مسلمان ہونا چاہتے ہو تو بڑی خوشی سے ہو سکتے ہو۔ بادشاہت البتہ تمہیں نہ ملے گی۔ اگر تم چاہو تو تمہارا بیٹا جو بالغ
اسلام کے حلقے میں لا کر بادشاہ بنایا جا سکتا ہے۔"

راجہ جو کسی صورت بھی ابراہیم کے خوف سے نجات پانا چاہتا تھا جھٹ اس کے لیے تیار ہو گیا اور فوراً بیٹے کو لے کر آپ کے پاس حاضر
اسے مسلمان کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

آپ نے اس کے بیٹے کو قریب بلایا اور پوچھا" بیٹا کیا نام تمہارا؟"

"جدو" گنیش کا بیٹا بولا جو تقریباً بیس سال کا نوجوان تھا۔

پھر آپ نے اس سے پوچھا کیوں بیٹا کیا تم مسلمان ہونا چاہتے ہو؟ اگر مسلمان ہونا چاہتے ہو تو کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم پر کسی
ڈالا ہو اور تم بغیر اپنی رضا و منشا کے مسلمان ہو رہے ہو۔"

جدو یہ سن کر بولا" حضرت ایسی ہرگز کوئی بات نہیں میں اپنی خوشی سے مسلمان ہو رہا ہوں۔ مجھ پر کسی کا کوئی دباؤ نہیں۔ یہ میرا ذاتی فیصلہ
چنانچہ شیخ نورالحق نے مطمئن ہو کر اسے مسلمان کیا۔ کلمہ طیبہ پڑھا لے کے بعد آپ نے ایک پان چبایا اور اس کا باقی حصہ جدو کو کھلایا جو ا
عقیدت سے لے کر منہ میں رکھا۔ پھر آپ نے اعلان کیا" آج سے جدو جس کا اسلامی نام جلال الدین رکھا گیا ہے بنگال کے اس خطے کا نیا
اور یہاں شریعت محمدیہ کے نفاذ کا ذمہ دار آج سے یہاں اسلامی قوانین رائج ہوں گے۔"

پھر آپ اپنے مریدوں کے ہمراہ جلال الدین کو لے کر محل کی طرف گئے اور [illegible] دربار میں لے جا کر تخت پر بٹھایا۔ راجہ گنیش بھی و

کے سامنے اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔
ادھر ابراہیم شرقی بھی منزلیں طے کرتا بنگال کے نزدیک آن پہنچا۔ اور شہر کے باہر خیمہ زن ہو کر بیٹھ گیا۔ شیخ نور الحق نے مریدوں سمیت لشکر میں
جا کر ابراہیم سے ملاقات کی اور اُسے بتایا کہ وہ کیا حالات تھے جن میں انہوں نے اُسے خط لکھا تھا اور اب جبکہ راجہ تائب ہو چکا ہے بلکہ تخت
سے ہی دستبردار ہو کر بیٹے کو مسلمان کرنے کے بعد اس کے حوالے کر چکا ہے لہٰذا اب جنگ کرنا واجب نہیں۔ بھلا ایک مسلمان حکومت اور حاکم کے
خلاف جنگ کب جہاد کہلا سکتی ہے۔"
اگرچہ ابراہیم شرقی نے اس بات کا بہت بُرا منایا اور آپ پر واضح کیا کہ ہندو کبھی بھی قابلِ اعتبار قوم نہیں رہی۔ یہ وہ بدخصلت قوم ہے جس
کی فطرت میں ڈنک مارنا لازماً شامل ہے۔ وقتی طور پر تو بے شک راجہ گنیش نے حالات دیکھتے ہوئے آپ سے صُلح کر لی ہے اور آپ کی شرائطِ مان
لی ہیں۔ لیکن اتنا میں آپ کو کہے دیتا ہوں کہ جیسے ہی اُسے کسی کا ڈر نہ رہا وہ دوبارہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جائے گا۔ ابراہیم
بہت دیر تک آپ کو اس بات پر آمادہ کرتا رہا کہ آپ اُسے جنگ کرنے کی اجازت دیں۔ کیونکہ گنیش بدعہد اور مسلم آزار راجہ ہے۔ کسی بھی وقت وہ
مکر سکتا ہے۔ لیکن آپ نے واضح الفاظ میں اُسے صاف کہہ دیا۔
"اب راجہ کی حکومت تو ہے نہیں جو ہم گنیش کے خلاف کارروائی کے لیے آپ سے مدد مانگیں ابراہیم شرقی... بے شک تیرے رعب و دبدبے
اور تیری سپاہ کا ہی خوف تھا جس نے اس بدعہد انسان کو سیدھا راستہ دکھایا۔ لیکن اب یہاں کا راجہ ایک مسلمان ہے۔ مجھے تم ہی بتاؤ بھلا میں اب کیسے
ایک مسلمان کو مسلمان کے ساتھ لڑنے کی اجازت دوں۔ اور یہ لڑائی کیسے جہاد کہلا سکتی ہے۔ جہاد کافروں سے کیا جاتا ہے نہ کہ مسلمانوں سے۔"
سلطان ابراہیم شرقی آپ کے دلائل سے لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ مگر اُس کے چہرے کے تاثرات صاف چغلی کھا رہے تھے کہ وہ آپ کے
دلائل سے مطمئن نہیں۔ چنانچہ وہ اُٹھتے ہوئے بولا "حضرت جیسے آپ کی مرضی میں چلا تو جاتا ہوں مگر اتنا بتانا ضرور چاہوں گا کہ آپ ایک مرتبہ جس سانپ
سے خود کو ڈسوا چکے ہیں دوبارہ اُسی کو دودھ پلا رہے ہیں اور یہ کوئی ہوشمندی کی علامت نہیں۔ ہندو قوم مگرمچھ کی مکار فطرت کی حامل ہے اور
اس کا اندازہ جلد ہی ہو جائے گا آپ کو۔"
چنانچہ سلطان نے واپسی کا اعلان کیا اور جلد ہی شہر کا محاصرہ اٹھا کر کوچ کر گیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان اس دُنیا سے ہی رُخصت ہو گیا۔
اُدھر گنیش کی طرف سے بھی امن تھا۔ اُس کا نو مُسلم بیٹا جلال الدین، شیخ نور الحق کی ہدایات کے مطابق حکومت چلا رہا تھا۔ شیخ نور قطب عالم
اپنے کنبے میں شاد مان تھے۔ آپ کو جب سلطان ابراہیم کی وفات کا علم ہوا تو آپ کو اس کا سخت رنج ہوا۔
شیخ نور الحق ہر روز نو مُسلم راجہ کے پاس جایا کرتے تھے تاکہ اُسے آہستہ آہستہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں آگاہ کرتے رہیں اور اسلامی طرز
سے اُس کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا رہے۔
چنانچہ اُس دن جب آپ دربار گئے تو وہاں خلافِ معمول گنیش آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ نے اُس سے جلال الدین کے بارے میں پوچھا
تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا کہ میرا بیٹا بیمار ہے اور طبیب نے اُسے آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔ آپ نے اگر اُس سے ضروری ہی ملنا ہے تو ہفتے کے
بعد آ کر مل لیجئے گا۔
گنیش کی یہ ٹال مٹول سُن کر آپ کا ماتھا ٹھنکا اور آپ نے ذرا سختی سے کہا "گنیش میں جلال الدین کا استاد ہوں۔ بیمار ہے تو مزاج پُرسی کے
لیے بھی جا سکتا ہوں۔ تم کیوں مجھے روکنا چاہتے ہو۔ اور یہ معاملہ کیا ہے؟"
گنیش نے جو آپ کا سخت لہجہ سُنا تو وہ بھی درشتی میں بولا "حضرت جلال الدین کا خیال آپ دل سے نکال ہی دیں تو بہتر ہے۔ رہا مزاج پُرسی
کا بہانہ تو شریمان جی وہ میری اولاد ہے جسے چاہوں اُس سے ملنے دوں جسے چاہوں روک دوں۔"
اب تو شیخ نور الحق کو یقین ہونے لگا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مرتبہ دُرازی سے کہا "گنیش... جلال الدین بے شک تمہارا بیٹا
ہے مگر راجہ بھی ہے اور میرا اس وقت اُس سے ملنا ضروری ہے کیونکہ آج اُس کے پاس ایک مقدمہ فیصلے کے لیے آیا ہوا ہے اور میں جانتا
ہوں چونکہ ملزمان کا تعلق اسلام سے ہے لہٰذا انہیں جلال الدین اسلام کی مقرر کی ہوئی سزا ہی دے گا۔"

یہ سن کر گویا گنیش بھڑک اٹھا اور غصے میں کہنے لگا "شریمان جی یہ کیا اسلام اسلام لگا رکھی ہے۔ میرے جدو کو اسلام سے کیا تعلق۔ وہ ہندو راجہ ہے جو مناسب سمجھے گا سزا دے دے گا۔"

"ہندو راجہ؟" شیخ نورالحق نے حیرانگی سے زیرلب کہا اور سوالیہ انداز میں گنیش کو دیکھنے لگے۔

گنیش اپنے مکروہ چہرے پر مکاری کا نقاب چڑھاتے بولا "ہاں شریمان جی وہ میری مجبوری تھی جو میں نے اپنے جدو کو جلال الدین بننے دیا لیکن اب میرے لیے کوئی مجبوری نہیں۔ اور آپ بھی یہ سن لیں کہ جتنا جلد ہو سکے یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ باقی مسلمان علماء سے تو خیر میں نپٹ لوں گا لیکن آپ کو اس لیے چھوڑ رہا ہوں کیونکہ آپ نے بھی ابراہیم شرقی سے میری جان بچائی تھی اب میں اتنا احسان فراموش نہیں ہوں کہ محسن کی قدر نہ کروں۔ آپ بھی میرے اس رویے کی قدر کریں اور جتنا جلد ہو سکتا ہے یہ علاقہ چھوڑ دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے ارادے سے بھٹک جاؤں اور آپ کی شان میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں۔"

شیخ نورالحق نے حیرت سے اس دشمن عہد و پیمان کو دیکھا انہیں رہ رہ کر سلطان ابراہیم کا کہا یاد آرہا تھا کہ "حضرت یہ ہندو انتہائی مکار مگرمچھ کی فطرت رکھنے والی قوم ہے۔ اور اس کا اندازہ جلد ہی آپ کو ہو جائے گا۔" چنانچہ آپ مایوس شکستہ دل ہو کر واپس پلٹ آئے۔

ادھر گنیش کے بیٹے جلال الدین نے جدو بننے سے انکار کر دیا۔ گنیش نے ہر طریقے سے اس پر دباؤ ڈال کے دیکھا مگر وہ رام راج کی بجائے شریعت محمدیہ کے نفاذ کا اٹل ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ گنیش نے جب یہ دیکھا کہ بیٹا کسی صورت بھی رام نہیں ہو رہا اور سب کیے کرائے پر پانی پھرنا چاہتا ہے تو اس نے دربار میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اسے گرفتار کرا لیا اور قید خانے میں بند کروانے کے بعد خود راجہ بن بیٹھا۔

گنیش نے راجہ بنتے ہی سب سے پہلے یہ فرمان جاری کرا یا کہ علاقے کے سارے مسلمان یہ جگہ چھوڑ کر کہیں بھی جا بسیں لیکن گنیش مہاراج کے راج میں نہ رہیں۔ اور اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو پھر انہیں اپنے قتل عام کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

گنیش کے اس اعلان نے تمام مسلمانوں میں ہلچل مچا دی۔ سب اکٹھے ہو کر شیخ نورالحق کے پاس پہنچے اور کہنے لگے "حضرت یہ کیا ہو گیا گنیش نے تو آپ کو پوری یقین دہانی کرائی تھی۔ کیا آپ بھی اس ہندو بچے سے دھوکہ کھا گئے۔ جب آپ جیسے صاحب کامل بزرگ بھی دھوکہ کھانے لگیں تو پھر اب ہمارا کیا بنے گا۔"

شیخ نورالحق انہیں کیا جواب دیتے۔ دکھ و غم سے ان کی باتیں سنتے۔ سوالوں پر خاموشی سادھ لیتے۔

شیخ نورالحق کا ایک بیٹا بھی تھا انور۔ جو بہت نرم دل اور رحمدل انسان تھا۔ اس نے جب یہ عالم دیکھا تو باپ کے پیچھے پڑ گیا اور کہنے لگا "بابا۔۔ آپ کو کچھ نہ کچھ مسلمانوں کے لیے کرنا ہی پڑے گا۔"

شیخ نورالحق پہلے ہی سے برہم تھے۔ اوپر سے جب بیٹے نے بھی سفارش کی تو جھنجلا کر بولے "میں کیا کر سکتا ہوں۔"

انور نے دھیمے پُر درد لہجے میں کہا "بابا آپ کو اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر مسلمانوں کے ساتھ کوئی ظلم و ستم ہوا تو اس کے ذمہ دار آپ ہی ہوں گے۔ آپ کو بہت عرصہ قبل ہی سلطان ابراہیم نے اس بات سے آگاہ کر دیا تھا لیکن اس وقت آپ نے گنیش جیسے سانپ پر اندھا دھند اعتماد کر کے بڑی فاش غلطی کی جس کی سزا آج نہتے مسلمان بھگت رہے ہیں۔"

بیٹے کی یہ صاف صاف کھری باتیں سن کر شیخ نورالحق جو پہلے ہی پریشان تھے ایک دم غصے میں آ گئے اور بولے۔

"گنیش کا ظلم و ستم مسلمانوں پر اس وقت تک بند نہیں ہو سکتا جب تک مظلوم مسلمانوں میں تمہارا خون بھی شامل نہ ہو جائے۔"

انور کو اب اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ ادھر شیخ نورالحق بھی بات منہ سے نکال کر سخت پریشان تھے اور کچھ کہہ بیٹھے تھے اس کا سخت احساس پشیمانی تھا مگر بات منہ سے نکل چکی تھی نکل گئی۔

اس واقعہ کے چند دن بعد گنیش کے ہندو اہلکار دندناتے ہوئے خانقاہ میں آ گھسے۔ اور آپ کے بیٹوں کو گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ گنیش نے نورالحق کے صاحبزادوں کو دیکھ کر کہا "دیکھو لڑکو جو کچھ ہم تم سے پوچھیں صاف صاف جواب دینا۔ ہماری اطلاع کے مطابق تمہارے والد کے پاس منوں کے حساب سے سونا جمع ہے۔ اب تم ہمیں اس جگہ سے آگاہ کرو جہاں یہ مال تمہارے باپ نے دبا رکھا ہے۔ دونوں لڑکوں نے لاعلمی کا

مظاہرہ کیا۔ جب گنیش کسی صورت میں بھی آپ کے دونوں بیٹوں سے یہ بات نہ اُگلوا سکا جو حقیقت بھی نہ تھی۔ چنانچہ طیش کے عالم میں اُس نے اپنے اہلکاروں سے کہا کہ "انہیں قید خانے میں لے جا کر تشدد کے ذریعے پوچھو تبھی یہ لوگ سیدھی بات اُگلیں گے۔ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکالا جا سکے تو پھر انگلیوں کو ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اور پھر محل کے قید خانے میں شیخ نور الحق کے دونوں صاحبزادوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ سخت اذیتیں دینے کے باوجود قید خانے کے ملازم دونوں سے بالکل ہی وہ بات نہ اُگلوا سکے جس کا گنیش خواہش مند تھا۔ بالآخر سپاہیوں نے دونوں سے راز اُگلوانے کا ایک اور طریقہ سوچا۔ انہوں نے آپ کے بڑے صاحبزادے انور کو کوٹھری سے باہر نکال کر زمین پر لٹا دیا اور اُس کی گردن پر تلوار کی نوک چبھوتے ہوئے بولے "لڑکے جوں جوں تم خزانے سے لاعلمی کا اظہار کرتے جاؤ گے یہ تلوار کی نوک تمہاری گردن میں پیوست ہوتی جائے گی۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ آیا تم خزانہ محفوظ رکھنے ہو یا پھر اپنی جان۔ لیکن انور تو بھلا خزانے کی بابت کیا علم ہو سکتا تھا جس کا وجود ہی سرے سے نہ تھا۔ چنانچہ وہ اذیت پسند ظالم سپاہی تلوار کی نوک لمحہ بہ لمحہ گردن میں اُتارتا چلا گیا لیکن آپ کے صاحبزادے سے خزانے کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ کر سکا۔ انجام کار آپ کے بیٹے کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ایک سپاہی نے ہنستے ہوئے ڈھلکی گردن کو تلوار کے ایک وار سے تن سے جدا کر دیا۔ پھر انہوں نے سوچا ایک کو تو شہید کر چکے ہیں اب گنیش مہاراج سے دریافت کرنے کے بعد ہی دوسرے کے بارے میں قدم اٹھائیں گے۔

شیخ نور الحق خانقاہ میں بیٹھے بے حد ملول اور رنجیدہ خاطر تھے۔ مریدوں سے آپ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی مگر وہ بیچارے بھی کیا کر سکتے تھے۔ بعض نے کہا "حضرت آپ راجہ کے دربار میں جا کر اپنے صاحبزادوں کے بارے میں پوچھ گچھ تو حاصل کریں کہ آخر اُن کا بنا کیا؟"

لیکن آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں اپنا مقدمہ احکم الحاکمین کی عدالت میں درج کرا چکا ہوں اور اب حتمی فیصلہ کا اُمیدوار ہوں۔"

ادھر قید خانے میں شہزادہ جلال الدین جو اب محض قیدی بن کے رہ چکا تھا سخت پریشانی کے عالم میں پل پل کی خبریں پا رہا تھا۔ اُس کے ہمدرد نگرانی پر متعین سپاہی اُسے باہر کی ہر خبر لا کر دیتے رہتے تھے۔ جلال الدین نے جب یہ سنا کہ شیخ نور الحق کے صاحبزادوں کو گرفتار کر کے تشدد کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا ہے تو وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ اب اُس نے دل میں ارادہ کر لیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف خود ہی کوئی قدم اٹھائے اور اپنے بدعہد ظالم باپ کو اُس کے کرتوتوں کا پھل اُسے پہنچائے۔

چنانچہ اُس نے نگرانی پر متعین اپنے ایک سپاہی کو اعتماد میں لیا۔ جو جلال الدین سے بے پناہ محبت رکھتا تھا۔ جلال الدین نے پورا منصوبہ اُسے سمجھایا پھر کہا کہ جلد از جلد اُس کے پتا کے پاس جا کر یہ کہو کہ جلال الدین اپنے سابقہ رویے پر نادم ہے اور اس کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔

گنیش کو جب بیٹے کے ذہنی انقلاب کی خبر پہنچی تو خوشی کے مارے دوڑتا چلا آیا اور قید خانے سے بیٹے کو نکال کر گلے لگا لیا اور بولا "بیٹے جد میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تجھے رام کا خیال آئے گا اور تو اپنے ملیچھ نام سے نفرت کرنے لگے گا۔ بھگوان کا شکر ہے کہ اُس نے جلد ہی تمہاری آنکھیں کھول دی کہ تم سوچ سکو کہ اسلام ہمارے ہندو ازم کے لیے کس قدر خطرناک ہے۔"

اس کے بعد گنیش نے شاندار طریقے سے جلال الدین کو دربار میں جا کر بٹھایا۔ جہاں پہلے ہی سونے سے بنی سات گائیں تیار کھڑی تھیں گنیش نے جلال الدین سے کہا "بیٹا یہ اُس نیچ کام کا کفارہ ہے جو میں نے تجھے مسلمان بنا کر کیا تھا۔ اب تم ان کے اندر سے ہو کر باہر نکلو تاکہ ان کا سونا بھگوان کی راہ میں بانٹا جا سکے۔"

جلال الدین نے خاموشی سے وہ سب کیا جو اُس کے والد نے کہا۔ جیسے ہی وہ آخری گائے سے باہر نکلا "دربار نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا گنیش کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر بیٹے کو خوشی سے دبوچ لیا اور پھر اُسے لے کر دسترخوان پر جا پہنچا۔ لیکن جلال الدین نے کھانے سے انکار کر دیا۔ راجہ کو تنہا ہی کھانا کھانا پڑا۔ ذرا ہی دیر بعد محل سے چیخ و پکار کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ ایک کہرام برپا ہو گیا۔ راجہ گنیش اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اُس کے ناپاک وجود سے دنیا پاک ہو چکی تھی اور پھر فوراً ہی اُس بدعہد راجہ کے مسلمان بیٹے جلال الدین نے حکومت سنبھال لی۔

جلال الدین نے فوراً اپنے باپ کے احکامات منسوخ کیے اور شیخ نور الحق کے مخدوم زادے کو رہا کر دیا کہ عزت و احترام کے ساتھ شیخ نور الحق کی خانقاہ تک خود لے کر گیا اور آپ سے سخت افسوس اور دکھ کا اظہار کرتا رہا کہ انہیں ان مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔
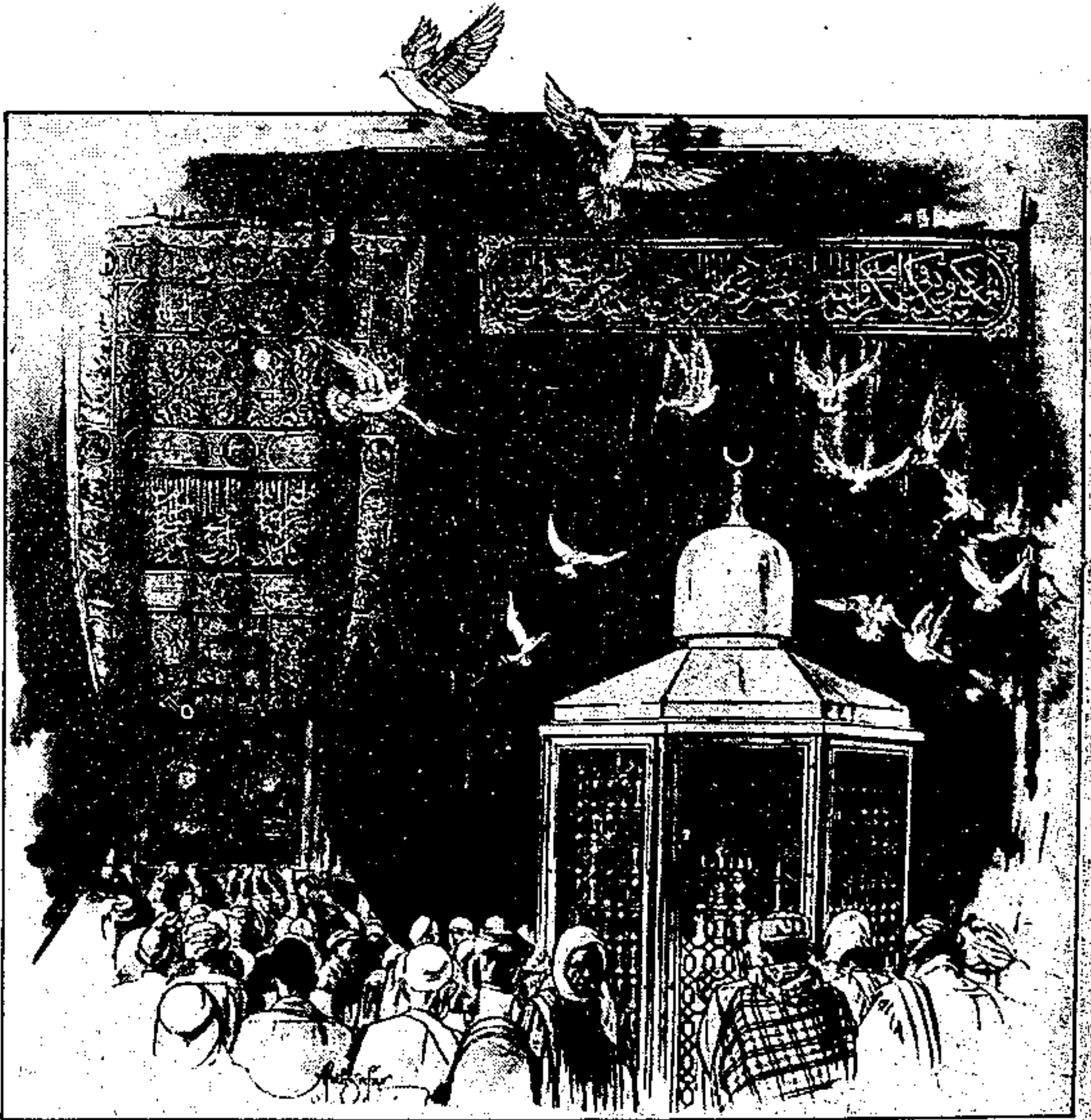
شیخ نور الحق نے اپنی پوری زندگی بنگال میں فروغِ اسلام کے لیے وقف کر دی اور اس سلسلے میں ہر قسم کے دُکھ و مصائب جھیلے لیکن ثابت قدم رہے۔ علاقے بھر میں آپ کے عقیدت مند آپ پر جان نچھاور کرتے تھے۔ آپ کا جدھر سے گزر ہوتا عقیدت مند احتراماً کھڑے ہو کر آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشش کرتے۔

زہد و تقویٰ نے آپ کو بہت زیادہ رقیق القلب بنا دیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ وہ حالات بھی لکھے جا سکتے ہیں جن سے آپ کو دوچار ہونا پڑا۔ ایک مرتبہ آپ بہت زیادہ غمزدہ اور ملولی کیفیت میں بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ مریدوں نے یہ دیکھا تو اُن کا دل بھی بھر آیا۔ ایک مرید آپ کے پاس گیا اور پوچھنے لگا "حضرت! آپ اس طرح رو کیوں رہے ہیں؟ کیا ہم سے کوئی خطا ہوئی ہے؟"

یہ سن کر آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں آخرت کا سوچ کر رو رہا ہوں۔ دُنیا میں اللہ نے تو میرے بہت سے انسانوں کو مطیع بنا رکھا ہے لیکن نہ جانے وہاں میرے عقیدت مند لوگ مجھے کس حال میں دیکھیں گے۔ شاید مجھ جیسا گناہگار بندہ اپنے انہی عقیدت مندوں کے آگے قیامت کے دن مجرم بنا کھڑا ہو۔ وہی لوگ میرا سر پامال کریں۔"

یہ سن کر مرید بولا "حضرت آپ نے ایسا سوچا کیوں؟ آپ تو بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہیں۔ پھر بھی آپ ایسا سوچ رہے ہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "رب کی باتیں کون جان سکا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ نہ جانے اُس نے میرے کون سے اعمال پسند کیے ہوں اور کون سے ٹھکرا دیے ہوں۔ بس یہی سوچ کر میرے آنسو بھر آتے۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دُنیا فانی ہے۔ یہاں قدم قدم پر دھوکہ ملتا ہے۔ ہم انسان یہاں درخت کی مانند ہیں ایک ایسے درخت کی مانند جس کی اُوپری چھال اُتاری گئی ہو۔ خدا بہت غیور ہے۔ گناہ گار بندوں کو معاف کرنے والا غفور الرحیم ہے تو صدیقین کے لیے بڑا غیرت مند۔

آپ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے۔ خلق کے مظالم کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا۔ ضبط کا بندھن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ سورج کی مانند سخاوت کرنا۔ تحمل زمین سے سیکھو اور پانی کی طرح عاجزی اختیار کرنا۔

پنڈوہ میں جلال تبریزی کی آخری آرام گاہ کے ساتھ ہی آپ کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔

"ابنِ خلدون اور امیر تیمور"

مشہورِ آفاق مؤرخ اور "مقدمے" کے مصنف علامہ ابنِ خلدون کو اپنی زندگی میں ایک عظیم سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ اُن کے بال بچے تیونس سے اُن کے پاس آ رہے تھے کہ اچانک ایک سمندری طوفان نے انہیں گھیر لیا اور سب سمندر کی موجوں کی نذر ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد انہوں نے فریضۂ حج ادا کیا اور اس طرح سکونِ قلب کا سامان بہم کیا۔ حج سے فارغ ہو کر مصر واپس پہنچے۔ اسی اثنا میں امیر تیمور نے دمشق پر حملہ کیا۔ دمشق کی مدافعت کی غرض سے فوج تیار کی گئی۔ ابنِ خلدون علماء اور فضلاء کی ایک جماعت کے ساتھ دمشق پہنچے۔ علماء نے تیمور سے درخواست کی کہ وہ شہر کو تباہ و برباد نہ کرے۔ ابنِ خلدون کسی طرح خفیہ طور پر تیمور تک پہنچ گئے اور اُس سے خوب گھل مل کر باتیں کیں۔ تیمور اُن کی شخصیت، علم اور بے خوفی سے بہت متاثر ہوا اور اُن سے افریقہ کی تاریخ لکھنے کو کہا۔ ابنِ خلدون نے ایک ماہ تیمور کے ہاں مہمان رہ کر یہ کتاب تیار کر دی اور معاوضے میں بہت سے انعام و اکرام حاصل کر کے چلے آئے۔

بحوالہ "تاریخِ تعلیم"
از ڈاکٹر خالد یار خان

ہندوستان

قدیم زمانے سے ہی کفر و جہالت کے اندھیروں میں گھرا، بُت پرستی کا سب سے بڑا گہوارہ چلا آ رہا تھا۔ اسلام کی روشن کرنیں آہستہ آہستہ جہالت کے اندھیروں کو دُور کر کے سرزمین ہند میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایسے میں ایک درویش صفت بزرگ شیخ شمس الدین مُفتی ہندوستان میں وارد ہُوئے جو علومِ ظاہری اور باطنی میں یکتا تھے۔

مُفتی شمس الدین، جدّوجہد اور فکر و تدبر کا نمونہ تھے۔ علم و فضل اور تقویٰ میں کمال رکھتے۔ طبیعت میں سادگی اور میٹھا پن اتنا کہ لوگ جلدی آپ کے گرویدہ ہو گئے اور رو ہتک میں پانچ وقت اذان دی جانے لگی۔

خالقِ حقیقی سے ملنے کا وقت نزدیک آیا تو پسماندگان کو حیرت انگیز نصیحت فرمائی: "جب میرا انتقال ہو تو تم لوگ دفن کرنے نہ چل پڑنا۔ بس میرے جنازے کو مسجد میں رکھ کر دُور ہٹ جانا۔ کچھ دیر بعد آ کر دیکھ لینا۔ اگر جنازہ موجود ہو تو جہاں جی چاہے دفنا دینا لیکن اگر نہ ملے تو رونا دھونا مت۔ بس خدا کی مرضی سمجھ کر چُپ ہو رہنا۔"

کئی سال بعد انتقال ہُوا تو پسماندگان نے وصیت کے مطابق عمل کیا اور جنازہ مسجد میں رکھ کر دُور چلے گئے۔ کچھ سمے بیتا کر واپس لوٹے تو مسجد کا صحن خالی تھا۔ ذہنوں میں آپ کی وصیت اور نصیحت تازہ تھی۔ لہٰذا خاموشی سے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس خاندان نے بہت عروج حاصل کیا۔ شاہی درباروں سے وابستہ رہے لیکن علم کا دامن نہ چھوڑا۔ مُلازمتیں کیں، لیکن تعلیمی مدرسوں کی صحبت سے بھی اُٹھنا گوارا نہ کیا۔ اور بے انتہا عزت احترام اور شہرت پائی۔ اسی خاندان کی نسل سے پھر ایک اور بزرگ ہستی کا ظہور ہوا جو شیخ وجیہہ الدین کے نام سے مشہور ہُوئے۔ آپ کے والد کا نام معظم تھا جو شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی شاہی مُلازمت اختیار کی۔ رات، خدا کی یاد میں عبادت و ریاضت میں گزرتی تو دن دُنیاوی معاملات نبٹانے میں۔ ایک مرتبہ آپ سرکاری کام کے سلسلہ میں فوجی دستے کے ساتھ جا رہے تھے راستہ طویل تھا۔ گھوڑوں پر سوار، چلتے چلتے تھکاوٹ سی محسوس ہوئی تو ساتھیوں نے آرام کی خواہش ظاہر کی۔

گھوڑے بھوکے پیاسے تھے، سامنے کسی کے کھیتوں کی ہریالی دیکھ ہنہنانے لگے۔ سوار سمجھ گئے کہ گھوڑے بھوکے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے گھوڑوں کو سامنے والے کھیتوں میں چھوڑ دیا۔ آپ نے فوراً اس کی مخالفت کی۔ ساتھیوں نے پُوچھا کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کا گھوڑا بھی تازہ دم ہو جائے۔ آپ نے متانت سے جواب دیا "کیوں نہیں۔ مَیں کیوں نہیں چاہوں گا کہ میرا گھوڑا بھی آرام کرے اور اُسے بھی چارہ نصیب ہو لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مَیں اپنے گھوڑے کے لیے کسی کی محنت سے تیار کی گئی فصل اُجاڑ دوں۔"

ساتھیوں نے یہ سُنا تو ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے اور بولے "لو اس سر پھرے کی بات سنو۔ بھلا ہمیں اس سے کیا غرض کہ یہ کسی اور کا کھیت ہے۔ ہمیں تو مطلب ہے اپنے گھوڑوں کو چارہ کھلا کر تازہ دم کرنا اور وہ ہم کریں گے۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے گھوڑے فصل سے تیار کھیتوں میں بیدردی سے داخل کر دیئے۔

ساتھیوں نے پھر سوال کیا: "جب تمہارا گھوڑا بھوکا بھی ہے تو اس کی خوراک کا انتظام کس طرح کرو گے؟"
آپ نے جواب دیا: "میں اس کا انتظام کسی طرح بھی کروں مگر میں کسی کے کھیت کو برباد نہیں ہونے دوں گا۔"
ساتھی سپاہی ناک بھوں چڑھانے لگے، بولے: "عجیب سر پھرا شخص ہے یہ۔ اب تو ہم صبر نہیں کریں گے۔"
اُن سب نے اپنے اپنے گھوڑوں کو غیروں کے کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ شیخ وجیہ الدین کو ایسا لگا، گویا اُن کے ساتھیوں نے انھیں بڑی اذیت پہنچائی ہے وہ تلملائے تلملائے اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ آپ فرما رہے تھے: "ظالمو! یہ تم نے کیا کر دیا؟ کسی کی روزی برباد کر دی۔"
چونکہ آپ کا گھوڑا بھی بھوکا تھا اور آپ نے اُسے روک رکھا تھا اس لیے وہ حالت بے بسی میں اپنی دونوں پچھلی ٹانگوں پر بار بار کھڑا ہو جاتا۔ آپ ہوں ہوں کر کے اس کے اگلے دونوں پاؤں پھر زمین سے لگا دیتے۔ آپ نے گھوڑے سے فرمایا: "اے بے زبان جانور! میں خوب جانتا ہوں کہ تو چاہتا کیا ہے؟ تو بھوکا ہے تو چارہ چاہتا ہے اور تو شاید اس لیے بھی بے چین ہے کہ تیرے دوسرے ساتھی اسی کھیت سے اپنی بھوک مٹا رہے ہیں۔ تو سوچ رہا ہو گا کہ آخر میں تجھے کیوں روک رہا ہوں؟"
گھوڑے نے اپنے دونوں اگلے پاؤں زمین پر مارے، آپ نے فرمایا: "کیا بات ہے؟ گھبراؤ نہیں میں تمہیں ابھی کسی چراگاہ تک لے چلوں گا۔"
اس کے بعد آپ اپنے گھوڑے پر بیٹھ گئے اور گھوڑے پر بیٹھ کر چراگاہ کی تلاش میں چل پڑے۔
کئی گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ چراگاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ خود بھی بے حد بھوکے تھے لیکن انھوں نے جانور کے مقابلے میں اپنی پروا نہیں کی جب گھوڑا اچھی طرح چر کر فارغ ہو گیا تو آپ اپنے ساتھیوں میں واپس پہنچے۔ اُن کے ساتھی جشن سا منا رہے تھے۔ معلوم نہیں کہاں سے وہ مزے مزے کے کھانے لائے تھے۔ انھوں نے شیخ وجیہ سے اشارۃً کہا: "اگر بھوک لگ رہی ہے تو کھانا حاضر ہے۔"
آپ نے پوچھا: "مگر یہ اتنا بہت سارا کھانا تم لوگ لائے کہاں سے؟ کیا کہیں سے خرید کر لا رہے ہو؟"
ایک شخص زور زور سے ہنسنے لگا، بولا: "لو بھائیو! سنا تم نے۔ کیا میں نہ کہتا تھا کہ ایماندار آتا ہو گا اس لیے جلدی جلدی کھا لو۔ مگر تم لوگ نہیں مانتے اور ایماندار شخص ہم میں آ گیا۔"
کسی طرف سے آواز آئی: "بھائیو! تمہیں قسم ہے کہ یہاں جو کچھ دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو اس کو اپنے اپنے حافظے میں محفوظ رکھو۔ میں جب کھانے سے فارغ ہو جاؤں گا تو۔" شیخ وجیہ کی طرف اشارہ کر کے: "اِن کو اپنے دستِ خاص سے کھانا کھلاؤں گا۔"
آپ نے فرمایا: "میں یہ کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک مجھے اس کے حلال ہونے کا ثبوت نہیں مل جاتا۔"
لیکن وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے، ان کی نیت ضرور درست تھی۔ شیخ وجیہ نے اپنا ضروری سامان یہیں کہیں رکھ دیا تھا۔ اسی سامان میں اُن کا روکھا پھیکا کھانا بھی تھا۔ وہ دیر تک اس سامان کو تلاش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔
آپ نے اپنے ساتھی سے پوچھا: "میں یہاں اپنا سامان چھوڑ گیا تھا، وہ کہاں چلا گیا؟ مل نہیں رہا۔"
ایک شخص ہنسنے لگا۔ دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور مسکراتے ہوئے جواب دیا: "پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ دیکھو کہیں اِدھر اُدھر ہی پڑا ہو گا۔"
آپ نے فرمایا: "بھائیو! اگر میرا کھانا کسی نے کھا لیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں بھوکا ہوں، کوئی اور سبیل کروں گا مگر وہ کھانا اگر مجھ سے پوچھ کر کھایا جاتا تو بہتر تھا۔"
کسی کی آواز سنائی دی: "اگر پوچھ کر کھایا جاتا تو کھانے کی اجازت ہی کون دیتا۔ کیا ہم اتنے بھولے ہیں؟"
آپ کو بہت زیادہ بھوک لگ رہی تھی۔ کسی دوست نے پوچھا: "حضرت! جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر آپ اجازت دے دیں تو میں اسی وقت گرم گرم اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
آپ کو ان باتوں سے بڑا دکھ ہو رہا تھا، آپ نے پوچھا: "دوستو! میں تم سے ایک سوال کروں گا۔"
کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں: "بارہا بادشاہ سے کہہ کر اپنے سفر اور حضر کی خوشیوں میں اضافہ اس طرح کرنا ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
آپ خوب سمجھ رہے تھے کہ اُن کا رُخِ سخن کدھر ہے، آپ نے جواب دیا: "میں خود بادشاہ سے یہ کہوں گا کہ مجھے کہیں اور لگا دیا جائے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔"
ایک نے جواب دیا: "دیکھا آپ لوگوں نے، اس کو کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"
دوسرے نے غیر معمولی ہمدردی جتائی: "موصوف کو بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اگر آپ اجازت دے دیں تو بندہ کھانا لانے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔"

کسی نے پوچھا " کھانا کتنا آئے گا ؟ میں ابھی آتا ہوں "۔

آپ نے فرمایا " یہ تو مجھ پر بڑا ظلم ہوگیا۔ میں بھوکا ہوں اور میرے پاس رقم بھی نہیں کہ میں بازار سے خرید کر ہی کھالوں "۔

ایک شوخ و شریر نے جواب دیا " حضرت ! اب زیادہ بڑھ چڑھ کر بس اپنی ایمانداری کا۔ میں خوب جانتا ہوں آپ سب کی ایمانداری اور بے ایمانی کو "۔

آپ نے فرمایا " افسوس کہ میں اس وقت بھوکا ہوں ورنہ میں تیری باتوں کا بہت اچھا جواب دیتا "۔

اس شخص کو بھی غصہ آگیا، پوچھا " آپ کیا جواب دیتے مجھے ؟ "

آپ نے جواب دیا " میں اپنے نفس کے لیے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا "۔

اس شخص نے جواب دیا " لیکن میں اپنے نفس کے لیے آپ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں "۔

آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، بولے " بس۔ اب ختم کر اس سلسلے کو "۔

اس شخص نے اور زیادہ جسارت سے کام لیا، آپ کو شانوں سے پکڑ لیا، بولا " نظریں کیوں چراتے ہو ؟ ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو، مجھے یہ چوری کی عادت ذرا بھی پسند نہیں "۔

آپ نے بہت ضبط سے کام لیا، کہا " دیکھ میرے پیمانۂ صبر کو لبریز نہ کر "۔

اب اس شخص نے اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے آپ کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا، بولا " میں اگر چاہوں تو تمھیں مسل کر پھینک دوں، تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو ؟ "

اب آپ کو بھی غصہ آگیا، آپ نے فرمایا " میں خود کو کیا سمجھتا ہوں یہ بتانا فضول ہے مگر میں ہوں کیا تجھ کو ابھی بتائے دیتا ہوں "۔

اس کے بعد آپ نے اس شخص کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر دُور پھینک دیا، بولے " بس دفع ہو جا میری نظروں سے "۔

وہ شخص گر کر اٹھا اور پھر گر گیا۔ اب اس کے دوسرے ساتھیوں نے بھی آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ تنہا تھے اور وہ کئی، لیکن آپ نے دو کو اور اسی طرح اٹھا کر پھینک دیا۔ تین کے حشر نے سب کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ آپ سے دور دور رہ کر تلخ کلامیاں کرنے لگے مگر پاس کوئی بھی نہیں آیا۔ اور آپ جب بھی غصے میں اُن کی طرف لپکتے، وہ بھاگ کھڑے ہوتے۔

آپ کے ہاتھ میں کہیں سے چابک آگیا، آپ نے احتیاطاً اُسے گھمانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد آپ سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے ؟ بھوک تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ پھر بے خیالی میں آپ چابک کی لکڑی سے زمین کو کریدنے لگے۔ اچانک اندر سے چنے کے دانے نکلنے لگے۔ آپ نے ان دانوں کو ہاتھ میں لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کی، کہ آخر یہ یہاں آئے کہاں سے ؟ "

آپ نے ان دانوں کو منہ میں رکھ کر ان کا ذائقہ جانچا تو بہت اچھا نکلا۔

اب آپ نے اُس جگہ کو اور کھودا اور اندر سے چنے کی وافر مقدار نکال لی۔ یہ چنے اتنے ہو گئے تھے کہ ان سے آپ کی بھوک مٹ گئی۔

آپ کے ساتھی دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، آپ نے انھیں آواز دی " حضرات ! اب آپ آجائیں "۔

لیکن ساتھی بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے، ایک بھی آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ نے اُن سے کہا " اپنا سامان تو یہاں سے اٹھا لو "۔

اُن لوگوں نے جواب دیا " میاں جی ! آپ انسان ہیں یا کچھ اور ؟ "

آپ نے جواب دیا " میں تمھاری ہی طرح انسان ہوں، مگر یہ سوال کیوں کیا تم نے ؟ "

ایک نے جواب دیا " اس لیے کہ جب آپ نے مجھے پھینکا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا، گویا میں تنکا ہوں جسے اٹھا کر پھینک دیا گیا ہے "۔

آپ نے اُن کا سامان دے دیا اور خود بھی وہاں سے چلے گئے۔

❊

آپ اپنے شہر دہلی سے کہیں جا رہے تھے، دورانِ سفر آپ نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص درخت کے سائے میں بیٹھا ہے اُن کو اس کے عقیدت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ شیخ وجیہہ الدین بھی اُن بزرگ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ کچھ دیر انسانی ہجوم میں کھڑے اس دربار کا مشاہدہ کرتے رہے۔ یہ کھڑے سوچ رہے تھے کہ اگر یہ بزرگ دنیادار ہیں تو ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دیں گے، اور اگر یہ ولی ہیں تو خصوصی مزاج پرسی فرمائیں گے۔

انھیں ابھی بمشکل دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس ولی نے لوگوں سے کہا " دلی والوں میں شناسا شیخ وجیہہ الدین کو بلاؤ، اسے میرے پاس لاؤ۔ وہ ولیوں کا جدِ اعلیٰ ہے "۔

ان بزرگ کے ایک مرید نے حاضرین سے باآواز بلند دریافت فرمایا: "صاحبان! آپ میں شیخ وجیہ الدین کس کا نام ہے؟"
آپ آگے بڑھے اور جواب دیا: "میرا۔"
مرید نے کہا: "آپ کو پیر مرشد یاد فرما رہے ہیں، آگے آئیے۔"
شیخ وجیہ الدین آگے بڑھے، یہاں تک کہ اس بزرگ کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔
اُن بزرگ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور شیخ وجیہ الدین نے پوچھا: "کیوں جی یہ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم میرا امتحان لو۔ میں بھولا بدھا آدمی۔ میں امتحان کس طرح دوں گا؟ خدا کے لیے میرا اور امتحان نہ لینا۔"
شیخ وجیہ الدین کے دل پر ان باتوں کا گہرا اثر ہو رہا تھا، انھوں نے پوچھا: "بابا! میری رہنمائی فرمائیں میں دنیا میں رہ کر بھی خود کو دنیا سے دور دور محسوس کرتا ہوں، ایسا کیوں ہے؟"
بابا نے جواب دیا: "بابا وجیہ الدین! تو خود ولی ہے اور ساتھ ہی کئی ولیوں کا جدّ اعلیٰ بھی، دنیا میں تیرا کیا دل لگے گا۔"
شیخ نے پوچھا: "میرے لیے کوئی نصیحت؟"
بابا نے جواب دیا: "زندگی کو سادگی سے گزارئیے، انسانوں میں امتیاز کرنا چھوڑ دیجئے، خدا کے سوا کسی سے خوف نہ کھا۔ کم گوئی اور کم آمیزی اختیار کر۔"
شیخ نے پوچھا: "بس یا اور کچھ بھی؟"
بزرگ نے جواب دیا: "یہی بہت کافی ہے۔"
شیخ وجیہ الدین اُن کے مرید ہو گئے اور انھوں نے جو نصیحتیں کی تھیں، اُن پر زندگی بھر قائم رہے۔
یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کہ مالوہ کے علاقہ میں قصبہ دہاموئی کا ایک ہندو سرکش زمیندار مصیبت بنا ہوا تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کا بڑا شہرہ تھا۔ دہلی کی حکومت نے سید حسین نامی امیر کو اس سرکش کی تادیبی کارروائی پر متعین کر دیا اور شیخ وجیہ الدین سے کہا گیا کہ اس مہم میں آپ سید حسین کا ساتھ دیں۔ چنانچہ شیخ نے اپنے چار سالہ بیٹے کو اپنے ساتھ لیا اور سید حسین کے ساتھ مالوے کے قصبہ دہاموئی روانہ ہو گئے۔ سید حسین کے ساتھ اُن کا آزمودہ کار لشکر تھا۔
سرکش ہندو امیر نے سید حسین کے لشکر پر کئی بار حملہ کیا مگر منہ کی کھا کر رفوچکر ہو گیا۔ آخر اس کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ سید حسین پر قابو پانا بہت مشکل ہے تو اس نے ایک دوسری ترکیب سے سید حسین کو مات دینا چاہی۔
سید حسین، شیخ وجیہ الدین اور دوسرے امرا کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں ایک بدحال شخص اُن کے پاس آیا اور پوچھا: "جناب والا! آپ میں سید حسین کس کا نام ہے؟"
سید حسین نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور جواب دیا: "میرا ہی نام سید حسین ہے، بتا مجھ سے تیرا کیا کام ہے؟"
آنے والے نے کہا: "میں ٹھاکر رام ہیبت سنگھ کا آدمی ہوں۔ ٹھاکر جی جنگ کے بادلوں سے بے حد پریشان ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں مقابلے سے نہیں گھبراتا مگر مقابلوں سے پہلے میں سید حسین سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"
سید حسین نے شیخ وجیہ الدین کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں، آخر کیوں؟"
اس شخص نے کہا: "تو گویا آپ ہمارے ٹھاکر کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے، کیوں؟ ہے نا یہی بات؟"
سید حسین کو غصہ آگیا، بولے: "یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا کہ میں مقابلے سے بھاگ رہا ہوں؟"
اس شخص نے جواب دیا: "اس بات سے کہ آپ متامل ہیں۔"
سید حسین نے جواب دیا: "تب پھر تو جا سکتا ہے اپنے آقا سے کہہ دینا کہ میں اس کا ہر جگہ مقابلہ کر سکتا ہوں۔"
اس شخص نے منہ بنا کر کہا: "جناب والا! اگر آپ میرے آقا ٹھاکر کو اپنے پاس آنے دیں تو آپ کو خود ہی یہ معلوم ہو جائے گا کہ میرا آقا کیا ہے۔"
سید حسین نے پوچھا: "تب پھر کیا ملے بابا؟"
اس نے جواب دیا: "یہ کہ آپ مقابلے سے پہلے میرے آقا سے ملاقات کر لیں گے۔"
سید حسین نے کہا: "ہاں مگر اس طرح کہ تیرا آقا میرے پاس تنہا آئے گا، وہ ہتھیار لے کر نہیں آئے گا۔"
ٹھاکر کے آدمی نے کہا: "مگر کیوں؟ آپ تو اپنے لشکر میں ہیں اور ہمارا ٹھاکر تنہا آئے گا، پھر آپ اس کو ہتھیاروں [illegible]
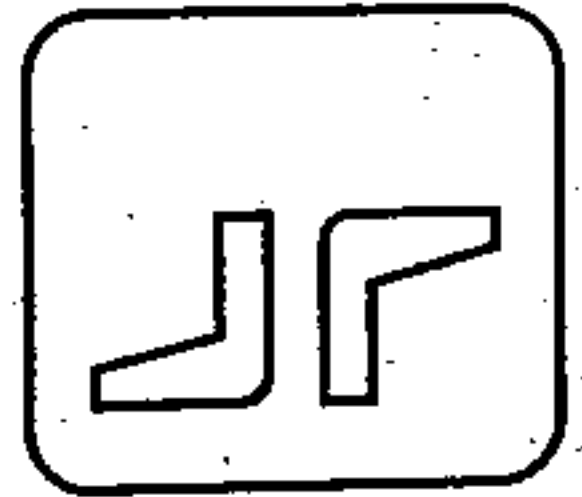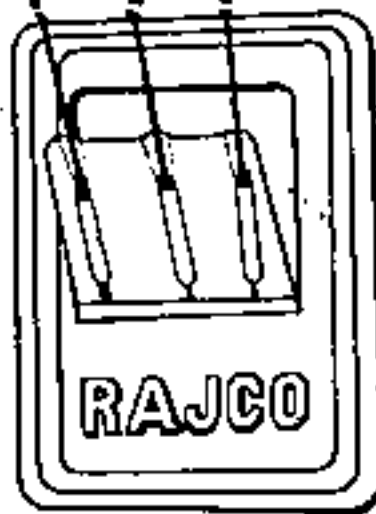
نہیں آنے دیتے۔"

سید حسین نے ایک بار پھر شیخ وجیہہ الدین کی طرف دیکھا۔ شیخ نے کہا "تیرا ٹھاکر بات کرنے آئے گا یا جنگ کرنے؟"

قاصد نے جواب دیا۔ "وہ آئے گا تو بات ہی کرنے مگر وہ اپنے جسم سے ہتھیار اس لیے نہیں دور کرے گا کہ اس بات کو وہ مردمی کے خلاف سمجھتا ہے۔"

سید حسین نے غصہ میں کہا "اب تو جاتا ہے یا میں دھکے دے کر نکلوا دوں؟"

وہ گھبرا گیا، باہر کی طرف جاتے ہوئے کہا "تو گویا میرا آقا اب یہاں ہتھیار اتار کر آسکتا ہے۔"

سید حسین نے جواب دیا "ہاں میں نے یہی کہا ہے اور اسی پر میں قائم رہوں گا۔"

وہ شخص چلا گیا مگر دوسرے ہی دن تنہا پھر آگیا۔ سید حسین نے پوچھا "تیرا آقا کہاں ہے؟ وہ نہیں آیا؟"

اس نے جواب دیا "جیسا کہ میں خود بھی سمجھ رہا تھا کہ میرا آقا یہاں نہتا نہیں آئے گا چنانچہ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

شیخ صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا "مجھے تو تیرا آقا بہت شریر معلوم ہوتا ہے، کیوں ہے نا یہی بات؟"

قاصد نے جواب دیا "آپ جو چاہیں کہیں۔ مگر وہ اکیلا اور نہتا نہیں آئے گا۔"

سید حسین نے کہا "تب پھر جا اور اس سے کہہ دے کہ میں اکیلا اور نہتا ہی آنے دے سکتا ہوں۔"

قاصد نے آہستہ سے کہا "میرے آقا نے مجھ سے کہا تھا کہ جب آپ میری بابت کسی بھی طرح نہ مانیں تو میں آپ سے ایک بات کہہ دوں۔"

سید حسین نے پوچھا "کون سی بات؟"

قاصد نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ سبھی چونک پڑے، اس نے کہا "میرے آقا نے کہا ہے کہ تم تو اپنے گھر ہی میں ہو تمھارے پاس لشکر بھی ہے اور اس لشکر میں میرے آقا کی حیثیت مکھی سے بھی بدتر ہوگی یعنی کمتر۔"

سید حسین نے پرجوش لہجے میں کہا "جا اپنے آقا سے کہہ دے کہ وہ یہاں جس حال میں ہے اسی میں چلا آئے۔"

قاصد اس کو ہی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا مگر بول نہیں پا رہا تھا۔

سید حسین نے کہا "اب تو اپنے آقا کے پاس جا اور اس سے کہہ دے کہ وہ تنہا اور ہتھیار سمیت آسکتا ہے۔"

قاصد جانے لگا تو شیخ وجیہہ الدین نے کہا "آپ کو یہ اجازت نہیں دینا تھی۔"

سید حسین نے جواب دیا "پروا نہ کرو، آنے دو، آئے گا شرارت کرے گا تو اس کی سزا پائے گا، ہمارا کیا بگاڑے گا؟"

شیخ وجیہہ الدین سے بار بار یہی پوچھا گیا کہ اگر اس نے سید حسین کے بجائے شیخ بابا سے مقابلہ کرنا چاہا تو؟

قاصد نے کہا "میرا آقا ایک وقت میں ایک ہی مقابلہ کرے گا۔"

سید حسین نے کہا "اب تو جاتا ہے یا میں دھکے دوں؟"

قاصد فوراً بھاگ گیا۔ کافی دیر بعد سید حسین نے بابا وجیہہ الدین سے کہا "اس دن میں نے۔۔۔"

لیکن سید حسین نے جو کچھ کہنا چاہا تھا، نہیں کہا اور چھپا گیا۔

کچھ دیر بعد ٹھاکر اس طرح نمودار ہوا کہ اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔ گال میں پان دبا ہوا تھا، ایسا لگتا تھا گویا وہ کسی تقریب میں آیا ہو۔ اس کے ہتھیار دیکھنے والوں کو مرعوب اور متاثر کر رہے تھے۔

کسی دربان نے اسے روک لیا، کہا "جناب! آپ ہتھیاروں سمیت اندر نہیں جائیں گے۔"

ٹھاکر نے جواب دیا۔ "تو کون ہوتا ہے روکنے والا۔ میں نے اجازت حاصل کر لی ہے۔"

شیخ وجیہہ الدین نے سید حسین سے کہا "جناب آپ نے ٹھاکر کو ہتھیاروں سمیت آنے کی اجازت دے تو دی ہے مگر یہ دھوکا کرے گا۔ آپ میری یہ بات ذہن نشین کر لیں۔"

سید حسین نے پوچھا "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

شیخ نے جواب دیا "جب یہ قریب آجائے تو آپ چوکنا رہیں۔"

دربان نے ابھی تک اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ سید حسین نے دور ہی سے آواز دی "آنے دو، اسے ہتھیاروں سمیت آنے دو۔"

ٹھاکر نے طنزاً مسکراتے ہوئے دربان کی طرف دیکھا اور کہا "تھوڑے تیری اوقات پر۔"

شیخ وجیہہ الدین نے ایک خدمت گار کو بلا کر اپنے چار سالہ بیٹے رحیم الدین کو اس کے حوالے کر دیا اور کہا "اس کو لے کر دور ادھر چلا جا۔"

خدمت گار بچے کو لے کر چلا گیا۔
ٹھاکر مستوں کی طرح جھومتا ہوا سید حسین کے پاس پہنچا اور کہا "تو سید! میں نے اپنی بات منوا ہی لی۔ میں بھی ایک ہی ضدی اور سرکش انسان ہوں۔"
سید حسین نے جواب دیا "اس میں کیا شک سارا زمانہ تیری شری طبیعت سے آگاہ ہے۔"
اب ٹھاکر بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے تلوار نکالی اور سید حسین پر حملہ کر دیا۔ سید حسین تو پہلے ہی سے ہوشیار حملے کے منتظر تھے۔ وہ کھسک کر ایک طرف ہو گئے۔ تلوار تکیے پر گری اور اس کو کاٹتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔
ابھی سید حسین سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھاکر نے دوسرا وار کر دیا۔ سید حسین لڑکھڑا کر گر گئے۔
شیخ وجیہ الدین نے ٹھاکر کو للکارا "ٹھاکر! تو نے دھوکا کیا ہے اس لیے اب ہم تیری حفاظت سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ اب مجھ سے بچ اور دیکھ کہ وار کس طرح کیا جاتا ہے۔"
شیخ وجیہ الدین کے خنجر کا ایک ہی وار کافی ثابت ہوا۔ ٹھاکر چیخ مار کر لوٹنے لگا۔
سید حسین نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔
جب یہ خبر ٹھاکر کے لشکر میں پہنچی تو وہ سید حسین کے لشکر کے سامنے آ گیا۔
کافروں کے لشکر میں سے ایک جوان اس طرح آگے بڑھا کہ اس نے تلوار اپنے گلے میں حمائل کر رکھی تھی۔ اس نے باآواز بلند کہا "بہادرو! میں اس فوج کا سردار ہوں جس کا سب سے بڑا ٹھاکر ابھی ابھی مارا گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی نکل کر میرا مقابلہ کرے۔"
سید وجیہ الدین نے سید حسین سے کہا "مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کا مقابلہ کروں۔"
سید حسین نے کہا "معلوم نہیں یہ تم سے مقابلہ کرے گا بھی یا نہیں۔ اس کے آثار تو کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔"
سید وجیہ الدین آگے بڑھے اور اعلان کیا "تیرے مقابلے پر میں آ گیا ہوں۔ میرا خیال ہے تجھے اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔"
اس نے جواب دیا "نہیں، میں تم سے نہیں لڑوں گا۔ میں سید حسین سے لڑنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مرد اور کھرا ہے تو میرے مقابلے پر آئے۔ کسی اور سے لڑنا میری بے عزتی ہے۔"
سید حسین تیزی سے اٹھے اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر ٹھاکر کے سامنے پہنچ گئے۔ بولے "میں آ گیا ہوں۔"
شیخ وجیہ الدین وہیں کھڑے رہے۔
ٹھاکر نے پوچھا "تو تم ہی ہو سید حسین؟"
انھوں نے جواب دیا "ہاں میں ہی ہوں سید حسین۔"
ٹھاکر نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی، تلوار کا ایک بھرپور وار کر دیا۔ سید حسین نے اس کا یہ وار اپنی ڈھال پر روک لیا۔ وار اتنا کاری اور بھرپور تھا کہ تلوار ڈھال کو کاٹ کر اندر تک پیوست ہو گئی۔ اب تلوار ڈھال میں پھنس چکی تھی۔ سید حسین ابھی سنبھلنے بھی نہ تھے کہ ٹھاکر نے ایک زوردار جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ سید حسین خود کو سنبھال نہ سکے، گھوڑے سے زمین پر آ رہے۔
ٹھاکر بھی کود کر سید حسین کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنا خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ سید حسین نے اپنی موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ اس دوران شیخ وجیہ الدین نے تلوار کا ایک بھرپور وار کر کے ٹھاکر کا ہاتھ کاٹ دیا اور دوسرے وار سے ٹھاکر کو قتل کر دیا۔
سید حسین نے اٹھ کر شیخ وجیہ الدین کو گلے سے لگا لیا، کہا "شیخ! اس وقت اگر تم نہ ہوتے تو میں قتل ہو چکا ہوتا۔"
وہ دونوں یہاں سے چل کر اپنی جگہ پہنچے۔
یہاں سے انھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ انھوں نے دیکھا مقتول ٹھاکر ہی جیسا ایک دوسرا ٹھاکر اسی طرح سامنے کھڑا ہے۔
ان دونوں نے ایک ساتھ مقتول کی طرف دیکھا، وہ خاک و خون میں پڑا ہوا تھا۔ سید حسین نے کہا "بھائی شاہ وجیہ الدین! یہ تو مقتول ہی جیسا کوئی ہے۔ بالکل اسی جیسا ہم شکل، ڈیل ڈول، قد و قامت سب کچھ ویسا ہی ہے۔"
ٹھاکر نے پھر آواز لگائی "سید حسین! کہاں ہو، میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"
شیخ وجیہ الدین اس کے سامنے پہنچ گئے اور پوچھا "تو کون ہے اور بار بار سید حسین ہی کو کیوں بلا رہا ہے؟"
ٹھاکر نے جواب دیا "میں مقتول ٹھاکر کا بھائی ہوں۔ آپ ہی کی طرح میں بھی اکیلا کھڑا ہوں چاہیں تو مجھے قتل کر دیں لیکن شرط شجاعت یہ ہے کہ میرے بھائی کا قاتل میرے سامنے آئے۔ میں اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

شیخ وجیہ الدین نے جواب دیا: "تیرے بھائی کو میں نے قتل کیا تھا، پھر تو نے سید حسین کو کیوں آواز دی؟"
اُس نے کہا: "اس لیے کہ میرے بھائی کا مقابلہ سید حسین سے ہو رہا تھا۔"
شیخ وجیہ الدین نے کہا: "تب پھر سید حسین کو بھول جا اور مجھ سے مقابلہ کر۔"
دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ٹھاکر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا اور شیخ وجیہ الدین ان حملوں کو نہایت استادی اور مہارت سے روک رہے تھے۔ آخر ٹھاکر تھک گیا اور شیخ وجیہ الدین کے حملوں کا آغاز ہوا۔ آپ کے حملوں میں جتنی تندی اور تیزی پائی جاتی تھی، ٹھاکر کے لیے وہ بہت پریشان کن تھی۔ شیخ نے کہا: "لے روک میرے وار۔"
ٹھاکر گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ میں شیخ کی تلوار اٹھ کر پہلو میں اتر گئی۔ وہ چیخ مار کر گھوڑے سے گر گیا۔
شیخ وجیہ الدین وہیں کھڑے رہے اور ٹھاکروں کو للکارا: "ٹھاکرو! تمھارا دوسرا سردار بھی مارا گیا۔ کیا ان دونوں کا کوئی اور بھائی بھی ہے؟ اگر ہے تو میرے سامنے آئے، میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔"
یکایک ٹھاکروں میں سے ایک اور سردار نمودار ہوا۔ یہ ٹھاکر بھی دونوں مُردہ ٹھاکروں کی شکل کا تھا، آپ نے ازراہِ مذاق پوچھا۔ "کیا تیرے ماں باپ نہیں ہیں؟"
دوسری طرف سے جواب ملا: "میرے ماں باپ موجود ہیں اور میں انھی کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"
شیخ نے کہا: "تب تو سرخ رو تو ہو جائے گا مگر ماں باپ کی نظروں میں نہیں۔ میری تلوار تیرا چہرہ سرخ کرے گی اور پھر تیرے سرخ چہرے کو ایک زمانہ دیکھے گا۔"
ٹھاکر نے کڑک کر کہا: "او میرے دو بھائیوں کے قاتل! زیادہ باتیں نہ بنا، مجھ سے مقابلہ کر۔"
آپ نے جواب دیا: "میں باتیں نہیں بنا رہا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تو خود پر اور اپنے ماں باپ پر رحم کھا، واپس جا اور کسی اور کو میرے مقابلے پر بھیج دے۔"
ٹھاکر نے پوچھا: "کیا تو مجھ سے ڈر گیا؟"
شیخ نے غصے میں جواب دیا: "میں اور تجھ سے ڈر گیا، خوب۔"
اس کے بعد دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ٹھاکر نے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا دی اور آپ کو اپنی گرفت میں لے کر زمین پر آ گیا۔ ٹھاکر بہت طاقتور تھا، اس نے آپ کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ آپ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ طاقت سے ٹھاکر کو زیر کرنا ممکن ہے، اس لیے آپ نے اعلان کیا، فرمایا: "ٹھاکر! جنگ میں تو یہ جائز ہے اب میں تجھے زیر کرنے کے لیے تو یہ اختیار کرتا ہوں۔" اس کے بعد آپ نے اپنے کسی فرضی ساتھی کو آواز دی: "بھائی ذکا! ذرا اس ٹھاکر کو سنبھالنا تو سہی۔"
ٹھاکر نے آپ کو چھوڑ دیا اور ذکا سے بچنے کی فکر کرنے لگا۔ وہاں ذکا نام کا کوئی تھا ہی نہیں۔ ٹھاکر آپ کو چھوڑ کر جیسے ہی مڑا آپ نے اس پر خنجر سے وار کر دیا۔ ٹھاکر تڑپنے لگا اور ذرا سی دیر میں سرد پڑ گیا۔ ٹھاکروں نے یکے بعد دیگرے اپنے تین چار سرداروں کو اس طرح ہلاک ہوتے دیکھا، تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔
مسلمانوں نے ان کا پیچھا نہیں کیا اور اپنی چھاؤنی میں واپس چلے گئے۔
مسلمان بہت خوش تھے، انھوں نے خوشیاں منائیں۔ آپ اپنے خیمے میں آرام فرما رہے تھے۔ سید حسین آپ کے مداحوں میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت آپ کے آگے پیچھے رہنے لگا تھا۔ سید حسین آپ کے خیمے سے نکل کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ اس دوران ایک بوڑھی عورت چھاؤنی میں داخل ہوئی اور سپاہیوں سے پوچھا: "اے مسلمانو! میں اس نوجوان سے ملنا چاہتی ہوں جس نے تین دن پہلے تین ٹھاکر بھائیوں کو قتل کر دیا تھا۔"
سپاہیوں نے کہا: "ارے بھائی! یہ وجیہ الدین کو پوچھ رہی ہیں۔"
اس کے بعد انھوں نے بڑی بی کو وجیہ الدین کے پاس پہنچا دیا۔ آپ خیمے کی دیوار کی طرف منہ کیے کچھ سوچ رہے تھے کہ اچانک آپ نے
کوئی سپاہی کہہ رہا تھا: "حضرت! یہ خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"
آپ نے مڑ کر دیکھا اور اشارے سے کہا: "آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟"
بڑی بی نے جواب دیا: "ہاں میں اپنے بیٹوں کے قاتل سے ملنا چاہتی ہوں۔"
آپ نے پوچھا: "میں آپ کے بیٹوں کا قاتل ہوں؟ کس طرح؟ آپ ہیں کون؟"

بڑی بی نے کہا: تو نے ایک ہی مقابلے میں یکے بعد دیگرے جن تین ٹھاکروں کو قتل کیا ہے میں اُن بدنصیبوں کی ماں ہوں۔"
آپ نے فرمایا: ماں! مجھے اس کا افسوس ہے لیکن وہ تینوں اس لیے مارے گئے کہ اگر وہ نہ مارے گئے ہوتے تو میں مارا جاتا۔ اور پھر یہ
معرکہ حق و باطل تھا۔ میں اپنے دور دراز وطن سے چل کر یہاں آیا ہوں۔ میں نے سُنا تھا کہ یہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے چنانچہ میں
آیا، میں لڑا اور کامیاب ہوا۔ اب آپ فرمائیں کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟"
بڑی بی نے جواب دیا: بیٹے! تو نے مجھے ماں کہا ہے اس لیے اب ہمیشہ اس کا خیال رکھنا۔ میں نے اپنے تینوں بیٹوں کو ہمیشہ دُنیا
کے بہادر نوجوان سمجھ رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں زیر کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا لیکن بھگوان تجھے زندہ و سلامت رکھے کہ تو ان تینوں
سے بہادر نکلا۔ اب میں تجھے اپنا بیٹا بنانا چاہتی ہوں۔"
آپ نے جواب میں فرمایا: جو کچھ ہوا اس پر میں نادم اور شرمسار ہوں۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے۔ میں نے بھی اگر آپ کو ماں کہا
ہے تو زندگی بھر ماں کہتا اور ماں مانتا رہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"
بڑی بی نے کہا: اس طرح نہیں۔ بیٹا اپنی ماں کے پاس رہتا ہے۔ اگر تو نے جو کچھ کہا، دل سے کہا ہے تو پھر اس کو عملاً بھی ثابت کر۔"
آپ نے پوچھا: اس کو عملاً کس طرح ثابت کروں؟"
بڑی بی نے جواب دیا: تو میرے ساتھ میری بستی، میرے گھر چل۔ وہاں چند دن میرے ساتھ رہ۔ تب میں سمجھوں گی تو میرا بیٹا ہے۔"
آپ نے فرمایا: مجھے آپ کے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن آپ ہندو ہیں اور میں مسلمان۔ آپ کے دھرم والے اس پر اعتراض
نہیں کریں گے؟"
بڑی بی نے جواب دیا: دھرم والے کیا کہیں گے جو کہیں گے کہتے رہیں۔ اگر وہ زیادہ کچھ کہیں گے تو میں مسلمان ہو جاؤں گی۔ اگر تو
چند دن بھی میرے ساتھ رہ جائے گا تو میں اپنے تینوں بیٹوں کا غم دُور کر سکوں گی۔"
آپ نے فرمایا: اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ آپ کی بستی میں چلوں گا اور چند دن آپ کے ساتھ ضرور رہوں گا۔"
اس کے بعد آپ نے اپنے خادم کو حکم دیا: میرے گھوڑے پر زین کس دے، میں ماں کے ساتھ اِن کے گھر جا رہا ہوں۔"
سید حسین کو جب اِن باتوں کا علم ہوا تو انھوں نے آپ کو الگ بلا کے سمجھایا: آپ تو عقلمند آدمی ہیں، یہ کیا کر رہے ہیں؟"
آپ نے جواب دیا: سید حسین! میں ماں کے ساتھ اس کی بستی جا رہا ہوں، دل سے نکلنے والی آواز دل میں اُتر جاتی ہے۔ ماں کے لفظوں میں
ماں کی آواز میں درد و سوز پایا جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ دھوکا نہیں کیا جائے گا۔"
سید حسین نے کہا: یہ آپ کہہ رہے ہیں، میں آپ کو نہیں جانے دوں گا چاہے کچھ ہو جائے۔"
اب آپ کے بعض عزیزوں کو بھی حوصلہ ملا، اُن کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور کہا: ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کس طرح یہاں سے جاتے ہیں۔
ہم آپ کی راہ میں لیٹ جائیں گے اور آپ ہمیں اپنے گھوڑے کے پاؤں تلے روند کر ہی یہاں سے جا سکیں گے۔"
آپ نے دیکھا وہ سب واقعی آپ کے گھوڑے کے چاروں طرف لیٹ گئے۔
بڑی بی نے اُن سب سے کہا: آخر تم لوگ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک ماں اپنے بیٹے کو دھوکا دے گی؟ کیا میں اپنے منہ بولے
بیٹے کو دھوکا دوں گی؟ بھگوان کے لیے ایسا نہ سوچو۔"
آپ کو بڑی بی پر بہت رحم آیا۔ آپ نے فرمایا: ماں! اس وقت تو آپ چلی جائیں یہ لوگ مجھے یہاں سے نہیں جانے دیں گے لیکن میں
آپ کا بیٹا آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت جلد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا بس آپ اپنا پتہ سمجھا دیں مجھے۔"
بڑی بی کو بہت مایوسی ہو رہی تھی، بولیں: پتہ تو میں سمجھا دوں گی مگر میرا خیال ہے کہ اگر تم میرے ساتھ نہ چل سکے تو پھر کبھی نہ آ سکو گے۔"
آپ نے جواب دیا: یہ بات نہیں ہے، میں جو وعدہ کر رہا ہوں اُسے پورا کروں گا۔"
بڑی بی نے انھیں اپنا پتہ سمجھا دیا اور چلی گئیں۔
بڑی بی کے جاتے ہی لوگوں نے انھیں سمجھانا شروع کر دیا لیکن آپ پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ موقع کی تلاش میں رہے آپ ہر ایک سے
کہتے تھے کہ مجھے دھوکا نہیں دیا جائے گا، مجھے کچھ نہیں ہو گا۔
آخر ایک دن موقع پا کر آپ چلے گئے۔ آپ اس بستی میں داخل ہوئے اور پتہ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچ گئے۔ یہ خالص ہندوؤں کی بستی تھی۔
وہاں کے ہندو بہت غور اور حیرت سے دیکھتے۔ آپ نے بڑی بی کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا تو ٹھکرائن نے اپنے سامنے جو کچھ دیکھا
دیر تک اس پر یقین ہی نہیں آیا۔ حیرت سے پوچھا: تو یہ تم ہو، تم آ گئے، میں کس طرح یقین کروں؟

آپ نے گھوڑے کو باہر ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا اور خود اندر چلے گئے۔ اس عورت نے آپ کے لیے صاف ستھرا بستر بچھایا یہ مکان کیا، اچھا خاصا محل تھا۔ آپ نے پوچھا: کیا اس پورے محل میں آپ اکیلی رہتی ہیں؟

بڑی بی نے جواب دیا: نہیں تو۔ نوکر چاکر بھی ہیں۔ کیوں؟ یہ سوال کیوں کیا تم نے؟

آپ نے کہا: اس لیے کہ دستک دیتے ہی آپ باہر نکل آئیں حالانکہ اس محل میں گھنٹوں دستک دینے کے بعد بھی جواب کا ملنا آسان بات نہیں ہے، ہاں اگر دربان موجود ہو تو کوئی مشکل نہیں۔"

بڑی بی نے دروازے کے پاس ہی ایک بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ میرا بستر ہے اور یہ اس دن سے یہیں بچھا ہوا ہے جس دن سے تم سے مل کر یہاں آئی ہوں اور اس دن تک بچھا رہتا جب تک تم آنہ جاتے۔ میں اپنا بستر یہاں لگا کر تمھارا انتظار کر رہی تھی۔"

آپ کے دل پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ اس عورت نے آپ کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

آس پاس کے ہندوؤں نے اس پر اعتراض کیا اور ٹھکرائن کو سمجھایا: ٹھکرائن! بڑا اچھا موقع ہے۔ تمھارے بیٹوں کا قاتل تمھارے قبضے میں ہے اگر تم چاہو تو ہم تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور اس کا کام کر دیں گے۔"

ٹھکرائن نے جواب دیا: لوگو! یہ میرا بیٹا ہے، میں نے اسے اپنا بیٹا بنایا ہے بھلا کوئی ماں اپنے بیٹے کو کس طرح مار سکتی ہے۔"

ہندوؤں نے کہا: یہ مسلمان ہے اور تیرے بیٹوں کا قاتل ہے۔ تجھ کو تیرے بیٹوں کی روحیں ملامت کریں گی۔"

ٹھکرائن نے کہا: ایسا نہیں ہوگا میرے بیٹے بہادر تھے اور بہادر بہادر کی عزت کرتے ہیں میرے بیٹوں کی روحیں مجھے ملامت نہیں کریں گی کیونکہ وہ خود بھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ ان کی ماں کی گود اپنے بہادر بیٹوں کی موت سے خالی رہے۔ میری گود اب بھی بھری ہوئی ہے۔"

ٹھکرائن کا بھتیجا کہنے لگا: آپ ہندو ہیں اور یہ مسلمان۔ ایک ملیچھ کو اپنے گھر میں رکھ کر خود کو، پورے گھر کو بھرشٹ کر ڈالا۔ اب آپ برادری اور ہندو جاتی میں کس طرح آئیں جائیں گی؟"

ٹھکرائن بہت جذباتی ہو رہی تھیں، بولیں: میں نے کہہ تو دیا کہ میں اپنے تینوں بیٹوں کو کھو دینے کے بعد اسے نہیں کھو سکتی۔ اگر میری برادری اور ہندو جاتی مجھے پسند نہیں کرتی تو مجھے بھی ان کی کوئی پروا نہیں۔"

آپ ٹھکرائن کے پاس کئی دن رہے، دوسری طرف سید حسین اور ان کے ساتھی آپ کے لیے بہت پریشان تھے۔ سید حسین اپنی فوج لے کر اس بستی کے پاس پہنچ گئے اور اسے محاصرے میں لے کر اعلان کیا: بستی والو! تمھاری بستی میں ٹھکرائن کے گھر میرے دوست وجیہ الدین آئے تھے۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے میں انھیں لینے آیا ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں ملے تو میں یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

اس اعلان نے پوری بستی میں کھلبلی مچا دی۔ آپ ٹھکرائن کے ساتھ بستی کے باہر آئے اور سید حسین سے کہا: سید حسین! تم کیسے نا سمجھ انسان ہو۔ کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ٹھکرائن میری ماں ہے اور میری ماں میرے ساتھ دھوکا نہیں کرے گی میں اپنی ماں کے ساتھ خیریت سے رہ رہا ہوں۔"

سید حسین نے کہا: شیخ! آپ کا بیٹا رحیم الدین بہت پریشان ہے۔"

آپ نے ٹھکرائن سے اجازت لی اور سید حسین کے ساتھ چھاؤنی میں چلے گئے۔

آپ کئی دن بعد ٹھکرائن کے پاس دوبارہ گئے اور اس بار اپنے بیٹے رحیم الدین کو بھی لیتے گئے۔ ٹھکرائن نے رحیم الدین کو اپنا پوتا سمجھا اور انھیں بڑی محبت دی۔

●

اورنگ زیب عالمگیر کا اپنے بھائیوں سے جھگڑے کا آغاز ہو چکا تھا۔ دارا شکوہ اور شجاع ایک طرف تھے۔ شہزادہ مراد اور اورنگ زیب دوسری طرف۔ عالمگیر کی فوج میں شیخ وجیہ الدین بھی تھے۔ شاہ شجاع بنگالے کی طرف سے کوچ کرتا ہوا آیا اور اورنگ زیب نے اس کو راستے میں روک لیا۔ شجاع کی فوج میں سرکش اور جنگجو ہاتھیوں کی کثرت تھی۔ شاہ شجاع نے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا اور ان کی مدد سے اورنگ زیب کی فوج پر حملہ کر دیا۔ شاہ شجاع نے اپنے ہاتھیوں کے پیچھے زرہ پوشوں کے دستے متعین کر رکھے تھے۔ ہاتھیوں نے اورنگ زیب کی فوج میں بھگدڑ مچا دی، وہ بھاگنے لگے۔ اس جنگ میں عالمگیر پر اتنا برا وقت آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ

آیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے راہ فرار اختیار کی اور بس چند آدمی باقی رہ گئے ان میں شیخ وجیہہ الدین بھی شامل تھے۔ اورنگ زیب نے کہا: "شیخ صاحب! اگر آپ بھی اپنی جان بچانا چاہیں تو میری طرف سے آپ کو اجازت ہے آپ جا سکتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "میدان جنگ سے بھاگنا مردوں کا کام نہیں ہے۔ پھر میں کیونکر بھاگ سکتا ہوں۔"

اورنگ زیب نے کہا: "اب جان بچنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔"

آپ نے فرمایا: "میں اپنی جان بچا کر میدان جنگ سے بھاگ جاؤں، یہ کس طرح ممکن ہے؟"

آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "ساتھیو! میں ان میں سے کسی ایک ہاتھی پر حملہ کرنا چاہتا ہوں، تمھاری کیا رائے ہے؟"

ایک ساتھی نے جواب دیا: "آپ ہاتھی پر حملہ کر کے بچیں گے کس طرح؟ وہ ہاتھی چشم زدن میں آپ کو ہلاک کر دے گا۔"

آپ نے اپنے جملہ ساتھیوں سے فرمایا: "میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل کروں گا۔ جو ساتھی میرا ساتھ دینا چاہیں رُک کے رہیں اور جو جانا چاہیں چلے جائیں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

آپ کا یہ فرمانا تھا کہ چار کے سوا سبھی نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کر لی۔ آپ نے ان چاروں کے لیے فرمایا: "میرے یہ چار ساتھی آخر وقت تک میرے ساتھ رہیں گے یہاں تک کہ میں فتح حاصل کر لوں گا۔"

آپ کے چاروں ساتھیوں نے قسم کھائی: "ہم بھی آپ سے عہد کرتے ہیں کہ جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔"

آپ اپنے چاروں ساتھیوں کو لے کر ہاتھیوں کی طرف بڑھے اور ان میں جو ہاتھی سب سے زیادہ سرکش تھا اس کے سامنے پہنچ گئے آپ کے ساتھیوں نے پوچھا: "کیا ہم اس پر حملہ کر دیں؟"

آپ نے منع کیا: "ابھی نہیں دیکھو یہ ہاتھی کیا کرتا ہے؟"

ابھی آپ کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہاتھی نے اپنی سونڈ اٹھائی وہ آپ کو اپنی سونڈ کی گرفت میں لینا چاہتا تھا کہ آپ نے اس کی سونڈ پر تلوار کا بھرپور وار کیا، ہاتھی کی سونڈ کٹ کر دور جا گری۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہوا واپس ہوا اور اپنی ہی فوج کو روندنے لگا اس بھگوڑے ہاتھی کے پیچھے دوسرے ہاتھی بھی بھاگنے لگے اور چشم زدن میں شاہ شجاع کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اورنگ زیب اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں شاہ شجاع کو شکست ہوگئی، اور بنگالے واپس چلا گیا۔

اورنگ زیب آپ کے پاس گیا اور کہا: "شیخ صاحب! آپ نے جو اس وقت کارنامہ انجام دیا ہے میں اسے زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

آپ نے جواب دیا: "میں مشیت ایزدی سے کس طرح انحراف کرتا۔ خدا کی مرضی بھی تھی کہ میں آپ کا ساتھ دوں۔"

اورنگ زیب نے کہا: "حضور والا! میں چاہتا ہوں آپ کے منصب میں اضافہ کر دیا جائے۔"

آپ نے جواب دیا: "نہیں، میں جہاں ہوں مطمئن ہوں۔ قناعت اور استغنا کا دامن کس طرح چھوڑ دوں؟"

اورنگ زیب نے آپ کے اس کارنامے اور احسان کو ہمیشہ یاد رکھا۔

شاہی منصب داروں میں سید شہاب الدین کی کسی نے شکایت کی کہ اس نے شاہی امانت میں خرد برد کی ہے بادشاہ نے اس کو اپنے سامنے طلب کیا اور کہا: "شہاب الدین! اپنا حساب پیش کرو۔"

شہاب الدین نے حساب پیش کیا تو اس میں مجرم قرار پائے۔ بادشاہ نے کہا: "میں تجھ کو سزا دوں گا۔"

شہاب الدین رونے لگا اور درخواست کی: "حضور والا اگر مجھے وقت دیا جائے تو میں یہ رقم پوری کر دوں گا۔"

بادشاہ نے کہا: "میں تجھ کو کسی ضمانت کے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔"

شہاب الدین نے کہا: "لیکن میں کس کی ضمانت پیش کروں؟"

ان واقعات کا علم شیخ وجیہہ الدین کو ہوا تو انھوں نے ضامن کی حیثیت سے خود کو پیش کر دیا، بولے: "شہاب الدین کا ضامن میں بنتا ہوں۔"

بادشاہ نے پوچھا: "شہاب الدین! تو مطلوبہ رقم کتنے دنوں میں واپس کرے گا؟"

شہاب الدین نے جواب دیا: "کم از کم چھ ماہ میں۔"

بادشاہ نے آپ سے فرمایا: "حضور والا! آپ کے علم میں ہے کہ یہ رقم واپس کرنے کی چھ ماہ کی مہلت مانگ رہا ہے جو میں دے رہا ہوں

آپ اس کو اپنے طور پر ہدایت فرما دیں کہ یہ وعدے کا پاس کرے۔"

آپ نے شہاب الدین سے کہا: "میں نے تیری ضمانت دی ہے، تجھے اس کا خیال کرنا ہو گا۔"

شہاب الدین نے جواب دیا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ مطلوبہ رقم چھ ماہ کے اندر واپس کر دوں گا۔"

شہاب الدین کو رہائی مل گئی۔

اس بات کو چھ ماہ گزر گئے، مگر شہاب الدین کی طرف سے رقم نہیں واپس کی گئی۔ بادشاہ نے اپنا آدمی آپ کے پاس بھیجا اور آپ کو مطلع کیا: "شہاب الدین نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔"

آپ نے شہاب الدین کو اپنے گھر بلایا اور پوچھا: "شہاب الدین! کیا تو نے بادشاہ کی رقم واپس کر دی؟"

شہاب الدین نے جواب دیا: "رقم تو میں نے ابھی تک نہیں واپس کی۔"

آپ نے پوچھا: "تو نے چھ ماہ کا وعدہ کیا تھا، اس کو کتنی مدت گزر چکی ہے؟"

شہاب الدین نے جواب دیا: "تقریباً سات ماہ۔"

آپ نے فرمایا: "تو بادشاہ کی رقم پہنچا دے، یہ تو بڑی شرمناک بات ہے۔"

شہاب الدین نے جواب دیا: "بات شرمناک ہو یا افسوسناک، میرے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہیں، میں کہاں سے ادا کروں؟"

آپ نے کہا: "بات پھوٹی کوڑی کی نہیں، وعدے اور اصول کی ہے۔ بادشاہ کی رقم اسے ملنی چاہیے۔"

شہاب الدین نے اپنی تلوار آپ کی طرف بڑھا دی اور کہا: "رقم تو میرے پاس نہیں، یہ تلوار حاضر ہے، آپ جو چاہیں کریں۔"

آپ نے طنزاً کہا: "شہاب الدین! تلوار پکڑنا تو آسان ہے، مگر اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل۔"

شہاب الدین کو آپ کی یہ بات بہت گراں گزری۔ اس نے اپنی تلوار سے اچانک آپ پر حملہ کر دیا، لیکن آپ نے اس کا وار خالی دیا، دوسرے ہی لمحے سیدھے ہاتھ سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ شہاب الدین زمین پر گر گیا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

آپ نے اپنے خادم سے کہا: "اس کو قید خانے میں ڈال دو اور اس کے اصطبل سے مویشی کھول لاؤ۔"

کچھ دیر بعد شہاب الدین کو ہوش آ گیا۔

آپ نے اس سے کہا: "تیری وہ ڈینگیں کہاں گئیں؟"

شہاب الدین نے جواب دیا: "میں نے کوئی غلطی نہیں کی، میں بے قصور ہوں۔ رہ گئی یہ بات کہ آپ نے مجھے زیر کر لیا، تو حضرت ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی میرا ہاتھ اٹھا ہی تھا کہ آپ نے تھپڑ رسید کر دیا۔ آپ نے مجھ پر حملے میں پہل کر دی تھی، اس لیے آپ جیت گئے، ورنہ میں دیکھتا۔"

آپ نے فرمایا: "اچھا تو یہ بات تھی۔" اس کے بعد آپ نے اپنے خادم سے کہا: "اس کو تلوار دے دو تاکہ یہ دل کی حسرت نکال لے۔"

خادم نے تلوار دے دی۔ شہاب الدین نے تلوار لے تو لی اور حملے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا، مگر پھر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ رونے لگا۔ آگے بڑھا کر قدموں میں گر گیا۔ بولا: "حضرت! مجھے معاف فرما دیں، میں بادشاہ کی رقم آج ہی واپس کر دوں گا۔"

چنانچہ اس نے بادشاہ کی رقم اسی دن واپس کر دی۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ "وجیہ الدین میں معلوم نہیں کیا بات تھی کہ میں لرز گیا۔ مجھے ایسا لگا گویا میں ہلاک کر دیا جاؤں گا۔"

❁

ایک بار آپ نے جنگ میں حصہ لیا اور طرفین میں بہت خون خرابہ ہوا۔ یہ مقابلہ بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوا تھا۔ شام کو مسلمانوں نے فتح حاصل کی اور غیر مسلم فرار ہو گئے۔ اس میں کافی آدمی مارے گئے تھے۔ رات کو آپ کی فوج کا سپہ سالار دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھا اور مقتولین کی تعداد کا ذکر چھڑا۔ کوئی کہتا تھا: "دونوں طرف کے ہزار تو ضرور مارے گئے ہوں گے۔"

دوسرے نے رائے دی: "نہیں ہزار تو نہیں، لیکن سات ساڑھے سات سو سے کم نہیں مارے گئے ہوں گے۔"

آپ نے فرمایا: "نہ ہزار نہ سات سو۔ مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ کل پانچ کم دو سو یا پانچ اوپر دو سو آدمی مارے گئے۔"

سپہ سالار نے پوچھا: "ایک طرف کے، یا دونوں طرف کے؟"

آپ نے جواب دیا: "دونوں طرف کے۔"

سپہ سالار نے کہا: "مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

آپ نے اُن سب کو وہیں چھوڑا اور خود زخمیوں اور مُردوں میں پہنچ گئے لوگوں کو شبہ بھی نہیں گزرا کہ آپ کس مقصد سے جا رہے ہیں۔

یہ بڑی طوفانی رات تھی۔ طوفانِ باد و باراں نے ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ آپ میدانِ کارزار میں پہنچ گئے۔ آپ کو جس جگہ بھی شبہ ہُوا وہیں جھک کر ٹٹول لیا۔ آپ نے ایک شخص کو ٹٹولا تو چیخ مار کر رویا، بولا "حضرت! میں زندہ ہوں مجھ زخمی کو یہاں سے نکال لے چلو۔"

آپ نے جواب دیا "میرا نام وجیہ الدین ہے میں یہاں سے واپس جا کے آدمی بھیجوں گا وہ تجھے اٹھا لے جائیں گے۔"

آپ میدانِ کارزار کے بعد گاؤں میں چلے گئے۔ یہاں بھی زخمی اور مُردہ پڑے ہُوئے تھے۔ اندھیرے میں آپ کا ہاتھ کسی بوڑھی عورت پر پڑا تو وہ خوف سے رونے لگی۔ آپ نے پوچھا "تو کیوں رو رہی ہے؟"

عورت نے جواب دیا "میں جان بچا کے بھاگ رہی تھی کہ رات ہو گئی اور اس جگہ چھپ گئی۔ اب رات کے سناٹے اور باد و باراں کے طوفان میں کہیں جانے کی ہمت نہیں رہی۔"

آپ نے فرمایا "عورت! میرا نام وجیہ الدین ہے اور میں مسلمانوں کے لشکر سے آیا ہوں۔ تو یہیں موجود رہ۔ کچھ دیر بعد میرے ساتھی یہاں آئیں گے وہ تجھ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

عورت جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ آپ اپنے لشکر میں واپس گئے۔ آپ نے دیکھا سپہ سالار اور دوسرے سردار اسی طرح سر جوڑے بیٹھے تھے۔ آپ نے اُن سب سے کہا "ابھی ابھی میں مقتولوں کو گن کر آیا ہوں اُن میں دو زندہ ہیں۔ ایک زخمی مرد اور ایک خوف زدہ بوڑھی عورت۔ بقیہ دو سو پانچ کی لاشیں پڑی ہیں۔"

سپہ سالار نے حیرت سے پوچھا "آپ اتنی جلدی گن بھی آئے۔ جب کہ میرے خیال میں وہاں جا کے اتنی جلدی واپس آ جانا ہی ناممکن ہے۔ اور پھر ان حالات میں کہ باد و باراں نے تہلکہ مچا رکھا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "تم لوگ چاہو تو جا کر گن لو۔ تمھارا جانا وہاں یوں بھی بہت ضروری ہے کہ وہاں دو زندوں کی جانیں بچ جائیں گی۔"

سپہ سالار نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا "آپ حضرات کیا مشورہ دیتے ہیں۔"

ایک سردار نے کہا "اس وقت میدانِ جنگ اور مذکورہ گاؤں میں جانا اتنا آسان بھی نہیں ہے اندھیری رات میں یہ کام کس طرح ہو گا؟"

لیکن دوسرے سردار نے مثبت مشورہ دیا، بولا "ہمیں وہاں پہنچنا چاہیے کیونکہ دو زندوں کو بچا لانا ثواب کا کام ہے۔ اندھیرے کو مشعلوں سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ بارش رک جائے تو ہم سب اس مہم کا آغاز کر دیں۔"

سپہ سالار نے اسی وقت سو مشعلیں روشن کرا دیں اور یہ لوگ بارش کے تھمتے ہی اُدھر روانہ ہو گئے۔

ان لوگوں نے مقتولوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شمار کیا تو ان کی تعداد دو سو پانچ سے کچھ نہیں نکلی اور دونوں زندہ بھی انھیں مل گئے۔ اُن دونوں نے تلاش کرنے والوں سے پوچھا "کیا آپ کے ساتھ وجیہ الدین بھی آئے ہیں؟"

ایک سردار نے جواب دیا "وجیہ الدین فوج میں ہیں، اُن سے آپ کا کوئی کام؟"

ان دونوں نے یکے بعد دیگرے ایک ہی جواب دیا "نہیں۔ ہم نے ان کا ذکر اس لیے کیا کہ وہ کچھ دیر پہلے یہاں آئے تھے۔"

دونوں کی باتوں نے سبھی کو متحیر اور متعجب کر دیا۔ وجیہ الدین جتنی جلدی واپس گئے تھے اس سے یہ باتیں اُن کی کرامت سے کم نہیں معلوم ہوتی تھیں سپہ سالار نے کہا "وجیہ الدین ولی ہیں۔ وہ خود کچھ کہیں نہ کہیں لیکن اُن کا وجود کرامت آمیز ہے۔"

❁

آپ کہا کرتے تھے کہ میں نے رسول مقبولؐ کی سنت کو اپنانے میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی یہاں تک کہ میں نے کفار سے جنگیں بھی لڑی ہیں۔ پھر آپ نے شاہی ملازمت چھوڑ دی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ آپ کے صاحبزادے شاہ عبدالرحیم رات کو اٹھ اٹھ کر آپ کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

آپ تہجد میں بھی اتنے ہی مستعد تھے جتنے پانچ وقت کی نمازوں کے۔ آپ کی تہجد کا ایک وقت مقرر تھا۔ شاہ عبدالرحیم نے محسوس کیا، تہجد گزاری کا وقت گزر چکا ہے مگر آپ بستر پر نہیں آئے۔ یہ والد کو دیکھنے کے لیے حجرے میں جو پہنچے تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ آپ سجدے میں بے سُدھ پڑے ہوئے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم کافی دیر کھڑے دیکھتے رہے۔ وہ بے حس و ساکت سجدے میں پڑے تھے۔ انھیں شبہ گزرا شاید اُن کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ انھوں نے دوسروں کو خبر کرنے کے لیے جیسے ہی حجرے سے نکلنا چاہا تو اُن کے جسم میں ہلکی سی حرکت ہوئی، یہ ٹھہر گئے۔ آپ نے سجدے سے سر اٹھایا تو تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے پوچھا "ابا بزرگوار! طبیعت ... آپ کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "میں پریشان نہیں ہوں میں تو بیٹھے بیٹھے عقبیٰ کی سیر کر رہا تھا۔ میں نے عقبیٰ میں اپنے خاندان کے ان بزرگوں سے ملاقات کی جو مختلف جنگوں میں شہید ہو چکے ہیں۔ میں نے ہر ایک کو بلند درجات اور اعلیٰ مقامات پر فائز دیکھا۔ میں بے حد خوش ہوا اور اسی عالم میں میں نے اپنے خدا سے استدعا کی کہ مجھے بھی شہادت کا مرتبہ عطا ہو۔ میں بہت رویا گڑگڑایا۔ یہاں تک کہ میری دعا قبول ہو گئی اور مجھے وہ جگہ دکھا دی گئی یہ جگہ دکن میں ہے میں نے اس جگہ کو دیکھ اور پہچان لیا ہے۔"

دوسرے دن صبح آپ نے اپنے بیٹوں سے کہا: "میں دکن جانا چاہتا ہوں میرا سامان سفر تیار کر دیا جائے۔"

آپ کے تینوں بیٹوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ شیخ ابوالرضا، شیخ عبدالرحیم اور شیخ عبدالحکیم۔ عبدالرحیم کو حکم دیا گیا کہ گھوڑا خرید لیا جائے۔ ایسا گھوڑا جس پر دکن کا سفر کیا جا سکے۔

سامان سفر تیار تھا۔ گھوڑا بھی خرید کر آپ کے حوالے کر دیا گیا۔ آپ نے فرمایا: "میں دکن جا رہا ہوں، وہاں میرا مقابلہ شاید شیوا جی مرہٹہ سے ہوگا۔ میں اگر واپس نہ آؤں تو میرا انتظار نہ کرنا اور نہ فکر اور غم کرنا۔"

آپ دکن روانہ ہو گئے اور سیدھے برہان پور چلے گئے۔ برہان پور میں تہجد کے دوران آپ کو بتایا گیا: "مقام شہادت تم پیچھے چھوڑ آئے اس لیے واپس جاؤ۔"

آپ نے علی الصبح برہان پور چھوڑ دیا اور جدھر سے آئے تھے اسی طرف واپس چلے۔ راستے میں تاجروں کا قافلہ مل گیا۔ یہ تاجر نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ ان لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ نے ان کی محبت کی وجہ سے ان سے وعدہ کیا کہ پتہ نہیں میں کہاں شہید کر دیا جاؤں اس لیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں تمہارا دوست اور غمخوار رہوں گا۔

تاجر آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔

دوران سفر ایک جگہ آپ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس سے چلا نہیں جا رہا تھا مگر سفر کر رہا تھا، آپ نے اسے روک لیا اور پوچھا: "بڑے میاں! آپ کہاں جا رہے ہیں اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

بڑے میاں نے انہیں اس طرح دیکھا جیسے ان کی بینائی بھی جواب دے چکی ہے۔ انھوں نے وجیہہ الدین کو پہچاننے کی کوشش کی، بولے: "میاں جی برا نہ مانیے گا، میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے، آپ کا نام کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "میرا نام وجیہہ الدین ہے۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں کہیں ملے ہوں لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پہلے بھی میں نے کہیں آپ کو دیکھا ہے۔"

بوڑھے نے کہا: "میں ہندو ہوں مگر بڑھاپے نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔"

آپ نے پوچھا: "اس بڑھاپے میں آپ کو اپنے گھر بیٹھنا تھا، یہ کہاں چل دیے؟"

اس نے جواب دیا: "میرا ایک بیٹا ناراض ہو کر دہلی چلا گیا ہے میں اسے منانے جا رہا ہوں۔"

آپ نے بے خیالی میں فرمایا: "آپ دہلی تو خیر کیا جائیں گے بہر حال جہاں تک آپ میرے ساتھ ہیں آپ کو مجھ سے ہر روز تین پیسے مل جایا کریں گے۔"

بوڑھے ہندو نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور آپ اسے ہر روز تین پیسے دینے لگے۔

راستے میں ایک جگہ آپ نے اس بوڑھے سے کہا: "بڑے میاں! رات مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ مجھے وہیں لیے جا رہے ہیں جہاں میرا خاتمہ بالخیر ہونا ہے۔"

بڑے میاں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور بڑبڑانے لگے: "رام رام رام۔ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے اور میں ہی تمہیں کسی ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں تمہارا خاتمہ ہوگا۔"

آپ نے فرمایا: "مجھے تو کچھ یہی بتایا گیا ہے۔"

قافلہ قصبہ ہنڈیا سے پہلے نوین بریا نامی سرائے میں ٹھہر گیا۔ یہ سرائے دریائے نربدا سے دو تین منزل ہندوستان کی طرف ہے۔ بڑے میاں اس سرائے سے غائب ہو گئے۔ آپ نے اسے ادھر ادھر تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ آپ نے اپنے تاجر ساتھیوں سے کہا: "دال میں کچھ کالا کالا ہے ہوشیار رہو۔"

لیکن تاجر جنگجو نہیں تھے، بولے: "ہم سب اپنے رب کی مشیت کے تابع ہیں۔"

صبح فجر کی نماز کے بعد آپ تلاوتِ کلام پاک میں مشغول تھے کہ سرائے کو سینکڑوں آدمیوں نے گھیر لیا۔ یہ ہتھیار بند ڈاکو تھے۔

ڈاکوؤں میں سے تین آدمی آگے بڑھے اور پکار کر پوچھا: ”تم میں وجیہ الدین کس کا نام ہے؟ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔“

آپ نے قرآن پاک کی تلاوت کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی دوسرے شخص نے آپ کی طرف اشارہ کیا: ”ان کا نام وجیہ الدین ہے۔ ان سے کوئی کام ہے؟“

انھوں نے جواب دیا: ”ہم انتظار کریں گے کہ یہ اپنی مقدس کتاب پڑھ چکیں تو ہم ان سے کوئی بات کریں۔“

جب آپ قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہوئے تو قرآن کو جزدان میں رکھ کر بوسہ دیا اور اسے اونچی جگہ پر رکھ کر نو آمدوں سے پوچھا: ”کیا بات ہے؟ میرا ہی وجیہ الدین نام ہے۔“

تینوں میں سے ایک نے کہا: ”شریمان جی! ہمیں آپ سے کوئی غرض نہیں، آپ یوں بھی بہت بھلے مانس انسان ہیں اور یہ کہ آپ نے ہمارے ایک آدمی کو بہت سکھ دیا ہے، اس نے آپ کا نمک کھایا ہے ہم اس نمک کا پاس کریں گے۔“

آپ نے پوچھا: ”مگر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

اس ہندو نے جواب دیا: ”جیسا کہ ہم نے بتایا کہ ہم تم سے کچھ نہیں بولیں گے مگر تم جس قافلے کے ساتھ ہو اسے ہم نہیں چھوڑیں گے۔“

آپ نے کہا: ”اس قافلے کے ساتھ میں بھی تو ہوں۔“

اس ہندو نے کہا: ”ہم نے آپ کو پناہ دی ہے آپ قافلے سے الگ ہو جائیں۔“

آپ نے جواب دیا: ”ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس قافلے سے عہد و پیمان کیا ہے۔ میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔“

اسی ہندو نے اکڑ کر کہا: ”اور ہم بھی مجبور ہیں کہ اس قافلے کو نہیں چھوڑ سکتے۔“

آپ نے اپنے ہتھیار پر ہاتھ ڈالا، کہا: ”میں اپنے قافلے کی حفاظت میں جنگ کروں گا۔“

اس ہندو نے واپس جاتے ہوئے کہا: ”بہرحال ہم نے ابھی تک اپنے کسی محسن پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔“

آپ نے فرمایا: ”تم نے اپنے محسن پر ہاتھ نہیں اٹھایا تو میں نے بھی آج تک اپنے کسی دوست یا ساتھی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔“

تینوں ہندو واپس جانے لگے۔ ایک نے کہا: ”ہماری طرف سے آپ کو اس وقت تک پناہ ہے جب تک آپ ہمارا مقابلہ نہیں کریں گے۔“

آپ نے جواب دیا: ”مجھے ایسی پناہ نہیں چاہیے۔“

ہندوؤں کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ آپ تلوار لے کر آگے بڑھے۔ تاجروں نے بھی مقابلہ کیا۔ مگر لٹیرے بہت زیادہ تھے۔ کچھ دیر مقابلہ جاری رہا۔ آخر تاجر قتل کر دیے گئے اور آپ کے جسم پر بھی بائیس زخم آئے۔ آپ زخموں سے چُور ہو کر گر گئے۔ ایک ہندو آگے بڑھا اور سر تن سے جدا کر دیا، بولا: ”اس نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔“

آپ ایک بار پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اس ہندو کا پیچھا کیا وہ بدحواس ہو کر بھاگا، ایک ہندو عورت نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو حیرت سے بولی: ”میاں جی! یہ کیا۔ یہ کیا؟“

آپ اسی وقت گر گئے۔

ڈاکوؤں کی لوٹ مار کے بعد سرائے والوں نے وہیں آپ کو دفن کر دیا۔

شہادت کے بعد آپ کو شاہ عبدالرحیم نے اپنے گھر میں دیکھا آپ کمرے کے دروازے پر خون میں لت پت کھڑے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے گھبرا کر پوچھا: ”باوا جان! آپ کب تشریف لائے؟ یہ آپ کو کیا ہوا؟“

آپ نے اپنے بیٹے کو پوری تفصیل بتا دی اور فرمایا: ”چند بھلے آدمیوں نے مجھے نریندر یا کی سرائے کے باہر دفن کر دیا ہے۔“

شاہ عبدالرحیم کی آنکھیں بھر آئیں، پوچھا: ”کیا آپ کے جسدِ مبارک کو وہاں سے لے آیا جائے؟“

آپ نے جواب دیا: ”نہیں! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں وہیں ٹھیک ہوں!“

اس کے بعد شاہ عبدالرحیم نے دیکھا آپ دھوئیں کی طرح فضا میں تحلیل ہو گئے۔

یہ فانی دُنیا اور اس کی پُر فریب دلچسپیاں اس حد تک دلفریب ہوتی ہیں کہ انسان اِن کے سحر میں جکڑے بنا نہیں رہ سکتا اور پھر وہ اِن دلفریبیوں میں اس حد تک گھِر جاتا ہے کہ اپنی تباہی و بربادی کا سامان پیدا کر لیتا ہے۔ انسان کو خراب کرنے والی یہ چیزیں اُسے بدی کی راہ پہ ایسا لگاتی ہیں کہ وہ منزل سے بھٹک جاتا ہے۔ اپنے مقام و مرتبے سے ایسا گرتا ہے کہ پھر سنبھل نہیں پاتا۔ انسان عبادت کرتا ہے۔ اپنے رب کی خوشنودی کے لیے اُس کی رضا کے لیے لیکن جب وہ اپنی اس عبادت گزاری پہ فخر کرتا ہے، نخوت سے رہتا ہے۔ تب وہ گویا خود کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ جانتے ہو معلم الملکوت ــــ نے کیوں شیطان کا درجہ پایا؟ کثرتِ عبادت کے باوجود مردودِ بارگاہ کیوں ہوا؟ صرف اور صرف اس لیے کہ وہ اپنی عبادت گزاری پہ نخوت سے رہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے خود کو گمراہی کی اُن اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیا کہ اب اُس کا اُن سے نکلنا ناممکن ہے۔"

مُرشد بولتا جا رہا تھا اور زیرِ تربیت مُرید گوش بر آواز تھا۔ وہ اپنے مُرشد کا لفظ لفظ غور سے سُنتا جا رہا تھا۔ مُرشد نے نصیحتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ انسان ماضی میں ایسی نادانیاں کرتا ہے کہ بعد میں اُن پہ افسوس کرتا رہتا ہے۔ وہ نادان اُن دِنوں کو غنیمت جان کر جو گزر رہے ہوتے ہیں اپنی فلاح و سیدھے راستے کا خیال نہیں رکھتا نہ وہ آنے والے دِنوں کا خوف رکھتا ہے اور جب انسان آنے والے وقت سے بے خبر ہو، بے خوف ہو تو گویا اُس نے خود کو جہنم کے بے رحم شعلوں کے حوالے کر دیا۔

مُرشد کی باتیں سُن کر اب تو مرید کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ ساتھ ساتھ کہتا جاتا: "ہائے افسوس میں تو کہیں کا نہ رہا ..... بھلا میں اس معیار کو کہاں پا سکوں گا۔ میری بربادی تو یقینی ہے۔ میں کیا کروں؟"

مُرشد نے رحمدلی سے مُرید کو دیکھتے ہوئے اپنی نصیحتوں کو جاری رکھا اور کہنے لگے "دیکھ کبھی اپنی حالت پہ فخر نہ کرنا سرسبز و شاداب باغات پہ غرور گویا جنت کے باغوں کی کمتری ثابت کرنے کے ہے۔ حالانکہ دُنیا کے سرسبز و شاداب باغ جنت کے باغوں کے

آگے کیا چیز ہیں۔ ہمیشہ مایوسی نجات میں احکامات کی پابندی کرنا۔ فراغت میں عبادت سے مُنہ نہ موڑنا۔ مخلوقِ خدا سے اخلاص سے پیش آنا۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اگر تم نے اس سے دوری اختیار کی تو تم نے اپنی ہلاکت اور بربادی کو دعوت دی۔"

مُرشد کی باتیں سُن کر مرید کے دل میں ایک آگ سی لگ گئی۔ وہ انتہائی بے چینی اور بیقراری سی محسوس کرنے لگا۔ اُس نے جو کچھ مُرشد سے سُنا تھا اُس کا ہر ایک عضو اس کا اثر قبول کر کے خدا کے خوف سے لرزاں تھا۔

یہ مُرید جس کا ہر ہر عضو خوفِ خدا سے لرزاں تھا اللہ کا وہ پُراسرار بندہ تھا کہ جب اُس کی آخری سانسیں پوری ہوئیں اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا تو رسم کے مطابق نہ تو اُس کا جنازہ اُٹھایا گیا نہ ہی مزار بنا۔ یہ مرید وہ مشہورِ عالم صوفی بنا جو زندگی بھر انسان ہی رہا۔ انسان جو خطا کا پُتلا ہے۔ سو اس کی سرزنش بھی ہوئی اور اسے نوازا بھی گیا۔ اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہونے والا اور پھر ان کی اصلاح کرنے والا، اللہ کی بنائی تقدیر پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے والا یہ عسکر ابوتراب خراسانی تھا۔ وہ صوفی جس نے سخت ترین آزمائشوں اور امتحانوں سے کامیابی سے گزر کر وہ مجاہدے اور نفس کشی اختیار کی کہ کوئی اُن کا ثانی نہ رہا۔

دوسری صدی ہجری کے چھٹے عشرے میں ایک خراسانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام چونکہ حصین تھا اسی لیے آپ کو بھی عسکر بن الحصین کہا جانے لگا۔ بچپن میں جب دینی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو اُنہوں نے زیادہ توجہ اُس حصہ پر دی جو عشقِ الٰہی پر مشتمل تھا۔ بچپن میں جب بچّہ کھیل کود میں دلچسپی محسوس کرتا ہے آپ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صحبت میں بیٹھنا زیادہ پسند کرتے۔ اُس دور میں حاتم اصم وہ مشہور صوفی تھے جن کی صحبت و ہم نشینی میں بیٹھنا آپ کو بہت ہی بھلا لگتا اور حاتم اصم بھی آپ کا خاص طور پر خیال رکھتے اور نصیحتوں سے فیض یاب کرتے رہتے اور بتاتے کہ عسکر اگرچہ تم نے اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے لیکن اب بھی میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں چند نصیحتوں کی ضرورت ہے تم انہیں غور سے سُنو اور ہمیشہ اُن پر عمل کے لیے خود کو آمادہ پاؤ۔"

چنانچہ اُس دن بھی حاتم اصم اپنے اس ہونہار مُرید کو نصیحتیں فرما رہے تھے اور عسکر ابوتراب آپکی باتیں غور سے سنتے اور روتے جاتے تھے۔

جیسے ہی حاتم اصم کی نصیحتوں کا سلسلہ ختم ہُوا۔ آپ نے اُن پر عمل شروع کر دیا۔ آپ اچھی طرح جان گئے تھے کہ اس چند روزہ دُنیا کی حقیقت کیا ہے۔ ایک بے وقعت و حقیر۔ جس کے بارے میں اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے کہ "اگر اللہ کے نزدیک اس دُنیا کی ذرا بھی قدر و قیمت ہوتی، حتیٰ کہ ایک مچھر کے برابر ہی کیوں نہ درجہ رکھتا تو اللہ کسی کافر یا منکر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔" پھر ایسی بے وقعت فانی چیز میں دِل لگانا اور اترانا کہاں کی دانشمندی ہے۔

چنانچہ اب آپ نے ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ اُن کی مشکلات و مصائب کو جانتے۔ اُنہیں دُور کرنے کے لیے اپنے ربّ جلیل سے مدد مانگتے۔ لوگوں کو آخرت کی تعلیم دیتے۔ اُنہیں راہِ حق دکھاتے۔ غرض جہاں وہ پہلے اپنا زیادہ وقت عبادت گزاری میں صرف کیا کرتے اب اُنہوں نے وہ وقت خدا کے بندوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔۔۔ لوگوں سے اس حد تک اچھا برتاؤ کرتے کہ جب وہ جانے لگتے تو آپ سے بے حد متاثر ہوتے کہ آپ کی عظمت کا احساس اُن میں اور جاگزیں ہوتا۔ لیکن عبادت اور ریاضت سے بھی آپ نے مُنہ نہیں موڑا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر خدا کی حمد و ثنا کرتے۔ نفسِ امارہ کو قابو میں رکھ کر مجاہدے اور ریاضت میں شب بیداری کرتے۔

حضرت عسکر کس قدر عظیم المرتبہ درویش تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے میں دیکھا کہ آپ جنّت میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں جنّت کے حسین اور مسحور کُن نظاروں کی بہتات تھی وہیں آپ کے اردگرد حسین حوروں کا بھی جمگھٹا لگا ہوا تھا، لیکن آپ حوروں سے بے نیاز اپنی عبادت میں مشغول تھے۔ حوروں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح آپ کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں لیکن آپ نے اُن پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ آخر جب حوروں نے یہ دیکھا کہ یہ درویش صفت نوجوان تو انہیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تو اُنہوں نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ذرا حرکت کی اور پھر اُن

ائے کرام نمبر

س کی سرسراہٹ سے آپ کی آنکھیں کھل گئیں۔ آپ نے جو ان حوروں کو اپنے نزدیک تر پایا تو بے رخی و بے نیازی سے مخاطب ہوئے۔

"تمہیں مجھ سے کیا کام ہے ؟ کیوں آئی ہو میرے پاس ؟"

حوروں نے آپ کو جو خود سے مخاطب پایا تو اپنی حکمتِ عملی کی ایک دوسرے کو لگاہوں ہی لگاہوں میں کامیابی کی داد دیتے ہوئے مسکرا کر آپ سے کہا "حضرت ہم آپ ہی کے لیے بھیجی گئی ہیں لیکن آپ تو اس قدر رُوکھے انسان لگ رہے ہیں کہ ایک نظر بھی ہم ال گوارا نہیں کر رہے۔"

یہ سن کر آپ نے فرمایا "میں تمہارے لیے وقت کہاں سے لاؤں ؟ اپنے خالق کے ذکر سے ہی مجھے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ میں اور طرف دھیان دے سکوں۔ پھر میں کس طرح تمہاری طرف متوجہ ہو سکتا ہوں۔ لہٰذا تم جاؤ اور میری عبادت میں خواہ مخواہ ل نہ ڈالو۔"

اس پر حوروں نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا "حضرت آپ کو ہمارا ذرا بھی خیال نہیں ہے ہم آپ کے لیے بھیجی گئی ہیں اور کی بے رُخی اور عدم توجہی کا یہ عالم ہے کہ اب تو دوسری حوریں ہماری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی ہیں جن میں ہمارے لیے اور تضحیک ہوتی ہے کہ ہم آپ کو اپنی طرف مائل ہی نہ کر سکیں۔ ہم میں اتنی کشش ہی نہیں کہ ایک انسان ہماری طرف ہو۔ آخر آپ ہم سے ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں ؟"

جب حوروں نے آپ سے اپنے گلے شکوے جاری رکھے اور آپ ان کی باتوں سے بے نیاز اپنی عبادت میں مشغول رہے تو جنت کے داروغہ کو مداخلت کرنا پڑی اور اس نے ان حوروں کو سمجھایا کہ "دیکھو...... یہ تو ابھی ذکرِ الٰہی میں اس حد تک ڈوب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اور جنت کی کوئی حسین شے اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر پائے گی۔ پھر کیوں تم بے فضول انہیں اپنی راغب کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ ہرگز نہ متوجہ ہوں گے۔ ہاں البتہ روزِ محشر تمہاری ان سے ضرور ملاقات ہو گی۔"

انسان حالتِ خواب میں کس قدر بے بس، بے اختیار ہوتا ہے اس کا سبھی کو علم ہے لیکن اللہ العالمین کے اس نیک بندے کا یہ کہ اسے حالتِ خواب میں بھی خود پر اس قدر ضبط اور اختیار ہے کہ حسین ترین حوریں بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔

آپ کے پاس اکثر عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو آپ سے محبت کرتے تھے۔ آپ کی میں بیٹھنا اپنے لیے مفید اور فلاح کے حصول کے لیے آخری چشمہ آپ کی صحبت کو گردانتے تھے۔ آپ بھی ان لوگوں کی باطنی ن اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں بھرپور توجہ سے اصلاح کرتے۔ ایک مرتبہ آپ کے ہاں جمع والے مریدوں میں سے ایک مرید انسانی فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے مرید سے بیٹھا راز و نیاز کے ساتھ تیسرے کی غیبت کر رہا تھا اور اس کی برائیاں گنوا رہا تھا اور جو کچھ وہ تیسرے شخص کی غیبت میں کہہ رہا تھا چوتھے مرید نے سن کر ذہن میں رکھنا شروع کر دیں۔ حضرت عسکر ابوتراب بھی اسی محفل میں بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھی یہ باتیں پڑ رہی تھیں، لیکن آپ لوکا نہیں، بلکہ درمیان میں ہی اٹھ کر چلے گئے اور نفیس و عبادت کرنا شروع کر دی۔

دیر بعد چوتھا مرید آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "حضرت کسی کی پیٹھ پیچھے اُس کی برائیاں گنوانا یا دوسرے لفظوں میں کیا معنی رکھتا ہے ؟"

آپ نے افسردگی سے جواب دیا "بہت برا فعل۔ خدا کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ۔"

سن کر مرید بولا "حضرت اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ نے اُس مرید کو کیوں نہیں ٹوکا جو اپنے کسی ساتھی کی بیٹھے غیبت گویا آپ نے جانتے بوجھتے اُسے گناہ میں ملوث ہونے دیا۔"

آپ نے انتہائی کرب سے جواب دیا "روکا تو میں نے تمہیں بھی نہیں تھا۔ جب تم چوری چھپے اُس کی ٹوہ میں لگے تھے تم دونوں

ہی غلطی پر ہو اور تم دونوں کی غلطی تمہاری نہیں بلکہ میری ہے یقیناً میری ہی تعلیم و تربیت میں کوئی نقص ہے۔ کوئی ادھورا پن ہے جو میں تم لوگوں کی اصلاح نہ کر سکا۔ اسی لیے میں اس کی باتوں کے درمیان ہی اُٹھ کر چلا گیا تھا اور خدا کے حضور توبہ واستغفار کی۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے چاہنے والوں میں جو کمزوریاں ہیں جو درحقیقت میری ہی کمزوریاں گردانی جائیں گی۔ اُنہیں دُور کرے۔"

ایک مرتبہ آپ اپنے مریدوں کے درمیان بیٹھے وعظ و نصیحت کر رہے تھے اور کہنے لگے "لوگو ہمیشہ ریاکاری سے بچو۔ بہت ہلاکت خیز بات ہے۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں کہ مجھ سے کہیں کوئی ریاکاری نہ ہو جائے۔ جو میری تمام عبادتوں کو دیمک کی طرح چاٹ لے۔"

ایک مرید نے پوچھا "حضرت ریاکاری کا مطلب کیا ہے؟"

آپ نے اُن کی بات سن کر چند لمحے چپ سادھ لی۔ پھر نرمی سے بولے۔ "دیکھو اس وقت تو میں تمہیں ریاکاری کا کوئی مفہوم نہ سمجھا پاؤں گا۔ ہاں البتہ تم چند دن ٹھہر جاؤ۔ میں پھر تمہارے سامنے اس کا عملی ثبوت پیش کر دوں گا۔ تب تم زیادہ و اسے سمجھ پاؤ گے کہ ریاکاری کیسے کہتے ہیں۔"

مرید آپ کی یہ بات سن کر چپ ہو رہا۔ اتفاق سے کچھ عرصہ بعد اُس مرید کی معاشی حالت بہت خراب ہو گئی اور نوبت فاقوں تک آ گئی۔ ایک دن وہ بیچارہ بھوکا پیاسا آپ کے پاس اس اُمید پر آ بیٹھا کہ شاید اُس کا مرشد اُس کی حالت سے اندازہ لگا لے اور کچھ کھانے کو مل جائے۔ چنانچہ وہ انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ بیٹھا رہا، لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ ابھی اُسے بیٹھے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک شخص حضرت عسکر کی خدمت میں خربوزوں سے بھرا ایک ٹوکرا لے آیا۔ خربوزے دیکھ کر مرید کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ خیال کرنے لگا کہ شاید مرشد کو اُس کی حالت کا اندازہ ہو گیا ہے، لیکن تھوڑی دیر بعد اُس کی حیرت اور نا اُمیدی کی انتہا نہ رہی جب حضرت عسکر نے وہ خربوزے دُور بیٹھے مریدوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے اور اُس طرف آئے ہی نہ جہاں یہ بیچارہ فاقوں کا مارا حال سے بے حال ہوا بیٹھا تھا۔ مصیبت جھیلنے میں صابر تھا۔ چنانچہ چپ بیٹھا رہا اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا اور اُن کو حسرت سے دیکھنے لگا جو خوشی خوشی خربوزے کھاتے اور چھلکے پرے پھینکتے جا رہے تھے۔ ان میں مرید کے چند جان پہچان والے بھی تھے۔ اب مرید اس آس میں تھا کہ شاید کوئی ازراہِ تکلف اُسے بھی اپنے ساتھ شامل کر لے لیکن کسی نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھا اور کھانے میں ایسے مصروف ہوئے کہ سب کچھ صاف کر کے ہی سر اُوپر اُٹھایا۔ مرید کا برا حال اور کیفیت اضطرابی۔ وہ آس بھری نظروں سے کھانے والوں کو تکتا کبھی مرشد پر نگاہ ڈالتا جو نجانے کن سوچوں میں گم تھے۔ آخر جب مرید کھا پی کر جانے کے لیے اُٹھے تو یہ بیچارہ بھی ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہوا، لیکن آپ نے اُسے واپس نہ جانے کا اشارہ کر کے پاس بلایا۔ مرید خوش ہوا کہ شاید اب کچھ کھانے کو مل جائے اور بھوک سے جو برا حال ہے وہ دُور ہو لیکن جلد ہی یہ خوشی بھی دُور ہو گئی جب اُس نے کہتے سنا کہ تم یہیں بیٹھو گے جب تک میں ایک جگہ سے ہو کر نہیں آ جاتا۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

مرید یہ سن کر بھوک سے مچل ہی اٹھا اور بولا "حضرت جہاں آپ جا رہے ہیں مجھے بھی ساتھ لیتے جائیں۔"

مرید کی بات سن کر آپ نے ناگواری سے کہا "کیا..... ساتھ لیتا جاؤں۔ بھئی میں کسی دعوت میں جا رہا ہوں جہاں بلایا گیا ہے۔ بھلا وہاں تمہارا کیا کام؟ کس جواز سے لے جاؤں۔"

آپ کی بات سن کر مرید دل ہی دل میں بولا "واہ یہ جواز کی بھی خوب رہی۔ میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں اور مجھ دوسروں کو خربوزے کھلا دیئے اور خود دعوت اڑانے جا رہے ہیں اور مجھے بھوک سے مرنے کے لیے یہیں چھوڑے جا رہے ہیں۔"

حضرت عسکر نے جو مرید کو یوں سوچوں میں گم دیکھا تو بولے "کیوں..... کیا بات ہے تم کن سوچوں تک پہنچ گئے ہو؟"

مرید بولا "حضرت جہاں آپ جا رہے ہیں بس مجھے ساتھ ہی لیتے جائیں۔ یہاں اکیلے میں میرا دل نہیں لگے گا میں

اہوں کہ وہاں ایک لقمہ تک نہیں لوں گا۔"

مُرید کی یہ بات سُن کر حضرت عسکر ناگواری سے بولے "تیری عقل کو کیا ہوا ہے؟ ایک لقمہ تک نہیں لوں گا.... بھلا یہ کیا بات
ں وہاں ہر شخص کھانے میں مصروف ہوگا اور میں تمہیں اُن کا منہ تکنے کے لیے ساتھ لیجاؤں۔"

ھر مُرید پھر بھی ڈھٹائی سے بولا "حضرت میں کہہ رہا ہوں کہ میرا یہاں دِل نہیں لگے گا۔ بس آپ مجھے ساتھ لے جائیں میں باہر
رک جاؤں گا۔"

آپ نے مُڑتے ہوئے حتمی فیصلے کے طور پر کہا "دل کی بھی خوب رہی۔ میاں خود کو مصروف رکھو گے تو یہ من بھی بہل ہی جائے
ل بس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک لوٹ آؤں گا۔ تم تب تک یہ چھلکے باہر پھینک دینا" یہ کہہ کر آپ باہر نکل گئے۔

اب مُرید کی حالت دیدنی تھی۔ مُرشد کے باہر نکلتے ہی اُس نے اپنا سر پیٹ لیا اور دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگا کہ کاش
آج سیدھا یہاں نہ آتا اور کسی دوست کے پاس ہی چلا جاتا کم سے کم وہاں کھانے کو تو کچھ مل جاتا۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ آج اللہ
میرے مرنے کے لیے مُرشد کی جگہ ہی پسند کی ہے۔ میں تو اب یقیناً بھوک کے ہاتھوں ہی یہاں جان دے دوں گا۔ یہ سوچتے
تے اُسے مُرشد کا حکم یاد آیا اور اُس نے نفرت سے چھلکوں کو گھورا اور کہنے لگا "بدنصیبی کی انتہا ہے۔ کھائیں لوگ اور بھوک کے
ے پیٹ رکھنے والے اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینکیں۔" پھر وہ بادلِ نخواستہ اُٹھا اور چھلکے اکٹھے کر کے ایک جگہ ڈھیر کرنے لگا۔ چھلکے
ی تر تازہ تھے اور اُن میں سے سوندھی سوندھی خوشبو اب بھی اُٹھ رہی تھی جو مُرید کی بھوک کو اور تیز کر گئی۔ اب اُس بدقسمت
ضبط کا یارا نہ رہا۔ اُس نے ایک کھائی ہوئی قاش کو اُٹھایا جو دوسروں سے نسبتاً صاف تھی۔ اُس پر گودا ابھی اچھا خاصا لگا ہُوا
ابھی وہ مُنہ کی طرف لیجا کر اُسے کھانے کی نیت ہی کر رہا تھا۔ اچانک حضرت عسکر اُس کے سر پہ آن ٹپکے اور بیچارہ شرم کے
ے پانی پانی ہو گیا اور جلدی سے خربوزے کی قاش جو لمحوں بعد اس کے ہونٹوں سے لگنے والی تھی اُسے اس تیزی سے پھینکا
کہ اُسی ٹوکری میں جا گری جس میں وہ چھلکے اکٹھے کر رہا تھا۔ پھر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

مُرشد نے اُسے دیکھ کر حیرت سے کہا "یہ تُو کیا کر رہا تھا؟"

اُن بیچارے کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا تھا، جو دیتا۔ سو خاموش ہی کھڑا رہا۔

حضرت عسکر بولے "میاں میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا اور تم ہو کہ چپ سادھے کھڑے ہو۔ آج تمہیں یہ ہو کیا گیا ہے۔ جب سے
اسی طرح کی حرکتیں کر رہے ہو۔"

یہ سُن کر مُرید بول ہی اُٹھا اور کہنے لگا "حضرت آپ کو تو میرے تمام حالات سے آگاہی ہے۔ میں آج فاقوں بھرا پیٹ لے کر
یہ آیا تھا کہ آپ کے ہاں کھانے کو کچھ مل جائے گا لیکن یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ دوسرے لوگ۔ تو آپ کے ہاں کھانے
کے طالب ہوئے مگر مجھے کچھ نہ مل سکا۔ ایسے میں، میں اگر چھلکے نہ کھاؤں تو اور کیا کروں؟"

آپ نے اُسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا "لیکن تم نے تو اپنے خدا سے عہد کیا تھا کہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ
دنیا ترک کر کے تصوف اختیار کر دگے لیکن یہ کیا.... کہ چند ہی فاقوں نے تمہیں اتنا بے حال و بے صبرا بنا دیا ہے کہ اپنا عہد
چھلکے تک کھانے پر آمادہ ہو گئے۔"

مُرید نے آپ کی باتیں سُنیں تو شرم سے زمین میں گڑھا جانے لگا۔ پھر آپ نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہوگا کہ ایک
تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ریا کیا ہوتی ہے۔ آج میں تمہیں اس ریاکاری کا مفہوم سمجھاؤں گا۔"

مُرید جو بھوک سے نڈھال تھا۔ حیرت سے مُرشد کو دیکھنے لگا۔ ایک طرف اُس کا بھوک سے بُرا حال تھا اور مُرشد یہ بات
رہے تھے پھر بھی اس معاملے سے پہلو تہی کرتے ہوئے اُسے بجائے کھانے کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے روک
رہے تھے چنانچہ اُس نے صاف صاف کہنا شروع کیا کہ "حضرت آپ کچھ تو میری حالت کا اندازہ لگائیں۔ مجھے بھو[illegible] ہی اُس

حد تک بے حال کر رکھا ہے کہ اب کسی اور چیز کی چاہ ہی نہیں رہی۔ سوائے کھانے کے، اور آپ ہیں کہ مجھے باتیں سنا کر پیٹ بھرنے کا طریقہ سمجھا رہے ہیں۔"

آپ نے یہ سن کر فرمایا: "بس یہی رویہ جو تم اس وقت اپنائے ہوئے ہو ریاکاری کہلاتا ہے۔ تم نے اپنے رب سے عہد کیا تھا کہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ گے اور دُنیا ترک کر کے خدا کے آگے صبر و تحمل سے رہو گے، لیکن تمہاری حالت کا یہ عالم ہے کہ تم اپنے عہد سے منکر ہو کر دوسروں کی عدم موجودگی میں چھلکے تک کھانے کے لیے تیار ہو۔ یہی کیفیت ریاکاری کے زمرے میں آتی ہے۔"

مُرید بیچارہ آپ کی بات سن کر شرمندہ ہو گیا اور بولا "حضرت میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں دُنیا ترک کر سکوں۔ میں تصوف کے اس کٹھن راستے پر چلنے کا خود کو اہل نہیں پاتا۔ اس لیے میں اس تصوف کو چھوڑتا ہوں۔"

یہ سن کر آپ نے جواب دیا: "اچھا جیسی تیری مرضی۔ ویسے کیا تجھے یہ خود بھی عجیب سا نہیں لگتا کہ انسان چند فاقوں سے ہی دہشت زدہ ہو کر خدا اور تصوف سے دل برداشتہ ہو جائے۔"

مُرید آپ کی باتوں سے شرمندہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ بمشکل مُنہ سے بس اتنا ہی کہہ سکا "حضرت میں شرمندہ ہوں آئندہ آپ سے اس قسم کی باتیں ہرگز نہ کیا کروں گا۔"

مُرید کی یہ بات سن کر آپ نے کہا "نہیں.... ایسا کہنے سے اصلاح نہیں ہوتی، بلکہ تو وعدہ کر کہ تو ثابت قدمی سے اس کٹھن راہ کو طے کرے گا اور ہر مُشکل کو صابر بن کر جھیلے گا۔" اور پھر مُرید نے اس کا عہد کیا۔

انسان چاہے کم تر درجے کا ہو یا اعلیٰ درجے کا ریاضت میں یکتا ہو یا گناہ گار نفس وہ سبھی کے ساتھ ہوتا ہے۔"

ایک دن آپ کسی جنگل میں عبادت کی غرض سے داخل ہوئے یہ ایسی جگہ تھی جہاں آپ پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ آپ نے کسی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ چنانچہ عبادت کر کے جب اُٹھے تو آپ کو یاد ہی نہ رہا کہ میں جنگل میں کس راستے سے داخل ہوا تھا۔ پریشانی کے عالم میں کبھی دائیں جاتے اور کبھی بائیں مگر ہر طرف جنگل ہی پھیلا ملتا اور دُور دُور تک کوئی انسانی بستی نظر نہ آتی۔ اسی پریشانی میں رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا۔ چلتے چلتے آپ کی ٹانگیں بھی اب درد سے کپکپانے لگی تھیں بھوک بھی شدت سے ستا رہی تھی۔ آپ نے دل ہی دل میں خدا کو مخاطب کیا۔

"اے پروردگار..... راستہ تو مل نہیں رہا۔ صبح سے شام ہونے کو آئی ہے۔ بھوک سے بھی بُرا حال ہے۔ کاش مجھے ایک انڈہ اور روٹی مل جاتی۔"

ابھی آپ یہی خواہش کر ہی رہے تھے کہ اچانک آپ کو جنگل میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ آپ نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا پھر چند لمحوں بعد آپ کو انسانی آوازوں کے شور و غل کی آواز اور بہت سے قدموں کے چلنے کی گونج سنائی دی۔ آپ حیرت زدہ ہو کر وہیں کھڑے ان آوازوں کو نزدیک سے نزدیک تر ہوتا سن رہے تھے اور پھر ایک چھوٹا سا مجمع آپ کے سامنے آ گیا۔ جیسے ہی اُس ہجوم میں سے ایک شخص کی نظر آپ پر پڑی تو وہ چلا کر بولا: "ارے ہمارا مجرم تو یہاں ہے اور ہم نے خواہ مخواہ میں ہی جنگل چھان مارا۔"

دوسرے لوگوں نے اس شخص کی آواز پر چونک کر آپ کو دیکھا اور پھر آپ کی طرف لپکے۔ ایک نے آگے بڑھ کر آپ کو پکڑا اور درشت لہجے میں کہنے لگا: "بالآخر ہمارے ہاتھ لگ ہی گئے ناں۔ اب سیدھی طرح یہ بھی بتا دو کہ ہمارا مال کہاں رکھا ہے اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلا تو ہم ٹیڑھی انگلیوں سے بھی گھی نکال لیتے ہیں۔"

آپ نے جب یہ ماجرا دیکھا تو گھبرا گئے اور پریشان ہو کر بولے: "مال کیسا مال؟ ہم نے کسی کا مال نہیں چرایا، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"
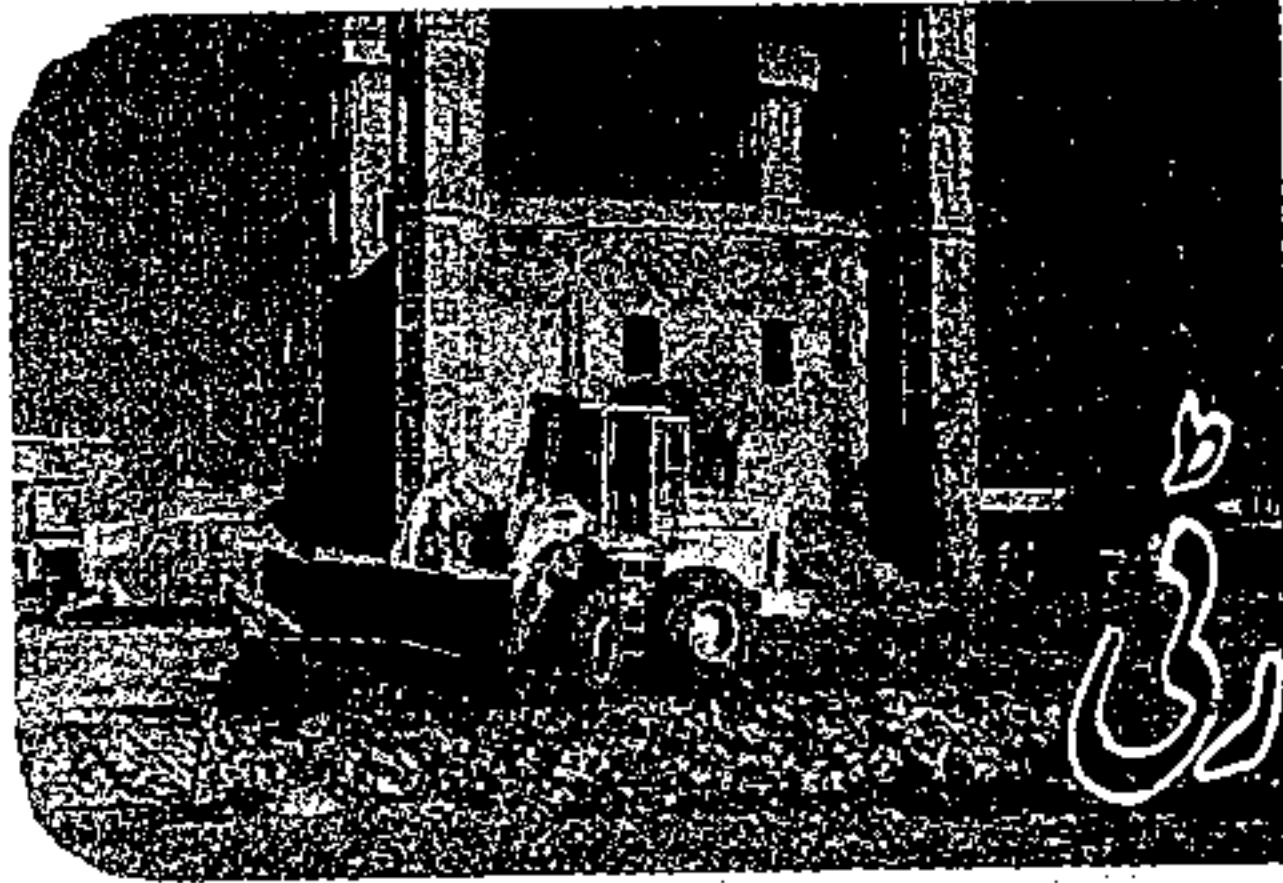
عروس البلاد لاہور کی تعمیر و ترقی کا نشان

لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے وزیرِ اعظم پاکستان جناب میاں محمد نواز شریف کی سرپرستی میں لاہور شہر کی بیشتر بڑی سڑکوں کی تعمیرِ نو، کشادگی اور کارپٹنگ کا کام شروع کر دیا ہے۔ شہر میں کئی جگہوں پر فلائی اوورز اور زیرِ زمین راستوں کی تعمیر کے منصوبے مختلف مراحل میں داخل ہو چکے ہیں۔ اندرونِ شہر کی تاریخی عمارتوں کی بحالی اور شہری سہولتوں کی حالت کو بہتر بنانے کا کام تیزی سے جاری ہے۔ یہ تمام منصوبے زندہ دلانِ لاہور کے شہرِ بے مثال کو حسین سے حسین تر بنانے کی کوششوں کا حصہ ہیں۔

DA لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی

یہ سُن کر وہ شخص غصّے میں اکڑ گیا اور آپ کو ایک تھپڑ رسید کر مارا پھر غصّے سے بولا "اب مال کا بھی علم نہیں۔ تم شکل سے تو بھلے مانس دکھتے ہو، لیکن ہو بڑے چور اور وہ بھی پکّے۔ اب سیدھی طرح اُگل دو کہ ہمارا مال کہاں چھپایا ہے۔ ورنہ یاد رکھو یہیں دو ٹکڑے کر کے اپنی راہ لیں گے۔"

یہ سُن کر آپ بے رُخی سے بولے "جب مَیں کہہ رہا ہوں کہ مجھے کسی مال وال کا علم نہیں۔ اب چاہے تم میرے دو ٹکڑے کر دو یا دو سو۔ حقیقت تو یہی رہے گی۔"

یہ سُن کر نوجوان غصّے میں آگئے اور خنجر نکال کر آپ پر حملہ کرتے ہوئے کہنے لگے "اس انسان کی ہمّت دیکھو پاؤں قبر میں ہیں۔ کرتوت یہ کہ مال چُرا کر پارسا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تم کتنی ڈھٹائی سے اقرار کرتے ہو کہ مال تم نے نہیں لیا۔"

وہ نوجوان بڑی تیزی سے آپ پر خنجر سے وار کر رہے تھے اور آپ پھرتی سے اُن کے وار کو اپنے ہاتھوں پر روک رہے تھے۔ اس سے جسم تو زخمی ہونے سے بچ گیا تھا۔ مگر ہاتھ بُری طرح لہولہان ہو چکے تھے۔ لوگوں نے شور وغل سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا اور آپ کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ اتنے میں ایک بوڑھا سا شخص مجمع میں داخل ہوا اور پوچھنے لگا "یہ کیا ماجرا ہے۔ کیوں اتنا شور وغل برپا ہے اور یہ کون لڑ رہے ہیں۔"

مجمع میں سے کسی نے اُسے بتایا کہ یہ شخص جو ہمارے نوجوان کا مقابلہ کر رہا ہے پرلے درجے کا چور ہے۔ مال ہضم کر کے اقرار سے انکاری ہے لیکن ہم بھی اسے مار مار کر اُگلوا ہی لیں گے۔ مر جائے تو اور بات ہے۔ آخر چور کو کچھ سزا تو ملنی ہی چاہیئے ناں۔"

اُس شخص کی بات سُن کر وہ بوڑھا آگے بڑھا اور کہنے لگا "اچھا ایسا ڈھیٹ چور ہے کہ چوری کا علم بھی ہو چکا ہے اور مان بھی نہیں رہا۔ مَیں بھی تو دیکھوں ذرا ایسے انسان کو۔"

وہ بوڑھا شخص جو درحقیقت قافلہ کا امیر تھا۔ آگے بڑھ کر چور کو دیکھنے لگا۔ لوگوں نے بھی اُس کے لیے راہ چھوڑ دی تھی۔ اُس نے جب زخمی حالت میں آپ کو دیکھا تو سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ وہ آپ سے اچھی طرح واقف تھا۔ چنانچہ آپ کو اس حال میں دیکھ کر اُس کے ہواس جاتے رہے۔ وہ پریشانی سے بول اُٹھا "ارے بدبختو یہ تم نے کیا کر ڈالا جسے مار رہے تھے جانتے بھی ہو کہ وہ ہے کون۔"

لوگوں نے جب امیرِ قافلہ کے لہجے میں پریشانی اور غصّے کا عنصر دیکھا تو حیرت سے ٹھٹک کر رہ گئے اور سوچنے لگے کہ آخر یہ شخص کون ہو سکتا ہے جس کے لیے امیرِ قافلہ اتنی پشیمانی کا اظہار کر رہا ہے۔ سو سبھی اُس کا مُنہ سوالیہ انداز میں تکنے لگے۔

امیرِ قافلہ بولا "نادانو! یہ تم نے کیا ظلم کیا۔ جانتے ہو یہ کون ہیں؟ بدبختو! تم نے کبھی ابوتراب بخشی کا نام سُنا ہے؟"

"ابوتراب بخشی؟" سبھی نے زیرِ لب کہا اور حیرت سے بوڑھے کا مُنہ تکنے لگے۔

بوڑھا بولا "ہاں ابوتراب بخشی..... مشہور صوفی جسے تم نے خنجروں کے گھاؤ لگا لگا کر زخمی کر ڈالا۔ خدا تمہارے حال پر رحم کرے جانے اب کیا ہو؟"

یہ سُن کر مجمع کی حالت غیر ہو گئی۔ خاص طور پر وہ نوجوان جو آپ پر وار کر رہے تھے خوف و رنج کے ساتھ ساتھ کانپنے لگے۔ نوجوان اور دوسرے لوگوں نے فوراً آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنا شروع کر دی۔ وہ روتے بھی جاتے اور گڑگڑا کر معافی بھی مانگتے جاتے۔ وہ بوڑھا آگے بڑھا اور بھرّائی ہوئی آواز میں چلّا کر بولا "بدبختو اب رونے سے کیا حاصل انہیں خیمے میں چلو اور ان کی مرہم پٹی کرو۔"

قافلے کے ہمراہ طبیب و جرّاح تھے، اُنہوں فوراً آپ کی مرہم پٹی کی۔ اب آپ خیمے میں ایک آرام دہ بستر پر دراز تھے اور نوجوان جو آپ کی جان لینے کے درپے تھے اس وقت آپ کے پاؤں پکڑے بیٹھے تھے اور رو رو کر کہہ رہے تھے کہ "حضرت ہم اُس وقت تک آپ کے پاؤں نہیں چھوڑیں گے جب تک آپ ہمیں معاف نہ کر دیں۔"

امیر قافلہ نے بھی آپ سے کہا "حضرت یہ نادان ہیں۔ جوانی کے جوش میں عقل سے پیدل۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔"
آپ نے نرمی سے فرمایا نہیں...... ان کا کوئی قصور نہیں۔ مجھے ان سے ذرا برابر بھی شکایت نہیں بلکہ یہ تو میرے اعمال کا پھل تھا۔ جو مجھے بھگتنا پڑا۔"

لوگوں نے آپ کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلایا اور نوجوان بھی اب کسی قدر مطمئن ہو کر آپ کے پاؤں دابنے لگے اتنے میں وہ بوڑھا شخص آپ کے لیے کھانا لایا جو انڈہ اور روٹی پر مشتمل تھا۔ کھانے کو دیکھ کر آپ کی ہچکیاں بندھ گئیں اور آپ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ساتھ ساتھ خدا سے توبہ واستغفار بھی کرتے جاتے۔ سبھی نے آپ کی اس کیفیت کو غور سے دیکھا اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ آخر بوڑھا آدمی ہی آگے بڑھا اور بولا "قابل عزت درویش یہ کیا ماجرا ہے کہ کھانا دیکھ کر آپ نے رونا شروع کر دیا کہیں آپ کو وہ زخم تو یاد نہیں آگئے جو ہم نے آپ کو لگائے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ ہماری بدقسمتی ہوگی۔"
یہ سن کر آپ بولے "نہیں...... یہ بات نہیں۔" پھر آپ نے انہیں وہ پوری بات بتائی جس کی وجہ سے انہیں یہ سب بھگتنا پڑا۔ کہ کس طرح انہوں نے اپنے مرید کو خربوزے کھا کے یہ ذلیل کیا تھا اور خدا کو جب یہ بات پسند نہ آئی تو اس نے کس طرح آپ کو اس انڈے اور روٹی کی خاطر ذلیل کیا۔ یہ بتا کر آپ پھر رونے لگے۔
یہ سن کر نوجوانوں کی حالت بھی غیر ہوگئی اور انہوں نے بھی رونا شروع کر دیا۔ آپ نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پوچھا "ارے تم کیوں روتے ہو؟ مجھے تو میرے کیے کی سزا ملی اور جو غلطی مجھ سے ہوئی میں اس کے لیے رو رہا ہوں۔ تم کیوں روتے ہو؟"
وہ نوجوان بولے "حضرت جب ذرا سی غلطی کے لیے آپ جیسے عظیم عبادت گزار درویش کو یہ سزا بھگتنا پڑی تو پھر ہم گناہ گاروں کا کیا انجام ہوگا جنہوں نے آپ کو اتنا دکھ پہنچایا۔"
یہ سن کر آپ نے شفقت سے فرمایا "میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرے خدا نے بھی تمہیں معاف کیا۔ اس لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب مجھے ہی تم سے کوئی گلہ نہیں پھر تم کیوں اس قدر غمزدہ ہو۔"
اب آپ کا استغنا اور توکل عروج کے اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ جہاں آپ اپنی ضروریات سے بالکل ہی بے نیاز ہو گئے تھے اور خدا پہ توکل کی انتہا یہ تھی کہ آپ راضی برضائے الٰہی ہو چکے تھے جس لباس میں خدا نے رکھنا جو کھلانا وہ آپ نے کھا لینا۔ گویا اب آپ خدا سے بھی اپنی حاجت بیان نہ کرتے تھے۔
آپ اکثر عبادت کی غرض سے جنگلوں میں نکل جاتے۔ اس طرح ایک دن آپ اپنے دو مریدوں کے ساتھ جنگل میں جا رہے تھے کہ آپ اپنے مریدوں سے بچھڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ جنگل گھنا اور خوفناک تھا۔ درختوں کی شاخیں بلندی پر جا کر اس طرح آپس میں ملی تھیں کہ روشنی کی کرن تک زمین پہ نہ پہنچ سکتی تھی۔ سورج کی کرنوں سے بے نیاز جنگل آپ کو اور بھی ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ آپ نے دل میں سوچا اس قدر وحشت ناک جنگل میں سوائے جانوروں کے انسان تو رہ ہی نہیں سکتا۔ اب تو آپ کو بھی اس جنگل میں تنہائی کے احساس سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور آپ تیز تیز قدم اٹھاتے جنگل سے باہر جانے والی راہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔
دفعتاً آپ کو محسوس ہوا کہ آپ جنگل میں اکیلے ہی نہیں چل رہے بلکہ آپ کے ساتھ کسی اور انسان کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دے رہی ہے۔ آپ خوفزدہ ہو کر رک گئے۔ لیکن آپ کے رکتے ہی ان قدموں کی چاپ بھی ساکت ہو گئی۔ آپ اسے اپنا وہم سمجھ کر پھر چل پڑے لیکن آپ نے اپنے پیچھے پتوں کی سرسراہٹ سے اندازہ لگا لیا کہ کوئی آپ کا پوشیدہ رہ کر پیچھا کر رہا ہے۔ آپ کے ذہن میں فوراً کسی درندے کا خیال ابھرا لیکن پھر خود ہی اس کی یہ کہہ کر نفی کر دی کہ اگر کوئی درندہ ہوتا تو اب تک حملہ کر چکا ہوتا۔
چنانچہ اب کی بار آپ نے وہیں رک کر بلند آواز سے کہا "کون ہے؟ کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو۔ جو بھی ہے سامنے آ کر سامنا

کرے۔ کیوں پریشان کرنے کی ٹھانی ہے۔"
آپ کی آواز سُن کر آپ کے نزدیک کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ پھر اچانک آپ کے سامنے ایک سیاہ فام خوفناک شکل والا انسان نمودار ہوا۔ جس کے سفید چمکتے دانت اُس کے سیاہ جسم پر عجیب سے لگ رہے تھے۔ آپ نے اُسے خوفزدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تُو کون ہے؟ اور میرا پیچھا کس نیت سے کر رہا ہے"
وہ شخص یہ سُن کر آپ کا جواب دینے کی بجائے خوفناک سی ہنسی ہنسنے لگا۔
آپ نے دوبارہ پوچھا "تم بتاتے نہیں کہ کون ہو تم۔ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔"
یہ سُن کر وہ شخص اپنی خوفناک مسکراہٹ سے لبوں کو پھیلاتے ہوئے بولا۔
"حضرت میرا نام اور میرے متعلق جان کر آپ کیا کریں گے۔ آپ اپنے بارے میں ارشاد فرمائیں کہ آپ کون ہیں اور اس جنگل بیابان میں کہاں بھٹک رہے ہیں۔"
آپ نے اُس کا جواب دینے کی بجائے اُلٹا اُسی سے سوال کیا۔
"تمہارے خیال میں میں کون ہو سکتا ہوں؟"
وہ شخص بولا "شکل و لباس سے تو تم مسلمانوں جیسا حلیہ رکھتے ہو لیکن میں تو دل کے ناطے لوگوں کو دیکھتا ہوں اور تم دل سے مجھے مسلمان دکھائی نہیں دیتے۔"
یہ سُن کر آپ غصے سے بولے۔ "اے شخص کچھ خدا کا خوف کر۔ تُو مجھے نہیں جانتا کیا۔ میں اللہ کا نام لیوا ہوں اور تُو مجھے غیر مسلم بنائے دے رہا ہے۔"
یہ سُن کر وہ شخص بولا "حضرت اگر آپ مسلمان ہیں اور پھر اللہ کے نام لیوا خاص بندے تو پھر مجھے یہ بتائیں کہ جس بندے کے دل میں خدا بستا ہے اُس میں کسی دُوجے کی کہاں دہشت باقی رہتی ہے اور تم ہو کہ مجھ جیسے بے ضرر انسان کی شکل دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو گئے۔"
یہ سُن کر آپ بہت شرمندہ ہو گئے اور دل میں سوچا یہ بندہ بات تو بہت اچھی کر رہا۔ اُس کے بعد آپ نے اُس شخص کی طرف دیکھنے کے لیے سر اُٹھایا تو وہ شخص غائب تھا۔ آپ نے اُس بھیانک شخص کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ پھر آپ کو وہ شخص دراصل خضر تھے۔ خضر الاولیا ر جو ولیوں کے دِلوں پر تعینات تھے اور انہیں اللہ سے بھاگنے کی صورت میں راہِ راست کی طرف لانے کے ذمہ دار تھے کیونکہ اللہ سے بھاگنا بربادی کے مترادف اور واپس حق راہ کی طرف آنا اور اللہ سے رجوع کرنا راست گاری ہے اور خدا اپنے بندوں کی تباہی و بربادی نہیں چاہتا۔
اسی جنگل میں آپ کی ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جو بالکل تنہا بغیر کسی سامان کے پیدل چلا جا رہا تھا۔ آپ نے اُسے لیا اور حیرت سے پوچھا۔ "اے شخص تُو اکیلا ہی بنا کسی زادِ راہ کے نکل کھڑا ہوا ہے۔"
وہ شخص آپ کو حیرت سے دیکھنے لگا اور پھر بولا "اکیلا...... اکیلے سے کیا مُراد ہے تمہاری۔ انسان کبھی اکیلا بھی رہ سکتا ہے۔"
آپ نے دل میں سوچا یقیناً اس بندے کے ساتھ ساتھی بھی ہوں گے جو پیچھے رہ گئے ہوں گے۔ آپ نے پھر بھی اُس سے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن انسان زادِ راہ تو کم از کم ساتھ لے کر چلے۔ نجانے کب کہاں ساتھیوں سے بچھڑ جائے۔"
یہ سُن کر وہ شخص عجیب سی نظروں کے ساتھ آپ کو دیکھتے ہوئے بولا "حضرت یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا ساتھی اور مجھ سے الگ اے شخص تُو کیا بات کر رہا ہے۔ میرا ساتھی تو میری شہ رگ کے نزدیک تر ہے۔ جب مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے تو پھر میں کسی کو کیوں اپنا ساتھی بنا کر ساتھ لیے پھروں۔"
یہ سُن کر آپ ندامت میں ڈوب گئے اور خود سے بولے افسوس میں ابھی تک اُن رموز سے آگہی حاصل نہیں کر پایا جو

جاننا ضروری ہے۔

آپ کے عہد میں ایک اور مشہور و بزرگ کامل درویش بایزید بسطامی بھی رہا کرتے تھے۔ ابو تراب خراسانی کو بھی اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ اُن کا بڑے عزت و احترام سے تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک مرید کو جو سب سے زیادہ عبادت گزار تھا کہا کہ "تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تو اب بایزید بسطامی کی صحبت میں جایا کر۔" مرید آپ کی بات سنتا مگر ٹال جاتا لیکن آپ نے بھی اپنا اصرار جاری رکھا۔ ایک دن آپ نے پھر اپنے اُس مرید کو ہدایت کی اور کہا "دیکھ میں تجھے لاتعداد مرتبہ کہہ چکا ہوں لیکن تو میری بات مانتا ہی نہیں۔ آخر تجھے بایزید بسطامی جیسے صوفی کی خدمت میں کونسی چیز حاضر ہونے سے روک رہی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تو یوں مجھے ٹال رہا ہے"؟

مرید آپ کی بات سن کر ذرا تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"حضرت آپ بار بار اصرار کر کے مجھے دلی ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ بھلا کہاں میں اور کہاں بایزید بسطامی۔ آپ تو خود میری عبادت گزاری سے واقف ہیں۔ مجھے تو خدا کا دیدار تک ہو چکا ہے۔ بھلا میں اب کیوں بایزید بسطامی کی خدمت میں جا کر اُن کا دیدار کروں"؟

مرید کی بات سن کر آپ نے فرمایا "یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے آج۔ اللہ پر اور اپنی عبادت پر اتنا غرور انسان کو تباہی و بربادی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ تو کیوں اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ جو میں کہتا ہوں تو اُس پر عمل کر اور جا کر بایزید بسطامی کی خدمت میں حاضر ہو اُن کا دیدار — خدا کے دیدار سے افضل ہے"۔

وہ مرید آپ کی یہ بات سن کر حیرت سے منہ کھولے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر ذرا تشویش زدہ لہجے میں بولا "حضرت جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں آپ نے اس پر غور کیا کہ آپ نے کس قدر سنگین بات کہی ہے"؟

آپ نے جواب دیا "نادان تو میری بات سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر۔ مجھے یہ بتا کہ تو نے کس خدا کو دیکھ لیا ہے جو اتنا اترا رہا ہے۔ خدا تو برتر از قیاس ہے۔ کون انسان اُسے دیکھ سکنے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور پھر اُس پاک ذات کا دیکھنا تو ایک طرف رہا انسان اُس کا خیال تک گمان میں نہیں لا سکتا"۔

"تو جس خدا کو دیکھتا ہے وہ تو اپنے پاس دیکھتا ہے اپنی مقدار کے مطابق لیکن جب تو بایزید کو دیکھے گا تو انہیں اللہ کے پاس دیکھے گا اور تب تجھے معلوم ہو گا کہ اللہ کیا ہے اور بایزید بسطامی کا مرتبہ و مقام کیا ہے۔ وہ خدا کے برگزیدہ بندوں میں شمار ہوتے ہیں اور تو اُن سے ملنے سے گریزاں ہے"۔

آپ جوش و جذبے سے بایزید بسطامی کی اس قدر حمایت کر رہے تھے کہ مرید ڈر گیا اور درخواست کرنے لگا "حضرت میں اکیلا جانا اچھا نہیں لگتا آپ بھی میرے ساتھ تشریف لے جائیں۔ میں اُن کا سامنا کیسے کر پاؤں گا"۔

چنانچہ آپ اُس مرید کو ساتھ لے کر بایزید بسطامی سے ملنے چل پڑے۔ آپ کو علم تھا کہ بایزید بسطامی اپنا زیادہ وقت جنگل میں درندوں کے ساتھ رہ کر گزارتے ہیں اور وہیں عبادت کرتے ہیں، چنانچہ وہ مرید کو سیدھے لے کر جنگل میں جا داخل ہوئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سامنے سے ایک شخص کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ آپ نے اُس شخص کو دیکھتے ہی مرید سے کہا "لو وہ سامنے سے بایزید بسطامی چلے آ رہے ہیں۔ اب آگے بڑھ کر انہیں ادب سے سلام کرو"۔

اتنے میں بایزید بسطامی آپ کے نزدیک ہی پہنچ گئے۔ مرید نے آگے بڑھ کر آپ کو سلام کیا بایزید بسطامی نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر جونہی انہوں نے ابو تراب بخشی کی طرف بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا آپ کا مرید چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا اور انتقال کر گیا۔ ابو تراب بخشی نے حیرت سے مرید کو دیکھا اور دوڑ کر اُس کے پاس پہنچے۔ مرید کے دل کی دھڑکن بند محسوس کر کے آپ نے شکایتی لہجے میں بایزید بسطامی سے مخاطب ہو کر کہا "حضرت یہ آپ نے کیا کر ڈالا۔ میں تو اپنے مرید کو آپ کی خدمت میں سلام کرنے کی غرض سے لایا تھا اور آپ نے اُسے ایسی تیز نظروں سے دیکھا کہ بیچارہ جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا"۔

بایزید بسطامی نے بھی دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "ابوتراب دل میلا نہ کر، میری نظروں نے تیرے مُرید کی جان نہیں لی بلکہ تیرا مُرید جو صادق عاشق تھا وہ ایک راز سے محروم تھا۔ جب میں نے اُسے نظر بھر کے دیکھا تو اُس کے قلب پر اُس راز کا بھی انکشاف ہو گیا اور وہ اس راز کا متحمل نہیں تھا سو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

آپ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے خود سے کہا: "افسوس وہ جہاں صادق عاشق تھا، وہیں اُس میں ہمت بھی ہوتی بلند مقام رکھتا لیکن افسوس وہ توکم حوصلہ مرید نکلا۔"

آپ کچھ عرصہ بایزید بسطامی کے پاس رہنے کے بعد واپس چلے آئے۔

آپ اکثر مُریدوں اور ارادت مندوں کو وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ سے کسی مُرید نے پُوچھا: "حضرت عارف کسے کہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "عارف وہ کہلاتا ہے جس کے نورِ معرفت سے سب کچھ روشن ہو۔ جس کے باطن پر سیاہی کا اثر تک نہ ہو۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "سب سے اچھی اور بہترین طاعت وہ طاعت ہے جس سے دلوں کی اصلاح ہو اور وہ فلاح پا سکیں۔"

ایک مرتبہ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص پر خدا کی رحمتوں اور نعمتوں کا بہت زیادہ نزول ہو رہا ہے اور وہ خدا کی نعمتوں سے اس حد تک لدا ہے کہ اُسے کسی چیز کی تمنا محسوس نہیں ہوتی۔ یہ دیکھ کر آپ نے اُس سے افسوس ظاہر کرتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں کہا: "اے شخص تو اپنے نفس پر ماتم کر۔ تجھ پر نعمتوں کا اس قدر نزول دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ تجھے خدا نے مسلسل آزمائشوں میں ڈال رکھا ہے۔"

علامہ عبدالوہاب سے روایت ہے کہ آپ گرمیوں کے موسم میں جنگل میں نماز پڑھ رہے تھے۔ سخت گرمی اور لو سے آپ کا جسم تپ رہا تھا، لیکن آپ نے اس کی پروا نہ کی اور اپنی عبادت میں مشغول رہے۔ چنانچہ گرمی کی شدت نے آپ پر اس طرح سے حملہ کیا کہ آپ چکرا کر نیچے گرے اور آپ کی رُوح جسدِ خاکی سے نکل کر پرواز کر گئی۔ اس طرح آپ کا جسم جانوروں کا کام آ گیا۔

جبکہ شیخ فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں تحریر کیا ہے کہ ۲۴۵ھ میں جب آپ جنگل میں اکیلے عبادت کے لیے نکلے آپ کا وہاں انتقال ہُوا تو برسوں بعد جب لوگوں کا اُدھر سے گزر ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ آپ عصا ہاتھ میں لیے قبلہ رو کھڑے ہوئے ہیں اور درندے آپ کے پاس آنے کی جرأت تک نہیں کر پا رہے۔

اسلام حقیقت میں ایک اجتماعی مذہب ہے جسے دنیا کے ۲/۳ حصہ آبادی نے حق تسلیم کر لیا ہے۔ اسلام ہی نے دنیا کی عمرانی ترقی کے لیے ہر قسم کے ذرائع یورپ کو بہم پہنچائے۔ روئے زمین سے اگر اسلام مٹ گیا، مسلمان مٹ گئے، قرآن کی حکومت جاتی رہی تو کیا دنیا میں امن قائم رہ سکے گا؟ ہرگز نہیں۔

(موسیو گاسٹن کار)

ابوالحسن شاذلیؒ کا زہد و تقویٰ بیان کا محتاج نہیں۔ آپ علم کا بحرِ بیکراں تھے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنی تعلیمات اور وعظ و نعمت کو تحریری شکل بھی دی ہے کہ نہیں۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ میں نے اگرچہ کسی تصنیف کو کتابی شکل میں مرتب نہیں کیا لیکن اپنے اصحاب و مریدین کو اس طرح تصنیف کیا ہے کہ رہتی دُنیا تک میری تعلیمات محفوظ رہیں گی۔ آپ نے مزید فرمایا کہ میری جامع اور مشرح تصنیف سید امام احمد ابو العباس ہیں جو میری تعلیمات کی مستقل اور بھرت بھرت تصویر ہیں اور میرے علم کے اصلی وارث بھی وہی ہیں اور اس کی اُن سے بہتر کوئی حفاظت نہیں کر سکتا۔

ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں۔ اللہ اور اس کے ولی کا ساتھ شیرنی اور اس کے بچے کی طرح کا ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ حرص و طمع، نمود و نمائش اور ہوائے نفسانی جب ولی کو ورغلاتے ہیں تو اللہ رب العزت ایک شیرنی کی طرح اپنے ولی کی حفاظت کرتا ہے اور اپنے دامانِ رحمت میں اس طرح محفوظ کر لیتا ہے جیسے شیرنی اپنے بچے کو محفوظ کرتی ہے۔ احمد ابو العباس مرسی واقعی بڑے صاحب ارشاد بزرگ گزرے ہیں۔ آپ عصر کی نماز کی امامت فرما رہے تھے کہ مقتدیوں نے غیر ارادی اور لاشعوری طور پر آپ پر ہلکی ہلکی بارش پھوار کی شکل میں برستی دیکھی اور آپ کے جسم کو نور سے لبریز دیکھا۔ جس میں آپ کا جسم بالکل چھپ گیا تھا۔ نماز کے بعد حاضرین کے استفسار پر آپ نے فرمایا! وہ بارش اور پھوار جو تم لوگوں نے دیکھی ہے وہ شرح و تفسیر اور معانی و مطالب کی بارش تھی اور اس کی تجسیم ہی نور معلوم ہو رہی تھی۔

⁂

ایک دفعہ نمازِ فجر کے بعد بہت سے لوگ آپ کے پاس جمع ہوئے اور آپ پر مختلف انواع کے سوال کرنے لگے۔ آپ سوالات کے جواب مسلسل دے کر سخت تھک گئے تھے۔ اسی اثنا میں ایک شخص آپ کی محفل میں آیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ آپ نے اُس کو اپنے پاس بُلایا اور فرمایا کہ تمہارے وجود سے آج کسی کارِ ناپسندیدہ کی بُو آ رہی ہے کہیں تو زنا کا مرتکب تو نہیں ہوا۔ اُس نے عرض کی یا حضرت میں نے آج راستے میں ایک حسینہ کو دیکھا جس کا حُسن بلاخیز، جسم و شباب اور ہوش مستی مجھے عصیاں کی دعوت دے رہے تھے۔ اس طرح مجھے خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ آہو چشم قتالہ میرے قبضے اور تصرف میں آ سکتی۔ میری یہی خواہش میری گنہگاری

ہے۔ اُس کو آپ اگر بدکاری خیال کرتے ہیں تو واقعی مَیں گنہگار ہوں۔ اس پر ابو العباس نے فرمایا کہ جب تک تمہیں اپنے آپ پر اتنا اختیار نہیں ہو جاتا کہ تُو اپنے خیالات اور تصوّرات پر قابو پا سکے اُس وقت تک تُو نظر نیچی اور سَر جُھکا کر چلا کر۔

**

آپ کی خدمت میں ایک دفعہ ایک عقیدت مند کچھ کھانے کو لایا۔ آپ نے سب مُریدوں کے ساتھ مل کر کھانے کا ارادہ کیا۔ ابھی آپ نے کھانے کو چھُوا بھی نہیں تھا کہ آپ کے ہاتھ کانپنے لگے اور اُنگلیاں پھڑپھڑانے لگیں۔ آپ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور لانے والے سے سوال کیا کہ کیا تُو یہ کھانا اپنے گھر سے پکوا کر لایا ہے۔ اُس نے انکار کیا اور کہا کہ آج میرے ایک دوست کے گھر میری دعوت تھی۔ مَیں نے وہاں کھانا نہیں کھایا اور اس خیال سے ساتھ لایا ہوں کہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ آپ نے فرمایا یہ کھانا واپس لے جا اور جہاں سے لایا ہے اس کو واپس کر دے کیونکہ تیرے دوست کا کاروبار پاکیزہ اور حلال نہیں ہے وہ شراب کا بیوپاری ہے۔ ایسے شخص کے گھر کا کھانا مجھ پر اور میری ذُرّیت پر حرام ہے۔ آپ نے ذُرّیت کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ میرے مُرید ہی میری ذُرّیت ہیں۔ اس کے بعد کھانا لانے والے نے سوال کیا کہ آپ نے کس طرح معلوم کر لیا کہ یہ کھانا نیک کمائی سے نہیں تیار کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب مَیں کھانے کو چھُونے کو تھا تو میری اُنگلیوں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ میری اُنگلیوں میں ساٹھ رگیں ایسی ہیں جو مجھے مشتبہ کھانے کا پتہ دیتی ہیں۔ اس شخص نے آپ سے معافی مانگی اور عرض کی کہ مَیں تو آپ کی رُوحانیت کی آزمائش کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: خدا اپنے ولیوں کی خود حفاظت کرتا ہے تو پھر کس طرح خدا کے دوستوں کو امتحان میں ڈال سکتا ہے۔ اگر خدا نے تجھے آزمائش میں ڈال دیا تو پھر تمہیں معلوم ہے تمہارا کیا حال ہو گا اس پر اُس نے آپ سے گڑگڑا کر معافی مانگی۔ آپ نے اُسے معاف کر دیا۔

احمد ابو العباس ایک دن اپنی خانقاہ میں استغفار، ہمّت اور پرہیزگاری کے موضوع پر اپنے مریدین سے خطاب فرما رہے تھے۔ محفل پر وجد طاری تھا۔ اس وعظ کا بہت چرچا ہوا۔ اُسی شب آپ اپنے ایک عقیدت مند کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے وہاں ایک کتّا آ گیا آپ نے اُس کے آگے روٹی پھینکی اُس نے نہ کھائی۔ آپ نے کافی کوشش کی کہ وہ روٹی کھا لے لیکن اُس نے روٹی کو کھانا تو درکنار اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ آپ نے تنگ آ کر روٹی کُتّے کے مُنہ کو بھی لگائی مگر بے سُود۔ آپ نے کُتّے کو کفرانِ نعمت کرنے پر سرزنش کی۔ اسی لمحہ غیب سے آواز آئی کہ تُو نے جتنا پرہیزگاری ہمّت اور استغفار پر وعظ کیا تھا وہ اکارت گیا کیونکہ ان چیزوں کی عملی شکل دیکھ کر تُو اُن کی پہچان نہ کر سکا۔ آپ کو دِل میں بہت شرمندگی ہوئی۔ آپ نے اُسی روز سے خلوت نشینی اختیار کر لی۔ لوگ آپ کی مُلاقات اور وعظ و نصیحت کو ترس رہے تھے مگر آپ نے ہر قسم کی مُلاقات اور بات چیت ترک کر رکھی تھی۔ آخر ایک دن ایک مُرید آپ کے پاس پہنچا اور مُصر ہو گیا کہ اس آدم بیزاری کی کیا وجہ ہے، عقیدت مند اور ارادت مند آپ کی شکل دیکھنے کو بے چین ہیں۔ آپ نے فرمایا: خاموشی میرے لیے باعثِ عظمت ہے کیونکہ آدمی جو کہے اس پر عمل کر کے نہ دکھائے تو وہ عنداللہ اور عندالناس ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ مُرید آپ کی بات سے بالکل متّفق نہ ہوا اور اصرار کرتا رہا کہ اگر آپ اپنے مُریدوں کے پاس نہیں آئے تو وہ پاگل ہو جائیں گے اور آپ کے خلوت خانے میں داخل ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ مُریدوں کو بتلا دو کہ مَیں نے اپنے رب کے ایما پر گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور اس طرح آپ نے کُتّے والا قصہ بھی سُنایا اور کہا کہ جب تک ـــــ مجھے خدا حکم نہیں دے گا مَیں اپنے حُجرے سے باہر نہیں نکلوں گا۔ مُرید نے آ کر سب کو اپنی گفتگو سے مطلع کیا سب بہت آزردہ خاطر ہو گئے۔

ہفتے گزر گئے ابو العباس اپنے حُجرے میں معتکف رہے۔ مُرید اس تعطیل کے خاتمے کے منتظر تھے کہ ایک روز حُجرے میں روشنی پھیل گئی آپ اُس کی تاب نہ لا سکے وجد میں آ کر بے ہوش ہو گئے اسی بے ہوشی میں آپ کو معلوم ہوا کہ خدا نے انہیں معاف کر دیا اور حکم دیا ہے کہ لوگوں کو جا کر اُن کو واعظ و نصیحت کرو اور آپ حکم عدولی کے ڈر سے اسی دم حُجرے سے باہر نکلے اور لوگوں

میں پہنچ گئے۔ آپ کے مریدوں میں خوشی و انبساط کی لہر دوڑ گئی اور اس دن تمام مریدوں نے عید کی سی خوشی منائی۔

❋❋

ایک دفعہ آپ کسی شخص کے ساتھ سرگوشی کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ آپ کے مریدوں میں سے کسی ایک نے کہا کہ ابوالعباس نامعلوم کیسی باتیں کر رہے ہیں، اگر یہ اچھی بات کر رہے ہیں تو سب کو سنانی چاہیے اور اگر بری بات کر رہے ہیں تو یہ ان کے شایانِ شان نہیں۔ آپ نے اس مرید کو پاس بلایا اور کہا خدا تجسس کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ستارالعیوب ہے اور اس کی یہی صفت اس کے بندوں میں بھی ہوتی ہے۔ اگر میں لوگوں کے رازوں کے افشا کا کام شروع کروں تو اس محفل میں کوئی بھی شخص دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اس شخص نے شرمندگی کے ساتھ معذرت طلب کی آپ نے اس کو خدا سے معافی مانگنے کی تلقین کی۔

❋❋

ایک شخص جو اپنے زہد و رکوع میں بہت شہرت رکھتا تھا اور اس کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے مرید اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک روز وہ آپ کی (ابوالعباس) خدمت میں حاضر ہوا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ پیرو مرشد اس کی بڑی پذیرائی کریں گے۔ آپ نے اس کے لیے کوئی توجہ نہ دی۔ لوگوں کے اصرار پر آپ نے فرمایا کہ میں اس کو مل لیتا ہوں مگر مریدوں نے محسوس کیا کہ آپ اس کو زیرِ خاطر نہیں لائے اور وہ چلا گیا۔ بعد میں آپ نے مریدوں سے فرمایا کہ اگر یہ شخص مغرور اور متکبر والا نہ ہوتا تو میں اس کو اس انداز سے ملتا کہ ساری زندگی یہ ملاقات یادگار رہتی مگر اس کے غرور و تکبر نے مجھے اس کے قریب جانے سے روکے رکھا۔ آپ کے مریدین جب یہ سن چکے تو انھوں نے اس عالم کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ جب یہ لوگ اس سے ملنے گئے تو وہ ابوالعباس کے مریدوں سے طنز و تمسخر سے پیش آیا اور کہنے لگا کہ تم لوگوں کے مرشد ابوالعباس کی بزرگی اور تقویٰ نے مجھے ذرا برابر متاثر نہیں کیا بلکہ میں نے اپنے آپ کو ان سے برتر پایا۔ مجھے اپنے تقوے اور پرہیزگاری پر بجا طور پر ناز ہے۔ درحقیقت یہ غرور اس شخص کی بربادی کی نوید تھی جس کا آغاز ہونے والا تھا۔

❋❋

آپ قاہرہ میں مقیم تھے آپ کو اکثر لوگ آپ کے پیرو مرشد ابوالحسن شاذلیؒ کی خانقاہ میں دیکھا کرتے تھے۔ آپ وعظ و نصیحت کو واپس قاہرہ آجاتے تھے۔ لیکن شاذلی کی وفات کے بعد آپ قاہرہ میں ہی رہے۔ آپ کے مکاشفات کا علم جب عام لوگوں کو بھی ہونے لگا تو ایک منکر نے آپ کو شعبدہ باز قرار دیا جو لوگوں کو کرامات و کرشمات دکھا کر اپنی طرف متوجہ کیے رکھتے ہیں اور سے شرط لگائی کہ آپ مجھ کو قائل کریں گے تو تب میں آپ کو مانوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سکندریہ کے امیر کو مکتوب کہ ابوالعباسؒ کو قاہرہ سے طلب کر کے ان سے ان کی کرامتوں کا مطالبہ کیا جاوے۔ آپ کو اسی وقت فرمان موصول ہوا۔ ابوالعباسؒ نے فرمان پڑھا اور قاصد کو زبانی جواب دیا کہ اپنے امیر سے کہہ دو کہ تو صرف سکندریہ کا امیر ہے اور جس امیر کا میں پابند ہوں اس کے سامنے تیری حیثیت دربان سے بھی کم ہے۔ سکندریہ کے حاکم کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو وہ بہت تلملایا اور رنجیدہ خاطر ہوا۔ مصلحت کے پیشِ نظر اظہار نہ کیا بلکہ نرم زبان میں ایک اور خط روانہ کر دیا جس میں اپنے رویے کی معافی مانگی ہوئی تھی اور کو سکندریہ آنے کے لیے مدعو کیا گیا اور آپ کو غائبانہ طور پر اپنا مرشد مان لیا تھا اور کہا مجھے بھی اپنے مریدوں میں شامل کر لیں۔ آپ نے خط کا مضمون تسلی سے پڑھا اور قاصد سے کہا کہ اپنے امیر سے کہنا کہ یونان کے بادشاہ کے مصر میں آنے کے سکندریہ شہر آباد ہوا۔ سکندر کے نام پر ہی اس شہر کا نام بھی رکھا گیا۔ ایک دفعہ سکندر نے اپنے ایک ہم عصر دیوجانس فلسفی سے کہا میرا فیض عام ہے میں نے لوگوں کو زر و دولت سے مالا مال کر دیا ہے تو بھی چاہے تو میرے پاس آجا اور دولت سے اپنا دامن بھر لے۔ دیوجانس بہت زیادہ قانع اور بے غرض تھا اس نے جواب دیا کہ اے سکندر! کیا تجھے ایک محکوم غلام نے تمہیں اپنا بنا لیا ہے اب تو یہ بتا کہ میں غلاموں کے غلام سے کیا طلب کروں۔ چنانچہ قاصد تو اپنے امیر کو میرا پیغام دینا کہ میں نے حرص و

میرے ساتھ آئندہ اس قسم کی
طمع اور شہوت کو اپنا غلام بنا رکھا ہے لیکن تو ان چیزوں کا غلام ہے لہٰذا تیرا اور میرا کیا واسطہ
دل لگی کرنے سے گریز کرے کیونکہ امیر اور فقیر یک جا نہیں ہو سکتے۔ امیر ساری زندگی ابوالعباسؒ سے ملاقات اور مرید کا شرف
حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہا مگر اُس کی یہ تمنا بالکل نہ پوری ہو سکی اور اسی خواہش میں وہ دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ اسی امیر کے
ایک ساتھی کے دل میں آپ کے بارے میں شبہ تھا کہ آپ جتنے عالم مشہور ہیں دراصل اتنے عالم نہیں ہیں وہ آپ کے امتحان کی غرض
سے قاہرہ پہنچا۔ آپ کی محفل میں ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وعظ ہو رہا تھا آپ نے اپنے وعظ میں فرمایا کہ لوگو! جب تک تم
کسی شخص کے بارے میں از خود تصدیق نہ کر لو اُس کے متعلق کسی قسم کی رائے نہ قائم کیا کرو۔ اب اجنبی کو محسوس ہوا کہ یہ جملہ حضرت نے
میرے لیے ہی بولا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اس مجلس میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جس نے سکندریہ کے امیر کو اس بات پر آمادہ
کیا کہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں ولی ہوں کہ نہیں۔ حالانکہ اس طرح کے طرزِ عمل سے امیر اور اس اجنبی کو کوئی فائدہ یا نقصان نہ ہو سکتا
تھا بحر حال صرف مجھے آزار دینے کی غرض سے انھوں نے یہ کام کیا۔ یہ سُننا تھا کہ اجنبی سے نہ رہا گیا وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے جرم کا
اعتراف کیا۔ آپ سے معافی مانگی اور آپ کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گیا۔

••

آپ ایک مرتبہ سکندریہ جا رہے تھے کہ راستے میں جس شہر میں آپ نے قیام کیا اُس کے امیر نے آپ سے مُلاقات کی خواہش
ظاہر کی۔ آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے عرض کی میں آپ کا مداح ہوں۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ میں تمہارا مداح نہیں اگر
تمہیں غرض ملاقات ہی تو قاہرہ آتے۔ پھر اُس نے عرض کی کہ میں کل صبح نمازِ فجر کے بعد خود آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا آپ
نے فرمایا بلاشبہ تم آؤ گے لیکن تمہاری میرے ساتھ مُلاقات نہیں ہو سکتی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اگلی صبح آنے سے قبل ہی آپ سکندریہ
کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

••

آپ کے مُریدوں نے آپ کو بتایا کہ شہر میں ایک متقی عالم حال ہی میں حج سے واپس آیا ہے۔ لوگ ہر وقت اس کے پاس
موجود رہتے ہیں۔ آپ نے اندازہ لگایا کہ مُرید اُس شخص سے خاصے متاثر ہیں اور اس کی مُلاقات کو جانا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا
اگر واقعی اُس شخص کی علمیت کا کوئی جواب نہیں تو پھر میں تم لوگوں کے ساتھ اُس کی ملاقات کو جاؤں گا۔ چنانچہ آپ مع اپنے مریدوں
کے اس حاجی عالم کے گھر پہنچے۔ اُس کو آپ کی آمد کا پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوا۔ آپ نے اُس عالم حاجی سے فرمایا کہ تم بڑے خوش
قسمت انسان ہو جس کو خانۂ خدا کی زیارت اور دیارِ حبیبؐ کا قرب نصیب ہوا۔ اُس شخص نے کہا کہ وہ ٹھیک ہے لیکن راستے کی دشواریوں
اور رہزنوں کے خوف نے ہر وقت جان سُولی پر لٹکائے رکھی۔
آپ نے پھر فرمایا کہ دیارِ حبیبؐ پر پہنچ کر جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں اور انسان بے خود رہتا ہے۔ اس شخص نے پھر عالمانہ
جواب دیا کہ میں نے تو مدینے میں بہت سیر کی اور ہر نیا شہر دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے خواہ وہ مدینہ ہو یا کوئی اور ہو۔
آپ نے تیسرا سوال اُس سے کیا کہ کعبۃ اللہ کی حدود میں داخل ہو کر یوں لگتا ہے کہ مسافت سمٹ گئی ہو اور بندہ حضرتِ غفور
کے دربار میں جا پہنچا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں تو اُس ہجوم سے سخت گھبرا گیا تھا اور دُور دُور ہی رہا۔ اب بھی مجھے اُس ہجوم
کے بارے میں سوچ کر دہشت ہوتی ہے۔
آپ نے چوتھا سوال کیا کہ حاجی صاحب آپ کا حج کیسا رہا۔ اُس نے جواب دیا بہت ارزاں۔ میں نے بہت سی خرید و فروخت
کی۔ لہٰذا میرا یہ سفر بہت کامیاب رہا۔
آپ نے اُس حاجی عالم سے کہا کہ افسوس تو نے حج پر جا کر بھی اپنا وقت ہی ضائع کیا۔ جس شخص کو خانۂ خدا کی زیارت اور دیارِ
حبیبؐ کی سعادت نے کچھ عطا نہ کیا ہو، اُس سے بڑا بدنصیب کون ہو سکتا ہے تو کعبہ پہنچا لیکن تجھے ان ادراک کا علم نہ ہو سکا

سے انسان مسافت سمیٹ کر حضرت خلیلؑ کے دربار میں پہنچتا ہے تو تُو نے حج کو ثواب کی نیت سے نہیں کاروبار کی نظر سے کیا ہے۔ گویا تُو نے جذب و شیفتگی سے حج نہیں کیا۔

وہ کہنے لگا کہ اس میں جذبے اور عشق کا کیا تعلق ہے۔ بس حج ایک رکن دین ہے وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔ اسی دوران نماز کا وقت آگیا آپ نے نماز کا ارادہ فرمایا۔ وہ شخص وضو کرنے گیا لیکن دوران وضو اُس کو وسوسوں نے گھیرے رکھا اور بمشکل تمام وہ وضو کر پایا۔ پھر نماز پڑھانے از خود امامت کے مصلی پر کھڑا ہو گیا۔ نماز میں بھی سہو کا شکار رہا ایک ہی رکعت میں کئی کئی سجدے کرنے لگا۔ نماز ختم ہوئی تو حضرت احمد ابوالعباسؒ نے دوبارہ نماز پڑھی اور مُریدوں سے فرمایا کہ میں اس عالم کے حالات سے پہلے ہی واقف تھا لیکن اتنی باتیں اور وقت ضائع میں نے صرف اس لیے کیا کہ تم لوگ اپنے ضعفِ اعتقاد کی وجہ سے اُس کو بہت کچھ سمجھ بیٹھے تھے چنانچہ اُس کی اصلیت ظاہر کرنا اب مجھ پر ضروری ہو گیا تھا۔ اگر میں آپ لوگوں کو گھر میں بیٹھ کر ہی سب کچھ بتلا دیتا تو شاید آپ کو یقین نہ آتا۔ مُرید بہت شرمندہ ہوئے اور آئندہ اس قسم کے اصرار سے معافی کے طلبگار ہوئے۔

□□

شہر کا ایک بدنام ترین شخص آپ کی خدمت میں آیا اور ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ مُریدوں نے اُس کو ابوالعباسؒ سے ملاقات کرانے میں پہلوتہی سے کام لیا لیکن اُس کے اصرار پر اُسکو پیرومرشد کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت ابوالعباسؒ نے اُس کو دیکھا تو اس پر تلطف فرمایا۔ آپ کی نوازشات دیکھ کر اُس شخص کی کچھ حوصلہ افزائی ہوئی۔ اُس نے اپنا آنے سے پہلے کا خوف اور جھجک حضرت پر منکشف کی آپ نے جواباً فرمایا کہ میرا گھر کسی بادشاہ کا محل تو نہیں جو تم آتے ہوئے گھبرا رہے تھے یہ تو فقیر کا غریب خانہ ہے خاص و عام یہاں آ سکتا ہے۔ اُس نے عرض کی حضرت میں ایک عاصی اور گناہ گار انسان ہوں۔ آپ خاصۂ خاصان ہیں اس خیال سے ڈرتا تھا کہ شرفِ باریابی ملے گا بھی کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا "تو اپنے گناہ کے لیے استغفار کر۔ تیری گناہوں پر شرمندگی اور گناہ کا احساس تیرے حق میں بہتر ثابت ہونگے۔ خدا تمہیں بالکل مایوس نہیں کرے گا۔"

آپ کی حوصلہ افزائی اور پند و نصیحت سے اُس شخص کی کافی تسلی ہو گئی۔ آپ نے فرمایا کہ جب خدا توبہ قبول کر لیتا ہے اور سیدھی راہ دکھا دیتا ہے تو انسان اسی وقت پُل صراط پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے زہد و تقویٰ کے پہلو میں شیطان بھی آن کھڑا ہوتا ہے۔ زہد و رکوع پر اترانے اور تکبّر کرنے کے لیے بہکاتا رہتا ہے اور اگر انسان شیطان کے بہکاوے میں آجائے تو اس کا سارا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے۔

اُس شخص نے ایک مدت آپ کی راہ نمائی اور ظلِ شفقت میں گزاری۔ دن کو محنت و مزدوری کرتا اور شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ کچھ مدت کے بعد اس شخص میں عجز و انکسار نمایاں طور پر پیدا ہو گیا۔ وہ ہر وقت لغزشوں اور گناہوں سے خوف زدہ رہتا۔ ترقی میں اُس نے خاصا مقام حاصل کر لیا تھا اور بعد میں وہ ایک بلند پایا بزرگ اور درویش بنا۔

□□

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "افکار پریشان سے میں عاجز آچکا ہوں، اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے مجھے استغفار کرنے کو کہا جو میری فطرت کے برعکس تھا لہذا میں وہاں سے اُٹھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ آپ میری تشفی فرمائیے"۔ آپ نے اس پر خصوصی توجہ دی اور اُس سے اس کے مسائل کے متعلق پوچھا۔ اُس نے کہا حضرت میں نے کچھ لوگوں کو مظاہر میں گم دیکھا ہے اور اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ ہیں جو آنکھیں بند کیے خفا میں گم ہوتے ہیں۔ میں اُن کے فرق کو نہیں جان سکا کہ اُن میں سے کون سے بزرگ ہیں اور کون سے برتر ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ جو خدا کا حقیقی بندہ ہے اُس کے لیے خفا اور ظہور دونوں برابر ہیں۔ بصورت دیگر، جو ظہور کا دوست ہے وہ اس کا بندہ ہے جو خفا کا ساتھی ہے وہ اس کا بندہ۔ بہرحال حقیقت وہ ہے جو میں نے بیان کر دی ہے۔ اُس شخص نے پھر آپ سے

عرض کی کہ میں موت سے بہت زیادہ خوفزدہ ہوں مجھے اس ڈر سے نجات دلائیے۔ آپ نے فرمایا خدا کا دوست موت سے نہیں ڈرتا اور جو اللہ کی دوستی سے محروم ہو گا وہ موت سے دور بھاگے گا۔ کیونکہ ارشادِ ربانی ہے کہ "اگر تم سچے مومن ہو تو موت کی آرزو کرو"۔ خدا سے دوستی کا دعویدار اپنے آپ کو اسی کسوٹی پر پرکھے تو اس کی دوستی کے اخلاص ظاہر ہو جائیں گے۔ یہ سن کر وہ شخص بہت آسودہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تو آج سے اسی در کا ہو کر رہ گیا کیونکہ یہاں سے مجھ کو آسودگی ملی ہے۔

حضرت ابوالعباسؒ بجا طور پر ابوالحسن شاذلیؒ کی مستقل جامع اور شرح تصنیف تھے۔ آپ نے اپنے مرشد کی بہت سی تعلیم کو اپنی زبان اور قلم کے ذریعے عام کیا۔ ابوالحسن شاذلیؒ کی تعلیم اور فرمان اگر چھپ جاتا تو لوگوں کو اس قدر متاثر و مسخر نہ کرتا جتنا ابوالعباسؒ کی شکل میں لوگوں میں مقبول و معلم ثابت ہوا۔ آپ نے نہایت اخلاص اور محبت کے ساتھ لوگوں کو تعلیم دی۔ یہی وجہ تھی جو ایک دفعہ آپ کے پاس آیا آپ ہی کا ہو کر رہ گیا۔ ایک دفعہ آپ کا ایک مرید اپنے آپ کو مستغنی سمجھ بیٹھا اور اس امید پر آپ سے کنارہ کش ہو گیا کہ اب لوگوں خود بخود اس کے پاس آنا جانا شروع کر دیں گے۔ جب اس کا یہ خیال خام نکلا اور وہ کئی مسائل کا شکار ہوا تو آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ میں چند مسائل کا شکار ہوں۔ آپ نے فرمایا پہلے یہ بتا تو اب تک کہاں تھا۔ اس نے اپنے مستغنی ہونے کا قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ کائنات میں کوئی بھی استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ شیخ محترم حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسی کامل و ظاہر ہستی اس قسم کا دعویٰ نہ کر سکی۔ تم کس طرح اس خیال کے مرتکب ہوئے۔ وہ شخص بہت نادم ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ زمین جب وجود میں آئی تو اس میں شدت کی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ اللہ نے اس کی بے چینی کو پہاڑوں سے دبا دیا۔ یہی حال نفس کا تھا اور اللہ نے نفس کی بے چینی کو عقل کے پہاڑ سے دبا دیا۔

ایک مرتبہ آپ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک فربہ اندام شخص کو آپ نے وعظ کرتے ہوئے دیکھا۔ لوگ بڑے ہی انہماک سے وعظ سن رہے تھے۔ آپ نے بھی وعظ سننا شروع کر دیا۔ آپ کے پاس ہی ایک شخص وعظ سن رہا تھا اور واعظ کو دیکھ کر زیرِ لب کچھ بول رہا تھا۔ آخر آپؒ نے اس سے اس کیفیت کے متعلق پوچھ ہی لیا۔ اس نے واعظ کے متعلق ناپسندیدہ کلمات کہنے شروع کر دیئے۔ وہ باتیں سرگوشی کے انداز میں کر رہا تھا جو ابوالعباسؒ کے علاوہ کوئی نہ سن سکتا تھا لیکن واعظ نے نہ صرف اس کا سوال دہرایا بلکہ جواب بھی اس شخص کو دیا۔ اس نے پھر کوئی بات ابوالعباسؒ سے کہی جس کا بھی جواب اس موٹے عالم نے دیا۔ وہ شخص تو اب خوف زدہ ہو گیا اور عالم سے معافی مانگی۔

ابوالعباسؒ نے فرمایا کہ اے عالم تو عاشق با مراد ہے، تو اپنے آپ کو کیوں چھپاتا پھر رہا ہے، خدا کے بندوں پر بھی اپنے اسرار کو آشکار کرو تاکہ علم و بصیرت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ اس عالم نے آپ کے حکم کی تعمیل اسی دم کرنی شروع کر دی۔

آپ عمر بھر تعلیمات اور تشریحات سے لوگوں کی تشنگی بجھاتے رہے۔ آپ زندگی کے ہر شعبے پر تنقید کرتے رہے۔ لوگوں کی بھلائی کی خاطر مختلف بزرگوں اور صوفیاء کے پاس حاضریاں دیا کرتے تھے۔ جب آپ کی عمر ستر سال کو پہنچی تو آپ نے زندگی سے [illegible] رہنا شروع کر دیا۔ آخر ایک دن ۶۸۶ھ کو آپ واصلِ حق ہو گئے۔ لوگ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے اور آپ کی وفات سے ایک روشن چراغ غروب ہو گیا۔

برصغیر میں سلطان محمد تغلق کا زمانہ تھا۔ سلطان تغلق کو اپنی عقل اور فہم و فراست پر بڑا ناز تھا۔ شریعت کو تو اہمیت دیتا تھا مگر طریقت سے گریزاں تھا۔ ین خوشامدی مصاحبوں میں گھرا رہتا۔ جو دن رات پورا زور اسی بات پر صرف کرنے میں لگا دیتے کہ عالم میں سلطان تغلق جیسا عقلمند اور معاملہ فہم اور کوئی ان نہیں چنانچہ سلطان بھی اپنی اس تعریف سے خوشی سے پھولا نہ سماتا اور اپنے ان درباریوں اور مصاحبوں کا خاص خیال رکھا کرتا اور یہ خوشامدی حضرات' ن کی خوشنودی کی خاطر کسی نہ کسی بے گناہ پر کوئی ایسا جھوٹا الزام ضرور عائد کرتے کہ جسے سن کر سلطان اس میں اپنی ہتک محسوس کرے۔ اور پھر ایسے شخص کا م نکلتا وہ، وہی ہوتا جو عموماً ناراض غصہ ور شاہوں کے ہاتھوں کمزور لوگوں کا ہوتا ہے۔ یہ خوشامدی حضرات ہر اس شخص کے خلاف سلطان کے کان بھرا کرتے ے تنہائی میں سب سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ ایسے لوگ جو دنیا سے الگ تھلگ ہو کر خدا کی یاد میں زندگی بسر کرتے، ان میں اکثریت اولیاءؒ ا ہوا کرتی اور پھر یہ صوفی ان شر پسند درباریوں کی فہرست میں صف اول پر درج ہوتے۔

انہی دنوں ہند میں ایک صوفی حضرت قطب الدین منورؒ کا بڑا شہرہ تھا حضرت قطب الدین منور محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کے مقرر کردہ خاص خلیفہ تھے اور مشہور حضرت جلال الدین ہانسویؒ کے پوتے بھی علم، عقل، وفا اور عشق و زہد کے پیکر قطب الدین استغنا اور توکل میں اس حد تک عروج میں تھے کہ جابر سے جابر سلطان کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ تزکیہ نفس اور مجاہدہ باطن کے غازی اس صوفی نے اپنے اندر کی دنیا مسخر کر لی تھی۔ آپ اپنی ایمان پرور زندگی اور مشاغل سے مردہ دلوں کو بخشتے تھے چنانچہ آپ کے اردگرد ہر وقت مریدوں ارادت مندوں کا ہجوم رہنے لگا، اور آپ لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے اسلامی تعلیمات اور شریعت ی دیتے۔

سلطان تغلق کے درباریوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک صوفی بزرگ نام جس کا قطب الدین ہے دلی کے دربار سے دور ہانسی میں بڑے آرام سے زندگی بسر کر ہے اور زندگی بھی ایسی جو بظاہر تو درویشی معلوم ہوتی ہے۔ مگر جس طرح لوگ اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں اس حساب سے تو وہ صوفی گوشہ نشینی میں سلطنت کر رہا ہے۔ اور یہ اس قدر بڑی بات تھی جو مصاحبوں اور درباریوں کے لئے سوہان روح بن گئی بھلا وہ کسی ایسے شخص کا سکھ چین کیسے دیکھ سکتے جو سرکار دلی کے دربار سے وابستہ بھی نہ ہو۔ جو بادشاہ کو سلام کرنے بھی نہ آتا ہو اور ٹھاٹ سے زندگی بسر کر رہا ہو۔ چنانچہ اب انہوں نے دن رات قطب الدین منور کے خلاف سلطان تغلق کے کان بھرنا شروع کر دیئے اور سلطان کو آمادہ کرنے لگے کہ وہ کسی طرح اس صوفی کے خلاف سخت اقدام اٹھائے۔ دلائل میں انہوں نے سلطان کو بتایا کہ یہ درویش صفت لوگ پرلے درجے کے مکار ہوتے ہیں۔ اگر ان سے پردہ پوشی اختیار کی جائے اور انکی کاروائی

کا سختی سے جائزہ نہ لیا جائے تو سلطنت میں جہاں نقصِ امن اور انتشار کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے بلکہ بغاوت تک کا خطرہ محسوس ہوتا ہے وہاں ان ریشوں
کی باطنی مکروہ حالت بھی پردہ میں رہتی ہے۔

سلطان تغلق جو درباریوں اور مصاحبوں کے خیالات سنتے سنتے انہی پر تکیہ کرنے لگ پڑا تھا جھنجلا کر ایک دن اُن سے دریافت کر ہی بیٹھا کہ آخر مجھے
اس درویش سے کیا خطرہ لاحق ہے۔ جو بھی بات ہے صاف صاف مجھ سے کی جائے۔ یہ سن کر ایک حاسد بولا "حضور آپ کو اس سے بڑا اور خطرہ کیا لاحق ہو
سکتا ہے کہ وہ علاقہ جہاں آپ بلا شرکتِ غیرے حکومت کریں اور سب سے اعلیٰ اور بہتر قرار دیئے جائیں وہاں آپ کے دعویٰ کو جھٹلانے والا اور لوگوں کے
دلوں پر حکومت کرنے والا کوئی آن بیٹھے۔"

سلطان نے پوچھا "آخر ایسی کون سی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جو میرے خلاف جاتی ہے؟"

حاسد بولا "حضرت یہاں ایک درویش قطب الدین آجکل آپ کے مقابل آنے کی تیاری کر رہا ہے۔ حد سے زیادہ مغرور اور انا پرست ہے۔ اپنے
مُریدوں اور عقیدت مندوں کو آپ کے خلاف ورغلاتا ہے۔ انہیں بتاتا ہے کہ دُنیا میں خُدا نے حکمران کسی کو نہیں بنایا۔ اصل حکمرانی تو صرف اُسی فردِ واحد کی
ہے جو اللہ کہلاتا ہے اور یہ دنیاوی بادشاہ تو اس لائق ہی نہیں ہوتے کہ اُن کی عزّت کی جائے یا چاکری کی جائے۔"

سلطان تغلق ـــــ غصّے سے بے حال ہو گیا۔ اُس نے طیش میں آ کر اُس حاسد سے کہا "اچھا... تو ذرا یہ تو بتا کہ آخر وہ درویش کن لوگوں کے سامنے
یہ باتیں کرتا ہے تو انہیں میرے سامنے لا تاکہ میں انہیں گواہ بنا کر اس درویش کے خلاف کارروائی کر سکوں۔"

یہ سن کر حاسد رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ ہکلاتا ہوا بولا "حضور گواہ تو میں کوئی پیش نہ کر سکوں گا۔ ہاں البتہ آپ یہ باتیں ہانسی کے کسی شخص سے بھی معلوم کریں تو بات
صاف ہو جائے گی۔ سلطان چپ کر کے اُٹھا اور تخلیہ میں چلا گیا۔

ایک دن سلطان تغلق نے قاضی کمال الدین صدر جہاں سے پوچھا "یہ شیخ قطب الدین کیسا انسان ہے؟"

صدر جہاں نے سلطان کو چونک کر حیرت سے دیکھا۔ کیونکہ آج سے پیشتر سلطان نے اُس سے اس قسم کی گفتگو نہ کی تھی۔ پھر وہ سنبھل کر بولا "حضور
قطب الدین ایک سیدھے سادے درویش انسان ہیں اور بس مگر حضور کو اس صوفی کے بارے میں تحقیقات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

سلطان نے جواب دیا "میں نے سُنا ہے کہ وہ ہماری بادشاہت بلکہ دُنیا کی ہر بادشاہت کے خلاف لوگوں میں نفرت پھیلا رہا ہے۔ اس طرح
کو اُس کی تکلیف دہ باتوں کو سُننے کا موقع ملتا ہے۔"

قاضی بولا "حضور یہ بات تو میرے علم میں نہیں۔ ہاں البتہ قطب الدین کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک بے ضرر درویش ہے۔ سیدھا سا
سلطان یہ سُن کر غصے میں آ گیا اور بولا "صدر جہاں ہم نے تمہیں قطب الدین کے بارے میں اپنے شبہات کی تصدیق کے لئے بلایا ہے نا کہ اس در
کی وکالت کے لئے۔"

یہ سُن کر صدر جہاں گھبرا گیا اور بولا "حضور میں کسی کی وکالت تو نہیں کر رہا۔ جو حقیقت ہے وہ بیان کر رہا ہوں۔ میں نے قطب الدین کی شرافت اور
کو مدِنظر رکھ کر ہی آپ کو بتایا ہے کہ وہ ایک بے ضرر اپنے حال میں مست رہنے والا بزرگ ہے۔ اُس سے بھلا جہاں پناہ کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے"

سلطان پر تو اُس وقت اپنے مصاحبوں اور درباریوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے قاضی سے کہا "اگر تم اس درویش کو ایسا ہی سمجھتے ہو
کا امتحان ہو جائے گا بلکہ یہ امتحان تمہارے ہی ہاتھوں لیا جائے گا تاکہ تم اُس کی اصلیت سے آگاہ ہو سکو۔"

قاضی دل ہی دل میں گھبرا گیا کہ نجانے سُلطان قطب الدین کے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہے۔

سلطان بولا "صدر جہاں میں تمہارے اس بے ضرر اور سادہ لوح درویش کو اُس کے ظاہری روپ سے نکال کر اصلی شکل میں لانا چاہتا ہوں۔ اُس
پر تصنع کا نقاب چڑھا رکھا ہے وہ میں نوچ کر ہی رہوں گا۔"

صدر جہاں بولا "حضور میرے لائق جو بھی خدمت ہو کہیں گے بجا لانے کے لئے تیار رہوں گا۔"

سلطان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک فرمان لکھوایا جس کے تحت قطب الدین کو دو گاؤں عطا کئے گئے۔ پھر سلطان نے وہ فرمان صدر جہاں کو
ہوتے کہا "یہ دو گاؤں کی ملکیت کا پروانہ ہے جو تم لے اپنے اُس بے ضرر درویش کو جا کر دینا ہے۔ ہر طریقہ سے مگر وہ ہر حال میں انہیں قبول کرے تم اس

Habib Bank Limited
حبیب بینک کی ایک اور خدمت
حبیب بینک ویزا ٹریولرز چیکس
دنیا کا سفر، بے خوف و خطر
TWENTY U S DOLLARS
Habib Bank Limited
SPECIMEN
$20
VISA
SPECIMEN
۱۸۰ سے زیادہ ممالک میں
گمشدہ چیکس کے دوبارہ اجراء کی ہمہ وقت سہولت
• محفوظ
نقدی سے زیادہ محفوظ
استعمال میں انتہائی آسان
• بے خطر
Visa اور Citicorp
کے تعاون سے
• گمشدہ چیکس
دوبارہ اجراء
فوری مہیا
• قبولیت
دنیا بھر میں قابل قبول
اور بھنانے میں آسان
• دستیابی
۲۰، ۵۰، ۱۰۰، ۵۰۰
اور ۱،۰۰۰ امریکی ڈالر میں دستیاب
حبیب بینک لمیٹڈ
PID (Islamabad)

بھلا اور کیا ہوگی لیکن اگر وہ ٹال مٹول کرتا ہے تو پھر یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی کہ اسے ہر ممکن طریقے سے رضامند کرو کہ وہ یہ گاؤں لے لے۔ اور پھر جب
وہ مان جائے تو تم دیکھنا میں اس کے چہرے سے یہ درویشی کا نقاب کیسے اتار پھینکوں گا۔ میں اس کو دربار میں بلا کر پوچھنا چاہوں گا کہ آخر وہ درویش ہو
ہوئے یہ زر کس طرح سنبھالنے پر آمادہ ہوگیا۔ بھلا درویشی اور زر کا آپس میں کیا میل۔ اس کے بعد میں اسے اتنی کڑی سزا دوں گا کہ منور قطب الدین کا انج
دیکھ کر دوسرے دنیادار درویش بھی عبرت پکڑیں گے۔"

یہ سن کر صدر جہاں بولا "حضور اگر اس طریقے سے قطب الدین منور کے صدق و ریا کا اندازہ ہوسکتا ہے تو میں جلد سے جلد یہ کام انجام دینا چاہوں
اور پوری کوشش کروں گا کہ وہ یہ فرمان قبول کرتے ہی بنیں۔"

دربار سے نکل کر صدر جہاں نے ہانسی کی تیاری کی۔ اور ہانسی روانہ ہوگئے۔ شاہی فرمان انہوں نے ایک کپڑے میں چھپا لیا تھا۔ اُدھر جب شیخ قطب ال
کو صدر جہاں کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے اُسے فوراً خانقاہ میں بلایا اور مصافحہ کرنے کے بعد ایک چبوترہ نما اونچی سی صاف جگہ پر بٹھا دیا پھر قطب
منور نے صدر جہاں سے دریافت کیا "حضرت آپ کی تشریف آوری میرے لئے باعثِ مسرت ہے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

صدر جہاں بولے "حضرت آپ گوشہ نشینی میں بیٹھ کر جس طرح یادِ الٰہی میں مصروف ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلقِ خدا آپ سے بے خبر ہے۔ سلطا
آپ کی ریاضت اور عبادت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور وہ آپ کی خدمت کرکے آخرت میں سرخرو ہونا چاہتا ہے۔" یہ سن کر شیخ قطب بولے "صد
جو بات ہو اُسے صاف صاف بیان کر دینا چاہیئے۔" قطب الدین کی بات سن کر صدر جہاں ذرا سا ہچکچایا۔ پھر بولا "حضرت، سلطان تغلق کو آپ
خیال ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتا ہے کہ آپ جو دنیا سے بے نیاز اس طرح یادِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں تو پھر آخر آپ کی دنیاوی زندگی کی گذر بسر کیسے
ہوگی بس جب سے سلطان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اُس نے بے چینی سے اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ کو د
بطور نذرانہ دے دے تاکہ آپ اُن سے حاصل شدہ آمدنی سے اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کریں۔ اور معاشی پریشانیوں سے نجات پالیں۔

یہ کہہ کر صدر جہاں نے کپڑے میں لپٹا ہوا سلطان تغلق کا فرمان نکال کر آپ کی طرف بڑھایا لیکن آپ نے سختی سے اُسے واپس کرتے ہوئے کہا
میں مجبور ہوں میں اسے قبول نہ کر پاؤں گا۔" صدر جہاں نے حیرت سے پوچھا "حضرت مجبوری کس چیز کی ہے سلطان نے بڑی عقیدت و چاہت
کو بھیجا ہے۔ اگر آپ نے انکار کر دیا تو سلطان کا دل ٹوٹ جائے گا اور وہ سمجھے گا کہ اللہ کے نیک بندے اُس سے ناراض ہیں۔" آپ نے جوا
جہاں تمہارا کہنا بجا مگر ہم مجبور ہیں۔ ایک زمانہ گذرا۔ ہمارے بزرگ حضرت بابا فرید گنج بخش شکر کے پاس سلطان ناصر الدین نے اسی طرح جاگیریں بھیج
انہوں نے صاف انکار کر دیا اور ہمیں بھی ان چیزوں سے منع فرمایا۔ اب تمہی بتاؤ کہ ہم اپنے بزرگوں کا کہا کیسے ٹالیں۔ تم براہِ مہربانی بادشاہ کو ہما
آگاہ کر دینا میں سلطان کے احترام و اخلاص کی قدر کرتا ہوں۔ مگر اُس کا یہ تحفہ کسی طور قبول نہیں کر پاؤں گا۔"

صدر جہاں نے ہر ممکن کوشش کرکے دیکھ لی مگر قطب الدین کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ ہم مجبور ہیں اور اسے ہرگز قبول نہیں کریں
نے جب یہ دیکھا کہ قطب الدین کسی طور قابو میں نہیں آرہے تو آخری مرتبہ کوشش کرتے ہوئے بولا "حضرت میں تو مصیبت میں پھنس گیا۔ ج
کر جاتا ہوں تو اپنی تباہی کو آواز دیتا ہوں۔ سلطان برہم ہو کر یہی سوچے گا کہ بجائے میں نے آپ سے کس قسم کا برتاؤ کیا کہ آپ نے ا
کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا میں تو اب روپوش ہی ہو کر اس غضب سے بچ سکتا ہوں۔"

آپ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "قاضی صدر جہاں تجھے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اللہ نے چاہا تو سلطان ہرگز تجھ سے نارا
تو خوش خوش جا اور مطمئن ہو کر جا۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔" چنانچہ قاضی صدر جہاں ناکام ہو کر سلطان تغلق کے پاس پہنچا اور اُسے تمام ماجر
سلطان سے کہنے لگا "بادشاہ سلامت میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ قطب الدین فرشتہ صفت درویش ہیں۔ آپ کو یقیناً لوگوں نے ال
ہے۔ اب تو آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے ناں؟" سلطان نے کہا "اچھا۔۔ تو واقعی تمہارے کہنے کے مطابق یہ درویش بے ضرر اور بے غرض لگ
یہ ہے کہ میں اب بھی اس سے مطمئن نہیں ہو پایا۔ اور جلد ہی دوبارہ کوشش کروں گا کہ اُسے اس مصنوعی خول سے نکال کر ہی رہوں گا جس میں اُس نے
ایک مرتبہ آپ کسی ضرورت کے تحت دلی کے سفر پر نکلے۔ راستے کے لوگوں کو علم ہوا تو آپ کے ارادت مندوں نے آپ سے ملاقات
کرنے کے لئے راہ میں کھڑے ہونا شروع کر دیا۔ ان ارادت مندوں سے پہلے ان کے حق میں دعائیں کرتے جب آپ دلی میں داخل ہوئے تو

کے مریدوں اور ارادت مندوں نے گھیر لیا۔ اور آپ نے انہیں بھی وعظ ونصیحت کرنا شروع کر دی۔ وعظ کے دوران آپ نے ایک شخص پر نگاہ جمائے رکھی جسے ایک پل چین نہ تھا۔ اُس کے انداز واطوار سے لگ رہا تھا کہ وہ مُنہ میں کوئی بڑی بے چینی دبائے بیٹھا ہے چنانچہ آپ نے اُسے اپنے پاس بلایا اور نرمی سے پوچھا۔
"کیوں... تمہیں کیا بے چینی ہے؟ کس چیز کی بیقراری ہے جو تم یوں بے قرار سے ہو۔"

یہ سُن کر وہ شخص بولا "حضرت مجھے آپ سے ہی بات کرنا تھی اور اس کے لیے خود کو آمادہ کر رہا تھا کہ آپ کو کس طرح مخاطب کروں۔ اب جبکہ خوش قسمتی سے آپ نے خود ہی مجھ پہ اپنی نظرِ کرم ڈالی ہے تو مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے دوست خواجہ کافور اور اُن کے تین ساتھیوں کو سلطان نے نجانے کس بات پر خفا ہو کر جیل میں ڈال رکھا ہے کہ اب وہ چاروں جیل میں سڑ رہے تھے۔

آپ نے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا "اوہ... بڑا افسوس ہوا یہ سُن کر۔ مگر تم کون ہو؟"
وہ شخص بولا "حضرت میں اُنہی کا ساتھی ہوں۔"

آپ نے گہری نظروں سے اُسے ٹٹولا اور بولے "یہ غلط بیانی کر کے تم مجھ سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہو تم اُجرت پر کام کرنے والے نہیں؟ جس نے خواجہ کافور سے رقم کے لالچ کے بدلے اس کام کی حامی بھری کہ مَیں اُن کے لیے قطب الدین سے دعائے خیر کرا دوں گا۔"

یہ سُن کر وہ شخص تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ اور نادم ہوتے ہوئے بولا "حضرت آپ سچ کہہ رہے ہیں مَیں نے خواجہ کافور سے اس کام کا معاوضہ لیا ہے۔"

آپ نے فرمایا "خیر وہ تمہارا فعل ہے۔ بہر حال خواجہ کافور سے کہنا کہ اللہ نے چاہا تو سلطان اُسے بہت جلد اُس کے ساتھیوں سمیت بری کر دے گا مگر اُس کا چوتھا ساتھی زندہ باہر نہ آسکے گا۔"

وہ شخص جو خواجہ کافور کے لئے رحمت کی دُعا کرانے آیا تھا یہ سُن کر بہت خوش ہوا کہ جلد ہی خواجہ کافور باہر نکلنے والے ہیں مگر دُعا کے آخری حصے کو سُن کر وہ سخت دُکھ محسوس کرنے لگا لیکن پھر جلد ہی وہ اپنی اس کیفیت سے نکل کر آپ کو سلام کر کے چلا گیا۔

کچھ دنوں بعد سلطان تغلق نے خواجہ کافور اور اُس کے ساتھیوں کو بری کر دیا مگر اُن کا چوتھا ساتھی جیل میں ہی کسی بیماری کے باعث انتقال کر چکا تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ اپنے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں میں گھرے انہیں روحانی تعلیم سے فیض یاب فرما رہے تھے کہ ایک قلندر سا کہیں سے آن کر اُن میں شامل ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تو بیٹھا خاموشی سے آپ کی نصیحتوں بھری گفتگو سُنتا رہا۔ پھر کھڑا ہو کر بولا "حضرت اِک نظرِ کرم اِدھر بھی ڈال دیں"۔
آپ نے اُس پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر ایک مرید سے کہا کہ "اسے کھانا کھلا دو"۔

قلندر کو کھانا کھلایا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد قلندر نے کہا "شیخ اللہ سب کا رازق ہے۔ اُس نے کھانا تو تیری معرفت کھلا ہی دیا اب اگر تن ڈھانپنے کے لئے بھی کچھ مل جائے تو صد شکر ادا کروں"۔

یہ سُن کر آپ نے ایک مرید کو اشارہ کیا۔ مرید نے فوراً اُسے ایک جوڑا کپڑوں کا لا دیا۔ وہ قلندر کپڑوں کو گٹھڑی بنا کر بغل میں دباتے ہوئے بولا "حضرت بوڑھا قلندر ہوں ہر دم حالتِ سفر میں رہنے والا۔ اب تو پیدل چلنے کی سکت نہیں رہی۔ اگر ایک گھوڑا بھی عنایت کر دو تو بڑی مہربانی ہو گی۔

حضرت قطب الدین نے ایک مرید کو گھوڑا لانے کا اشارہ کیا۔ مرید نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور آپ کو گھوڑے کی لگام لا کے تھما دی۔ آپ نے وہ فوراً اُس قلندر کو تھماتے ہوئے کہا "لے اب گھوڑا بھی تجھے مل گیا ہے اب تو تو مطمئن ہے ناں۔"

یہ سُن کر قلندر بے نیازی سے بولا "شیخ... بھلا خود سوچ میں قلندر بندہ۔ اپنے کھانے کا انتظام تو کر نہیں سکتا اس گھوڑے کو کدھر سے کھلاؤں گا۔"
یہ سُن کر آپ بولے "پھر اب مَیں کیا کروں؟ آخر تو چاہتا کیا ہے؟"
قلندر بولا "جہاں آپ نے مجھ پر اس قدر احسان کئے وہاں ایک احسان اور بھی کر دیں اور مجھے کچھ نقدی عطا کر دیں تاکہ مَیں اُس سے گھوڑے کے لئے خوراک خرید کر اُسے کھلا سکوں۔

آپ نے اُسی وقت سو ٹنکوں کی تھیلی نکال کر اُس قلندر کو تھما دی۔ اور کہا "قلندر فی الحال تو اسی سے گذارا کر جب یہ بھی ختم ہو جائیں تب آجانا۔"
قلندر کی خواہشات لامحدود تھیں۔ یا پھر شاید وہ بہت لالچی انسان تھا۔ سو اُس نے ٹنکوں کی تھیلی کپڑوں میں باندھتے ہوئے کہا "حضرت ختم ہو جائیں تب آنا کیا مطلب؟ یہ تو سمجھیں ختم ہو ہی گئیں۔"

لاکھوں روپے کے ہزاروں انعامات جیتیے
فلپس گولڈن اسکیم میں حصّہ لیجئے
فلپس کے ۱۰۰ فیصد کوالٹی بلب خریدیئے اور بیش قیمت انعامات جیتئے۔
WIN!
انعامات
قواعد و ضوابط
Lighting

فلپس

آپ نے سوالیہ انداز میں اُسے دیکھا تو وہ بولا "ہاں حضرت! — یہ سو تنکے تو گھوڑے کی خوراک کے لیے ہیں بھلا کہاں سے کھاؤں گا مجھے بھی تو کچھ نقدی عنایت کریں"۔

یہ سُن کر قطب الدین غصے میں آگئے اور بولے "قلندر... تُو تو بڑا لالچی اور حریص بندہ نکلا۔ بھلا تجھے کون قلندر کہے تیری ایک کے بعد ایک جائز ناجائز خواہش پوری کی گئی مگر تو کہیں بس ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا"۔

حضرت قطب الدین منور کے ایک مرید نے جو یوں مرشد کو قلندر پر گرم ہوتے دیکھا تو اس نے فوراً جھپٹ کر اُسے دبوچ لیا اور باہر کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا "تو بھی حریص انسان ہے۔ ہمارے مرشد نے تیری ہر خواہش پوری کی لیکن تو کہیں بھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اس قلندری میں یہ دُنیاداری توبہ... توبہ۔ نہ آج تک دیکھی نہ سُنی"۔ قلندر نے پوری جدّوجہد اور زورصرف کر کے خود کو مرید سے چھڑوایا اور قطب الدین کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں بولا "حضرت یہ کیسے مرید پال رکھے ہیں آپ نے جنہیں تہذیب چھو کر بھی نہیں گذری۔ کیا آپ نے انہیں یہ تعلیم نہیں دی کہ قلندروں سے کیسا سلوک کرنا چاہیئے"۔

آپ نے قلندر کی بات سُنتے ہوئے کہا "میرے مرید میں ذرا بھی خامی نہیں۔ یہ تو ہے ہی ایسا کہ اچھا بھلا انسان بھی تیرا طرزِ عمل دیکھ کر غصے میں آئے بنا نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ تو بتا کہ تو نے جو اپنی کمر کے ساتھ تنکوں کی بھری تھیلی علیحدہ — باندھ رکھی ہے۔ وہ کس کام کے لئے ہے؟ تُو پہلے اُسے تو استعمال کر جب تیرے پاس کچھ نہ ہو تب تو مانگتا بھی اچھا لگے۔ مگر مجھے تو لگتا ہے کہ تُو تو ہے ہی حریص اور لالچی انسان"۔ آپ کے مرید نے جب یہ سُنا کر قلندر کے پاس اپنا بھی مال علیحدہ سے ہے تو اس نے فوراً اُسے دوبارہ پکڑا۔ اور زبردستی تھیلی کمر سے کھول کر دیکھی تو وہ لبالب مُنہ تک بھری تنکوں کے بوجھ سے لدی تھی۔ سبھی نے حیرت سے قلندر کو دیکھا اور پوچھا "قلندر یہ کیا ماجرا ہے؟ کیوں قلندری کو بدنام کرتا پھر رہا ہے۔ درویشی کے ساتھ دنیاداری کا جوڑ آج تک کہاں مل پایا ہے جو تو ان دونوں کا ملاپ کر رہا ہے"۔

قلندر نے یہ سُن کر ایک شانِ بے نیازی سے جواب دیا "مجھے نہ گھوڑے سے دلچسپی ہے نہ مال و زر سے بلکہ میں تو تمہیں اُس عظیم شخص کی عظمت و بڑائی سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ جسے تم دن رات سامنے دیکھتے ہو قطب الدین جیسے عظیم درویش کم ہی دُنیا سے گذرے ہیں"۔

اس کے بعد قلندر تو یہ کہہ کر چلا گیا اور گھوڑا تنکوں کی تھیلی سمیت ہی چھوڑ گیا لیکن وہ حضرت قطب الدین کے مرتبے سے اُن کے مریدوں اور ارادت مندوں کو آگاہ ضرور کر گیا کہ وہ عرفان کی کس بلندی پر ہیں۔ کتنے روشن ضمیر اور باعمل بزرگ ہیں۔

ایک مرتبہ سلطان اپنی سلطنت کے دورے پر نکلا اور گھومتا ہوا ہانسی کے قریب آن نکلا سلطان تغلق کے ساتھ اس کے خوشامدی درباری بھی تھے ہانسی کے نزدیک پہنچ کر اُن کے پرانے زخم پھر درد کرنے لگے اور انہیں شیخ قطب الدین کی یہاں کی بے تاج بادشاہت سانپ بن کر ڈسنے لگی چنانچہ انہوں نے بادشاہ کو قطب الدین کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ مگر بادشاہ نے اس مرتبہ اُن کی باتوں کا کوئی خاص اثر نہ لیا۔

ہانسی میں سلطان کا امیر مخلص الملک کے نام سے مشہور تھا۔ سلطان اسے بہت پسند کرتا تھا کیونکہ وہ بھی سلطان ہی کی طرح ظلم و تشدد کا شوقین اور انتہائی ظالم ...ص تھا۔ چنانچہ سلطان نے ایک دن اُسے اپنے پاس بلایا اور کہا "مخلص الملک مجھے ہانسی کے قلعے کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ تُو آج ہی قلعے کا ...ئزہ لے کر بتا کہ قلعے کی کہاں کہاں سے مرمت والی ہے۔ اُسے تو ایک اہم فرض سمجھ کر انجام دے۔ اور دیکھ میں نے تجھے لائق فائق سمجھ کے ہی یہ کام تیرے ...پرد کیا ہے۔ اب تو سمجھداری سے انجام دینا اور جلد سے جلد میری خدمت میں نتیجہ پیش کرنے کی کوشش کرنا"۔ چنانچہ مخلص الملک سلطان کے حکم کی تعمیل کرنے فوراً ہی نکل کھڑا ہوا۔

حضرت شیخ قطب الدین منور کا گھر قلعے کے قریب ہی تھا۔ چنانچہ جب مخلص الملک قلعے کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ ایک گھر میں بہت سے لوگ عزت و احترام کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور پھر اُسی عزت و احترام سے اُلٹے قدموں باہر نکلتے ہیں۔ جیسے کسی شاہی دربار میں حاضری دے کر بندہ باہر آتا ہے ...تا ہے۔ اُس نے حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ بالآخر اپنے ساتھیوں سے پوچھنے لگا کہ "یہ کس کا گھر ہے جس میں لوگ یوں احترام سے داخل ہو رہے ہیں؟" ...کے ساتھیوں نے جواب دیا "حضور، یہ یہاں کے مشہور صُوفی حضرت شیخ قطب الدین منور کا گھر ہے۔ یہ بزرگ ہانسی کے مشہور درویش شیخ جمال الدین ...کے پوتے بھی ہیں"۔

...الملک پھر بولا "خیر وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ لوگ کیوں اس قدر تعداد میں اُس کے گھر جاتے ہیں"۔ ساتھیوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

اور پھر ایک ہمت کر کے بولا "حضور حیرت ہے آپ کو آج تک شیخ صاحب کی عظمت و مقام کا ہی علم نہ ہو سکا۔ شیخ منور اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اور لوگ ان کی محبت میں رہ کر سکون اور فلاح پاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ان کے عقیدت مند، ارادت مند اور مرید ہیں جو اتنی بھاری تعداد میں آتے جاتے رہتے ہیں۔" اب کے مخلص الملک نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "اچھا تو یہ وہی منور قطب الدین ہیں جو دلی کے نظام الدین اولیاء کے مرید اور خلیفہ ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں حد سے زیادہ اکھڑ اور خود سر۔ ان کا دماغ تو ساتویں آسمان سے باتیں کرتا ہو گا۔" یہ کہہ کر اُس نے خود ہی بھونڈا سا قہقہہ لگایا۔ اُس کے ساتھیوں نے ناگواری سے اُسے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔

مخلص الملک نے شیخ منور سے ملنے کا ارادہ کیا اور اُن کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اُن کے مرید سے رُعب دار آواز میں بولا "جاؤ اپنے خلیفہ سے کہو کہ ہانسی کا امیر مخلص الملک مُلاقات کے لئے آیا ہے۔"

مرید یہ سُن کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا اور اُسے اندر لے گیا۔ مخلص الملک گھر میں داخل ہو کر جونہی شیخ قطب الدین کے سامنے پہنچا تو بنا سلام کئے بدتہذیبانہ انداز میں مخاطب ہوا کہ "شیخ... کیا تجھے علم نہیں کہ دلی کا تاجدار ہانسی آیا ہوا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں مجھے علم ہے کہ آج کل سلطان تغلق ہانسی آکر ٹھہرا ہوا ہے۔"

مخلص الملک بولا "خوب... سب معلوم ہے تو پھر جناب نے زحمت کیوں گوارہ نہ کی کہ بادشاہ سلامت کو سلام کر آتے۔"

آپ نے مخلص الملک کے گستاخانہ رویے کو محسوس تو کیا مگر نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے بولے "مخلص الملک ہم درویش انسان ہیں ہمارا دنیاوی راج پاٹ سے کیا تعلق۔ شاہی دربار ہم فقراء کو راس نہیں آتا۔ اس لئے میں بادشاہ کو سلام کرنے نہیں جا سکا لیکن میں اپنے پیروں کی طرح یہاں گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر سلطان کے حق میں ضرور دعائیں کرتا ہوں۔ پھر اس صورت میں، میں یہ ضروری خیال نہیں کرتا کہ دربار میں جا کر سلطان کو سلام کروں۔"

آپ کی بات سُن کر مخلص الملک طنزیہ انداز میں ہنسی ہنستے ہوئے بولا "خوب تو آپ یہاں حجرے میں بیٹھ کر سلطان کے حق میں کلمہ خیر پڑھتے رہتے ہیں مگر شیخ پوشیدہ رہ کر سلطان کے حق میں دُعا کرنے سے بہتر ہے کہ تُو جا کر سلطان کی خدمت میں سلام پیش کر۔"

یہ سُن کر آپ نے فرمایا "مخلص الملک تو کیوں خواہ مخواہ مجھ سے بدگمان ہوا جا رہا ہے کسی کے بارے میں یوں شک و شبہ کا اظہار کرنا اچھی عادت نہیں جب میں نے تجھے ایک مرتبہ بتا دیا ہے کہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ بادشاہوں کے دربار میں حاضری دوں تو پھر کیوں تُو مجھے وہاں گھسیٹ کر لے جانا چاہتا ہے؟"

مخلص الملک سے ایسی باتیں بھلا کب کس نے کی تھیں۔ وہ طیش میں آگیا اور کھولتے ہوئے لہجے میں بولا "شیخ تجھے بادشاہ کے دربار میں جا کر حاضری تو اب ضرور ہی دینا ہی ہو گی میں سلطان کا برسوں سے نمک کھا رہا ہوں بھلا سلطان کی یہ سبکی کیسے برداشت کر لوں کہ سلطان ہانسی میں موجود ہو اور اہل ہانسی سلام کرنے نہ جائیں۔"

اب آپ کو بھی مخلص الملک پر غصہ آگیا۔ آپ نے درشتی سے جواب دیا "مخلص الملک تیری طبیعت میں جوش اور فساد کا عنصر ہے وہ میں خوب جانتا ہوں یہ میری اپنی ذمہ داری ہے کہ میں کب کس وقت سلطان کے دربار میں حاضری دُوں۔ تیرا اس سے کیا واسطہ۔ اب تو جا سکتا ہے جس کام کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ وہ جا کر انجام دے۔"

آپ کی یہ صاف اور کھری کھری باتیں سُن کر مخلص الملک بولا "شیخ میں جا تو رہا ہوں لیکن اتنا بتا دوں کہ میں بھی تمہیں دربار بلا کر ہی دم لوں گا دیکھتا ہوں تمہاری درویشی میں کتنا دم ہے۔" یہ سُن کر آپ بولے "مخلص الملک کچھ خُدا کا خوف کر کیوں درویش کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے [illegible] غضب کا ذرا برابر ڈر نہیں؟"

مخلص الملک غصے میں وہاں سے نکل کر قلعہ میں داخل ہوا اور قلعے کا اچھی طرح معائنہ اور جائزہ لے کر سلطان کے پاس پہنچا اور قلعے کے بارے میں [illegible] سے آگاہ کرنے کے بعد بولا "سلطان قلعے کو دشمنوں سے بچاؤ کے لئے آپ کا اسے مضبوط بنانا احسن ہے مگر شاید آپ کو معلوم نہیں کہ قلعے میں [illegible] بادشاہت کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح ایک متکبر ترین انسان چاٹ رہا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنے اس طرزِ عمل سے فساد و شر پھیلا کر [illegible] لیے مشکلات کا باعث نہ بنے۔" سلطان نے نرمی سے پوچھا "آخر واقعہ کیا ہے؟ جو کہنا ہے وہ صاف صاف کہو۔"

جواب میں مخلص الملک نے اپنی شیخ قطب کے ساتھ ہوئی گفتگو کا تمام خلاصہ کہہ سنایا۔
سلطان نے پوری بات سن کر اسی نرمی میں مخلص الملک سے کہا "مخلص الملک میرا خیال ہے وہ شیخ درست ہی ہے۔ یہ لوگ گوشہ نشیں ہو کر ہی رہتے ہیں۔ انہیں خواہ مخواہ تنگ کرنا مناسب نہ ہے گا۔" لیکن مخلص الملک اپنی بات پر ہی اڑا رہا اور کہنے لگا "مجھی ہوئیں تو اُسے کہہ آیا تھا کہ میں تجھے سلام کیلئے شاہی دربار بلا کر ہی چھوڑوں گا۔"

سلطان نے یہ سن کر ہنسنا شروع کر دیا اور بولا مخلص الملک تو اتنا ضدی ہوگا مجھے اس کا آج سے پہلے اندازہ نہیں تھا بہر حال اب جبکہ تو کہہ ہی آیا ہے تو اس درویش کو تو اب سلام کہنے آنا ہی پڑے گا۔"

چنانچہ سلطان نے تالی بجائی۔ اور اگلے ہی لمحے اُس کے سامنے جاہ وتکبر کا مجسمہ گوشت پوست کی حالت میں آن کھڑا ہوا سلطان نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "شیخ حسن۔ ہانسی میں ایک درویش شیخ منور کے نام سے مشہور ہے۔ غرور اور انا کا پجاری۔ وہ اب تک ہمیں سلام کرنے نہیں آیا تو اس کے پاس جا اور اُسے ہر حال میں لے کر دربار حاضر کر۔" شیخ حسن۔ آپ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ آپ کی عاجزی وانکساری کا بھی علم رکھتا تھا اس لئے اُس نے بادشاہ کا یہ حکم حیرت سے سنا لیکن کہا کچھ نہیں اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت قطب الدین کو لانے چل پڑا۔ ابھی وہ آپ کے گھر سے چند کوس کے فاصلے پر ہی ہوگا کہ اُس نے سبھی ہتھیار اتار کر علیحدہ رکھے اور ساتھیوں کو وہیں روک کر خود اکیلا شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے قدموں میں سر رکھ کر بولا "شیخ ایک کمینہ انسان درخواست لے کر آیا ہے۔"

آپ نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں شیخ حسن کہو کیسے آنا ہوا؟"

شیخ حسن نے تمام ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح سلطان تغلق کو ہانسی کے امیر مخلص الملک نے بھڑکا دیا ہے چنانچہ اب وہ انہیں دربار بلانے کے لئے ضد کی حد تک آگے بڑھ چکے ہیں۔ شیخ منور نے کچھ دیر سوچا۔ پھر کہا "شیخ حسن ہم تمہیں مایوس نہیں کریں گے تم اپنا فرض پورا کرنے آئے ہو۔ لہٰذا ہم تمہیں اس کا موقعہ دیں گے بس تم ہمیں اتنی مہلت دے دو کہ ہم تیاری کر لیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد آپ تیار ہو کر باہر نکل آئے۔ اس حال میں کہ مصلیٰ کندھے پر رکھا ہوا اور عصا ہاتھ میں۔ آپ نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔ شیخ حسن نے بہت اصرار کیا کہ آپ گھوڑے پہ سوار ہو جائیں مگر آپ نے صاف انکار کر دیا۔ سو شیخ حسن نے بھی آپ کے ساتھ پیدل چلنا شروع کر دیا۔ جب سردار پیدل چل رہا ہو تو ساتھی کیسے سواری کر سکتے تھے لہٰذا شیخ حسن کے ساتھی بھی گھوڑوں کی باگیں تھامے پیدل چلتے رہے۔

سلطان محمد تغلق ہانسی سے آٹھ میل دور ہنسی نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شیخ حسن نے سلطان کو جا کر اطلاع دی کہ وہ حضرت شیخ قطب الدین منور کو ساتھ لے آیا ہے لیکن سلطان نے شیخ منور سے فوراً ملنا گوارہ نہ کیا۔ اور دلی کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اب شیخ کو بھی دلی تک لازماً جانا ہی تھا۔ چنانچہ آپ نے بھی دلی کا سفر اختیار کیا۔ دلی پہنچ کر سلطان نے شیخ منور کو دربار میں طلب کیا۔ دربار میں ایک سے بڑھ کر ایک امراء بیٹھے تھے۔ زرق برق لباس پہنے شان وشوکت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹھاٹھ باٹھ سے خود کو نمایاں کئے ہوئے تھے۔

سلطان کے سامنے پہنچتے ہی آپ نے مصافحے کیلئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سلطان نے بھی غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر آپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ آپ نے زور سے سلطان کا ہاتھ دبایا۔ سلطان نے آپ سے شکایت آمیز لہجے میں کہا "حضرت کیا میں اتنا ہی گیا گذرا انسان ہوں کہ آپ نے سلطنت میں ادنیٰ ادنیٰ فرد کے ساتھ ملاقات کی لیکن مجھے ملنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ نہ مجھ پہ کوئی توجہ دی۔ حالانکہ مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کے ناطے میرا پہلا حق تھا کہ اللہ کے نیک بندے میری راہنمائی فرماتے۔"

آپ نے کہا "سلطان میں بادشاہوں سے مل کر انہیں دعائیں دینے کی نسبت گوشہ تنہائی میں اُن کے حق میں دعا کرنے کا زیادہ قائل ہوں۔ اس لئے بندہ مجھے حاضری اور ملاقات سے بالکل ہی معذور سمجھا جائے۔"

سلطان نے غور سے اس صاف گو اور کھرے انسان کو دیکھا۔ پھر ندامت بھرے لہجے میں بولا "حضرت مجھے تمام عمر افسوس رہے گا کہ میں نے ناحق آپ کو تکلیف دی۔" آپ خاموش ہی رہے۔

تھوڑی دیر بعد سلطان نے کہا "حضرت آپ کی کوئی خواہش ہو تو بیان کیجئے مجھے اس کی تکمیل سے خوشی محسوس ہوگی۔"

رُوح افزا

بے شمار خوبیوں اور خواص کا حامل مشروب

مقابلتاً با کفایت بھی

رُوح افزا ہماری تہذیب ہے!

رُوح افزا ہماری ثقافت ہے!

ہمدرد نے اس تہذیب و ثقافت کی عظمت اور حفاظت رُوحِ فکر کے ساتھ کی ہے۔ ہر حال میں بلند معیار کو برقرار رکھا ہے۔ اجزائے خام کی گرانی پاکستان کی ایک اقتصادی و معاشی مجبوری ہے، بہ ایں ہمہ مقابلتاً ہمدرد کا منافع قلیل تر ہے اور یہ قلیل تر اور جائز منافع بھی الحمدللہ مدینۃ الحکمت کی صورت میں قوم کو واپس کر رہے ہیں۔ مدینۃ الحکمت آج کی آواز بھی ہے اور کل کی حقیقت بھی، جب دنیا اعتراف کرے گی کہ سرزمینِ پاکستان پر ایک شہرِ علم و حکمت نے وجود حاصل کیا ہے جو ایک علمی و عالمی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جسے اہلِ پاکستان نے بنایا ہے۔

رُوحِ پاکستان۔ رُوح افزا

راحتِ جان رُوح افزا مشروبِ مشرق

ہمدرد
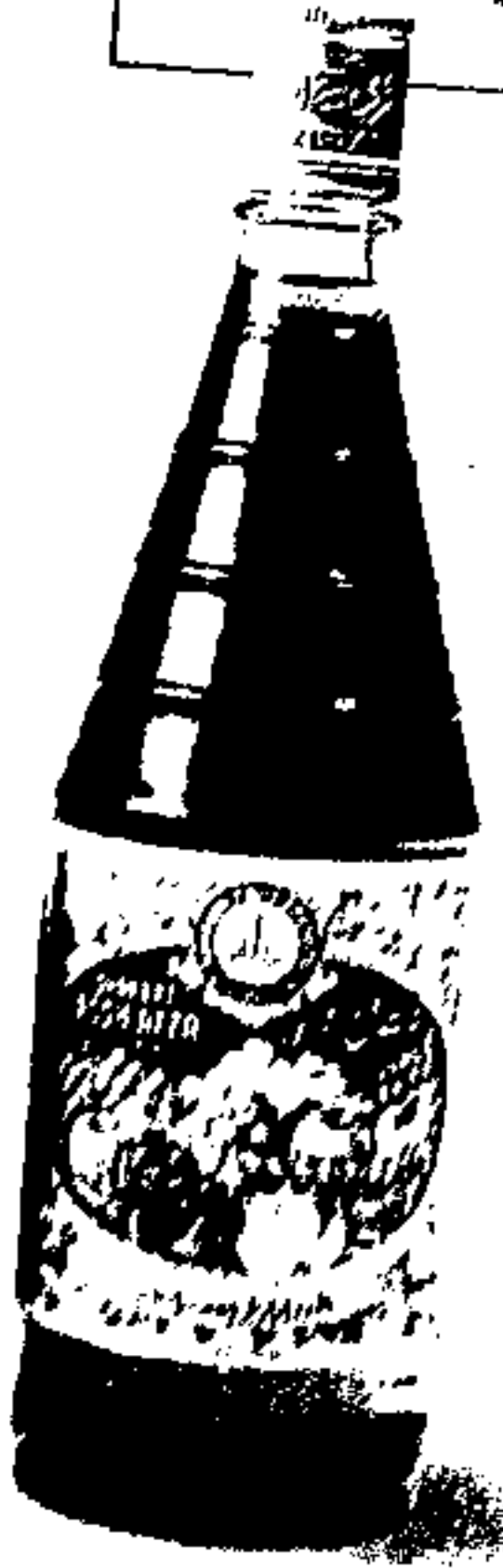
مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

A-3/94

آپ نے فرمایا "سلطان میری کوئی خواہش نہیں۔ میں درویش بندہ ہوں۔ اللہ پہ توکل رکھنے والا۔ بھلا میں بندوں سے کیوں خواہشات بیان کرتا پھروں۔ ال البتہ اتنی بات ضرور کہوں گا کہ اب مجھے ہانسی جانے کی اجازت ضرور دی جائے۔ تاکہ میں وہاں رہ کر سکون سے اپنے آباؤاجداد اور پیروں کی خدمت رسکوں۔" سلطان شرمندہ ہو کر بولا "حضرت اس میں اجازت کا کیا سوال آپ مرضی کے مالک ہیں چاہیں تو دلی رہیں یا ہانسی میں کیوں آپکو روکوں گا۔"
اس کے بعد سلطان نے آپ کو عزت واحترام کے ساتھ ہانسی کی طرف روانہ کر دیا۔

آپ کے واپس جانے کے بعد سلطان نے ایک مرتبہ اپنے خاص امیر ملک کبیر سے باتیں کرتے ہوئے کہا "کبیر میں نے زندگی میں لاتعداد لوگوں سے مصافحہ یا۔ مگر ہر بار مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ کر کانپا لیکن شیخ واحد انسان تھے۔ جنہوں نے میرے ہاتھ کو مضبوط گرفت میں رکھا۔ اور جب ہوں نے میرے ہاتھوں کو خفیف سا دبایا تو میں لرز گیا کہ کہیں یہ ان کی ناراضگی کا تو اظہار نہیں۔ میں نے انہیں ستایا بھی تو بہت تھا لیکن اس میں برا بھی کیا قصور؟ کسی کے حاسد اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ دوسرے کے دل و دماغ پر چھا کر اس حد تک اس کی عقل سلب کر لیتے ہیں کہ پھر وہ انہی کے زاویے سے سوچنے لگتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ شیخ کے حاسدوں نے مجھے ان کے خلاف اس قدر بھڑکایا کہ میں بدظن ہوئے بنا رہ سکا۔ اور انہیں ہر طرح سے ستایا۔ خدا مجھے معاف کرے۔"

اب سلطان کو قلبی بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اسے رہ رہ کر خیال ستاتا کہ اس نے اللہ کے ایک نیک بندے کو ستا کر اچھا نہیں کیا۔ چنانچہ ب یہ بے چینی حد سے بڑھی تو اس نے اپنے خاص امیر برنی اور بھتیجے فیروز شاہ تغلق کو بلایا۔ فیروز شاہ تغلق شیخ منور کا بہت عقیدت مند تھا۔ در شیخ بھی اس پر خصوصی نظر کرم رکھتے تھے۔

سلطان نے برنی سے کہا "عجب ہے شیخ منور کے ساتھ زیادتی کی ہے کسی پل چین نہیں۔ دل کا سکون غارت ہو چکا ہے۔ سوچتا ہوں نجانے اللہ مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں۔ میں خوشامدی درباریوں اور شیخ قطب الدین کے حاسدوں کی باتوں میں آ کر بہت گناہ کر بیٹھا۔"
سلطان کی بات سن کر برنی بولا "حضور اس قلبی بے چینی کو دور کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ آپ شیخ صاحب کی خوشنودی حاصل کریں اور خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں زر و جواہر سے لاد دیں۔"
سلطان نے اس تجویز کو موزوں سمجھتے ہوئے۔ اسی وقت ایک لاکھ تنکوں سے بھری تھیلیاں آپ کی خدمت میں روانہ کیں۔ ساتھ ہی اپنے بھتیجے فیروز تغلق کو بھی روانہ کر دیا اور اسے ہر ممکن تاکید کی کہ "دیکھو ناکام نہ لوٹنا خواہ کچھ ہو تم نے انہیں شیخ منور کی خدمت میں لیجانا ہے۔ اور قبول بھی کروانا ہے۔ انہوں نے واپس لوٹا دیے تو میرے دل کی بیقراری مجھے کہیں کا نہ رکھے گی۔"
الغرض برنی اور فیروز تغلق وہ مال لے کر اسی وقت ہانسی کو روانہ ہوئے اور شیخ قطب الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر آمد کی غرض بیان کرتے ہوئے وہ مال آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہا لیکن قطب الدین نے سخت ناگواری سے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا "فیروز یہ تجھے کیا ہو گیا ہے تو نے مرشد کو دنیاوی مال و زر میں الجھانا چاہتا ہے۔ جب سلطان کو اس بات کا مشورہ دیا گیا ہو گا اس وقت تم نے منع کیوں نہ فرمایا۔" آپ کی بات سن فیروز تغلق بولا "حضرت سلطان نے ہماری کہاں سننی تھی۔ اسے تو بس یہی خواہش ہے کہ کسی صورت آپ کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اب اگر آپ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کیا تو سلطان نجانے کیا سمجھے اور پھر اس کا بھی ہمیں کچھ علم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو۔" آپ نے فرمایا "وہ سب لیکن میں اس قدر مال و زر لے کر کروں گا کیا۔ میں درویش بندہ ہوں میرے لئے پیالہ بھر چاولوں کی کھچڑی ہی کافی ہے۔ پھر میں اس قدر زر کو کہاں کروں گا۔"

تغلق بولا "حضرت آپ کچھ بھی کریں انہیں قبول تو آپ کو کرنا ہی ہے۔ ورنہ میں تو کم از کم ناحق مارا ہی جاؤں گا۔"
آپ نے کچھ سوچتے ہوئے اس میں سے دو ہزار تنکے نکال لئے۔ اور باقی واپس کر دیئے۔ فیروز تغلق خوش ہو گیا کہ چلو حضرت نے کچھ تو قبول کیا۔ وہ خوشی خوشی لوٹ گیا۔ آپ نے ان دو ہزار تنکوں سے سلطان المشائخ اور حضرت بختیار کاکی کا مزار درست کروایا اور باقی رقم حاجت مندوں میں بانٹ دی۔
اس کے بعد آپ دلی نظام الدین اولیاء کے مزار پر عرس میں شرکت کرنے گئے۔ وہاں محفل سماع نے وہ منظر باندھا تھا کہ آپ بے خود ہو گئے۔ اور رونے لگے۔ آپ کے وجد اور کیف کی حالت کو دیکھ کر لوگوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ آپ سے زیادہ اس محفل میں اور کوئی اتنا وجد اور کیف کی حالت میں نہ ہو گا۔

ایک مرتبہ ایک مرید نے پوچھا "حضرت فقر کیا ہوتا ہے؟" آپ نے جواب دیا "فقر کی دو اقسام ہیں۔ ایک کو فقر اضطراری کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کو فقر اختیاری۔ فقر اضطراری اُسے کہتے ہیں کہ انسان بالکل ہی مفلس ہو کہیں سے مال و زر کا حصول ممکن نہ ہو اور حد سے زیادہ تنگ دست ہونے کے باوجود صبر شکر سے رہے تو ایسے فقیر کا صابرین، صابر کی فضیلت سے ہمکنار ہوتا ہے اور فقر اختیاری وہ چیز ہے کہ انسان کے پاس مال و زر کی بہتات ہوتے ہوئے بھی وہ فقیری اختیار کیے رکھے۔ جمع شدہ مال کو یا وصول ہوتے رہنے والے مال و زر کو وہ غریبوں اور دوسرے حاجت مندوں میں بانٹتا رہے۔ اور اپنے لئے کچھ بھی نہ رکھے۔ حضور نے فقر کی اس حالت کو اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لئے بہت محبوب ٹھہرایا ہے۔"

اسی طرح آپ ایک مرتبہ وعظ و نصیحت کی محفل گرم کیے بیٹھے تھے کہ ایک مرید بولا "حضرت آپ نے سلطان تغلق کے دربار سے آئے ایک لاکھ ٹنکے ٹھکرا کر بہتر نہیں کیا۔ اس دولت سے لاتعداد حاجت مندوں کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔" آپ نے فرمایا "بے شک اُس دولت سے اکثر کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں لیکن سلطان کا مال مشتبہ تھا۔ اور جب میں کوئی چیز اپنے لئے اس وجہ سے پسند نہ کروں تو تم لوگ مجھ سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ میں اپنے ساتھیوں کو وہ ناپسندیدہ چیز دلواؤں گا۔"

آپ دیر تک مریدوں اور عقیدت مندوں کو وعظ و نصیحت فرماتے رہتے تھے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "جب انسان کسی رائے پہ مستحکم انداز میں ڈٹ جائے اور اللہ پر بھروسہ رکھے کہ وہ مدد فرمائے گا تو پھر اُس پر دُنیا کی کوئی طاقت غالب نہیں آسکتی۔ اللہ توکل کرنے والے کو بہت پسند کرتا ہے۔ انسان سوچے کہ اگر اللہ ہی اُس کا ساتھ چھوڑ دے تو پھر دُنیا کی وہ کون سی طاقت ہوگی جو اُسے ذلت و پستی کی دلدل سے بچائے رکھے گی۔ اس لئے جو سچے مومن ہیں وہ اللہ پر توکل کرتے ہیں اُسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔"

اور پھر ایک دَور ایسا آیا کہ آپ خاموش خاموش رہنے لگے۔ ہانسی والوں نے آپ میں یہ تبدیلی دیکھی تو محسوس کیے بنا نہ رہ سکے۔ انہوں نے آپ سے دریافت کیا "حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ آجکل بہت چُپ چاپ رہتے ہیں؟" آپ نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے آباؤ اجداد کی رُوحیں مجھے اپنی طرف بُلا رہی ہیں اور مجھے اُن کے پاس جانا ہی ہوگا۔ کوئی انسان فانی نہیں۔ سبھی نے ایک دن اپنے خالق کی طرف لوٹ جانا ہے۔"

یہ سُنتے ہی لوگوں نے رونا شروع کر دیا۔

اس بات کے چند دن بعد آپ کا انتقال ہو گیا اور پھر آپ کو آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے دادا جمال الدین ہانسویؒ کے قدموں میں دفن کر

خلیفہ منصور نے امام مالکؒ اور امام عبداللہ بن طاؤس کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔ جب یہ دونوں بزرگ دربار میں پہنچے تو خلیفہ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا۔ جب دونوں بزرگ بیٹھ گئے تو خلیفہ منصور نے حضرت عبداللہؒ سے کہا کہ کوئی ایسی حدیث سنائیے جو آپ نے اپنے والد سے سُنی ہو۔

حضرت عبداللہؒ نے کہا، رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن سخت عذاب اس شخص پر ہوگا جس کو خدا نے اپنی حکومت میں شریک کیا لیکن اس نے ظالمانہ طریقے پر حکومت کی۔ خلیفہ منصور کو اِنکا ظالمانہ طرزِ حکومت پر بے حد غصہ آیا اور امام مالکؒ کو یہ خیال گزرا کہ خلیفہ منصور حضرت عبداللہ کو ضرور قتل کرا دے گا۔ اس وقت حضرت عبداللہ کے ہاتھ میں دوات دبی ہوئی تھی۔ خلیفہ منصور نے کہا، لاؤ یہ دوات مجھے دو۔"

حضرت عبداللہ نے دوات دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے دُوسری بار اور پھر تیسری بار دوات مانگی اور یہ برابر انکار کرتے رہے۔

منصور عباسی نے غصے سے پوچھا، یہ تم دوات کیوں نہیں دیتے؟ حضرت عبداللہ نے کہا، صرف اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری دوات کی سیاہی سے تم کوئی ظالمانہ حکم لکھو اور میں اعانتِ ظلم میں تمہارا شریک ہو جاؤں۔"

منصور عباسی نے خفیف ہو کر کہا "اچھا اب آپ دونوں حضرات یہاں سے تشریف لے جائیں۔ حضرت عبداللہ کھڑے ہو گئے۔ فرمایا "ہم بھی یہی چاہتے تھے۔"

یہ کہانی کرمان شاہ کے حاکم کی ہے جو دستِ لوط کے مشرق جنوب میں آباد تھی یہ حاکم جو شاہ شجاع کرمانی کے نام سے مشہور تھا، سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ جو چاہا، پالیا اور جو سوچا، مل گیا۔ دُنیاوی عیش وآرام میں اس حد تک گم کر لہو ولعب ہی سب کچھ اور آخرت وعقبیٰ کے نام تک سے ناواقف۔

سیر وشکار کے رسیا۔ گھڑسواری میں اس قدر طاق تھے کہ بڑے بڑے شہسوار بھی اُن کے سامنے نہ ٹھہر سکتے تھے۔ وہ تسلیم کر چکے تھے کہ شاہ شجاع کو گھڑسواری میں شکست دینا ناممکن ہے اور وہ ابوالفورس یعنی ماہر ترین گھڑسوار، دُنیا کے عاشق۔ ہر لمحے سے لطف اندوز ہونا جن کا مقصد حیات تھا، اللہ والے انہیں سمجھاتے، "شاہ شجاع یہ دُنیا فانی ہے۔ اپنی آخرت کو سنوارو۔" تو اس پر وہ حقارت سے جواب دیتے "تم دُنیا کے عیش وآرام کو کیا جانو۔ وہ کیفیت جو اُن کے حصول سے وجود پر طاری ہوتی ہے تم اُسکی لذت سے ناآشنا ہو۔" نصیحت کرنے والوں نے جب دیکھا کہ یہ تو دُنیاوی خواہشات کے غلام بن چکے ہیں تو وہ یہ سوچ کر خاموش ہو بیٹھے کہ اب کوئی انقلاب ہی انہیں راہ راست پر لاسکتا ہے۔ درباری اپنے بادشاہ کو ہر لمحہ خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ بادشاہ کی خوشی ہی اُن کے دُنیاوی آرام و عیش کی ضمانت تھی۔

میر شکار، بادشاہ کی خوشنودی کیلئے ہر وقت جنگل میں جستجو کیے رہتا، کہیں کوئی شکار نظر آئے تو بادشاہ کو آگاہ کرے۔ ایک روز انہوں نے جو ہرنوں کی ڈار دیکھی۔ تو خوشی سے باچھیں کِھل گئیں۔ شاہ شجاع کو مطلع کیا چونکہ پُرکشش خبر تھی اس لیے شاہ شجاع کرمانی نے فوراً تیاری کا حکم دے دیا۔ سامانِ شکار سے آراستہ قافلہ فوراً جنگل کی سمت چل پڑا، کھلی جگہ پڑاؤ کیا گیا۔ تھکاوٹ سے بادشاہ بے حال تھا، پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ دوبارہ ہرنوں کی ڈار کے کھوج میں نکل پڑے مگر انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ شاہ شجاع غصے میں میر شکار سے بولے۔ "کیوں کدھر گئی تمہاری وہ ہرنوں کی ڈار یہاں ہرن تو کجا تیتر تک نظر نہیں آرہے۔"

میر شکار ہکلاتے ہوئے بولا "جناب والا! یقین کیجئے میں نے خود ہرنوں کی ڈار دیکھ کر ہی آپ کو مطلع کیا تھا۔" بادشاہ نے اُسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ مزید کچھ کوشش کر لیتے ہیں لیکن اگر آگے بھی یہی حال رہا تو میں خالی ہاتھ واپس لوٹنے کی بجائے تمہیں شکار کرکے لیجانا زیادہ پسند کروں گا۔"

میر شکار اور معاون شکاری شاہ شجاع کے مقصد کو پا گئے تھے۔ خوف زدہ ہو کر زیادہ شدت اور تگ ودو سے تلاش شروع ہوگئی، چوکنا انداز میں چاروں اطراف دیکھتے آگے بڑھتے رہے۔ شاہ شجاع خود بھی ہرنوں کی ڈار کی تلاش میں ہر آہٹ پر کان کھڑے کرکے جنگل میں گھوڑا دوڑاتے چلے جارہے تھے مگر ایک لمحہ ایسا آیا کہ ہرنوں کا پیچھا کرتے ہوئے شاہ شجاع اپنے ——

ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ یہ ہرنوں کی ڈار کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ شاہ شجاع نے اپنا گھوڑا اُن کے پیچھے ڈال رکھا تھا۔ ڈار کچھ اس طرح بھاگ رہی تھی کہ شاہ شجاع اُن پر حملہ آور ہو گئے۔ کئی تیر اُن پر چھوڑے مگر اُن سے ایک ہرن بھی شکار نہیں ہوا۔ انھیں اپنی ناکامی اور مایوسی پر غصہ آ رہا تھا۔

یہ کچھ دیر بعد تھک گئے اور ادھر اُدھر پناہ گاہ کی تلاش میں پھرنے لگے۔ ہرنوں کی ڈار اُن کے سامنے چرنے میں مشغول تھی لیکن اب اُن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُن کا شکار کرتے۔ یہ تھک ہار کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اپنے آدمیوں کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی یہاں بیٹھے ہوئے . . . . زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ انھیں اپنے قریب ہی کہیں سے مختلف درندوں کے بولنے اور غرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ تیر کمان سنبھال کے بیٹھ گئے۔

اتنے میں انھوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایسا منظر کہ اس سے پہلے کسی اور نے بھی نہ دیکھا ہو گا۔ انھوں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک گرانڈیل چیتے پر سوار اُن کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور اس کے چاروں طرف دو دو کر درندے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مطیع و فرماں بردار جانوروں کی طرح۔ شاہ شجاع کو بڑی حیرت تھی کہ یہ کیسا انسان ہے کہ اسے درندوں سے ڈر نہیں لگتا اور درندے اس کے مطیع و فرماں بردار کیونکر ہو گئے؟ شاہ شجاع کو ان درندوں سے خوف آ رہا تھا۔ پہلے کچھ دیر تو یہ ہمت کر کے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے لیکن پھر جب انھوں نے محسوس کر لیا کہ درندوں کی نیت ٹھیک نہیں ہے تو یہ چپکے سے اٹھے اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھے لیکن درندوں نے بھی ان کا ارادہ سمجھ لیا تھا۔ وہ زبانیں باہر نکالے اور آنکھوں میں خونخواریت لیے اُن کی طرف بڑھے۔ ان کی رفتار میں زیادہ تیزی آ گئی، درندے بھی اور تیزی سے اُن کی طرف بڑھے۔ اور جب اُن دونوں کا فاصلہ برائے نام رہ گیا تو چیتے کی پشت پر سوار نوجوان نے درندوں کو ڈانٹا۔ "کیا کرتے ہو، یہ شاہ شجاع ہیں۔ کیا تم انھیں نہیں جانتے یہ کرمان کے حکمراں ہیں تم سب ان کی رعایا ہو خبردار جو انھیں گزند پہنچانے کی کوشش کی۔"

درندے جہاں تک آئے تھے وہیں رک گئے اور 'کوں کوں' کرنے لگے۔

شاہ شجاع کو اس نوجوان پر اور زیادہ حیرت ہوئی جس کا حکم درندوں پر بھی چل رہا تھا۔ شاہ شجاع خود بھی جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔ اُن کا جی چاہ رہا تھا کہ اس نوجوان کے پاس جائیں اور اُس سے باتیں کریں مگر درندوں کے حصار میں جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

نوجوان نے انھیں دور ہی سے مخاطب کیا۔ "کیا سوچ رہے ہو شاہ شجاع؟"

شاہ شجاع نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر میں تجھ سے ملنا چاہوں اور تجھ سے باتیں کرنا چاہوں، تو کیا کروں؟ اور کس طرح تیرے پاس آؤں؟ یہ درندے مجھے آنے ہی نہیں دیں گے۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں آنے دیں گے، کیا یہ تمہارا علاقہ نہیں ہے؟ کیا یہ تمہاری رعایا نہیں ہیں؟ تعجب ہے کہ بادشاہ کی رعایا اس کا ادب نہ کرے اور اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ تم کیسے بادشاہ ہو؟"

شاہ شجاع نے کہا۔ "میں بادشاہ ہوں، میری رعایا مجھ سے محبت بھی کرتی ہے اور مجھ سے خوفزدہ بھی رہتی ہے مگر یہ تو درندے ہیں، عقل و شعور سے عاری درندے یہ کیا جانیں کہ بادشاہ کیا ہوتا ہے، وزیر کسے کہتے ہیں۔ ان پر میرا رعب کیونکر قائم ہو سکتا ہے؟"

نوجوان نے تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "تب پھر تم حکومت چھوڑ دو۔ میری طرف دیکھو اور مجھ سے سیکھو میں نہ تو کسی سے ڈرتا ہوں نہ کسی پر میرا ایسا رعب ہے جس کو تم میرا دبدبہ اور خوف کہو۔ یہ درندے جنھیں تم میرے آس پاس دیکھ رہے ہو، یہ مجھ سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ ہاں احترام البتہ کرتے ہیں۔"

شاہ شجاع نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ کس طرح؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "دیکھو شاہ شجاع! تم ایک دنیادار انسان ہو، دنیا ہی تمہارے لیے سب کچھ ہے حالانکہ میں تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر کے دیکھ رہا ہوں کہ وہاں محبتِ دنیا کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں اللہ کی محبت اور دنیا سے بیزاری پائی جاتی ہے مگر دل کا یہ حصہ ابھی تک سنسان کیوں ہے؟"

شاہ شجاع نے کہا۔ "مگر نوجوان تم ہو کون؟ حیرت ہے کہ تم نے میرے دل کی گہرائیوں میں اتر کے بھی دیکھ لیا اور میں اپنے دل کی اس کیفیت سے ناواقف ہوں۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "شاہ شجاع! بات صرف اتنی سی ہے کہ تم ابھی تک دنیا کے عشق میں مبتلا ہو۔ دنیا نے تمہیں غافل کر رکھا ہے

اور سیر و شکار سے تمھیں فرصت ہی نہیں ہے حالانکہ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس دنیا کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے، دوسری دنیا۔ تمھارا بھی ایک آقا ہے ۔۔۔۔"

شاہ شجاع نے کہا "تیری باتیں بھی تیری ہی طرح عجیب و غریب ہیں۔ میں اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا ہوں، مجھے اُن کا انتظار ہے۔ پھر کوئی وقت ملے تو بہت ساری باتیں بھی ہو جائیں گی، اس وقت میں بہت تھکا ہوا بھی ہوں۔"

نوجوان نے جواب دیا "پھر کیا معنی؟ ابھی کیوں نہیں؟ دوبارہ نہ تو میں ملوں گا اور نہ تم ہاتھ آؤ گے، اس لیے مجھے جو کچھ کہنا سُننا ہے، اسی وقت کہہ سن لوں گا۔ دیکھو شاہ شجاع! تمھارا بھی ایک آقا ہے۔ اگر تمھارا کوئی غلام تمھاری خدمت نہ کرے اور تم سے انعام و اکرام کا بھی خواستگار ہو، تو تم اس کی حماقت یا سادہ لوحی پر ہنسو گے یا انعام و اکرام سے نواز دو گے؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا "سیدھی سی بات ہے۔ جس نے خدمت ہی نہ کی ہو وہ انعام و اکرام کا مستحق کیونکر ہو سکتا ہے؟"

نوجوان ہنسنے لگا، بولا "شاہ شجاع! خدا تمھارا بھلا کرے۔ یہی میں بھی تم سے کہلوانا چاہتا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آقا کی کتنی خدمت کی ہے جو اس سے آخرت میں انعام و اکرام کی خواہش کرو گے اور اگر تم اس کی خواہش کرو گے بھی تو کیا یہ تمھاری حماقت اور سادہ لوحی نہیں ہوگی؟"

شاہ شجاع کا دل کروٹ لے رہا تھا۔ اس کے سوئے ہوئے جذبے بھی بیدار ہو رہے تھے۔ شاہ شجاع بھاگ دوڑ سے بہت تھکے ہوئے تھے اور انھیں بھوک پیاس نے بھی تنگ کر رکھا تھا، بولے "اے نوجوان! میں نے کہہ تو دیا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے اپنے آدمیوں کا بھی انتظار ہے کیونکہ کھانے پینے کا سامان اُن کے پاس ہے اور میں یہاں بھوک پیاس سے ہلکان ہو رہا ہوں۔"

نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا "میں خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ بھوک پیاس نے تمھیں پریشان اور ہلکان کر رکھا ہے اور دُنیادار لوگوں کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ مت گھبراؤ، میں تمھاری بھوک پیاس کا انتظام بھی کیے دیتا ہوں۔"

اس کے بعد نوجوان نے کسی اور زبان میں کسی سے کچھ کہا۔ جواب میں ایک بوڑھی عورت ایک ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور دوسرے میں کھانا لیے ہوئے نمودار ہوئی۔ نوجوان نے کہا "شاہ شجاع! یہ شاہی کھانا تو نہیں ہے لیکن ہے بہت مزے دار۔ اسے کھا لو۔ اس کے بعد پانی پی لو۔"

شاہ شجاع نے یہ کھانا جو کھایا تو یہ اتنا لذیذ اور مزے دار نکلا کہ پچھلے تمام کھانے حقیر اور بے مزہ محسوس ہونے لگے۔ انھوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پانی کا پیالہ نوجوان کے ہاتھ میں تھا، اس میں سے اُس نے کچھ خود پی لیا اور بقیہ شاہ شجاع کے حوالے کرتے ہوئے کہا "معاف کیجیے گا شاہ شجاع! میں بھی پیاسا تھا اس لیے میں نے بھی تھوڑا سا پی لیا۔"

شاہ شجاع کی پیاس جھوٹے اور غیر جھوٹے کی پروا نہیں کر رہی تھی۔ انھوں نے پیالے کا جھوٹا پانی بے تکلف پی لیا اور دل ہی دل میں انھیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اتنا میٹھا اور مزے دار پانی انھوں نے پہلے کبھی نہیں پیا۔ شاہ شجاع نے اس بوڑھی عورت کو نظروں سے تلاش کیا مگر اب وہ وہاں نہیں تھی۔

نوجوان نے پوچھا "شاہ شجاع! کس کو تلاش کر رہے ہو؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا "اس عورت کو جو یہ کھانے پینے کا سامان لائی تھی۔"

نوجوان نے پوچھا "اگر وہ تمھیں مل جائے تو تم کیا کرو گے؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا "میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ یہ کھانے پینے کا سامان کہاں سے لائی تھی! بس اس سے اس شخص کا پتا پوچھوں گا، جس نے اتنا لذیذ کھانا پکایا اور اس شخص کا پتا بھی پوچھوں گا جس نے یہ شربت بنا کے بھیجا تھا۔"

نوجوان کو ہنسی آ گئی، بولا "وہ بڑھیا تو تمھاری ملازم ہے اور اسی کو تم نہیں پہچانتے۔ تعجب ہے!"

شاہ شجاع نے حیرت سے پوچھا "وہ میری ملازم ہے اور میں ہی اس سے واقف نہیں، کمال ہو گیا۔ اس کا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "دنیا۔ یہ تمھاری نوکر ہے۔ بس یہی چیز تمھارے اختیار میں ہے شاہ شجاع۔ اور ذرا اس پہلو پر بھی غور کرو کہ دنیا نوکر تو تمھاری ہے اور تعمیل کرتی ہے میرے حکم کی۔"

شاہ شجاع نے کہا "دیکھو بھائی! بھوک لگی تھی، کھانا مل گیا، کھا لیا اور شکم سیر ہو گیا۔ پیاس لگی تھی پانی مل گیا پی لیا اور شکم سیر ہو گیا۔ اب یہ باتیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ مجھ سے میرے آدمی بچھڑ گئے ہیں وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے اب میں انھیں تلاش کروں گا۔"

لیکن نوجوان کہاں پیچھا چھوڑنے والا تھا، بولا "شاہ شجاع! جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ آج کے بعد پھر کون کس سے ملے گا، میں اپنا فرض آج ہی ادا کر دینا چاہتا ہوں۔ سنو۔ یہ بڑھیا جس نے ہمیں کھانا پہنچایا، آج کل اس کو میری خدمت پر متعین

کیا گیا ہے۔"
شاہ شجاع کو اب یہ باتیں فضول لگ رہی تھیں بولا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"
نوجوان نے کہا۔ "جانا چاہتے ہو؟ کہاں؟ کہاں جاؤ گے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھیں اپنے آپ پر اختیار ہے؟ تمھارے اختیار کا تو
اندازہ مجھے بھی ہو گیا۔ تم کرمان کے بادشاہ ہو مگر حالت یہ ہے کہ درندے تم سے نہیں ڈرتے تم ان سے ڈرتے ہو۔ تم بے انتہا مال و دولت کے
مالک ہو مگر حال یہ ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے تم بھوکے پیاسے تھے اور تمھارے پاس ایک لقمہ کھانے کا اور ایک گھونٹ پانی کا بھی نہیں تھا۔
تمھیں دنیا دی گئی ہے لیکن آقا بنا کے؟ دنیا تمھاری آقا ہے اور تم اس کے غلام ہو۔ مجھے دیکھو۔ میری طرف مجھے بھی دنیا دی گئی ہے
لیکن میں آقا ہوں اور دنیا غلام۔ میں جہاں چاہوں اپنے غلام کو طلب کر لوں۔"
شاہ شجاع نے پوچھا۔ "کس طرح؟"
نوجوان نے جواب دیا۔ "اسی طرح جس طرح کچھ دیر پہلے بڑھیا آئی تھی۔ اور کس طرح؟"
شاہ شجاع کو اب ادھر بھی توجہ دینا پڑی۔ پوچھا۔ "کیا اس عورت کو جب تم چاہو بلا لو، آ جائے گی؟"
نوجوان نے جواب دیا۔ "ابھی تم نے دیکھا نہیں کیا! شاہ شجاع! جب دنیا تخلیق کی جا رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت
دنیا سے یہ کہہ دیا تھا کہ اے دنیا! جو کوئی میری خدمت کرے گا تو بھی اس کی خدمت کرے گی اور جو تیری خدمت کرے گا تو تجھے اختیار
ہے کہ تو اس سے خدمت لیتی رہ۔"
اب شاہ شجاع میں انقلاب آ چکا تھا، نوجوان سے کہا۔ "ہاں تو تو نے کیا کہا، ذرا پھر سے تو کہنا۔ جب اللہ نے دنیا کو تخلیق کیا تھا تو
اس سے کیا کہا تھا؟"
نوجوان نے اپنی بات پھر دہرا دی، کہا: "جب دنیا تخلیق کی جا رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت دنیا سے یہ کہہ دیا تھا کہ اے دنیا!
جو کوئی میری خدمت کرے گا تو بھی اس کی خدمت کرے گی اور جو تیری خدمت کرے گا تو تجھے اختیار ہے کہ تو بھی اس سے خدمت لیتی رہ۔"
شاہ شجاع کا دل بھر آیا، آنکھیں بھیگ گئیں آہستہ سے کہا۔ "ہاں تو نوجوان! خدا تجھے اور زیادہ بلند مقام عطا فرمائے۔ ابھی کچھ
دیر پہلے تو نے ایک اور بھی کام کی بات کی تھی، آقا اور غلام والی۔ جو غلام اپنے آقا کی خدمت نہیں کرے گا وہ انعام و اکرام کا حقدار کیوں کر
ہو گا۔ شاید یہی بات کی تھی تو نے؟"
نوجوان نے جواب دیا۔ "ہاں میں نے یہی کہا تھا۔"
شاہ شجاع نے کہا۔ "اس ایک بار پھر اپنی زبان سے کہہ تیری زبان کی بات ہی کچھ اور ہے۔"
نوجوان نے جواب دیا۔ "میں نے کہا تھا اے شاہ شجاع! تمھارا بھی ایک آقا ہے۔ اگر تمھارا کوئی غلام تمھاری خدمت نہ کرے اور تم
سے انعام و اکرام کا خواستگار بھی ہو تو تم اس کی سادہ لوحی یا حماقت پر ہنسو گے یا انعام و اکرام دو گے؟"
شاہ شجاع کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "جس نے خدمت ہی نہ کی ہو وہ انعام و اکرام کا مستحق کیونکر ہو سکتا ہے؟"
نوجوان نے کہا۔ "درست۔ تمھارا بھی ایک آقا ہے شاہ شجاع! تم اپنے آقا کی یہاں خدمت کرو گے تو دوسری دنیا میں اس کا انعام
اکرام بھی حاصل کرو گے۔"
شاہ شجاع پر رقت طاری ہو گئی، کہا۔ "میں نے اپنی عمر کا کتنا حصہ لہو و لعب میں ضائع کر دیا ہے۔ اب میں کس طرح
اس گھاٹے کو پورا کروں گا؟"
نوجوان نے انھیں تسلیاں دیں کہا۔ "جو گزر گیا اس پر منفعل ہو جانا ہی کافی ہے۔ توبہ کرو اور اللہ سے دعا مانگو کہ وہ آئندہ
ان کوتاہیوں اور غفلتوں سے دور رکھے اور آج ہی سے اللہ کی طرف راغب ہو جاؤ۔"
شاہ شجاع نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی غفلتوں اور لغزشوں سے پر ماضی پر غور کیا تو دل ہولنے لگا۔ انھیں رونا آ گیا اور آہ و زاری
کرنے لگے۔ "الٰہ العالمین! میری غفلتوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما دے۔ میں اپنے گزشتہ پر شرمندہ ہوں۔ سائیں تیرے سوا کس کے پاس
اور کس سے معافی مانگوں۔ میری توبہ قبول فرما لے اپنے رسول رحمتِ مجسمؐ کے طفیل۔"
اب شاہ شجاع نے آنکھیں جو کھولیں تو وہاں نہ تو وہ نوجوان تھے اور نہ درندے۔ یہ پریشان حال ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آخر
قرار آ گیا اور وہ آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کے پاس گئے کمان کو شانے سے لٹکایا اور تیر کو ترکش میں ڈال لیا۔ اب وہ اپنے آدمیوں کی
تلاش میں چلے کہ ان کے آدمی انھیں تلاش کر رہے تھے۔ پھر جب ساتھیوں سے ملاقات ہو گئی تو شاہ شجاع نے انھیں حکم دیا کہ شکار نہیں

سرمہ لگانا سنت ہے
اور فائدہ مند بھی
صدیوں کا آزمودہ
ہاشمی سرمہ
قدرتی تحفظِ نگاہ
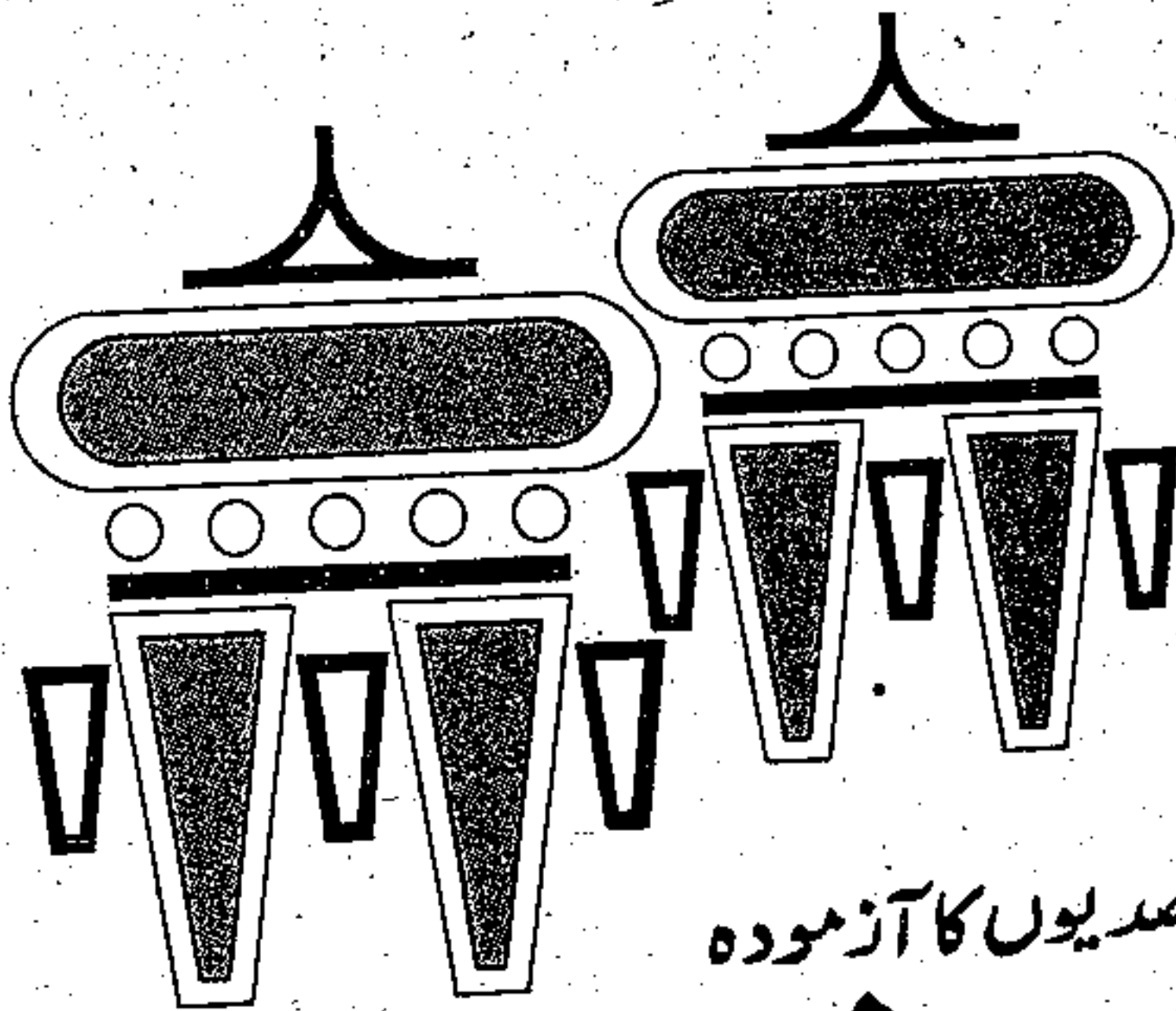
جائے گا۔ ہم سب واپس چلیں گے۔

میر شکار نے عرض کیا: "لیکن حضورِ والا! کیا خالی ہاتھ؟ شکار تو ہم نے کیا ہی نہیں ہے"

شاہ شجاع نے حکم دیا: "میں نے حکم جو دیا۔ اب شکار نہیں کھیلا جائے گا"

خیمہ و خرگاہ اکھڑنے لگے۔ سامانِ خورد و نوش مویشیوں پر بار کر دیا گیا اور یہ لوگ شاہی محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

شاہی محل میں داخل ہونے سے پہلے شاہ شجاع نے نہایت افسردگی سے اعلان کیا: "دوستو! یہ میرا آخری شکار تھا، اب تم کسی اور کے ساتھ شکار کے لیے جایا کرو گے لیکن بہتر یہ تھا کہ تم لوگ بھی اس لہو و لعب سے توبہ کر لیتے تو اچھا تھا تاکہ عمر کے کسی بھی حصے میں میری طرح تمہیں بھی شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

محل میں تمام رشتہ داروں کی موجودگی میں شاہ شجاع نے حکومت اپنے بھائی کے حوالے کر دی اور کہا: "میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ضائع کر دیا ہے اب اس کو توبہ و استغفار سے پاک کرنا چاہتا ہوں"

بھائی نے کہا: "بھائی صاحب! آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی فرمالیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو اپنے اس فیصلے پر شرمندہ ہونا پڑے۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا: "شرمندہ تو میں اپنے ماضی پر ہوں، اللہ نے چاہا تو اب میں شرمندہ نہیں ہوں گا"

آپ کی ایک بچی تھی جو ابھی چھوٹی تھی۔ بیوی نے یہ فیصلہ سنا تو پوچھا: "اگر آپ حکومت سے کنارہ کش ہو جائیں گے تو رہیں گے کہاں؟ اور ہماری گزر اوقات کس طرح ہو گی؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا: "نیک بخت! کیا محل اور حکومت چھوڑ کے ہم اپنے رب سے بھی محروم ہو جائیں گے؟ کیا دنیا کا ہر انسان بادشاہ ہے؟ اور شاہی محل میں رہتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب میں اللہ کے سوا ہر شے سے ناتہ توڑ لوں گا۔ اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہے تو ٹھیک ہے ورنہ تم محل میں رہ سکتی ہے۔"

بیوی نے کہا: "جہاں آپ ہوں گے وہیں میں رہوں گی۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی۔"

شاہ شجاع نے جب محل چھوڑا اور حکومت سے کنارہ کشی اختیار کی تو بستوں کو اس سے دکھ پہنچا۔ انھوں نے آبادی سے دور ایک جھونپڑی بنائی اور اس میں رہنے لگے۔ جب لوگ انہیں اس حال میں دیکھتے تو ان کے دلوں پر اس کا بڑا اثر ہوتا لیکن شاہ شجاع کو یہاں بہت سکون تھا۔ شاہ شجاع دن بھر محنت مشقت کرتے اور رات کو صبر و شکر کر کے اللہ سے لو لگاتے۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی جہاں ان کے علاوہ ادھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے لوگ بھی نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔

اسی جھونپڑے نما کچے مکان میں ایک بچہ پیدا ہوا، اس بچے کے سینے پر ہلکے سبز رنگ میں اللہ جل شانہٗ لکھا ہوا تھا۔ شاید یہ نسیں تھیں جن سے قدرت نے اللہ جل شانہٗ لکھ دیا تھا۔ اس کا چرچا ہوا اور لوگوں کا ہجوم بچے کو دیکھنے کے لیے آنے لگا۔

کسی نے آپ سے پوچھا: "حضرت! اس کا کیا مطلب ہوا؟ آپ کچھ بتا سکتے ہیں؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا: "میرا یہ لڑکا بھی اسی طرح اللہ کی طرف گریز اختیار کرے گا جس طرح میں کر رہا ہوں۔ اللہ اس کو لہو و لعب سے محفوظ رکھے اور اپنی طرف راغب فرمالے۔"

بچے کی پرورش جس ماحول میں ہو رہی تھی اس میں ناز و نعم اور آرام کا کہیں گزر ہی نہ تھا۔ بچہ ذرا بڑا ہوا تو اسے یہ ماحول پسند نہیں آیا۔ باپ نے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری خود اپنے سر لے رکھی تھی۔ ذہانت اور اخذ و قبول میں کوئی کمی نہ تھی۔ شاہ شجاع واعظانہ انداز میں جب کچھ بتاتے تو اس کو ان کی باتیں زیادہ پسند نہ آتیں۔ اسی دوران لڑکے کی دوستی ان لڑکوں سے ہو گئی جو موسیقی سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ شہزادے کو بھی یہی شوق پیدا ہو گیا اور اس نے اپنے باپ سے چھپ کے بربط بجانا شروع کر دیا۔ ہم عمر لڑکے شہزادے کی بربط نوازی سے بہت خوش ہوتے اور آپس میں کہتے کہ ہم نے دوسروں سے بربط سنا ہے لیکن ان میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

جب اس کا چرچا عام ہوا تو شاہ شجاع کو بڑا دکھ ہوا اور بیٹے سے پوچھا: "بیٹے! یہ میں لوگوں سے کیا سن رہا ہوں؟"

بیٹے نے جواب دیا: "پتا نہیں آپ کیا سن رہے ہیں؟"

شاہ شجاع نے پوچھا: "تم سارا سارا دن کہاں غائب رہتے ہو آخر؟"

بیٹے نے جواب دیا: "پتا نہیں میں کہاں غائب رہتا ہوں آپ اس کا بھی پتا لگا لیں گے"

شاہ شجاع کو اس جواب سے بڑی تکلیف پہنچی، کہا: "بیٹے! دوستوں کی بُری صحبت نے تجھ کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ گستاخی کرنے لگا

بیٹے نے جواب دیا" باداجان! اس موضوع کو زیادہ نہ بڑھائیں تو اچھا ہے کیونکہ اس سے جتنی تکلیف آپ کو پہنچے گی اس سے کچھ زیادہ مجھے ہوگی۔"

شاہ شجاع نے اسی وقت گفتگو بند کردی اور بیٹے کو اس کے حال پر چھوڑ کر بیوی کے پاس چلے گئے۔ اس کو ساری تفصیل بتا کے نہایت دردمندانہ انداز میں کہا" اب میں تو اس سے بات کروں گا نہیں، تم کرو بات۔ مجھے یہ لڑکا بہت دکھ پہنچا رہا ہے۔"

بیوی نے جواب دیا" میں اس سے بات کروں گی لیکن شاید ہی اس پر اثر ہو۔ جب تک اس کو لڑکوں کی صحبت سے نہ نکالا جائے، اس کی اصلاح مشکل ہے۔"

شاہ شجاع نے پوچھا" کیا میں اس جگہ کو بھی چھوڑ دوں؟"

بیوی نے جواب دیا" اگر اس کی اصلاح مقصود ہے تو آپ کو یہ بھی کرنا ہوگا۔"

شاہ شجاع خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے، بولے" لیکن شاید بربط نوازی کی عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ وہ جگہ اور ماحول بدلنے کے بعد بھی قائم رہے۔"

بیوی نے کہا" وہ تو ٹھیک ہے لیکن تدبیر کرنا بھی تو ضروری ہے۔"

شاہ شجاع نے بے دلی سے کہا" بہر حال یہ کر کے بھی دیکھ لوں گا۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، دوسری طرف شاہ شجاع کے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا اور حکومت بھتیجے کے حصے میں آگئی تھی۔ یہ خبریں ہر طرف گشت کر رہی تھیں جب شاہ شجاع کی بیوی نے بیٹے سے بات کی اور کہا" بیٹے! یہ میں تیرے بارے میں کیا سنتی رہتی ہوں؟"

بیٹے نے جواب دیا" یہ باتیں والد صاحب سے بھی ہو چکی ہیں ماں! براہ کرم آپ اس موضوع پر کوئی بات نہ کیجیے۔"

ماں نے غصے میں کہا" واہ یہ کیا بات ہوئی۔ میں تیرے منع کرنے سے باز آجاؤں گی۔ یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا؟"

بیٹے نے پوچھا" آخر آپ کیا باتیں کریں گی مجھ سے؟ یہ مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

ماں نے کہا" بیٹے! تیرا باپ کتنا عبادت گزار اور اللہ والا ہے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو بربط نواز، شاہ شجاع کا بیٹا ہے تو وہ بہت افسوس کرتے ہیں اور تیرا باپ بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔"

بیٹے نے کہا" ماں! سنتا ہوں کہ چچا کا انتقال ہو گیا اور حکومت ان کے بیٹے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اگر والد صاحب محل میں ہوتے تو یہ حکومت آج بھی انہی کے پاس ہوتی اور میں شاہی محل میں ٹھاٹھ سے رہ رہا ہوتا لیکن آج، جب میرے ساتھی میرے دوست مجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ تیرے باپ نے تاج و تخت کو لات کیوں مار دی تو میں شرمندہ ہو جاتا ہوں اور انہیں کوئی جواب نہیں دے پاتا۔"

ماں نے پوچھا" آخر تو چاہتا کیا ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا" میں چاہتا ہوں جس طرح میں دوسروں کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتا اسی طرح میرے معاملات میں بھی دخل نہ دیا جائے۔"

ماں کو اس جواب سے بے حد افسوس ہوا۔ اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ شہزادہ بربط لیے گلیوں کوچوں اور بازاروں میں بجاتا پھر رہا ہے۔ شاہ شجاع اور ان کی بیوی نے اس پر صبر کر لیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" اے اللہ! میں اس کی اصلاح نہیں کر سکتا تو ہی اس کو سدھار۔"

کئی دن بعد شاہ شجاع کا حکمران بھتیجا شاہی حشم و خدم کے ساتھ ان سے ملنے آیا۔ آس پاس والوں پر اس کا بڑا رعب پڑا۔ شاہ شجاع نے اپنے بھتیجے سے پوچھا" تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

بھتیجے نے جواب دیا" عم محترم! والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد مجھے بادشاہ بنا دیا گیا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ہمارے پاس آپ کی امانت ہے۔ آپ جب چاہیں ہم سے واپس لے لیں۔"

شاہ شجاع نے کہا" بیٹے! جس چیز کو میں ٹھوکر مار چکا ہوں اب اسے لے کر کیا کروں گا۔ حکومت تجھی کو مبارک۔"

حکمران بھتیجے کی نظریں اپنی عم زاد بہن پر پڑ گئیں جو جوان ہو کے بے مثل ہو گئی تھی۔ اس کو یہ لڑکی بہت اچھی لگی۔ اور اپنے محترم سے کہنے لگا" عم محترم! آپ اپنے ساتھ انہیں بھی پریشان کر رہے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہیں رہیں اور انہیں محل میں بھیج دیں۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا" نہیں، افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں جہاں بھی رہوں گا یہ میرے ساتھ رہیں گی۔"

اتنے میں بیٹا بھی آگیا۔ اس نے شاہی حشم و خدم کا باہر ہی مشاہدہ کر لیا تھا۔ گلے میں بربط ڈالے اندر جو داخل ہوا تو حکمران بھتیجے نے

اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ کون ہے عم محترم؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا "تیرا عم زاد بھائی۔"

نوجوان بادشاہ نے اس سے ہاتھ ملایا اور بربط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ گلے میں کیا لٹکا رکھا ہے بھائی؟"

شہزادے نے جواب دیا "یہ ایسی چیز تو نہیں ہے کہ آپ کو اس کا علم ہی نہ ہو اور جس چیز کا آپ کو علم ہے میں اس کا کیا جواب دوں؟"

نوجوان بادشاہ کو اس چڑچڑے پن پر غصہ آ گیا لیکن وہ ہنس کے ٹال گیا۔ اس نے کہا "اگر تم چاہو تو میں تمہیں محل میں لے چلوں،

وہاں تمہارے لیے رہائش کا خاص انتظام کر دوں گا۔"

شہزادے نے جواب دیا "جس شے کو میرے باپ نے ٹھکرا دیا ہو میں اس کو کس طرح قبول کر سکتا ہوں۔"

بیٹے کے اس جواب نے سبھی کو خوش کر دیا۔ شاہ شجاع نے بیوی کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

نوجوان بادشاہ نے اپنے عم زاد بھائی سے پھر کوئی بات نہیں کی اور دل برداشتہ ہو کر محل واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شاہ شجاع نے کہا "آج

بیٹے کے جواب نے مجھ کو بے حد خوش کر دیا۔"

بیوی بھی بہت خوش تھی، جواب دیا "اور مجھے بھی۔"

شاہ شجاع نے کہا "لیکن آج شاہی سواری کو اپنے در پر دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں پھر آئے۔"

بیوی نے جواب دیا "آپ کا بھتیجا ہے ہم اسے کس طرح منع کر سکتے ہیں؟"

شاہ شجاع نے کہا "ہم اس کو منع تو نہیں کر سکتے مگر ہم یہ جگہ تو چھوڑ سکتے ہیں۔"

شوہر پرست بیوی کو ہر حال میں اپنے شوہر کی خوشنودی عزیز تھی، بولی "آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں، میں نے آپ سے کبھی

اختلاف کیا ہے؟"

شاہ شجاع کو بس بیٹے کا غم کھائے جا رہا تھا، باہر جاتے جاتے بولے "اللہ میرے بیٹے کو سدھارے بس میرے لیے یہی کافی ہے۔

یوں میں کوشش کروں گا کہ اس جگہ کو چھوڑ دوں اور کہیں اور چلا جاؤں۔"

کئی دن بعد شاہی سواری اپنے حشم و خدم کے ساتھ دوبارہ آ گئی۔ اس بار نئے بادشاہ کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی۔ ماں نے اندر

جا کے دونوں سے بڑی شکایت کی اور کہا "بھائی صاحب! اسی شہر کی نواحی بستی میں رہتے ہو اور ہم سے رشتہ بھی قائم ہے پھر کیا بات

ہے کہ تم لوگ آتے جاتے بھی نہیں۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا "میں نے جس چیز کو خود لات مار دی اب اس کے طواف سے حاصل؟ میں تو اس کے سائے تک سے

گریزاں ہوں۔"

بادشاہ کی ماں نے اپنی بھتیجی کو سینے سے لگا لیا اور کہا "کیا چاند سا چہرہ پایا ہے میری بیٹی نے! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس کی

پیشانی کا چمکتا دمکتا نور اس کو ایک بار پھر شاہی محل واپس لے جائے گا۔"

ان باتوں نے شاہ شجاع کے کان کھڑے کر دیے اور سوالیہ نظروں سے اپنے بھائی کی بیوہ کو دیکھنے لگے، پھر پوچھا "میں آپ کا مطلب

نہیں سمجھا، آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ ذرا کھل کے بتائیے۔"

مرحوم بادشاہ کی بیوہ نے جواب دیا "بھائی صاحب! اصل بات تو یہ ہے کہ جب سے آپ لوگ وہاں سے آئے ہیں آپ کے مرحوم بھائی چین

کی نیند نہ لے سکے اور شاید اسی غم میں ان کا انتقال ہو گیا۔" اس کے ساتھ وہ خود بھی رونے لگیں اور کچھ دم لے کر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

"آج اگر وہ زندہ ہوتے اور آپ لوگوں کو اس حال میں دیکھ لیتے تو معلوم نہیں ان کا کیا حال ہوتا مارے غم کے۔"

شاہ شجاع بیوہ کی وہ بات سننا چاہتے تھے جس کی یہ تمہید تھی۔ آخر ان سے رہا نہ گیا، کہا "مرحوم بھائی کی بیوہ خاتون! آخر اس طرح

باتوں سے حاصل؟ میں تو آپ کی زبان سے وہ باتیں سننا چاہتا ہوں جس کے لیے آپ ہمارے گھر آئی ہیں۔"

مرحوم بادشاہ کی بیوہ سے اب جس قسم کی باتیں شروع ہو چکی تھیں ان سے کوئی بھی تو خوش نہیں تھا، خاص کر شاہ شجاع اور ان کی

بیوہ نے کہا "بھائی صاحب! آپ کو میری بات اچھی لگے یا بری میں کہوں گی ضرور۔ جب سے آپ کا بھتیجا اپنے عم کی بیٹی کو دیکھ کر

ہے اس پر منحصر ہے کہ شادی کروں گا تو اس سے۔ آج جب اس نے یہ باتیں کیں تو میں آپ کے پاس چلی آئی اب آپ کچھ سوچیے گا نہیں۔"

شاہ شجاع نے کسی قدر تامل سے جواب دیا "خاتون! کیا یہ رشتہ بے جوڑ نہیں ہو گا؟"

بیوہ خاتون نے جواب دیا "بے جوڑ رشتہ! یہ کیا کہہ دیا تم نے؟ ماشاءاللہ یہ شہزادی ہے اور میرا بیٹا بادشاہ۔ یہاں سے جاتے ہی اللہ نے چاہا تو ملکہ بن جائے گی۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا "لیکن سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ جس چیز کو میں نے اپنے لیے پسند نہیں کیا، اپنی بیٹی کے لیے کیوں کر پسند کر سکتا ہوں۔"

لیکن خاتون اپنی بات پر اڑی رہیں، بولیں "بھائی صاحب! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں اپنی بیٹی کو گھر لے جانا چاہتی ہوں، میں اور کچھ نہیں سنوں گی۔"

شاہ شجاع بہت زیادہ فکرمند ہو گئے، بولے "اچھا، پھر آپ ایسا کریں کہ مجھے سوچنے کے لیے تین دن دیں۔ اس کے بعد کوئی حتمی جواب دے سکوں گا۔"

خاتون نے تین دن کی مہلت دے دی اور کہا "ٹھیک ہے آپ کو تین دن دیے لیکن ایک بات میں ابھی سے بتائے دیتی ہوں کہ میں تین دن بعد بھی کوئی عذر نہیں سنوں گی، ایک نیک کام جو ہونا ہے ضرور ہونا چاہیے۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا "آپ تین دن تو دیں مجھے — جو کچھ اللہ کرے گا بہتر ہی کرے گا۔"

مرحوم بھائی کی بیوہ محل واپس چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی شاہ شجاع مسجد میں جا کے بیٹھ گئے، اور سوچنے لگے کہ اس معاملے سے کس طرح نمٹا جائے؟ انھوں نے کئی سال سے ایک نوجوان کو اس مسجد میں نمازیں پڑھتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی نماز پڑھ رہا تھا۔ شاہ شجاع اس نوجوان کے زہد و تقویٰ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے گھر سے ذرا فاصلے پر اس نوجوان کی جھونپڑی تھی۔ انداز شریفانہ مزاج درویشانہ۔ شاہ شجاع کو یہ نوجوان بہت پسند تھا۔ آپ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو اس سے پوچھا "صاحبزادے! تمھاری شادی ہو گئی یا نہیں؟"

نوجوان نے جواب دیا "نہیں، ابھی تک میں نے شادی نہیں کی۔"

شاہ شجاع نے پوچھا "شادی کرو گے؟"

نوجوان ہنسنے لگا، بولا "جناب والا! آج آپ مجھ سے کوئی مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟"

شاہ شجاع اس نوجوان کو مسجد سے اٹھا کے باہر لے آئے اور کہا "نوجوان! میں تجھ سے مذاق کیوں کروں گا اور یہ مذاق میں نے آج تک کسی اور سے بھی نہیں کیا پھر تجھ سے کیوں کروں گا۔"

نوجوان خاموش ہو گیا، شاہ شجاع نے اس سے ایک بار پھر پوچھا "دیکھ، تو میری بات کا صاف صاف جواب دے۔ تو شادی کرنا چاہتا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "ہاں میں شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھ جیسے نادار اور مفلس سے شادی کرے گا کون؟"

شاہ شجاع نے کہا "میں اپنی بیٹی سے تیری شادی کروں گا۔"

نوجوان اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا، پوچھا "آپ اپنی بیٹی سے میری شادی کریں گے؟"

شاہ شجاع نے حیرت سے پوچھا "ہاں مگر تجھ کو اس پر حیرت کیوں ہے؟"

نوجوان جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں پا رہا تھا، ہچکچاتے ہوئے کہا "جناب والا! میں نے کئی بار آپ کے دربار شاہی کی داری دیکھی ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس ملک کے اصل بادشاہ آپ ہی ہیں۔ آپ کی بیٹی شاہی خاندان کی لڑکی ہے کیا وہ مجھ سے شادی کر کے خوش رہ سکے گی؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا "اے نوجوان! یہ تو کیسی سادہ لوحی کی باتیں کرتا ہے، وہ میری بیٹی ہے اور میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہ کہاں گزر کر سکے گی اور کہاں نہیں کر سکے گی۔"

نوجوان نے عرض کیا "ویسے میں تو بالکل تیار ہوں لیکن بس خوف یہی ہے کہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا "ایسا نہیں ہو گا۔" پھر پوچھا "تیرے پاس شادی کے لیے نقدی بھی ہے یا نہیں؟"

نوجوان نے جواب دیا "میرے پاس صرف تین درم فی الوقت ہیں اور اس سے زیادہ کا میں بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔"

شاہ شجاع نے کہا "چلو یہ رقم بھی کافی ہے۔ اب تم دن تاریخ مقرر کر لو۔"

ٹوتھ پیسٹ کیا ہوتی ہے

جو دانتوں کو چمکدار بنائے
جو دانتوں کی حفاظت کرے کیڑا لگنے سے بچائے
مُنہ کی بدبُو کو دُور کرے اور سانسوں کو مہک دے
جس کا ذائقہ پسندیدہ ہو
کہیئے کس ٹوتھ پیسٹ کا ذکر ہے!

فلاس فلاس ٹرانسپیرنٹ ٹوتھ پیسٹ
نئے ذائقے اور فلورائیڈ کے ساتھ

DOT CREATIVE SERVICES

نوجوان نے نہایت فدویانہ عرض کیا۔ "چلیے اگر وہ تین درم ہی کافی ہیں تو مجھے بتائیے کہ اس کے علاوہ کیا کرنا ہوگا۔"
شاہ شجاع نے جواب دیا۔ "ایک درم کی روٹیاں اور دوسرے درم کا سالن اور تیسرے درم سے عطر خرید لینا۔ باقی کام میں خود کر دوں گا۔"
شادی کی تاریخ دوسرے دن کی مقرر کر دی گئی۔
شاہ شجاع اِدھر معاملہ طے کر کے اپنے گھر پہنچے اور بیوی سے کہا۔ "میں نے اپنی بیٹی کا مسئلہ طے کر دیا ہے اور شادی کے لیے کل کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔"
بیوی نے پوچھا۔ "کہاں؟ کس کے ساتھ؟ کیا اپنے بھتیجے کے ساتھ؟"
شاہ نے جواب دیا۔ "نہیں، بھتیجے کے ساتھ نہیں۔ مسجد میں ایک متقی پرہیزگار نوجوان آتا ہے میں نے اسی سے یہ رشتہ طے کر دیا ہے۔"
بیوی نے کہا۔ "وہ انکار تو نہیں کرے گی لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلے میں اس سے بھی پوچھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔"
شاہ نے جواب دیا۔ "بیشک۔ وہ تو میں پوچھوں گا ہی۔ یہ کام میں خود کروں گا کیونکہ یہ بہت نازک کام ہے۔"
اس بات چیت کے بعد آپ اپنی بیٹی کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ "بیٹی! آج میں تجھ سے ایک اہم مسئلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"
سعادت مند بیٹی نے جواب دیا۔ "پوچھیے انشاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔"
شاہ شجاع سوچنے لگے کہ بات کس طرح شروع کی جائے؟ آخر بولے۔ "بیٹی! تجھ کو یہ بات تو معلوم ہی ہو گئی ہوگی کہ میرے بھائی کا بیٹا جوان دنوں اس ملک کا بادشاہ ہے، تیرا رشتہ مانگ رہا ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنی ماں کو بھی بھیجا تھا۔"
بیٹی نے شرمائے شرمائے لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں، مجھے معلوم ہے۔"
شاہ شجاع نے کہا۔ "میں نے اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ سے کہہ دیا ہے کہ میں اس کا تین دن بعد جواب دوں گا۔"
بیٹی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش ہو گئی۔ آخر شاہ شجاع نے پوچھا۔ "لیکن تین دن بعد میں اس کو کیا جواب دوں گا؟"
بیٹی نے جواب دیا۔ "جس چیز کو آپ نے اپنے لیے پسند نہیں کیا۔ اس کو میرے لیے کیوں پسند فرماتے ہیں آپ؟"
شاہ شجاع کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "جزاک اللہ۔ سبحان اللہ۔ مجھے تجھ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ واہ وا، اللہ نے کیا صالح سوچ عطا فرمائی ہے تجھ کو میری طبیعت خوش کر دی تو نے۔"
بیٹی خاموش تھی اور شاہ شجاع بے حد خوش۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے بیٹی کے سامنے اصل مسئلہ رکھ دیا۔ "بیٹی! اب میں اصل مسئلہ تیرے سامنے رکھے دیتا ہوں۔ میں ایک ایسے نوجوان سے واقف ہوں جو انتہائی متقی اور پرہیزگار ہے۔ وہ درویش ہے اور جو شخص نوجوانی میں درویش ہو جائے اس کا اللہ کے نزدیک کیا مقام ہوگا تو خود سمجھ سکتی ہے۔"
بیٹی خاموشی سے یہ سب سنتی رہی۔ آخر میں پوچھا۔ "باوا جان! آپ نے بات پوری نہیں کی۔"
شاہ شجاع نے جواب دیا۔ "میں نے تیرا رشتہ اس نوجوان سے طے کر دیا ہے اور کل کا دن اس نیک کام کے لیے مقرر کر دیا ہے، اب تیری جیسی بھی مرضی ہو۔"
بیٹی نے کہا۔ "باوا جان! میں آپ سے زیادہ دانا بینا نہیں ہوں۔ آپ نے جو کچھ طے کر دیا ہے میں اس سے متفق ہوں۔"
شاہ شجاع کو اپنی پاکباز بیٹی سے یہی توقع تھی۔ اس شادی میں کوئی تیاری بھی نہیں کی گئی۔ سیدھے سادے طریقے سے شادی کر دی گئی۔ نکاح خود شاہ شجاع نے پڑھایا۔ باراتیوں میں آس پاس کے چند شریفوں کو شریک کر لیا گیا تھا۔
نوجوان اپنی بیوی کو اپنے جھونپڑے نما گھر میں لے گیا۔ اس چھوٹے سے گھر کا نئی نویلی دلھن نے جائزہ لیا۔ اس خالی گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ دولھا کا ایک عزیز تک اس گھر میں نہیں تھا۔ دلھن نے شوہر سے پوچھا۔ "کیا آپ اس گھر میں اکیلے رہتے ہیں؟"
احساسِ کمتری میں مبتلا شوہر نے جواب دیا۔ "ہاں میں اس گھر میں تنہا رہتا ہوں، اس لیے کہ میں اس دنیا میں اکیلا ہی ہوں۔ کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے یہاں میرا۔"
دلھن نے ایک طرف کونے میں ایک گھڑا رکھا ہوا دیکھا۔ پوچھا۔ "اس میں پانی ہے؟"
جواب دیا۔ "ہاں تھوڑا بہت تو موجود ہوگا اس میں پانی۔ کیوں کیا پانی درکار ہے آپ کو؟"
دلھن نے کہا۔ "نہیں، میں تو اس گھر کا اور اس گھر کے ساز و سامان کا بس یونہی جائزہ لے رہی ہوں۔"
نوجوان کچھ اور ہی سمجھا۔ اس نے عاجزی و انکساری سے کہا۔ "خاتونِ محترم! میں آپ کے مزاج کر سے کسی حد تک واقف ہوں آپ شہزادی

ہیں آپ کو میرا یہ گھر پسند آنا بھی نہیں چاہیے۔ میرا آپ کا کوئی جوڑ بھی تو نہیں۔ میں نے انکار کر دیا تھا لیکن آپ کے والد مانے ہی نہیں۔ میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔"

دُلھن نے شاید ان باتوں کو صحیح طور پر سُنا بھی نہیں۔ گھڑے پر ایک سوکھی روٹی رکھی ہوئی تھی۔ دُلھن نے وہ روٹی کو اٹھا لیا، پوچھا۔

"یہ روٹی، یہ سوکھی روٹی یہاں کیوں رکھی ہے؟"

نوجوان دولھا نے جواب دیا "یہ روٹی ہے جو کل کی بچی ہوئی۔ کل میں بازار سے دو روٹیاں لایا تھا۔ ایک کل ہی کھالی تھی اور دوسری یہ آج کے لیے بچالی تھی۔"

دُلھن نے بیزاری کا اظہار کیا اور کہا "براہِ کرم آپ مجھے میرے والدین کے گھر پہنچا دیں۔"

دولھا کو اس بات سے بڑا دکھ پہنچا اور کہا "خاتون! آپ میری دُلھن ہیں اور آج ہی اس گھر میں آئی ہیں، آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

دُلھن نے مختصراً جواب دیا "براہِ کرم آپ مجھے میرے والدین کے گھر پہنچادیں۔"

دُولھا نے اپنی بیوی کے چہرے پر موجود عزم و ثبات کو دیکھا تو کانپ گیا، بولا "میں اپنے اس انجام سے اچھی طرح واقف تھا لیکن آپ کے والد شاہ شجاع مانے ہی نہیں کہنے لگے میری بیٹی بہت متقی اور پرہیزگار ہے میں۔ باتوں میں آگیا۔"

دُلھن نے پوچھا "آپ اپنے کس انجام کی بات کر رہے ہیں؟"

نوجوان شوہر نے جواب دیا "میں جانتا تھا کہ آپ شاہزادی ہیں آپ کا اپنا ایک مزاج ہوگا۔ میں نے تو پہلے ہی یہ سوچ لیا تھا کہ آپ اس جھونپڑے میں خوش نہیں رہیں گی لیکن شوق اور لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ اگر آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو میں ہمیشہ کے لیے ادھورا، اور پریشان رہ جاؤں گا۔"

دُلھن نے کہا "میں آج ہی اپنے والدین کے پاس اس لیے واپس جا رہی ہوں کہ شادی سے پہلے میرے باپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں تیری شادی ایک عفیف نوجوان سے کر رہا ہوں۔ اب میں اپنے باپ پر حیران ہو رہی ہوں کہ انھوں نے ایک ایسے نوجوان کو عفیف کیونکر کہہ دیا جو اللہ پر بھروسا نہیں کرتا اور روٹی کا کل کے لیے انتظام کر رکھتا ہے۔"

نوجوان بہت شرمندہ ہوگیا، بولا "آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور میں معافی چاہتا ہوں، اللہ نے چاہا تو آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

دلھن نے جواب دیا "میں کچھ نہیں جانتی، آپ جو چاہیں کریں لیکن میں ایسے گھر میں نہیں رہوں گی جہاں کل کی فکر کی جا رہی ہو۔ اب اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا پھر روٹی رہے گی۔ اب میں اسی گھر میں رہنا پسند کروں گی جہاں کل کی فکر ہی نہ ہو۔ اب اس گھر میں یا تو یہ روٹی رہے گی یا ہم دونوں۔ بس یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔"

شوہر نے اعلان کر دیا "اس گھر میں ہم دونوں رہیں گے۔ روٹی، جو جھگڑے کی فساد کی جڑ ہے، میں اس جڑ سے دور رہنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد روٹی کو خیرات کر دیا گیا اور دونوں میاں بیوی اطمینان سے رہنے لگے۔

رات کے پچھلے پہر ان دونوں نے بربط کی آواز سنی۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ بہن بھائی کی بربط نوازی سے خوب واقف تھی، شوہر سے کہا "ذرا باہر تو جائیے دیکھیے شاید یہ میرا بھائی بربط بجا رہا ہے۔"

شوہر نے باہر جاکے دیکھا تو یہ واقعی ان کا برادرِ نسبتی تھا۔ بہن نے بھائی سے شفقت آمیز لہجے میں کہا "بھائی! یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے، کیا تمھیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا جو یہ بربط لیے آوارہ و سرگرداں پھرتے رہتے ہو؟"

بھائی نے جواب دیا "اللہ کوئی ڈرنے کی چیز ہے، وہ تو نہایت محبت کرنے والا مہربان ہے۔"

بہن نے کہا "بھائی! بربط بجانا چھوڑ دو اور باوا جان کے نقشِ قدم پر چلو اسی میں عافیت ہے اسی میں نجات ہے۔"

بھائی نے بے مروتی سے کہا "بہن! میں آپ کا ادب کرتا ہوں جس طرح میں آپ کے معاملات میں دخل نہیں دیتا اسی طرح آپ کو میرے معاملات سے غیر متعلق رہنا چاہیے۔ ہم دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں اس لیے ہمیں ایک دوسرے کے معاملاتِ زندگی میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔"

بہن نے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی، بولی "بھائی! اگر میں تمھاری بہن نہ ہوتی تو شاید خاموش ہو جاتی لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم دین اور دُنیا تک برباد ہو جاؤ۔"

بھائی نے جواب دیا "اچھا اب میں جاؤں گا اور دیکھنا بہن تم آئندہ مجھے اس طرح نہیں بلاؤ گی، اگر بلاؤ گی تو میں آؤں گا نہیں۔"

بہن نے کہا: "لیکن میں باز نہیں آؤں گی تم اپنا کام کرتے رہو میں اپنا کام کروں گی۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

بھائی نے ایک سرد آہ بھری اور جواب دیا: "بہن! جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہاں کی حکومت میرے باپ کے پاس تھی تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ اس حکومت کو ہمارے ہی پاس ہونا چاہیے تھا۔ حکومت میں جو مزہ، جو کیف ہوتا ہے اس کو میں اس غربت میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔"

بہن کو بھائی کی باتیں تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ اس نے جواب دیا: "میں کچھ کہوں گی تو نہیں لیکن ایک بات پیشگوئی کے طور پر تمہارے دل و دماغ میں اتار دوں گی، دنیا میں کچھ نہیں رکھا۔ یہ دھوکے فریب کی دنیا ہے یہ دھوکے فریب کے علاوہ اور کیا دے گی؟"

بھائی نے اپنے بربط کو ساتھ لیا اور مزید کوئی بات کیے بغیر باہر نکل گیا۔

بازاروں، گلی کوچوں میں شاہ شجاع کے بیٹے کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ اس کو شاہ شجاع کے حوالے سے پہچانتے تھے اور عزت دیتے تھے۔ اس کا جدھر سے بھی گزر ہوتا، لوگ اس سے بربط بجانے کی فرمائش کرتے۔

شاہ شجاع نے بیوی سے کہا: "اگر صاحبزادے کے یہی لیل و نہار رہے تو میں اس بستی کو بھی چھوڑ دوں گا اور کسی ویرانے میں چلا جاؤں گا۔"

بیوی نے پوچھا: "کسی ویرانے میں جا بسنے سے آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا: "اس سے ہمیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ لوگ ہمیں شرمندہ نہیں کریں گے۔"

بیوی نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "اس میں بھی ایک خرابی ہے کیونکہ آج آپ جس جگہ کو ویرانہ کہیں گے جب آپ وہاں بیٹھیں گے تو وہ جگہ بھی رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ شہر کی شکل اختیار کر جائے گی اس لیے آپ کو جو کچھ کرنا ہے یہیں کیجیے۔"

شاہ شجاع کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ کہا: "تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ پھر یہ بتاؤ کہ میں اپنے بیٹے کے لیے کیا کروں کہ یہ سدھر جائے؟"

بیوی نے جواب دیا: "دعا۔ آپ اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر دیجیے اور دیکھیے کہ وہاں سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔"

شاہ شجاع نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسی وقت اپنا یہ مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر دیا اور گڑگڑاتے ہوئے کہا: "اے اللہ! یہ بہت بے کسی، بے بسی اور اذیت کی بات ہے کہ میں اپنے بیٹے کو راہ راست پر نہیں لا سکتا۔ اب مجھ پر رحم فرما اور میرے بیٹے کو سیدھی راہ دکھا۔"

جب یہ اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر رہے تھے، ان کا بیٹا بربط لیے بازار میں گاتا پھر رہا تھا اور شائقین اس کے آگے پیچھے

اقوالِ زرّیں

★ اخلاص یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا معاوضہ نہ چاہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

★ خاموشی غصّے کا بہترین علاج ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

★ خندہ روی سے پیش آنا سب سے بڑی نیکی ہے۔ (حضرت علیؓ)

★ جب لوگوں کو اچھا کام کرتے دیکھو تو تم بھی شریک ہو جاؤ (حضرت عثمان غنیؓ)

★ عظیم گناہوں کا کفّارہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ (حضرت علیؓ)

★ دوسروں کو خوش رکھ کر جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں (امام اعظمؒ)

★ جو شخص تعلیم کی مصیبت نہیں اٹھاتا اُسے جہالت کی ذلت اٹھانا پڑتی ہے۔ (مولانا محمد علی جوہر)

★ حیا کے ساتھ تمام نیکیاں اور بے حیائی کے ساتھ تمام برائیاں وابستہ ہیں۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

★ حیا کی غایت یہ ہے کہ آدمی خود اپنے آپ سے بھی حیا کرے۔ (حضرت علیؓ)

داد دے رہے تھے۔ اس ہجوم میں ایک بزرگ نے بربط نواز بیٹے سے کہا "کچھ جانتا ہے کہ تیرا باپ کیا کر رہا ہے؟"
لڑکے نے پوچھا "میرا باپ کیا کر رہا ہے؟"
بزرگ نے جواب دیا "تیرے باپ نے تیرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے اور عنقریب پیشیاں پڑنے والی ہیں۔"
بربط نواز بیٹے نے مسکرا کر جواب دیا "میرے باپ کو اس کے سوا آتا ہی کیا ہے جب پیشیاں پڑیں گی تو میں سوال جواب کر کے عدالت کو حیران کر دوں گا۔"
بزرگ نے کہا "نادان! وہ مقدمہ کسی دنیاوی عدالت میں نہیں خدا کی عدالت میں دائر کیا گیا ہے سو وہاں پیشیاں پڑیں گی مگر تجھ کو ان کا پتا تک نہیں چلے گا۔"
لوگوں نے شور کر دیا "بربط بجاؤ بربط سناؤ! بڑے میاں وقت نہ ضائع کرو، دور ہٹو۔"
بڑے میاں نے ہنس کر جواب دیا "واہ واہ کیا بات کہی ہے تم لوگوں نے۔ میں کام کی باتیں کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ وقت نہ ضائع کرو اور جب یہ شاہ شجاع کا بیٹا بربط نوازی کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا ہے تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے وقت کا صحیح استعمال ہو رہا ہے۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور عقل سلیم عطا فرمائے۔"
بربط نوازی جاری رہی اور بربط نواز شہزادے کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ اللہ کی عدالت میں مقدمہ کی آخری تاریخ پڑ گئی اور فیصلے کا دن آ گیا۔
نصف رات گزر چکی تھی چاند غائب تھا آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا شاید یہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ بربط نوازی میں رات کا نصف حصہ گنوانے کے بعد شہزادہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں ایک مکان کو اس نے جگمگاتے ہوئے دیکھا۔ یہاں کسی کی شادی ہوئی تھی اور دولہا ابھی دلہن سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ بربط نواز شہزادے پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اس لیے اس مکان کی دیوار کے سائے میں بربط بجانا شروع کر دیا۔ دلکش اور دلوں میں اتر جانے والی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی اور ایک سماں بندھ گیا۔
گھر میں نئی نویلی دلہن ابھی تک جاگ رہی تھی۔ بربط کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ بے چین ہو کر دروازے پر آ گئی اور جھانکنے لگی۔ شہزادہ بربط نوازی میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اندر سوئے ہوئے شوہر کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس نے اپنے آس پاس بیوی کو تلاش کیا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو چپکے سے اٹھا اور اسے تلاش کرتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ بربط کی آواز دولہے کے کانوں میں بھی رس گھول رہی تھی، اس نے دروازے کے پاس اپنی بیوی کو اس حال میں دیکھا کہ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اس میں سے بیوی کا چہرہ ذرا سا نکلا ہوا تھا۔ دروازے کی درز سے اس نے جھانک کر بربط نواز کو دیکھا اور پہچان لیا کہ یہ تو شاہ شجاع کا بربط نواز بیٹا ہے جو آج کل بازاروں اور گلی کوچوں میں آوارہ و سرگرداں پھر رہا ہے اگر باپ نے بروگ نہ لیا ہوتا تو یہی لڑکا یہاں کا شہزادہ اور ولی عہد ہوتا۔ اس کو یہ دیکھ کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اس کا کچھ بھی نہ کر سکتا تھا اس نے بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے پوچھا "تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"
بیوی نے چونک کر اپنے پیچھے شوہر کو جو دیکھا تو گھبرا گئی اور کھسیا کر جواب دیا "آپ بھی تو بربط کی آواز سن رہے ہیں۔ کیسا عمدہ بجاتا ہے یہ لڑکا۔"
شوہر کے دل میں حسد اور رقابت کی آگ جل اٹھی، بولا "ادھر آ۔ چل اندر، تجھ سے تو میں بعد میں باتیں کروں گا پہلے میں اس نوجوان سے بات کر لوں۔"
بیوی نے شوہر کی خوشامد شروع کر دی، کہا "خدا کے لیے اس نوجوان سے کچھ نہ کہیے گا کیونکہ اس کی کوئی خطا نہیں۔ میں یہاں اپنی مرضی سے آئی تھی اور پھر یہ کہ اگر آپ نے اس کے خلاف کچھ کہا تو یاد رکھیے گا کہ یہ یہاں کے بادشاہ کا چچا زاد بھائی ہے اور ہم سب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"
شوہر نے کہا "تو اندر تو جا۔ میں اسے ماروں گا نہیں، بس ذرا غیرت دلاؤں گا۔ امید ہے کہ اس سے بات بن جائے گی۔"
لیکن بیوی کو اپنے شوہر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا بولی "میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوں آپ ان سے باتیں کیجیے جا کر۔"
شوہر بیوی کو چھوڑ کر باہر چلا گیا اور بربط نواز شہزادے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
بربط نوازی ختم ہو گئی اور شہزادہ کھڑا ہو گیا۔ شوہر کو غصہ چڑھا ہوا تھا اس نے شہزادے کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو جھنجھوڑ کر پوچھا "یہاں کیا ہو رہا ہے نوجوان؟"

شہزادے نے جواب دیا:" بربط بجا رہا ہوں کیوں کیا آپ کو اس پر اعتراض ہے کسی قسم کا؟"

شوہر نے ایک جھٹکا اور دیا اور کہا:" اعتراض، ایسا ویسا اعتراض۔ میں ابھی بتاتا ہوں تجھ کو کہ مجھ کو کس قسم کا اعتراض ہے۔"

شوہر یہ کہ کر نوجوان سے دھینگا مشتی کرنے لگا۔ شہزادے نے کہا:" یہ کیا کرتے ہو؟ شور غل ہوگا محلے کے لوگ جمع ہو جائیں گے، اور تجھ سے پوچھیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو تو کیا جواب دے گا؟"

شوہر کی سمجھ میں یہ بات آگئی، بولا:" اچھا، اس وقت تو میں تجھ کو چھوڑ دوں گا۔ اب تو یہاں سے چلا جا لیکن جانے سے پہلے ہمیں ایک بات بتا جا۔"

شہزادے نے پوچھا:" وہ کیا؟ پوچھو، میں ضرور جواب دوں گا۔"

شوہر نے پوچھا:" کیا تو شاہ شجاع کا بیٹا ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا:" ہاں میں انہی کا ننگِ خاندان بیٹا ہوں۔"

شوہر نے مزید سوال کیا:" اور جیسا کہ میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ تیرا باپ تجھ سے بے حد ناراض بھی ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا:" ہاں یہ بات بھی درست ہے۔"

شوہر نے کہا:" جب وہ بھی درست ہے اور یہ بھی درست ہے تو کیا بات ہے کہ تو اپنے ننگِ خاندان کام سے باز بھی نہیں آتا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

شہزادے کو رونا آگیا، بولا:" اپنے باپ کی حکومت تھی وہ باپ نے اپنے بھائی اور بھتیجے کو دے دی۔ میں نے اپنے غم غلط کرنے کے لیے بربط کا سہارا لیا تو اس کا اپنے والد کے ساتھ ایک زمانہ دشمن ہو رہا ہے۔ اب تو ہی بتا کہ میں کیا کروں کہاں جاؤں؟"

شوہر نے جواب دیا:" اب تم سیدھے سیدھے گھر جاؤ اور توبہ و استغفار کرو، شاید خدا کو تمھاری توبہ پسند آجائے۔"

شہزادے نے بربط سنبھالی اور آہستہ سے کہا:" تو نے ٹھیک کہا۔ شاید خدا کو میری ادا پسند آجائے اور میں توبہ پہ مائل ہو جاؤں۔"

شہزادے نے اپنے گھر جا کے بربط توڑ دی اور اندر بند ہو کے روتا رہا۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سُجا لیں۔ شاہ شجاع کو جب یہ بتایا گیا کہ اُن کا بیٹا اندر رو رہا ہے اور اُس نے بربط توڑ کے پھینک دی ہے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ پوچھا:" کیا یہ سچ ہے؟"

بیوی نے جواب دیا:" اس میں ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ میں نے ٹوٹی ہوئی بربط خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ آپ اندر جائیں اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں۔"

شاہ شجاع نے اپنے بیٹے کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا:" کیا ہوا بیٹے! تو کیوں رو رہا ہے؟"

بیٹے نے اشک آلود نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور پھر اُٹھ کے سینے سے لگ گیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

شاہ شجاع نے اپنے بیٹے کو بھینچ لیا اور پُشت کو تھپتھپاتے ہوئے کہا:" نہ رو میرے بیٹے! میں تیرے کرب سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو میں جانتا ہوں تو نہیں جانتا۔ جس حکومت کو میں نے چھوڑ دیا اس کے خرخشوں سے تو واقف نہیں وہ ہمارے لیے عذاب تھا اور تیرے لیے خواب۔ اس میں بڑی مصیبتیں تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کا عیش اور ہمیشہ کا عذاب۔ تو نے بربط بجانا شروع کیا۔ میں نے تجھ کو ایک آدھ بار منع کیا، اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ اب تو نے خود ہی بربط کو توڑ ڈالا تو میں تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟"

بیٹے نے جواب دیا:" اب میں اس دنیا سے بیزار ہو چکا ہوں، مجھ کو وہ راستہ دکھایئے کہ میں سکون حاصل کر سکوں۔ میری بے چینیوں میں کمی واقع ہو اور میں خود کو اپنی نظروں میں گرا ہوا نہ محسوس کروں۔"

شاہ شجاع نے جواب دیا:" نہ گھبرا میرے بیٹے اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بیٹا ایک بار پھر سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ شاہ شجاع بھی رونے لگے۔ بیٹے نے کہا:" امتحانات اور آزمائشوں کا سلسلہ جاری ہے خدا جانے یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟"

بیٹے نے کہا:" میں نے بربط نوازی سے توبہ کر لی ہے کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟"

شاہ شجاع نے جواب دیا:" بیٹے! وہ غفور الرحیم بھی ہے اور ستار العیوب بھی۔ اس سے مایوس نہ ہو۔"

اب بیٹے نے باپ کے ساتھ اُن کی نگرانی اور سرپرستی میں مجاہدہ اور تزکیہ نفس شروع کر دیا اور اپنے باپ شاہ شجاع کے بقول کہ جو مقام اور مرتبہ چالیس سال میں حاصل نہ ہو سکتا تھا اسے اُن کے بیٹے نے چالیس دن میں حاصل کر لیا تھا۔

اب شاہ شجاع نے سیاحت شروع کر دی تھی۔ گھر میں بیٹا تو موجود ہی تھا، آپ مختلف شہروں میں گئے اور صوفیوں سے ملاقاتیں کیں۔ شاہ شجاع کا شہرہ ان سے پہلے ہی جگہ جگہ پہنچ چکا تھا۔ اسی عہد کے مشہور صوفی یحییٰ بن معاذ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوتے۔

یحییٰ بن معاذ لوگوں میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے شاہ شجاع کو دعوت دی کہ میری مجلسِ وعظ میں آپ تشریف لائیں۔ آپ نے انکار تو نہیں کیا لیکن مجلسِ وعظ میں گئے نہیں۔ حضرت یحییٰ بن معاذ کو آپ سے شکایت ہوگئی کہ بلانے پر آئے نہیں۔ ایک دن آپ بغیر بلائے وہاں چلے گئے اور اس ہجوم میں ایک جگہ چپ چاپ چھپ کر بیٹھ گئے۔ یحییٰ بن معاذ انہیں نہیں دیکھ سکے اور اپنے وعظ میں مشغول رہے۔

کچھ دیر بعد یحییٰ بن معاذ کی زبان جواب دے گئی اور وعظ کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ جب کئی بار کی کوششوں کے باوجود وہ کچھ نہ بول سکے تو اعلان کیا اور کہا: "میرا خیال ہے اس مجلس میں کوئی ایسا شخص بھی موجود ہے جو مجھ سے بڑا واعظ ہے، اگر ہے تو وہ میرے سامنے آجائے۔"

شاہ شجاع ان کے سامنے چلے گئے۔ یحییٰ بن معاذ نے کہا: "تو یہ آپ ہیں جس نے میری زبان بندی کر دی تھی۔"

آپ نے جواب دیا: "اسی وجہ سے میں آپ کی مجلسِ وعظ میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔"

آپ کی اپنے ہمعصروں سے خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ اسی عہد کے ابوحفص نام کے ایک مشہور صوفی نے آپ کو خط میں لکھا:

"جب میں نے اپنے عمل، نفس اور مصیبتوں پر نگاہ ڈالی تو مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔"

آپ نے ان کو جواب میں لکھا: "حضرت! میں نے آپ کے مکتوب کو اپنے قلب کے لیے آئینہ بنا لیا ہے کیونکہ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر نفس سے مخلصانہ مایوسی ہوگی تو خدا تعالیٰ سے آس ہوگی اور جب خدا سے آس ہوگی تو دل میں خوف پیدا ہوگا اور جب خوف پیدا ہوگا تو نفس کی طرف سے مایوسی ہوگی اور جب نفس سے مایوسی ہو جائے گی تو اللہ کی یاد ہو سکے گی اور جب اللہ کی یاد مکمل ہوگی تو استغنا پیدا ہوگا اور مستغنی ہونے کے بعد ہی اللہ کا وصل ہو سکتا ہے۔"

اسی طرح ایک موقع پر فقر کے بارے میں بتایا کہ فقر خدا کا ایک راز ہے اور جب تک فقرا اس کو پوشیدہ رکھتے ہیں امین ہوتے ہیں مگر جب راز کا افشا ہو جاتا ہے تو اس سے فقر سلب کر لیا جاتا ہے۔

آپ نے فضل اور ولایت کے بارے میں کسی دوسرے صوفی کو لکھا: "یاد رکھو اہلِ فضل کا فضل اور اہلِ ولایت کی ولایت اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ اپنے فضل اور ولایت کو فضل و ولایت تصور نہیں کرتے۔"

آپ نے ایک بار اپنے بارے میں فرمایا: "میری مثال اس مرغ جیسی ہے جس کو سیخ میں پرو کر آگ پر رکھ دیا جائے اور چاروں طرف سے آگ دہکا دی جائے۔"

آپ طویل عمر گزارنے کے بعد وصال فرما گئے۔ آپ کی قبر پر فقرا زیارت کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ علی سیرجانی آپ کے مرید تھے اور ان کا قاعدہ تھا کہ مزار پر کھانا پکوا کر تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر آپ نے دعا کی: "اے اللہ! اس وقت کسی مہمان کو بھیج دے تاکہ....میں اس کے ساتھ کھانا کھاؤں۔"

تھوڑی دیر بعد کسی طرف سے ایک کتا آیا اور آپ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ آپ نے اس کو دھتکار کے بھگا دیا۔ جب کتا چلا گیا تو کسی نے دل میں کہا: "واہ کیا خوب آدمی ہو۔ خود ہی مہمان کی تمنا کرتے ہو اور جب مہمان آتا ہے تو اس کو دھتکار کے بھگا دیتے ہو۔"

علی سیرجانی مضطربانہ اٹھے اور کتے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کئی دن کی جستجو کے بعد وہ کتا ایک جنگل میں مل گیا۔ آپ نے کھانا اس کے آگے رکھ دیا اور کہا: "میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

کتے نے کھانا نہیں کھایا۔ احساسِ ندامت سے علی سیرجانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور توبہ و استغفار کرنے لگے۔

کسی نے ان سے کہا: "اے علی سیرجانی! تم نے اس کے ساتھ جو حرکت کی تھی وہ اگر شاہ شجاع کے مزار سے ہٹ کر کرتے تو وہ سزا دی جاتی کہ تم زندگی بھر یاد رکھتے۔"

سلطان خلجی مالوے سے اپنی فوجیں لے کر گجرات کی تسخیر کے لئے روانہ ہو چکا تھا اس وجہ سے گجرات کا بادشاہ قطب الدین بہت پریشان تھا۔ اسی پریشانی میں وہ شاہ عالم کے والدِ گرامی شاہ قطب عالم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دعا کی درخواست کی، شاہ قطب مراقبے کے بعد بادشاہ سے مخاطب ہوتے کہ تیرے والد نے پیر شیخ کمال کو رنجیدہ کیا تھا اور یہ افتاد اسی غلطی کی پاداش کے نتیجے میں نازل ہوئی۔ سلطان قطب الدین نے گزارش کی یا حضرت گناہ میرے والد کا تھا اور سزا مجھ کو کیوں مل رہی ہے۔ اس پر شاہ قطب عالم نے فرمایا کہ شاہ عالم کو ساتھ لے جاؤ، ساتھ ہی شاہ عالم کو ایک شکستہ تیر دیا اور فرمایا کہ دورانِ جنگ مناسب موقع دیکھ کر یہ تیر سلطان خلجی کی فوجوں پر پھینکا دیا جائے۔ انشاء اللہ فتح سلطان قطب الدین کی ہوگی۔

سلطان قطب الدین انتہائی غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ اُس کو خدا پر یقین اور شاہ قطب عالم کی بات پر اعتماد تھا، مگر پھر بھی بے کلی اور پریشانی اپنی جگہ تھی۔ لڑائی شروع ہوئی وہ منتظر تھا کہ شاہ عالم اپنا تیر مخالف فوج کی طرف پھینکیں اور جنگ کا فیصلہ ہو مگر شاہ عالم موقع کی انتظار میں تھے۔ بادشاہ نے منت مانگی کہ اگر میں یہ جنگ جیت گیا تو ہر پیغمبر کے نام پر ایک اشرفی خیرات کروں گا۔ شاہ عالم یہ منت اگین دعا سن رہے تھے۔ آپ نے اسی اثنا میں مناسب موقع دیکھ کر تیر ہوا میں بلند کر کے مخالف سپاہ پر اُچھال دیا، تیر کا پھینکنا تھا کہ سلطان خلجی کی موت واقع ہو گئی اور فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ غضب کا رن پڑا اور فتح سلطان قطب الدین کو نصیب ہوئی۔ اب بادشاہ کو فوراً منت پوری کرنے کا خیال آیا۔ بادشاہ نے باسٹھ ہزار اشرفیاں غربا میں خیرات کر دیں جب کہ باسٹھ ہزار اشرفیاں شاہ عالم کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیں، آپ نے لینے سے انکار کر دیا اور بادشاہ کے اصرار پر سکوت فرمایا۔ بادشاہ شاہ قطب عالم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شاہ عالم کے متعلق گزارش کی وہ اشرفیاں قبول نہیں کرتے والد کے اصرار و استفسار پر شاہ عالم نے فرمایا کہ خیرات کے مال کو رسولِ مقبولؐ نے اپنے آپ اور اپنے خاندان پر حرام قرار دیا ہے۔ والد قطب شاہ بڑے ملول ہوتے اور اپنے حجرے میں داخل ہو گئے۔ اُن کو بادشاہ کی اس روش پر بہت دکھ تھا۔ شاہ عالم کو خیال ہوا کہ والدِ گرامی میرے اوپر شاید ناراض ہو گئے ہیں، آپ نے یہ ذکر اپنے برادر زاہد شاہ سے کیا، شاہ زاہد اپنے والد کے حجرے میں گئے مگر جواب نہ ملا وہ بہت پریشان ہوتے۔ اسی رات شاہ قطب کو خواب میں آنحضورؐ کی زیارت ہوئی اور فرمایا گیا کہ شاہ عالم نے جو کچھ کیا ہے وہ عین حقیقت ہے لہٰذا اُن پر کوئی ناراضگی نہ رکھی جائے۔ یہ سن کر شاہ قطب فوراً حجرے سے باہر آتے اور فرمایا کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں جس کا وہ بیٹا ہے جس کی وکالت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی

ہے۔ شاہ عالم کو والدِ گرامی نے سینے سے لگا لیا اور معرفت کے اسرار و رموز سے کماحقہ آگاہ کیا۔

شاہ عالم حضرت شاہ قطب عالم کے چہیتے بیٹے تھے، آپ کی پیدائش کے وقت آپ کے والد بہت زیادہ خوش ہوئے۔ ۹ ذیقعد ۸۱۷ھ کو جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے والد عالمِ استغراق میں چلے گئے۔ اسی کیف و مستی کے عالم میں آپ کو بتایا گیا کہ اس نومولود کا نام سید محمد رکھا جائے آپ مسکراتے، لبوں پر کئی مرتبہ اس نام کو دُہرایا، اس کے ساتھ ہی آپ کو سید عالم بھی بتلایا گیا، اس طرح سید محمد کے ساتھ سید عالم کا نام و لقب آپ کو اللہ تعالیٰ نے از خود عطا فرمایا۔ سید عالم پر دوسرے بھائی بہنوں کی نسبت زیادہ توجہ دی جانے لگی، آپ علومِ ظاہری و باطنی کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حریص واقع ہوئے۔ آپ کے والد جب اپنے کسی دوسرے بیٹے پر ملتفت ہوتے تو یہ بہت ملول ہوتے، آپ کو عربی، فارسی اور تفسیر و حدیث، منطق و فقہ کی تعلیم گھر پر ہی حاصل ہو رہی تھی، آپ کو سنِ آغاز میں پتنگ بازی کا بہت شوق تھا۔ ایک روز آپ اپنے اس شغل میں مشغول تھے کہ آپ کے والد اس جگہ پہنچ گئے۔ انھیں بہت رنج ہوا۔ شاہ عالم اس صورتِ حال سے بے خبر پتنگ اُڑانے میں مصروف تھے۔ اس کا شاہ قطب عالم کو بہت دکھ ہو رہا تھا۔ آپ پر عالمِ وجد طاری ہو گیا۔ دل کی گدازیت نے آنکھوں میں آنسو اور جسم میں کپکپی طاری کر دی۔ کسی ہم جولی نے شاہ عالم کو اُن کے والد کے متعلق بتلایا۔ وہ پتنگ چھوڑ کر والد کی طرف دوڑے۔ والد کو اس حالت میں دیکھ کر آپ کو بہت شرمندگی ہوئی۔ کافی دیر وہ والد کو دیکھتے رہے، اپنی غلطی کی معافی مانگتے ہیے۔ شاہ قطب کے آنسو جاری تھے۔ شاہ عالم بہت خوش ہوئے کہ والدِ گرامی پر وجد طاری ہے اس کیفیت میں بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، آپ نے اپنے والد کے بازو پکڑ کر عرض کی کہ میں بھی ایسی کیفیت سے دوچار ہونا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس سے ہمکنار فرمائیں۔ شاہ قطب نے فرمایا کہ کیا چیز حاصل کرنا چاہتے ہو۔ شاہ عالم بولے، درد، کیف، سوز اور کیفیت، میں ان چیزوں کی لذت حاصل کرنا چاہتا ہوں جو آپ کو حاصل ہیں۔

شاہ قطب نے سمجھایا کہ اس کٹھن راستے پر چلنا بہت دشوار ہے۔ یہ دلکش راستے حصول میں بڑے صبر آزما ہوتے ہیں، لیکن شاہ عالم نے اپنا ارادہ ترک نہ کیا۔ اس پر شاہ قطب نے فرمایا، اگر تو یہ چاہتا ہے تو میرے آنسو کو چاٹ لے۔ شاہ عالم نے اپنے والد کے آنسوؤں کو چاٹ لیا۔ آنسوؤں کا جسم کے اندر جانا تھا کہ..... انقلاب اور روشنی پیدا ہو گئی۔ سینے میں ایک کیف و سوز اور درد بھرا مزا، پُر لطف آگ سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے بعد شاہ عالم نے حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور اپنے دل میں برپا ہنگاموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ باہر لوگ آپ کی اس طرح کی حالت پر پریشان تھے۔ شاہ قطب عالم نے چشمِ مکاشفہ سے دیکھ لیا تھا کہ بیٹا کن رُوحانی کیفیات سے دوچار ہو چکا ہے، چنانچہ لوگوں کے اضطراب سے آپ کو کوئی پریشانی نہ ہوئی، لیکن لوگوں کی وجہ سے آپ نے شاہ عالم کو حجرے سے باہر آنے کا حکم دیا۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو آپ کی ظاہری حالت بالکل بدل چکی تھی، آپ سر سے لے کر پاؤں تک جذب و سوز کی کیفیت سے دوچار تھے۔ شاہ قطب عالم کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، آپ نے شاہ عالم کو سینے سے لگا لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس طرح شاہ عالم ہوش میں آ گئے۔

شیخ احمد کھٹو بہت بلند پایہ بزرگ تھے۔ وہ ایک مرتبہ آپ کے والد کے پاس تشریف لائے ہوئے تھے، انھوں نے شاہ عالم کو دیکھا تو بہت ہی متاثر ہوئے اور آپ کو پاس بُلایا۔ اس وقت آپ کے والد شاہ قطب دوسرے بیٹے کی تربیت میں مشغول تھے، آپ نے شیخ احمد کھٹو سے فرمایا کہ میرے والد میری طرف متوجہ نہیں ہیں، آپ ہی میری طرف توجہ فرمایئے۔ شیخ احمد کھٹو نے فرمایا تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس پر شاہ عالم آب دیدہ ہو گئے اور کرتے کے دامن سے آنسو پونچھنے لگے۔ شیخ احمد کھٹو ابھی اُن سے یہ باتیں کر رہے تھے کہ شیخ عبد اللطیف پٹن والے بھی تشریف لے آئے۔ ان کی آمد پر آپ کے والد شیخ قطب عالم نے فرمایا، آپ کس طرح تشریف لے آئے، جب انھوں نے یہ بتلایا کہ مجھے آپ کے صاحبزادے شاہ عالم لے کر آئے ہیں۔ شاہ قطب نے شاہ عالم کو گلے لگا لیا کہ یہ بیٹا کس قدر رمز شناس ہے، میرے دل میں آپ کی ملاقات کی طلب تھی اس نے چشمِ باطنی سے میرے دل کی کیفیت بھانپ لی، آپ کو والدِ گرامی سے بہت زیادہ دعائیں ملیں، اس پر شیخ احمد کھٹو بولے، کیا اب بھی تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے، شاہ عالم نے عرض کی آپ والدِ گرامی سے میری سفارش کریں کہ سلوک کی جو تعلیم وہ میرے بھائیوں کو دے رہے ہیں اس میں مجھے بھی شامل کر لیں۔ شیخ احمد کھٹو نے ایک روز یہ بات شاہ قطب سے کی، یہ سُن کر شاہ قطب مسکرائے اور فرمایا شاہ عالم ہر کام جلدی چاہتا ہے، اس کو خدا بڑے درجات عطا کرے گا اس کو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ شیخ احمد کھٹو بولے جو وہ آپ سے چاہتا ہے اس کا مجھ سے بھی طالب ہے، میں اس کو بہت کچھ سامانِ روحانیت

دول گا۔ جب شاہ عالم کو احمد شاہ کھٹو کے ارادہ کا پتہ چلا، وہ گھر میں اطلاع کئے بغیر بٹوا چلے گئے۔ جہاں احمد شاہ کھٹو کا مسکن تھا، وہ شاہ عالم کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے ساتھ ہی بلا اجازت گھر سے چلے آنے پر ناراض بھی ہوئے۔ شاہ عالم نے عرض کی کہ وفورِ شوق مجھے اس قدر بے گانہ کر چکے تھے کہ مجھے اجازت کا خیال ہی دل میں نہ آیا۔ آپ کو اپنے والد قطب شاہ کی ناراضگی کا علم احمد شاہ کھٹو کے کشف و کرامات کی بدولت ہو چکا تھا۔ اس پر وہ واپس اپنے گھر آئے مگر والد کے سامنے جانے کی جرأت نہ کر سکے۔ ایک دن والد کو نہایت خوشگوار موڈ میں دیکھ کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ قطب نے نہایت سنجیدگی سے بلا اجازت چلے جانے کی وجہ پوچھی۔ جواب میں جب اُن کو پتہ چلا کہ شیخ احمد کھٹو کے زہد و ورع اور روحانی کمالات اُن کو اپنی کشش میں مبتلا کر کے لے گئے تھے تب والد بزرگوار نے جواب دیا کہ شیخ احمد کھٹو بلاشبہ بڑے ولی ہیں۔ میں خود بھی اُن کا عقیدت مند ہوں مگر تم نے مجھ میں کون سی ایسی کمی دیکھی جس کی وجہ سے مجھ سے اجازت لینی بھی مناسب نہ سمجھی۔ اس پر شاہ عالم اپنے باپ کے قدموں پر سر رکھ کر اس طرح روئے کہ شدتِ گریہ سے آنکھیں متورم ہو گئیں۔ اس طرح شاہ قطب نے بیٹے کو معاف کر دیا اور اپنے دامانِ شفقت میں لے لیا۔

آپ کو آپ کے والد شاہ قطب سے خلافت کا خرقہ عطا ہوا۔ جب وہ واصل حق ہوئے تو اُن کی جگہ آپ آزادانہ رشد و ہدایت فرمانے لگے۔ انہی [...]ول منگلور سے سید رکن الدین کا مکتوب آپ کو ملا جس میں بتلایا گیا تھا یہاں کے حالات جن میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اسلام کا گہوارہ بنانا تھا [...]رسید رکن الدین کے دادا سید سکندر کو رشد و ہدایت کا کام سونپا تھا۔ اس کے بعد سید آدم نے دینی عنان سنبھالی۔ اب وہی منگلور جو اسلام کا قلعہ تھا گمراہی کا گھر [...]ناجار رہا ہے۔ یہاں کا ہندو حکمران مسلمانوں کا سخت دشمن بن چکا ہے۔ مالی وسائل کی کمیابی کا یہ عالم ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دو وقت کی روٹی مشکل ہو [...]ن شاہ عالم نے خط پڑھا۔ جواباً تسلی و تشفی آمیز جملے لکھے۔ چند ورد و وظائف لکھے۔ جن سے امن و آشتی کا سلسلہ پیدا ہو گا اور مالی وسائل پیدا ہوں گے۔ دوسرے [...]ندو فرمانروا کے متعلق فرمایا کہ اس کو سخت عبرت ناک سزا ملے گی۔ انہی دنوں گجرات کے حکمران نے منگلور پر حملہ کر کے اس کے والی کو گرفتار کر لیا اور احمد آباد [...]قبضے لیا۔ اس طرح مسلمانوں کو اس ظالم سے نجات مل گئی۔ احمد آباد شاہ عالم کا شہر تھا۔ یہاں ہندو قیدی حکمران پر اتنی کڑی پابندیاں نہ تھیں وہ وقتاً فوقتاً [...]ن پھر لیتا تھا۔ ایک روز حضرت شاہ عالم کی خانقاہ کے سامنے سے گزرا تو عقیدت مندوں کے ہجوم کو دیکھ کر کہنے لگا، یہ کسی بادشاہ کا دربار ہے۔ جواب ملا نہیں [...]الم حضرت شاہ عالم کی خانقاہ ہے۔ پھر آپ کی آمدن، روزگار کے متعلق پوچھنے لگا۔ جب اُس کو معلوم ہوا کہ شاہ عالم تو عالم کو بہت کچھ عطا کرتے ہیں اور [...]سے کچھ لیتے نہیں اُن کا گزر بسر صرف توکل پر ہوتا ہے تو وہ بڑا حیران ہوا بلکہ ششدر رہ گیا کہ اتنا بلند مرتبہ تو بڑے بڑے شہنشاہوں کا بھی نہیں ہوتا۔ آپ سے [...]ت کا شوق ظاہر کیا۔ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کا نام لے کر فرمایا، سناؤ آج کل کیا کرتے ہو۔ اُس نے اپنی بے بسی اور بے نوائی کی [...]ن حالم و کاست عرض کر دی۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے بے گناہ مسلمانوں پر بہت ہی ظلم و ستم کئے ہیں، بتا سکتے ہو اس کی کیا وجہ تھی۔ اس نے کہا کہ میں شرمندہ [...]توبہ اور معافی چاہتا ہوں اور مسلمان ہونا چاہتا ہوں، کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کیوں نہیں، تو اپنے آپ کو پاک صاف کر کے آ اور جو میں پڑھاؤں [...]تو ان شاء اللہ مسلمان ہو جائے گا۔ وہ آپ کا حکم بجا لایا۔ آپ نے اس کو کلمہ پڑھایا اُس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ اسلام کتنا آسان مذہب [...]صرف یہی اسلام ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں اُس کے ارکان کی بجا آوری بھی تجھے کرنا ہو گی۔ اس نے اُسی روز سے ارکانِ اسلام سیکھے۔ پھر عمر بھر صوم و صلوٰۃ [...]اور توبہ استغفار میں غرق رہا۔

[...]شاہ عالم کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ آپ کے کتب خانے میں ہر قسم کی اسلامی کتاب موجود تھی۔ آپ گھنٹوں بیٹھ کر مطالعہ کرتے تھے۔ آپ کی کہنیاں تخت پر [...]کی وجہ سے سیاہ ہو چکی تھیں۔ ایک روز اس عہد کے نامی گرامی مولانا صدر جہاں آپ کے کتب خانے میں داخل ہوئے۔ آپ نے اُن کی آمد محسوس تک [...]ان کو دیکھ کر مولانا نے کھنکار کر آپ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مطالعہ کے ذریعہ میں ان بزرگانِ دین کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کر لیتا ہوں جو آج ہم میں [...]ان اس کے بعد شاہ عالم نے مولانا صدر جہاں کو اپنے کتب خانے کی سیر کرائی۔ اور وہ کتابیں دکھائیں جن کے نام تو مولانا نے سن رکھے تھے مگر اُن کو [...]دیکھا تھا۔ مولانا اس پر فرمانے لگے کہ آپ کا دیدار تو مطلوب تھا ہی، اُس کے ساتھ نایاب کتب کا دیدار بھی میرے لئے باعثِ افتخار ہے۔ اور یہ میری خوش قسمتی [...]جیسے وحید العصر انسان سے میری نشست ہوئی، جو سراپا مومن ہے جو عالمِ اسلام کے لئے رحمت ہی رحمت ہے۔

[...]شاہ عالم کی ریاضت اور درویشانہ زندگی اور شرع و سنت سے بہت زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔ آپ کو اس طرح کی عقیدت قطعاً مطلوب نہ تھی آپ

نے بڑھتی ہوئی عقیدت کو دیکھ کر ایسی روش اختیار کر لی کہ لوگ یہ سمجھنا شروع ہو گئے کہ آپ نے روشن لباس پہننا شروع کر دیا، دنیادار اور نکتہ چین معتقدوں نے یہ خیال کر لیا کہ آپ عیش و عشرت اور دنیاداری میں پڑ گئے۔ اس طرح آپ کے پاس لوگوں کا آنا جانا بہت حد تک کم ہو گیا، لیکن وہ مرید جو آپ سے حقیقی اور دلی لگاؤ رکھتے تھے لوگوں کی باتوں سے بہت آزردہ خاطر ہوتے، ظاہرداروں نے آپ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ شاہ عالم پر لوگوں کے اظہارِ خیال پہنچتے رہتے تھے لیکن آپ کسی بھی صورتِ حال کو زیرِ خاطر نہ لاتے، جب اچھی طرح آپ کے حسبِ حال عقیدت مندرہ گئے تو آپ نے ان کو ساری کہانی سنائی کہ انھوں نے یہ لبادہ کیوں اوڑھا تھا، اس کے بعد آپ نے دوبارہ اپنی اصل طرزِ حیات کو اختیار کر لیا۔

آپ نے امراء اور بادشاہوں کے ساتھ بھی نشست و برخاست رکھی، لوگوں نے اس پر بھی اعتراض کئے، کسی نے اس کو بزرگانِ سلف کے طرزِ عمل کے خلاف قرار دیا، کسی نے درویش اور سلطان کا میل جول ناپسندیدہ قرار دیا، آپ نے کسی کی پرواہ نہ کی، آپ کا خیال تھا کہ انسان کی اچھائی اور برائی کا انحصار اس کی نیت پر موقوف ہوتا ہے۔ انسانی خدمت بہرحال مستحسن ہے وہ جس حال میں بھی کی جائے، امراء اور سلاطین سے درویشوں کے تعلق سے بھی انسانی خدمت کا ایک پہلو نکلتا ہے وہ اس طرح کہ کوئی بھی بادشاہ اپنے شیخ کی بات نہیں ٹالتا چنانچہ کسی غریب مستحق اور غرض مند کی امداد پیر و مرشد کی سفارش سے ہو جائے تو اس کو بھی عبادت کا ہی درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ایک دفعہ آپ کے پاس ایک ضعیف عورت تشریف لایا کرتی تھی، وہ آپ کا وعظ و نصیحت سنتی آخر کار وہ آپ کی عقیدت مند اور پھر آپ کی مرید ہو گئی کچھ عرصہ بعد وہ خاتون سال خوردہ کافی دن آپ کے وعظ سننے نہ آئی آپ کو بہت خیال ہوا، آپ نے ایک مرید کو حکم دیا کہ اس خاتون محترم کی خیریت دریافت کی جائے۔ مرید حسبِ حکم اس خاتون کے گھر پہنچا، اور شاہ عالم کا پیغام دیا کہ آپ کافی دنوں سے وعظ و نصیحت کی محفل میں نہیں آ رہی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ خاتون نے جواب دیا کہ شاہ عالم کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کرنے کے بعد بتانا کہ میرا اکلوتا سترہ سالہ بیٹا تپ محرقہ میں مبتلا ہے اور میں بہت پریشانی میں ہوں لہٰذا میرے لئے دعا فرمائیں، کیونکہ اطباء کا خیال ہے آپ کی دعا کی ضرورت ہے کیونکہ دواؤں کا وقت گزر چکا ہے۔ مرید نے کہا کہ آپ نے اس سلسلہ میں شاہ عالم سے بات کی ہوتی، شاید وہ کسی روحانی طرزِ علاج سے آپ کی مدد کرتے، اس پر خاتون یوں گویا ہوئیں۔ کہ میں شاہ عالم کے پاس کیا کہنے جاؤں، وہ پیر ہیں جب انھیں از خود مریدوں کے احوال کی خبر نہیں۔ تو ان کو جا کر بتلانا بے معنی ہے، میں تو آجکل سخت مایوس ہوں، بیٹا صحت یاب ہو گیا تو پھر انشاءاللہ شاہ عالم کی خدمت میں حاضری دوں گی، قاصد مرید نے خاتونِ مغموم کو تسلی دی اور خدا کی رحمت پر امید رکھنے کی ہدایت کر کے واپس لوٹا اور کیفیت اور احوال شاہ عالم کے گوش گزار دیئے۔

شاہ عالم نے جب یہ باتیں سنیں تو بہت افسوس سے بولے کہ درحقیقت خاتون کے بیٹے کی عمر تمام ہو چکی ہے، اور اس کی بس آخری سانسیں ہیں، اور اس ضعیف عورت کی حالت اتنی دگرگوں ہے کہ اگر اس کا بیٹا زندہ نہ رہا تو کوئی بعید نہیں کہ وہ خود بھی چل بسے گی، شاہ عالم نے عرض کی کہ پیر و مرشد اس ضعیف عورت کی حالت اتنی دگرگوں ہے کہ ... اس پر مرید نے گزارش کی کہ تو پھر آپ اللہ سے دعا کریں کہ اس بڑھیا کا بیٹا صحت یاب ہو جائے، آپ نے فرمایا جب اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ خداوند قدوس نے کر دیا ہوا ہے تو اس میں ترمیم کرنے والا میں کون ہوتا ہوں، غرضیکہ بڑھیا اپنے بیٹے کا علاج کراتی رہی مگر بے سود، آخر تنگ آ کر مریض نے ماں سے کہا مادرِ محترم میرا علاج فضول ہے مجھے کوئی دوا کارگر نہیں ہوئی، مگر اس حوصلہ مند خاتون نے کہا جانِ مادر فرمانِ خداوندی ہے کہ مشکلات و بیماریوں میں تدبیروں اور علاج سے پہلوتہی نہ کی جائے اور اس کی رحمت سے مایوسی نہ کی جائے سو میں اس کے احکام بجا لا رہی ہوں۔

بڑھیا کا بیٹا رفتہ رفتہ اتنا کمزور ہو گیا کہ ایک دن اس کا آخری وقت آ گیا، اور اس کی وفات ہو گئی، یہ سانحہ بڑھیا نے نہایت صبر اور حوصلہ سے برداشت کیا، بڑھیا فوراً شاہ عالم کے حجرہ کی طرف گئی، آپ اس وقت تشریف فرما تھے، آپ نے دستک سن کر فرمایا اندر آ جاؤ میں تمہارا ہی منتظر تھا بیٹے کا وقت پورا ہو چکا تھا سو اس کو اس کے مالک نے اپنے پاس بلا لیا، اس معاملہ میں انسان بے بس ہوتا ہے، مشیتِ ایزدی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی، آپ کی یہ باتیں سن کر اس عورت کی تسلی نہ ہوئی، وہ مصر رہی کہ میں نے تو آپ پر اعتماد اور بھروسہ کیا تھا، میرا اکلوتا بیٹا مر گیا ہے اب میری زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے، مجھے میرا بیٹا واپس دلوائیں، آپ نے بہت سمجھایا صبر کی تلقین کی مگر بے سود، وہ اپنی ضد پر اڑی رہی، آخر آپ نے

کو حجرے میں ہی ٹھہرنے کا حکم دیا اور خود گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ اندر اپنے بچے کو کھیلتے ہوئے پایا، اُس کو شفقت بھری نظروں سے دیکھا، پیار کیا اور اُٹھا لیا
گود میں لے کر خدا سے دُعا کی خدایا میرا بچہ لے لے اور اس بڑھیا جس کو مجھ پر بہت مان تھا اس کا بیٹا دے کر اس کا مان رکھ لے۔ یہ کہہ کر آپ نے بڑھیا کو اس
کے گھر واپس بھیج دیا کہ جا تیرا بیٹا تجھے واپس مل گیا۔ آپ کا بچہ لحہ بہ لمحہ موت کے منہ میں چلا گیا، اور بڑھیا کا بیٹا زندہ ہو گیا۔ جب بڑھیا گھر پہنچی تو اس کا بیٹا اس کو
تلاش کر رہا تھا کہ ماں تو کہاں گئی تھی میں تو تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے بعد بڑھیا کو اس کے فرزند نے بتلایا کہ ابھی عالم بے خودی اور بے ہوشی میں میرے
پاس ایک کم سن بچہ آیا تھا اور مجھے کہنے لگا کہ تیری ماں تیرے لئے بڑی بے قرار ہے اور تو اپنی ماں کے پاس جا، تیری جگہ میں عالم بالا کی طرف چلا جاتا ہوں۔
بڑھیا کو پوری زندگی یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ شاہ عالم نے کتنی بڑی قربانی دے کر اس کے بیٹے کے نخل حیات کی آبیاری کی اور اپنے خون سے اس کے بیٹے
کی زندگی کو سینچا۔ اتنی بڑی قربانی دینا ہر کس و ناقص کے بس کی بات نہیں ہوتی، اعلیٰ مراتب عطا فرمانے کے لئے اللہ نے بندے خاص طور سے چنے
ہوتے ہیں۔

حضرت شاہ عالم کی شادی ہوئی لیکن آپ کی اہلیہ محترمہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکیں۔ اُس کے بعد آپ کا عقد آپ کی خواہر نسبتی سے ہوا۔ آپ ر
رکوع اور عبادات و ریاضت میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کو علوم ظاہری و باطنی، منازل سلوک اور مکاشفات اور دیگر بلند مرتبے اپنے والد گرامی شاہ قطب
حاصل ہوئے۔ آپ کو بچپن سے ہی تصوف اور عبادت، ورد و وظائف میں سبقت لے جانے کا شوق تھا۔ آپ اس معاملہ میں اپنے بھائیوں سے سبقت
جانے کی کوشش کرتے۔ آپ کو آپ کے والد صاحب نے اوصاف حمیدہ کا حامل کر دیا تھا۔ آپ نے اپنی تمام عمر ریاضت، مطالعہ اور بزرگان دین کی نیک
میں گزار دی۔ بڑے سے بڑے مصائب و مشکلات میں بھی آپ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہیں آئی۔ آپ کی نظر ہمیشہ سامنے کی طرف رہی۔
آپ کے اندر کی تڑپ نے آپ کو بزرگوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کیا، آپ کے باطن میں وہ بے چینی وافر مقدار میں پائی جاتی تھی جس کے لئے عموماً
بے چین رہتے ہیں اور اس کے بغیر نہ کشف و سرور کے دروازے وا ہوتے ہیں۔ آپ میں بہت زیادہ غیرت تھی۔ آپ وہ گوشہ گیر اور عزلت نشین تھے
سلطان کی وہ خطیر رقم نامنظور کر دی جس پر خدا کی چھٹ لگی ہوئی تھی۔ آپ کے والد کی ناراضگی کے معاملہ میں آپ کی سفارش از خود رسول مقبولؐ نے فرا
کی لائبریری مثالی تھی اور آپ کا مطالعے کا شوق لاثانی تھا۔ آپ کے پاس وہ کتابیں تھیں جن سے علماء دین نام سے بھی واقف نہ تھے۔ آپ علم و عمل اور ظا
باطنی اسرار و رموز کے مرد میدان تھے۔ آپ کے حالات زندگی بہت زیادہ دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں، آپ کو زندگی میں بہت زیادہ کامیابیاں حاصل
آپ نے بہت زیادہ ناموری حاصل کر لی تھی۔
آپ بڑے بڑے صدمات میں بھی شاکر و قانع رہے۔ آپ نے اپنے لخت جگر کو بڑھیا کے بیٹے کی جگہ دے دیا لیکن آپ کے ماتھے پر ایک شکن تک
کا وصال ۱۴۷۵ھ میں ہوا۔ آپ عمر بھر رشد و ہدایت کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ کے مزار پر شہنشاہ جہانگیر نے حاضری دی تھی۔ اُس نے سجادہ نشین سے ان
تصدیق چاہی جن کو اس کے پیرو کار مانتے ہیں، سجادہ نشین نے اس بات کو بالکل سچ کہا اور بتایا کہ یہ روایتیں تواتر سے مجھے موصول ہو رہی ہیں اور
حالات مجھ تک پہنچ رہے ہیں، لہٰذا یہ باتیں شک و شبہ سے پاک و صاف ہیں، جہانگیر بہت متاثر ہوا۔ اُس نے آپ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور وہ دل
آپ کے فیضان و بزرگی کا قائل ہو چکا تھا۔ دوران فاتحہ جہانگیر بہت زیادہ رقت اور تاثر محسوس کر رہا تھا۔ آپ کا مزار احمد آباد میں آج بھی مرجع خاص

سرورِ کائنات کے خدّام

کچھ صحابہ کرام ایسے تھے، جن کو حضورؐ نے خاص خدمات سپرد کر رکھی تھیں۔ وہ خدّام یہ تھے:

۱۔ انسؓ بن مالک الخزرجی۔ آپؐ کے مشہور خادم ہیں۔ دس برس کی عمر سے حضورؐ کی خدمت میں ر

۲۔ عبداللہؓ بن مسعود۔ آپؐ کے نعلین اور مسواک کے محافظ تھے۔

۳۔ عقبہؓ بن عامر الجہنی۔ یہ سفر میں حضورؐ کا خچر ہانکا کرتے تھے، بعد میں مصر کے والی ہوئے۔

۴۔ اسلعؓ بن شریک۔ یہ آپؐ کا اونٹ ہانکتے تھے۔
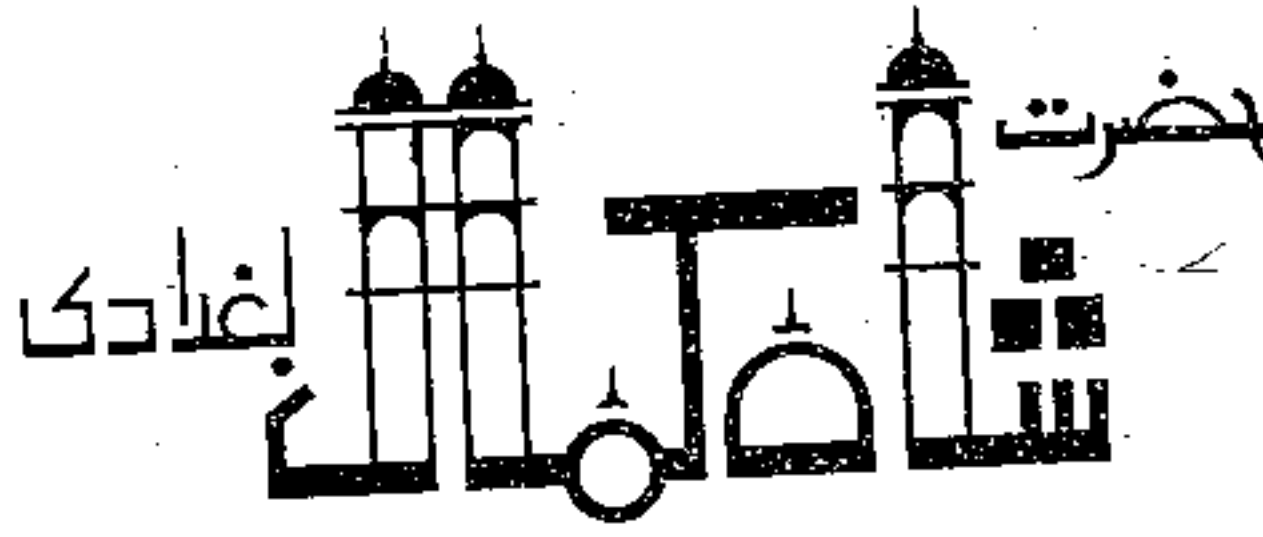
شرقی پنجاب کے ضلع کرنال کی ایک تحصیل کیتھل ہے جو دہلی سے ۱۲۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ سنسکرت میں کپس بندر کو اور تھل رہنے کی جگہ کو کہا جاتا
یتھل کا پرانا نام اسی وجہ سے کپس تھل تھا جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے کیتھل ہو گیا۔ یہ علاقہ ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ اس علاقے میں ہی تھانیسر جس کو عُرفِ عام
ہت کہا جاتا ہے، جہاں کئی فیصلہ کُن جنگیں ہوئیں۔ کیتھل میں سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ بھی مدفون ہے۔
ہندو لوگوں کا خیال ہے کہ کیتھل کو ہنومان نے آباد کیا تھا کیونکہ اس جگہ ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ استھان انجنی بھی یہیں پر واقع ہے۔ یہ ایک مندر ہے
ن کی ماں کے نام سے منسوب ہے۔

بل میں ایک تالاب کے کنارے ایک ہندو فقیر رہتا تھا جس کا نام باوا سیتل داس تھا۔ اس کا کام لوگوں کو عجیب و غریب شعبدے دکھانا تھا وہ اپنے
و اپنی انتڑیاں باہر نکال لیتا اور پھر اُن کو دوبارہ پیٹ میں ڈال دیتا۔ لوگوں میں یہ کرشمہ خوش فہمی اور خوش عقیدگی بن چکا تھا۔ لوگ دور دراز سے
ن کی زیارت اور درشن کو آتے اور عجیب و غریب تماشے دیکھتے۔ تماشا کوئی بھی ہو وہ لوگوں کی نظروں کا مرکز بن جاتا ہے اور پھر حیرت انگیز تماشے
ری لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ حضرت شاہ کمال کیتھل کے ویرانے سے گزر رہے تھے کہ آپ نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ آپ بھی متجسس ہو کر آگے
یتل داس کو اپنی انتڑیاں نکال کر صاف کرتے دیکھا۔ آپ نے اُس ہندو فقیر کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ ایسا کرنے سے تمہاری صفائیِ قلب تو ممکن نہیں اور
بی شہرت مطلوب ہے تو خیر اور بات ہے۔ یہ کہہ کر شاہ کمال آگے روانہ ہو گئے۔ مگر سیتل داس کی صورتِ حال عجیب ہو گئی۔ حسبِ معمول جب وہ اپنی
بارہ پیٹ میں رکھنے کی کوشش کرتا وہ واپس نہ جاتیں۔ اس نے متعدد بار یہ عمل دہرایا مگر بے سود۔ اچانک اس کا خیال شاہ کمال کے جملوں کیطرف
نے فوراً ہجوم سے مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ وہ شخص کون تھے جنھوں نے کلمات تنقید میری ریاضت سے متعلق کہے تھے۔ لوگوں نے کہا گرو بابا وہ مسلمانوں
رگ تھے۔

داس کی بات سے بہت لوگوں نے شاہ کمال کے متعلق سوچا اور اُن کی بزرگی دھیرے اور دھیمے انداز سے اُن کے دلوں میں اُتر گئی۔ بعض نے
سے سوال کیا کہ وہ بزرگ کیا تم سے زیادہ صاحبِ کرامت ہیں، ہندو فقیر نے کہا اُس شخص نے مجھے میرے معمول کے کام میں ناکام کر دیا۔ اُن کی نظر
میں بلا تامل اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُن جیسے ولیِ کامل سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے اُن تک پہنچاؤ ورنہ میرا زندہ رہنا محال ہو رہا ہے۔
ر شاہ کمال کی اقامت گاہ پر لایا گیا۔ اُس نے اپنی آنتوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور آہ و زاری کر رہا تھا۔ شاہ کمال نے جب دیکھا تو فرمایا

کرتماشا تو بہت دکھا لیتے ہو لیکن اپنا علاج نہیں کر سکتے۔ ایسا کہنا تھا کہ انتیں خود بخود پیٹ میں چلی گئیں۔ سیتل داس شاہ کمال کے قدموں میں گر پڑا اور
گڑگڑا کر درخواست کی کہ اب اس مریض کے مسیحا جناب ہی ہیں، آپ کے علاج سے ہی صحت یابی ممکن ہے۔ شاہ کمال نے اس کی چھاتی پر دستِ شفقت پھیرا گویا
اس کی دنیا ہی بدل گئی، وہ مسلمان ہو گیا، اور شب و روز آپ کی خدمت میں گزارنے لگا۔ اور روحانیت میں اتنی ترقی کر گیا کہ ایک روز شاہ کمال سے خرقہ
خلافت حاصل کیا۔ طب و حدیث، فقہ، اصول معقول و منقول میں

شاہ کمال نے ۸۹۵ ہجری بروز جمعۃ المبارک حاجی حافظ سید عمرؒ کے گھر مشرقی بغداد میں جنم لیا۔ سید عمرؒ
یکتائے روزگار تھے۔ آپ دقیق سے دقیق مسئلوں میں حل کر لیا کرتے تھے۔ سید عمرؒ کا سلسلۂ نسب سیدنا عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ شاہ فیضل قادری سید عمرؒ
بزرگ تھے۔ انھوں نے شاہ کمال کی پیدائش سے کافی مدت پہلے سید عمرؒ کو ایک نامی گرامی فرزند کی بشارت دی تھی جس کا ولایت میں اعلیٰ مقام ہوگا، جو حید
ہوگا۔ جب شاہ کمال کی ولادت ہو گئی، تو شاہ فیضل قادری تشریف لائے اور بچے کو گود میں لیا اور فرمایا کہ یہ بچہ حضرت قبلہ غوث اعظم کی اُس پیشین گوئی کی
اور جیتی جاگتی تصویر ہوگا جو سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے۔ انھوں نے سید عمرؒ کو شاہ کمال کی خصوصی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی ہدایت کی۔
روایت کے مطابق بچے کو مکتب و مسجد کے علم کی ابتدائی تعلیم دینی شروع کی، مگر بچہ قرآن مجید پڑھتے پڑھتے کھو جاتا، اور جب اُس نے اس ارشادِ باری
غور کیا کہ "زمین کی سیر کرو اور قدرتِ الٰہیہ کے نشان دیکھو" تو اُن کی دنیا ہی بدل گئی۔ انھوں نے گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا۔ شہر کے ساتھ مضافات میں صحرا
شروع کر دی۔ والدین بہت پریشان تھے تکرار کرتے وقت ان کی قوتِ گویائی سلب ہو جاتی۔
ایک مرتبہ شاہ کمال کئی روز سے گھر سے غائب ہو گئے۔ والدہ بہت پریشان ہوئیں، کئی دن انتظار کیا لیکن جب اضطراب ناقابلِ برداشت ہو
خاوند سے گزارش کی کہ شاہ کمال کو کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لایا جائے۔ سید عمرؒ اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے، نہ اندازہ تھا کہ شاہ کمال کہاں اور کہ
سون گے۔ ایک عزم کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر ایک طرف کو چل پڑے، کچھ سفر طے کیا ہوگا کہ ایک جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چلتے چلتے ویرانوں میں
کئی بار خیال آیا کہ بے نیلِ مرام واپس چلا جاؤں۔ مگر شفقتِ پدری راہ میں رکاوٹ بن جاتی، کبھی جل بھری دو آنکھیں سامنے آ جاتیں جو بیٹے کے غم اور جدائی
کئی روز سے جاگ رہی تھیں، انہی خیالوں میں غلطاں کوئی غیر مرئی قوت اُن کو آگے لے جا رہی تھی، ایک جگہ پہنچ کر سید عمرؒ کے قدم خود بخود رک گئے۔ ایک
بڑے درخت کے وسیع تنے سے ٹیک لگائے شاہ کمال استراحت فرما رہے تھے، بیٹے کو دیکھ کر سید عمرؒ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی، دل کی دھڑ
ہونے لگیں، وہ لپکے اور بیٹے کو سینے سے لگانے کے لئے آگے بڑھے، یکایک ایک دیو ہیکل چیتے جیسا جانور سامنے آ گیا، جس کی نظریں شعلہ آگیں تھیں
سید عمرؒ پر گڑی ہوئی تھیں، سید عمرؒ کے قدم رک گئے۔ اور وہ جانور کے خوف سے پیچھے بھاگنے لگے، پھر خیال آیا مبادا یہ درندہ شاہ کمال کو کوئی نقصان نہ پہنچا
خیال سے دوبارہ آگے بڑھے مگر درندہ دوبارہ مزاحم ہوا اور اپنے سر کو شاہ کمال کے پاؤں میں رکھ کر لیٹ گیا۔ اس عقیدت مندی کو دیکھ کر سید عمرؒ واپس
دل مسرور ہو گیا اُن کو شاہ فیضل قادری کی بات یاد آ گئی کہ شاہ کمال ولایت کے چرخ ہفت میں پرواز کرے گا، وہ واپس لوٹے، بیوی کو سارا قصہ سنایا، وہ
لیکن دل میں طمانیت پیدا ہو گئی کہ اُن کا فرزند دل بند مشائخ کبار میں شامل ہو گیا، آنکھوں میں آنسو رواں تھے، مفارقت کا صدمہ اور بلند مرتبے کی خوشی
میں سما گئے تھے، کئی روز گزر گئے، ایک روز اچانک شاہ کمال گھر واپس آ گئے۔ ادھر شاہ کمال نے گھر میں قدم رکھا ادھر حضرت شاہ فیضل بخاری کی تشریف
سید عمرؒ نے شاہ فیضل بخاری سے گزارش کی کہ حضرت شاہ کمال کی تربیت آپ ہی فرمائیے یہ کام ہم جیسے ناقصوں کے بس سے باہر ہے۔ آپ ان
اور مریدی میں قبول فرمائیے۔
شاہ صاحب گویا اسی انتظار میں تھے، اس طرح شاہ کمال کو سلوک و تصوف کے مدرسہ میں داخل کیا گیا، اور یوں حضرت غوث اعظم سے براہِ
کر کے شاہ کمال نے درجۂ کمال پایا۔ حضرت غوث اعظمؒ کا خرقۂ خلافت اُن کے صاحبزادے عبدالرزاق کی وساطت سے مختلف سلسلے سے ہوتا ہوا
یہاں پہنچا اور پھر بعد میں یہی خرقۂ خلافت امام ربانی مجدد الف ثانی کو عطا ہوا۔
شاہ کمال حضرت شاہ فیضل بخاری کے ہمراہ طویل سیاحت پر روانہ ہو گئے، سلوک و معرفت کی جملہ منازل طے کرتے ہوئے کئی مرتبہ اکٹھے
کمال سے اکثر و بیشتر عجیب عجیب کرامات سرزد ہونے لگیں ـــــ شاہ فیضل بخاری سمجھ گئے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کے لئے خدا نے شاہ
اور شاہ فیضل کی تربیت عطا ہوئی تھی، چنانچہ اتوار کے دن ۹۲۰ ہجری کو شاہ فیضل بخاری نے آپ کو مسندِ خلافت سے سرفراز فرما کر ہندوستان

آپ مشہد، نجف اشرف، تبریز، اصفہان سے ہوکر برصغیر میں داخل ہوئے۔

ہندو جس قدر شاہ کمال کی شخصیت سے مسحور اور متاثر ہوتے تھے، مسلمان انھیں اتنا ہی کم خاطر میں لاتے۔ کیتھل کے علاقے کے مُفتیوں کا تو آپ سے
واسطے کا بیر تھا، یہ لوگ اپنے کو عالم اور علوم دینی کا منتہیٰ خیال کرتے تھے۔ آپ کو دیوانہ اور مخبوط الحواس شخص سمجھتے تھے۔ شاہ کمال نے اُن مفتیوں کے بہت سے
آزار برداشت کئے۔ علاء الدین صابر کلیری جیسا جلال رکھتے ہوتے بھی آپ اب تک خاموش تھے۔ مفتیوں کو یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ جو لوگ دن رات اُن
کے اِردگرد چکر لگاتے تھے وہ شاہ کمال کے ارادت مند بن گئے تھے۔ اب مفتیوں نے مختلف گروہوں کو شاہ کمال کے پیچھے لگا دیا۔ وہ لوگ شاہ کمال کو بہت
ستاتے۔ آپ اذیتیں اور سختیاں خندہ لبی سے برداشت کرتے رہے۔ ایک روز فجر کی نماز ادا کرنے آپ مسجد میں تشریف لے گئے۔ وضو کے دوران ایک مفتی نے
آپ کے وضو پر تنقید کی، آپ نے دوبارہ وضو کیا۔ مگر تنقید جاری رہی، متعدد بار وضو اور تنقید ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اب شاہ کمال جلال میں آگئے۔ اعتراض مسح سر
پر ہوتا تھا۔ آپ نے جلال میں آکر اپنے بالوں سے پکڑ کر اپنا سر تن سے جُدا کر دیا اور فرمایا کہ اب تو مسح میں کوئی کمی نہیں رہ گئی۔ آپ نے اپنے سر کو تالاب میں پھینک
دیا۔ آپ کا سر گرتے ہی اُس مفتی کا بھی سر علیحدہ ہو کر تالاب میں گر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کا سر واپس دھڑ پر لگ گیا مگر مفتی وفات پا گیا تھا۔ دیگر مفتیان نے اس
کو بھی شعبدہ بازی کہا۔ اب مفتیانِ شہر پر خدائی عذاب نازل ہونا شروع ہوگیا۔ ایک ایک کرکے افرادِ خاندان وفات پاگئے۔ بچے، بڑے اور املاک تباہ ہوکر رہ گئیں حتیٰ کہ
ان کے گھروں کی طرف سے گزرتے ہوئے بھی اہلِ شہر گھبراتے تھے۔ اب دوسرے علاقوں کے مفتیوں نے شاہ کمال کی خدمت میں حاضری دے کر دریافت
کیا کہ یہ بددُعا صرف کیتھل کے مفتیوں کے لئے ہے یا کہ سارے عالم کے مفتیوں کے لئے تھی، آپ نے فرمایا صرف کیتھل کے مفتیوں کے لئے تھی، یہ سُن کر مفتیوں
کی جان میں جان آئی، ورنہ عالمِ اسلام سے مفتیان کا نام و نشان بھی عنقا ہو جاتا۔ اُس کے بعد کسی مسلم غیر مسلم نے شاہ کمال سے گستاخی کی ہمت نہیں کی۔

برصغیر میں فقہا اور محدثین شریعت کے پابند لوگ زیادہ تر ٹھٹھہ میں آباد تھے۔ سید محمدؒ احکام شریعت میں بہت سخت گیر مشہور تھے۔ بڑے بڑے امراء و رؤساء
ان کا درس سُننے مدرسے آیا کرتے تھے۔ شاہ کمال پر اُن دنوں مکمل طور سلوک جذب کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ مجذوب لوگ عموماً دنیاداری کے طور طریقوں سے بے نیاز
رہتے ہیں ستر پوشی بھی اُن کے ہاں مفقود ہوتی ہے۔ شاہ محمد مدرس اِن کو اپنے درس میں اس طرح نیم برہنہ حالت میں دیکھ کر چراغ پا ہوتے اور سرزنش کی لیکن
شاہ کمال نے اس بات کو ماتھے کی شکن نہ بنایا۔ اکثر اوقات شاہ کمال سید محمد سے دینی علوم پر مباحثہ و مناظرہ کرتے تھے۔ کئی کئی روز غیر حاضر بھی رہتے تھے۔ آپ کی
غیر حاضری میں سید محمدؒ پر ندامت کا دورہ پڑتا وہ اپنی علمیت کے اعتبار سے شاہ کمال کو کم تر خیال کرتے تھے اور کسی کم تر سے بحث و تکرار کرنا فضول سمجھتے تھے اسی خیال
کے پیشِ نظر سید محمدؒ نے سوچا کہ میں صاحبِ شریعت ہونے کے ساتھ صاحبِ اختیار بھی ہوں، اس دیوانے کو جس کو لباس کی قید منظور نہیں آبادی سے باہر نکال دینا
چاہئے۔ اس طرح شرعی فریضہ بھی ادا ہو جائے گا اور اُس کی بے تکی باتوں سے بھی خلاصی ہوگی۔ کافی دنوں کے بعد شاہ کمال تشریف لائے۔ درس سُنا اُن کی ستر
پوشی اُن کی توں تھی۔ شاہ محمد اپنے ارادے اور فیصلے کا ذکر اپنے شاگردوں سے بھی کر چکے تھے۔ بلکہ اُن کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جب شاہ کمال آئیں مجھے میرے ارادے کے
بارے میں یاد دہانی کروادی جائے۔ چنانچہ شاگردوں نے شاہ کمال کو دیکھ کر اپنے استادِ محترم کو یاد دلایا۔ مگر سید محمدؒ پر شاہ کمال کا وہ رعب طاری تھا کہ وہ اُن کے سامنے آنکھ بھی نہ اُٹھا
سکے۔ یہ بات شاہ محمدؒ کو پریشان کر رہی تھی ان کی بزدلی واضح ہوگئی تھی۔ آپ شرمسار ہوکر گھر تشریف لے گئے۔ اپنی بہن جو ایک بلند پایہ ولیہ تھیں اُسے اپنی فکرمندی
کا ذکر کیا۔ بہن نے سکوت کرنے کے بعد شاہ محمد سے کہا کہ میں کئی روز سے رسول مقبولؐ کو خواب میں دیکھ رہی ہوں وہ مجھے حکم دیتے ہیں کہ اس لباس آزاد فقیر کی بیعت کرلو۔
پھر کہا کہ جب میں نے عرض کی کہ حضورؐ میرا بھائی عالم ہے اور وہ اس فقیر کو نیم برہنگی کی وجہ سے شہر سے نکالنے کے درپے ہے وہ مجھے کیونکر اُس کی بیعت کرنے دے گا اس
پر آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے بھائی کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ شاہ کمال کی نظر کا فیض حاصل کرنے عارفِ ربانی بن جائے۔ خواب سُن کر سید محمدؒ کی رہی سہی ہمت بھی
جاتی رہی۔ حضورؐ کا حکم ٹالنا یا جھٹلانا کسی کو اتنی ہمت کہاں پھر شاہ محمد جیسے عاشقِ رسول تو حضورؐ کے احکام کے مطابق ہی زندگی گزار رہے تھے۔
سید محمدؒ کی رات کی نیند دن کا سکون غرضیکہ کھانا پینا تمام ہوکر رہ گیا۔ شریعت کی رُو سے نیم برہنہ شخص کو آبادی میں رہنے کی اجازت دینا شریعت سے رُوگردانی تھی
اور حضورؐ کے حکم سے سرتابی دنیا و آخرت کی بربادی مول لینے والی بات تھی۔ اسی کشمکش میں اُن کو خواب میں رسالت مآبؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپؐ نے
فرمایا تم تمہارے علم کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے علم میں جو قیل و قال بتایا ہے اُس کی بابت اس مجذوب سے ہدایت پاؤ۔ تمہیں علمِ شریعت اسی مجذوب
نے سکھایا ہے۔ سید محمدؒ خواب سے بیدار ہوئے۔ شاہ کمال کی کٹیا کی طرف بھاگے مگر وہ سارے شہر میں کہیں موجود نہ تھے۔ شاہ محمدؒ نے بے چین ہوکر اپنا خواب

اپنے شاگردوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور دیگر عالموں کو سنایا سب باجماعت شاہ کمال کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ویرانے میں شاہ کمال کو مشغول عبادت پایا
سب دست بستہ عرض گزار ہوتے کہ باکمال ہم آپ کو پہچاننے سے قاصر رہے ہیں ہماری تقصیر معاف کردو۔ ہمیں اپنی بیعت سے مشرف فرمائیں، سید محمد کی گڑگڑاہٹ
تو دیدنی اور شنیدنی تھی، شاہ کمال نے سید محمد کے چہرے پر نگاہیں اس طرح مرکوز کیں کہ نظر کیمیا کام کر گئی۔ سید محمد کا سینہ گداز ہوگیا، علم کی چوب خشک، جذب وکیف
سے تر ہوگئی، وہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ جذب وکیف بھی ہوگئے۔ اس کے بعد ٹھٹھہ میں جو مقام ومرتبہ سید محمد کو حاصل ہوا وہ نصیب والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے
شاہ کمال زیادہ عرصہ ٹھٹھہ میں نہ ٹھہرے اور امرالی سے ملتان کی طرف رُخ کیا یہ شیر شاہ سوری کی حکومت کے ایام تھے، ملتان میں آپ کی بہت پذیرائی کی گئی یہاں پر
مختصر قیام کے بعد آپ لدھیانہ چلے گئے۔ اور یہاں سے پایل (سرہند) تشریف لے آتے، آپ کا زیادہ تر قیام ویرانوں میں آبادی سے دور رہتا لیکن ویرانوں میں بھی
جہاں آبِ حیات کے چشمۂ صافی ہوں وہاں پیاسے اور زندگی کے متلاشی خود بخود پہنچ جایا کرتے ہیں۔

حضرت شاہ کمال عموماً سرخ لباس میں ملبوس ہوا کرتے تھے، بسا اوقات فوجی وردی بھی پہن لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے تیسرا رنگ نہ استعمال کیا تھا
آپ کے سرخ لباس پر بعض اوقات معترضین انگشت نمائی کرنے کی کوشش کرتے لیکن منہ پر گویائی کی قوت سلب ہو جاتی، ایک دفعہ آپ کو سفید لباس پیش کیا گیا
آپ اس کوشش کا مطلب سمجھ گئے مگر سکوت فرمایا اور لباس پہن لیا، اب لوگوں کو تشفی ہوئی کہ حضرت نے لباس میں تبدیلی منظور کرلی ہے، چنانچہ وہ خوش ہوگئے مگر
کچھ دیر بعد ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سفید لباس ازخود سرخ رنگ میں تبدیل ہونا شروع ہوگیا اور تھوڑی ہی دیر میں مکمل سرخ ہوگیا۔ اب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ا
سرخ لباس میں شاہ کمال کی مرضی نہیں شامل بلکہ یہ مشیت ایزدی ہے۔ اس کے بعد آپ کا نام ہی لال ریال پڑ گیا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں اپنے معاملات پر کوئی
اختیار نہیں۔

ایک دن آپ فوجی وردی پہن کر گھوڑے پر سوار تھانیسر کے مشہور بزرگ جو ایک سرائے میں مقیم تھے اُن کی ملاقات کو گئے، بزرگ شیخ جلال الدین کے نام
مشہور تھے، سرائے کے دروازے پر آپ گھوڑے سے اترے اور سرائے کی مالکہ سے کہا کہ ہمارے آنے تک ہمارے گھوڑے کی نگرانی کرو، وہ بڑی سخت گیر خاتون تھی
نہایت تند خوئی سے بولی کہ شیخ جلال الدین کی ملاقات کو دن میں بیسیوں لوگ آتے ہیں اب میں کس کس کی چوکیداری کروں، اس پر شاہ کمال کو جلال آگیا آپ نے
کوڑا اس کو رسید کیا، اور گھوڑے کو چھوڑ کر شیخ جلال الدین کے پاس پہنچ گئے۔ شیخ نے آپ کو ایک فوجی سمجھا اور بادشاہ کا ایلچی خیال کرکے آپ کو اُٹھ کر سلام کیا اور بادش
خیریت دریافت کی، آپ نے فرمایا درویشوں کو شہنشاہوں سے کیا واسطہ آپ بادشاہ سے بہت مرعوب نظر آتے ہیں، شیخ جلال الدین مروت مہمانی سے خاموش
شاہ کمال نے اُن سے کہا کہ میں ایک دقیق مسئلہ تصوف لایا ہوں اس کا حل مجھے درکار ہے۔ مسئلہ سن کر شیخ جلال سکتے میں آگئے اور کہنے لگے آپ مج
آپ تصوف کی پیچ دار باتوں سے دُور ہی رہیں تو بہتر ہے، شاہ کمال نے فرمایا کہ کیا تصوف کے دروازے فوجیوں پر بند ہوتے ہیں؟ شیخ جلال الدین لاجواب ہو
آپ کا مسئلہ دقیق اور تادیر بیان کیے جانے کا متقاضی ہے، لہٰذا آپ پھر کسی وقت تشریف لائیں جب یہاں کوئی اور نہ ہو، شاہ کمال نے پھر کہا کہ اگر اس مسئلہ کو
سامنے ہی حل کر دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ شیخ جلال الدین نے قدرے تحمل سے فرمایا یہ مسئلہ اس قسم کا ہے کہ مجلس میں موجود افراد کی سمجھ سے بالاتر ہے لہٰ
خلوت میں تشریف لاویں، آپ نے پھر فرمایا کہ اگر مسئلہ مجلس میں حاضرین کی فہم سے بالا ہے تو آپ اس محفل کو خلوت ہی سمجھیں، اب شیخ جلال الدین لاجواب
خاموشی اختیار کیے رکھی، شاہ کمال سمجھ گئے کہ شیخ کے پاس یا کوئی جواب نہیں یا بُخل سے کام لے رہے ہیں، آپ ناراض ہوکر واپس لوٹے، سرائے کے
مالکہ خاتون کو گھوڑے کی نگرانی کرتے ہوئے پایا، آپ کو دیکھتے ہی وہ آپ کی قدم بوسی کرنے لگی، لوگوں نے عورت سے کہا اس شخص نے تمہیں کوڑا مارا ہے
کوئی جوابی کارروائی کرنے کے اُلٹا اس کی قدم بوسی کر رہی ہو، اُس خاتون نے جواب دیا کہ کوڑے کی ایک ضرب نے مجھے اسرار ورموز کی پہچان کرا دی، میر
چکی ہے یوں لگتا ہے مجھ پر انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ آپ نے اپنا گھوڑا لیا اور اس خاتون کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے، رستے میں آپ نے جلال
پیچھے آتے ہوتے پایا، اُن کے ساتھ مشہور بزرگ شیخ عبدالاحد بھی تھے دونوں نے آپ سے بہت معذرت کی اور عرض کی حضرت ہم آپ سے ناواقف
کے مرتکب ٹھہرے، آپ نے ان کو معاف کر دیا، وہ واپس چلے گئے مگر شیخ عبدالاحد نے آپ کا دامن نہ چھوڑا، انہی دنوں شیخ عبدالاحد نے عالم خواب
ایک نورانی شکل کے بزرگ کفار وظالم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں، اور حق کی آمد کی صدا بلند کر رہے ہیں، آپ نے یہ خواب حضرت شاہ کمال کو بیان کیا
عبدالاحد تمہارے یہاں ایک فرزند پیدا ہوگا جو مرتبے میں اولیاء کرام کا ہم پلہ ہوگا، اس کے ذریعے شرک وبدعت کی تاریکی ختم ہوگی اور اسلام کو تابانی ا
ی، لہٰذا بچے کی ولادت کے بعد سب سے پہلے اس کو ہمارے پاس لانا، کچھ ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ شیخ عبدالاحد کے گھر بچہ پیدا ہوا، آپ بحکم مرشد اس کو

باسمِ ربّ الکعبہ

نوٹس داخلہ

ہم پیش رو ہیں جانب منزل رواں دواں

نواز شریف گرلز ہائی سکول کی عمارت میں

۱۱ تا ۴ بجے | ایف اے | بی اے | اور کمپیوٹر کلاسز کا اجراء

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ماڈل کالج

عصر حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق اسلامی نظام تعلیم کی انقلابی درس گاہ

بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم ◉ لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

خصوصیات

- تعلیمی دنیا میں نئے انقلاب کا علمبردار
- کوالیفائیڈ اور تجربہ کار سٹاف
- گائیڈنس اور کونسلنگ کا جدید معیاری نظام
- سمعی و بصری معاونات سے آراستہ
- حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے خوابوں کی حسین تعبیر
- دینی و سائنسی علوم کی یکجا و یکجان تعلیم و تربیت کا حسین و جمیل گہوارہ
- لائبریری اور لیبارٹریز کی بہترین سہولیات سے مزین
- اسلامی ماحول اور دینی نظام تربیت
- ان ڈور گیمز بالخصوص مارشل آرٹس کی تربیت کا اہتمام
- طالبات کے لیے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت

سال اوّل اور کمپیوٹر کلاسز میں داخلہ یکم اگست سے شروع

الداعی ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ سیکرٹری پاکستان ماڈل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز فاؤنڈیشن
۱- نکلسن روڈ - لاہور فون : ۶۳۶۵۵۲۸
رابطہ ۸ تا ۲ بجے دن

کی خدمت میں لے کر حاضر ہوگئے۔ شاہ کمال نے کیمیائی نظریں نومولود پر مرکوز کر دیں اور انگشتِ شہادت بچے کے منہ میں دے دی، اور فرمایا یہ بچہ تجدید دین اور روحانی فیض خلقِ خدا کو پہنچانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ نومولود کافی دیر تک شاہ کمال کی انگلی چوستا رہا حتیٰ کہ شاہ کمال بولے بس کر بیٹا کچھ ہماری نسل کے لئے بھی رہنے دے تو نے تو ہماری نسبت لے لی ہے۔ یہی وہ بچہ تھا جو بعد میں مجدد الف ثانی کہلائے اور جنہوں نے عہد ساز اور جلیل القدر بادشاہ کو اپنے آگے سرنگوں کر لیا۔

ایک مرتبہ شاہ کمال کسی صحرا سے گزر رہے تھے کہ آپ نے ایک چرواہے کو دیکھا جو درختوں کے پتے اپنی بکریوں کو کھلا رہا تھا۔ اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی ایک پوٹلی میں دو روٹیاں تھیں، آپ نے اُس کو مخاطب کیا اور کہا کہ تمہارے پاس دو روٹیاں ہیں جن میں سے ایک مجھے دے دو، اُس نے انکار کر دیا، آپ آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چرواہا بھاگتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا معافی مانگی اور روٹی پیش کر دی، آپ نے اُس کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ روحانیت سے مالا مال کر دیا۔

شاہ کمال کے جلال ان کے افرادِ خانہ پر بھی اثر انداز ہوتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے چھوٹے صاحبزادے نورالدین دیوار پر گھڑ سواری کے انداز میں فروکش تھے، اور دیوار کو حکم دینے لگے کہ چل پڑو دیوار متحرک ہوگئی۔ شاہ کمال سارے معاملہ کو دیکھ رہے تھے، آپ کو بہت غصہ آیا بچے کو پاس بلایا اور سینے پر ہاتھ پھیر کر اُس کی روحانیت سلب کر لی، اسی طرح ایک دفعہ آپ کا نام یعنی شاہ کمال شاہ کمال کہہ کر کوئی شخص پکار رہا تھا، آپ کے بڑے بیٹے شاہ عمادالدین نے یہ صدائیں تو ہمہ تن توجہ میں زور لگانے لگے، شاہ کمال نے دیکھا تو بیٹے سے فرمانے لگے یہ کیا کر رہے ہو، انہوں نے عرض کی کہ محترم پدر گاہی ہزاروں میل دور سمندر میں آپ کا ایک مرید کسی مشکل میں گرفتار ہے اور آپ کی امداد کا طلب گار ہے چنانچہ میں نے اُس کی مدد کی اور اُس کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، آپ کو بہت غصہ آیا آپ نے فرمایا کیا تمہیں لوحِ مبارک پر لکھا ہوا فیصلہ معلوم ہے جو تم اپنی کرامت دکھانے میں مصروف ہو۔ آپ نے شاہ عمادالدین کے بھی سینہ پر ہاتھ پھیر کر اُن کی روحانیت سلب کر لی، آپ کی جلالیت سے گھبرا کر آپ کے تیسرے فرزند شاہ موسیٰ نے آپ سے دور ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور رات کی تاریکی میں میلوں سفر کرتے مگر صبح ہوتے ہی اپنے آپ کو والد کی خانقاہ کے باہر دیکھتے ہفتے گزر گئے وہ کہیں بھی نہ جا سکے، اور آخر کار والد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی کیفیت بیان کی، بعد میں موسیٰ کو ہی خرقہ خلافت ملا اور آپ کو کوٹ قبولہ ضلع ساہیوال میں خلقِ خدا کی رشد و ہدایت کے لئے روانہ کیا گیا۔

آپ کا ایک مرید تجلیِ الٰہیہ کا بہت شوقین تھا مگر سالہا سال کی کوششوں کے باوجود شوقِ دیدار سے محروم رہا آخر کار حضرت نجم الکبریٰ کی خدمت میں جانے کا ارادہ کیا۔ ہوا، کیونکہ اُن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ جدھر نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے اس کی دنیا ہی بدل جایا کرتی تھی، مرید اپنے پروگرام کو آخری شکل دے رہا تھا کہ آپ نے اُس کو طلب کر کے پوچھا کہ کیا تو نجم الکبریٰ کے ذریعے تجلیِ الٰہیہ کا متمنی ہے، اُس نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور سوچنے لگا اب شاید حضرت مہربان ہو کر دیدارِ الٰہی سے سرفراز فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اے مرید میری طرف دیکھ، مرید نگاہوں کی تاب نہ لا سکا غش کھا کر گرا اور پھر واصل حق ہو گیا، لوگوں نے حیرانگی سے پوچھا کہ یہ کیا ہو گیا، آپ نے فرمایا وہ تجلیِ الٰہیہ کا متمنی تھا مگر تاب نہ لا سکا اور راہی عدم ہو گیا ہے۔

آپ کا وصال بھی عجیب انداز میں ہوا، آپ کئی روز سے اپنے حجرے میں بند تھے، ۲۹ جمادی الآخر ۹۸۱ھ کو آپ کے صاحبزادے شیخ عمادالدین آپ کی خبر گیری کے لئے آپ کے حجرے میں گئے، آپ کو بے سدھ پایا، ہلایا جلایا اور جب تصدیق کر لی کہ آپ پردہ کر گئے ہیں تب لوگوں کو اطلاع دی، مگر جب غسال غسل دلانے لگا تو آپ نے اچانک آنکھیں کھولیں اور غسال ڈر کے مارے بھاگنے لگا تھا، آپ نے فرمایا کیا وجہ ہے کیوں دامن چھڑا کر بھاگ رہے ہو، اُس نے عرض کی حضرت آپ کی اطلاع تو شہر بھر میں ہو چکی ہے، آپ نے فرمایا اچھا اور کروٹ لے کر ابدی نیند سو گئے، آپ کے مزار پر ہر وقت رحمتِ باراں رہتی ہے، چار سو پھلدار درخت اور پھول دار پودے لگے ہوتے ہیں، عجیب سماں الدرُوح پرور ماحول ہر آنے جانے والوں کو محظوظ کرتا ہے، خاص کر موسم بہار کی رونقیں آپ کے مزار کو پھولوں سے چھپا دیتی ہیں، آپ خودی کے معلم اور سرخیل عاشقاں تھے، آپ کے علوم و اسرار کے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اسیر و تابع ہیں اور رہتے ہیں۔

یہ حالاتِ زندگی اللہ کی ایک برگزیدہ ہستی شیخ عبدالمالک پانی پتی کے ہیں جن کی سوانح عمری ایک عشق کی رُوداد ہے۔ وہ عشق جس کے بارے میں علاّمہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ع عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب

وہ دُنیائے تصوّف کے ایک ایسے صوفی تھے جنہوں نے اس فانی دُنیا کی پُر ہجوم رونقوں میں بھی تنہائی اختیار کیے رکھی۔ سب سے الگ، سب سے جُدا۔ شیخ ابن عربی بھی تھے اور متبع اور شارح بھی۔ کسی حال میں بھی وجد و حال، گریہ وزاری اور جوش سے خالی رہتے تھے۔ توحید پرستی کے بہت بڑے عالم تھے۔ حتیٰ کہ وقتِ آخر بھی آیا تو زبان پر کلمۂ توحید کا وِرد تھا۔

آنکھ کھولی تو سَر پہ بزرگوں کا سایۂ عاطفت نہ پایا۔ نفسا نفسی کا عالم دیکھا جہاں انسان بظاہر ایک دوسرے کے ہمدرد و غمگسار تھے، آنکھوں میں حیا اور رشتوں کا پاس رکھتے تھے مگر جہاں وقت آن پڑا یہ ہمدرد انسان خونی بھیڑیوں کی طرح چیڑنے پھاڑنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ مصائب اور وقت کی گردش میں آیا ہوا انسان اُن کی خودغرضی اور لالچ کی بھینٹ چڑھنے سے بچ پاتا۔ حقہ بجرے پینے میں تاک بیٹھنے والے اُس سے اپنا پُورا پُورا حصّہ وصول کرتے ہیں۔

عبدالمالک نے جب نفسا نفسی اور خودغرضی کی اس فانی دُنیا میں آنکھ کھولی اور سنِ بلوغت کو پہنچے تو سب کچھ جان گئے۔ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انھیں جو کچھ بھی کرنا ہے خود ہی کرنا ہے مستقبل کا ہر فیصلہ، بُرے بھلے کی تمیز اور انسان کو زمانے کی سرد و گرم ہواؤں سے رُوشناس کرانے میں علم کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے جب آپ یہ حقیقت جان گئے تو علم کے حصول کی جستجو میں سرگرداں ہوئے۔ پانی پت جائے پیدائش تھی۔ بڑے بڑے علماء اور اساتذہ درس و تدریس کا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ آپنے جن کا بھی شہرہ سُنا اُن کے پاس حاضری دی۔ علم کی خواہش بیان کی اور انھوں نے بھی آپ کی حصولِ علم کی خواہش کو حتی المقدور پُورا کرنے کی کوشش کی مگر آپ مطمئن نہ ہو پائے۔ انہی دنوں پانی پت میں شیخ مودود کا بڑا شہرہ ہوا۔ توحید پرست، علم کیمیا میں طاق، تنہائی پسند تھے۔ عبادتِ الٰہی ہی مقصدِ حیات تھا۔ عبدالمالک نے اُن میں کشش محسوس کی۔ اُن کی ذات کو منزلِ مقصود سمجھا تو اُن کی صحبت میں جا بیٹھے۔ شیخ نے جب اس ننھے بچے کو دیکھا تو اُس کی پیشانی پہ چمکتا اقبال مندی کا نور سب کچھ عیاں کر گیا۔ محبت سے پاس بُلا کر پُوچھا: "مجھ سے پڑھو گے؟"

عقیدت و احترام سے جواب ملا "کیوں نہیں۔ آیا ہی اسی لیے ہوں۔"

شیخ نے پُوچھا: "مَیں تو علم و رندِ مشربی کے باوجود تنہا ہوں۔ ایک آگ میں جل رہا ہوں۔ کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ اس میں جل سکو؟"

سنجیدگی و متانت سے جواب ملا: "حضرت! مَیں تو شاگردی اختیار کرنے آیا ہوں جو کچھ عطا کریں گے پُوری دیانت داری اور مستقل مزاجی سے حاصل کروں گا اور خود کو اس کا اہل ثابت کروں گا۔"

بچپن رخصت ہوا تو نوجوانی نے ہاتھ تھاما اور اس وقت تک عبدالمالک بہت کچھ حاصل کر چکے تھے۔ یہیں انھوں نے مشہور صوفی محی الدین ابن عربی کا نام سنا اور ان کے حالات اور اقوال سے آگاہی حاصل کی۔ تاریخ تصوف کی اس عجیب و غریب شخصیت نے عبدالمالک کو بھی بے حد متاثر کیا، یہ اثر زندگی بھر قائم رہا۔

شیخ مودود نے انھیں فارغ کیا تو یہ ہدایت کی کہ اب کسی ایسے مرشد کو تلاش کرو جو تمھارے ذوق اور مزاج کو نکھار سکے۔ عبدالمالک کے تیز ذہن نے اپنے استاد کی بات کا اصل مفہوم پا لیا تھا اور اب انھیں ایک ایسے مرشد کی تلاش تھی جو اپنی سوچ و فکر اور جذبے میں ابن عربی کے مشابہ ہو۔ ایسا شخص پانی پت میں تو نہیں مل سکتا تھا۔ دہلی البتہ نوادرات سے پُر تھا اور یہاں دنیا بھر کے منتخب لوگ رہتے تھے۔ عبدالمالک نے پانی پت کو چھوڑ دیا اور دہلی چلے گئے۔

یہ اپنے پیر کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں تھے۔ لوگوں سے صاحب کمال مرشدوں کے پتے پوچھتے اور جب ان سے ملتے تو مایوس ہو کر آگے بڑھ جاتے۔ اسی تگ و دو.... اور جستجو میں یہ ایک جگہ بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے کہ انھوں نے ایک شخص کو کچھ پڑھنے میں مشغول دیکھا۔ یہ سوچنا تو بھول گئے، پوچھا: "بھائی! یہ تم کیا پڑھ رہے ہو؟"

ان صاحب نے جواب دیا: "اپنے پیر مرشد کا خط پڑھ رہا ہوں۔"

عبدالمالک نے پوچھا: "تمھارے پیر مرشد کون ہیں؟"

جواب ملا: "شیخ محمد حسن۔" پھر سوال کیا: "لیکن یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

انھوں نے جواب دیا: "اس لیے کہ میں خود کسی پیر کی تلاش میں ہوں۔ میں نے سوچا شاید اس طرح میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔"

اس شخص نے اس نوجوان کو بڑی توجہ سے دیکھا اور کہا: "اگر یہ بات ہے تو تم میرے پیر کی بابت مجھ سے سوالات کرو۔ میں تمھارے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دوں گا۔"

عبدالمالک نے عرض کیا: "جناب والا! میں آپ کے پیر کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا بلکہ آپ خود ان کے بارے میں بتانا چاہیں بتا دیں۔"

اس شخص نے بتانا شروع کیا: "ہمارے پیر مرشد شیخ محمد حسن مشہور صوفی شیخ حسن طاہر کے صاحبزادے ہیں، جو جونپور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی طرف سے سلسلۂ چشتیہ سے منسلک رہے لیکن انھیں سلسلۂ قادریہ سے خاص تعلق رہا۔ مدینہ منورہ چلے گئے۔ حرم مدینہ میں رہ کر سالوں رسولِ مقبول کے مزارِ اقدس کی مجاوری کی پھر یمن چلے گئے اور وہاں کے قادری مسلک مشائخ کے مرید ہو گئے۔ پھر وہاں سے بیعت کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اسی دوران ایک دوسرے مشہورِ زمانہ صوفی حاجی شیخ عبدالوہاب سے بیعت ہو گئے۔ جب دوسری بار مدینہ منورہ پہنچے تو وہ انھیں بھی واپس اپنے ساتھ برصغیر لے آئے۔"

عبدالمالک یہ سب بہت توجہ سے سن رہے تھے۔ جب وہ شخص خاموش ہو گیا تو انھوں نے اس کے دونوں کاندھے پکڑ کر انھیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں بتاؤ، اور بتاؤ۔ تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

اس شخص نے جواب دیا: "جناب والا! پیر مرشد اپنے خطوط کے ذریعے بھی تعلیم و تربیت فرماتے ہیں۔ میں ان کے چند خطوط کی غرض سے دیتا ہوں۔ انھیں پڑھو اور میرے پیر کے مرتبہ و مقام کا اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔ زبانی کیا عرض کروں۔"

اس شخص نے چند خط عبدالمالک کے سامنے رکھ دیے، یہ انھیں پڑھنے لگے۔

ایک خط میں لکھا تھا:

"جان لے کہ ایک ایسا عالم بھی ہے جس کو حواس کے سوا کوئی اور چیز معلوم نہیں کر سکتی اور ایک وہ عالم بھی ہے جس کو عقل کے سوا کوئی اور چیز نہیں پہچان سکتی۔ ان کے علاوہ ایک ایسا عالم بھی ہے جس کا ادراک علم کے سوا ممکن نہیں ہے۔ ان عالموں کے علاوہ بھی ایک عالم ہے۔ اس عالم کو عشق کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔"

خط پڑھتے پڑھتے عبدالمالک کی حالت ہی غیر ہو گئی۔ خطوط دینے والا ان کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا، بولا: "رک کیوں گئے؟ پڑھو، پڑھو۔ دوسرے خطوط بھی تو پڑھو۔"

عبدالمالک نے دوسرے خطوط پڑھنا شروع کر دیے۔ ایک اور دوسرے خط میں لکھا تھا:

"اے طالب! اللہ تعالیٰ اپنے مرتبے کے لحاظ سے اوّل و آخر ہے۔ اس کو زمانے اور جگہ سے کوئی لگاؤ نہیں — اور اللہ تعالیٰ جس نے سب کو پیدا کیا ہے وہ مکین کون و مکاں ہے۔ انسان نام ہے تمثیل خداوندی کا جو تمام موجودات سے بالا اور برتر ہے۔ تمام کائناتِ انسانی اس کی شکل میں ظہور پذیر ہے۔ انسان کی دُنیا بہت بڑی ہے۔ انسان کی وحدت، وحدتِ خداوندی کے لیے دلیل ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ وحدتِ حقیقی ہو یا کثرتِ نسبی، سب کے سب انسان میں دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی بھی نورِ محض یا ظلمتِ خالص دکھائی نہیں دیتی اور جو دکھائی دیتی ہے وہ مخلوط ہے، نور و ظلمت سے جس کو ہم ضیاء و روشنی کہتے ہیں۔ ہر ہستی کا ظہور ہستی سے مربوط ہے جس کو دنیا کہتے ہیں اور جس ظہور کو اللہ تعالیٰ نے نزول کے ذریعے اعیان کے ساتھ نسبت دی ہے وہ رسولِ مقبولؐ ہیں جو کامل نورانی ہونے کے ساتھ اخلاق و وسعت میں بمرتبہ افعال و اسمائے صفاتی جلوہ گر ہیں۔"

اس تحریر نے عبدالمالک کو مجبور کر دیا کہ اس کے لکھنے والے کے پاس جائیں اور اس سے بیعت ہو جائیں۔ یہ دہلی میں شیخ محمد حسن خدمت میں پہنچے اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سر اُٹھا کر دریافت کیا: "کہو کیا بات ہے کیسے آئے؟"

انھوں نے عرض کیا: "حضرت! میں اپنی تشنگی بجھانے آیا ہوں، کچھ عطا ہو جائے۔"

شیخ محمد حسن نے پوچھا: "کیا تجھ کو ابنِ عربی کی فصوص الحکم سے دلچسپی ہے؟"

عبدالمالک نے جواب دیا: "بیشک بندہ آپ کی روشن ضمیری کا قائل ہے۔ میں ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ بھی پڑھنا چاہتا ہوں بشرطیکہ ان کی تشریح کرنے والا بھی کوئی ہو۔"

شیخ محمد حسن نے کہا: "عبدالمالک! ابنِ عربی وہ شخص ہیں جن کے افکار و اقوال تک ہر کسی کی رسائی نہیں۔ جو کچھ لوگوں کی سمجھ آگیا اس کو غنیمت جانا، باقی کو خدا پر چھوڑ دیا۔"

عبدالمالک نے جواب دیا: "حضرت! میں اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں، اور اس پیاس میں سبھی کچھ شامل ہے۔"

انھیں مرید کر لیا گیا۔ شیخ محمد حسن کو بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ شاگرد عام شاگردوں جیسا نہیں ہے اس میں جستجو بلا کی باقی ہے اور یہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتا۔ عبدالمالک نے اپنے پیر مُرشد کو جن مشاغل میں منہمک دیکھا تھا، اُن میں فنِ کتابت بہت نمایاں ایک دن انھوں نے اپنے پیر مُرشد کو دیکھا، وہ کوئی کتاب لکھنے میں مشغول تھے۔ عبدالمالک کو بڑی خوشی ہوئی کہ چلیے ہمیں ایک بلند پایہ [illegible] مل جائے گی۔

لیکن جب یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی تو انھوں نے اُسے دُوسروں کو پڑھنے کے لیے دے دیا پھر جب واپس لی تو اس کے اوراق قینچی [illegible] کاٹ کر ہوا میں اُڑا دیے۔

اسی طرح آپ نے تصوّف پر ایک کتاب لکھی اور جب وہ مکمل ہو گئی تو اس کو نذرِ آتش کر دیا۔ مریدوں میں اتنی ہمت نہیں تھی

مردِ مجاہد

سلطنتِ عثمانیہ ترکیہ کا بانی، عثمان خاں غازی، اسلام کا وہ مایۂ ناز حکمراں تھا جس نے یورپ کی اُن استعماری قوتوں کو کچل کر رکھ دیا تھا جو مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنا چاہتی تھیں۔ اُس مردِ مجاہد اور اُس کی لائق اولاد نے اپنی جانبازی اور سرفروشی سے پورے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

سلطان بایزید یلدرم اسی مردِ مجاہد کا وہ شیر دل پوتا تھا جس نے نکوپولس کے مورچے پر تنِ تنہا نہ صرف پورے یورپ کو شکست فاش دی تھی بلکہ یورپین حکومتوں کے پچیس فرمانرواؤں اور شہزادوں کو گرفتار کرنے کے بعد کسی سزا کے بغیر رہا بھی کر دیا تھا اور رہائی کے [illegible] ان یورپین حکمرانوں سے کہا تھا: "تم لوگوں نے ناحق میرے ملک پر حملہ کرنے کی تکلیف گوارہ کی۔ میں خود تمھارے ملکوں کو فتح کرنے [illegible] یورپ آنے والا تھا۔ اب میں تمھیں اسی لیے آزاد کر رہا ہوں تاکہ تم اپنے ملکوں میں جا کر پورے اطمینان کے ساتھ میرے [illegible] کی تیاری کر سکو۔ اب انشاء اللہ تمھارے ہی ملکوں میں تم سے ملاقات ہوگی۔ میں بہت جلد پورے یورپ کو فتح کرنے کے لیے [illegible] اور سینٹ پیٹر کے گرجا میں اپنے گھوڑے کو دانا کھلاؤں گا۔ جاؤ اور جا کر میرے مقابلے کی پوری تیاریاں کرو تاکہ تمھاری رزو باقی نہ رہ جائے۔"

ناصر اختر

رہنے پیرِ مرشد سے پوچھتے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

کچھ عرصہ بعد جب ایسا واقعہ کئی بار پیش آیا تو عبدالمالک نے اپنے پیر مرشد سے پوچھ ہی لیا: "حضرت! میں نادان ہوں اور کچھ نہیں جانتا کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔"

مرشد نے جواب دیا: "دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سراپا حیرت انگیز ہے اور ہم میں سے کس کی اتنی مجال ہے کہ اللہ سے پوچھے کہ ایسا کیوں ہوا یا ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

عبدالمالک نے عرض کیا: "حضرت! اللہ تک اپنی رسائی نہیں ہے ورنہ میں یہ سوال اس سے بھی کرتا۔ آپ محنتِ شاقہ سے کتاب تصنیف کرتے ہیں اور اس کے بعد اس کو ضائع کر دیتے ہیں، آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

پیر مرشد نے جواب دیا: "اللہ بس، باقی ہوس۔"

پیر مرشد کی خدمت میں خاصی مدت گزارنے کے بعد عبدالمالک نے اپنے وطن پانی پت جانے کی اجازت چاہی۔

اس موقع پر پیر مرشد نے جواب دیا: "عبدالمالک! کیا تجھ کو اپنا موجودہ نام پسند ہے؟ حالانکہ میں نے عالمِ بالا میں تیرا کوئی اور ہی نام دیکھا ہے۔"

عبدالمالک نے عرض کیا: "حضرت! نام کے سلسلے میں میری پسند یا ناپسند کو کوئی دخل نہیں جو والدین نے رکھ دیا بس وہی نام چل نکلا۔"

مرشد نے جواب دیا: "تو امان اللہ ہے۔ اللہ کی امان۔ اور اسی سے تیری شہرت ہوگی اور اسی نام سے تو صدیوں زندہ رہے گا۔"

فرماں بردار مرید نے سرِ تسلیم خم کر دیا کہا: "بھلا مجھ کو اس سے کیا انکار ہو سکتا ہے، آج سے میں امان اللہ ہوں اور آئندہ بھی یہی رہوں گا۔"

مرشد نے پانی پت جانے کی اجازت دے دی اور کہا: "امان اللہ! دنیا میں میں رہتا ہوں مگر بیگانوں کی طرح۔ یہاں دل نہیں لگتا۔ کتابیں لکھتا ہوں اور ضائع کر دیتا ہوں لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کتابوں سے زیادہ کوئی رفیق بھی نہیں۔ تم بھی انہی کو اپنا رفیق بنانا۔ بالخصوص تصوف کی کتابیں۔"

امان اللہ باچشمِ نم پانی پت چلے گئے۔

انھیں توحید سے خاص دلچسپی تھی۔ طبیعت میں حد درجہ بے نیازی پائی جاتی تھی۔ علم و فضل میں دور دور تک ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

جب توحید پر تقریر کرتے تو سماں باندھ دیتے اور سننے والے اپنے ہوش و حواس میں نہ رہتے۔

انھیں بھی تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ آپ نے ایک کتاب اثبات الاحدیت کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں اللہ کے حاکم علی الاطلاق ہونے اور کائنات کے حقائق کو علم الیقین کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا ہے۔

آپ تصوف میں مشربِ ملامتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ دور سے انھیں دیکھتے تو بیزار ہو کر اور دور ہو جاتے۔

ایک دن آپ کی محفل میں لوگوں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں تو آپ نے انھیں منع کیا اور کہا: "بہتر تو یہی ہے کہ آپ لوگ یہاں بیٹھ کر تصوف کی باتیں کریں۔"

ایک نے جواب دیا: "حضرت! ہم تصوف ہی کی کہاں تک باتیں کرتے رہیں گے۔ میرے ایک دوست ہیں اور انھیں تصوف سے چڑ ہے دنیا کے بارے میں ان کی رائے عجیب سی ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ یہ دنیا چند روزہ ہے پھر اس چند روزہ زندگی کو غموں اور احتیاطوں میں کیوں بسر کیا جائے؟"

آپ نے جواب دیا: "دوست کی باتیں دوست سے کرنا جو شخص اس محفل میں موجود نہیں ہے اس کا اس طرح ذکر ہی کیوں کیا جائے"

اس شخص نے کہا: "میں اس شخص کی برائی تو نہیں کر رہا۔ بس آپ کو اور دوستوں کو یہی تو بتا رہا ہوں کہ میرا مذکورہ دوست فلسفہ کی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس دنیا میں خوشی اور غم توام ہیں، ان میں سے کسی ایک سے بھی نجات ناممکن ہے اس لیے کیوں نہ زیادہ زیادہ خوشیاں سمیٹنے کی فکر کی جائے۔"

آپ نے فرمایا: "اے شخص! میری محفل میں کسی کی غیبت نہیں ہوگی، دنیا داری کی باتیں نہیں ہوں گی اور بیہودہ گفتگو سے پرہیز"

اس شخص نے آپ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہنے لگا: "جناب! یہ کیا بات ہوئی؟ آپ تو ملامتیہ مشرب سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں تو یہ ساری باتیں جائز سمجھی جاتی ہیں۔"

آپ نے سختی سے جواب دیا۔ ٹھیک ہے ملامتیہ مشرب رکھنے والوں میں ممکن ہے یہ باتیں جائز ہوں لیکن میں بذاتِ خود ان سے نفور اور گریزاں ہوں لہٰذا مجھے تو معاف رکھو "

دوسرے لوگوں کو بھی آپ کی یہ باتیں اچھی نہیں لگیں، ایک دوسرے شخص نے کہا۔ حضرت! ہم تو یہاں اس لیے آتے تھے کہ ہم آپ کو آزاد مشرب سمجھتے تھے لیکن آج یہ بھید بھی کھل گیا کہ آپ بھی بعض باتوں کے پابند ہیں "

آپ نے فرمایا "تم لوگوں نے مجھے بالکل غلط سمجھا ہے۔ میں یا میرے جیسا کوئی اور شخص غیبت، بیہودہ گفتگو اور دنیاداری کو ہرگز پسند نہیں کرے گا، اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اور کسی بھی انسان کے لیے اللہ کی ناراضی حد درجہ خطرناک ہوتی ہے "

حاضرینِ محفل ناراض ہو گئے، بولے "اب تو ہم یہاں کبھی نہیں آئیں گے "

آپ نے فرمایا "ٹھیک ہے میں تنہا ہوں اور تنہا ہی رہوں گا کیونکہ میں خود بھی تنہائی پسند واقع ہوا ہوں "

دوست احباب آپ کو چھوڑ کر چلے گئے، اور آپ تنہا رہ گئے۔

✳

آپ کے علم کا شہرہ ایسا نہ تھا کہ لوگ آپ کی طرف سے لاتعلق اور بے نیاز ہو جاتے۔ عقیدت مند اور تشنگانِ علم آپ کے دربر حاضریاں دیتے اور آپ کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ آپ کی باتوں میں نشہ تھا، سحر تھا، جادو تھا۔ آپ زیادہ تر تصوف ہی پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے گرد و پیش جو کتابیں موجود رہتی تھیں ان میں کی بیشتر تصوف سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر ایک کو کسی خاص چیز سے رغبت ہوتی ہے مجھ کو تصوف کی کتابوں سے رغبت ہے۔ یوں بھی آپ کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔

غیبت کرنے والوں کی آپ کے ہاں کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی طرح بازاری زبان میں باتیں کرنے والوں کے لیے بھی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چونکہ فضول قسم کے لوگ آپ کے پاس نہیں آتے تھے اس لیے کتابوں کے مطالعے اور کتابیں لکھنے کا بہت وقت مل جاتا تھا۔

آپ فصوص الحکم کے مطالعے میں مشغول تھے کہ آپ کے پاس چند آدمی آئے۔ ان میں کا ایک آدمی ذرا مخبوط الحواس نظر آتا تھا۔

امام بخاریؒ

ایک شب امام بخاریؒ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے آرام فرما رہے ہیں، اور آپ قریب بیٹھے ہوئے پنکھا جھل جھل کر مکھیاں اڑا رہے ہیں۔ صبح کو آپ نے اپنے عالی قدر اور شفیق استاد حضرت اسحاق راہویہؒ سے اس مبارک خواب کا ذکر کیا۔ اسے سن کر انھوں نے فرمایا "مبارک ہو تمھیں کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی تدوین کے لیے چن لیا گیا ہے، اور یہ سعادت تمھارے لیے مقدر ہے۔" امام بخاری کے کارنامے گواہ ہیں کہ یہ خواب اور اس کی تعبیر حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہوئی۔

(سیرت امام بخاری۔ دیباچہ صحیح بخاری شریف)

جناب عبدالواحد طوسیؒ امام بخاریؒ کے ہم عصر تھے، اور اپنے زمانے کے اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ایک شب انھوں نے خواب دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ سرِراہ کسی کے منتظر کھڑے ہیں۔ انھوں نے سلام کے بعد عرض کیا:

"یا رسول اللہ! کس کا انتظار ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "محمد بن اسماعیل بخاری کا انتظار کر رہا ہوں۔" حضرت عبدالواحد طوسیؒ فرماتے ہیں کہ اس خواب کے چند روز بعد ہی مجھے امام بخاریؒ کی وفات کی خبر ملی تو میں نے تحقیق کی تب مجھے معلوم ہوا کہ جس وقت میں نے خواب دیکھا تھا اسی وقت امام بخاریؒ کا انتقال ہوا تھا۔

(امام بخاریؒ مصنفہ مغیث احمد، روزنامہ جسارت ص ۲، ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

ان لوگوں نے آپ کو نہایت ادب سے سلام کیا اور عرض کیا "حضرت! ہم آپ کا شہرہ سن کر بہت دور سے آئے ہیں۔"

آپ نے ایک شخص کی طرف ایک کتاب بڑھا دی اور کہا "ذرا اس کو پڑھ کے تو سنانا۔"

اس شخص نے جواب دیا "جناب! میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔"

آپ نے فرمایا "اگر تو پڑھا لکھا نہیں ہے تو تیرے ساتھی تو ضرور ہی پڑھے لکھے ہوں گے ان سے ہی پڑھوا دے۔"

جواب دیا گیا "حضرت! ہم سب ان پڑھ ہیں۔ ایک بھی لکھا پڑھا نہیں ہے۔"

آپ نے مخبوط الحواس جوان کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "ہاں تو اس مخبوط الحواس جوان کے بارے میں تو آپ لوگوں نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ یہ صحیح الدماغ تو نہیں لگتا۔"

ایک نے جواب دیا "حضرت! یہ اچھا بھلا تھا، پھر معلوم نہیں اس کو کیا ہو گیا کہ گلی کوچوں میں بھاگنے لگا۔"

آپ نے اس نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا "ہاں تو، تو بتاتا کیوں نہیں کہ تجھ کو ہو کیا گیا ہے؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا مگر نوجوان کی مضطرب اور بے چین نظریں آپ کے چہرے سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد آپ نے ایک سرد آہ بھری اور اس نوجوان سے کہا "افسوس کہ تو ایک فضول شے کے لیے اپنی دنیا بھی برباد کر رہا ہے اور عقبیٰ بھی۔ اگر تجھ کو عشق ہی کرنا ہے تو اپنے رب سے کر اور پھر اس کے اثرات دیکھ۔ یہ کیا کہ ایک لڑکی پر عاشق ہو گئے اور اپنی جوانی اپنی زندگی برباد کرنے لگے۔"

نوجوان ذرا سی دلدہی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، بولا "میں وہیں شادی کروں گا۔ اسی لڑکی سے۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی اور لڑکی کی طرف تو دیکھنا بھی نہیں۔"

آپ نے نوجوان کے عزیزوں سے کہا "صاحبان! آپ نے نوجوان کی باتیں سن لیں اب اس کا علاج آپ لوگ بآسانی کر سکتے ہیں۔"

ایک شخص نے جوان سے پوچھا "ہاں تو اس لڑکی کا پتا مجھے بتا، میں تیرے لیے کوشش کروں گا۔"

نوجوان نے لڑکی کے گھر کا پتا سمجھایا تو ادھیڑ عمر شخص نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا پتا سمجھ لیا اور اس کے بعد اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کے بولا "ارے بھائی! تجھ کو کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی۔ یہ تو ہمارے سات پشتوں سے دشمن چلے آ رہے ہیں۔"

آپ نے پوچھا "کیوں، کیا بات ہے؟ کوئی خاص بات؟"

اس شخص نے جواب دیا "یہ لڑکی جس کا ذکر چھڑا ہوا ہے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو ہمارے دشمن ہیں۔ پھر بھلا وہ اپنی لڑکی کیوں دینے لگے۔"

آپ نے اس نوجوان کو سمجھایا "اے شخص! تو نے عشق بھی کیا تو کس سے؟ ایک فانی شے سے۔ یہ تو تبدیلیوں کے شوق ہیں۔ اگر وہ لڑکی تجھے مل بھی جائے گی تو تیرا عشق چند دنوں میں مر جائے گا۔ وصال عشق کی موت ہے۔ اس سے عشق کر جس کا وصال ممکن ہی نہیں اور اس طرح تو عشق کی آگ میں ہمیشہ جلتا رہے گا۔"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا، بس دیوانوں کی طرح آپ کی شکل دیکھتا رہا۔

ایک شخص نے آپ سے کہا "کیا آپ اس کو سمجھا نہیں سکتے؟ ممکن ہے اس کی سمجھ میں آپ کی کوئی بات آ جائے۔"

آپ نے جواب دیا "مجھ کو جو سمجھانا تھا، سمجھا چکا۔ اب دعا کے اثر کا انتظار کر۔"

اس کے بعد آپ نے پوچھا "تمہیں پڑھنا لکھنا آتا ہے؟"

ایک نے جواب دیا "نہیں۔ ہمیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔"

آپ نے غصے میں فرمایا "تب پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

وہ سب آپ کے پاس سے چلے گئے۔

کچھ عرصے بعد نوجوان کا پاگل پن دور ہو گیا اور وہ سب سے اپنے ہوش و حواس میں باتیں کرنے لگا۔ اس دوران گھر والوں نے لڑکی والوں سے بات کر لی تھی اور لڑکی والے شادی پر اس لیے آمادہ ہو گئے تھے کہ اس طرح دونوں خاندانوں کی دشمنی دور ہو جاتی۔ اب نوجوان نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ گھر والوں نے لڑکی کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا مگر نوجوان نے نظریں جھکا لیں اور گھر والوں سے کہا "یہ آپ لوگ کس کو پکڑ لائے میرے پاس! خدا کے لیے اسے آپ میرے پاس سے لے جائیں۔"

گھر والوں نے آپ کی خوشامد کی "حضرت! خدا کے لیے اسے سمجھائیں اور اس کے حق میں دعا کریں کہ یہ پہلے جیسا ہو جائے۔"

آپ نے غصے میں جواب دیا "تم لوگوں نے دعا کو مذاق سمجھ رکھا ہے کہ پہلے تو یہ کہا کہ نوجوان کو ٹھیک کر دیا جائے اور اس کے دل سے نوجوان لڑکی کے عشق کو دور کر دیا جائے۔ چنانچہ نوجوان کے حق میں دعا کر دی گئی اور وہ بھی بھی باتیں کرنا بھول گیا۔ یہاں تک کہ اپنی محبوبہ تک کو بھلا دیا اور اب تم لوگ یہ کہتے ہو کہ میں اس کو دوبارہ پہلے جیسا نوجوان بنا دوں۔"

آپ نے ان لوگوں کو بھگا دیا مگر چند دنوں بعد نوجوان تنہا آپ کے پاس آیا اور کہا "حضرت! میں آپ کے قدموں میں اپنی زندگی بسر کر دینا چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ اس کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔"

آپ نے فرمایا "بھائی! اگر میں تجھ کو اجازت دے بھی دوں تو خدا کی قسم مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ لوگ مجھے بھی ستانے لگیں گے۔"

نوجوان نے جواب دیا "آپ مجھے اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دیں تو سہی، اپنے خاندان کے لوگوں سے لڑائی میں خود لڑ دوں گا۔"

آپ نے فرمایا "میں تجھ کو خاندان والوں سے لڑنے نہیں دوں گا کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

نوجوان اپنی ضد پر قائم رہا، بولا "اور میں بھی یہاں یہ طے کر کے آیا ہوں کہ اب اس در سے کہیں اور نہیں جاؤں گا۔"

آپ نے فرمایا "میں تجھ کو یہاں آنے سے منع نہیں کروں گا لیکن رہنے سے روکوں گا۔ میں عسرت اور تنگدستی میں اپنی زندگی گزار رہا ہوں۔ زمین پر سوتا ہوں اور اپنے پاس بستر تک نہیں۔ اپنے پاس کھانے پینے کے سامان کا کوئی ذخیرہ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ کماتا ہوں وہ بھی پیٹ بھر نہیں ہوتا۔ کیا تو بھی یہ پریشانیاں، یہ دکھ جھیل سکتا ہے؟ شاید نہیں۔ کیونکہ تو ایک آسودہ حال گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور تو ان پریشانیوں کا ذرا بھی عادی نہیں۔"

نماز کی تعلیم

نافع بن جبیرؓ بن مطعم کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ پر نماز فرض کی گئی تو آپؐ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے۔ انھوں نے آپؐ کو ساتھ لے کر ظہر کی نماز پڑھی، جب آفتاب سمت الراس سے مائل ہو چکا تھا۔ پھر جب آپؐ کا سایہ طول میں آپؐ کے مثل ہوا تو عصر کی نماز پڑھی۔ پھر سورج ڈوبنے پر آپؐ کو ساتھ لے کر مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر جب شفق نہ رہی تو آپؐ کو ساتھ لے کر عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر طلوعِ فجر پر آپؐ کو ساتھ لے کر صبح کی نماز پڑھی۔ دوسرے روز جبریل علیہ السلام دوبارہ آئے۔ اور آپؐ کو ساتھ لے کر نماز ظہر اس وقت پڑھی جب آپؐ کے سایے کا طول آپؐ کے مثل تھا۔ پھر جب سایہ طول میں دوگنا ہو گیا تو آپؐ کو ساتھ لے کر عصر کی نماز پڑھی۔ پھر جب سورج ڈوب چکا تھا اور گزشتہ کل ہی کا وقت تھا، انھوں نے آپؐ کو ساتھ لے کر نماز مغرب ادا کی۔ پھر رات کا ابتدائی تہائی وقت گزر جانے پر عشاء کی نماز پڑھی۔ اور پھر آپؐ کو ساتھ لے کر صبح کی نماز پڑھی جب دن روشن ہو چکا تھا اور سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جبریلؑ نے کہا "اے محمدؐ! نماز کے اوقات آپؐ کی آج اور کل کی نمازوں کے درمیان ہیں۔" (ابن ہشام)

لیکن نوجوان پھر بھی نہیں مانا اور آپ کے پاس ہی رہنے لگا اب جو اس نے آپ کے شب و روز آپ کے ساتھ رہ کر دیکھے تو وہ ذرا سی دیر کے لیے پریشان ہو گیا، آپ کی زندگی میں آرام نام کی کوئی چیز بھی نہ تھی اس نے بھی آپ ہی کے ساتھ مجاہدے شروع کیے۔

❋

اس دن باتیں ہو رہی تھیں، انسان کے ان حالات اور واقعات کی جو بظاہر تو کہیں نظر آتے نہیں مگر ان کا کہیں نہ کہیں وجود ضرور ہوتا ہے۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ انسان کو اپنے اور کائنات کے بارے میں ابھی کچھ بھی نہیں معلوم۔ یہاں کیا کچھ موجود ہے ہمیں کچھ پتا نہیں۔ کان ان کی سرگوشیوں کو سن نہیں سکتے۔ آنکھیں انھیں دیکھ نہیں سکتیں، حواس ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔

کسی نے پوچھا "ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے کیا کچھ وضاحت سے بتائیں گے آپ؟"

آپ نے جواب دیا "اس کی وضاحت یہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہم سے کچھ کہہ رہا ہے لیکن ہم اس کی آواز نہیں سن سکتے۔ زمین میں بویا ہوا وہ دانہ جو زمین کا سینہ توڑ کر باہر نکل آتا ہے ہم سے یہ کہتا ہے کہ اندر سے باہر نکلو اور دنیا کو اپنی مخفی قوتوں کے بارے میں بتاؤ لیکن انسان ایسا نہیں کرتا۔ یہ پوری زندگی اپنے مصنوعی خول میں بند رہ کے مر جاتا ہے۔ انسان کو خدا نے کئی قسم کی حیرت انگیز صلاحیتیں اور قوتیں دی ہیں، افسوس کہ یہ نہ تو ان سے واقف ہے اور نہ واقف ہونا چاہتا ہے۔ مگر یہ جس دن ان سے واقف ہو گیا، انسانی زندگی میں انقلاب آ جائے گا۔ یہ زمین پر اللہ کا نائب ہے اپنے رب کا خلیفہ ہے پھر تم ہی بتاؤ کہ اس نے کون سا ایسا کام کیا ہے جس سے اللہ کی نیابت اور ارضی خلافت کا کوئی تاثر، کوئی اثر ملتا ہو یا پایا جاتا ہو؟"

آپ بولنے پر آتے تھے تو اسی طرح بولتے تھے، اور جو بھی آپ کی تقریر سنتا بس سنتا ہی رہ جاتا۔

آپ اپنے ارادت مندوں میں گھرے ہوئے تھے اور وہ آپ سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے اور آپ ان کے سحر انگیز جواب دے رہے تھے۔ اسی دوران آپ کی مجلس میں ایک حواس باختہ درویش داخل ہوا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟"

درویش نے جواب دیا "بھائی امان! اللہ نے تمھیں جو رتبہ دیا ہے اس رتبے کو کام میں لاؤ۔"

آپ نے پوچھا "بات کیا ہے مجھے بتاؤ تو سہی میں کس طرح تمھارے کام آ سکتا ہوں؟"

درویش نے جواب دیا "اللہ نے آسمان سے مجھ کو ایک ہزار گائیں بھیجی تھیں، وہ گائیں مغل ہانک لے گئے۔ یہ تو میرے ساتھ زیادتی ہو گئی۔"

آپ نے پوچھا "یہ کب ہوا؟ اور وہ کدھر ہانک لے گئے آپ کی گائیں؟"

درویش معصومیت سے سر جھکائے کھڑا تھا، بولا "پتا نہیں کب اور کدھر ہانک لے گئے؟ میں کیا جانوں؟ یہ پتا لگانا تمھارا کام ہے۔"

آپ مسکرائے اور بٹھاتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے بھائی کہا ہے اس لیے میں آپ کی عزت کر رہا ہوں۔ آپ ذرا صبر کریں۔ مجھ کو پتا لگانے کے لیے چند دن چاہئیں میں اس طرح تو کچھ بھی نہیں بتا سکوں گا۔"

درویش کو غصہ آنے لگا، بولا "چند دن کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ انھیں کھا جائیں گے۔ بس جناب بس، اب آپ کھڑے ہو جائیں اور میرے ساتھ چل کے میری گائیں دلوا دیں ورنہ میں خود قیامت کھڑی کر دوں گا۔"

حاضرین مجلس نے اس درویش کا مذاق اڑایا۔ کسی نے درویش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ذرا ان بزرگوار کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں اور ہزار گائیں کی خوش فہمی پر غور فرمائیں۔ ذرا ان سے پوچھیے تو سہی کہ آسمان سے ہزار گائیں پھاند کے نیچے آ گئی تھیں یا ان کے لیے کوئی سیڑھی لگائی گئی تھی؟ اور یہ گائیں انھیں کیوں دی گئی تھیں؟"

آپ نے ان لوگوں کو منع کیا "ایسی باتیں مت کرو، کہیں اس سے تمھیں نقصان نہ پہنچ جائے!" پھر درویش سے کہا۔ "بھائی! اگر وہ گائیں آپ کی ہوتیں اور آپ کے مقدر میں ہوتیں تو انھیں مغل نہیں لے جا سکتے تھے۔ ظاہر ہے وہ خدا نے انھی کے ذریعے مغلوں کو بھیجی تھیں، سو مغل اپنا حق لے گئے۔"

درویش مسکرایا، نہایت تحمل سے کہا "ہاں۔ اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

آپ نے درویش کے لیے کھانا منگوایا اور اس کو پیٹ بھر کے کھلوا کے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور کہا "آپ مجھ کو بہت زیادہ تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذرا آرام کر لیں تو طبیعت بھی سنبھل جائے گی۔"

درویش کو بستر بچھوا کے لٹا دیا گیا۔ وہ سو گیا اور دیر بعد جب بیدار ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا "کیسے طبیعت ہلکی ہو گئی؟" انہیں

درویش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "ہاں اس وقت میں بہت خوش ہوں اور طبیعت بھی بہت ہلکی ہو رہی ہے۔"

آپ نے کہا: "تو اب ہم دونوں مغلوں کے پاس چلیں؟"

درویش نے حیرت سے کہا: "مغلوں کے پاس؟ کہاں ہیں یہ مغل؟ اور پھر ہم ان کے پاس کیوں چلیں؟"

آپ نے جواب دیا: "وہ آپ کی سو گائیں جو لے گئے ہیں، کیا ان سے وہ گائیں واپس نہیں لینا ہیں؟"

درویش ہنسنے لگا، بولا: "بھائی امان! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کس کی گائیں کہاں کے مغل؟ میں درویش فاقہ مست انسان۔ میرے پاس ہزار گائیں آئیں گی کہاں سے؟"

آپ نے جواب دیا: "ہزار گائیں آسمان سے اتری تھیں آپ کے لیے۔"

درویش زور زور سے ہنسنے لگا۔ بولا: "بھائی امان! مجھ سے کیوں مذاق کرتے ہیں آپ؟ ایسی بے سروپا باتیں! توبہ توبہ مجھے تو معاف کریں۔"

حاضرین مجلس کو بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ یہ درویش کو آخر ہو کیا گیا ہے جو اس قسم کی بے سروپا باتیں کر رہا ہے۔ مجلس کے کئی آدمی درویش سے بات کرنا چاہتے تھے مگر آپ نے انھیں منع کر دیا کہ درویش کو اہلِ مجلس کے کسی آدمی سے دکھ نہیں پہنچنا چاہیے۔

آپ نے درویش سے کہا: "حضرت! پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟"

درویش نے جواب دیا: "میں کیا حکم دوں گا تمھیں امان! ذرا ان لوگوں کو میرے حوالے کر دو جو مجھ سے باتیں کرنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔ میں ان کو انعام دینا چاہتا ہوں۔"

آپ نے درویش کو سمجھایا: "بھائی! یہ نادان ہیں انھیں معاف کر دیں اور پھر یہ لوگ میری مجلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے ہیں۔ آج نادان ہیں کل دانا ہو جائیں گے، آج غافل ہیں کل ہوشیار ہو جائیں گے، آج بے بہرہ ہیں کل بہرہ ور ہو جائیں گے۔"

درویش نے درگزر سے کام لیا۔ جب یہ درویش چلا گیا تو آپ نے حاضرینِ مجلس سے کہا: "آج تم لوگوں نے غضب کر دیا تھا۔ اگر درویش غیظ و غضب میں تم لوگوں کے خلاف کچھ کہہ دیتا تو اس کا نہ جانے کیا نتیجہ نکلتا۔"

ایک شخص نے کہا: "لیکن آپ بھی تو اس درویش کی گپ ملاحظہ فرمائیں۔ وہ جن ہزار گائیں کا ذکر کر رہا تھا، وہ کہاں ہیں اور پھر یہ کہ اس کے بقول وہ ہزار گائیں آسمان سے اتری تھیں۔ کون مانے گا ان بے سروپا باتوں کو۔"

آپ نے اس معترض کو جھڑک دیا۔ فرمایا: "اے شخص! میں کہتا ہوں تم لوگوں کو درویش سے محبت کرنی چاہیے۔ وہ مجذوب تھا اور مجذوبوں کو بہت سی چیزیں ایسی بھی دکھائی دیتی ہیں جو ہمارے آس پاس نہیں تو کہیں اور وقوع پذیر ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور ہم اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان کا انکار نہیں کر سکتے۔ اس عالم نمود میں سب کچھ موجود ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ درویش نے یہ واقعہ کہیں نہ کہیں دیکھ لیا ہو۔"

کافی دنوں بعد ایک شخص بسلسلۂ تجارت بخارا سے ہندوستان آیا اور اس نے بتایا کہ پچھلے دنوں ایک مخیر انسان نے ہزار گائیں ایک دینی مدرسے کے طالب علموں کو دی تھیں مگر مغل انھیں زبردستی ہانک لے گئے۔

*

حاضرینِ مجلس نے کئی بار محسوس کیا کہ آپ نے فرض نمازیں نہیں پڑھیں۔ ان کے دلوں میں آپ کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے اور یہ لوگ جب آپ کی مجلس سے اٹھ کر کہیں اور سر جوڑ کر بیٹھے تو اسی موضوع پر گرماگرم بحث شروع ہو گئی۔ ایک نے کہا۔ "تعجب کی بات ہے کہ آج میں نے پیر مرشد کو ظہر کی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔"

کسی دوسرے نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا: "تم ظہر کی نماز کی بات کرتے ہو میں نے تو ان کے قریب رہ کر دیکھا ہے کہ کبھی وہ فجر کی نماز گول کر جاتے ہیں اور کبھی مغرب کی۔ کبھی عشاء۔ کبھی عصر کی گول کر جاتے ہیں۔ پتا نہیں ان گنڈے دار نمازوں سے انھیں کیا ملتا ہے؟"

کسی تیسرے نے کہا: "بہرحال انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہم سب ان کی تقلید کرتے ہیں اور جب یہ خود نماز نہیں پڑھیں گے تو ہمیں نماز کی تلقین کس طرح کریں گے۔"

لیکن چوتھے شخص نے ان سب کی مخالفت کی اور کہا: "نماز فرض ہے اور اس کے لیے کسی کی تلقین ضروری نہیں۔ ہم نمازیں جناب امان اللہ کی تقلید میں نہیں پڑھتے۔ اگر ایسا کرتے ہیں تو غلطی کرتے ہیں۔"

ایک اور شخص نے بھی چوتھے شخص کی تائید کی، بولا: "کسی شخص کے ظاہری مگر سرسری اعمال پر حجت نہیں ہونا چاہیے ہو سکتا ہے۔۔

نمازیں پڑھتے ہوں اور ہمیں اس کا علم نہ ہو۔"
معترضین لاجواب ہو گئے۔ ان میں دو ایسے تھے جنھیں یہ فکر لگ گئی تھی کہ وہ پتا لگانے کی کوشش کریں گے کہ آپ نمازیں پڑھتے بھی
ہیں یا نہیں۔ ان دونوں نے آپ کا قرب اختیار کیا اور شب و روز آپ کے ساتھ رہنے لگے۔ شام کو مغرب کے بعد آپ ذکر میں مشغول رہے
گئے۔ عشا کے بعد آپ نے حاضرین کے سامنے انسان کے ظاہر و باطن پر تقریر کی اور اپنے ارادت مندوں کو بتایا: "لوگو! تم کسی کے ظاہری
عمل سے دھوکا نہ کھانا۔ پرہیزگاری اور تقویٰ میں دوسروں کی تقلید کرو۔ اور قابلِ تقلید ذات سامنے نہ ہو تو خود اپنی کوششوں سے
پرہیزگاری اختیار کرو۔۔۔۔"

آپ دیر تک تقریر فرماتے رہے۔
کافی رات گئے دونوں نے آپ کو چھپ کے دیکھا۔ آپ وضو کر رہے تھے۔ وضو کے بعد آپ نفلیں پڑھنے لگے۔ یہ دونوں انھیں نماز
پڑھتے دیکھ کر اپنے حجرے میں واپس چلے گئے۔ رات کے پچھلے پہر یہ دونوں پھر آپ کے حجرے کی طرف گئے۔ آپ اس وقت بھی نفلیں
پڑھ رہے تھے۔ صبح کے قریب آپ کو وضو کرتے دیکھا گیا۔ ان دونوں کو حیرت تھی کہ یہ پوری رات تو جاگتے رہے پھر سوئیں گے کس وقت؟
یہ دونوں ایک ماہ آپ کے قریب رہے اور جو کچھ پہلے دن دیکھا تھا وہی مہینہ بھر دیکھتے رہے۔ دونوں آپ کے بارے میں جس بدظنی کا
شکار رہے تھے اس پر شرمندہ ہوئے اور آپ سے معافی چاہی۔ کہا: "حضرت! ہم دونوں بہت شرمندہ ہیں، ہمیں معاف فرما دیں۔"
آپ نے پوچھا: "معافی کس بات کی؟ شرمندگی کیوں؟"
دونوں نے بدظنی کا ذکر کیا اور کہا: "اس وقت تک ہم نے آپ کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔"
آپ نے جواب دیا: "کیا میں نے تم لوگوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ تقویٰ اور پرہیزگاری میں دوسرے کی پیروی کرو، برائی میں نہیں۔
اگر سامنے کوئی مثال نہ ہو تب بھی متقی اور پرہیزگار بننے کی کوشش کرو۔"
ایک زمانہ بعد آپ کی کچھ اور کیفیت ہو گئی۔ آپ دوسروں کے ساتھ نماز پڑھنے سے گھبرانے لگے۔ عموماً تنہائی اور تخلیہ میں نمازیں
پڑھنے لگے۔ آپ کے مخالفین اور ظاہر بیں حضرات نے پھر شور و غل شروع کر دیا اور کہا: "یہ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ اب جماعت
کے ساتھ نمازیں نہیں پڑھتے۔ معلوم نہیں کیوں؟"
کسی نے آپ سے پوچھا: "حضرت! یہ کیا بات ہے کہ آپ باجماعت نمازیں نہیں پڑھ رہے ہیں، کوئی خاص وجہ؟"
آپ نے جواب دیا: "لوگو! مجھے تنگ نہ کرو۔ میں اپنے حال میں عاجز اور تنگ ہوں۔"
پوچھا گیا: "آپ کو کیا پریشانی ہے؟ ہم لوگوں کو بھی تو بتائیں۔"
آپ نے غصے میں جواب دیا: "میں لوگوں کا پابند نہیں ہوں، میں اپنے اللہ کے آگے جواب دہ ہوں۔"
لیکن معترضین نہیں مانے، کہا: "بہرحال ہمیں تو یہ معلوم ہے کہ کوئی خاص عذرِ شرعی نہ ہونے کی صورت میں انسان کو نماز باجماعت
ادا کرنی چاہیے۔ آپ بظاہر کسی عذرِ شرعی کو پیش نہیں کر سکتے۔"
آپ نے جواب دیا: "تم لوگ نمازیں پڑھتے ہو مگر اس کو دل و دماغ پر طاری کر کے نہیں لیکن میری نمازیں ایسی نہیں ہوتیں۔"
لوگوں نے کہا: "آخر ہم بھی تو دیکھیں کہ وہ نماز کیسی ہوتی ہے جو دل و دماغ پر طاری کر کے پڑھی جاتی ہے۔ ہم نے تو آج
تک کسی کو ایسی نماز پڑھتے دیکھا نہیں۔"
آپ نے جواب دیا: "آیاتِ قرآنی تلاوت کے دوران دلوں میں یوں اُتر جاتی ہیں کہ اُن کا برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"
لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا اور کہنے لگے: "یہ کیا کہہ رہے ہیں! اپنی سمجھ میں تو کوئی بات آ نہیں رہی۔"
آپ نے جواب دیا: "میری باتیں یوں سمجھ میں آنے والی بھی نہیں کیونکہ ان کا تعلق قال سے نہیں حال سے ہے۔ اچھا! یہ حال
کو دکھا دیا جائے تاکہ تمھاری زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں۔"
ظہر کا وقت قریب تھا۔ آپ نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آپ امامت فرما رہے تھے۔ سورۂ فاتحہ قراءت

پڑھنا شروع کردی۔ یہاں تک کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" ایک عجیب سے رقت انگیز آواز و انداز میں کہا اور بے ہوش ہو کر گر گئے۔ مقتدیوں
کا برا حال تھا۔ اُن سب کے وجود میں ایک زلزلہ سا آیا ہوا تھا اور شاید کوئی شخص بھی اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جب ہوش
آیا تو آپ نے پھر "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کا ورد شروع کردیا۔ اس کے آگے آپ سے ادا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سورۂ فاتحہ کے
اس حصے کو بار بار ادا کرتے کرتے آپ دوبارہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ آخر یہ اسی حال میں باہر لائے گئے۔ مقتدیوں کا بھی بہت برا
حال تھا اور شاید انھیں اُس دن یہ معلوم ہوا کہ حال کسے کہتے ہیں۔

بمشقت تمام ظہر کی نماز پڑھی گئی اور آپ کا اُدھر جو حال دیکھنے والوں نے دیکھا اور بھگتا تھا، اس کے پیش نظر اب ان
میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو آپ پر تنقید یا تنقیص کرتا۔

اب وہ سب آپ کی بہت عزت کرنے لگے تھے۔ آپ بھی اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔

✱

دہلی میں ایک بزرگ پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے اپنے دو مہمان سیّد زادوں کو اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ دونوں اُن
بزرگ کی دونوں بیٹیوں سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے جب کہ لوگوں کے بیان کے مطابق یہ بزرگ ان دونوں مہمانوں سے اپنی
بیٹیوں کی شادیاں کرنے کے بہت زیادہ خواہشمند تھے۔ دونوں سیّد زادے اپنی خواب گاہ میں مُردہ پائے گئے۔ شہر میں ایک ہنگامہ
برپا ہو گیا۔ مقدمہ بادشاہ تک پہنچ گیا۔ یہ شیر شاہ سوری کا عہد تھا۔ سوری نے حکم دیا کہ اس قتل کی تحقیق کے لیے یہ قضیہ علماء
کے سپرد کر دیا جائے۔ ملک بھر سے منتخب اور بے مثل علماء کو دہلی میں بلوا لیا گیا۔ شیر شاہ سوری نے ان علماء میں آپ کا نام بھی
شامل کر دیا تھا کیونکہ وہ ان کی علمیت اور فضیلت کا بے حد قائل تھا۔

بادشاہ کا ہرکارہ آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا "حضرت! دہلی میں سیّد محمد شاہ فیروز آبادی کو اس الزام میں گرفتار
کر لیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے دو جوان مہمانوں کو اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ سیّد محمد شاہ فیروز آبادی کی بیٹیوں سے شادی نہیں کرنا
چاہتے تھے۔"

آپ نے شاہی ہرکارے سے کہا "سیّد محمد شاہ فیروز آبادی ملزم ہیں یا مجرم۔ اس بات کا پتا چلانا قاضی کا کام ہے،
میرا کیا کام؟ اور اگر اس سے بادشاہ کا مقصد شاہ صاحب کو سزا دینا ہو اور اپنے اس ارادے میں ہمارا تعاون درکار ہو تو ہم اس
کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

شاہی ہرکارے نے عرض کیا "حضرت! ہم تو بادشاہ کے تنخواہ دار اور حکم کے بندے ہیں۔ آپ کا یہ جواب ہم کس طرح بادشاہ
کے گوش گزار کریں گے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں تو بھی سچ کہتا ہے، تو بھی مجبور ہے۔ بادشاہ کی خدمت میں ہماری طرف سے یہ عرض کر دینا کہ وہ
جو کچھ کرنا چاہتا ہے کرے، اس میں ہماری شمولیت چنداں ضروری نہیں۔"

شاہی ہرکارہ خوشامد کرنے لگا۔ بولا "میں آپ کا یہ جواب بھی بادشاہ تک پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

آپ نے فرمایا "تب پھر بادشاہ سے کہہ دینا کہ امان حاضری سے قاصر ہے۔ وہ پانی پت ہی سے بادشاہ کی دنیا اور عقبیٰ کی
دعائیں کر رہا ہے۔"

شاہی ہرکارہ بے نیل و مرام واپس چلا گیا اور بادشاہ کی خدمت میں آپ کا جواب پہنچا دیا۔ بادشاہ یہ تلخ جواب سن کر خاموش
ہو گیا اور آپ کے خلاف کسی غم و غصے کا اظہار نہیں کیا۔

اب آپ قمری سن کے حساب سے ایک سو اکیس سال کے ہو چکے تھے۔ ۹۹۷ھ کے ربیع الثانی کا مہینہ تھا۔ آپ ہر سال
دہلی ضرور جاتے تھے چنانچہ اس سال بھی گئے اور اپنے جملہ دوست احباب سے ملاقاتیں کیں۔ اس بار آپ نے کچھ زیادہ ہی خوش اخلاقی
اور محبت کا اظہار کیا۔ دوست احباب بھی بہت چوکنا ہوئے اور آپ سے پوچھا "کیا بات ہے امان! تم بہت خوش نظر
آ رہے ہو، اس کی کوئی خاص وجہ ہے کیا؟"

آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "پانی پت پہنچ کے مجھ کو ایک دوسرے طویل سفر پر روانہ ہو جانا ہے اس لیے میں
سب سے مل کر جانا چاہتا ہوں۔"

دہلی میں آپ کے ایک خاص دوست ذکریا اجودھنی تھے، انھوں نے آپ سے کہا "بھائی امان! اگر یہ بات ہے تو اس طویل

سفر میں آپ مجھے کیوں اپنا ہمسفر بنا کر ساتھ نہیں لے جاتے۔ حضرت مجھے اس کی بڑی چاہ ہے کہ کسی سفر میں مَیں آپ کی ہمراہی کی سعادت حاصل کروں۔"

یہ سُن کر آپ نے مضبوط لہجے میں کہا: "نہیں! ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس سفر پہ مجھے تنہا ہی جانا ہوگا۔ یہ سفر کسی کی رفاقت نہیں مانگتا پھر بھلا مَیں تمہیں کیونکر ساتھ لے جاسکتا ہوں جب کہ تم اس سفر کی نوعیت تک سے آگاہ نہیں۔ مَیں تمہیں فی الحال اس کی بابت کچھ نہیں بتاسکوں گا مگر اطمینان رکھو اس کے بارے میں تمہیں جلد آگاہ ضرور کروں گا۔"

گیارہ ربیع الثانی کا دن، غوث الثقلین کے عُرس مبارک کا دن ہوتا ہے۔ عُرس سے ایک دن پہلے آپ سخت بخار کی حالت میں تھے جسم تپ کر سُرخ ہوچکا تھا مگر غوث الثقلین کی محبت اور چاہت یہی تھی کہ انتہائی شان و شوکت سے عُرس کا اہتمام کیا جائے۔ ارادت مندوں اور مُریدوں نے زور دیا "حضرت! طبیعت سخت خراب ہے یوں نہ کریں آپ کے لیے آرام ہی مناسب ہے۔"

آپ ہنس کر جواب دیتے: "تم لوگ کیوں فکر مند ہو مَیں بخوبی جانتا ہوں کہ تمہارے خدشات کیا ہیں۔ تم کن وسوسوں میں ڈوبے ہو لیکن اطمینان رکھو۔ نادانوں کیا تم مجھ سے یہ اُمید رکھتے ہو کہ غوث الثقلین کے عُرس مبارک کے دن قدم اُٹھاؤں گا۔ مجھ سے یہ بے ادبی کب ہوسکے گی۔ غوث الثقلین کے احترام کے منافی مَیں ایسا قدم کیوں کر اُٹھا سکتا ہوں۔"

چنانچہ عُرس کا ایسا عظیم الشان بندوبست کیا کہ سبھی عش عش کر اُٹھے۔ مستحقین میں کھانا تقسیم کیا اور حاجت مندوں کی ضروریات خود جان کر اُن کی امداد کی۔

دوسرے روز یعنی بارہ ربیع الثانی کو وقتِ آخر آن پہنچا۔ مریدوں اور ارادت مندوں پر رقت طاری تھی۔ روتے تھے، آہیں بھرتے ہچکیوں کے درمیان آہ و فریاد کرتے۔ اکثر کہا کرتے: "حضرت! یہ غم نہ سہا جائے گا کس کے سہارے چھوڑ کر جارہے ہیں؟"

آپ مسکرائے اور فرمایا: "تم اس بات پر رنجیدہ ہو کر مَیں اپنے خالقِ حقیقی سے ملنے کیوں جارہا ہوں۔ اپنے ابدی ٹھکانے پہ کیوں لوٹ رہا ہوں۔ کیا یہی تمہاری محبت ہے تمہیں ذرا برابر اس کی خوشی نہیں کہ مَیں اپنے رب کے پاس جارہا ہوں۔"

مُریدوں نے جب یہ واضح بات سُنی تو ہچکیاں روک نہ سکے اور غم سے نڈھال ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ لیکن آپ اُن سب سے بے نیاز کلمۂ توحید کا ورد کرنے لگے اور اپنے خالقِ حقیقی کی طرف پرواز کرگئے۔ یہ بارہ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کی بات ہے۔

مولوی اسمٰعیل شہید

اکبری مسجد کے صحن کی پہلی صف میں کسی وجہ سے فرش کا ایک پتھر نیچے بیٹھ گیا تھا۔ برسات کے موسم میں وہاں پانی بھر جانے سے کیچڑ ہو جاتی تھی۔ تمام نمازی اپنے کپڑوں کو بچانے کی خاطر اس جگہ کو چھوڑ کر کھڑے ہوا کرتے تھے اور اس وجہ سے صف میں خلا رہ جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی اسمٰعیل شہیدؒ خوش پوشاک تھے۔ ایک روز مولوی صاحب عمدہ پوشاک پہنے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ آپ نے صفِ اوّل میں خلا دیکھا تو اسی جگہ کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔

ایک مرتبہ مولوی اسمٰعیل شہیدؒ اپنے ایک دوست مولوی رستم علی کے ساتھ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص نے مولوی اسمٰعیل شہیدؒ کو گالیاں بکنی شروع کردیں۔ اس پر مولوی رستم علی کو بہت غصہ آیا اور وہ تلوار نکال کر اس شخص کو مارنے دوڑے۔ مولانا نے جھپٹ کر مولوی رستم علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا "میاں رستم علی! کیا غضب کرتے ہو۔ وہ گالیاں بیجا نہیں دیتا بلکہ وہ ٹھیک کہتا ہے کہ مولوی اسمٰعیل بڑا بد دین ہے جو نئی نئی باتیں نکالتا ہے، سو اس میں کیا شک ہے میری باتیں اس کے لیے تو واقعی نئی ہیں۔ اس سے قبل، مُلّاؤں نے ان بیچاروں کو دین کی یہ باتیں کہاں سنائی ہیں! پھر اسے نئی کیوں نہ معلوم ہوں اور یہ گالیاں کیوں نہ بکے!"

ملفوظات ہاشمی

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء محفل میں تشریف لا چکے تھے۔ قوالوں نے سُر اور ساز چھیڑ دیئے۔ ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی صدائیں آ رہی تھیں۔ محفل کیف و سرور سے سرشار ہونے کے بعد برخاست ہو گئی۔ فوراً ہی ایک شخص بلند آواز ے پکارنے لگا کہ اس محفل میں شیخ عثمان نام کے کوئی صاحب تشریف فرما ہیں تو وہ فوراً میرے پاس تشریف لائیں تا کہ ان حضرت کو محبوب الٰہی ا خدمت میں پیش کیا جائے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے شیخ عثمان دم بخود رہ گئے۔ اعلان سن کر ان کو اس قدر خوشی ہوئی مگر اس خیال سے سرت معدوم ہونے لگی کہ مبادا یہاں کوئی اور شیخ عثمان بھی نہ ہو جن کو محبوب الٰہی کی قربت کا بلاوا آ رہا ہے جب سہ مرتبہ اعلان کے باوجود ری محفل سے کوئی شخص شیخ عثمان کے نام کی صدا پر نہ اٹھا تو شیخ عثمان اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ اُٹھے اور لبیک کہہ کر ایا کہ میں ہی شیخ عثمان ہوں۔ حضرت محبوب الٰہی کے خادم خاص خواجہ رضی نے کہا کہ حضرت اتنی آواز دینے کے باوجود آپ اپنی جگہ سے نہیں لے۔ اس پر شیخ عثمان نے کہا کہ میں سمجھا تھا کہ شاید اس نام کا کوئی اور آدمی یہاں نہ ہو جو پکارا جا رہا ہو۔ اب جب میں تسلی کر چکا ہوں تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہا ہوں جن کو حضور محبوب الٰہی نے یاد فرمایا ہے۔

خواجہ رضی شیخ عثمان کو لے کر حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے محبوب الٰہی نے فرمایا "شیخ عثمان! ہم تمہارے منتظر تھے اور تیری ا مقصد جاننا چاہتے ہیں"۔ شیخ عثمان نے جواب دیا۔ پیر و مرشد! آپ کی قدم بوسی اور دائمی غلامی مطلوب ہے اس لیے حاضر ہوا ہوں اس پر محبوب ی نے فرمایا تو نے اتنی دیر لگا دی ہمیں انتظار میں مبتلا کیے رکھا۔

حضرت محبوب الٰہی نے اسی وقت شیخ عثمان کو مرید کر لیا۔ شیخ عثمان اپنے مقدر کی یاوری پر اس قدر خوش تھے کہ وہ سوچ بھی نہ سکتے ے کہ خدا ان کو اتنی جلدی اتنے ارفع و اعلےٰ مقام پر پہنچا دے گا۔ واقعی ایسی سعادتیں خدا ہی عطا کرتا ہے، زورِ بازو سے حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے۔ شیخ عثمان جو بعد میں خواجہ حسام الدین کے نام سے مشہور ہوئے دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق سے نسبت رکھتے تھے۔ آپ ے خاندان والوں نے ہندوستان میں رُشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا تو اسی خاندان میں بہت سے رجلِ رشید پیدا ہوئے جن کو فقہ، حدیث وف پر عبور حاصل تھے۔ اسی خاندان میں شیخ عثمان جیسا جلیل القدر فرزند پیدا ہوا۔ آپ ——— ثقہ روایات کے مطابق ۶۳۹ھ ہجری پیدا ہوئے اور تصوف کے میدان میں آفتابی کرنوں کی طرح زمانے بھر پر پھیل گئے آپ نے اس میدان میں بہت تلاشِ حق کی مگر آپ کی

تشنگی کسی طرح بھی دُور نہ ہوئی۔ آپ مسجد میں بیٹھ جاتے کسی مسافر کو دیکھتے تو اس سے اس کے وطن میں بزرگانِ دین کے متعلق پوچھتے۔ ایک دن حسبِ معمول آپ کی مُلاقات ایک تاجر سے ہوئی جس نے آپ کو ہندوستان کے مختلف علاقوں کے متعلق مختلف حالات تبلائے آپ نے اس سے روشنی کے ان میناروں کے متعلق سوال کیا جن سے زمانے بھر میں روشنی پھیلی ہوئی ہے آپ کو جب پتہ چلا کہ دہلی میں غیاث پور نامی جگہ ہے وہاں نامی گرامی بزرگ ہیں جن کا دربار شہنشاہوں سے اعلیٰ اور ارفع ہے بادشاہ ان کے عالی مقام سے حسد کرتے ہیں لیکن ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں رکھتے۔ اس بلند پایہ درویش کو مشیتِ الٰہی کے علاوہ کسی کا ڈر نہیں اور لوگ ان کو خواجہ نظام الدین المعروف محبوب الٰہی کے نام سے جانتے ہیں۔

ان کے مواعظ حسنہ ہزاروں کتابوں پر حاوی نظامی دربار ایک علم کا بحرِ بے پایاں ہے ان کا درس سننے والوں کی گویائی سلب ہو جاتی ہے ہیں زمین پر وہ ظل الٰہی کا پرتو ہیں۔ یہ سننا تھا کہ شیخ عثمان کے دل و دماغ معطر اور مضطرب ہو گئے۔ آپ کو ملتان میں ٹھہرنا محال نظر آنے لگا آپ نے دنوں میں اپنا رختِ سفر باندھا اور دہلی کے لیے عازم سفر ہوئے۔ دہلی پہنچ کر جو پذیرائی اور مقام شیخ عثمان کو نصیب ہوا وہ کسی مقدر والے کو ہی نصیب ہوتا ہے مرید ہوتے ہی آپ کو کعبہ کی زیارت اور حجِ اکبر کی ادائیگی کا حکم ملا۔ آپ بلا چون و چرا حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ نہ سفر تیاری کی۔ نہ زادِ راہ لیا۔ صرف توکل اللہ اور حکم مرشد کا پاس ساتھ تھا۔ یہی وجہ تھی۔ منزلیں خود بخود طے ہوتی گئیں۔ سفر کی صعوبتیں خود بخود دور گئیں۔ آپ نے غلافِ کعبہ تھام کر خدا سے عرض کی میرے مالک! میرے ظاہر و باطن سے تو واقف ہے، میری طلب تو جانتا ہے میں تجھ سے تجھ کو مانگتا ہوں۔ تو میرے لیے جو کچھ بہتر ہے وہ مجھے عطا فرما دے۔ آپ نے مسجد الحرام میں بڑی عبادات اور ریاضت کی۔ اور دل کھول کر دعائیں مانگیں۔ دل پُرسکون ہوا تو آپ نے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا اور دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

ایک دن جمعہ کے روز کیلوکھڑی کی مسجد میں بعد از نماز فجر حضرت محبوب الٰہی آرام فرما رہے تھے کہ شیخ عثمان مکہ سے واپس پہنچے اور اپنے جسم میں خیال کیا کہ حضرت آرام فرما لیں، لہٰذا بعد از نماز جمعہ خدمت میں حاضر ہوں گا اور اس سے پہلے کسی کو نہ ملوں گا اس لیے آپ اپنے جسم مستور کر کے بیٹھ گئے۔

چاشت کی نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہی اٹھے اور خادم مسجد سے کہا کہ مسجد میں شیخ عثمان آ چکے ہیں۔ ان کو فوراً میرے پاس لاؤ۔ خادم مسجد نے ساری مسجد تلاش کی سوائے ایک پردہ پوش کے ساری مسجد خالی تھی۔ آخر وہ ان کے پاس پہنچ کر کہنے لگا۔ اے چادر میں چھپے شخص! تو یقیناً شیخ عثمان ہے کیونکہ حضرت محبوب الٰہی غلط نہیں کہہ سکتے اس لیے تو فوراً انکی خدمت میں حاضر ہو جا۔ یہ سن کر شیخ عثمان اُٹھے اور پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ عثمان کیا طفلانہ حرکت تم نے کی کہ اپنے آپ کو ہم سے چھپا عثمان نے محبوب مبتسم سے عرض کی کہ یا حضرت! میں آپ کو اچانک مل کر حیران کر دینا چاہتا تھا۔ آپ مسکرا دیئے اور خانہ کعبہ میں ریاضت و عبادت اور دیگر حالات کے بعد یہ بھی دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں بھی گئے کہ نہیں! شیخ عثمان کا نفی کا جواب سُن کر حضرت محبوب الٰہی بہت غوش ہوئے اور فرمایا حج کے بعد مدینہ جانا ایک طفیلی عمل ہے اور ایسے عمل سے عشق کی توہین ہوتی ہے عشق کا جذبہ اس بات کا متقاضی ہے کہ حج کے بغیر آقا کے دَر پر حاضری دی جائے حج کے ساتھ مدینہ بھی چلے جانا تو ایک رسم ہے جو عاشقوں کے صدق کے منافی ہے تم آج ہی مدینہ روانہ ہو جاؤ اور رسول مقبول کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ اور میرا سلام عرض کرنا۔ شیخ عثمان نے کیوں اور کیا کہنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ اُدھر حکم ملا اِدھر تعمیل ہو گئی۔ اسی دم آپ مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے کی تکالیف، پریشانیاں اور مشکلات کو آپ بالکل زیرِ خاطر نہ لائے اور اپنی منزل کی طرف گامزن رہے جب مدینہ منورہ پہنچے تو حضورؐ کے روضے پر جا کر دیکھا کہ حضرت محبوب الٰہی بھی وہاں موجود ہیں ان کو دیکھ کر شیخ عثمان نے کہا، پیر و مرشد گواہ رہنا، کہ میں نے حضورؐ کے روضے پر طفیلی حاضری نہیں دی بلکہ میں خصوصی اور اہتمام کے ساتھ مدینہ حاضر ہوا ہوں۔ شیخ عثمان نے ماہ تک مدینہ میں قیام رکھا اور جب دہلی واپس ہونے لگے تو دل بے قرار ہو گیا آنکھیں اشک بار ہو گئیں مگر بادلِ ناخواستہ واپس ہوئے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رونے لگے کہ آقا کے روضے سے واپس آنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ طبیعت اب نہایت آزردہ اور بے قرار ہے حضرت محبوب الٰہی نے آپ کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور اس دن آپ کو حسام الدین کا لقب عطا کیا۔

دن سے آپ کا نام حسام الدین ہی مشہور ہو گیا۔ اور شیخ عثمان معدوم ہو کر رہ گیا۔ حسام الدین اسم با مسمیٰ ثابت ہوئے آپ دین کی تلوار تھے۔ آپ نے اس راہ میں اتنی ترقی اور ریاضت کی جو بہت کم لوگوں کو میسر آئی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وہ مراتب عطا کیے جو صرف وہ اپنے خصوصی بندوں کو بخشتا ہے۔ آپ واقعی شمع مصطفیٰ کے پروانہ تھے۔ آپ کو ولایت، خلافت اور مقام بلند اللہ نے خود بلا کر عطا فرمایا آپ کو اپنے مرشد سے والہانہ لگاؤ تھا حکم کی تعمیل آپ کا نصب العین تھی اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہر معاملہ میں سُرخرو کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت فضیلت دی یقیناً جو لوگ اللہ کے ہو جاتے ہیں اللہ کی ساری چیزیں انکی مطیع و فرمانبردار ہو جاتی ہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔ زمان و مکان میں ماضی اور مستقبل کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور یہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب اللہ مہربان ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ مشہور بزرگ علاؤالدین نیلی چشتی اور مولانا شمس الدین یحییٰ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں شرفِ ملاقات کیلئے حاضر ہوئے اور آپ کے حکم کے مطابق پہلے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر حاضری دی۔ اس کے بعد دیگر دوست حضرات سے ملاقاتیں کیں اور پھر مولانا حسام الدین اپنی کٹیا میں موجود تھے۔ اس کٹیا میں نہ تھ کانے کی بیٹھنے کو جگہ تھی، نہ کھڑکی نہ دروازہ تھا۔ یہ دونوں بزرگ جب اندر داخل ہوئے تو مولانا حسام الدین نے ایک پرانی چٹائی ان کے لیے بچھا دی اور ان کے سامنے کھانے کو کھچڑی پیش کی۔ دونوں مہمان بزرگوں نے مولانا حسام الدین کو ایک چادر دوسرے نے ایک چاندی کا سکہ پیش کیا۔ مولانا حسام الدین نے دونوں چیزیں قبول کرلیں اور جب دونوں مہمان رخصت ہونے لگے تو مولانا حسام الدین نے ان سے کہا میرے درویش بھائیو آئیں آپ دونوں کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کرنا چاہتا۔ لہذا آپ میری طرف سے یہ نذرانے قبول کریں اس پر مولانا حسام الدین نے جس بزرگ نے چادر پیش کی تھی اس کو چاندی کا سکہ دیا۔ اور جس نے چاندی کا سکہ پیش کیا اس کو چادر دے دی۔

مولانا علاوالدین نیلی چشتی اور مولانا شمس الدین یحییٰ جب حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنے سفر کے تمام واقعات سنائے جب مولانا حسام الدین کا ذکر آیا تو حضرت محبوب الٰہی نے بہت دل چسپی سے ذکر سنا اور فرمایا کہ حسام الدین سے ملاقات کا حال تفصیل سے بیان کرو۔ دونوں بزرگ چادر اور چاندی کے سکہ والا قصہ بھی سنانے پر مجبور ہو گئے یہ سننا تھا کہ حضرت محبوب الٰہی آبدیدہ ہو گئے اور فوراً خادم خاص خواجہ رضی کو کچھ چاندی کے سکے، کپڑے اور اپنا جانماز دے کر فرمایا کہ یہ چیزیں ابھی مولانا حسام الدین کو پہنچا دو۔ خواجہ رضی جب یہ اشیاء لے کر مولانا حسام الدین کی خدمت میں پہنچے۔ تو مولانا حسام الدین بہت حیران ہوئے اور فرمایا میں ان چیزوں کے کہاں لائق ہوں۔ خواجہ رضی نے مولانا حسام الدین کے استفسار پر یہ بھی بتلایا کہ جب یہ اشیاء پہنچانے کا حضرت مولانا محبوب الٰہی نے حکم دیا تھا اس وقت مولانا شمس الدین یحییٰ اور علاؤالدین نیلی چشتی حضرت کے پاس تھے۔ مولانا حسام الدین فوراً حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان دونوں صاحبان سے شکوہ کیا کہ آپ نے میرے حالات کی ٹوہ لے کر ان کے پیر و مرشد کو بتایا۔ حضرت نے خود چشم مکاشفہ سے میرے حالات جان لیتے تو یہ اور بات ہوتی آپ کو اس طرح میرے متعلق نہیں بتلانا چاہیے تھا۔ دونوں نے معذرت کے ساتھ عرض کی کہ ہم جب آپ کا ذکر حضرت محبوب الٰہی سے کر رہے تھے تو انہوں نے ہمیں جو وقت آپ کے پاس گذارے ہوئے ہر لمحہ کی تفصیل پوچھی چنانچہ ہم مجبور ہو گئے۔ بہرحال ہم شرمندہ ہیں ہمیں معاف فرمادیں۔ آپ نے ان کو معاف کر دیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے جس دن نصیر الدین چراغ دہلوی اور قطب الدین منور کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس دن حسام الدین گھر میں بیٹھے ریاضت میں مشغول تھے، آپ کو جب پتہ چلا تو آپ نے ان دونوں کی خوش بختی پر رشک کیا اور سوچا کہ میں تو اس در پر عمر بھر پڑا رہوں تو میری خوش نصیبی ہوگی۔ ابھی آپ یہ سوچ رہے تھے کہ آپ کو خواجہ رضی نے بتایا کہ حضرت محبوب الٰہی آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ آپ کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ خواجہ رضی نے دوبارہ حضرت کا حکم دہرایا آپ جب دربار نظامی میں پہنچے تو آپ کو اسی وقت خلافت سے نوازا گیا۔ آپ کو خرقۂ خلافت عطا ہوا اور دنیا کو ترک کر دینے کا حکم ہوا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے مولانا حسام الدین کو زندگی کے اسباق دیئے انکی تربیت کی اور شہزادوں جیسی زندگی بسر کرائی اور ان کی

تھا اور جلدی واپس جانا چاہتا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میری بیٹی کی شادی اور شادی —— دن طے پا چکے ہیں بیٹی میرے ساتھ ہے اول تو کوئی قافلہ پٹن جانے والا ہی نہیں جس کے ہمراہ ہم پٹن جا سکیں۔ دوسرے ہم اتنی جلدی پٹن نہیں پہنچ سکتے کہ شادی کی تاریخ سے پہلے ہم پہنچ جائیں۔ آپ ہماری مشکل حل فرمائیں میں بہت ہی پریشان ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ پٹن سے مولانا حسام الدین اکثر تشریف لاتے رہتے ہیں اگر آج بھی وہ آ گئے تو میں تم دونوں کو شادی کی تاریخ سے بہت پہلے پہنچوا دوں گا اس شخص نے عرض کی کہ ایک شخص کے ساتھ حضرت! میں کیسے جاؤں جب کہ جوان بیٹی کا ساتھ ہے راستہ میں سو خطرات بھی ہوں گے۔ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ تم فکر نہ کرو مولانا حسام الدین کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ وہ شخص خاموش رہا۔ یہ باتیں اس کے فہم و ادراک سے بالا تھیں۔ ظہر کی نماز کے بعد اس کو حضرت محبوب الٰہی نے حکم دیا کہ جا کر اپنی بیٹی کو یہاں لے آؤ۔ مولانا تشریف لا چکے ہیں۔ وہ شخص گیا اور اپنی بیٹی کو لے کر آ گیا۔ حضرت نے مولانا حسام الدین کو فرمایا کہ اس شخص اور اس کی بیٹی کو پٹن لیتے جاؤ۔ مولانا نے عرض کی پیرو مرشد میں تو اپنے حال سے دوسروں کو واقف نہیں کرنا چاہتا تھا مگر آپکی مرضی افشا کرنے کی ہے تو میری کیا مجال! مولانا نے دونوں باپ بیٹی سے کہا کہ گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جب میں کہوں تب گھوڑے کو چلنے کا اشارہ کریں۔ چنانچہ اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے آنکھیں کھول دینے کا حکم دیا تو اس شخص کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کی مسافت سمٹ چکی تھی اور وہ پٹن میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے مولانا سے بات کرنا چاہی اور سپاس ادا کرنا چاہا مگر مولانا وہاں موجود ہی نہ تھے۔ اس نے کسی طرح مولانا کا ٹھکانہ معلوم کر لیا مگر آپ نے اس شخص کو اس واقعہ کا کسی اور سے ذکر کرنے سے سختی سے منع کر دیا اور فرمایا یہ تو حضرت محبوب الٰہی کے روحانی کمالات ہیں اس میں میرا کوئی دخل نہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء اپنے مریدوں کی محفل میں تشریف فرما تھے۔ مولانا حسام الدین جیسے بلند پایہ مرید بھی موجود تھے۔ آپ نے مولانا حسام الدین کی طرف مخاطب کر کے فرمایا کہ دن بھر روزہ رکھنا اور رات بھر عبادت کرنا اتنا آسان کام ہے کہ یہ کام کوئی بیوہ عورت بھی کر سکتی ہے۔ ہاں رسیدگی کے لیے جو عبادت بندگانِ خدا کرتے ہیں اس مقام کی کیا بات ہے آپ نے ایسا کہہ کر سکوت فرما لیا۔ لوگوں نے عرض کی حضرت مزید فرمائیے۔ بات تشنہ رہ گئی۔ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ اس موضوع پر پھر کبھی بات کروں گا۔ جب چھ ماہ گذر گئے تو ایک روز سلطان علاؤ الدین خلجی کا چوبدار محمد کاتب جو کہ آپ کا مرید تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ سلطان کی طرف سے جو کام بھی مجھے سپرد کیا جاتا ہے میں وہ کرتا ہوں آج میں سرائے میں بندگانِ خدا میں ٹنکے تقسیم کر رہا تھا اور فرصت پا کر آپکی خدمت میں آیا ہوں۔ یہ بات سن کر حضرت محبوب الٰہی نے مولانا حسام الدین کو مخاطب کر کے فرمایا۔ انعام سلطان بہتر ہے یا وہ وعدہ جو مجھ سے کیا گیا ہے اس کی ایفاء۔ مولانا حسام الدین نے عرض کی ایفائے عہد۔ اس پر خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا۔ مشغولی سالکین شش چیزوں پر مشتمل ہے۔ خلوت ایسی ہو کہ جملہ حاجات و خواہشات مالک کے کنٹرول میں رہیں ہر وقت باوضو رہا جائے اور نیند کے غلبہ پر فوراً وضو کیا جائے۔ روزہ رکھا جائے اور اپنی عرض کو زبان پر مت لایا جائے۔ ذکر اور خواطر غیر کی نفی کی جائے۔

یہ سن کر مولانا اس خیال سے آبدیدہ ہو گئے کہ شاید میں اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔ اس پر حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ تم اس معیار سے بھی بڑھ چکے ہو۔ مولانا حسام الدین نے عمر بھر ریاضت و عبادت کی اور حضرت محبوب الٰہی سے وہ تلطف حاصل کیا جو اور کسی کو کم ہی ملا ہے آپ کا وصال ۷۳۵ھ میں ہوا اور آپ کا مزار پٹن میں ہے جو آج بھی مرجع الخلوق کا باعث ہے۔

رحیم یار خان کے ریلوے اسٹیشن کی شمال کی طرف چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ مُبارک واقع ہے۔ اس قلعہ کو ایک ہندو راجہ رائے تبس کرور نے اپنی ماں کے نام پر تعمیر کرادیا تھا اور اسی نسبت سے اس قلعہ کا نام "مؤ" مشہور ہے۔ یہاں پر ایک ہندو جوگی رہا کرتا تھا جو اپنے کرشموں اور شعبدوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا تھا۔ جب حمید الدین حاکم بغداد سے یہاں پہنچے تو وہ بڑی کسمپرسی اور عُسرت میں مُبتلا تھے۔ ہندو جوگی اُن کی حالت سے بہت رنجیدہ خاطر ہوا اور اُس نے اپنے دِل میں اُن کی امداد کرنے کے بارے میں سوچا اور چند مٹی اور کانسی کے برتن لے کر اُن کے پاس پہنچا۔ حمید الدین حاکم نے جوگی کو دیکھا اور اُس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ جوگی نے کہا کہ مَیں آپ کو کئی دنوں سے پریشان دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ میرے دِل میں آپ کی مدد کا خیال پیدا ہوا ہے اور مَیں آپ کے افلاس اور تہی دستی کا مداوا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ حمید الدّین حاکم، جوگی کی باتیں سُن کر مُسکرائے اور کہا "پھر امداد کرنے کے لیے تم نے کیا طریقہ سوچا ہے"۔ جوگی ہمراہ لائے ہوئے برتن حمید الدین حاکم کی طرف بڑھا کر بولا۔ فی الحال اِن سے کام چلائیں۔ حمید الدین نے کہا، یہ برتن میرے کس کام کے۔ جوگی بولا۔ مَیں ان کو اپنی کیمیائی نظروں کے اثرات سے سونے میں تبدیل کردوں گا، آپ اِن کو بازار میں فروخت کر کے اپنی گزراوقات چلائیں۔ یہ کہہ کر جوگی نے برتنوں پر اپنی نظریں گاڑ دیں اور یکایک اُن میں چمک پیدا ہوئی اور برتن طلائی شکل اختیار کر گئے۔

جوگی نے متکبرانہ شان سے مُسکرا کر برتنوں کی طرف دیکھا اور بولا "اب ان کی قیمت سے اپنا کام چلاؤ اور ان کے صرف ہو جانے پر مجھے اطلاع کر دینا۔ مجھے تم مدد کے لیے موجود پاؤ گے"۔ حمید الدّین حاکم نے برتنوں کو اُٹھا کر دریا بُرد کر دیا اور فرمایا۔ "ہم درویش منش لوگوں کو اِن سونے چاندی کے جھمیلوں سے کیا غرض۔" جوگی نے مضطرب ہو کر حمید الدّین کو دیکھا اور سخت غصّے سے بولا۔ "تم نے میری ہمدردی کا تمسخر اُڑایا ہے۔ اگر تمہیں میری پیشکش سے اختلاف تھا تو تم میرے دیئے ہوئے برتن واپس کر دیتے۔ اُن کو اس طرح دریا بُرد کرنے کا تمہیں کیا حق تھا۔ تم میرے برتن مجھے واپس کرو۔ مَیں اپنی ریاضت و محنت کو یوں مٹی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا"۔ حمید الدّین حاکم نے کہا کہ تمہارا حوصلہ اتنا پست ہے۔ دریا بُرد کردہ برتن تمہیں کیسے واپس مل سکتے ہیں؟ اور پھر دی ہوئی چیز واپس لینا کوئی اچھی بات ہے"؟ جوگی نے کہا مَیں کچھ نہیں جانتا میرے برتن واپس کرو یا اُس کے بدلے اُس کا

ہم وزن سونا واپس کرو۔ حاکم نے کہا ہم تمہیں اتنا سونا واپس کر دیں گے لیکن جوگی مُصر ہوا کہ مَیں ابھی حساب چُکاؤں گا۔ تمہارے جیسے خانہ بدوش کا کیا پتہ کل ملے یا نہ ملے۔ حمید الدّین کو جوگی کی بے مروتی اور بے اعتباری پر بہت قلق ہوا۔ اُنہوں نے جوش کے ساتھ دریا میں ہاتھ ڈالا کر اُس کو حکم دیا کہ اسے دریا! سونے اور موتی کی حقیر مقدار اپنے کنارے پر پہنچا کر اُس جوگی کی آتشِ طمع کو ٹھنڈا کر۔ یکایک ایک طلاطم پیدا ہوا۔ سمندری لہروں کی طرح دریا میں امواج پیدا ہوئیں اور آناً فاناً کنارے پر سونے اور موتیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جوگی حواس باختہ ہو گیا اور آپ سے پُوچھنے لگا۔ شری مان جی! یہ آپ نے کیا کیا؟ اور کس طرح کیا؟ حاکم بولے جو مَیں نے کیا وہ تمہارے فہم و ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ وہ آپ کے قدموں میں گر کر معذرت گزار ہوا اور ہندو جوگ کو ترک کر کے مسلمان ہو گیا۔ پھر اس کا نام زین الدّین رکھا گیا۔ آج بھی سینکڑوں برس بعد حمید الدّین حاکم کے مزار کی مجاوری کے فرائض اُسی نومُسلم زین الدّین کی اولاد انجام دے رہی ہے۔

❖❖❖

حمید الدین حاکم کا تعلّق بنو ہاشم قریشی خاندان سے تھا۔ آپ کے جدِ امجد بنو اُمیّہ کے مظالم سے تنگ آکر یوسف قریشی ہاشمی کی قیادت میں نقل مکانی کر کے بغداد کے نواح جبلِ ہنکار میں پہنچے اور یہاں سے سندھ، سیستان اور کیچ مکران تک چلے آئے۔ کیچ مکران کے باسی اپنے حکمرانوں سے بہت نالاں تھے۔ اُنھوں نے جب آلِ رسولؐ کی آمد کی خبر سُنی تو بغاوت کر کے مقامی حکمرانوں کو دربدر کر دیا اور حکومت آلِ رسولؐ کے نوواردان کے سپرد کر دی۔ اسی آلِ رسولؐ کی پانچویں نسل میں شہزادہ بہاء الدّین تھے جن کی شادی لاہور کے مشہور بزرگ سیّد احمد توختہ کی صاحبزادی حاج بی بی سے انجام پائی تھی۔ بہاء الدین کے تین بیٹے، جمال الدّین، ضیاء الدّین اور حمید الدّین تھے۔ بہاء الدّین اپنے خاندان کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک دن اُن کو سرزمینِ حجاز کی یاد نے ستایا وہ حکومت اور اپنے چھوٹے بیٹے حمید الدّین کو مکران میں اپنے بھائی شہاب الدین الوالبقاء کے سپرد کر کے مکّہ تشریف لے گئے۔ حج کی ادائیگی اور مدینہ کی حاضری کے بعد وہ مکّہ کے اُن علاقوں کی سیر کر رہے تھے جہاں آنحضرتؐ نے زندگی بسر کی تھی۔ اسی سیر کے دوران اُن کا انتقال ہو گیا۔ یوُں وہ اور اُن کے دونوں لڑکے عرب میں ہی رہ گئے۔

کیچ مکران کی حکومت شہاب الدّین الوالبقاء کے بعد حمید الدّین کو منتقل ہو گئی۔ حمید الدّین نے اپنی حکومت کے قیام کے بعد جن چیزوں کو اوّلیت اور فوقیت دی وہ عدل و انصاف تھا۔ اس وجہ سے لوگ حمید الدین کا بہت احترام کیا کرتے تھے مگر بدقسمتی سے رفتہ رفتہ حکومت کا نشہ حمید الدین کے سر پر سوار ہو گیا اور اُن میں شدّت سے احساسِ برتری پیدا ہو گیا۔ اکیس سال حکومت کرنے کے بعد حمید الدّین نہایت مطلق العنان حکمران بن چکے تھے۔

ایک روز حمید الدّین اقتدار و طاقت کے نشہ میں چُور اپنے محل میں استراحت کے لیے داخل ہوئے اور اپنے پلنگ پر ایک نوجوان کنیز کو نہایت مزے سے گہری نیند سوئے ہوئے پایا۔ بس اس بات نے حمید الدّین کو مضطرب کر دیا۔ فوراً مسلح پہریدار عورتوں کو طلب کیا گیا اور حکم دیا کہ اس گستاخ کنیز کو اُٹھایا جائے اور اتنی دیر تک کوڑے لگائے جائیں جب تک حکمِ ثانی نہ ملے۔ کوڑا زنی مسلسل ہوتی رہی۔ کنیز کے کپڑے مسک چکے تھے خون بہہ رہا تھا مگر لب جامد خاموش تھے اور اُن پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ یہ دیکھ کر حمید الدین کو اور زیادہ طیش آیا اور کوڑہ زنی بند کر کے کنیز سے پُوچھا کیا تمہیں کوڑہ زنی سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تُو اس طرح مُسکرا رہی ہے۔ کنیز بولی، جہاں تک تکلیف کا تعلّق ہے وہ میرے خون آلود اور مسکے ہوئے لباس سے عیاں ہے اور یہ مُسکراہٹ، وہ اس لیے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ چند گھڑیاں اس آرام دہ بستر پر سونے کی اتنی کڑی سزا ملی ہے تو ساری عُمر اس بستر پر گھنٹوں سونے والے کا کیا حشر ہو گا۔

یہ سُن کر حمید الدین کے اوسان خطا ہو گئے۔ مسلح عورتوں کو رُخصت کر کے کنیز سے دریافت کیا کہ تُو کون ہے اور اتنی جامع بات تُو نے کس طرح کہہ دی۔ کنیز نے عرض کی کہ آپ پریشان نہ ہوں، اتنی سخت سزا برداشت کرنے کے لیے اللہ نے میرے اندر یہ عارفہ

جواز پیدا کر دیا جس سے اتنی ہمت اور قوتِ برداشت میرے اندر پیدا ہوگئی۔ یہ معجزہ ہے یا کرامت، میرے مُنہ سے ایسی بات نکل گئی جو میرے باہمت ہونے کی بنیاد تھی۔ حمید الدین نے اسی وقت کنیز کو تو آزاد کر دیا اور خود اس مسہری پر اُس دن کے بعد نہیں سوئے۔

ابھی اس واقعہ کے اثرات حمید الدین کے ذہن سے معدوم بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک روز وہ اکیلے ہی شکار کے لیے نکل کھڑے ہوئے خادم حیران تھے مگر پُوچھنے کی کسی کو مجال نہ تھی۔ حمید الدین گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے جنگل میں نکل گئے۔ اُن کو ایک ہرن کا پیارا سا بچہ نظر آیا جو اُن کو دیکھ کر سرپٹ بھاگنے لگا آپ نے اس کا تعاقب کیا اور مسلسل گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے ایک قبرستان میں پہنچ گئے۔ ہرن کے بچے نے جب جان بچنے کی کوئی صورت نہ دیکھی تو ایک قبر میں گھس گیا۔ حمید الدین نے گھوڑے کو قبر کے نزدیک روکا، قبر کھُلی تھی اندر سے مُردہ صاف نظر آرہا تھا اور ایک بچھو بار بار اُس تازہ مُردے کے مُنہ پر رینگ رہا تھا اور ڈس رہا تھا حمید الدین کو تو ہرن کی تلاش تھی مگر وہ تو قبر میں داخل ہوتے ہی غائب ہو گیا تھا اب اُن کی توجہ اُس بچھو کی طرف مبذول ہوگئی۔ انھوں نے کئی مرتبہ بچھو کو مُردے کے چہرے سے ہٹایا مگر وہ پھر اپنی ڈیوٹی پر آجاتا۔ تنگ آکر حمید الدین نے بچھو کو کسی طرح پکڑ کر قریب ندی میں ڈال دیا۔ مگر چند لمحوں میں ہی اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ندی میں سے ایک سانپ نکلا اُس نے بچھو کو اپنی پیٹھ پر بٹھایا اور قبر کی طرف لے کر آگیا اب بچھو کے ساتھ سانپ بھی میّت کو ڈس رہا تھا۔ اس واقعہ نے حمید الدین کو حیران و پریشان کر کے رکھ دیا۔ وہ قبرستان سے ملحق گاؤں میں گئے اور وہاں نمبردار سے اُس تازہ میّت کے متعلق سوال کیا۔ نمبردار حمید الدین سے ناواقف تھا اور اُن کو ایک عام آدمی سمجھ کر یہ بتایا کہ تازہ مُردہ ایک بڑا زمیندار تھا اُس کے ظلم و آمریت سے لوگ بڑے پریشان تھے اور یہ نتیجہ لوگوں کی آہوں کا ہے کیونکہ اُس نے لوگوں کے بہت دِل دُکھائے تھے۔

اگر ایک زمیندار کا اتنا بھیانک انجام ہوسکتا ہے تو کیچ مکران کے حکمران کا کیا حشر ہوگا۔ اب حمید الدین اُس نمبردار کو کیا بتاتے کہ کیچ مکران کا حکمران تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ بس ان دو واقعات نے حمید الدین کی کایا ہی پلٹ دی۔ انھوں نے ابراہیم بن ادھمؒ کی طرح تخت و تاج سے کنارہ کیا اور بیوی سے کہا کہ میری رفاقت عزیز ہے تو سب کچھ ترک کردو اور میرے ساتھ چل پڑو۔ وفادار بیوی بلا تامل آپ کے ساتھ چل پڑی اور تن کے تین کپڑوں کے سوا سب کچھ محل میں چھوڑ کر دونوں میاں بیوی، سیّد احمد توختہ کے پاس جانے کے لیے روانہ ہوگئے۔ راستے میں حمید الدین کی بیوی اچانک پے در پے قے کرنے لگ گئی۔ وہ اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے اور بیوی سے پُوچھا کہ اے نیک بخت کیا تو اپنے ساتھ بھولے سے کوئی قیمتی چیز تو نہیں لائی۔ بیوی نے جواب دیا بظاہر تو مَیں گھر سے خالی ہاتھ چلی ہوں مگر پھر بھی تسلّی کر لیتی ہوں مبادا کوئی چیز لاعلمی میں ساتھ نہ آگئی ہو چنانچہ سامان کی پڑتال کے بعد ایک قیمتی تسبیح سامان سے نکلی جس کو فوراً کسی درویش کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں دونوں میاں بیوی طویل سفر کر کے لاہور سیّد احمد توختہ کی خدمت میں پہنچے۔ نانا بہت حیران ہوئے۔ حمید الدین سے سوال کیا، ایسے حال میں کس طرح آنے ہوا؟ جواباً حمید الدین نے عرض کی، نانا! ہم نے درویشی اختیار کر لی ہے اور آپ سے اس طویل سفر میں راہ نمائی کے طالب ہیں۔

سیّد احمد توختہ بہت حیران ہوئے پھر اُن کو اس کٹھن راہ کے متعلق بتلایا کہ تمہیں قدم قدم پر علائق دُنیا بہکائیں گے۔ حمید الدین نے عرض کی نانا جان مَیں ہر چیز کو ثابت قدمی سے برداشت کروں گا۔ یہ سُن کر سیّد احمد توختہ نے اپنے نواسے اور اس کی بیوی کی تربیت شروع کر دی۔ ان کی ریاضت و عبادت کی نگرانی کرنے لگے۔ سوزشِ سینہ نے حمید الدین کا کھانا پینا اور سونا جاگنا حرام کر دیا تھا مگر راہِ سلوک کی لگن اُن کو قدم بہ قدم آگے لے جا رہی تھی۔

ایک روز نانا نے حمید الدین کو حکم دیا کہ لاہور کے شمالی سرے پر جاؤ، وہاں تمہیں ایک درویش نظر آئے گا تم اُس سے پانی کا پیالہ طلب کرنا۔ پانی لانے پر تم پیالہ توڑ دینا۔ پھر اُس کو پانی لانے کا حکم دینا جب وہ پانی لائے تم پھر پیالہ توڑ دینا۔ غرضیکہ یہ عمل اُس وقت بار بار کرتے رہنا جب تک اُس درویش کے تمام پیالے ٹوٹ نہ جائیں اور وہ خود عرض نہ کرے کہ اب وہ پانی پیش کرنے سے قاصر ہے

اور پھر عذر داری کی صورت میں تم اُسے خوب زدوکوب کرنا اور واپس چلے آنا۔

حمید الدین نے اپنے نانا سید احمد توختہ کے حکم کی تعمیل کی اور بتائی ہوئی جگہ پر گئے درویش کو ملے۔ پانی لانے اور پیالے توڑنے کا عمل تب تک کرتے رہے جب تک درویش نے عذر داری نہ پیش کی۔ عذر داری کی صورت میں درویش کی خوب پٹائی کی۔ جب اچھی طرح پٹائی کر چکے تو درویش نے آگے بڑھ کر آپ کے ہاتھ دبانے اور سہلانے شروع کر دیئے اور عرض کیا کہ ہماری ہڈیاں آپ کو مارتے وقت تکلیف پہنچاتی رہی ہیں چنانچہ آپ کے تھکے ہاتھوں کو دبانا اور سہلانا میرا فرض ہے۔ آپ واپس چلے آئے اور نانا کو سارا واقعہ سنایا۔ سید احمد توختہ نے انھیں بتلایا کہ تمہیں تسلیم و رضا کا سبق دینے کیلئے یہ واقعہ رونما کرایا گیا ہے تاکہ تم اندازہ کر سکو کہ تسلیم و رضا کے راستے کس قدر دشوار گزار ہیں

❖

حمید الدین نے لاہور پہنچ کر شاعری شروع کر دی اور کیونکہ کیچ مکران کے حکمران بھی رہ چکے تھے لہذا آپ نے تخلص حاکم ہی رکھ لیا اور آپ کے نانا بھی آپ کو اسی نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ جب آپ کے نانا سید احمد توختہ کے وصال کا وقت قریب آ پہنچا تو اُنھوں نے آپ کو وصیت کی کہ سلوک کی وہ راہ جس پر میں تمہیں نہیں پہنچا سکا وہاں تمہیں سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ پہنچا جائیں گے لہذا تم سہروردیہ سلسلہ کے بزرگان دین کی صحبت میں جاؤ اور اپنی ادھوری تربیت و تعلیم کو مکمل کرو۔ یہ سُنکر حاکم کو بہت دکھ ہوا کہ نانا کی رفاقت سے محرومی ہو رہی ہے مگر حکم کی اُنھوں نے فوراً تعمیل کی اور بغداد روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضری دی۔ جب آپ حضرت کے دروازے پر پہنچے تو اندر جانے سے قبل ہی آپ پر مستی کا غلبہ طاری ہو گیا آپ بے خود ہو گئے اور تین دن دروازے پر ہی پڑے رہے۔ رات کو شہاب الدین سہروردیؒ کو خواب میں حضرت نے حکم دیا کہ میرا بیٹا تمہارے دروازے پر تین دن سے پڑا ہے اور استغراق کے غلبہ کی وجہ سے وہ ملاقات نہیں کر سکا۔ آپ خود اُس کو ملیں اور اُس کو اُس کی منزل کی نشان دہی کر کے دیں۔ شہاب الدین سہروردی بیداری کے بعد حمید الدین حاکم کے پاس پہنچے اور ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ فرمایا کہ ملاقات سے پہلے ہی یہ سکر و مستی آپ نے اپنے آپ پر طاری کر لی اور آمد کی خبر بھی نہ کی۔ حاکم فوراً ہوش میں آ گئے اور ادب سے سر جھکا لیا اور گزارش کی کہ میں نے ابراہیم بن ادھم کی طرح تخت و تاج کو تیاگ دیا ہے اور اپنے نانا سید احمد توختہ کے حکم سے سلوک کے مراتب کے حصول کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں میری راہ نمائی فرمائیے۔

حضرت شہاب الدین سہروردی نے حاکم کو غور سے دیکھا اور مراقبے میں چلے گئے اور بعد از مراقبہ فرمایا کہ تمہاری تربیت جس ہستی نے کرنی ہے وہ ابھی عالم وجود میں نہیں آئی۔ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے پوتے جو ابھی اس دُنیا میں تشریف نہیں لائے وہ تمہارے مرشد ہوں گے۔ لہذا تمہیں اُن کی آمد تک ان کا انتظار کرنا ہو گا۔ لہذا تم ملتان کے قریب چلے جاؤ، تمہارے مرشد ظہور فرمانے والے ہیں تم اُن کا انتظار کرو۔

حاکم حضرت سہروردیؒ سے رخصت ہوئے اور مرشد کے انتظار میں اپنا وقت ریاضت و عبادت میں گزارنا شروع کر دیا۔

❖

لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ آپ کیچ مکران کے سابق حکمران ہیں۔ آپ کے خاندان کے دیگر لوگ بھی ہجرت کر کے آپ کے پاس پہنچ گئے۔ لوگ دن رات آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ عقیدت مندوں نے کئی گاؤں اور زمینیں آپ کے نام وقف کر دیں۔ آپ اُن زمینوں کی آمدن سے حاجت مندوں کی دستگیری فرماتے۔ آپ کی زمینوں کے ساتھ کچھ اراضی حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے کسی مُرید کی بھی تھی اُس کو آپ کے خدام سے کوئی تکلیف پہنچی اُس نے حضرت بہاؤ الدین سے شکایت کر کے آپ کے نام ایک خط لکھوایا جس میں حضرت بہاؤ الدین زکریا نے فرمایا کہ زمینوں کی خاطر دلوں کو آزردہ کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ حمید الدین حاکم خط پڑھ کر سکتے میں آ گئے اور جواباً تحریر کیا کہ حضور یہ ناچیز آپ کی خاک پا سے بھی کم تر ہے، اللہ سے بے خبر تھے ہمارا وعدہ ہے

کہ آئندہ آپ کو اور آپ کے مُریدوں کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔
حضرت بہاؤالدین زکریا اس جواب سے اس قدر خوش ہوئے کہ اُنھوں نے حمیدالدین حاکم کو فوراً اپنے پاس بُلایا جب حا
ملتان پہنچے تو اُن کی بہت پذیرائی کی گئی اور حضرت بہاؤالدین زکریا سے آپ نے اس قدر لطف فرمایا کہ اپنی بیٹی بی بی فاطمہ کی شا
حمیدالدین حاکم سے کر دی۔ آپ کو بہاؤالدین زکریا کے مُریدوں نے حضرت کی بیعت کی بھی پیش کش کی مگر آپ نے معذرت کر
ہوئے عرض کی ہم تو حضرت کے پوتے رُکن الدین کے منتظر ہیں۔ کچھ روز قیام کے بعد حمیدالدین اپنی اہلیہ کو لے کر واپس مؤ پہنچ گئے۔

ایک روز حمیدالدین حاکم کا ایک مُرید جو روزانہ دریا کے پار سے اُن کے لیے دودھ لایا کرتا تھا، کنارے پر حسبِ معمول آیا
کوئی کشتی نہ ملی۔ بہت انتظار کیا اور کشتی سے جب مایوس ہوگیا تو غیر حاضری کے خیال سے دودھ کا برتن کندھے پر رکھ کر دریا
داخل ہوگیا۔ دریا کے درمیان پہنچ کر وہ گرداب میں پھنس گیا اور بچنے کی اُمید کھو بیٹھا۔ اسی اثنا میں اُس کو گردن سے پکڑ کر کسی
طاقت نے کنارے پر ڈال دیا۔ وہ دودھ لے کر حمیدالدین حاکم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ سنایا۔ حمیدالدین نے اُس کو ا
گیلی آستین دکھائی اور کہا کہ ہمیں اپنے مُریدوں کا بہت خیال رہتا ہے، تم ڈوب رہے تھے ہم نے تمہیں پانی سے نجات دلائی۔ مُر
سمجھ گیا کہ دریا میں بچانے والا غیبی ہاتھ حمیدالدین حاکم کا ہی تھا۔
آپ کی بیوی کو آپ کے ساتھ کئی کئی روز فاقہ کرنا پڑتا مگر وہ نیک بخت حرفِ شکایت کبھی لب پر نہ لاتی تھیں۔ ایک
اُن کی حالت فاقے سے غیر ہونے لگی۔ تو حاکم سے نہ رہا گیا اُنھوں نے اپنے مصلّے کے نیچے سے ایک بیش قیمت موتی نکالا اور بیو
کہا اُس کو فروخت کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھالو۔ بیوی مطمئن ہوگئی۔ اسی طمانیت میں اُس کو نیند آگئی۔ عالمِ رویا میں اُس نے
کہ وہ جنّت میں داخل ہوگئی ہے اور وہاں اُس نے ایک ایسا محل دیکھا جس کا ایک کنگرا غائب تھا اُس نے کسی سے پوچھا کہ یہ
کا محل ہے۔ جواب ملا حمیدالدین حاکم کا۔ پھر بیوی نے کنگرا کے غائب ہونے کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ اس جگہ کا مروارید اُنھوں
دُنیا میں طلب کر لیا ہے لہٰذا اُس کی جگہ خالی ہوگئی ہے۔ بیوی کی آنکھ فوراً کھل گئی اور اُنھوں نے موتی حضرت حمیدالدین حاکم
واپس کر دیا اور عرض کی کہ فاقوں سے مرجانا بہتر ہے۔ آپ اس موتی کو اس کے مقام تک پہنچا دیں۔ حاکم نے موتی کو اُسی مقا
پہنچا دیا اور بیوی کے ایثار پر مسرور ہوگئے۔
ایک مرتبہ حمیدالدین حاکم کی خدمت میں غیاث الدین تغلق کے وزیر ملاقات کے لیے آئے اور آپ کو کپڑوں میں پیوند لگ
ہوئے دیکھا۔ اُن کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان بزرگ کو خدا نے ٹھکانے کا لباس بھی نہیں دیا۔ یہ خیال دل میں آتا تھا کہ
ان کے مصاحبین کے منہ ٹیڑھے ہوگئے۔ اسی صورت حال سے گھبرا کر وزیر اور اُن کے ساتھیوں نے آپ سے معافی مانگی اور اپنی
سوچ پر نادم و شرمندہ ہوئے۔ اس پر حاکم نے فرمایا جب ہمارے آقا کالی کملی والے اپنا کام خود کرتے تھے تو ان کی اتباع کر
میں ہمیں کیوں تامل کرنا چاہیے۔ آپ نے اُن کے مُنہ سیدھے کر دیئے اور معاف کر دیا۔

آپ کی اہلیہ محترمہ ایک مرتبہ ملتان گئیں۔ آپ رات کو ایک بوریہ پر سوئی تھیں جب کہ آپ کے لیے بیش قیمت بستر
ان کے بھائی صدرالدین نے اُن سے کہا کہ بستر چھوڑ کر زمین پر بوسیدہ بوریے پر کیوں سو رہی ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا
طرح سونے کی مَیں عادی ہو چکی ہوں۔ کیونکہ میرے میاں ساری رات چار رکعتوں میں بتا دیتے ہیں اور ان ہی چار رکعتوں
قرآن مجید ختم کر لیتے ہیں اور بہت کم آرام کرتے ہیں۔ ایک دن اُن کے سر کے نیچے مَیں نے سرہانہ رکھ دیا۔ اُنھوں نے ا
ہٹا دیا اور فرمایا کہ مجھ کو آرام و تلذذ کی طرف مائل نہ کرو۔ اسی دن سے مَیں نے خود بھی آرام کی نیند ترک کر دی ہے کیونکہ حمید
نام کے حاکم ہی نہیں اُنھوں نے زہد و ریاضت اور نفس کے تزکیہ پر بھی حکمرانی کر رکھی ہے۔

آپ نے اپنے پیر کی آمد کی انتظار کی شدت کو کم کرنے کے لیے سوچا کہ کیوں نہ حج کیا جائے چنانچہ آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔
استے میں طوفان آگیا۔ جہاز کے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی طے یہ پایا کہ کسی ایک آدمی کو سمندر کی نظر کر دیا جائے تاکہ صدقہ کی ادائیگی
سے باقی جہاز کے مسافروں کی جان بچ جائے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ حمید الدین حاکم نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ جب سمندر سے
باہر نکلے تو اپنے آپ کو ایک ایسے جزیرے میں پایا جہاں دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آپ نے ایک طرف چلنا
شروع کر دیا اور ایک سبزہ زار میں پہنچ گئے جہاں آپ کو ہر طرف انسانی ہڈیوں اور ڈھانچوں کے ڈھیر نظر آئے۔ آپ سارا دن ان
ڈھانچوں کے متعلق سوچتے رہے جن کے یہ ڈھیر پڑے تھے اور اسی سوچ میں ڈوبے ڈوبے شام ہو گئی۔ رات کا آغاز ہو چکا تھا چاند سفینہ
درخ پر چل رہا تھا۔ دفعتاً حاکم نے محسوس کیا کہ آپ کے پاس کسی اور کا بھی وجود ہے۔ مڑ کر دیکھا تو ایک حسین و جمیل عورت آپ کے
پہلو میں بیٹھی ہے اور آپ سے کہنے لگی۔ میں اِن مُردوں کی ساتھی ہوں یہ سب مجھ کو چھوڑ گئے ہیں اور اپنی ہوس کا شکار ہو گئے ہیں۔
عورت نے حاکم کو کہا یہاں رُک جاؤ اور میرے قریب آؤ اس ویرانے کو ہم نئی نسل سے آباد کریں گے۔ آپ نے سکوت فرمایا اور عبادت
میں مشغول ہو گئے۔ وہ عورت آپ کے قریب تر ہونے لگی اور آپ کو گناہ پر آمادہ کرنے لگی آپ نے سکوت بحال رکھا اس پر بھی وہ باز
نہ آئی اور آپ کی آغوش میں گرنے کی کوشش کرنے لگی۔ آپ نے اُس کو کہا۔ دیکھو! اگر تم مجھ سے عُمر میں بڑی ہو تو میری ماں کے
برابر ہو، اگر ہم عُمر ہو تو بہن کا درجہ رکھتی ہو اور اگر چھوٹی ہو تو بیٹی کی مانند ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔
یہ کہہ کر آپ نے سر جھکا لیا اور جب آپ نے سر اُٹھایا تو وہ عورت غائب ہو چکی تھی۔ اس وقت ہاتفِ غیبی نے کہا کہ حاکم تم امتحان میں
کامیاب ہو گئے۔ یہ عورت اِن سب مُردوں کی شکاری تھی۔ تُو نے اس کو ٹھکرا کر ثابت کر دیا کہ دُنیا کی تمہارے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔
آپ اُسی وقت سجدہ میں گر گئے اور گڑگڑا کر خدا کا شکر بجا لائے جس نے اس کٹھن امتحان سے نجات دی۔ اگلے روز آپ کو حج کے
لیے جہاز مل گیا آپ نے سرزمینِ حجاز میں پہنچ کر کعبہ کا طواف کیا۔ حج کیا۔ خدا سے جی بھر کر دعائیں مانگیں اور واپس لوٹے۔
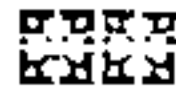
آپ نے عُمر کا بیشتر حصّہ اپنے پیر و مرشد کی آمد کے انتظار میں بسر کر دیا اور ایک نوعُمر شخص کی مُریدی حاصل کی حالانکہ جس وقت
آپ مُرید ہوئے اس وقت آپ عُمر رسیدہ ہو چکے تھے جب کہ خواجہ رُکن الدین نوجوان تھے۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا کے وصال کے بعد
ان کے صاحبزادے شیخ علم الدین سجادہ نشینی کے متمنی تھے اور ان کو یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ شیخ رُکن الدین اپنی کرامات اور
روحانیت کے زور پر سجادہ نشین بن جائیں گے۔ چچا نے اپنے آپ بھتیجے پر فوقیت دی اور سلطان غیاث الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر
سجادہ نشین کی نامزدگی کی درخواست کی۔ انہی دنوں شیخ رُکن الدین بھی دہلی آئے ہوئے تھے۔ آپ کی کرامات نے بادشاہ کو آپ کا قائل و
شیدا بنا دیا۔

شیخ علم الدین نے بادشاہ کو کہا کہ میں علم و فضل میں اپنے بھتیجے رکن الدین سے زیادہ فضیلت رکھتا ہوں اور بابا بہاؤ الدین زکریا
ملتانی کا بیٹا ہوں اور سجادہ نشین بننے کا میرا حق ہے۔ بادشاہ نے شیخ علم الدین کے اصرار پر شیخ رکن الدین کو طلب کیا تاکہ دونوں کے علم
کا مقابلہ کرایا جائے۔ شیخ رکن الدین، حمید الدین حاکم کے ہمراہ بادشاہ کے دربار میں پہنچے۔ شیخ علم الدین نے رُکن الدین سے سوال کیا
وضو کے درمیان ہاتھ دھونا۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا سُنت ہے اور مُنہ دھونا فرض ہے۔ فرض پر سُنتوں کو مقدم کر دینے کا کیا
سبب ہے؟

شیخ رکن الدین کی طرف سے حمید الدین حاکم نے جواب دیا کہ سنّت کی تقدیم رنگ و ذائقہ معلوم کرنے کی وجہ سے کیونکہ ہاتھ
دھونے سے پانی کی رنگت۔ کلی کرنے پانی کا ذائقہ اور ناک میں پانی ڈال لینے سے پانی کی بُو کا پتہ چل جاتا ہے
اور بُو کے متعلق اطمینان کر لیا جاتا ہے تب پانی کو مُنہ پر ڈالا جاتا ہے اور فرض پر سُنتیں اسی لیے مقدم قرار دی

اس جواب پر شیخ علم الدّین کو اعتراض ہوا کہ جواب شیخ رکن الدّین کی بجائے حمید الدّین حاکم نے دیا ہے جو کہ عالم انسان ہیں۔ اس پر شیخ رکن الدّین نے فرمایا کہ ایک جاہل غلام لایا جائے وہ ہماری طرف سے چچا علم الدّین کے سوالوں کے جواب دے گا۔ بادشاہ نے جاہل غلام منگوایا۔ غلام کے منہ میں مرشد کے حکم پر حمید الدّین حاکم نے اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔ پھر شیخ علم الدّین کے ہر مشکل سوال کا جواب جاہل غلام نے دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ سجادہ نشین رکن الدّین کو بنایا جائے مگر رکن الدّین اپنے چچا علم الدّین کے حق میں دستبردار ہو گئے اور بادشاہ نے شیخ علم الدّین کو بابا بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کا سجادہ نشین نامزد کر دیا۔ ملتان روانگی سے قبل شیخ رکن الدّین نے اپنے چچا علم الدین سے کہا کہ خانقاہ میں کسی کو درس نہ دینا اور کبوتروں کو روضے سے نہ نکالنا۔ شیخ علم الدّین خاموش رہے اور ملتان پہنچ کر انھوں نے اس پر وہ عمل کیا جس سے شیخ رکن الدّین کی دل آزاری ہوتی تھی۔ خانقاہ میں درس کے شروع ہوتے ہی کبوتروں کو بھی نکال دیا گیا۔ گوشہ نشیں فقراء کو ستایا گیا۔ ان فقراء میں شیخ حاکم تھے جن پر ہر وقت سکر و مستی طاری رہتی تھی۔ ان کو نماز میں شرکت سے بھی روکا جاتا رہا۔ انھوں نے ایک دن تنگ آ کر کہا کہ عشق کے جلے ہوؤں کو مت جلاؤ“ اس فقرے میں جانے کیا اثر تھا جس نے شیخ علم الدّین کو ایسی سوزش میں مبتلا کر دیا کہ ہفتہ کے اندر اندر وہ وفات پا گئے۔

❋❋❋

حمید الدّین حاکم نے ایک سو ساٹھ سال عمر پائی۔ بڑی بڑی کرامات اُن سے منسوب ہوئیں۔ لوگوں کی مشکلات حل کیں۔ آپ کی خدمت میں جو بھی آیا سرخرو اور کامران ہوا۔ آپ نے سلطان العارفین کا خطاب پایا۔ یہ مرتبہ واقعی کچھ کھونے سے حاصل ہوتا ہے، پانے سے حاصل نہیں ہوا کرتا۔

ایک دفعہ ملتان میں کفّار نے مسلمانوں پر حملہ کر کے لوٹ مار اور قتل و غارت کا ارادہ کیا۔ حضرت حمید الدّین حاکم کو جب اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ سے آگاہ کیا تو انھوں نے دریا میں اپنی چھاگل ڈالی اور نکال لی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دریا میں پانی بتدریج کم ہونے لگا، حتیٰ کہ دریا بالکل سوکھ گیا۔ مسلمانوں کو جب کفّار کی حرکت کا علم ہوا انھوں نے کافروں پر حملہ کر دیا۔ کافر پیاسے کہاں تک لڑتے۔ ان کو بہت بُری طرح شکست ہوئی لیکن پیاس نے مسلمانوں کو بھی بے حال کر دیا۔ وہ دریا کی خشک حالت کے لیے کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں از خود کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ بابا بہاؤ الدین زکریا کے پاس جائیں چنانچہ مسلمان بابا جی کے پاس گئے اور عرض کی کہ حضور یہ مسئلہ حل فرمائیں۔ آپ نے سکوت فرمایا اور کہا کہ بابا حمید الدّین حاکم کو یہاں لانے کی زحمت دیں۔ لوگ تھوڑی ہی دیر میں بابا حمید الدّین کو لائے۔ آپ سے انھوں نے کہا کہ حاکم تم نے سارا دریا اپنے کوزے میں بند کر دیا ہے مخلوقِ خدا پیاسی مر رہی ہے اب آپ کا ارادہ کیا ہے۔ انھوں نے عرض کی حضرت میں نے پانی بندی تو کفّار پر کی تھی۔ بابا بہاؤ الدین زکریا نے فرمایا وہ تو جا چکے ہیں۔ پیاسے تو اپنے مسلمان بھائی ہیں۔ بابا حمید الدّین حاکم فوراً حکم بجا لائے اور اپنا کوزہ دریا میں الٹ دیا۔ آن کی آن میں دریا پانی سے بھر گیا اور مسلمانوں نے شکم سیر ہو کر پانی پیا۔ حمید الدّین حاکم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں ہیں فقہ میں بخارا، صرف میں گنج گنج اور نحو میں نیام اور نظم میں گلزار بہت مشہور ہوئیں۔ آپ کی حیات جلال و جمال کے حسین امتزاج سے مزیّن ہے۔ ہمیشہ شاہی جلال اور گدا کا جمال آپ کے ہمراہ اور ہم رکاب رہا۔ آپ آنحضرت کے اس قولِ مبارک الفقر فخری کی عملی صداقت اور چلتی پھرتی تصویر اور تفسیر تھے۔ جاہ و حشم کو ٹھکرا کر فقیری خرقہ پہن کر زندگی گزار دینا۔ الفقر فخری کی دل کش اور حسین تفسیر ہے۔ آپ کے وصال سے قبل کسی بزرگ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ملتان کی ایک سمت غرق ہونے والی ہے۔ آپ نے فرمایا ایسی کوئی فکر والی بات نہیں ہے ہاں البتہ کوئی صاحبِ کرامت بزرگ دنیا سے رحلت فرما جائیں گے۔ آپ کی یہ بات کچھ عرصہ بعد بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ ۱۲، ربیع الاوّل [illegible]ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔ ملتان میں آپ کی تجہیز و تکفین ہوئی اور بہاولپور میں رحیم یار خان کے ریلوے اسٹیشن کی شمال کی جانب چھ میل کے فاصلہ پر موضع ترنڈہ ایک جگہ ہے وہاں آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ نے حضرت ا[براہ]یم بن ادھم کی طرح اشارہ غیبی اور خدا کی منشا کے عین مطابق اقتدار کو ٹھکرا کر خدا رسیدگی اور تقرب الٰہی کی منازل طے کیں۔ خدا اپنے محبوب کو اپنی [illegible] اکرنا چاہے تو وہ بعض اوقات معمولی اور بعض اوقات سنگین واقعات کے ذریعہ اپنی طرف بلا لیتا ہے۔

انیسویں صدی کا دور تھا۔ ہندوستان پر صدیوں سے جاہ و جلال سے حکمرانی کرنے والی مغلیہ حکومت کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی۔ آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر صرف نام کا شہنشاہ بن کر رہ گیا تھا۔ عملی طور پر اب ہندوستان پر سمندر پار سے آنے والی انگریز قوم کا راج تھا جو دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اور مسلمان اپنے اعمال اور غفلت و لاپرواہی کے سبب آہستہ آہستہ غلامی اور ذلت کی دلدل میں دھنستے جا رہے تھے۔

ہندوستان میں افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے میں ١٨٣١ء میں شکر گنج لکھنؤ میں ایک صاحب کمال بزرگ ہستی نے جنم لیا۔ جن کا نام آغا محمد تھا۔ نسلاً ایرانی تھے۔ آغا محمد کے والد، محمد مرزا، ہندوستان میں، واجد علی شاہ کے چچا امجد علی کے عہد میں وہاں کے محکمہ عدالت کے داروغہ تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد محمود آباد آ گئے اور وہیں اُن کی وفات ہوئی۔ مرزا محمد کے پردادا محمد قاسم سلطنت کے عروج میں لکھنؤ آئے تو اپنی علم و ذہانت کے سبب جلد ہی لکھنؤ کے محکمہ دارالضرب کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ شاہ اودھ مردم شناس تھا۔ اُس نے محمد قاسم کی شرافت و عظمت کو پرکھا اور عزت سے ایسا پیش آیا کہ محمد قاسم لکھنؤ کے ہی ہو کر رہ گئے۔ بعد میں ان کی اولاد بھی لکھنؤ میں ہی آباد ہوتی چلی گئی۔ علم و فضل میں ممتاز یہ خاندان شاہی زمانے میں لکھنؤ کا ایک معزز اور شاہی دربار سے وابستہ خاندان شمار ہوتا تھا۔

آغا محمد کے فطری جوہر بچپن میں ہی کھل کر سامنے آنے لگے۔ عام بچوں کے برعکس سنجیدہ و متین اور سرخ و سفید انتہائی پرکشش نقش و نگار کے حامل۔ جو بھی دیکھتا گود میں اُٹھا کر پیار کیے بنا نہ رہتا۔ آپ کی والدہ ایک عبادت گزار اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ ...ن اور خدا ترس۔ سید علی مردان کے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ شیر مردان خان اُن کے خالو تھے۔ جن کا باغ آج بھی لکھنؤ [illegible] جنگ کے نام سے قائم و دائم ہے۔ انتہائی عبادت گزار خاتون تھیں۔ آغا محمد کی تربیت میں کوئی خامی نہ آنے دی۔ آغا محمد کو اہل بیت سے محبت والدین کی طرف سے ہی ملی۔ آپ کی والدہ کا یہ طریق تھا کہ محرم میں وہ پہلے دن سے چاند کی منتظر رہتیں ...ی رہتیں۔ محرم کا چاند جیسے ہی نظر آتا آپ اس کے احترام میں کھانا چھوڑ دیتیں۔ سات محرم کی رات تک صرف دودھ پر رہتیں۔ ٨ محرم سے سب کچھ کھانا پینا چھوڑ دیتیں۔ حسینؑ اور اہل حسینؑ کے سوگ میں دن رات روتیں اور عبادت کرتی رہتی

تھیں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آغا محمّد کو بھی اہلِ بیت سے بے پناہ محبت تھی۔ کھیل کود سے تو دلچسپی تھی نہیں۔ اس لیے زیادہ وقت پڑھائی کی طرف توجہ دی۔ مدرسہ گھر سے نزدیک تھا۔ خاندان بھر کے اور آس پاس کے لڑکے بالے وہیں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لہٰذا آپ کو بھی تحصیلِ علم کی خاطر وہیں داخل کرادیا گیا۔ ذہین تھے۔ چنانچہ کم عمری میں ہی قرآن حفظ کر لیا۔ بچپن میں جب دوسرے ساتھی بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے، آپ نے گلستان۔ بوستان اور میزان الصرف کا مطالعہ جاری رکھا اور انہیں کرکے دم لیا۔

❁❁

اپنے وقت کے قطب آغا محمّد کو خدا کی جستجو بچپن سے ہی تھی۔ اکثر والدہ سے پوچھتے "ماں..... اللہ کہاں ملے گا؟" ماں جواب نہ دے پاتی تو مسجد میں نمازیوں سے پوچھتے کہ خدا کیسے مل سکتا ہے؟ لوگ اُس کمسن سے لڑکے کو دیکھتے حیرت کرتے پھر اپنی سمجھ اپنی سوچ کے مطابق اُسے مختلف عبادات کی تلقین کرتے۔ مجاہدوں کا اور وظائف کا ذکر کرتے کہ یہی وہ راہیں ہیں جن سے سکون میسّر آتا ہے اور خدا کے نزدیک ہونے کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے باغ میں ایک خاندان آکر رہنے لگا۔ دو میاں بیوی اور چند چھوٹے بچوں پر مشتمل یہ خاندان خیمہ ڈال کر آباد ہو گیا۔ لوگ خاندان کے سربراہ کو شاہ صاحب کہہ کر پکارتے۔ باریش عبادت گزار خدا کے بندے دکھائی دیتے تھے۔ نماز باجماعت محلّے کی مسجد میں ادا کرنے آتے اور لوگوں سے بڑے اخلاص وسلوک سے ملتے۔ لوگ بھی شاہ صاحب کی طبعی شرافت سے بڑے متاثر ہوتے اور اُن کی صحبت میں رہنے کو ترجیح دیتے۔ آغا محمّد ابھی کمسن تھے اور تجسّس کا مادہ بچوں میں تو بدرجہ اُتم ہے۔ لہٰذا آپ اکثر رات کو گھر سے چوری چھپے باغ میں نکل جاتے اور شاہ صاحب کی جھونپڑی کے پاس آن کر باتیں سُننے کی کوشش میں لگے رہتے۔

ایک رات اسی طرح وہ شاہ صاحب کی ٹوہ میں اُن کی جھونپڑی تک پہنچے اور کان لگا کر سُننے لگے کہ آخر شاہ صاحب بیوی بچوں سے کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے شاہ صاحب کی بیوی کی آواز سُنی جو بھرّائے ہوئے لہجے میں شاہ صاحب سے کہہ رہی تھیں آج تو فاقوں کو تیسرا دن ہونے کو ہے۔ بچوں کو بڑی مشکل سے تھپک تھپک کر سُلایا ہے۔ بیچارے تین دن کے پیاسے نقاہت کے مارے تقریباً بے ہوش ہی پڑے ہیں۔ خدارا صبح اُن کے لیے کہیں سے بھی کھانے کا بندوبست کریں ہوں۔ میں کب تک اُنہیں یوں بھوکا پیاسا دیکھ کر برداشت کرتی رہوں گی یہ کہہ کر شاہ صاحب کی بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آغا محمّد نے یہ سُنا تو اُن کا دل بھی بھر آیا۔ اگرچہ کمسن تھے مگر بے حد رحمدل اور نرم مزاج۔ شاہ صاحب کے بچوں کا بھوکا پیاسا سو رہنے کا سُنا تو دل پہ ایک گھونسا سا لگا۔ فوراً گھر کو دوڑے۔ ماں کو سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ آپ کی والدہ نے بھی بڑے دکھ کا اظہار کیا اور خدا سے توبہ استغفار کرنے لگیں کہ وہ ہمسائے میں بھوکا رہنے والوں سے بے خبر رہیں۔ خدا اُن کا یہ گناہ معاف کرے پھر انہوں نے اُسی وقت بیٹے کو گرم گرم کھانا تیار کرکے دیا کہ جاؤ جا کر شاہ صاحب کے بچوں کو کھلا کر آؤ۔ آغا محمّد نے ماں کے ہاتھوں سے وہ خوان لیا اور شاہ صاحب کی جھونپڑی کی طرف بڑھے۔ انہوں نے جھونپڑی کے باہر سے شاہ صاحب کو آواز دی اور شاہ صاحب کے باہر آنے پر وہ کھانے کا تھال انہیں دیا۔ شاہ صاحب نے کھانا قبول کرتے ہوئے بیوی کو آواز دے کر کہا۔ نیک بخت اللہ بڑا رازق ہے۔ بندے کو ہر حال میں رزق پہنچانے والا۔ اُٹھو بچوں کو بھی اُٹھا اور ان کے ہاتھ منہ دھلا کر انہیں کھانا کھلاؤ۔ شاہ صاحب کی بیوی نے یہ بات سُنی تو خوشی سے تین یوم کے بھوکے بچوں کو اُٹھا کر ان کا ہاتھ منہ دھلانے لگی۔ کھانا چنا ہوا تھا۔ شاہ صاحب نے گھڑا دیکھا تو وہ خالی تھا۔ چنانچہ انہوں نے آغا محمّد کو ساتھ لیا اور باغ میں ہی بنے کنوئیں سے

یرت سے کُتّے کو دیکھا اور خاموشی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب کی بیوی بچّوں کو جب صاف سُتھرا کر کے جھونپڑی لے کر آئیں تو اندر کا منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئیں اور اپنے بھوکے بچّوں کو دیکھ کر اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر بہنے لگے۔ ہانے دُکھ بھرے لہجے میں کہا: "افسوس! اے اللہ تُو نے کُتّے کو تو رزق پہنچا دیا اور انسان کے بچّوں کو بھوکا پیاسا ہی رکھا۔" شاہ صاحب نے بیوی کے دُکھ بھرے لہجے کو بُری طرح محسوس کیا۔ اُن کا دِل بھی غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ اُنہوں نے آہ بھر کر "تو مر کیوں نہیں جاتا ارے۔"

شاہ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ کُتّا کھانا چھوڑ کر وہیں ڈھیر ہو گیا اور اُس کا بدن اکڑ گیا۔ آغا محمّد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ احب نے روتے ہوئے کم سن آغا محمّد کو سینے سے لگا کر کہا: "پگلے تُو کیوں روتا ہے۔ خدا کی منشا یہی تھی۔ تم نے اپنا حق خدمت دیا۔ خدا تجھے اِس کا اجر دے گا۔"

آغا محمّد کا دِل بھر آیا اور خوب روئے۔ شاہ صاحب نے آغا محمّد کو شفقت سے گلے لگاتے ہوئے کہا: "مَیں جو کہہ رہا ہوں رونا ہے تو روتا کیوں ہے۔ تُو ابھی کیا جانے کہ خدا اور اُس کے بندے کے معاملات کتنے عجیب ہیں۔ کتنے پیچیدہ! اور یاد رکھ فانی ہے۔ بھوک فانی۔ بس اب تم گھر جاؤ اور بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ خدا تمہارا نگہبان رہے۔"

آغا محمّد کی اِس وقت عمر دس گیارہ سال بھی بمشکل ہو گی۔ وہ گھر آ کر رات بھر روتے رہے۔ صبح اُنہوں نے جب ماں سے رات سُنایا تو اُن کی والدہ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے اُن سے پُوچھا کہ اُنہوں نے رات ہی اُنہیں کیوں نہیں بتایا۔ آغا محمّد چپ ہی پھر آپ کی والدہ نے جلدی سے کھانا تیار کر کے لونڈی کے ہاتھ شاہ صاحب کو بھجوایا۔ آغا محمّد بھی لونڈی کے پیچھے پیچھے شاہ کی جھونپڑی کی طرف بڑھے، لیکن باغ میں پہنچ کر اُنہوں نے جو دیکھا وہ اُنہیں حیرت زدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کل رات جھونپڑی شاہ صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ سے بھری پڑی تھی اب پل بھر میں ویران و سنسان یوں دکھائی دے رہی تھی کہ مدیوں کسی نے یہاں قیام تک نہ کیا ہو۔

ا محمّد کا اِس واقعہ سے دُنیا اور دُنیاداری سے دِل اُچاٹ ہو گیا۔ آپ ہر وقت اُداس سے رہنے لگے۔ اللہ کا تصوّر اُن کے جسم پر محیط ہو چکا تھا اور وہ کسی ایسے عالم کی تلاش میں تھے جو اُن کے وجود میں بھڑکتی اِس آگ کو سرد کر سکے۔ بالآخر ایک دن نے مسجد میں چند نمازیوں کو ایک بزرگ شاہ مخصوص عالم کی خصوصیات بتاتے سُنا کہ ایمان کی دولت سے اس قدر مالا مال بزرگ ل درویش تھے کہ کافروں تک کو مسلمان کر دیتے تھے۔ آپ نے اُن بزرگ کے بارے میں سُنا تو اُن نمازیوں کے --- اور ہو کر بیٹھ گئے تاکہ اُن بزرگ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے اُن تک پہنچنے کی کوششیں کریں۔

ا محمّد نے اُن نمازیوں کو کہتے سُنا کہ ایک دن شاہ مخصوص عالم کسی کام سے اپنے مُریدکے ساتھ بنارس کے سفر پر نکلے۔ بنارس اُنہوں نے ایک ویران اور غیر آباد بوسیدہ سی مسجد کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا اور وہیں رہنے لگے۔ آس پاس کے لوگوں نے جب ک کو یوں غیر آباد مسجد میں قیام کرتے دیکھا تو تجسّس کے مارے اُن سے ملنے دوڑے چلے آتے اور گھنٹوں شاہ مخصوص عالم اُن بیٹھے رہتے۔ لوگ آپ کی باتوں سے بڑے متاثر ہوئے اور آپ کی عبادت و ریاضت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ وہ گرویدہ ہو گئے۔ اب تو بنارس بھر میں اِس مسلمان صُوفی کا چرچا ہونے لگا اور شہر بھر سے لوگ آپ سے فیض یاب ہونے آنے لگے۔ یہ ایک اُجڑی ہوئی مسجد تھی لیکن اب لوگ رفتہ رفتہ اسے آباد کر رہے تھے۔ اور یہ سب آپ کی بدولت

ی دنوں باندے کا ایک نواب بنارس کے حاکم کے پاس مہمان بن کے آیا ہوا تھا۔ اُسے شاہ مخصوص عالم کی ... کا علم ہوا تو وہ فوراً اُن سے ملنے اُس مسجد تک پہنچا اور اُنہیں کھانے کی دعوت دی۔ لیکن آپ نے صاف انکار کر دیا۔ نواب تو ہوا، لیکن ہمّت نہ ہاری اور اصرار جاری رکھا۔ بالآخر شاہ مخصوص عالم کو نواب کی خواہش کا پاس کرنا ہی پڑا اور اُس کے

ساتھ نواب کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے کھانے میں شرکت فرمائی۔ کھانے کے بعد سماع کا پروگرام تھا ہند میں معین الدین اجمیری کے دور سے سماع کو جو عروج حاصل ہوا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ محفل سماع میں بنارس کا ہندو راجہ اپنے ایک بڑے پنڈت کے ساتھ شریک ہوا۔ پنڈت ننگے تن، دھوتی پہنے جسم پر رنگ روغن ملے، ہاتھوں اور گلے میں سونے کے زیورات پہنے ایک عجیب وغریب مخلوق بنا بیٹھا تھا۔ وہ جب بھی اس مسلمان صوفی کو دیکھتا جو پھٹے ہوئے خستہ حال لباس میں بیٹھے وجد کی حالت میں سماع سن رہے تھے تو نفرت اور حقارت سے منہ بنالیتا۔ اگرچہ شاہ مخصوص عالم کو بھی پنڈت کے اس رویے کا علم ہو چکا تھا لیکن وہ اس سے بے نیاز سماع میں مگن تھے۔ ان پر جذب کی ایک انوکھی کیفیت طاری تھی۔ قوال پورے جوش وخروش سے گا رہے تھے

"محبت غیر سے میری چھڑا دو یا رسول اللہؐ"

محفل سماع جوبن پر تھی۔ قوال بار بار وہی مصرعہ دہرا رہے تھے کہ

محبت غیر سے میری چھڑا دو یا رسول اللہؐ"

شاہ مخصوص عالم نے اپنی جذب کی حالت میں ہی پجاری کو مخاطب کر کے کہا۔

"سن.... سن نادان سن یہ کیا کہا جا رہا ہے" اور پھر آپ بھی مستی میں وہی مصرعہ دہراتے کہ "محبت غیر سے میری چھڑا دو یا رسول اللہ"

پجاری نے جب آپ کو خود سے مخاطب دیکھا تو اس نے ناگواری سے شاہ مخصوص عالم پہ نظر ڈالی، لیکن نظر کا ڈالنا ہی تھا کہ وہ آپ کے چہرے پر چھائی کیفیت کو دیکھ کر لرز گیا اور اس کا پورا وجود کپکپانے لگا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر ایک چیخ ماری اور زنار کا بوجھ اتار کر بلند آواز سے نعرہ بلند کیا، لا الٰہ الا اللہ! حاضرینِ محفل نے حیرت سے اس پنڈت کو دیکھا۔ بنارس کے راجہ نے آنکھیں پھاڑ کر اپنے پجاری کو دیکھا۔ سبھی حیران تھے کہ ایک کٹر ہندو کس طرح ایک دم مسلمان ہو گیا ہے، لیکن وہ پجاری سب سے بے نیاز جھومتا نعرے لگاتا خدا کی وحدانیت کا اعلان کرتا آپ کے قدموں میں آن گرا، لیکن شاہ مخصوص عالم نے اسے نرمی سے اٹھا کر گلے لگا لیا اور سینے سے لگا کر کہنے لگے "نادان تیری جگہ قدموں میں نہیں بلکہ میرے سینے میں ہے"

آغا محمد نے جب ان نمازیوں سے یہ واقعہ سنا تو وہ اور زیادہ بے چین ہو گئے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح کر شاہ مخصوص عالم کی خدمت میں جا کر حاضری دیں۔ ان کے سینے میں لگی آگ جو سلگ رہی تھی اب بھڑک چکی تھی۔ عشق الٰہی ڈوبا یہ بے چین کم سن نوجوان تیرہ چودہ سالہ آغا محمد ہر چیز سے بے نیاز بنا گھر بتائے باندے کی طرف روانہ ہو گیا۔ نہ کم سنی نہ سفر کی مشکلات پیشِ نظر تھیں۔ زادِ راہ سے محروم یہ نوجوان جلد سے جلد منزل پہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ان دنوں ہندوستان کے خطے میں ریل کی آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ نے پیدل ہی سفر جاری رکھا۔ پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے لیکن مقصد غالب تھا۔ سفر طے کرتے رہے۔ منزلوں پہ منزلیں عبور کرتے کانپور پہنچے۔ فاقوں سے جسم نڈھال چہرہ زرد، ابھی کانپور بازار ہی میں تھے کہ وہاں کے ایک رئیس نے آپ کو دیکھ لیا۔ وہ آپ کے خاندان اور آپ سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے آپ کو دیکھتے ہی جا پکڑا اور زبردستی اصرار کر کے گھر لے گیا۔ آپ کو نہلا دھلا کر کھانا کھلایا اور ——— ایک کمرے میں آرام کرنے کے لیے سلا دیا۔ بستر پہ لیٹتے ہی آغا محمد نے سوچا کہیں یہ مہربان شخص انہیں دوبارہ گھر نہ بھجوا دے اور وہ جو مرشد کی جستجو میں اس قدر مصائب اور تکالیف سہہ کر یہاں تک پہنچے ہیں، دوبارہ گھر کو جا پہنچیں۔ چنانچہ آپ نے فیصلہ کر لیا کہ جلد یہاں سے بھی نکل کھڑے ہوں گے۔ رات ہوئی۔ سبھی افرادِ خانہ بے فکری سے گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ آپ دبے پاؤں اٹھے اور وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ کئی دن کا سفر طے کر کے آپ ایک گاؤں پہنچے، جہاں ایک گوالن نے آپ کو اس حالت میں دیکھا تو اسے آپ پہ بہت رحم آیا۔ اس نے آپ کو گھر لیجا کر کھانا کھلایا اور آرام کرنے کو کہا، لیکن آپ جانتے تھے کہ منزل بہت دور ہے۔ لہٰذا آپ نے یہاں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوبارہ سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ مشکلیں سہتے آپ

طرف گامزن تھے۔ شوق اُڑائے جا رہا تھا۔ تکلیفیں راستہ روک پا رہی تھیں اور بالآخر باندے پہنچ ہی گئے۔ باندے پہنچ کر اب آپ میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ دیوانہ وار شاہ مخصوص عالم کی خانقاہ کی طرف دوڑ لگائی۔ شاہ مخصوص عالم اس وقت اپنے مُریدوں اور شاگردوں کو درس دے رہے تھے۔ آپ سیدھے سحر زدہ شاہ مخصوص عالم کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ شاہ مخصوص عالم نے درس دیتے دیتے نظر اُٹھا کر دیکھا تو آپ کو سامنے کھڑا پایا۔ آپ کو دیکھتے ہی شاہ مخصوص عالم مسرت سے کھل پڑے اور فرمایا: "واہ سبحان اللہ کیسا طالب نکلا ہے۔ علم کے حصول کے لیے سچی لگن والا طالب یقیناً اس جیسا یہاں کوئی نہیں۔"

آغا محمد آپ کی محبت میں سرشار آگے بڑھے اور دیوانہ وار آپ کے قدموں میں جا گرے۔ شاہ مخصوص عالم نے شفقت و پیار سے اُنہیں اُٹھایا۔ گلے سے لگا کر پیار کیا۔ پھر اپنے نزدیک مسند پر بٹھا کر بیعت لی اور آپ کو بھی جاری درس میں شامل کر لیا۔ آغا محمد کی حالت اب اعتدال میں آ چکی تھی۔ برسوں کی چھائی اُداسی و بے قراری دُور ہو چکی تھی۔ سینے میں جو آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ شاہ مخصوص عالم کے سینے سے لگتے ہی سرد پڑ چکی تھی۔

شاہ مخصوص عالم نے اُن کا قاعدے کے مطابق چار روپے مہینہ وظیفہ مقرر کیا اور ایک بے اولاد بُزرگ مولوی احسان الحق سے مخاطب ہو کر کہا: "احسان۔ آج سے آغا تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اسے ظاہری علوم سے آگاہ کرنا اب تمہارا فرض ہے۔ یہ تمہارا دینی بیٹا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت دِل لگا کر کرنا۔"

چنانچہ مولوی احسان خوشی خوشی آپ کو گھر لے گئے۔ مولوی احسان کی بیوی بھی آپ کو پا کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ برسوں سے اولاد کی تمنا میں جی رہی تھی۔ اب خدا نے اُس کے حال پر رحم کھا کر ایک خوبصورت اور دینی علوم سے آراستہ شریف بیٹا عطا کر دیا تھا۔ اب آغا محمد مستقلاً مولوی احسان کے گھر رہنے لگے، بلکہ انہی کے گھرانے کے ایک فرد بن گئے۔ مولوی احسان اور اُن کی بیوی آپ کا بدرجہ خیال رکھتے اور آپ کی ضروریات پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ آپ کو اُن کے ساتھ رہتے اب کافی دن ہو چکے تھے۔ لیکن آپ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اُنہیں اپنے بارے میں یا اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتاتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جس مشکل و محنت پیہم کے بعد اُنہیں گوہر مقصود حاصل ہوا ہے وہ چھن جائے اور اُنہیں یہاں سے لوٹنا ہی پڑے۔

ایک شام شاہ مخصوص عالم نے مُریدوں کو طلب فرمایا اور کہنے لگے: "اب میرا اس فانی دُنیا سے کوچ کرنے کا وقت نزدیک آ گیا ہے۔ میں کسی بھی لمحے اپنے خالق حقیقی کی طرف واپس لوٹنے والا ہوں، لیکن تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ میرے بعد آغا محمد کا خیال رکھنا۔ ابھی اُس کی دینی تعلیم مکمل نہیں ہوئی جب وہ علوم ظاہری و باطنی کا حصول کر لے تو تم لوگوں پر لازم ہے کہ اُس کی اطاعت کرنا۔ میں اُسے اپنے بعد اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔"

مرشد کی وفات سے آغا محمد بہت اُداس رہنے لگے۔ کسی کام میں اُن کا جی نہ لگتا۔ ہر وقت انجانی سوچوں میں ڈوبے نجانے کن خیالوں میں گم رہتے۔ مولوی احسان نے جو آپ کی یہ حالت دیکھی تو اُنہوں نے آپ کی دل جوئی کی بہت کوشش کی اور بالآخر انہیں اس صدمے سے نکال لینے میں کامیاب ہو گئے۔

آغا محمد اب پھر پہلے کی طرح تحصیل علم کی طرف راغب ہو گئے اور دن رات علوم کے حصول کے لیے سرگرداں ہو گئے۔ اب آپ کی عمر ۲۵ سال کے لگ بھگ ہو گئی۔ علم و عرفان کی بلندی تیزی سے طے کرتے اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ آپ اس قدر وجیہہ اور مردانہ حسن و جمال کا بہترین نمونہ تھے کہ عورتیں کوشش کے باوجود آپ پر نظر نہ ڈال سکتی تھیں۔

یہ وہ دور تھا جب انگریز تاجر کے روپ میں آ کر ہندوستان کا مختار کل بن بیٹھا تھا اور ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں کسی طرح جکڑنے کے لیے اپنی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس سلسلے میں انگریز ہر وہ قدم اُٹھاتا جو تاج برطانیہ کے عروج کے لیے ہوتا۔ چنانچہ جب ہندوستانیوں نے انگریزوں کی اس روش کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو انگریزوں نے اس بغاوت کو کچلنے کیلئے وہ حربہ استعمال کیا جو اُن کی دسترس میں تھا۔ چنانچہ ہند ہندیوں کے لہو سے سُرخ ہو گیا۔ دوسرے شہروں کی طرح ہند کا دل لکھنؤ بھی

انگریزوں سے نہ بچ سکا اور تاراج ہوا۔ قتل و غارت کا وہ کھیل کھیلا گیا کہ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ آغا محمد کے والدین چونکہ لکھنؤ میں رہائش پذیر تھے اس لیے اُنہیں جب اس امر کی اطلاع ملی تو وہ سخت افسردہ ہو گئے۔ دل بیقرار ہو گیا طبیعت میں بے چینی عود کر آئی، لیکن پھر سنبھل گئے اور توبہ کرتے ہوئے خدا سے کہنے لگے کہ "اے پاک پروردگار! تو ہی سب جہانوں کا مالک ہے۔ ہم سب کو جس حال میں رکھے، ہمیں اُسی حال میں رہنا ہے۔ کس کی مجال ہے جو اس سے دم مارے۔ جو تجھے منظور ہوگا وہی ہوگا، لیکن اے ربِ عظیم ہمارے دل کو سکون دے اور یہ بیقراری ختم کر دے۔"

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی) ہندوستانیوں کے لیے خون آشام بلا بن کر آئی اور ہندوستانیوں پر مہذب انگریز قوم وحشی بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑی اور ظلم و بربریت کی وہ مثالیں قائم کی گئیں کہ جن سے چنگیز خان اور ہلاکو خان تک کے سر شرم سے جھک گئے۔ پورا ہندوستان آگ میں جل رہا تھا۔ باندہ بھی انگریزوں کے ظلم سے پاک نہ رہ سکا اور انگریزوں کے ناپاک وجود کے سائے باندہ تک پہنچنے لگے۔ تب احسان الحق اور اُن کی بیوی نے فیصلہ کیا کہ وہ باندہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا قیام کریں گے۔

منزلیں طے کرتے احسان الحق، آغا محمد کے ساتھ جبل پور آ پہنچے اور یہاں پہلے دینی مدرسے کی بُنیاد رکھی۔ جبل پور چھاؤنی میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مسلم مدرسہ تھا۔ جہاں احسان الحق آغا محمد کے ساتھ مل کر درس و تدریس کا کام سنبھال لیا۔

آغا محمد کی عمر اب شادی کے لائق ہو چلی تھی۔ احسان الحق نے چونکہ آپ کو اپنا دینی بیٹا بنا رکھا تھا۔ اس لیے اُنہوں نے یہ اپنا فرض گردانا کہ شادی کرانا بھی اُنہی کا فرض ہے۔ بالآخر احسان الحق کی بیوی نے جبل پور کے رئیس خواجہ عطاء اللہ کی بیٹی کو آپ کے لیے پسند کیا اور آپ سے رضامندی لے کر وہاں شادی کا پیغام بھجوا دیا جو فوراً ہی منظور ہو گیا۔ چنانچہ آپ کی شادی مولوی احسان الحق نے اس قدر دھوم دھام سے کی کہ جبل پور والوں نے ایک عرصہ تک اُس شادی کو یاد رکھا۔

آغا محمد کی شادی کے کچھ عرصہ بعد مولوی احسان الحق انتقال کر گئے۔

پہلے مُرشد پھر اُستاد کی وفات نے آغا محمد کو تنہا سا کر دیا۔ وہ بے چین و بیقرار کبھی جنگلوں میں نکل جاتے کبھی بیابانوں میں نکل کھڑے ہوتے۔ ریاضت و مجاہدے کرتے۔ اعتکاف میں بیٹھتے مگر دل تھا کہ سنبھلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ کسی پل سکون نہ تھا۔ ذہن بہت سے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔ شہر میں یا آس پاس میں کوئی ایسا صاحبِ کمال بزرگ نہیں تھا جس کی صحبت میں آپ اپنی پریشانی سے نجات پا سکتے۔ اُلجھن بڑھتی رہی اور من اُچاٹ ہوتا رہا۔ پوری رات خدا کے آگے سجدے میں گرے، دل کی بیقراری کی خاطر روتے ہوئے گزارتے۔ آپ کی دینی ماں مولوی احسان الحق کی بیوی سے آپ کی حالت چھپی نہ رہ سکی۔ وہ کافی دنوں سے محسوس کر رہی تھیں کہ آج پھر آغا کا وہی حال ہو گیا ہے جو اُس کا مُرشد کے وصال پہ ہُوا تھا۔ وہ آپ کا دُکھ درد سمجھتی تھیں اُنہیں معلوم تھا کہ جس منزل کی خاطر یہ کمسنی میں ہی مصائب و تکالیف کا بوجھ اُٹھانے کی خاطر گھر سے نکلے تھے اُس منزلِ مقصود سے ابھی کوسوں دُور ہیں۔ راہ میں بھٹکے ہوئے اپنے اس دینی بیٹے کی خاطر اُن کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی وہ آغا کے پاس گئیں اور اُنہیں شفقت سے سمجھانے لگیں۔

"فرزند میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل پہ کیا بیت رہی ہے۔ پہلے مُرشد چھوٹا پھر اُستاد کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ منزل تو در کنار راہ تک کا علم نہیں۔ بیٹے تمہیں صبر و سکون سے یہ سانحے سہنے ہوں گے۔ وقت کا انتظار کرنا ہی بہتر حکمت عملی ہے۔ بانس بریلی میں ایک صوفی شاہ نظام الدین حسین کا بڑا شہرہ ہے تمہارے دینی باپ مولوی احسان الحق بھی اکثر اُن کی تعریف کیا کرتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ تمہارے دُکھوں کا صحیح مداوا کر سکتے ہیں۔ تم اُنہیں اپنا مدعا بیان کر کے تو دیکھو۔ ممکن ہے وہ تمہارے بے کل من کو سکون پہنچا سکیں۔"

چنانچہ آغا محمد کو جب اُلجھن دُور کرنے کا سرا ملا تو اُنہوں نے دیر نہ لگائی اور فوراً شریعت و طریقت کے وہ اُلجھے مسائل جو اُن کے ذہن میں اُلجھن و بے چینی پیدا کیے دے رہے تھے ایک خط میں لکھ کر جواب کی خاطر بریلی میں مقیم شاہ نظام الدین کو بھیج دیئے اور

100% NATURAL
NO CHEMICALS
HAIR FORCE
NATURE'S ANSWER TO ALL YOUR HAIR PROBLEMS

جلد ہی اُنہیں اپنے خط کا اور سوالات کا اس قدر جامع اور بھرپور جواب ملا کر تڑپ اُٹھے۔ منزل کی راہ نمائی کرنے والا راہبر اُنہیں مل چکا تھا۔ ناامیدی کی تاریکی میں اُنہیں شاہ نظام الدین اُمید کی کرن کی مانند محسوس ہُوئے۔ چنانچہ اپنی دینی ماں سے اجازت لی۔ بیوی کو خُدا حافظ کہا اور بریلی اپنے راہبر شاہ نظام الدین سے مِلنے کی خاطر چل پڑے۔ شاہ صاحب کی علمی تبحر اور التفات نے آغا محمدؒ کے دل میں شاہ صاحب کے لیے چاہتوں کا سمندر موجزن کر دیا۔ شاہ صاحب کی گفتگو نے آپ کا ایسا دل موہ لیا کہ بریلی کی خاک کو سُرمہ بنا کر آنکھوں میں لگا لینا چاہتے تھے۔

آغا محمدؒ صاحب نے بریلی کے شاہ نظام الدین سے کسبِ فیض کے حصول کے لیے بریلی کے چکر پہ چکر لگانے شروع کر دیئے۔ گھر بار نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ وہاں ذمہ داریاں اُن کی منتظر تھیں۔ ہندوستان میں انگریزوں نے اپنا غاصبانہ تسلّط مضبوط تر بنانے کے لیے فوجوں کی آسان نقل و حمل کی خاطر مُلک میں ریل کا نظام جاری کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ اب آسانی سے سفر کرتے گھر کا بھی چکر لگا لیتے اور اپنے مُرشد شاہ صاحب سے بھی مل آتے۔ علم کی طلب اور چاہت تھی جس نے آپ کو کم سنی میں ہی گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ بچپن سے حصولِ علم کے لیے آپ نے مصائب بھرے سفر کیے اور راہ میں تکلیفیں سہتے مقصد کے لیے سرگرداں رہے۔

ایک دن خواب میں آغا محمدؒ نے اپنے مُرشد شاہ محصوص عالم کو دیکھا جو آپ کا ہاتھ تھامے بریلی میں شاہ نظام الدین کے پاس لیے جارہے ہیں اور شاہ صاحب کی خانقاہ میں پہنچ کر آپ کا ہاتھ شاہ صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہُوئے فرماتے ہیں۔

"شاہ صاحب! آج سے ہم نے اپنا جگر گوشہ تمہارے سپرد کیا۔ اسے ظاہری و باطنی علوم میں یکتا کر دو۔"

یہ خواب دیکھ کر آغا محمدؒ بیدار ہُوئے تو فوراً بریلی کی راہ لی۔ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوئے تو شاہ صاحب نے اُنہیں دیکھتے ہی کہا۔ "بالآخر ہمارے تخت کا وارث آ ہی گیا۔ آؤ۔ آؤ! یہ مسند تمہارے لیے ہی خالی پڑی ہے۔"

چنانچہ اب شاہ صاحب نے اُسی وقت آپ سے بیعت لی، بلکہ بیعت کی تجدید کی۔ اُنہیں معرفت کے اسرار سے آگاہ کیا۔ خلعت و خلافت ادا کی۔ گویا مُرشدی کا حق ادا کیا۔

اب شاہ نظام الدین جدھر کا بھی رُخ کرتے آغا محمدؒ کو ہمراہ رکھتے اور آپ کی دینی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دیتے۔

آغا محمدؒ اللہ کے عشق میں ہر وقت سورج کی طرف دیکھتے رہتے۔ اب اُنہیں حضرت صاحب کہا جانے لگا تھا۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد سورج کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے۔ وہ مسلسل سورج کی طرف دیکھتے رہتے لیکن خود اُن کی طرف دیکھنے کے لیے کسی میں تاب نہ تھی۔ جس کسی کی بھی آپ پر نظر پڑتی اُس کا چہرہ جُھلس جاتا۔ اسی وجہ سے آپ خود بھی لوگوں پر نظر ڈالنے سے اُحتراز کرتے تھے۔

ایک دن ایک تیز طرار ہندو نوجوان لڑکی نے سوچا کہ آخر اس میں کیا بھید ہے کہ جو بھی آپ پہ نگاہ ڈالتا ہے وہ جُھلس جاتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ آغا کی نگاہوں میں کتنی تپش ہے۔ چنانچہ ایک دن اُس نے آپ کو راہ میں جا لیا۔ آپ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے ہاتھ میں عصا تھامے گھر آ رہے تھے۔ آنکھیں آپ بند کرکے ہی گھر آتے کہ کہیں مبادا کسی پہ نظر نہ پڑ جائے لیکن رادھا نامی وہ ہندو عورت تو آج شر کے موڈ میں تھی، چنانچہ وہ آپ کے نزدیک سے نزدیک تر ہونے لگی۔ آغا محمدؒ جو اپنے آپ میں مگن جا رہے تھے، اپنے پیچھے آہٹ سُن کر چونکے لیکن توجہ نہ دی لیکن جُوں جُوں کسی کے قدموں کی چاپ آپ سے نزدیک سے نزدیک تر ہوتی چلی گئی تو آپ کو تشویش سی محسوس ہوئی۔ آج تک ایسا نہ ہُوا تھا کہ علاقے کا کوئی شخص اتنی دیدہ دلیری سے اپنی جان پر ظلم کروانے آپ کے نزدیک ہو کر چلتا۔ چنانچہ آپ نے تجسّس سے آنکھیں کھولیں، تو پہلی نظر ایک ہرے بھرے ــــــ تناور درخت پہ پڑی تو وہ آپ کی شرربار نظروں سے مفر نہ ہو سکا، چنانچہ وہ درخت جو کچھ دیر قبل سرسبز و شاداب تھا اب محض دھواں اُگلتا لکڑی کا ایک تنا تھا۔

اتنے میں رادھا بھی آپ کے نزدیک آ چُکی تھی۔ آپ نے غصے میں اُسے دیکھا۔ وہ سر پہ پانی سے بھرے گھڑے اُٹھائے آپ کے پیچھے کھڑی حیرت سے دھواں اُگلتے درخت کو دیکھ رہی تھی۔ آپ نے طیش کے عالم میں ہاتھ میں پکڑا عصا اُس کے گھڑوں پر

دے مارا۔ کچی مٹی کے گھڑے ایک ہی ضرب میں ٹوٹ گئے اور رادھا پانی میں شرابور کھڑی سکتے میں آ گئی۔ پھر اچانک اس نے دوڑ لگائی اور گھر کی طرف بھاگی۔ اُس کا جسم آغا محمد کی نگاہوں کی تپش سے جھلستا جا رہا تھا۔ وہ سیدھی آغا محمدؒ کے گھر داخل ہوئی اور روتے ہوئے بولی "دیدی، دُہائی ہے میرا شریر آگ میں جل رہا ہے۔"

آغا محمد کی بیوی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ سمجھ گئیں کہ اس کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ اُنہوں نے اُسے سمجھا بجھا کر بٹھا دیا اتنے میں آغا محمد بھی گھر آ گئے۔ آپ کی بیوی فوراً اُن کی طرف لپکیں اور کہنے لگیں "رادھا بے قصور ہے۔ بیچاری کم عقل اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتی۔ اسے معاف کر دیں۔"

آغا محمد نے کہا "تو یہ رو کیوں رہی ہے اور کیسی جلن کی دہائی دے رہی ہے۔ جسم تو سارا پانی میں شرابور ہے۔ پھر کیسی جلن کا احساس۔"

اُسی سمے رادھا کا شریر یوں محسوس کرنے لگا کہ گویا کسی ٹھنڈے پہاڑی چشمے میں بھیگا ہو وہ فوراً وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی، وہ دوبارہ کسی قسم کی غلطی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

اُس دن سے حضرت آغا محمدؒ نے اپنی آنکھیں نیم وا رکھنی شروع کر دیں۔ اللہ نے اُنہیں تجلیات کے دامن میں یوں چھپا لیا تھا کہ اب اگر وہ کسی کی آہٹ محسوس کرتے تو چونک کر دیکھنے پر اُنہیں سوائے انوار کی تابانی کے کچھ بھی نظر نہ آتا۔

آغا محمد جب عبادات کی رات گزار کر اپنے ٹھکانے سے واپس گھر کو لوٹتے تو اُنہیں کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ یادِ الٰہی سے سرشار وہ ہر چیز سے بے نیاز، بس چلتے رہتے۔ اکثر یوں ہوتا کہ اس کیفیت میں گھر کی راہ بھول جاتے۔ جانا کدھر ہوتا نکل کہاں جاتے۔ ایک بار اسی طرح عبادات سے فراغت کے بعد گھر کو چلے آ رہے تھے کہ راستہ بھول کر کسی اور ہی سمت لگ گئے۔ اتفاق سے اُس راستے میں ایک مے خانہ پڑتا تھا۔ جب آپ مے خانے کے نزدیک پہنچے تو اُنہیں کسی مغنیہ کی سُریلی لوچ دار آواز سنائی دی۔ جو مے خواروں کے جھرمٹ میں بیٹھی اپنے سنگیت سے اُن کا دل بہلا رہی تھی۔ آپ بے خیالی میں سیدھے مے خانے میں داخل ہو گئے۔ مے خانے کے شروع میں کوئلوں سے دہکتی ایک انگیٹھی رکھی تھی۔ جو اندر کے ماحول کو گرم رکھنے میں مدد دے رہی تھی۔ آپ کا پاؤں بے خیالی میں انگیٹھی میں جا پڑا اور آپ وجد کی کیفیت میں آ گئے۔ وجد میں آپ دیوانہ وار رقص کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے "یہی گاؤ.... یہی گاؤ.... یہی گائے جاؤ۔"

مغنیہ نے گانے کی کوشش کی مگر حلق سے الفاظ نہ نکل سکے۔ اُدھر مے خانے میں مدہوش مے خوار، جام و مینا گراتے ایک دم کلمہ پڑھتے اُٹھ بیٹھے۔ آپ بھی خدا کی وحدانیت کا نعرہ لگاتے مے خانے سے نکل آئے لیکن آپ کا پاؤں صحیح سالم تھا اور اُس پر آگ نے ذرا برابر بھی اثر نہ کیا تھا۔

لوگ بیان کرتے ہیں کہ آغا محمد صاحب کی آنکھیں سبھی سے جُدا تھیں۔ نہ اُن میں سفیدی نہ سیاہی۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ سورج سمان دو ٹکیاں ہیں جو آپ کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ لگی ہیں۔ لوگ انجانے میں آپ کو دیکھتے تو نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے بیہوش ہو جاتے اور ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی۔

ایک زمانے میں آپ کو پھولوں سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ آپ نے گھر میں جگہ جگہ پھول دار پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے لیکن اکثر یوں ہوتا کہ آپ گملوں پر نظر ڈالتے تو پودے مرجھا کر خشک ہو جاتے لیکن ظہر تک پودے دوبارہ تر و تازہ ہو جاتے۔ ظہر کے بعد آپ دوبارہ گملوں کی طرف نگاہ ڈالتے تو پودے دوبارہ خشک ہو جاتے۔

آپ کا بیٹا اور مالی حیرت سے اسے دیکھتے کیونکہ وہ بیچارے بڑی تلاش کے بعد ان پھول دار پودوں کو لاتے لیکن جب اُنہیں خشک دیکھتے تو اُنہیں حیرت و دکھ کے ساتھ ڈر بھی محسوس ہوتا کہ کہیں آغا محمد ناراض نہ ہوں۔

آغا محمد بھی اُن سے کہا کرتے تھے کہ "میاں یہ تم لوگ کس قسم کے پودے لاتے ہو جو چند لمحوں بعد ہی خشک ہو جاتے ہیں۔

کیا یہی وہ شاداب پودے ہوتے ہیں جن کے بارے میں تم کہتے ہو کہ بڑی تلاش کے بعد اکٹھے کیے ہیں۔"
یہ سُن کر وہ بیچارے شرمندہ ہوتے اور پھر مزید تلاش کے بعد چھانٹ کر سرسبز پودے لاتے۔ لیکن اُن کا بھی یہی انجام نکلتا۔

جبل پور میں آپ کی رہائش ایک مشہور ہندو سیٹھ جیون داس کے گھر کے نچلے حصے میں تھی۔ جو آپ نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ جیون داس عام ہندوؤں کی نسبت بہت نیک، پارسا اور مخیر انسان تھا۔ دولت کی وجہ سے غریبوں اور حاجت مندوں کی بھرپور مدد کیا کرتا تھا۔ اپنی اسی دولت اور انسان ترسی کے سبب وہ دُور دُور تک رسائی رکھتا تھا۔ اتفاق سے وہ ایک ایسے مقدمے میں پھنس گیا جو اُس کے ناکردہ گناہوں کا پھل تھا۔ بیچارا ہر ممکن کوشش کر چکا تھا مگر اس گردش سے نکلنے کی کوئی سبیل بر نہ آ رہی تھی۔ پریشانی کے عالم میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس مقدمے کا فیصلہ اُس کے خلاف ہوا تو گویا وہ زندہ درگور ہو جائے گا۔ برسوں سے بنی عزت سب خاک میں مل جائے گی۔ یہ سوچ کر اُس کے آنسو بھر آئے۔ اتفاق سے آغا محمدؒ اُس وقت گھر سے نکل رہے تھے۔ اُنہوں نے جو جیون داس کو گھر کے باہر بنے لان میں بیٹھے یوں آنسو بہاتے دیکھا تو رُک گئے اور اس کے نزدیک جا کر پوچھنے لگے "جیون داس کیا ہوا؟ جو یوں روئے جا رہے ہو؟"

جیون داس آپ کی پرہیزگاری اور مسلم صوفی ہونے کی حیثیت سے بڑی عزت کرتا تھا۔ اُس نے جب آپ کو دیکھا تو اُسے اُمید کی کرن نظر آئی۔ اُس نے دل میں سوچا کہ دُنیا کی ہر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا چکا ہوں پر بھگو کے اس پارسا بندے کو بھی اپنی بپتا سُنا کر دیکھوں شاید یہی میری نیا پار لگا دیں اور مجھے اس گرداب سے نکال لے جائیں۔

چنانچہ وہ روتے ہوئے آپ کو سارا ماجرا سنانے لگا کہ کس طرح وہ ایک ناکردہ جُرم کے سبب بے فضول مقدمے میں پھنس گیا ہے اور اُس کی عزت و آبرو داؤ پر لگی ہے۔

آپ جیون داس کو اُس کی نیک چلنی اور انسان ترسی کے باعث بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اُس کی دادرسی کی خاطر اُسے ایک تعویذ دیتے ہوئے کہا "جیون داس، یہ تعویذ لے کر عدالت میں جانا۔ اللہ نے چاہا تو کامران ہو جائے گا مگر دیکھ میں تجھے یہ کسی لالچ یا کسی قسم کے صلے کی اُمید میں نہیں دے رہا اور نہ میں تاجر ہوں۔ میں ایک فقیر، اللہ کی محبت و نظرِ کرم کا طالب ہوں۔ بس اتنا ذہن میں رکھنا۔"

جیون داس تعویذ پا کر بہت خوش ہو گیا۔ چند دنوں بعد اُس کی عدالت میں پیشی تھی۔ مخالف وکیل نے جس طرح اُس کے خلاف نام نہاد الزامات کے ثبوت بنا کر عدالت میں پیش کیے تھے وہ سب جیون داس کو بے آبروئی کی سمت دھکیلنے کے لیے کافی تھے۔ چنانچہ وہ تعویذ لے کر دھڑکتے دل سے عدالت میں داخل ہوا اور پھر عدالت نے اُسے باعزت بری کر دیا۔ جیون داس خوشی سے اس طرح سرشار ہوا کہ آغا محمدؒ کی نصیحت بھول گیا اور نذرانہ لے کر عقیدت سے آپ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

آپ نے اُسے ناگواری سے کہا "جیون داس تجھے میں نے اسی لیے سمجھایا تھا لیکن پھر تُو نے وہی حرکت کی، یاد رکھو جیون داس جو کام بنا سکتا ہے وہ بگاڑ بھی سکتا ہے۔"

جبل پور میں ایک شخص جو ڈاکٹر تھا اور ہری بابو بنگالی کے نام سے مشہور تھا ایک دن بخار میں ایسا مبتلا ہوا کہ نہ تو اُس کی ڈاکٹری کام آئی نہ دوسرے ڈاکٹر اُسے شفایاب کر سکے۔

لوگوں نے اُس کے اہل و عیال کو مشورہ دیا کہ وہ حضرت آغا محمد صاحب سے ملیں، وہی ہری بابو کے لیے امرت دھارا ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ آپ کے پاس آئے، آپ نے انہیں گا جھ کے عرق میں ذرا سی شکر ملا کر پلانے کا مشورہ دیا۔ مریض کے اہل و عیال نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی اور پھر ہری بابو جو پرلوک سدھارنے والے تھے، ایکدم بھلے چنگے ہو گئے۔

حضرت آغا محمدؒ کا ایک مُرید اس واقعہ کو ذہن نشین کر چکا تھا چنانچہ ایک مرتبہ جب اُس کے محلّے میں ایک شخص اُسی قسم کے بُخار میں مُبتلا تھا جس میں ہری بائی ہوئے تھے تو اُس نے اُسے گاجر کے رس میں شکر ملا کر پلانے کا مشورہ دے دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ایک مرتبہ آغا محمدؒ نے ہری بائی نامی مریض کو یہ دوا استعمال کرائی تھی اور وہ لمحوں میں تندرست ہو گیا تھا۔

چنانچہ لوگوں نے یہ نسخہ بھی استعمال کر کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ مریض کو گاجر کا عرق مع شکر پلائی گئی تو اُسے ایک ایسی قے آئی کہ نڈھال ہو کر رہ گیا اور سانس اُکھڑ کر رہ گیا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ مریض لمحوں میں خدا کو پیارا ہونے والا ہے۔

رشتہ دار پریشانی کے عالم میں مُرید کے گلے پڑ گئے کہ یہ سب کیا دھرا اُسی کا ہے۔ وہ بیچارہ یہ صورتحال دیکھ کر اپنے مُرشد کے پاس دوڑا گیا اور تمام ماجرا کہہ سُنایا۔ آغا محمدؒ نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”احمق۔ وہ نسخہ صرف ہری بائی کے لیے تھا نا کہ ایسا عام کر تُو ہر ایک کو استعمال کراتا پھرے۔“

پھر آپ نے اُس سے کہا ”خیر اب دوبارہ بھاگ کر جا اور یہی دوا دوبارہ استعمال کرا۔ اور دیکھ سُستی نہ کر یہ نہ ہو کہ مریض ہی چل بسے۔“

چنانچہ آپ کا مُرید دوڑا دوڑا گیا اور اُس شخص کے مکان میں پہنچ کر اُسے دوبارہ وہی عرق پلانے کی کوشش کی تو مریض کے رشتہ دار آگ بگولا ہو کر اُس پر پل پڑے اور بولے ”بدبخت۔ پہلے ہی تُو نے کونسا اُسے زندہ رہنے کے قابل رکھا ہے جو اب اُسے مزید بے حال کرنے آ پہنچا ہے۔“

مُرید نے بڑی مشکل سے خود کو اُن کے نرغے سے نکالا اور سمجھانے بُجھانے کے بعد اُنہیں اس بات پر رضامند کر ہی لیا کہ اب کی بار ایسا نہ ہو گا۔

اُن لوگوں نے مریض کی حالت کے پیشِ نظر اُسے بالآخر اجازت دے ہی دی۔ اب کی بار جب مُرید نے اُس شخص کو دوا پلائی تو اُس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں اور تندرست ہو کر اُٹھ بیٹھا۔

حضرت آغا محمدؒ اپنے معمولات پر سختی سے عمل کرتے۔ خواہ کچھ ہو جائے وہ اپنے معمولات سے نہیں ہٹتے تھے۔ طبیعت ناساز ہوتی۔ لیٹنا بھی دُشوار گزار ہوتا لیکن معمولات قضا نہ ہونے پاتے۔

اُنہیں اپنے ایک صاحبزادے منیر احمد سے بڑا دلی لگاؤ تھا۔ وہ آپ کے مُرشد کے ہم شکل تھے۔ کچھ اسی ناطے آپ منیر احمد سے بہت محبت کرتے تھے۔ منیر احمد جوانی کے عالم میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ اُس وقت مصلّے پر بیٹھے عبادت میں مشغول تھے۔ منیر احمد نے نزاع کے عالم میں باپ کا چہرہ دیکھنے کی خواہش بیان کی تو آپ چند لمحوں کے لیے بیٹے کے پاس آئے پھر واپس پلٹ کر مصلّے پر جا بیٹھے اور معمول کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔

ایک عورت آغا محمد صاحب کے گھر کا گندم پیسنے کے لیے لے جاتی مگر واپسی پر وہ پسا ہُوا گندم کم مقدار میں لاتی۔ حضرت آغا کے گھر والے اُس کے اس طرزِ عمل سے سخت شاکی تھے۔ ایک روز وہ آٹا لائی تو حضرت صاحب کی مستورات نے اُسے تولا تو وہ مطلوبہ مقدار سے کم نکلا۔ اُنہوں نے اُسے بُرا بھلا کہا یہ سُن کر وہ عورت اُلٹا شیر ہو کر چند نازیبا الفاظ ادا کرنے لگی۔ یہ سُن کر آغا صاحب کو بھی بُرا محسوس ہُوا۔ اُنہوں نے متانت اور سنجیدگی سے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”خاتون۔ ایک تو چوری کی اُوپر سے یہ سینہ زوری۔ آخر اس کا مطلب ؟“

عورت نے یہ سُنا تو بھڑک اُٹھی اور بولی ”حضرت۔ آپ بھی مجھے چور سمجھنے لگے۔ میاں! اگر میں چور ہوں تو پھر میری آنکھیں پھوٹیں۔“

یہ سُن کر آپ نے ملامت بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور بولے ”بدبخت! یہ تو نے خود اپنا فیصلہ کر ڈالا کاش تُو نے اللہ پر یہ فیصلہ چھوڑا ہوتا۔“

اور پھر ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ اُس عورت کی بینائی جاتی رہی اور وہ اندھی ہو گئی۔

حضرت صاحب آغا محمد اکثر کہا کرتے تھے۔
جس نے انصاف اور حق کے خلاف ہمدردی ظاہر کی گویا اس نے اپنی عاقبت خراب کر ڈالی اور انسان کا سب سے بڑا عیب، عیب جوئی ہی ہے۔ لامذہب وہی کہلاتا ہے جو ہر دلعزیز ہو۔ کیونکہ وہ سبھی کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ چاہے وہ حق بات ہو یا ناحق۔

وصال سے کچھ دن قبل آپ پر استغراق طاری ہونے لگا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے آپ کا استغراق بڑھتا جا رہا تھا۔ نہ کسی کو پہنچانتے تھے نہ کسی چیز کا ہوش تھا۔ دودھ اور پھلوں پر گزارا کرتے مگر اب وہ بھی لینے سے انکار کر دیا کہ ان چیزوں سے اب تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

۱۳۔ ذیلقعد ۱۳۳۴ ہجری بمطابق ۱۷؍اگست ۱۹۱۸ء کو جمعہ کے دن آپ کا وصال ہوا۔ آپ کے لبوں پر آخری دم لا الٰہ الا اللہ کا ورد تھا۔

غزوۂ بدر کا ذکر ہے کہ خدا کے آخری رسول صلعم ۱۲ ارمضان المبارک کو تین سو تیرہ جاں نثارانِ اسلام کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے تو ۱۷ رمضان المبارک کو مقام بدر کے قریب پہنچے۔ خبر ملی کہ لشکرِ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آگیا ہے۔ آنحضرتؐ اسی جگہ رک گئے مگر چونکہ اہلِ قریش پہلے پہنچ گئے تھے اس لیے انھوں نے جنگی اعتبار سے مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسکے برعکس اہلِ ایماں جہاں تھے وہاں کوئی پانی کا چشمہ یا کنواں نہیں تھا۔ زمین اتنی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پیر بھی ریت میں دھنسے جاتے تھے۔ اکثر ساتھیوں کو اس مقام پر پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے قیام پر تردد تھا لیکن آنحضرتؐ کے انتخاب کے خلاف کوئی رائے ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر حباب بن منذرؓ نے ہمت کی اور ہادیٔ برحقؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ جگہ جو منتخب کی گئی ہے وحیٔ الٰہی کی رو سے ہے یا خود حضورؐ کی کوئی فوجی تدبیر ہے؟ جواب میں آنحضرتؐ نے فرمایا۔ نہیں یہ وحی نہیں ہے میری اپنی رائے ہے۔ جاں نثارِ رسولؐ نے التماس کی کہ اس صورت میں یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمے پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنویں بیکار کر دیے جائیں آنحضرتؐ نے یہ مشورہ پسند فرمایا اور اسی پر عمل کیا گیا۔

ایسی ہی ایک مثال غزوۂ خندق کے موقع پر ملتی ہے۔ یہ واقعہ ۸ ذی قعدہ ۵ھ کا ہے۔ عرب کے تقریباً تمام قبائل نے ایک لشکرِ گراں تیار کیا تھا۔ آنحضرتؐ نے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے جناب سلمان فارسیؓ کے مشورے سے خندق کھود کر کفار کے محاصرے کا مقابلہ کیا اور یہ محاصرہ ایک ماہ تک اس سختی سے قائم رہا کہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر اور صحابۂ کرام پر تین تین فاقے گزر گئے۔ حضور کو خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان تکالیف میں انصار ہمت ہار جائیں۔ اس لیے آپ نے اس شرط پر کفار سے معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینے کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ انھیں دے دیا جائے۔ آپ نے سعدؓ بن عبادہ اور سعدؓ بن معاذ کو جو امرائے انصار میں تھے اور صاحب الرائے خیال کیے جاتے تھے اپنے پاس بلا کر مشورہ کیا کہ اس باب میں ان کی رائے کیا ہے۔ دونوں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر حضورؐ کا خیال ہے تو دست بستہ التماس ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج طلب کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے ہم کفار سے دب کر صلح کریں! یہ نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلعم کو ان کے جوش و ولولے سے بڑا اطمینان ہوا اور یہ ارادہ ترک فرما دیا۔

طوفانِ باد و باراں نے ہر سُو تباہی مچا دی تھی۔ لوگوں میں اضطراب و ہیجان بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس ہنگام انفنٹری روڈ پر سڑک کے کنارے گھاس پھوس کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں اللہ کا ایک ولی محوِ عبادت تھا۔ اس کے نورانی چہرے سے سکون و طمانیت ہویدا تھے۔ استغراق کا عالم یہ تھا کہ اُسے مطلق ہوش نہ تھا کہ جھونپڑی کے باہر کیا تباہی مچی ہوئی ہے۔ تیز ہوا کے دوش پر "یا وَدُودُ" کے ورد کی مسحور کن آواز دُور و نزدیک تک پھیل رہی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس طوفان میں بابا فضل شاہ نور والے کی کمزور جھونپڑی کا نام و نشان مٹ چکا ہو گا لیکن جب صبحدم اُنھوں نے دیکھا کہ وہ جُوں کی توں موجود ہے جب کہ رات کے تباہ کن طوفان میں پختہ مکان اور کوٹھیاں لرز اٹھی تھیں، چھتیں اُڑ گئی تھیں، تناور درخت زمین بوس ہو گئے تھے۔ وہ اس کی بزرگی و عظمت کے معترف ہو گئے۔ وہ لوگ جو بابا نور والے کی عبادت و ریاضت کو دُنیا کی آنکھ سے دیکھتے تھے اس کے قریب سرکنے لگے۔

بابا نور والے کو اس جگہ بیٹھے سال سے زائد عرصہ ہو گیا تھا لیکن گرد و نواح کے لوگوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ دن اور رات میں گاہے بگاہے چند ایک بوڑھے، ادھیڑ عمر اور جوان آ کر اُن کے سامنے مؤدبانہ انداز میں بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ وہ ان کی چائے پانی سے تواضع کرتا تھا۔ اللہ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سناتا تھا۔ دُنیا میں رہ کر عقبیٰ کی راہیں روشن کرتا تھا اور درسِ ہدایت دیتا تھا۔ معرفتِ الٰہیہ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے میانہ وجود کے اندر بدرجہ اتم سمایا ہوا تھا۔ لیکن نفسانی خواہشات کے غلام اور دُنیائے دَنی کی آلائشوں میں گھرے ہوئے انسان اس سے ناواقف تھے لیکن جو لوگ واقفِ حال تھے دُور دُور سے آ کر فیوض و برکات سے جھولیاں بھر رہے تھے۔

حضرت فضل شاہ نور والے رحمۃ اللہ علیہ جب تیرہ سال کے ہوئے تو آپ پر جذب و سکر کا غلبہ ہونے لگا۔ چودہ سال کی عمر میں راہِ حق کی تلاش میں شملہ کے پہاڑوں کی طرف چلے گئے جہاں بارہ برس گزار دیئے۔ طبیعت میں جلال اتنا تھا کہ کوئی شخص آپ کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی کو اپنی طرف آتا دیکھتے تو دُور سے بآوازِ بلند کہہ دیتے تھے: "جا تیرا کام ہو گیا ہے۔" اور اس کا کام ہو جاتا تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے ہو گئے تھے اور جنگلی اور پہاڑی خونخوار درندے آپ کے ماتحت ہو گئے تھے۔ وہ سلام کی غرض سے بابا نور والے کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے تھے، آپ کے قریب پہنچ کر ان کی درندگی و خونخواری سلب ہو جاتی تھی۔ وہ اس

طرح آپ کے نزدیک بیٹھ جاتے مجھے جیسے منتظر ہوں کہ بابا نور والے نے اگر ان کا سلام قبول کر لیا ہے تو اجازت لیں۔

ایک دن آپ بہت بڑے درخت کے نیچے اپنے ربِ ذوُد کے سامنے سجدہ ریز تھے کہ حکم ہوا "جالندھر شریف جاؤ" لہٰذا فوراً چل پڑے۔ کئی دنوں کی مسافت طے کرنے کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچے تو نکودر جانے والی سڑک کے قریب ایک گنبد نظر پڑی۔ وہاں تشریف لے گئے تو ولی کامل حضرت میاں خدابخش رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی جنہیں غوث الثقلین حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ اقدس پر چالیس سال حاضر رہنے کا شرف حاصل تھا اور غوثِ زماں حضرت احمد شرف الدین بغداد رحمۃ اللہ علیہ کی خلعتِ مریدی سے سرفراز تھے۔ نظریں چار ہوئیں تو انھوں نے نہایت مشفقانہ انداز میں فرمایا۔

"بیٹا! ہم تو بڑے دنوں سے تمہارے منتظر ہیں۔"

اور اُٹھ کر گلے لگایا۔ بس پھر کیا تھا۔ آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑے۔ پلک جھپکنے میں سلوک کی کئی منزلیں طے کرا دیں۔ نور والے حضرت میاں صاحبؒ کی خدمتِ اقدس میں چودہ سال رہنے کے بعد قطبِ عالم کی خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہو کر مسندِ ہدایت پر متمکن ہوئے۔ آپ کے بارے میں حضرت میاں خدابخشؒ نے فرمایا تھا کہ فضل شاہؒ کی بات سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس علمِ الٰہی سے ایسے چراغ روشن ہوں گے جن کی روشنی میں گمراہان صراطِ مستقیم منزل کا نشان پائیں گے اور جب چہار اکناف عالم ظلمت و تاریکی کے پرچم لہرانے لگیں گے تو اس کے علم سے استفادہ کی برکت سے اللہ تبارک و تعالےٰ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی راہیں روشن ہوں گی۔

لوگوں میں رفتہ رفتہ قطبِ عالم حضرت فضل شاہ نور والےؒ کا چرچا ہونے لگا۔ ایک دن آپ چوہدری نبی بخش کے ہاں مقیم تھے۔ رات کو یکدم گھر کے اندر سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ دریافت کیا تو بتایا گیا کہ چوہدری صاحب کا لڑکا محمد حسین جو کہ صغیر سنی میں تھا قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے۔ آپ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور بچےؒ کے چہرے پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو فرمایا۔

"بچہ زندہ ہے اسے سماع سنایا جائے۔"

فوراً اس کا اہتمام کیا گیا اور بچہ اللہ کے فضل سے زندہ ہو گیا۔ وہ آجکل قبولہ بازار عارف والا میں ٹرنکوں کا کاروبار کرتا ہے۔

جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کر دی۔ حضرت شاہؒ کے مریدوں نے ہجرت کرنے کا مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا۔

"ابھی حکم نہیں آیا۔ حقیقتاً بزرگانِ دین کا کام تو اب شروع ہوا ہے۔" چنانچہ آپ اس پُرآشوب دَور میں بدحال و پریشان دل لوگوں کو حوصلہ دیتے اور مدد فرماتے تھے۔ آپ نے جالندھر میں مہاجرین کے کیمپ میں لنگر جاری کر دیا تاکہ مخلوقِ خدا بھوک اور پیاس کے شدائد سے محفوظ رہے۔ ایک مرتبہ لنگر کے لیے خورد و نوش کا سامان لینے کے لیے جالندھر شہر گئے تو سکھ بلوائی آ گئے۔ وہ آپ کو شہید کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے ساتھی گھبرا گئے۔ آپ نے اُنھیں اللہ کا ذکر کرنے کی تلقین فرمائی۔ سب لوگ یا وَدُود پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے بلوائیوں کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل کر دیئے اور وہ اِدھر اُدھر پھیل گئے لیکن آپ اور آپ کے ساتھی انھیں نظر نہ آئے۔ نومبر ۱۹۴۷ء کے آخر میں آپ پاکستان تشریف لائے تو صرف تہبند پہنے ہوئے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں انفنٹری روڈ والی قیام گاہ دوالوں کا ڈیرہ کے نام سے مشہور ہوئی اور فیضِ عام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

ایک دن آپ اپنی جھونپڑی کے سامنے تشریف فرما تھے کہ ایک عورت اور مرد حاضرِ خدمت ہوئے۔ میاں بیوی کے چہروں پر اُداسی و مایوسی ٹپکتی تھی۔ ان کی شادی کو کئی سال بیت گئے تھے لیکن ہنوز عورت کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے اس عورت کو نہ صرف بچے کی پیدائش کی خوشخبری دی بلکہ اس کا نام بھی رکھ دیا اور بارگاہِ ربّ العزت میں اس طرح دُعا گو ہوئے۔

"اے باری تعالیٰ! نام میں نے رکھ دیا ہے بچہ تُو عطا فرما دے۔"

رب کریم نے آپ کی دُعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور اس کے ہاں نرینہ اولاد تولّد ہوئی۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ تشریف فرما تھے کہ ایک عورت اپنا مریل سا بچّہ لے کر آئی اور عرض گزار ہوئی۔

"بابا جی! یہ بچّہ آپ دیکھ رہے ہیں، نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ اس کا علاج فرمادیں۔"

آپ نے اس ماتا کی ماری عورت کی بات سُن کر فرمایا۔

"جا بی بی! بزرگانِ دین نے تیرے بیمار و کمزور بچّے سے اپنا صحت مند بچّہ بدل دیا ہے۔" چنانچہ وہ بچّہ دِنوں کے اندر تندرست و توانا ہوگیا۔

حضرت فضل شاہ قطب عالمؒ کا لنگر دن رات جاری رہتا تھا۔ بعض اوقات چار پانچ سو آدمی کھانا کھاتے تھے۔ جتنے زیادہ لوگ ہوتے آپ کو اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ آپ کے پاس نہ جائیداد تھی نہ مال وزر۔ فقط اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ تھا۔ جو بھی سائل آتا اُس کی حاجت روائی کی جاتی۔ عقل حیران تھی کہ یہ سب کچھ کہاں سے آتا ہے۔ آپ کے مُریدین کہتے تھے کہ یہ دستِ غیب کی بدولت تھا جو حضرت اویس قرنی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو عطا کیا تھا۔ جب بھی جیب میں ہاتھ ڈالتے پیسے نکل آتے تھے۔

ایک مرتبہ کراچی کے ریلوے سٹیشن پر گاڑی کا انتظار فرما رہے تھے، بہت سے مریدین موجود تھے۔ ایک چور نے سوچا کہ مریدین نے اپنے مُرشد کو خوب نذرانہ دیا ہوگا۔ نوٹوں سے جیب بھری ہوگی۔ اس نے جب آپ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو بڑا شرمسار ہوا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خوف سے بھاگا تو آپ نے اُسے آواز دے کر فرمایا۔

"ہمارے پاس سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں گیا۔ رُک جاؤ تم بھی کچھ لیتے جاؤ۔"

لیکن وہ تیزی سے بھاگ گیا۔ آپ کسی سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ اگر کوئی ہدیہ پیش کرتا تو فوراً حاضرین میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔

لنگر کے لیے ہمیشہ عطا محمّد قصائی سے گوشت خریدا کرتے تھے۔ ایک بار وہ سخت بیمار پڑھ گیا۔ اطباء اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ دو چار دن جب وہ دُکان پر نہ آیا تو آپ نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ بتایا گیا تو اس کی بیمار پُرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ بارگاہِ ربّ العزّت میں عرض کی۔

"مولا کریم! عطا محمّد لنگر کے لیے بڑے پیار سے گوشت دیتا ہے اگر اس کی زندگی ختم بھی ہوگئی ہے تو اسے اور عطا کردے تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

یہ فرما کر آپ واپس آگئے۔ دوسرے دن جب بازار تشریف لے گئے تو عطا محمّد قصائی دُکان پر بیٹھا تھا۔

ایک شخص عالم الٰہی المعروف عالم شاہ شادی سے گریزاں تھا۔ اس کی ماں جب کہتے کہتے عاجز آگئی تو حضرت قطب عالمؒ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی اور سارا ماجرا گوش گذار کیا۔ آپ نے عالم شاہ کو بُلایا۔ جب آیا تو شادی نہ کرنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ اس نے عرض کیا کہ حضور! شادی کرالوں گا مگر اس کے لیے میری دو شرائط ہیں۔ دریافت فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ اولاً میرے ہاں صرف لڑکے ہی پیدا ہوں ثانیاً میں تاحیات کوئی کام نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا۔ دونوں شرطیں منظور ہیں چنانچہ اس نے شادی کر لی اور جیسا آپ نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس کے ہاں اولادِ نرینہ ہی پیدا ہوئی اور خدا نے غیر متوقع جائیداد سے بھی نوازا۔

آپ کرامات کو وجہِ فضلیت نہیں سمجھتے تھے لیکن اکثر اوقات خوارقِ عادت کا ظہور ہو جایا کرتا تھا۔ آپ رُوحانی و جسمانی طبیب بھی تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جسمانی امراض کا علاج پرہیز اور روحانی عوارض سے صحت یابی پرہیزگاری میں مضمر ہے۔ کینسر، کنٹھیا، ذیابیطس جیسے کہنہ اور لاعلاج سے لاعلاج مریض دِنوں میں بفضلِ تعالیٰ آپ کی دُعا برکت اور علاج سے صحت یاب ہو جایا کرتے تھے اور پھر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ آئندہ یہ مرض زندگی بھر نہیں ہوگا۔

حضرت فضل شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے کسی مکتب سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن علم لدُنی کی سلطنت کے فرماں روا تھے۔ ایک مرتبہ قومی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں بہت سے لوگ شرکت کے لیے مسجد میں جمع ہوگئے ارشاد فرمایا۔

Kashif

جس کا جو سوال ہو پوچھ لے۔"
یہ بہت عظیم بات تھی۔ کوئی عام شخص یہ کہنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حاضرینِ محفل نے شرعی مسائل، طریقت کی منازل، روحانی عوارض، جسمانی امراض، معاشرتی برائیوں، سماجی الجھاؤ، معاشی تنگدستیوں، نفسیاتی الجھنوں، سیاسی موشگافیوں، شیطانی ہتھکنڈوں، مستقبل کے معاملات، حال کی چیرہ دستیوں، متنازعہ فیہ امور اور افتراق و فتنہ و فساد وغیرہ کے متعلق سوالات دریافت کئے۔ آپ نے سب کا علم الٰہی سے شافی و مدلل جواب مرحمت فرمایا۔ بعض سوالات کے جوابات عطا کرنے سے قبل ارشاد فرمایا کہ ان کا جواب سننے کے بعد تم پر لازم ہوگا کہ فرمان کے مطابق عمل کرو۔ اگر نہ کرو گے تو مشقت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ناقص الاعمال لوگوں میں اتنا حوصلہ کہاں تھا کہ جواب سننے پر آمادہ ہوتے۔ انھیں یقین تھا کہ قطب عالم کی زبان پاک سے جو نکل گیا اس کے مطابق اگر عمل نہ کیا تو مبتلائے بلا ہو کر رہیں گے۔
ایمان کی پہچان کے بارے میں سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اُسے محبوب حق صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت ہوگی اور اپنی جان سے بڑھ کر ہوگی۔ محبّ سوائے محبّت کے کسی عمل سے نہیں بنتا۔ یہی صورت قلبی امن اور ایمان کے حصول کی ہے۔
مصائب سے گلو خلاصی کے متعلق ایک سوال کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو حال بھی ہو اُسی پر راضی برحق رہنا چاہیئے یہی نجات کی صورت ہے۔
تکبّر اور اس کے علاج کے سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ عطائے حق کو اپنی کوشش اور کاوش کا نتیجہ جاننا اور علمِ الٰہی میں اپنی چاہت کو داخل کرنا تکبّر ہے اور اس کا علاج خدمتِ خلق ہے۔
بہت سے لوگ اپنی مشکلات خطوط میں لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے جنہیں جواب کے ذریعے ان کے حل بتائے جاتے تھے۔ آپکے مکتوبات علم و حکمت و معرفت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہیں۔ کئی لوگ اپنے رویا کی تعبیر بھی پوچھا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ خواب کی تعبیر اس سے دریافت کرنی چاہیے جو صاحب تعبیر ہو کیونکہ حل بھی وہی بتا سکتا ہے۔
حضرت فضل شاہ قطب عالمؒ نے قرآن حکیم کی تفسیر پاک بھی لکھوائی تھی۔ فرماتے تھے اس میں ہماری زیر، زبر اور پیش تک نہیں الہامی ہے۔ اکثر و بیشتر پوری آیات مبارکہ کی تفسیر پاک آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور وہ پڑھ کر لکھوا دیتے تھے۔
آپ ۲۱ جون ۱۹۷۸ء کو مرض بھگندر میں مبتلا ہوئے۔ چالیس روز علیل رہنے کے بعد ۳۰ جولائی ۱۹۷۸ء بمطابق ۲۳ شعبان ۱۳۹۸ ہجری بروز یک شنبہ ساڑھے گیارہ بجے دن بعمر ایک سو ایک سال اپنے خالق حقیقی کے پاس تشریف لے گئے۔
آپ کا مدفن الفنڈری روڈ پر نوروالوں کا ڈیرہ پاک میں مرجع خلائق ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ۲۲ اور ۲۳ شعبان المعظم کو ہوتا ہے۔

****

عباسی

خلیفہ جعفر منصور مُصر تھا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا منصب قبول کر لیں لیکن ابو حنیفہؒ اپنے تقوے اور بے داغ کردار کے پیشِ نظر یہ عہدہ اس لیے نہیں قبول کر رہے تھے کہ اُن کے فیصلوں میں خلیفہ منصور کے دباؤ، لحاظ یا اثر کے مخل انداز ہونے کا اندیشہ تھا اور بصورت دیگر انہوں نے یہ بھی سوچا کہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہو جانے کے بعد اگر وہ خلیفہ منصور کی مرضی کے خلاف فیصلے کریں گے تو یقیناً خلافت کا عتاب نازل ہوگا۔ ان حالات میں حضرت ابو حنیفہؒ نے یہی مناسب سمجھا کہ انکار کر دیں۔
کئی بار کی ناکامی کے بعد خلیفہ منصور نے حضرت ابو حنیفہؒ کو جبراً آمادہ کرنا چاہا، کہا "میں مجبوراً تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اس منصب کو قبول کرو۔"
حضرت ابو حنیفہؒ نے انکار کر دیا۔ بولے "جناب والا! میں خود کو اس منصب کا اہل نہیں پاتا۔"
خلیفہ منصور آگ بگولہ ہو گیا، تُرش لہجے میں بولا "تم جھوٹ بولتے ہو۔"
حضرت ابو حنیفہؒ نے برجستہ جواب دیا "تو آپ نے خود ہی فیصلہ فرما لیا کہ ایک جھوٹا آدمی قاضی القضاۃ کے منصب کا اہل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔"

شیخ علی متقی، توکل اور استغنا کے پیکر تھے۔ سینے میں علم ودانش مندی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ نوجوانی میں ہی یادِ الٰہی میں ایسے مشغول ہوئے کہ خود کو اللہ کی ذات میں ہی فنا کر ڈالا اور اس مقام پر جا پہنچے جہاں حسین ابن منصور نے
کا نعرہ بلند کیا تھا، لیکن آپ کو حال کی عریانی پسند نہ تھی ہمیشہ ضبط کیے رہتے۔

آپ کا نام حسام الدین تھا۔ زہد وتقویٰ میں بے مثل، لوگ متقی کہہ کر پکارتے تھے حسام الدین جو نپور سے برہان پور ہجرت کرکے آئے
…نے انہیں ایک ایسے بیٹے سے نوازا جس نے ایک عالم کو چونکا ڈالا۔ گفتار میں جدا، رہن سہن میں علیحدہ۔ غرض انفرادیت
…تھا۔ لوگ دیکھتے تو محسوس کرتے کہ حسام الدین کا یہ فرزند ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کی مثل، باپ کا نام خوب روشن کریگا۔
…ہی شیخ علی کے فطری جوہر کھل کر سامنے آنے لگے۔ بچپن میں ہی سنجیدگی ومتانت کے پیکر بن چکے تھے۔ حسام الدین کو تعلیم کی فکر
…کے ایک باعمل درویش شاہ باجن چشتی کی خدمت میں لے گئے اور فرمایا "حضرت! انہیں تعلیم دینی سے آراستہ کرنا اب
…نے ٹھہرا۔"

شاہ باجن نے بچے کو دیکھا۔ اس کی عظمت وبزرگی پل بھر میں شاہ صاحب پر عیاں ہوگئی۔ بولے "میں بھلا اسے کیا دعا دے سکتا ہوں۔
…اس کی دعاؤں کی طلبگار ہوگی۔ میاں حسام الدین تمہارا یہ بچہ تو ازل سے ہی دعا کے سائے میں ہے۔" حسام الدین خود بھی اپنے بیٹے
…کچھ جان چکے تھے۔ شاہ باجن کی گفتگو نے انہیں اور یقین دلا دیا کہ ان کا بچہ ایک دن عظمت وبزرگی کا درخشاں ستارا

…شیخ علی کی راہ تک رہی تھی۔ سن بلوغت کو ابھی نہیں پہنچے تھے کہ حسام الدین کے پدرانہ سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے شیخ علی پر گویا
…دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ کیا ہوگیا ہے۔ اس حالتِ دیوانگی میں جو گھر سے بھاگے تو ایک مدت تک متعلقین
…صورت نہ دیکھی۔ ایک عرصہ بعد گھر کا خیال آیا تو افسردہ حالت میں واپس لوٹے۔ عزیز واقارب نے حال احوال پوچھا اور آئندہ کے ارادے
…تو شیخ علی نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا "باپ کی جدائی کے غم سے مجھ پر جو گزری ہے وہ کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اس غم کو
…کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اب کسی کام میں الجھ کر اس غم سے نجات پانا چاہتا ہوں۔"

خاندان کے بااثر افراد نے جو آپ کو کام پر مائل دیکھا تو مانڈو کے حکمراں کے پاس ملازم رکھوا دیا۔ آپ نے یہاں بڑے انہماک اور یکسوئی سے کام کیا اور ڈھیر ساری دولت کما ڈالی۔

ایک دن کسی درویش نے اُن سے پوچھا: "بابا! یہ جو تو دن رات کام سے لگا رہتا ہے تو اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا یوں ہی بے مقصد لگا ہُوا ہے؟"

شیخ علی نے جواب دیا: "اس کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد ہے زیادہ سے زیادہ کمانا۔"

درویش نے کہا: "شیخ علی! یہ کوئی مقصد نہیں ہے، تو سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے خدا تجھ پہ رحم فرمائے۔"

شیخ علی نے پُوچھا: "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں کیا کروں؟"

درویش نے جواب دیا: "برخوردار! اپنی آٹھ سالہ زندگی کا وہ دن یاد کر جب تجھ کو تیرے باپ نے شاہ باجن کی خدمت میں پیش کیا تھا، وہاں سے تجھ کو جو کچھ مل چکا ہے اسی سے کام لے، اسی کو کارآمد بنا۔"

شیخ علی خوفزدہ ہو گئے، آہستہ سے کہا: "بابا! میں کیا کروں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

درویش نے کہا: "بابا شیخ علی! تو شاہ باجن کے صاحبزادے شیخ عبدالحکیم کے پاس چلا جا۔ تجھے جو کچھ وہاں سے ملنے والا تھا، اب اُن سے مل جائے گا، شرع میں شرم کیسی؟"

شیخ علی کا خیال اُس دولت کی طرف چلا گیا جو دُنیاوی چکر میں پڑ کر کمائی تھی، یہ دولت اُن کو روک رہی تھی، دولت شیخ علی سے کہہ رہی تھی: "شیخ علی! دولت ہے تو سب کچھ ہے، دنیا کا لُطف اُٹھاؤ، مزے کرلو، یہ مواقع روز روز نہیں ملتے۔"

لیکن اُن کا ضمیر اور نفسِ لوّامہ انھیں کسی اور ہی سمت لیے جا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا: "شیخ علی! یہ دُنیا کتنے دن تیرا ساتھ دے گی۔ یہ دولت کب تک تیرے پاس رہے گی، غافل نوجوان! دولت ہرجائی ہوتی ہے یہ کل کسی اور کے پاس تھی، آج تیرے پاس آگئی ہے کل کسی اور کو پسند کرے گی، بس ہرجائی سے پیچھا چھڑا۔"

شیخ علی ضمیر اور نفسِ لوّامہ کی ملامتوں سے تنگ آگئے اور اُنھوں نے وہ قدم اٹھایا کہ جس نے بھی سُنا دنگ رہ گیا۔

شیخ علی نے اپنی ساری دولت خدا کے نام پر غربا اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔ شاہ باجن چشتی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُن کی جگہ شاہ باجن کے صاحبزادے عبدالحکیم مسند آرائے خلافت تھے، یہ اُن کی خدمت میں پہنچے اور رو رو کر اپنا حالِ زار بیان کیا۔ شاہ عبدالحکیم نے تسلی دی اور کچھ دن اپنے پاس رکھ کر حکم دیا کہ ملتان میں شیخ حسام الدین متقی کے پاس جائیں وہیں سے گوہرِ مراد حاصل ہوگا۔

شیخ علی ملتان پہنچے تو انھیں استاد بھی عجیب و غریب ملا۔ اپنے طور و طریق اور انداز سے شیخ علی کے شاگرد معلوم ہوتے تھے۔

شیخ حسام الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ شیخ علی کو شاہ عبدالحکیم ابن شاہ باجن نے بھیجا ہے تو شیخ حسام الدین نے کہا: "صاحبزادے! آپ جس دربار کے بھیجے ہوئے ہیں میں اس کا بے حد احترام کرتا ہوں۔"

شیخ علی نے درخواست کی: "حضرت! میں تو آپ سے درس لینے آیا ہوں۔ آپ مجھے اس مقصد کے لیے جو وقت دیں گے میں اس کا پابند ہو جاؤں گا۔"

شیخ حسام الدین نے جواب دیا: "میاں صاحبزادے! میں آپ کو کیا وقت دوں گا، وقت تو مجھے آپ دیں گے۔"

شیخ علی نے حیرت سے پوچھا: "اُستادِ محترم! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

شیخ حسام الدین نے جواب دیا: "صاحبزادے! آپ مجھے اپنا وقت بتا دیں، میں خود حاضر ہو جایا کروں گا۔"

شیخ علی نے ندامت سی محسوس کی، شرمسار ہو کر کہا: "آپ اُستاد ہیں، آپ کیوں زحمت فرمائیں گے۔"

شیخ حسام الدین نے انھیں اپنے پاس بٹھا لیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے اور اسی بات پر مُصر رہے کہ وہ خود پہنچ جایا کریں گے۔ شیخ علی کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر پوچھا: "صاحبزادے! آپ نے قیام کہاں فرمایا ہے؟"

شیخ علی نے جواب دیا: "کہیں بھی نہیں۔ آپ سے بات کرلے کے بعد رہنے کا بندوبست بھی کروں گا۔"

حسام الدین متقی نے فرمایا: "واہ، یہ کیا بات ہوئی۔ آپ کہاں جائیں گے رہائش کا بندوبست کرنے۔ میں یہیں اپنے پاس ہی ایک کمرے کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔"

چنانچہ انھوں نے ایک کمرہ خالی کر کے شیخ علی کے سپرد کر دیا۔

ظہر کے کچھ دیر بعد شیخ علی کے بند دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ شیخ علی نے آہستہ سے پوچھا: "کون صاحب؟"

باہر سے جواب ملا۔ "حسام الدین متقی۔ میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے معلوم کروں، کیا فرصت ہے؟ میں آ جاؤں اور
ھا دوں۔"

شیخ علی نے جواب دیا۔ "کیا اس کے لیے آپ کو مجھ سے اجازت لینا ہوگی؟ آپ مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہیں؟"
حسام الدین متقی نے باہر ہی سے کہا۔ "صاحبزادے! آپ صرف یہ بتائیں کہ اس وقت فرصت ہے یا نہیں۔ یعنی آپ
سنا پسند فرمائیں گے یا نہیں۔ اگر نہیں تو میں دوبارہ آ جاؤں گا۔"
شیخ علی نے استاد کو اندر بلا لیا اور ان سے تفسیر بیضاوی کا درس لینا شروع کر دیا۔ پڑھ چکنے کے بعد شیخ علی نے استاد سے پوچھا
استاد محترم! اگر میں یہ کہہ دیتا کہ میں اس وقت نہیں پڑھوں گا تو آپ کیا کرتے؟"
شیخ حسام الدین نے جواب دیا۔ "میں واپس چلا جاتا اور دوبارہ آ جاتا۔"
شیخ علی کو اس جواب نے خوش بھی کر دیا اور طمانیت بھی بخشی۔
آپ میں معلوم نہیں کیا بات تھی کہ جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا، گرویدہ اور مداح ہو جاتا۔
آپ نے تعلیم حاصل کر لی اور خود اعتمادی اور انا میں اضافہ ہو گیا۔ آپ کی شہرت یوں پھوٹ نکلی جس طرح پھول سے خوشبو نکل کر
کو معطر اور خوشگوار بنا دیتی ہے۔ آپ نے اپنے اردگرد جن لوگوں کو جمع کر لیا تھا، وہ اس دور کے برگزیدہ اور نیک بندے تھے۔
آپ نے ایک تھیلے میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ لیں اور ساتھ ہی چند کتابیں بھی اور ادھر ادھر کی سیاحت شروع کر دی۔ آپ کے
میں استغنا اتنا تھا کہ کسی کو آپ میں حرص و طمع کا شائبہ تک نہ ملتا تھا۔ دو دن کا سامان چار دن چلتا تھا۔ دوران سفر جنگل میں بھی
رہتے تھے اور ویرانوں میں بھی۔ لکڑیاں خود کاٹتے اور اپنا کھانا خود تیار کرتے۔ آپ مسجد میں قیام نہیں فرماتے تھے۔ کھانا پکانے اور
سے پہلے برتنوں کو خوب صفائی سے دھوتے اس کے بعد انھیں کام میں لاتے۔ عقیدت مندوں میں شب و روز اضافہ ہوتا جا رہا
ض ارادت مند یہ خواہش کرتے کہ سفر میں آپ کا ساتھ دیں مگر آپ انھیں منع کر دیتے کیونکہ وہ کسی انسان سے خدمت
پسند نہیں فرماتے تھے۔

●

ان دنوں گجرات میں سلطان بہادر کی حکومت تھی۔ شیخ علی کی شہرت گجرات تک پہنچ چکی تھی۔ سلطان بہادر کو آپ سے
کا اشتیاق ہوا۔ اس نے آپ کی خدمت میں کئی آدمی اس غرض سے بھیجے کہ وہ سلطان بہادر کی درخواست ملاقات آپ
پہنچا دیں۔ آپ ہر ایک کو یہ جواب دے کر واپس کر دیتے کہ "درویشی اور شاہی کا یک جا ہونا محال ہے۔ میں سلطان بہادر
میں دور ہی سے دعائیں کرتا رہوں گا۔"
آپ گھومتے پھرتے گجرات پہنچے اور جس کے مکان میں آپ نے قیام فرمایا وہ آپ کا بڑا عقیدت مند تھا۔ اس نے آپ سے
ت کی۔ "حضرت! جیسا کہ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ یہاں سلطان بہادر کی حکمرانی ہے ہم سب اس کی رعایا ہیں۔ آپ نے
خوش قسمتی سے اس مکان میں قیام فرمایا ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ سلطان بہادر کو آپ سے ملاقات کا بے حد اشتیاق ہے۔"
آپ نے اس کی بات کاٹ دی، پوچھا۔ "تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ اپنا مطلب بیان کر ذرا کھل کر۔ پہیلیاں نہ بجھا۔"
ارادت مند نے عرض کیا۔ "وہی تو میں عرض کر رہا ہوں، سلطان بہادر کی خواہش ہے کہ وہ ایک بار آپ سے ضرور ملاقات کرے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا اور اگر تو مجھے مجبور کرے گا تو میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔"
میزبان ڈر گیا، بولا۔ "میں آپ کو مجبور کیوں کرنے لگا۔ توبہ توبہ۔ میں نے تو ایک بات عرض کر دی۔ آپ بشوق بیٹھیں
بندہ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔"
آپ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کرتے تھے۔ عقیدت مندوں کا یہ حال تھا کہ وہ باہر جمع ہو جاتے اور جب آپ
کھولتے تو وہ نہایت ادب اور قرینے سے آپ کی خدمت میں حاضری دیتے اور اقوالِ زریں کو دل و دماغ میں بسا کر
چلے جاتے۔
ان لوگوں میں آپ نے ایک دن ایسا چہرہ دیکھا جو دوسروں سے بالکل مختلف تھا۔ یہ چہرہ تھا عالم اور متقی قاضی [illegible]
یہ قاضی صاحب بھی ابرار و صلحاء میں بڑی عزت و شہرت کے مالک تھے۔ یہ بڑے اشتیاق سے آپ کی خدمت [illegible]
اور دیر تک اپنے مسلک پر باتیں کرتے رہے۔ آخر میں عرض کیا۔ "یا شیخ! کئی دن ہو گئے، میری سلطان بہادر سے [illegible]

ملاقات ہوئی تھی، میں نے محسوس کیا اس کے دل میں آپ کا بڑا احترام ہے۔"

آپ نے بے چین ہو کر پوچھا: "قاضی صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، صاف صاف بات کیجیے۔"

قاضی صاحب نے عرض کیا: "یا شیخ! اب آپ زیادہ مایوس نہ کریں سلطان بہادر کی خواہش ہے کہ وہ کم از کم ایک بار آپ کو بالکل قریب سے دیکھ لے، آمنے سامنے رُو در رُو، روبرو۔"

آپ نے فرمایا: "لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ وہ مجھ سے فضول باتیں کرے گا اور میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں۔"

قاضی صاحب نے جواب دیا: "اگر آپ سلطان سے بات نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں، آپ اس سے ملاقات تو کریں. جب سلطان آپ کے روبرو ہو گا۔ ہم سلطان کو باتوں میں لگا لیں گے۔"

آپ نے مزید اعتراض فرمایا: "سلطان کے لباس اور وضع قطع میں غیر اسلامی رنگ جھلکتا ہے اور یہ میرے لیے ناممکن ہے کہ میں سلطان کو اس عجیب ہیئت میں دیکھوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے باز رہوں اور جب میں سلطان کو نصیحتیں کروں گا تو ایک زمانہ میرا مخالف ہو جائے گا۔ اور خود سلطان بھی میری جان کا پیاسا ہو جائے گا۔"

قاضی صاحب نے فرمایا: "نہیں! ایسا نہیں ہو گا۔ میں اس بات کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ اگر کچھ بھی وہاں ہوا تو اس میں میرا ہاتھ ہو گا اور میں ایسا کسی بھی طرح نہیں ہونے دوں گا۔"

ان کے بعد قاضی عبداللہ سندھی نے سلطان بہادر سے باتیں کیں اور شیخ صاحب کا مدعا عرض کر دیا۔ سلطان نے جواب دیا۔ "قاضی صاحب! آپ ذرا غور تو فرمائیں کہ ایک . . ."

قاضی عبداللہ نے سلطان بہادر کی بات کاٹ دی، کہا: "حضرت! گستاخی معاف، آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر آپ شیخ علی سے ملنا اور انہیں اپنے سامنے بیٹھا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو ان کی بات ماننا پڑے گی۔"

سلطان بہادر نے بدرجہ مجبوری عرض کیا: "ہمیں منظور ہے۔"

قاضی عبداللہ نے جب آپ کو مطلع کیا کہ سلطان بہادر ان کی ہر شرط تسلیم کر چکا ہے تو آپ نے سلطان بہادر کو آنے کی اجازت دے دی۔ سلطان بہادر نہایت ادب سے آپ کے سامنے حاضر ہوا، سلام کیا۔ آپ نے سلطان کے سلام کا جواب تو دے دیا مگر نظریں نہیں ملائیں اپنے ایک مرید سے کہا: "سلطان کو میری طرف سے نصیحتیں کر دے۔"

آپ کے مرید نے بولنا شروع کیا: "سلطان والا شان! ہمیں پیر مرشد نے حکم دیا ہے کہ آپ کو چند نصیحتیں کریں چنانچہ ہم آپ کو مطلع کرتے ہیں کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ یہ زندگی ہیچ اور سرتا پا سراب ہے۔ اقتدار، حکومت اور فرماں روائی آدمی کا دماغ خراب کر دیتے ہیں آپ کو ان باتوں کا ہر وقت خیال رکھنا چاہیے۔"

سلطان بہادر نے شاہ علی سے عرض کیا: "حضرت! ہم تو آپ کے پاس آئے تھے، آپ سے باتیں کرنے، آپ کا دیدار حاصل کرنے لیکن ہمیں تو یہاں دیدار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملا۔"

آپ نے اپنے مرید سے فرمایا: "سلطان بہادر سے کہہ دے میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں دے سکتا۔"

مرید نے سلطان بہادر سے کہہ دیا سلطان بہادر کچھ دیر آپ کی صحبت میں رہا۔ اس کے بعد محل چلا گیا۔

دوسرے دن سلطان بہادر نے ایک کروڑ روپے گجراتی آپ کی خدمت میں بھیجے۔ آپ نے یہ ساری رقم وصول تو کر لی مگر قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی اور فرمایا: "بھائی قاضی! یہ رقم آپ کی ہے کیونکہ سلطان بہادر سے ملاقات کا اہتمام اور التزام آپ ہی نے فرمایا تھا۔"

قاضی صاحب کو تامل ہوا، مگر آپ نہیں مانے اور مذکورہ رقم زبردستی قاضی صاحب کے حوالے کر دی۔

سلطان بہادر کی دیکھا دیکھی، وزیر کو آپ سے ملاقات کا شوق چرایا۔ اس نے آپ کی خدمت میں اپنا ایک آدمی روانہ کیا۔ یہ شخص آیا اور آپ سے درخواست کی: "حضرت! مجھے وزیر صاحب نے بھیجا ہے۔"

آپ نے دریافت فرمایا: "آنے کا مطلب؟"

وزیر کے آدمی نے جواب دیا: "حضرت! وزیر محترم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

آپ نے فرمایا: "تو اس کو روکا کس نے ہے، آ لے۔"

اُس شخص نے جواب دیا: نہیں جناب وزیر کی یہ خواہش نہیں ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضری دے، چند باتیں کرے اور چلا جائے۔ اس کے برعکس وزیر موصوف کی دلی خواہش ہے کہ آپ اس کی ایک دعوت قبول فرمالیں۔"

اُس وقت آپ بے حد نرم تھے، فرمایا: "میں دعوت تین شرطوں پر قبول کر سکتا ہوں اگر تیرے وزیر کو میری تینوں شرطیں منظور ہوں تو میں اس کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔"

اس شخص نے عرض کیا: "پیر مرشد! وہ تینوں شرطیں بھی گوش گزار فرما دیں۔"

آپ نے فرمایا: "اپنے وزیر سے کہہ دینا کہ میری پہلی شرط یہ ہے کہ میں جہاں چاہوں گا اپنی مرضی سے بیٹھوں گا۔ مجھے کوئی مجبور نہیں کرے گا کہ حضرت! یہاں نہیں یہاں تشریف رکھیں میرے لیے آپ سب کا یہ اصرار بالکل فضول ہوگا۔"

وزیر کے نمائندے نے جواب دیا: "حضرت! ہمیں آپ کی پہلی شرط منظور ہے اب دوسری بیان فرمائیں۔"

آپ نے فرمایا: "میری دوسری شرط یہ ہے کہ میں وہاں جو چاہوں گا، کھاؤں گا۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کرے گا کہ حضرت یہ کھایئے اور یہ نہ کھایئے۔"

وزیر کے نمائندے نے کہا: "مجھے یہ دوسری شرط بھی منظور ہے، اب تیسری بھی بیان فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا: "میری تیسری شرط یہ ہے کہ میں جب چاہوں گا واپسی کے لیے کھڑا ہو جاؤں گا۔ تم لوگ مجھے مجبور نہیں کرو گے کہ حضرت کچھ دیر اور، کچھ دیر اور۔"

اس شخص نے کہا: "مجھے آپ کی یہ تیسری شرط بھی منظور ہے۔"

آپ نے فرمایا: "اگر تجھ کو میری تینوں شرطیں منظور ہیں تو پھر دیر کیوں، وزیر کے دربار میں فوراً مجھے لے چل۔"

وزیر کا نمائندہ بے حد خوش تھا کہ آپ نے اُس کی بات مان لی تھی۔

دوسرے دن وزیر کا آدمی آپ کے پاس آیا اور آپ کو وزیر کے پاس لے گیا۔ آپ کے گلے میں ایک تھیلی لٹکی ہوئی تھی اس میں روٹی کے چند ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔

وزیر نے آپ کے لیے شاہانہ انتظام کیا تھا، یہ دکھانے کے لیے کہ جس شخص کو سلطان اپنے محل میں نہیں بلا سکا، وزیر نے بلوا لیا ہے۔ ں نے امراء اور معززین شہر کو بھی اس دعوت میں بلا لیا تھا۔ اس ہال کو جہاں آپ کو بٹھانا تھا۔ فرش و فروش سے آراستہ کر دیا تھا۔ پ وہاں تشریف لے گئے اور ہال کے باہر دروازے کے پاس بیٹھ گئے۔

وزیر نے مودبانہ سلام عرض کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا۔

وزیر نے کہا: "حضرت! یہ آپ کہاں بیٹھ گئے، اندر تشریف لایئے۔"

آپ نے فرمایا: "میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

وزیر نے مزید اصرار کیا: "حضرت! یہ کیونکر ہوگا کہ آپ باہر کھڑے رہیں اور دوسرے لوگ قالینوں پر بیٹھ کر خوش گپیاں کریں۔"

آپ نے جواب دیا: "دیکھو ہماری تینوں شرطوں میں پہلی شرط یہی تھی کہ ہم جہاں چاہیں گے بیٹھ جائیں گے تو اصرار نہیں کرے گا ں نہیں یہاں بیٹھیے۔ میری پہلی شرط پوری ہوگئی کہ میں یہاں لوگوں سے دور الگ تھلگ بیٹھا ہوا ہوں۔"

وزیر نے اندر طرح طرح کے کھانے چنوائے اور جب باہر نکلا تو یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ آپ نے اپنی تھیلی میں سے روٹی کے ے نکال کر کھانا شروع کر دیے۔

وزیر نے جو یہ منظر دیکھا تو دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا، بولا: "یہ آپ کیا کھا رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "روٹی کے ٹکڑے۔"

وزیر نے عاجزی سے عرض کیا: "حضرت! میں نے تو جس مان اور گمان سے آپ کو بلایا تھا وہ سارا برباد ہوگیا۔"

آپ نے فرمایا: "لیکن میں نے آنے سے پہلے تیرے آدمی سے ملاقات کی اور اس سے تینوں شرطیں طے کر کے تیرے پاس چلا آیا۔"

وزیر نے روہانسے انداز میں کہا: "حضرت! شایانِ شان طریقے تو آپ اس تقریب میں شریک ہوتے اور نہ ہی کچھ کھایا پیا۔ اس کا مجھے ی بھر افسوس رہے گا۔"

آپ نے کھڑے ہو کر جواب دیا: "بہرحال میں نے جو کچھ بھی کیا اپنی شرائط کو سامنے رکھ کر۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا: "اور اب میں اپنے

وزیر بہت زیادہ گھبرا گیا، بولا "کچھ دیر تو اور ٹھہریے"
آپ نے فرمایا "نہیں، جتنی دیر ٹھہر گیا، کافی تھا"
وزیر کھسیایا ہوا دیکھتا رہ گیا اور آپ چلے گئے۔

❁

آپ کی خدمت میں کمال نامی ایک خدمت گار ہر وقت رہتا تھا۔ وہ بڑا گستاخ تھا مگر آپ کو اپنے نفس پر بڑا قابو حاصل تھا اور اپنی ذات کی حد تک اس کی بدتمیزیوں کو بھی برداشت کر لیتے تھے۔ آپ کا کھانا بھی کمال تیار کرتا تھا۔ آپ نے کبھی اس کے کسی کھانے پر اعتراض نہیں کیا۔

آپ کو بھوک بہت زیادہ لگی ہوئی تھی۔ آپ نے کمال کو حکم دیا "کیا کھانا تیار ہے؟"

کمال نے جواب دیا "جی تیار ہے، لاؤں؟"

آپ نے فرمایا "لے آ"

کمال صرف شوربا لے آیا، آپ نے شوربا چکھا تو اس میں نمک کی بڑی زیادتی تھی اور مزہ بھی بے حد خراب تھا۔ آپ نے کمال کو آواز دی "بابا کمال! ذرا ادھر تو آنا"

کمال ڈھٹائی سے اکڑا ہوا، بولا "کیا بات ہے؟"

آپ نے فرمایا "ذرا چکھنا تو سہی اس شوربے کو"

کمال نے شوربے کو چکھا اور منہ بنا کر پوچھا "اس میں کیا خاص بات ہے؟"

آپ نے فرمایا "اس میں کوئی خاص بات مجھے نہیں محسوس ہوتی؟"

کمال نے جواب دیا "نہیں۔ مجھے تو اس کے سوا کوئی خاص بات نہیں محسوس ہوتی کہ نمک بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ مگر اس سے مزے پر کوئی فرق نہیں آیا"

آپ نے پوچھا "کیا تو اسے کھا سکتا ہے؟"

کمال نے جواب دیا "کیوں نہیں، مگر میں نہیں کھاؤں گا"

آپ نے کہا "کیوں؟ کیوں نہیں کھائے گا؟"

کمال نے جواب دیا "میں اس لیے نہیں کھاؤں گا کہ میں نے یہ شوربا اپنے لیے نہیں آپ کے لیے پکایا ہے اس لیے اسے آپ ہی کھائیں گے"

آپ نے کمال کی اس تلخ و ترش بات کو بھی گوارا کر لیا اور فرمایا "یہ بہت خوب بابا کمال! ذرا پانی تو لانا"

کمال پیالہ بھر کے پانی کا لے آیا، آپ نے یہ پانی شوربے میں ملا دیا اور پھر اس شوربے کو بآسانی پی گئے۔ کمال کھڑا مسکراتا رہا۔

آپ نے کتابت کا پیشہ اختیار کیا تھا، اس سے جو کماتے اس کا بیشتر حصہ بیواؤں اور حاجت مندوں میں تقسیم فرما دیتے۔ تصنیف بھی آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔

ایک دن آپ نے اپنی اُجرت کا تین چوتھائی کسی بیوہ کو دے دیا۔ آپ کے کسی عقیدت مند نے کہا "حضرت! آپ کو بھی تو روپوں کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ دوسروں کو کیوں دے دیتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "بھائی! میں اللہ کو قرض دیتا ہوں اور میں نے سُنا ہے کہ اللہ کو قرض دینے سے بڑی وسعت اور خوشحالی آتی ہے"

اسی دوران آپ کے پاس ایک بڑی رقم کہیں سے آئی۔ آپ نے جب تحقیق سے اچھی طرح یہ یقین کر لیا کہ یہ حلال کی کمائی ہے تو آپ نے اُسے غربا میں تقسیم کر دیا۔

اس بار پھر ایک مرید کو اس پر اعتراض ہوا، اس نے کہا "پیر مرشد! آپ اگر چاہتے تو اس رقم سے بزرگوں کا عرس کرا دیتے، جس سے بزرگوں کی ارواح خوش ہو جاتیں؟"

آپ نے فرمایا "نہیں، ایسا نہیں ہے، دعوتِ مجلسِ طعام اور لوگوں کا اجتماع تکلیف اور پریشانی سے خالی نہیں ہوتا جب کہ ضرورت مند لوگوں کی حاجتیں پوری کرنا اللہ کے نزدیک بھی باعثِ خوشنودی ہے"

آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں میں شیخ عبدالوہاب کو بڑی عزت حاصل تھی، یہ اپنا زیادہ وقت اپنے پیر مرشد کی

ہی میں گزارتے تھے۔ آپ اُن سے اکثر دینی تالیفات و تصنیفات اور کتابت کی تصحیح اور مقابلے کا کام لیا کرتے تھے۔ شیخ عبدالوہاب
کو کئی سال تک اس بات کا کچھ پتہ نہ چلا کہ انھیں آپ کی صحبت اور فیضانِ نظر سے کچھ ملا ہے لیکن پھر یکایک انھیں اس کا نمایاں
احساس ہو گیا کہ انھیں وہ کچھ مل چکا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شیخ عبدالوہاب سفر و حضر میں اپنے پیر مرشد کے ساتھ ہی
رہتے تھے۔

آپ کا برصغیر سے جی گھبرا گیا اور آپ حرمین شریفین روانہ ہو گئے۔ شیخ عبدالوہاب نے عرض کیا: "پیر مرشد! میرے لیے کیا
حکم ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "میں ہمیشہ کیلئے یہاں سے جا رہا ہوں بابا عبدالوہاب! اپنے بارے میں تمھیں خود فیصلہ کرنا ہے۔"
سعادت مند مرید نے جواب دیا: "پیر مرشد! میں نے خود کو زندگی بھر کے لیے آپ کے حوالے کر دیا ہے، آپ جہاں جائیں گے، میں
آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

آپ نے فرمایا: "لیکن اب میں ہندوستان واپس نہیں آؤں گا۔"
مرید نے جواب دیا: "میرا ہر فعل آپ کا تابع ہے، اگر آپ واپس نہیں آئیں گے تو میں بھی واپس نہیں آؤں گا۔"
آپ نے شیخ عبدالوہاب کو ساتھ چلنے کی اجازت دے دی۔ آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات شیخ الحدیث
شیخ ابوالحسن بکری سے ہوئی۔ شیخ موصوف اپنے وقت کے مانے ہوئے ولی اللہ تھے۔ شیخ علی نے ان کی صحبت اختیار کی اور شاگرد ہو گئے۔ اس
کے بعد شیخ محمد بن محمد بن محمد سخاوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے سلسلۂ قادریہ کا خرقہ حاصل کیا۔ اُن کے بعد پہلے قطب زماں شیخ
نورالدین ابوالحسن علی الحسن شاذلی سے سلسلۂ شاذلیہ کا خرقہ اور شیخ ابومدین شعیب مغربی سے سلسلۂ مدنیہ کا خرقہ حاصل کیا۔
شیخ ابن حجر اپنے وقت کے جید عالم اور فقیہ تھے۔ شیخ علی نے ان کی شاگردی اختیار کی لیکن بعد میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ
شیخ ابن حجر خود کو شیخ علی کا شاگرد کہنے لگے بعد میں مریدی اختیار کی اور آپ سے خرقہ حاصل کیا۔
شیخ ابوالحسن بکری آپ کی بے حد تعریف کیا کرتے تھے۔ شیخ علی کا ملت اسلامیہ پر ایک یہ احسان بھی تھا کہ وہ نایاب کتب کی نقلیں
تیار کر کے ادھر اُدھر بھجواتے رہتے تھے۔ روشنائی خود تیار کرتے تھے۔ اس روشنائی سے خود لکھتے اور اپنے شاگردوں کو بھی دیتے تھے۔
آپ کی مجلس میں گرما گرم بحث چھڑی رہتی تھی۔ آپ سب کی سنتے تھے اور خاموش رہتے تھے لیکن اگر کوئی ادق اور مشکل مسئلہ زیرِ غور
ہوتا تو آپ کچھ نہ کچھ ارشاد فرما دیتے اور وہ اتنا ہمہ گیر ہوتا کہ ہر ایک خاموش ہو جاتا کیونکہ اس کا جواب کسی کے بھی بس کا نہ ہوتا۔
مکہ معظمہ میں قیام کے دوران مغرب سے دو باپ بیٹے آئے۔ یہ دونوں نہایت عبادت گزار تھے۔ ان کے روزوں کا یہ حال تھا کہ کئی
کئی دن کچھ نہ کھاتے۔ ہر طرف اُن کا شہرہ تھا۔ ان کی شہرت سے متاثر ہو کر اُن دونوں سے ملنے تشریف لے گئے۔ اُس وقت آپ کی
کمزوری آپ پر اتنی غالب تھی کہ پیدل نہیں چلا جاتا تھا، چنانچہ ایک قوی ہیکل آدمی نے آپ کو اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ شیخ عبدالوہاب
آپ کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ کتاب سَم کبیر بغل میں دبی تھی۔ اُن دونوں کو لوگوں نے بتایا: "تم دونوں کتنے خوش قسمت ہو کہ اس
وقت تم سے ملنے ایک ایسا شخص آ رہا ہے کہ اس کی ملاقات کے بعد تمھاری شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔"
اُن دونوں نے سوچا کہ اگر ہم نے اس ملاقات میں عجز و انکساری سے کام لیا تو یہ مشہور بزرگ شاید متاثر نہ ہوں اس لیے ذرا رکھ رکھاؤ
سے ملنا چاہیے۔

جب آپ ان دونوں کے سامنے پہنچے تو السلام علیکم کہہ کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔ ان دونوں نے بے التفاتی سے منہ پھیر کر آہستہ
سے جواب دیا: "وعلیکم السلام"
ان دونوں نے اپنے اپنے ہاتھ میں ایک ایک تسبیح پکڑ رکھی تھی اور انگلیاں اس کے دانوں کو بڑی تیزی سے آگے کھسکاتی جا رہی تھیں۔
آپ نے فرمایا: "حضرات! میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔"
لڑکے کے باپ نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔
آپ نے اپنے مرید شیخ عبدالوہاب سے کہا: "دیکھا تم نے، یہ شخص ہمیں وبالِ جان سمجھ کر رخصت کر دینا چاہتا ہے۔"
شیخ عبدالوہاب نے کہا: "پیر مرشد جو کچھ فرما رہے ہیں بجا ہے۔"
آپ نے ان دونوں کو بطورِ خاص مخاطب کیا: "حضرات! ہم نے مشائخین کے چند اقوال جمع کیے ہیں ہماری خواہش ہے کہ انھیں
آپ بھی سماعت فرمائیں۔"
دونوں آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ کو جو کچھ کہنا تھا، نہایت اثر انگیز پیرائے میں سُنا دیا۔ سُننے والوں پر اس کا اتنا شدید اثر

ہوا کہ دونوں کے ہوش وحواس ہی جاتے رہے۔ از خود رفتہ ہوکر کپڑے پھاڑنے لگے۔ ان پر وارفتگی اور جنون طاری ہو چکے تھے۔ آپ ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ ابھی آپ نے سکھ یا اطمینان کی سانس بھی نہیں لی تھی کہ دونوں اسی وارفتگی کی حالت میں آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ باپ نے کہا: "اے شخص! میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا: "کیوں؟ آخر کیوں؟"

باپ نے جواب دیا: "حضرت! شاید آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ آپ سے شرفِ ارادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے ان دونوں کو مرید کر لیا۔ انھیں عرصہ تک اپنی اس حرکت پر شرمندگی رہی کہ وہ پہلی ملاقات میں شیخ علی کو بے وقوف بنانا چاہتے تھے۔

●

آپ نے ایک وعظ کے دوران فرمایا: "لوگو! کیا تمھیں معلوم ہے کہ حلال مال کبھی برباد نہیں ہوتا۔"

ایک مرید نے پوچھا: "وہ کس طرح؟ یعنی آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

آپ نے فرمایا: "یعنی یہ کہ اگر حلال مال کسی طرح گم بھی ہو جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح ضرور مل جاتا ہے۔"

یہ بات یہیں پر ختم ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد آپ کسی سفر میں سمندر کے کنارے کنارے کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ اس سفر میں وہ مرید بھی ساتھ تھا جس نے دوران وعظ سوالات کیے تھے۔ اس وقت آپ کے پاس چند کتابیں بھی تھیں۔ مسافروں نے مشرق سے اٹھنے والی گھٹاؤں کو دیکھا تو گھبرا گئے۔ ملاح نے کہا: "صاحبان! ہوشیار ہو جائیں کیونکہ یہ گھٹائیں اس بات کی علامت ہیں کہ ہمیں بہت جلد طوفان میں گھر جانا پڑے گا۔" پھر اس نے پوچھا: "آپ میں سے پیراکی کتنوں کو آتی ہے؟"

سارے مسافر گھبرا گئے۔ ان میں سے بیشتر کو پیراکی نہیں آتی تھی۔ وہ رونے لگے۔ بولے: "ہمیں تو پیراکی ذرا بھی نہیں آتی۔" لیکن جنھیں پیراکی آتی تھی وہ بھی پریشان تھے۔ انھوں نے ملاح سے پوچھا: "اے بھائی! ہمیں پیراکی تو آتی ہے لیکن ہمیں یہ تو بتاؤ کہ اگر اس جگہ یہ کشتی خدانخواستہ ٹوٹ پھوٹ گئی تو یہاں سے ساحل کتنی دور ہے اور ہم وہاں تک کس طرح پہنچیں گے؟"

ملاح نے جواب دیا: "سوال ساحل تک پہنچنے کا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ پیراکی نہ جاننے والے بآسانی فوراً ہی ڈوب جائیں گے اور جنھیں پیراکی آتی ہے وہ بچنے کی کوشش میں کچھ دور پیر کر ڈوب جائیں گے اور شاید اس طرح انھیں یہ اطمینان رہے گا کہ وہ بچنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈوب رہے ہیں۔"

آپ کے مرید شیخ عبدالوہاب نے آپ سے پوچھا: "پیر مرشد! یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ اب کیا ہوگا؟"

آپ نے فرمایا: "ہوگا کیا، طوفان آئے گا، کشتی تنکے کی طرح سمندری امواج میں ڈولنے لگے گی، لوگ چیخنے چلانے لگیں گے۔ پھر طوفانی ہواؤں کا ایک تھپیڑا کشتی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا، مسافر پانی میں غوطے کھانے لگیں گے۔۔۔"

شیخ عبدالوہاب نے اپنے پیر مرشد کے چہرے پر طمانیت اور سکون کی جھلک دیکھی تو خود بھی مطمئن اور پرسکون ہو گئے، پوچھا: "پیر مرشد! پھر کیا ہوگا؟"

آپ نے فرمایا: "پھر یہ ہوگا کہ جنھیں پیراکی آتی ہے وہ تو ڈوب جائیں گے اور جنھیں پیراکی نہیں آتی وہ بچ جائیں گے۔"

شیخ عبدالوہاب نے حیرت سے پوچھا: "پیر مرشد! وہ کس طرح؟ یہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا: "یہ بات میں قبل از وقت کس طرح سمجھاؤں، وقت آنے دو، بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔"

آپ کی یہ باتیں ملاح بھی بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا، پوچھا: "بابا جی! آپ یہ کیسی الٹی بات کہہ رہے ہیں کہ جنھیں تیرنا آتا ہے وہ تو ڈوب جائیں گے اور جنھیں تیرنا نہیں آتا وہ بچ جائیں گے۔"

آپ نے جواب دیا: "الٹی بات میں نے نہیں کی، تو نے کی ہے، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ خدا جو قادرِ مطلق ہے انسان کو بچانے میں تیری پیراکی کا پابند ہے! ہرگز نہیں، وہ ہر وہ کام کر سکتا ہے جو بظاہر بعید از فہم ہے۔"

ملاح نے ہنس کر پوچھا: "بابا جی! طوفان تو بس آنے ہی والا ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ میرا کیا حشر ہوگا، بچوں گا یا ڈوب جاؤں گا؟"

آپ نے جواب دیا: "تو ملاح ہے اور ملاح کی موت سمندر ہی میں ہوتی ہے۔ یہ تیرا مقدر ہے۔"

ابھی یہ بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ سمندر کی سرکش امواج نے کشتی کو ہچکولوں میں پھنسا دیا۔ طوفانی ہواؤں نے سمندری پانی کو کشتی کے اوپر سے گزارنا شروع کر دیا۔ مسافروں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ کبھی مسافروں نے اذانیں دینا شروع کر دیں۔

ملاح نے چیخ کر اعلان کیا "صاحبان! جان بچانے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ آنے والے ہوائی جھکڑ ہمارا اور کشتی کا کیا حشر کریں گے۔"

اچانک ہواؤں میں شدت اور تندی پیدا ہو گئی۔ پھر دو متضاد سمتوں سے آنے والی ہوائیں آپس میں ٹکرائیں اور انھوں نے کشتی کو توڑ دیا۔ ملاح نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور متضاد سمتوں سے آنے والی ہواؤں کے بھنور نے ملاح کو سمندر کی تہ میں پہنچا دیا۔
چونکہ کشتی ٹوٹ چکی تھی اس لیے پیراکی جاننے والوں نے بھی چھلانگیں لگا دیں اور سمندری بھنور میں غوطے کھا کھا کر ڈوبنے لگے۔
ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے سطح سمندر پر تیرنے لگے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا "آپ لوگ بہت احتیاط اور ہوشیاری سے ان تختوں پر سوار ہو جائیں۔"

شیخ عبدالوہاب نے پوچھا "پیر مرشد! کیا یہ تختے جو خود تیر بھی نہیں سکتے، ہمیں بچا لیں گے؟"
آپ نے فرمایا "ہمیں تختے نہیں، خدا بچائے گا۔ جلدی جلدی ان تختوں پر سوار ہو جاؤ۔"
پانی میں گر جانے کی وجہ سے انھیں تختوں پر سوار ہونے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ ان کی کتابیں بری طرح بھیگ چکی تھیں۔
جب یہ لوگ تختوں پر سوار ہو گئے تو موجوں نے انھیں ساحل کی طرف پھینکنا شروع کر دیا اور کچھ دیر بعد یہ سب بعافیت ساحل پر پہنچ گئے۔

اب شیخ علی نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ پیدل سفر جاری رکھیں۔
اور پیدل سفر شروع کر دیا گیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد آپ نے بھیگی ہوئی کتابوں کو زمین کھود کر پتھروں کے درمیان رکھ کر دفن کر دیا۔ اور فرمایا "زمین! یہ ہماری امانت ہے جو ہمیں واپس ملنی چاہیے۔"
آپ ان کتابوں کو دفن کر کے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپ کے مریدوں کو آپ کے اس رویّے پر حیرت بھی تھی اور افسوس بھی۔ انھیں ملال تھا کہ اتنی نایاب اور قیمتی کتابیں زمین کے حوالے کر دی گئیں، جن کی بازیابی نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔
شیخ عبدالوہاب کو آپ کے مزاج میں سب سے زیادہ رسوخ حاصل تھا۔ انھوں نے پوچھ ہی لیا "پیر مرشد! یہ ساری کتابیں نایاب اور برسوں کی محنت کا ثمرہ تھیں انھیں اب ہم کس طرح پائیں گے؟"
آپ نے جواب دیا "جس خدا نے تمھیں سمندری طوفان سے صحیح سلامت یہاں تک پہنچا دیا ہے وہی ان کتابوں کو ہم تک دوبارہ پہنچا دے گا۔"

ایک مرید نے عرض کیا "پیر مرشد! سمندر میں تو ٹوٹی ہوئی کشتی کے ٹکڑے تھے جنھوں نے ہمیں ساحل تک پہنچا دیا، مگر زمین میں کون سی ایسی چیز ہو سکتی ہے جو ان کتابوں کو ہم تک پہنچا دے گی؟"
آپ نے فرمایا "صبر کرو صبر اور خدائے مسبب الاسباب کی قدرت دیکھو، وہ ہر شے پر قادر ہے، ہر تدبیر اور ذریعے پر۔"
غیر مطمئن مرید خاموش ہو گئے۔

دورانِ سفر انھیں پیاس ستانے لگی لیکن پانی کا کہیں دُور دُور پتہ نہ تھا۔ پیاس سے زبانیں باہر آنے لگیں۔
ایک مرید نے کہا "پیر مرشد! ایک پانی سے بچے تو دوسرا پانی شاید ہمیں ہلاک کر کے ہی دم لے گا۔"
آپ نے فرمایا "دوستو! مایوسی کفر ہے جس خدا نے یہاں تک صحیح سلامت پہنچا دیا ہے وہی آگے بھی زندہ رکھے گا۔"
شیخ عبدالوہاب نے عرض کیا "پیر مرشد! ان نادانوں کی نظریں دُور تک نہیں جاتیں یہ تو بس سامنے کچھ دُور تک ہی دیکھ سکتے ہیں۔ خدا کے لیے انھیں وہ دکھلائیے جو میری آنکھیں تو دیکھ رہی ہیں مگر یہ لوگ اس سے محروم ہیں۔"
آپ ایک جگہ رُک گئے اور اپنے مریدوں سے پوچھا "کیا بہت زیادہ پیاس لگ رہی ہے؟"
بہت زیادہ بے صبرے مرید نے عرض کیا "پیر مرشد! کچھ کیجیے ورنہ یہ بندہ تو چلا۔"
آپ نے اپنے جملہ مریدوں کو حکم دیا "اپنے اپنے برتن آسمان تلے رکھ دو۔"
مریدوں نے ایسا ہی کیا اور اپنے خالی برتن آسمان تلے رکھ دیے۔ اس کے بعد آپ نے بارش کے لیے گڑگڑا کر دعا کی۔
دعا کو ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ موسلادھار بارش شروع ہو گئی اور خالی برتن منہ تک بھر گئے۔ پیاسوں نے اپنی اپنی پیاس بجھائی اور برتنوں کو دوبارہ پانی سے بھر لیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے مشکیزے تک پانی سے بھر لیے تھے۔ اب سفر پھر سے شروع کیا۔
چند دنوں بعد یہ لوگ مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں سب نے خانہ کعبہ کا طواف اور عمرہ کیا اور دو دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد یہ لوگ سعی کے لیے صفا و مروہ پہنچے اور سعی میں مشغول ہو گئے۔
یہاں چند بدو عرب بھی آ گئے۔ اُن کے خیمے قریب ہی نصب تھے۔ سعی کے بعد جب یہ لوگ بھی ایک جگہ جمع ہوئے تو بدوؤں کا سردار اُن سے ملنے آیا۔ اس نے پوچھا "آپ کا سردار کون ہے؟"
شیخ عبدالوہاب نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "شیخ! سردار نہیں، پیر مرشد کہو۔ یہ ہمارے پیر مرشد ہیں۔"
بدوؤں کے سردار نے پوچھا "کیا تمھارے شیخ پڑھے لکھے بھی ہیں؟"
شیخ عبدالوہاب نے جواب دیا "ایسے ویسے پڑھے لکھے، اُن کے علم کا شہرہ تو عرب و عجم میں یکساں ہیں اور انھیں یہ فخر حاصل ہے کہ خدا نے انھیں عربوں کا استاد بنایا ہے۔"
بدوؤں کے سردار نے کہا "تب پھر انھیں کتابوں سے بھی شغف ہو گا؟"
شیخ عبدالوہاب نے جواب دیا "اس میں بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"
بدوؤں کے سردار نے کہا "تم اپنے شیخ سے کہو کہ ہمارے ساتھ ہمارے خیموں تک چلیں۔ ہمارے پاس چند کتابیں ہیں ہم انھیں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر شیخ کو ہماری کتابیں پسند آ جائیں تو خرید لیں، ہمارے لیے وہ کتابیں بیکار ہیں۔"
جب شیخ عبدالوہاب نے بدوؤں کے سردار کا پیغام اپنے شیخ کو پہنچایا تو وہ تیار ہو گئے اور اسی وقت شیخ عبدالوہاب کو ساتھ لے کر بدوؤں کے خیموں میں پہنچ گئے۔ بدوؤں کے سردار نے کئی کتابیں اُن کے سامنے رکھ دیں۔ شیخ عبدالوہاب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ ساری وہی کتابیں تھیں جنھیں شیخ علی نے پتھروں کے درمیان میں رکھ کر زمین میں گاڑ دیا تھا۔ آپ نے شیخ عبدالوہاب کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "بابا عبدالوہاب! کیا دیکھا؟"
شیخ عبدالوہاب نے جواب دیا "وہی کچھ دیکھ لیا جو میں اور دوسرے مرید دیکھنا چاہتے تھے۔"
آپ نے اپنی ہی کتابوں کو اُن کی قیمت ادا کر کے دوبارہ حاصل کر لیا۔ اور اس میں بڑی خوشی محسوس کی۔ سارے مرید دنگ اور حیران تھے کہ یہ کتابیں دوبارہ پیر مرشد کے پاس کیسے آ گئیں۔
ان کتابوں کے اوراق بھیگ جانے کی وجہ سے آپس میں پیوستہ ہو گئے تھے۔ آپ نے انھیں دوبارہ بھگو دیا اور جب وہ نم ہو گئے تو آپ نے چپکے ہوئے اوراق کو نہایت احتیاط سے الگ کیا اور ساری کتابیں بہت جلد اس لائق ہو گئیں کہ انھیں پڑھا جا سکے۔ اُن کے اوراق بالکل صحیح سلامت تھے۔ اور اُن کے نقطوں کی روشنائی کہیں سے بھی نہیں اُڑی تھی۔

●

شیخ حاجی نظر بدخشانی اپنے زمانے کے کامل بزرگ تھے، اُن کے چاروں طرف مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ حج کے بعد یہ بزرگ شیخ علی سے ملنے چلے آئے اور ذرا سی دیر میں اُن کا یہ حال ہو گیا کہ شیخ علی کے مداحوں میں ہو گئے۔ صبح و شام حاضریاں دینے لگے۔
جب بڑھاپے نے آپ پر غلبہ کیا تو اُن کے زہد و تقویٰ میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ پیشاب بار بار ہونے لگا تھا اسی عالم میں شیخ عبدالوہاب نے پوچھا "پیر مرشد ان دنوں نفل کتنی ادا فرماتے ہیں؟"
آپ نے جواب دیا "جوانی میں تو بہت زیادہ نفلیں پڑھا کرتا تھا، لیکن اب دن کے وقت تو میں ذکر خفی میں مشغول ہو جاتا ہوں اور اُدھر سے فارغ ہونے کے بعد تصنیف کتب میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ رات کو دس بارہ مرتبہ پیشاب کی زحمت برداشت کرنا پڑتی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہر بار اس کی توفیق سے میں وضو کرتا ہوں اور دو دو چار چار نفل ادا کرتا ہوں۔"
شیخ عبدالوہاب اپنے شیخ سے الگ کسی کتاب کی کتابت میں منہمک تھے کہ شیخ علی کا خادم آیا اور عرض کیا "بابا عبدالوہاب! آج پیر مرشد جوان نظر آ رہے ہیں، اُن کی عجیب حالت ہے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"
شیخ عبدالوہاب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی وقت شیخ کی خدمت میں پہنچے۔ اُس وقت شیخ علی پر سکر و بے خودی سی طاری تھی، انہیں دیکھتے ہی جیسے ہوش میں آ گئے، فرمایا "بابا عبدالوہاب! خوش رہو، مرحبا۔"
شیخ عبدالوہاب نے پوچھا "پیر مرشد! آپ کا کیا حال ہے؟"
انھوں نے جواب دیا "بابا عبدالوہاب! آج ہم پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی تاکہ حاضرین کو زیادہ یقین ہو جائے۔ سلف بھی اس کا مشاہدہ کرتا تھا لیکن بابا عبدالوہاب! تمھارا شمار اہل یقین میں ہے، تمھیں کسی خرق عادت کا کام دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
جب شیخ علی یہ فرما رہے تھے ان کی حالت میں تغیر ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اصل حالت میں لوٹ آئے۔

اسی عالم میں انھوں نے ایک بار پھر شیخ عبدالوہاب کو بلوا کر فرمایا "بابا عبدالوہاب! اب تم کہیں نہ جایا کرو میرے پاس ہی رہا کرو کیونکہ میرا چل چلاؤ قریب ہے۔ پتہ نہیں کس وقت اپنے خالق حقیقی سے جا ملوں۔"

پھر چند اشعار سننے کی خواہش کی اور شیخ عبدالوہاب نے انہیں سنا دیے۔

اسی دوران اُن کے پاس دو گروہ ملاقات کو حاضر ہوئے۔ آپ نے اُن سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ فرمایا "یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے تم لوگ چُپ چاپ کیوں ہو؟"

شیخ عبدالوہاب نے اُن دونوں گروہوں کی طرف دیکھا اور غور کرنے لگے کہ یہ کون ہیں اور انھیں کہاں دیکھا گیا ہے۔

کچھ دیر بعد جب دونوں گروہ چلے گئے تو انھوں نے خود ہی سوال کر دیا "عبدالوہاب! جانتے ہو یہ کون تھے؟"

شیخ عبدالوہاب نے جواب دیا "نہیں، میں انھیں نہیں جانتا۔"

آپ نے فرمایا "دونوں اجنّہ کے گروہ تھے۔ ایک گروہ میری عبادت کو آیا تھا اور دوسرا حاسد اور بغض و عداوت کا حامل تھا۔ یہ دونوں پہلے بھی کئی بار آ چکے ہیں لیکن جب بھی آتے ہیں چُپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں یہ نہیں بتاتے کہ میرے پاس کیوں آتے ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے اُن دونوں کے نام دو خط لکھوائے، فرمایا "بابا عبدالوہاب! لکھو، میں انھیں خط لکھواتا ہوں۔"

بابا عبدالوہاب نے قلم دوات اور کاغذ سنبھالا اور خط لکھنے لگے۔ آپ خط کی عبارت بول رہے تھے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حمد و ثنا کے بعد۔ منجانب کمترین خلق خدا علی بن حسام الدین متقی بنام بزرگ جن۔ سلامتی ہو اُس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ تم عرصے سے ہمارے پاس آ رہے ہو لیکن کچھ گفتگو نہیں کرتے۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو تاکہ تمھارا مقصد کیا ہے۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک شخص شیخ عبدالوہاب ہے۔ اگر تم چاہو تو اس کے پاس جا کر اپنا مطلب بیان کر دو تاکہ ہم تمھاری مدد کر سکیں۔ اے اللہ! ہم پر حق واضح کر اور حق کی پیروی کی قوت دے اور باطل کو باطل کی صورت میں دکھا اور اس سے محفوظ رہنے کی قوت عطا فرما۔ یہ خط تمھاری جماعت کے اراکین کے نام ہے۔"

اس کے بعد دوسرا خط لکھوایا۔

"تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت یعنی اپنے عرفان کے لیے پیدا کیا ہے۔ اللہ آپ پر رحمتیں نازل فرمائے۔ اس بات کو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے عرفان کے لیے پیدا فرمایا ہے اور تمام علماء، عقلاء اور عرفاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معرفتِ الٰہی صرف علم و عقل اور حکمت کے ذریعے ہے جو نیکی و بدی، شرارت اور نفع کا علم نہیں رکھتا، اس کو اللہ کے عرفان کی دولت نہیں ملتی۔ اس لیے لوگوں سے میل جول میں اپنی گفتگو کے ذریعے بھی اللہ کی معرفت کے طریقے حاصل کرو اور ہادی و رہنما شخصیتوں کی فہرست میں اپنا نام درج کراؤ۔ مجھ پر اللہ کا جو حق تھا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا۔ اس طرح میں اپنے فریضے سے سبکدوش ہو گیا۔ میری اس نصیحت پر جس کا جی چاہے عمل کرے۔"

دونوں خط لکھوانے کے بعد آپ نے ان دونوں کی نقلیں تیار کرائیں اور ایک ایک خط اپنے پاس رکھ لیا۔ دوسرے دن یہ دونوں خط غائب ہو گئے۔ گویا اس طرح وہ دونوں خط اجنّہ کی دونوں جماعتوں تک پہنچ چکے تھے۔

اس کے بعد آپ نے ذکرِ جہر شروع کر دیا۔ ذکرِ جہر کے دوران ان کی حالت میں کئی تغیر رونما ہوتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے وہ اپنے رب سے براہ راست مخاطب ہیں اور کبھی یوں لگتا گویا کوئی آیا ہوا ہے اور آپ اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ پھر کسی وقت یوں لگتا، گویا وہ کسی ناپسندیدہ شے کو دیکھ رہے ہیں اور اسے بھگا رہے ہیں۔ پھر اچانک شیخ عبدالوہاب کو آواز دیتے "بابا عبدالوہاب! کہاں چلے گئے؟"

شیخ عبدالوہاب جواب دیتے "پیر و مرشد! میں آپ کے پائینتی موجود ہوں، حکم ارشاد۔"

آپ نے فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اپنی قبر دیکھ لوں تاکہ مجھے اپنی منزل کا علم ہو جائے۔" قدرے توقف کے بعد فرمایا "اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم کب تک زندہ رہیں گے اور کب دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ یہ قبرستان جہاں تم لوگ مجھے لے جاؤ گے عام مسلمانوں کا ہے، مرنے سے پہلے ہی انسان کو کسی تنگ جگہ منتقل کر دینا مناسب نہیں ہے۔ انتقال کے بعد مجھے لوگ جہاں چاہیں دفن کر دیں اور اور دیکھو بھائی۔۔۔۔"

شیخ عبدالوہاب اور آپ کے دوسرے ارادت مندوں نے واضح محسوس کر لیا تھا کہ آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور شاید چند دنوں کے مہمان ہیں۔

اور پھر ایک دن آپ نے خود ہی اپنے نامزد کیے خلیفہ بابا عبدالوہاب کو بُلا کر ارشاد فرمایا "عبدالوہاب! ہو سکتا ہے میرے مرنے کے بعد بھی تم لوگ میری موت کے بارے میں شک و شبہ کی کیفیت میں رہو۔ مَیں تمہیں بتا دوں، جب تک میری انگشتِ شہادت بلند رہے گی مَیں زندہ رہوں گا۔"

۹۷۵ ہجری کے جمادی الثانی کی دو تاریخ کو آپ کی حالت میں تغیر رونما ہونا شروع ہو گیا۔ لوگوں نے جب آپ کی حالت دیکھی تو انہیں یقین آ گیا کہ اب آپ بقیدِ حیات نہیں رہے۔ آہ و بکا کرتے لوگوں نے آپ کا آخری دیدار کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر بابا عبدالوہاب نے غم سے جھنجلائے ہوئے انہیں ٹوکا اور کہا "کیوں حضرت پیرومُرشد کو پریشان کرتے ہو۔ یہ آہ و گریہ کب آپ کو پسند رہی ہے، جو تم کر رہے ہو۔ خاموش ہو جاؤ حضرت کو کیوں دکھی کرتے ہو۔"

پھر لوگوں نے یہ منظر بھی حیرت سے دیکھا کہ بظاہر تو آپ کا جسم سرد ہے اور زندگی کی رمق تک معلوم نہیں پڑتی لیکن آپ کی انگشتِ شہادت مسلسل متحرک ہے لیکن جلد ہی یہ علامتِ حیات بھی اوجھل ہو گئی۔

بابا عبدالوہاب نے بھیگی پلکوں سے آپ کا سر اپنے زانو سے اٹھا کر تکیہ پر رکھ دیا۔

آپ کی تدفین مکہ معظمہ میں ہوئی۔

آپ لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ لوگو! جہاں تمہیں آخرت میں سُرخرو ہونے کا علم حاصل ہو، وہی محبت تمہارے لیے سُود مند ہے گناہوں سے دُور رہنے کی حتی المقدور کوشش کیا کرو۔ اطاعتِ الہیٰ اور نفس کشی کو اپنا شعار بنا لو کیونکہ یہی تمہاری فلاح کی راہ ہے۔

یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں، کراچی میں کیتانہ میمن ایسوسی ایشن کے زیرِ انتظام چلنے والے ایک انڈسٹریل ہوم میں ایک شخص ملازم تھا۔ نام اُس کا عبدالکریم تھا۔ نوجوان تھا عمر یہی کوئی تئیس چوبیس سال ہوگی صحت بھی ٹھیک ٹھاک تھی لیکن بیچارا بچپن سے ہی ایک عجیب سے مرض میں مبتلا چلا آرہا تھا۔ اچانک بیٹھے بٹھائے نجانے کیسا دورہ پڑتا کہ جسم کی رگیں کھنچ جاتیں اور وہ یوں تڑپنا شروع ہوجاتا گویا جل بن مچھلی تڑپ رہی ہو۔

کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ غیر شادی شدہ تھا۔ ماں باپ نے کوئی ڈاکٹر کوئی حکیم ایسا نہ چھوڑا تھا جس کا انھیں علم نہ ہو یا کسی عزیز رشتہ دار نے آگاہ نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ عامل اور جادو ٹونے کرنے والے تک سے بیٹے کو چیک کروایا مگر حال وہی تھا۔ کچھ عرصہ بھلا چنگا رہتا۔ پھر وہی پرانی حالت۔ اگرچہ ایسا چند لمحوں کے لیے ہوتا تھا مگر یہ منظر دردناک اور وحشت انگیز ہوتا کہ سوچ کر ہی انسان کانپ اُٹھتا تھا۔ اور اُس نوجوان کا جس پر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی اُس کے حال کا تو اندازہ لگایا ہی جاسکتا ہے۔

ایک دن دفتر میں ہی بیٹھے بٹھائے جسم اکڑنے لگا۔ مٹھیاں بند ہوگئیں جسم کچھ دیر اُچھلنے کے بعد یوں ساکت ہوگیا کہ مانو اسمیں جان ہی نہیں۔ ساتھیوں نے گھبرا کر نبض دیکھی تو وہ چل رہی تھی۔ چہروں پر اطمینان ہوا تو ذہن نے بھی کام کرنا شروع کردیا۔ فوراً لے کر ہسپتال دوڑے۔ ماں باپ کو اطلاع دی۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔ اکلوتا بیٹا تھا ہونہار، لائق نجانے کس کی نظر لگ گئی تھی کہ پل بھر بھی بیچارا چین سے نہ رہتا تھا۔ ڈاکٹر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ ماں ہاتھ بلند کیے دعا مانگ رہی تھی مگر وہ نوجوان ایسا بے سدھ پڑا تھا کہ ماں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔

یہ حالت دیکھ کر ایک رشتہ دار نوجوان کے باپ کے پاس گیا اور بولا "جناب! میری مانیں تو اب اسے حضرت کامل شاہ کو بھی دکھلا دیں۔ بڑے اللہ والے بزرگ ہیں۔ ہاتھ میں ایسی شفا پائی ہے کہ پوچھو مت۔ بس اللہ کا نام لے کر انھیں کسی طرح اس بدنصیب پر نظرِ کرام ڈالنے کے لیے آمادہ کرلیں۔ سارے دکھ درد نہ دور ہوئے تو میرا نام بدل ڈالیے گا۔"

طوفان میں تو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے اور ادھر تو نوجوان بیٹا ہی ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ چنانچہ ہر وہ تجویز آزمانا باپ نے فرض خیال کیا جس سے بیٹے کی جان بچ سکتی ہو۔ ننگے پاؤں حضرت کامل شاہ کے آستانہ پر پہنچے۔ بڑی منتیں کیں اور ساتھ آنے پر رضامند

کر کے ہی لوٹے۔ حضرت کامل شاہ نے ہاسپٹل آتے ہی مریض کو دیکھ کر کہا: "عبدالکریم۔ اُٹھ۔ یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے رے تو نے۔" مریض ٹس سے مس نہ ہوا تو لوگ یہ دیکھ کر کانپ گئے کہ حضرت کے چہرے پر جوش اور جاہ و جلال کا یہ عالم کہ پہچانے نہ گئے اور پھر جیسے عبدالکریم کی شامت ہی آگئی۔ چوبیس سالہ نوجوان کو یوں اُٹھا کر بغل میں دبا لیا گویا بچہ مانک ہو۔ اب حضرت اُس نوجوان کو دبا کر کمرے میں کبھی دائیں دوڑتے تو کبھی بائیں، ساتھ ساتھ کہتے جا رہے ہیں، "عبدالکریم! کہہ کہ میرا رب ہی برحق ہے اور پھر اسی جملے کی گردان جاری رکھی۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ عبدالکریم نے آنکھیں کھول دیں۔ چہرے پر چھائی زردی حیرت انگیز طور پر سُرخی میں بدل گئی اور وہ بول اُٹھا: "ہاں رب العزت ہی برحق ہے ہر تعریف کا سزاوار۔"

اور پھر ایسا صحت مند ہوا کہ گھبرو جوان بھی دیکھ کر شرما جاتے۔ یہ چند برس قبل کا واقعہ ہے۔ آجکل نجانے وہ کدھر ملازمت کر رہا ہو لیکن کیتا نہ میمن ایسوسی ایشن میں اُس کا ریکارڈ اب بھی محفوظ ہوگا۔

حضرت کامل شاہ، موجودہ صدی کے ایک ولی کامل اور درویش صفت انسان تھے۔ دن رات عبادت و ریاضت میں بسر کرنے والے۔ ذکر اذکار میں مشغول رہنا دل پسند مشغلہ تھا خواہش نفس، ارادہ، دُنیا و آخرت غرض تمام آرزوؤں کو ترک کر کے اللہ کی یاد میں گم ہو چکے تھے۔ کسی چیز کی طلب تھی تو وہ خواہش اللہ کی تھی۔ دل میں کسی کی یاد تھی تو وہ صرف یادِ الٰہی کی تھی باقی سب کچھ خارج کر چکے تھے۔

اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو ممتاز ترین مقام پر فائز کرنے کی سوچتا ہے۔ تو پھر اُس بندے کو بھی اس مقام کے حصول کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ جتنا بڑا بلند مرتبہ ہوگا اتنی ہی کٹھن اور سخت ترین آزمائشوں اور امتحانات کی بھٹی میں سے اُسے گزرنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے لوہا بھٹی میں آگ کی تپش سے تپ کر یوں فنا ہوتا ہے کہ فنا فی الفولاد ہو جاتا ہے اور انسان بھی اللہ کی ذات بابرکات میں خود کو یوں فنا کر لیتا ہے اور اس ذات کے اس حد تک قریب آجاتا ہے کہ اُس کی ذات، خدا کی ذات میں گھل مل جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں حسین ابن منصور نے "انا الحق" کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن اُسے سُولی پر لٹکایا گیا۔

اگرچہ حضرت کامل شاہ کی ذاتِ مقدس بھی عرفان کی اس بلندی پر فائز تھی مگر آپ نے اپنی کیفیت کو اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا مجال ہے کہ زبان سے کوئی لفظ کہتے۔ حال کی عُریانی کسی صورت بھی نہ چاہتے تھے۔ جانتے تھے کہ حال کی عُریانی، اس زمانے میں مسخرے اور مضحکہ خیز جملوں کی سزا پائے گی۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ ماضی میں اس کی سزا سُولی تھی لیکن آج کل اس سے بھی سخت سزا وہ لفظوں کے گھاؤ رائج تھی جو انسان کے وجود کو چھلنی چھلنی کر دیتی۔ سو زبان کو لگام دے رکھی تھی۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہندوستان میں قیام تھا آگرہ کی پولیس میں ملازم تھے۔ چاہتے تھے کہ ملازمت چھوڑ دیں مگر محکمہ ہاتھ سے نکلنے نہ دے رہا تھا۔ دوڑ جاتے تو پکڑ کر واپس ڈیوٹی پر لے آیا جاتا۔ کٹھن آزمائشوں کے امتحانات میں سرخرو ہونے کی خاطر سخت محنت و مشقت کی۔ فقر و فاقہ اختیار کیا۔ عبادت کا حق ادا کیا۔ اہلِ خانہ حتیٰ کہ زوجہ تک کنارہ کش ہو گئی مگر یادِ الٰہی نے دل میں ایسی جگہ بنائی تھی کہ صرف خدا کی چاہ تھی۔

پولیس والے ہر دم پیچھے لگے رہتے اور زبردستی ڈیوٹی جوائن کرانے لے جاتے لیکن پھر بھاگ آتے۔ آخر کب تک ایسا ہوتا برداشت کرتے۔ یہ مداخلت طبیعت پہ سخت گراں گزرتی تھی، عبادت میں خلل انہیں کسی صورت پسند نہ تھا۔ جب یہ مداخلت بے جا حد سے زیادہ بڑھنے لگی تو سوچا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ مقام، یہ جگہ، یہ لوگ ہی چھوڑ دیئے جائیں۔ نہ کوئی جان پہچان والا ہوگا نہ یوں تنگ کرنے والا نازل ہوگا۔ چنانچہ دوستوں اور سپاہیوں سے چھپ کر جنگل کی راہ لی۔ جنگل ہی اللہ کی زمین پر ایک ایسا ٹھکانہ ہوتا ہے جو تنہائی پسندوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا ہے۔ چنانچہ ایک سنسان سی جگہ پسند کی، جہاں انسان تو انسان جانوروں تک کا کبھی گزر نہ ہوا ہوگا۔ اب آپ مکمل اطمینان سے یادِ الٰہی میں ڈوب گئے۔ لبوں پہ بس اللہ کا نام تھا۔ دل کی ہر دھڑکن سے اللہ کی صدا گونجتی۔ ذہن میں صرف رب العزت کی خوشنودی کا سوال گردش کرتا تھا۔ کسی اور چیز کا ہوش نہ تھا۔ نہ کھانے کا، نہ پینے کا اور یہی وہ درجہ فنا ہوتا ہے جو انسان کو اُس کے کھانے سے فنا یک تر کر دیتا ہے۔ غذا انسانی جسم کا لازمی جزو ہے۔ نہ ملے تو انسانی جسم میں اتنی سکت ہی کہاں رہتی ہے کہ وہ اپنے وجود کو سنبھال

جب یوں ایک عرصہ تک بھوک کے پیاسے خدا کی یاد میں ریاضت کرتے گزر گئی تو جسم بھوک و فاقہ سے نڈھال ہو چکا تھا۔ حالت اتنی ابتر کہ خود کو پہچان ہی نہ سکتے کہ میں کون ہوں۔ جسم پر ہڈیوں کا ظہور اس طرح ہوا کہ یوں لگتا گویا انسانی جسم کا ڈھانچہ رکھا ہو لیکن زبان اب تک دل و دماغ کا ساتھ دیتی آرہی تھی۔ دل اللہ کو پکارتا تھا' زبان لبیک کہتی تھی۔ دماغ میں رب کی چاہ کا سوال گونجتا' زبان رب کی واحدانیت کا اقرار کرتی رہی۔

اُدھر پولیس والے بھی آپ کی یوں پُراسرار گمشدگی سے سخت پریشان تھے۔ ایسا تو آج تک کبھی نہ ہوا تھا کہ آپ اُن کے شکنجے سے یوں ایک طویل عرصہ آزاد رہے ہوں۔ چنانچہ وہ پوری تندھی سے آپ کی تلاش میں آگرہ اور اُس کا چپہ چپہ چھان مارے دے رہے تھے۔ بالآخر اُس جنگل میں آپ انہیں مل ہی گئے' مگر کس حالت میں ـــــ دیکھ کر بیچاروں کے اوسان خطا ہو گئے۔ سامنے پوست و استخوان کے سوا کچھ نہ تھا جو جسم پر ہو۔ گھبرا کر نبض تھامی تو وہ دھیرے دھیرے چل کر اپنی بقا کا احساس دلا رہی تھی جلدی سے اُٹھایا اور سیدھے لے جا کر سرکاری ہسپتال میں جا داخل کروایا۔ ڈاکٹر حیران تھے۔ میڈیکل ہسٹری میں پہلا کیس تھا۔ ایک طویل عرصہ کا فاقہ انسان کو کب اس قدر سہولت مہیا کرتا ہے کہ وہ ہلکا سا بھی سانس لے سکے مگر اُن کے سامنے وہ سانس لے رہے تھے لیکن پھر بھی ڈاکٹرز کا یقین تھا کہ آج گئے کہ آج گزرے۔ وقت کی بچت کی خاطر سیدھا مُردہ گھر جا ڈلوایا آپکو۔ کبھی کبھی ڈاکٹر یا نرس' ہمدردی کے مارے مُردہ گھر میں نظر ڈال کر دیکھ آتے تاکہ جونہی آپ کی آنکھ بند ہو ورثا کے حوالے کر دیئے جائیں۔

چند دن یونہی گزر گئے لیکن پھر مُردہ گھر سے ایک کڑک دار گونجتی آواز میں خدا کا ورد ہونے لگا۔ لوگ سہم گئے' عقل مند دلیروں نے جھانکا۔ آپ کے ہونٹ ہلتے دیکھے تو ڈاکٹروں کو آگاہ کیا۔ وہ بیچارے حیرت اور شرمندگی سے دوبارہ اُٹھا لائے اور صحیح طریقے سے دیکھ بھال کرنے لگے۔

نفس امارہ وہ واحد طاقت ور دیوار ہے جو اکثر خدا اور بندے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے لیکن انسان اگر ہمت و جرأت کا مظاہرہ کرے تو اس دیوار کی شکست اُس کی دسترس سے باہر ہرگز نہیں ہوتی۔ جب تک انسان تزکیۂ نفس پہ قابو نہ پالے وہ کسی صورت بھی خدا کا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ نفس امارہ پہ قابو پانے کے لیے نفس لوامہ ضروری ہے۔ نفس لوامہ وہ واحد چیز ہے جو انسان کو نفس امارہ کی مکر و فریبی اُس کے چالوں سے آگہی عطا کرتا ہے۔ نفس لوامہ ایک مکمل گرفت رکھتا ہے اور نفس امارہ کو مغلوب کرنے کی بے پناہ صلاحیت بھی' اور یہی نفس لوامہ ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ نفس امارہ کو ختم کر دیتا ہے۔

نفس کو قابو میں کرنے کا سب سے آسان طریقہ تو فاقہ کشی ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ نفس کو بھوک اور پیاس ہی اس حد تک تھکاتے ہیں کہ انسان ان کے آگے سرنگوں نہیں ہو پاتا۔

اولیاء کرام نے نفس کو قابو میں رکھنے اور اس پر سدا غالب رہنے کے لیے بھوک اور پیاس کو ضروری قرار دیا اور فاقے کر کے اس پہ قابو پایا۔ یہی حال حضرت کامل شاہؒ کا تھا۔ نفس پر قابو پانے کی خاطر مہینوں بھوکے پیاسے رہنا۔ کبھی کوئی روکھی سوکھی روٹی مل گئی تو چبا کر کھا لینا۔ ورنہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دن گزارتے چلے جانا' اور اُس منزل کی طرف بڑھتے رہنا جہاں پہنچ کر انسان نعرہ لگاتا ہے کہ

من تو شدم تو من شدی

ایک رات آپ عبادت میں مشغول اس حد تک مگن تھے کہ کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ اُن دنوں آپ کی ڈیوٹی آگرہ کے ریلوے اسٹیشن پر تھی۔ رات کا وقت چونکہ فارغ ہوتا تھا۔ اس سمے آپ خدا کی یاد میں خود کو گم کرنا بہتر خیال کرتے چنانچہ اسی عبادت و ریاضت میں نہ جانے کس طرح آپ کی اُنگلی عمارت کی دیوار سے چھو گئی۔ عمارت سے اُنگلی کا چھونا تھا کہ ایک زلزلہ سا برپا ہو گیا۔ لوگ آہ و بکا کرتے گھروں سے نکل آئے۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔ ہر کوئی یہی سمجھا کہ بھونچال آگیا ہے۔

حضرت کامل شاہؒ کے ایک مُرید خاص ڈاکٹر سلطان ہوا کرتے تھے۔ یہ آپ کے بہت قریبی مُرید شمار ہوتے تھے۔ آپ بھی ڈاکٹر سلطان پہ خاص توجہ کرتے۔ ڈاکٹر سلطان کا ایک لڑکا محمد اشتیاق بخار میں پھنک رہا تھا۔ بخار کچھ ایسا چڑھا کہ اُترنے کا نام

ہی نہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹر اپنے تائیں سبھی کچھ کر کے دیکھ چکے تھے مگر حصول سوائے مایوسی کے کچھ نہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سلطان کو ایسے میں مرشد کا خیال آیا۔ اس دنیا میں وہ اللہ کے واحد برگزیدہ بندے نظر آئے جو انھیں اللہ کی رضا سے اس مصیبت سے نکال سکتے تھے اور اُسے تندرست و توانا کر سکتے تھے۔ چنانچہ روتے روتے آئے آپ کے پاس۔ آپ کو بھی محمد اشتیاق سے خاصا لگاؤ تھا۔ فوراً ڈاکٹر سلطان کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے اور اُن کے گھر جا کر اشتیاق کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولے "اشتیاق۔ پڑھو استغفر اللہ" مریض نے یہ سُننا تھا کہ بند آنکھیں کھول کر بے ساختہ استغفر اللہ کا وِرد کرنے لگا۔ اور وہ محمد اشتیاق آج بھی اللہ کے فضل و کرم سے زندہ و سلامت ہیں۔ لیاقت آباد (کراچی) میں ہولی فیملی میڈیکل اسٹور چلا رہے ہیں۔

حضرت کامل شاہ کو یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ بیک وقت مختلف جگہوں پہ اپنا وجود ظاہر کر سکتے تھے۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب آپ آگرہ میں پولیس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ایک مرتبہ محکمے کی طرف سے آپ کو ایک سمن دیا گیا جس کی تعمیل آگرہ سے آگے ایک گاؤں میں رہائش پذیر مجرم نادر سے کروانا تھی۔ سمن آپ نے لے تو لیا مگر آپ اپنی ریاضت عبادت میں وقفہ نہ ڈالنا چاہتے تھے کیوں کہ وہ گاؤں آگرہ سے اتنا دور تھا کہ اگر آپ مسلسل سفر جاری رکھتے تو بھی ایک دن ایک رات اس میں گزر جانا تھی۔ چنانچہ آپ نے سمن جیب میں رکھا اور مسجد جا کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔

محکمے میں ہندو عملہ بھی تھا وہ آپ کی روش اور اعلیٰ حکام کی اس چشم پوشی سے سخت نالاں تھے۔ اسی لیے موقع کی تاک میں رہتے تھے کہ جس سے فائدہ اُٹھا کر وہ آپ کے خلاف کارروائی کا جواز ڈھونڈ سکیں۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ آپ سرکاری کام کو پسِ پشت ڈال کر اپنی عبادت میں مشغول ہیں تو انھیں آپ کے خلاف قدم اُٹھانے کا موقع مل ہی گیا۔ انھوں نے مسجد میں لوگوں کو بھی اس کا گواہ بنا لیا کہ آپ اس وقت مسجد میں عبادت کر رہے تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے مسجد کی نگرانی اور ناکہ بندی کر دی تاکہ آپ رات مسجد میں ہی گزاریں اور سمن کی تعمیل کرانے نہ جا سکیں۔

یہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے تھانہ انچارج سے اس امر کی شکایت کی کہ حضرت کامل شاہ سرکاری کام کو ذرا برابر اہمیت نہیں دیتے اور اپنے مشاغل میں ہی مشغول رہتے ہیں۔ انچارج بھی ہندو تھا لیکن وہ آپ کی بزرگی اور کرامات کی وجہ سے کسی حد تک آپ کی عزت کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے خلاف کوئی الزام آئے لیکن اب کی بار وہ سمجھ گیا کہ خود وہ بھی حضرت کامل شاہ کے حق میں کچھ نہ کر سکے گا۔

ہندو عملہ بڑا خوش تھا اور صبح کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ کہ حضرت کاملؒ بنا سرکاری کام کیے دفتر آئیں گے لیکن اگلی صبح وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس مجرم سے سمن کی تعمیل کروانا تھی وہ خود ہی تھانہ میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت سٹپٹائے اور کسی صورت بھی ماننے سے رہے کہ آپ نے اس کو سمن دیا تھا تو یہ آیا ہے۔ وہ شخص بار بار سمن دیکھتا اور انھیں یقین دلانے کی کوشش میں لگا رہا اور اُن کے رویے پر حیران بھی تھا۔ بالآخر تھانہ انچارج نے آپ کو بُلایا اور پوچھا۔ کیوں حضرت کیا آپ نے ہی اس مجرم سے سمن کی تعمیل کروائی تھی؟"

آپ نے مسکراتے ہوئے کہا" جناب! کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اسی شخص سے دریافت کریں۔ جو زیادہ درست جواب دے سکتا ہے۔" اُس شخص نے آپ کو دیکھتے ہوئے فوراً پہچان لیا اور کہنے لگا" ہاں جناب! یہی وہ مُلاجی تھے جنھوں نے مجھ سے سمن کی تعمیل کروائی" ہندو عملے نے ماننے سے انکار کر دیا اور فوراً ایک بندے کو گاؤں دوڑایا جو وہاں سے یہ شہادت لایا کہ واقعی آپ وہاں گئے تھے لیکن گاؤں کے حاکم نے کہا کہ جناب آپ کے ہاں سے ڈاڑھی والے ایک مُلاجی آئے تھے جو سمن کی تعمیل کروا گئے تھے۔ گاؤں کے حاکم نے ہی رات بسر کرنے کے لیے انھیں ٹھکانہ مہیا کیا تھا۔ اس لیے اسے آپ کے نقش و نگار بھی یاد رہ گئے تھے جو اس نے بتا دیئے۔

جب تھانہ والوں کو اس امر کی اطلاع کی گئی تو وہ سخت حیران ہوئے مگر انھیں

اسی طرح ایک مرتبہ آگرہ تھانہ کا ایس۔پی تبدیل ہوکر ہندو کی جگہ ایک انگریز آگیا۔ اُس نے جب عملہ میں آپ کی روحانیت
ور کرامات کا چرچا سُنا تو اُسے اس پر ذرا برابر بھی یقین نہ آیا۔ اُس نے آپ کو آزمانے کا تصوّر کیا۔ بے تکلّف دوستوں اور عملہ میں شامل
عہدے داروں نے اُسے اس اَمر سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی مگر وہ بھی کوئی ضدی الشان تھا اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔
چنانچہ اُس نے اس بات کا اہتمام کیا کہ آپ کو دو مختلف عہدے داروں کے پاس ایک ہی وقت حاضری کا پابند کردیا جائے۔
حضرت کامل شاہؒ ہمیشہ اس بات سے بدکتے تھے کہ اپنی کرامات کو یوں عُریاں کرتے پھریں، چنانچہ آپ دونوں کے پاس باری باری
ئے اور انھیں بہت کہا کہ چونکہ مَیں ایک افسر سے ملنے کا پہلے ہی یہ وقت لے چکا ہوں لہٰذا دوسرا اپنے وقت میں تبدیلی کرے لیکن
دونوں نہ مانے۔

مجبوراً جب حاضری کا وقت آیا تو آپ نے بیک وقت دونوں جگہ حاضری دی۔ انگریز افسر آپ کو سامنے پاکر کب یقین کر
تا تھا کہ آپ دوسرے تھانیدار کے پاس بھی ہوں گے۔ لہٰذا اُس نے اس کی تصدیق کے لیے ایک سپاہی دوڑایا۔ اُدھر تھانیدار
نے آپ کو سامنے پاکر اپنے ایک سپاہی کو تصدیق کے لیے ایس۔پی کی طرف روانہ کررہا تھا۔ دونوں تصدیق کنندہ راہ میں مل گئے
ور ایک دوسرے سے سُن کر اپنے افسران سے جاکر سارا ماجرا کہہ سُنایا۔
یہ سُن کر انگریز افسر انگشت بدنداں رہ گیا لیکن اَب اُس کے دل میں آپ کے لیے بہت عزّت و احترام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اس
کے بعد وہ آپ کو "فادر" کہہ کر پکارا کرتا تھا۔
انہی دِنوں ہندوستان میں تحریکِ پاکستان عروج پر تھی۔ مسلمانِ ہند اپنے حقوق کی جدوجہد کے لیے بھرپور طریقے سے تحریک
ئے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد کا زمانہ تھا۔ قراردادِ پاکستان منظور ہوچکی تھی اور مُسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ تنظیم
م کرلیا گیا تھا۔ مسلم لیگ ہر سطح پر پاکستان کے مطالبہ کو پیش کررہی تھی۔ لاتعداد پوسٹر چھپوا کر ہندوستان کے در و دیوار پر چسپاں
دیئے جس میں تحریر ہوتا تھا کہ "بن کے رہے گا پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ یہی ہے اللہ کا فرمان۔"
ایک دن آپ مسجد تشریف لے گئے۔ ساتھ چند مرید بھی تھے۔ جوں ہی آپ نے مسجد کے دروازے پر قدم رکھا تو دیوار پر دو
شتہار دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ایک کانگریسی اشتہار تھا اور دوسرا مسلم لیگی۔ آپ نے جلال میں آتے ہوئے کانگریسی اشتہار
پھینکا اور کہا "اس مردود کا حق کے ساتھ کیا کام۔ بے شک پاکستان بن کر رہے گا۔"
اور آپ کی پیشن گوئی چند برس بعد ہی تکمیلِ پاکستان کی صورت میں سامنے آگئی۔
پاکستان بننے کے بعد برصغیر میں جو خون خرابہ ہوا اور ہندو سکھ اقوام نے بربریت کی جو دہشت ناک مثالیں قائم کیں وہ رہتی
ک اُن کے نام پر کالک کا دھبّہ بنی رہیں گی۔ ظلم و ستم میں لاثانی ان اقوام نے لاکھوں افراد کے لہو سے ہولی کھیلی۔
انہی دنوں آپ کے خاص مُرید سلطان آپ کے پاس مُلاقات کے لیے آئے تو دیکھا کہ آپ سخت جوش کے عالم میں ہیں
ار بار کہہ رہے ہیں "رُوحیں ماری ماری پھرتی ہیں نجانے کیا ہو؟" پھر خود ہی سلطان کو دیکھ کر کہا "کیوں! تمہیں معلوم ہے جہاں
ن نازل ہوتا ہے وہاں کا منظر کیا بن جاتا ہے۔" سلطان حیران پریشان بیٹھے رہے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ حضرت کیا فرما رہے ہیں۔
جلد ہی حضرت کی یہ پیشن گوئی وہ بھیانک طاعون بن کر سامنے آئی جس نے برصغیر کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا۔
پاکستان بنے ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ آپ مسجد میں نماز کی ادائیگی کے بعد بیٹھے تھے۔ سامنے ہی دو قبائلی بھی نماز کی ادائیگی
ارغ ہونے کے بعد دوسری عبادت کے لیے بیٹھے تھے۔ آپ نے اپنے ایک مُرید کو اُن پٹھانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔
ایک دن ہندوؤں کو ایسا ماریں گے کہ ہندوؤں سے اُن کے ظلم کا کسی حد تک بدلہ لے لیا جائے گا۔"
انہی دِنوں دُنیا کی عیار اور پست ترین ذہنیت کی مالک انگریز قوم نے وحشی ہندوؤں کے ساتھ مل کر پاکستان کو نقصان پہنچانے
کشمیر، بھارت میں شامل کردیا جو مسلمان آبادی کا اکثریتی علاقہ تھا۔ جب بات کسی طور بھی سنورتی نظر نہ آئی تو ہمارے پٹھان

جرأت وہمت کے پروانے بنے ناموسِ وطن کی خاطر کشمیر میں ان دو غلیظ ترین عزائم رکھنے والی قوموں پر قہر بن کے ٹوٹے اور کشمیر کا بڑا حصّہ اُن سے آزاد کرالیا۔

اسی طرح لاتعداد ایسی پیش گوئیاں تھیں جو پُوری ہوئیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد آپ نے پاکستان ہی میں رہنے کا ارادہ ظاہر کیا اور پاکستان ہجرت کی۔ یُوں ۱۹۵۲ء میں آپ پاکستان تشریف لے آئے۔

ڈاکٹر سلطان کے دو چھوٹے چھوٹے بچّے تھے جن سے آپ بہت محبت وشفقت سے پیش آتے اور اکثر اُنھیں کھانے کو ٹافیاں، مٹھائیاں دیا کرتے۔ کبھی کبھار خرچ کرنے کے لیے پیسے بھی عنایت کرتے۔ بچّوں کو بھی آپ سے بہت لگاؤ تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے بچّوں کو پیار سے بغل میں دبائے ڈاکٹر سلطان سے کہا۔ "یہ تو دوائیاں ہی لیے پھرتے ہیں۔" ڈاکٹر سلطان کہتے ہیں: مَیں یہ سُن کر سہم گیا کہ کہیں کسی بیماری کی طرف اشارہ تو نہیں مگر آپ کے چہرے پر پھیلی مسرّت وخوشی دیکھ کر مَیں نے اندازہ لگایا کہ حضرت کا کچھ اور ہی خیال ہے۔ اُس وقت تو وہ حضرت کامل شاہ کی بات نہ سمجھ سکے تھے لیکن بچّوں نے جب بڑے ہوکر میڈیکل سٹور چلانے کی خواہش ظاہر کی تو ڈاکٹر سلطان کو آپ کی پیشن گوئی یاد آگئی۔ آخری دِنوں میں حضرت کامل شاہ پر عشقِ الٰہی کا جذبہ اس قدر غالب آیا کہ آپ بار بار فرماتے،" رُوح اَب جسم میں نہیں رہنا چاہتی۔

وصال سے چند دن قبل آپ کے اہلِ خانہ نے کسی شادی میں حیدرآباد آنا تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ یہی آخری دیدار کا دن ہے چنانچہ ہر بچّے کو گود میں لے کر پیار کرتے اور سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے۔ گھر والوں نے حیرت سے کہا۔" بابا! آپ تو ہمیں لگ رہے ہیں جیسے خدانخواستہ ہماری آپ سے یہ آخری مُلاقات ہو۔"

یہ سُن کر آپ مُسکرا پڑے مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اور پھر ۲۲ ویں شب رمضان المبارک کو بروز بدھ وار آپ کا آٹھ بجے شب انتقال ہوگیا۔

آپ کا مزارِ مبارک کراچی میں محلہ پاپوش نگر میں تعمیر کیا گیا ہے۔ حضرت کامل شاہ نے شریعت پر فرمانِ رسول اللہ کے مطابق پُورا پُورا عمل کیا اور شریعت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو دربارِ رسول اللہ سے" عامل شاہ" کا خطاب ملا یعنی شریعت پر ہر درجہ صحیح قدم رکھنے والا۔ عمل کرنے والا۔ پابندِ شریعت کا بادشاہ۔

آپ کہا کرتے تھے کہ شریعت ہی وہ واحد راہ ہے جس سے گزر کر طریقت کے مقامِ اعلیٰ کو پایا جاسکتا ہے، جو حقیقت میں منزلِ حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ شریعت پر عمل نہ کرنے والا کسی بھی طور ولی اللہ نہیں کہلا سکتا۔

مولوی صاحب اپنے ذہین شاگرد کے سوال جواب سے بہت پریشان تھے۔ ایک دن اُنھوں نے اپنی دانست میں شاگرد سے لاجواب سوال کر دیا۔ پوچھا،" بیٹے اگر تم مجھے یہ بتادو کہ خدا کہاں ہے تو میں تمھیں ایک گھڑی انعام میں دُوں گا۔"

ذہین شاگرد نے جواب دیا۔" اگر آپ مجھے یہ بتادیں کہ خدا کہاں نہیں ہے تو میں آپ کو دو گھڑیاں انعام میں دُوں گا۔"

ابوالقاسم حماد نامی ایک درباری، اموی خلیفہ ولید کو حسبِ موقع بہترین اشعار سنانے کی کوشش کرتا تھا لیکن ولید کا شعری ذوق ناقص تھا اس لیے وہ اُس سے پست درجے کے شعروں کی فرمائش کرتا تھا۔ حماد اس بات پر بہت کڑھتا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ولید کی حکومت رُو بہ زوال ہے۔

پھر جب مہدی کی خلافت کا دور آیا تو حماد نے دیکھا کہ مہدی کا شعری ذوق بہت پختہ اور اچھا ہے۔ مہدی اُس سے ہمیشہ عمدہ اشعار کی فرمائش کرتا تھا۔ حماد نے اس امر سے اندازہ لگایا کہ مہدی کی حکومت رُو بہ ترقی ہے اور اقبال مندی اُس کا انتظار کر رہی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اُس کے دونوں اندازے دُرست ثابت ہوئے۔

کسی صُوفی کی رُوحانیت کی بلندی کا معیار پرکھنے کے دو ہی پیمانے ہیں. اوّل یہ دیکھو کہ وہ کس حد تک سنّتِ رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور دوم یہ کہ اُس کے دِل میں عشقِ الٰہی کس حد تک موجزن ہے۔ عمرو بن عثمان مکیؒ تمام سنّتِ رسولؐ پر کاربند رہے اور عشقِ الٰہی میں اس قدر ڈوبے کہ مکّہ کی محبّت میں آپ کا نام ہی مکّی پڑ گیا. عشقِ صادق کی اس کے وہ اور کیا معراج ہو سکتی ہے کہ ہر خاص و عام کی زبان پر اصل نام کی بجائے مکّی ہو۔

آپ زہد و تقویٰ پر اس حد تک کاربند تھے کہ لوگ آپ کو پیرِ حرم کہنے لگے. صُوفیوں کی غیر شرعی باتوں سے سخت نفرت تے تھے اور ہر اُس مُرید کو اپنے حلقہ سے نکال دیتے جو اس کا اظہار کرتا. حسین ابنِ منصور منکشف ہونے والے رازوں کے امین سکے. انا الحق کا نعرہ لگایا تو آپ نے فوراً خانقاہ سے نکال دیا. حدیث و فقہ میں عرفان کی اس حد تک بلندی حاصل کی کہ زبان اسرار و رموز کی زیادتی ہوگئی جو لوگوں کو سخت ناگوارِ خاطر گذرا. فقیہہ اور محدّث قرار پائے. تصوّف کی دُنیا کے دیوانے تھے. سوز و ب اور عشق اور تڑپ کا اظہار کرتے. اپنے عہد کے مروّجہ علوم حاصل کرنے کی جستجو میں رہے. جہاں اُنھیں سمجھایا گیا کہ گناہ کرنے تو گنہگار ہوتا ہی ہے مگر اُس گنہگار کے ساتھ ربط ضبط رکھنے والا بھی اسی زمرے میں آتا ہے. نصیحت کی گئی کہ کسی کا بُرا نہ چاہو' چاہنے والے ہمیشہ خود ہی مصیبت کے شکار رہتے ہیں. صبر کی تلقین کی گئی اور سمجھایا گیا کہ شروع شروع میں تو مصائب اور یف کا سامنا کرنا پڑے گا مگر انجام شیریں ہوگا۔

عمرو بن عثمان مکیؒ کو بتایا گیا کہ عارف وہ ہے جس کی جسمانی آنکھ بند ہو جائے تو روحانی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ یادِ الٰہی میں اس ت گم ہو جائے کہ فنا ہو جائے. فنا فی اللہ. بالکل اسی طرح جیسے لوہا' بھٹی میں تپ کر فنا فی الفور ہو جاتا ہے۔

عمرو بن عثمان مکیؒ سب کچھ سمجھ رہے تھے' علم حاصل کر رہے تھے. اُنھیں اپنا آپ بہت ہلکا لگا یُوں محسوس ہوتا تھا گویا اُن جود آسمان میں اُڑ رہا ہے۔

آپ نے خواجہ حسن بصری' رابعہ بصری اور فضیل بن عیاض کے تصوّفانہ زندگی اور اُن کی تعلیمات پر لکھی گئی کتب طالعہ شروع کر دیا۔

اس مطالعے کے دوران وہ رابعہ بصری کی تیز و تند باتوں کے اثرات اپنے دل و دماغ پر یکساں محسوس کرتے رہے۔ انھوں نے
دوران مطالعہ سفیان ثوری اور رابعہ بصری کے پُراثر مکالمے پڑھے تو ان کا دل تڑپ گیا۔۔۔ سفیان ثوری نے رابعہ بصری کی موجودگی
میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "خدایا مجھ سے راضی ہو جا۔"
اس پر رابعہ بصری نے تند و تیز لہجے میں کہا "کیا تجھے اس خدا سے رضامندی طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی جس سے
تو خود راضی نہیں ہے۔"
اس سلسلے میں رابعہ بصری کا ایک اور واقعہ عمرو بن عثمان کے پورے وجود کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا، اس واقعہ میں
عشق الٰہی اپنی معراج کو پہنچا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک رات رابعہ بصری نے خواب میں رسول اللہؐ کو دیکھا۔ آپؐ نے پوچھا "کیوں
رابعہ! کیا تم مجھ سے محبت رکھتی ہو؟"
رابعہ بصری نے جواب دیا "یا رسول اللہؐ! کون ہے جو آپ سے محبت نہیں رکھے گا لیکن بخدا اللہ تعالیٰ کی محبت نے مجھے
اپنے اندر اتنا جذب کر لیا ہے کہ میرے دل میں نہ کسی دوسرے سے محبت کرنے کی گنجائش باقی رہ گئی ہے نہ کسی سے نفرت
کرنے کی۔"
ان اقوال اور واقعات نے ابن عثمان کے دل میں ایک آگ سی لگا دی تھی اور وہ اس میں بری طرح پھنکے جا رہے تھے۔
ان دنوں بغداد تصوف کا گہوارہ تھا، انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ بغداد جائیں گے اور وہاں تصوف کے جادے پر فی الفور قدم رکھ دیں گے۔
عمرو بن عثمان نے یمن چھوڑ دیا اور مکے کی سکونت اختیار کر لی۔ مکہ کئی اعتبار سے انتہائی اہم شہر ہے، یہاں خدا کا گھر ہے
اور اس کے گلی کوچوں میں رسول مقبولؐ نے اپنی زندگی کے ترپن سال گزارے تھے۔ آپ جب کسی راستے سے گزرتے تو ہمیشہ آپ
کے ذہن میں یہی ہوتا کہ کبھی رسول اللہؐ کے پائے اقدس بھی کہیں نہ کہیں پڑے ضرور ہوں گے۔"
وہ ایک عرصے تک مکے میں رہے اور جب بھی کوئی بات ہوتی، وہ اس بات کو ظاہر اور باطن دونوں ہی سے حل کرنے
اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگتے۔
کچھ دنوں بعد انھیں احساس ہو گیا کہ کسی کی مدد کے بغیر تصوف کی کٹھن اور پُرپیچ راہ پر چلنا بہت دشوار ہے۔
اب آپ نے بغداد کا قصد کیا۔ بغداد میں نہ صرف یہ کہ جنید بغدادی سید الطائفہ موجود تھے بلکہ اس شہر میں دور دور سے
صوفیائے کرام پہنچتے رہتے تھے۔ ان کی آپس میں بات چیت ہوتی رہتی تھی جس سے بڑے کام کی باتیں علم میں آتی رہتی تھیں۔
آپ بغداد روانہ ہو گئے۔ بغداد میں آپ کی ملاقاتیں کئی صوفیا سے ہوئیں۔ ان میں سعید حزاز اور ابو عبداللہ سعید بن زید نباجی
کے نام نامی زیادہ مشہور ہیں۔ نباجی کی مجلس میں پہنچے اور ان کے ارادت مندوں میں یوں گھل مل گئے کہ انھیں الگ سے
نہیں جانا جا سکتا تھا۔ نباجی نے اپنے ارادت مندوں سے پوچھا "کیا تمھیں معلوم ہے کہ آج ایک فقیہ اور ذی علم بھی ہماری
مجلس میں موجود ہے؟"
ہر شخص اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھنے لگا۔ کسی ارادت مند نے پوچھا "کیا وہ فقیہ اور ذی علم کوئی اہم انسان ہے؟"
آپ نے جواب دیا "ہاں وہ بہت اہم انسان ہے۔ جب کوئی عالم اور فقیہ تصوف کی راہ میں قدم رکھے گا تو اس کی
شان ہی کچھ اور ہو گی۔"
کچھ دیر بعد حضرت نباجی نے فرمایا "او یمنی فقیہ! سامنے آ، لوگوں میں کیوں بیٹھ گیا۔"
عمرو بن عثمان نباجی کی خدمت میں پہنچ گئے، کہا "میں اجازت کے بغیر کس طرح حاضر ہو سکتا تھا، آپ کا کرم جو مجھے بلا
فرمایا اور حاضری کی اجازت مرحمت فرمائی۔"
حضرت نباجی نے فرمایا "الادب حلیۃ الابرار" (ادب نیکوں کا زیور ہے)
ابن عثمان ان کے سامنے سر جھکا کے بیٹھ گئے۔ حضرت نباجی فرماتے رہے "ابن عثمان! کیا تم نے یہاں آنے سے
پہلے اس پر غور کیا کہ اب جس راستے کا تم نے انتخاب کیا ہے، وہ آسان نہیں ہے اور یہ بڑی سنگلاخ اور خار دار وادی ہے
سب کچھ کھونے کے بعد تمھیں کیا ملے گا؟ کبھی اس پر بھی غور کیا؟"
انھوں نے جواب دیا "حضرت! میں نے خوب غور و خوض کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔"
حضرت نباجی نے انھیں اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی اور فرمایا "عمرو! یہ یاد رہے کہ دنیا تمھیں اپنی جگہ

نشہ میں کہیں وہ تنہا نہ رہ جائے!

مریض نشے کی طلب کا قیدی ہے۔ نشے کی بیماری اسے تلخ بنا دیتی ہے۔ والدین تھک ہار کر مریض کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ نشہ وہ بیماری ہے جو علاج کے بغیر سو فیصد جان لیوا ہے۔

وہ بیمار ہے اسے معاف کر دیجیے۔

نشہ چھوڑنے کیلئے محض قوت ارادی کافی نہیں ہوتی۔ اسے بہترین علاج مہیا کیجیے۔

صداقت کلینک امراض منشیات میں پاکستان کا سب سے بڑا اور معیاری کلینک ہے جہاں امریکہ کا جدید ترین علاج اور ہمارا دس سالہ تجربہ مریض کی شخصیت میں مثبت تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ ہم آپ کو اپنے نوجوانوں سے ملنے کا موقع فراہم کرتے ہیں جو نشہ چھوڑ چکے ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق مریض کو علاج پر آمادہ کرنا بھی علاج کا اہم حصہ ہے۔ اسی لیے صداقت کلینک مریض کو علاج پر آمادہ کرنے اور گھر سے لانے کی ذمہ داری بھی قبول کرتا ہے۔

بیماری کو راز نہ بنائیے۔

بیماری میں مدد حاصل کرنا دانائی کی علامت ہے۔

انتظار کرنے کی بجائے مدد حاصل کیجیے!

صداقت کلینک تشریف لائیے۔

ہم پرواہ کرتے ہیں۔

آخر نشہ آپ کے بچے کا مقدر کیوں رہے؟

صداقت کلینک

گول گراؤنڈ شادباغ لاہور

فون: 281166، 283232، 281866

REPERCUSSIONS

رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ اپنی طرف راغب اور متوجہ کرنے کی کوشش کرے گی۔"

انھوں نے جواب دیا: "لیکن میں اپنی رغبت اور توجہ کو ماسوا اللہ ہلاک کر دوں گا۔"

حضرت نباجی نے کہا: "تمہارا علم تمہیں سوچنے اور اپنے بھلے بُرے پر غور کرنے کی دعوت دے گا۔ دین کی دشواریاں تمہیں عاجز اور پریشان کر دیں گی اور دنیا کی تن آسانیاں اور تعیشات تم پر کمندیں پھینکیں گی اس وقت تم کیا کرو گے؟"

انھوں نے جواب دیا: "جب میں تصوف کے آداب سے واقف ہو جاؤں گا تو میں کسی بھی چیز سے خوف نہیں کھاؤں گا اور نہ ہی دنیا اور اہلِ دنیا مجھے ورغلانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔"

حضرت نباجی نے جواب میں فرمایا: "بِکُلِّ شَیٍٔ خادِمٌ وَخادِمُ الدین الادب" (ہر شے کا خادم ہوا کرتا ہے اور دین کا خادم ادب ہے)

ابنِ عثمان کے دل و دماغ حضرت نباجی کی باتوں میں نشہ سا محسوس کر رہے تھے۔ وہ سرشار ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے درخواست کی: "پیرِ مرشد! آپ مجھے روشنی عطا فرمائیں۔ میں اپنے دل کی آنکھوں سے وہ نشانیاں دیکھنا چاہتا ہوں جو دل اور دماغ کو اعلیٰ و ارفع روشنی عطا فرمائیں۔"

حضرت نباجی نے جواب دیا: "ابنِ عثمان! اللہ سے امید رکھو اور اس پر تکیہ کرو کہ کوئی نشان اس سے بڑھ کر روشن نہیں۔"

اب فیصلہ ہو چکا تھا۔ ابنِ عثمان نے حضرت نباجی کی خدمت میں رہنا شروع کر دیا۔ یہاں ہر روز عشا کے بعد ارادت مند جمع ہو جاتے اور آپ ان کے سامنے تصوف اور معرفت کے دریا بہا دیتے۔ حضرت نباجی کی باتوں میں بڑا اثر تھا اور ان کی صحبت میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی۔ جو بھی ان کے پاس کچھ وقت گزار کے چند باتیں سن لیتا، وہ وہیں کا ہو کے رہ جاتا۔

ابنِ عثمان کافی دنوں تک ان کی خدمت میں رہے اور مجاہدے اور مراقبے کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔

ایک دن فجر کی نماز کے بعد مریدوں نے اپنے پیر مرشد حضرت نباجی کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھا اور کسی بھی مرید کو جو اس وقت وہاں موجود تھے، یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت نباجی جا کہاں رہے ہیں؟

ابنِ عثمان بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے پیر مرشد سے پوچھا: "حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔"

حضرت نباجی نے جواب دیا: "چلو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں تمہیں ان سے ملانا بھی چاہتا ہوں۔"

ابنِ عثمان اپنے پیر مرشد کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سناروں کے محلے کے اس پار حضرت نباجی ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی کچھ لوگ جمع تھے جو ایک بزرگ کے سامنے ادب سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت نباجی نے ان بزرگ سے ابنِ عثمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "سعید! یہ عمرو بن عثمان ہیں۔ میں ان کے پُرسوز قلب اور بے پایاں علم کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ آپ انھیں اجازت دیں کہ یہ جب چاہیں یہاں حاضری دیتے رہیں۔ اس جوان میں جوہرِ قابل کی کوئی کمی نہیں بس ذرا نظرِ فیض اثر اور توجہ کی ضرورت ہے۔"

یہ ابوسعید کی خانقاہ تھی۔ اپنے وقت کے جید ترین صوفی جنید بغدادی بھی ان کے مداح اور ارادت مند تھے۔ ابنِ عثمان نے یہاں کشش محسوس کی، جتنی دیر بیٹھے سکون محسوس کرتے رہے۔ اب ابنِ عثمان کو دو جگہیں حاصل ہو گئی تھیں۔ آپ یہاں اکثر آجایا کرتے تھے۔ یہاں دوسرے صوفیوں سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی کبھی جنید بغدادی بھی آجایا کرتے تھے۔

ابوسعید کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے انھیں بڑی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک دن انھوں نے ابنِ عثمان کو مخاطب کر کے کہا: "اے ابنِ عثمان! اہلِ معرفت کے لیے کیا ضروری ہے؟"

ابنِ عثمان نے جواب دیا: "ایسے ہی سوالات کے جوابات حاصل کرنے یہاں آتا ہوں۔"

ابوسعید نے کہا: "اہلِ معرفت خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں دیکھتے اور نہ کسی سے ہم گفتگو ہوتے ہیں اور نہ خدا کے سوا کسی کے ساتھ مشغولیت اختیار کرتے ہیں۔"

ایک دن ابنِ عثمان، ابوسعید کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ آپ موزے سی رہے ہیں۔ پھر کبھی اور دن جوتے سیتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کی مجلس میں کسی نے دبی زبان میں جنید بغدادی سے پوچھا: "ابوسعید کو اکثر چمڑے کی چیزوں سیتے دیکھا جاتا ہے۔ کیا اس حال میں یہ اپنے رب سے غافل نہیں ہو جاتے؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ابو سعید خراز تو ہیں (خراز یعنی چمڑے کی چیزیں سینے والے) مگر ان کا ایک لمحہ بھی انھیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں کر سکتا۔ وہ ہر وقت یادِ الٰہی میں گم رہتے ہیں۔"

آپ نے ابو سعید خراز کی صحبت میں آنے جانے کے ساتھ ہی جنید بغدادی کی صحبت میں بھی آنا جانا شروع کر دیا۔ جنید بغدادی ان کے علم و فضل کے قائل تھے۔ آپ کو صوفیائے کرام کی جو باتیں اچھی لگتی تھیں قبول کر لیتے تھے مگر وہ سنتِ رسولؐ کے بے حد قائل تھے اور آپ ہر اس چیز کو رد کر دیتے تھے جو رسول اللہؐ کی زندگی اور قول سے مناسبت نہ رکھتی ہو۔ جنید بغدادی نے ان کے رجحان کو سمجھتے ہوئے ایک بار کہا "عمرو! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم آخر کار خلافت کی طرف سے پیش کردہ کوئی خدمت قبول کر لو گے؟"

عمرو بن عثمان نے جواب دیا "حضرت! میرے خیال میں اس میں کوئی ہرج بھی نہیں کیونکہ گوشے میں بیٹھ کے پوری دنیا سے قطع تعلق کر لینا سنتِ نبویؐ کے خلاف ہے اور میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ رسول اللہؐ کی سنت کے خلاف کچھ کروں۔"

جنید بغدادی نے فرمایا "لیکن یہ زمانہ کچھ اور ہے۔ ہر طرف مکر و فریب اور ریاکاری کا دور دورہ ہے۔ اس لیے اہلِ تصوف کو چاہیے کہ وہ دنیا سے دور رہیں۔"

ابنِ عثمان نے جواب دیا "زمانہ کوئی بھی ہو، مکر و فریب اور ریاکاری سے پاک نہیں ہو گا۔ پھر ہم اس سے محفوظ کیوں کر رہ سکتے ہیں؟"

جنید بغدادی نے گفتگو کا سلسلہ ہی موقوف کر دیا۔ بس اتنا ہی دونوں کے لیے کافی تھا۔

آپ نے جنید بغدادی کی محفل میں سب سے اہم بات یہ محسوس کی تھی کہ یہاں حال اور قال دونوں ہی مل جاتے تھے۔ یہاں تصوف بھی تھا اور علوم بھی، ظاہری علوم بھی باطنی علوم بھی۔ آپ یہاں کی گفتگو میں خود بھی شریک ہو جاتے تھے۔ سورۂ فاطر کا یہ حصہ موضوعِ گفتگو تھا۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرنے والے تو اہلِ علم ہی ہوتے ہیں۔

آپ نے جنید بغدادی سے پوچھا "آپ اس کی تشریح اور تفسیر میں کیا فرمائیں گے؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "ایک تو عارف باللہ ہوتا ہے اور دوسرا عالم باللہ۔ مسلمانوں کے درمیان جب ایک ایسا شخص دیکھا جائے جو خدا کی حمد و ثنا بیان کر رہا ہے، اس کی تسبیح و تکریم میں منہمک ہے۔ اللہ سے خوف زدہ بھی رہتا ہے اور اس سے امیدیں بھی وابستہ رکھتا ہے، اس کی جستجو کرتا ہے اور اس کے لیے سراپا شوق بھی بنا رہتا ہے۔ نیک عمل کرتا ہے، آنسو بہاتا ہے اور اپنے گناہوں پر نادم رہتا ہے۔ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اللہ کا تقرب چاہتا ہے تو اس شخص کی بابت یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی جو معرفت حاصل ہے، وہ ایک عام آدمی کی معرفت سے بہت بلند اور عالی مرتبہ ہے۔"

ابنِ عثمان نے اس میں اتنا اضافہ کر دیا "لیکن انسان کا محض عارف یا عالم ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کا باعمل ہونا بھی ضروری ہے محض عالم ہونا کافی نہیں ہوتا۔"

جنیدؒ نے ناگواری سے کہا "ابنِ عثمان! اگر تم چاہو تو دنیا کو ترک کر کے عارف باللہ کا مقام حاصل کر لو، ورنہ عالم باللہ تو کہلاؤ گے ہی۔"

ابنِ عثمان نے جواب دیا "شیخ! میں انسانی جبلت سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ انسان جو کھاتا پیتا ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے، رشک میں مبتلا ہو جاتا ہے، حسد کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ انسان ان جبلی خصوصیات و اوصاف سے کس طرح کنارہ کش ہو سکتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ بری جبلت کو اچھائیوں میں دبا دوں لیکن انھیں یکسر ختم کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ کیا کھانا پینا ترک کر کے انسان کچھ کر سکتا ہے۔ کھانا پینا اعتدال میں تو رکھا جا سکتا ہے لیکن اس کو یکسر ترک نہیں کیا جا سکتا۔ جسم کی بقا کا انحصار غذا اور پانی پر ہے۔ ان کے بغیر کوئی معرفت حاصل نہیں کی جا سکتی اور جب انسان کھائے پیئے گا تو اس کے لیے کام بھی کرنا پڑے گا اور جب انسان کام کرے گا تو اس کو دنیا میں دنیا کے ساتھ رہنا بھی پڑے گا۔ پھر تصوف میں ترکِ دنیا کا اسلام کی رو سے کیا مقام رہ جاتا ہے۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا "میں ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو ترک کر دینا بہت دشوار عمل ہے۔ دریا میں کودنا اور بھیگنے سے محفوظ رہنا

ناممکن ہے۔"

آپ نے اس گفتگو کی روشنی میں محسوس کیا کہ جنید بغدادی کی صحبت میں زیادہ وقت نہیں گزارا جاسکتا۔ کیونکہ دونوں کے انداز فکر میں فاصلہ تھا۔ آپ نے بغداد کو چھوڑ دیا اور اصفہان چلے گئے۔ اب آپ محض جستجو میں تھے۔ آپ ذاتی طور پر یہ کوشش کر رہے تھے کہ دنیا کو ترک کر کے کیا پاتے ہیں اور کیا کھوتے ہیں۔ آپ نے اپنے ارد گرد تارک الدنیا صوفیوں کو دیکھا تھا۔ اللہ کی یاد میں ڈوبے ہوئے، اللہ کی یاد کے سوا ہر چیز کو چھوڑے ہوئے لوگ، ان کے آس پاس ان کے ارادت مندوں کا ہجوم رہتا اور یہ خود مجاہدے اور وعظ و تلقین میں مشغول نظر آتے۔

آپ کو اس دوران ایک کتاب میسر آگئی۔ اس کتاب کا نام تھا گنج نامہ اس کتاب نے آپ کو بہت متاثر کیا۔ اس کے معنی و مفاہیم نے آپ کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ گنج نامہ آپ کی جائے نماز کے نیچے ہر وقت موجود رہتا اور آپ اس کا مستقل مطالعہ فرماتے رہتے۔

گنج نامہ میں لکھا تھا "ہم نے آدم کی تخلیق کے بعد فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا، ابلیس کے سوا سبھی نے سجدہ کیا، فرشتوں نے آدم کو اس لیے سجدہ کیا تھا کہ وہ تخلیق آدمؑ کے راز سے واقف نہیں تھے لیکن ابلیس اس اسرار سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے سجدے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف آدمؑ بھی ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کے بھید سے جتنے واقف تھے۔ دوسرا واقف نہیں تھا۔ ابلیس کو مردود بارگاہ کرنے کی یہی وجہ تھی۔ پھر ہم نے کہا کہ زمین کے اندر ہم نے ایک ایسا خزانہ پوشیدہ کر دیا ہے کہ جو بھی اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔"

ابلیس نے کہا۔ "مجھ کو جو خزانہ عطا کیا گیا ہے، اس کے بعد مجھے کسی اور خزانے کی ضرورت نہیں۔"

اسے بتایا گیا۔ "لیکن یہ خزانہ تیرے خزانے سے کہیں زیادہ بڑا اور عظیم ہے۔"

ابلیس نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں کوشش کروں گا کہ مجھے اس خزانے کا علم بھی حاصل ہو جائے اور اگر میں نے

رسول اللہ کی دعائے مغفرت

غزوۂ خیبر میں مرحب یہودی اور صحابی رسول حضرت عامرؓ کے درمیان مقابلہ ہوا۔ دونوں کی تلواریں چلنے لگیں۔ مرحب کی تلوار عامرؓ کی ڈھال میں گھس گئی۔ عامرؓ نے اس سے بچنے کے لیے ڈھال نیچے جھکائی تو وہ تلوار ان کی پنڈلی پر جا پڑی اور اس نے ان کی رگ کاٹ دی۔ اسی زخم کے باعث انھوں نے شہادت پائی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ عامر کا عمل بے کار گیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو قتل کر لیا۔ یہ سن کر عامر کے بھتیجے سلمہؓ روتے ہوتے رسول اللہ کے پاس آتے اور پوچھا "یارسول اللہ! کیا عامر کا عمل بے کار گیا؟" فرمایا "یہ کس نے کہا؟" سلمہؓ نے بتایا: "آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں۔" آپ نے فرمایا "جس نے یہ کہا غلط کہا، ان کے لیے تو دہرا ثواب ہے۔" حضورؐ نے یہ اس وجہ سے کہا کہ جب اسلامی لشکر خیبر کی جانب مارچ کر رہا تھا، تو عامرؓ اصحاب رسول کو جوش دلانے کے لیے یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے: "اللہ کی قسم، اگر اللہ نہ ہو تو ہم لوگ ہدایت نہ پاتے، خیرات نہ کرتے نماز نہ پڑھتے۔ جن لوگوں نے ہم پر کفر کیا، انھوں نے جب فتنے کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کیا۔ اے اللہ! ہم تیرے فضل سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اس لیے جب ہم مقابلہ کریں تو ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہم پر سکون و اطمینان نازل فرما۔" جب عامرؓ یہ اشعار پڑھ رہے تھے تو رسول اللہؐ نے دریافت فرمایا "یہ کون ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ عامرؓ ہیں آپؐ نے فرمایا "اے عامر! اللہ تمہاری مغفرت کرے۔" اس واقعے کے راوی کا کہنا ہے کہ حضورؐ نے جب کبھی کسی شخص کے لیے اس کی تخصیص کے ساتھ دعائے مغفرت کی تو وہ ضرور شہادت کے مرتبے سے سرفراز ہوا۔ (ابن سعد)

یہ علم حاصل کر لیا تو اسے عام کر دوں گا۔ سب کو بتا دوں گا۔"
جواب دیا گیا: "تجھ کو مہلت اور اجازت دی جاتی ہے۔ ہمارے بندے تجھ کو جھوٹا کہیں گے اور جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ابلیس ایک ایسا جن تھا جس نے اللہ کا حکم نہیں مانا اور جب ان کے دلوں میں یہ یقین پکا ہو چکا ہو گا تو وہ تیری کسی بات کو بھی سچ نہیں سمجھیں گے۔"
اس گنج نامہ میں ایک دوسری جگہ لکھا تھا۔
"اللہ نے دل کو روح سے سات ہزار سال قبل تخلیق کیا اور اسے محبت کے باغ میں رکھا۔ دماغ کو روح سے ایک ہزار سال قبل تخلیق کیا اور اسے مقام وصل میں ٹھہرایا۔ یہاں اس پر ہر روز تین سو ساٹھ بار نظریں ڈالی جاتیں پھر کلمات محبت سے رواح کو واقف کرایا گیا۔ اس کے بعد دل پر تین سو ساٹھ لطائف وارد کیے گئے اور دماغ پر تین سو ساٹھ بار کشف جمال کی تجلیات ڈالی گئیں۔ اس کے بعد جب دوسری مخلوق پر نظریں ڈالی گئیں تو آدم سے برتر کسی کو بھی نہ پایا گیا۔ اس کے بعد اللہ نے امتحان کے طور پر دماغ کو روح میں، روح کو دل میں اور دل کو اجسام میں قید کر دیا۔ نبیوں کو ہدایت کے لیے بھیجا گیا اور جب یہ سب اپنے اپنے مقام کے متلاشی ہوئے تو اللہ نے نماز کا حکم دیا چنانچہ جسم نے نماز کی مطابقت کی، دل نے محبت کی، روح نے قربت کی اور دماغ نے وصال کی مطابقت کی۔"
اس گنج نامہ میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ آپ اپنے ارادت مندوں کو اس کے مطالعہ سے منع فرمایا کرتے تھے۔
کسی ارادت مند نے دریافت کیا: "آپ تو اس کا مسلسل اور مستقل مطالعہ فرماتے ہیں پھر ہمیں کیوں منع فرماتے ہیں؟"
آپ نے جواب دیا: "اس میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے، اس کے معنی اور مطالب میں اسرار پائے جاتے ہیں۔ تم لوگ نادانی سے ان کا جو مطلب لو گے، اس سے فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا اور تم ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ اس لیے اس کا مطالعہ نہ کرنا ہی اچھا ہے۔"
ارادت مند خاموش ہو گیا۔
اصفہان میں جو لوگ آپ کے پاس آتے جاتے تھے، ان میں ایک نوجوان بھی تھا۔ وہ آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ وہ کسی کی پروا کیے بغیر آپ کے پاس حاضری دیا کرتا تھا۔ اس نوجوان کا متمول باپ صوفیوں سے بہت چڑتا تھا۔ وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کا بیٹا ان کی صحبت میں اٹھ بیٹھ کر کسی کام کا بھی نہ رہ جائے۔
اس نوجوان کا باپ ابن عثمان کا ذکر سن چکا تھا۔ اصفہان کے بازاروں، گلیوں اور کوچوں میں آپ کی شہرت پھیل چکی تھی، گھروں میں آپ کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی چرچے اور شہرت نے اس نوجوان کو آپ کی خدمت میں پہنچا دیا تھا۔ آپ بھی اس پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ نوجوان کے باپ نے دوسروں کے ذریعے آپ کو پیغام بھیجا کہ آپ میرے بیٹے کو اپنے پاس مت آنے دیا کریں۔ اس سے میری بڑی دل آزاری ہوتی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ میں اس سلسلے میں کوئی بڑا قدم نہ اٹھا بیٹھوں۔
آپ نے جواب میں کہلوا دیا: "میں کسی کو یہاں آنے سے منع نہیں کر سکتا۔ نوجوان تیرا بیٹا ہے تو خود اسے کیوں نہیں روکتا!"
اس کے بعد جب یہ نوجوان آپ کے پاس پہنچا تو اس نے پہلی نظر ہی میں آپ میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس کر لی۔ اس وقت تو وہ کچھ نہ بولا لیکن کچھ دیر بعد پوچھا: "پیر و مرشد! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"
آپ نے قدرے بے رخی سے جواب دیا: "نہیں تو، کیوں؟ یہ تو کیوں پوچھ رہا ہے؟"
نوجوان نے عرض کیا: "میں آپ کی نظروں میں پہلے جیسی بات نہیں دیکھ رہا۔ آپ کو میری آمد گراں گزری ہے شاید۔"
آپ نے جواب دیا: "جب تیرا باپ یہ پسند نہیں کرتا کہ تو یہاں آئے تو تو کیوں آتا ہے؟"
نوجوان شرمندہ ہو گیا۔ بولا: "تو یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے۔"
اس کے بعد نوجوان نے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ اٹھا اور اپنے گھر چلا گیا۔ باپ نے اپنے بیٹے کو خاموشی سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو پوچھا: "تو کہاں سے آ رہا ہے؟"
بیٹے نے جواب دیا: "وہاں سے جہاں کا آنا جانا آپ کو پسند نہیں ہے۔"
باپ نے کہا: "ہاں بیشک میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تو صوفیوں کی صحبت میں اٹھ بیٹھ کر خود کو برباد کرے۔ میں ایک

کاروباری انسان ہوں میرے بعد تجھ کو ہی میرا کاروبار سنبھالنا ہے۔ اس لیے میں تجھ کو اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔"
بیٹے نے باپ سے زیادہ بحث نہیں کی۔ بولا "آپ بزرگ ہیں۔ اب میں آپ سے کیا بات کروں لیکن میں خود کو آپ کے اور آپ کے کاروبار کے لائق نہیں پاتا۔ میں کاروباری تو بالکل ہی نہیں اور شاید آپ مجھ سے وہ حاصل نہ کرسکیں جس کی اپنے دل میں تمنا رکھتے ہیں۔"
باپ نے غصے میں کہا "کچھ بھی سہی لیکن اب میں تجھ کو اس درویش کے پاس قطعی نہیں جانے دوں گا جو خود تو بیکار اور فضول زندگی گزار رہا ہے، اپنے ساتھ تجھ کو بھی ضائع کرنا چاہتا ہے۔"
نوجوان نے سکوت اختیار کیا لیکن اس سکوت میں بڑا کرب تھا، بڑی اذیت تھی، بہت دکھ تھا اور اس اذیت میں وہ بیمار پڑ گیا۔ باپ نے شروع میں تو کوئی پروا نہ کی لیکن جب بیٹا گھلنے لگا تو اسے فکر لاحق ہوگئی۔ اس نے لائق ترین طبیبوں سے رجوع کیا۔ انھوں نے علاج شروع کردیا لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر وہ خود کو مجبور اور بے بس محسوس کرنے لگے اور صاف جواب دے دیا "جناب والا! یہی پتا نہیں چلتا کہ اس کو بیماری کیا ہے، پھر علاج کیا ہو؟"
نوجوان کے باپ نے حیرت سے کہا "تم لوگ اپنے وقت کے بقراط اور جالینوس ہو مگر افسوس کہ یہ بھی پتا نہ چلا سکے کہ میرے بیٹے کو مرض کیا لاحق ہے؟"
طبیبوں نے جواب دیا "جن مرضوں کا ہم علاج کرتے ہیں، ان میں تو یہ نوجوان مبتلا نہیں۔ شاید دوا کے بجائے دعا سے یہ صحت یاب ہوجائے۔"
باپ نے پوچھا "لیکن کس کی دعا سے۔ اس کے حق میں کس سے دعا کرائی جائے؟"
اس کا جواب طبیبوں کے پاس نہیں تھا۔ وہ منہ موڑ کر چلے گئے۔ باپ حسرت اور بے بسی سے ان کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ اس نے بیٹے سے پوچھا "تیری حالت کیا ہوئی جارہی ہے کچھ مجھے تو بتا۔"
بیٹے نے شکایت آمیز نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرکے کروٹ بدل لی، منہ دوسری طرف ہوگیا۔
اب باپ کے لیے بات ناقابل برداشت ہوچکی تھی۔ وہ رونے لگا۔ بیٹے کے پاس ہی بیٹھ گیا، پوچھا "بیٹے! کچھ تو بتا کہ بات کیا ہے۔ یہ تجھ کو کون سا مرض لگ گیا ہے جو طبیبوں کی سمجھ میں نہیں آرہا۔"
بیٹے نے ایک سرد آہ بھری اور آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ باپ نے کہا "اب میں اس درویش کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ میرے بیٹے کو اچھا کردے ورنہ اصفہان سے کہیں اور چلا جا۔"
بیٹے نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ باپ نے اس بار ذرا سختی سے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ اس کی بددعا کا اثر ہے جو تو بیمار پڑ گیا۔ وہ نہ جانے یہاں اصفہان میں کیا لینے آگیا۔"
نوجوان نے کروٹ بدلی اور باپ کو آپ کے پاس جانے سے منع کردیا "جب آپ کو میرا وہاں جانا پسند نہیں ہے تو اب آپ وہاں کیوں جائیں گے؟"
باپ نے جواب دیا "میں وہاں تیرے حق میں دعا کرانے جاؤں گا۔"
بیٹے نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"
باپ بیٹے میں یہ گفتگو جاری تھی کہ عمرو بن عثمان اپنے ارادت مندوں کے ساتھ خود ہی وہاں پہنچ گئے اور نوجوان سے پوچھا "یہ تو بستر پر کیوں پڑا ہے؟" پھر نوجوان کے باپ سے پوچھا "تم نے طبیبوں سے اس کا علاج نہیں کرایا؟"
باپ آپ سے مرعوب ہوچکا تھا۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔
آپ نے پھر وہی سوال کیا "تم نے اپنے بیٹے کا علاج نہیں کرایا؟"
باپ نے جواب دیا "کئی طبیب آئے تھے۔ وہ دیکھ کر واپس چلے گئے، کہتے تھے مرض سمجھ میں نہیں آرہا۔"
آپ نے فرمایا "پھر اب کیا ہوگا؟"
باپ نے جواب دیا "حضرت! میں تو آپ ہی کے پاس آنے والا تھا کہ آپ خود تشریف لے آئے۔"

آپ نے پوچھا: "تم میرے پاس آنے والے تھے وہ کیوں؟"
باپ نے جواب دیا: "میں اپنی حرکتوں پر نادم ہوں، میں نے اپنے بیٹے کو آپ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے منع کر کے بڑی غلطی کی۔"
آپ نے نوجوان سے پوچھا: "تیرا کیا حال ہے؟"
نوجوان نے نحیف آواز میں جواب دیا: "آپ کی دعاؤں سے اچھا ہوں۔"
آپ نے فرمایا: "ابھی تک تو ٹھیک نہیں ہے لیکن اللہ نے چاہا تو اب ٹھیک ہو جائے گا۔"
نوجوان نے عرض کیا: "حضرت! میں خوش الحانی میں کسی قوال سے کچھ سننا چاہتا ہوں اگر آپ سنوا دیں تو کرم ہوگا۔"
آپ نے اپنے ایک ارادت مند کو حکم دیا کہ "جا کسی قوال کو اسی وقت اپنے ساتھ لے آ۔"
ارادت مند چلا گیا اور کچھ دیر بعد ایک قوال کے ساتھ واپس آ گیا۔ آپ نے قوال کو حکم دیا: "میرے اس بیمار کی فرمائش پوری کرا اور اسے کچھ سنا دے۔"
قوال نے بیمار نوجوان کی طرف دیکھا اور انتہائی پُرسوز دھن میں پہلا شعر سنایا کہ

ملی مرضت فلم یعدنی عائد ٭ منکم ویعرض عبدکم فاعید
(معلوم نہیں کیوں، کہ جب میں بیمار ہوا تو تمہاری طرف سے کوئی بھی میری عیادت کے لیے نہیں آیا ٭ حالانکہ تمہارا غلام بھی بیمار ہو جائے تو میں اس کی بھی عیادت کرتا ہوں)

نحیف و نزار نوجوان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر شگفتگی پیدا ہو گئی۔ اس نے بے اختیار کہا: "زدنی"
(میرے لیے کچھ زیادہ کیجیے)
قوال نے آپ کی طرف دیکھا، آپ نے اجازت دے دی: "دوسرا شعر — ہاں دوسرا شعر۔"
قوال نے دوسرا شعر خوش الحانی سے ادا کیا۔

واشد من مرضی علی صدودکم ٭ وصدود عبدکم علی شدید
(اور تمہارا مجھ سے رُکا رہنا میرے نزدیک میرے مرض سے زیادہ سخت ہے ٭ اور تمہارے غلام کا رُکا رہنا بھی میرے لیے تکلیف دہ ہے)

آپ نے ہاتھ کے اشارے سے قوال کو روک دیا اور کہا: "بس، اتنا ہی کافی ہے۔"
نوجوان کے باپ نے اپنے بیٹے کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی جو دیکھی تو آپ کی خوشامد کرنے لگا۔ بولا: "حضرت! کچھ دیر تو اور رُکیے۔ آپ کی تشریف آوری نے تو یہاں کا نقشہ ہی بدل دیا۔"
آپ نے جواب دیا: "میں نے کہہ جو دیا کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔"
نوجوان نے اپنے باپ کو منع کیا: "آپ پیر مرشد کو کسی بات پر مجبور نہ کیجیے۔"
آپ نے نوجوان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور فرمایا: "میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں۔ اب تم باپ بیٹے میرے پاس آؤ گے۔"
آپ اپنے ارادت مندوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔ تیسرے دن باپ اپنے صحت مند نوجوان بیٹے کے ساتھ آپ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا: "حضرت! یہ آپ کا غلام آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ قبول فرمائیں۔"
آپ نے جواب میں فرمایا: "اس کی ضرورت تو نہ تھی۔ اس کی قسمت میں جو کچھ ہے اس سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا یہ تو اپنے عہد کا مرشد کامل ہے۔"
اس نوجوان نے اپنے باپ کی اجازت اور خواہش پر دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی اور بلند مقام حاصل کیا۔

اصفہان پھولوں کی سرزمین، آپ کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔ آپ کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا، ہر وقت ارادت مندوں اور عقیدت رکھنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آپ ہر ایک سے انتہائی خوش اخلاقی اور محبت سے پیش

PHILIPS
PHILIPS
PHILIPS
PHILIPS
فلپس
ٹیوب لائٹ
ہی پاکستان کی
واحد ٹیوب لائٹ ہے جس کے
سرے اینوڈ رنگ کیوجہ سے
سیاہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں
فلپس ٹیوب لائٹ میں فیلامنٹ کے گرد اینوڈ رنگ لگائے گئے ہیں اس لئے ٹیوب لائٹ کے کنارے سیاہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں اور آپ زیادہ روشنی زیادہ عرصے تک حاصل کرتے ہیں۔
ایک ۴۰ واٹ ۴ فٹ کے علاوہ ۲ فٹ - ۲۰ واٹ کی ٹیوب لائٹ بھی دستیاب ہے۔
فلپس ٹیوب لائٹ کے استعمال سے آپ یقینی طور پر بجلی کا خرچ کم کر سکتے ہیں۔
کیونکہ یہ بات تحقیق سے ثابت ہوتی ہے کہ ایک ۴۰ واٹ کی فلپس ٹیوب لائٹ ۶۰ واٹ کے پانچ بلبوں سے زیادہ روشنی دیتی ہے اور بجلی کا خرچ صرف ۱/۵ ہوتا ہے۔
فلپس ٹیوب لائٹ پانچ گنا زیادہ چلتی ہے اور اس کو نصب کرنا بھی آسان ہے۔
اپنے گھروں، دفتروں اور دکانوں کو فلپس ٹیوب لائٹ سے روشن اور پُر رونق رکھئے۔
یہی آپ کے روپے کا بہترین نعم البدل ہے۔
فلپس ٹیوب لائٹ نام لے کر طلب فرمائیں
PHILIPS
فلپس
ASIATIC
P.2-82
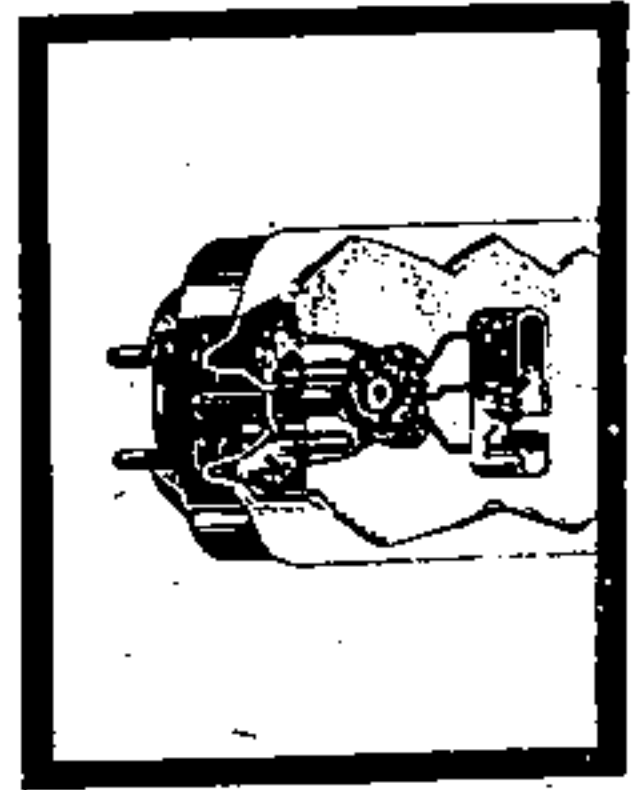
آتے۔ آپ نے کچھ عرصے بعد اصفہان سے خُرقہ کا رُخ کیا۔ خُرقہ عمان کی ایک بستی تھی۔ یہاں بھی آپ کی خدمت میں حاضری دینے والوں کی کمی نہیں تھی۔

فجر کی نماز کے بعد آپ نے اپنے ارادت مندوں کے سامنے ایک چھوٹا سا وعظ کیا اور دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئے۔ ایک ارادت مند نے اندر داخل ہو کے مطلع کیا "حضرت! ایران کے شہر بیضا سے ایک بیس سالہ نوجوان آیا ہے اور آپ سے ملاقات کی تمنا رکھتا ہے۔"

آپ نے پوچھا "بیضا سے۔ یہ بیضا وہی شہر ہے نا جو اصطخر کے قریب واقع ہے، شیراز اور شاپور سے متصل۔"

مرید نے جواب دیا "غالباً۔ صحیح جواب تو آنے والا ہی دے سکتا ہے۔"

آپ نے فرمایا "بلا، اندر بُلا، دیکھوں کیا کہتا ہے وہ؟"

مرید باہر گیا اور کچھ دیر بعد ایک نوجوان کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ آپ نے اس بیس سالہ نوجوان کے سراپا پر سرسری نظر ڈالی اور پوچھا "کہو، کیوں آئے ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا "حضرت! میں نے آپ کا بہت شہرہ سنا تھا۔ ملاقات کا شوق آپ کے پاس کھینچ لایا۔"

آپ نے پوچھا "تیرا نام کیا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "حسین۔"

آپ نے دوسرا سوال کیا "تو بیٹا کس کا ہے؟"

نوجوان نے کہا "منصور کا۔ میرے باپ کا نام منصور تھا، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

آپ نے کچھ سکوت اختیار کیا، پھر پوچھا "کیا چاہتا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "میں آپ سے بیعت ہونے آیا ہوں۔"

آپ نے دریافت کیا "پہلی بار یہاں آیا ہے یا کسی اور کا مرید بھی رہ چکا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "میں عبداللہ تستری کا مرید رہ چکا ہوں۔"

آپ نے چونک کر نوجوان کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا "تو عبداللہ تستری کا مرید رہ چکا ہے؟ کتنے عرصے؟"

نوجوان حسین نے عرض کیا "حضرت! صرف دو سال۔"

آپ نے جواب دیا "خوب، پھر تو تو وہیں چلا جا اور عبداللہ تستری ہی سے واسطہ اور تعلق رکھ۔"

حسین نے کہا "اگر مجھے وہاں واپس جانا ہوتا تو یہاں کیوں آتا۔"

آپ نے فرمایا "لیکن سوال تو یہ ہے کہ تو نے عبداللہ تستری کو کیوں چھوڑ دیا؟"

حسین نے جواب دیا "وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔ وہاں سے میں سیر نہیں ہو سکتا۔"

آپ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے تو سیر ہو جائے گا؟"

حسین نے جواب دیا "اندازہ تو یہی ہے۔ کیونکہ آپ میں دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ آپ عالم بے بدل اور صوفی بے مثل ہیں۔"

آپ نے فرمایا "میری تعریف کر کے میرے نفس کو سرکش اور مغرور نہ بنا۔ شاید وہ نہ نکلوں جو تو سمجھ رہا ہے۔"

حسین نے ضد اور استقلال کا اظہار کیا "حضرت! میں جو فیصلہ کر کے آیا ہوں، اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ آپ سے بیعت ہونے آیا ہوں اور بیعت ہو کر رہوں گا۔"

آپ نے کراہیت سے فرمایا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے ہمیشہ یہ ملال رہے گا کہ میں نے عبداللہ تستری کے مرید کو مرید کر لیا۔"

حسین نے جواب دیا "یہ فکر اور دُکھ تو مجھے ہونا چاہیے آپ کیوں دُکھ میں مبتلا ہوں۔"

آپ نے طوعاً و کرہاً حسین کو اپنے حلقۂ ارادت مندان میں داخل کر لیا۔ یہ نوجوان کچھ زیادہ ہی دلیر اور پُرجوش آتا تھا۔ آپ نے اپنے مریدوں سے کہا "مجھے تو اس نوجوان کے آثار بہتر نہیں نظر آتے۔"

آپ اس نوجوان کی عجیب و غریب باتوں سے پریشان رہنے لگے۔ وہ آپ سے حیران کن سوال کرنے لگا۔ آ

نے اسے سمجھایا "حسین! ایسی باتیں مت کیا کر، کیونکہ ان میں فتنہ مستور ہے تو خود نقصان اٹھائے گا اور ہمیں بھی پریشان کرے گا۔"
حسین نے کمال استغنا سے جواب دیا "پیر مرشد! جو جس کے مقسوم میں ہوگا، وہ اسے مل کر رہے گا پھر ہم پریشان کیوں ہوں؟"
آپ نے فرمایا "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے عبداللہ تستری کو خود نہیں چھوڑا، بلکہ انھوں نے تجھے چھوڑ دیا ہوگا۔"
حسین نے جواب دیا "بات تو ایک ہی ہوئی۔ میں انھیں چھوڑ دیتا، مگر اس سے پہلے ہی انھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔"
ایک دن آپ نے حسین کو اس حال میں دیکھا کہ وہ گنج نامہ لیے بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ آپ نے پوچھا "یہ تو کیا پڑھ رہا ہے؟"
اس نے جواب دیا "گنج نامہ۔ کیوں؟ آپ کو اس پر کسی قسم کا اعتراض ہے؟"
آپ نے فرمایا "ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ہمیں تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ گنج نامہ تو لایا کہاں سے ہے؟"
حسین نے جواب دیا "آپ ہی کا ہے۔ آپ کی جانماز کے نیچے سے؟ کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"
آپ نے فرمایا "ہاں مجھے اس پر اعتراض ہے۔ تجھ کو میری جانماز کے نیچے سے کوئی چیز میری اجازت کے بغیر نہیں نکالنا چاہیے۔"
حسین خاموش ہوگیا۔
آپ نے اپنے مریدوں سے کہا "حسین ایک سرکش اور شوریدہ سر نوجوان ہے۔ اس کو میری چیزیں مت چھونے دیا کرو اگر تم اسے نہ روک سکو تو اس سے مجھ کو مطلع کر دیا کرو۔"
مریدوں نے وعدہ کرلیا۔ کچھ دنوں بعد آپ کو اندازہ ہوگیا کہ حسین اس لائق نہیں ہے کہ اسے کوئی صوفی اپنی صحبت میں رکھے۔ اس کی باتوں سے فتنہ اور کم عقلی کی بو آتی تھی۔ حسین کو آپ نے کئی بار کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔ ایک بار آپ نے اس سے پوچھ ہی لیا "کیوں حسین! یہ تو کیا لکھتا رہتا ہے؟"
حسین نے جواب دیا "میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، یہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس لیے میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔"
آپ نے اصرار کیا "پھر بھی، کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ تم کیا لکھتے رہتے ہو اور اس میں وہ کیا ہے جو کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئے گا؟"
حسین نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا "اس سلسلے میں پھر کبھی بات ہوگی، سردست گفتگو کو موقوف کر دیا جائے تو بہتر ہے۔"
آپ خاموش ہوگئے۔ آپ نے حسین کو کئی بار اپنے آپے میں نہیں دیکھا۔ وہ دیوانوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ عصر سے ذرا پہلے حسین کچھ لکھنے میں مشغول تھا، اتنے میں آپ وہاں پہنچ گئے اور رسماً پوچھ لیا "حسین! کیا ہو رہا ہے؟"
حسین نے جواب دیا "قرآن کا جواب لکھ رہا ہوں۔"[1]
آپ غصے میں برس پڑے "یہ کیا بک رہا ہے تو۔ دور ہو جا میری نظروں سے، دفع ہو جا۔ ورنہ میں حالتِ اشتعال میں تجھ کو قتل کر دوں گا۔"
حسین آپ کی برہمی دیکھ کر سامنے سے ہٹ گیا۔
دوسرے دن صبح جب آپ نے نمازِ فجر کے بعد گنج نامہ پڑھنے کی غرض سے جانماز کے نیچے ہاتھ ڈالا تو وہ

---

[1] لیکن اس واقعہ کو ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر شعبۂ دینیات الازہر یونیورسٹی قاہرہ (مصر) اپنی کتاب جنید بغدادی سوانح، نظریات اور رسائل میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔
"عمرو ابن عثمان مکی حلاج (حسین بن منصور) کی بابت کہتے تھے کہ اگر میں اسے کہیں پالوں تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں۔ جب ان سے اس قدر برہمی کا سبب دریافت کیا گیا تو جواب دیا "میں ایک مرتبہ قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ رہا تھا کہ حلاج بول اٹھا "ایسا کلام تو میں بھی بول سکتا ہوں۔"
اس مضمون میں جو لکھا گیا۔ وہ تذکرۃ الاولیا از شیخ فریدالدین عطار سے لیا گیا ہے۔

وہاں موجود نہیں تھا آپ بہت پریشان ہوئے اور اپنے مریدوں سے پوچھا "میری جانماز کے نیچے گنج نامہ رکھا تھا۔ وہ نہیں مل رہا۔ کسی نے لیا ہو تو بتا دے۔"

مرید ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ وہ سب بہت پریشان تھے۔

آپ نے برہمی سے پوچھا "تم لوگ خاموش کیوں ہو۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

ایک مرید نے سب کی طرف سے جواب دیا "ہم سب بے قصور ہیں، اب آپ کو کس طرح یہ یقین دلائیں کہ ہم نے آپ کا گنج نامہ نہیں لیا۔"

آپ بہت ناخوش تھے، بولے "جب کسی نے لیا نہیں تو وہ کہاں چلا گیا؟"

اس مرید نے عرض کیا "اب اگر جواب میں ہم کچھ کہیں گے تو بات غیبت اور شبہے کی ہو جائے گی۔"

آپ نے فرمایا "میں جواب چاہتا ہوں، میں اس شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں جس نے میرا گنج نامہ چوری کیا ہے۔"

ایک دوسرے مرید نے عرض کیا "حضرت! آج صبح حسین بن منصور نے آپ کی جانماز الٹ کے کوئی چیز لی تھی۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔"

آپ کو بے حد غصہ آیا، فرمایا "ابن منصور! تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ تو جہاں کہیں بھی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن گنج نامہ کی عبارت تیرے لیے مصیبت بن جائے گی۔ کیونکہ تو اس کا جو مفہوم لے گا اسے عام کرے گا اور آخر کار تو دار پر چڑھا دیا جائے گا۔"

مریدوں نے پوچھا "کیا ابن منصور کے ساتھ ایسا ہو کر رہے گا؟"

آپ نے جواب دیا "ایسا ضرور ہو گا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی۔ میرا گنج نامہ جو بھی لے گیا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا اور اس کی لاش کو جلا کے راکھ ہوا میں اڑا دی جائے گی۔ اس کو گنج نامہ کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ وہ اس کے بھید تک رسائی نہیں حاصل کر سکے گا۔"

آپ بغداد تشریف لے گئے اور یہیں رہنے لگے۔ انھیں ایک بار پھر بہت سے صوفیوں سے ملاقات کا موقع ملا، یہاں ان سب کے سرخیل جنید موجود تھے۔ آپ ان کے پاس پابندی سے حاضریاں دینے لگے۔ آپ سے جنید بغدادی کی گفتگو علمی اور عارفانہ ہوا کرتی تھی۔ ایک روز صحو پر گفتگو ہوئی تو صحو کے سلسلے میں حضرت جنید بغدادی کی ایک نظم آپ کو بے حد پسند آئی۔ وہ نظم یوں تھی۔

جو کچھ میرے اندر تھا، وہ میں نے پالیا
میری زبان تجھ سے پردۂ اخفا میں ہمکلام ہوئی
اور ہم دونوں ایک لحاظ سے متحد ہو گئے
لیکن ایک دوسرے اعتبار سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہیں
اور اگرچہ رعب و ہیبت نے تجھے میری ان آنکھوں سے پوشیدہ کر رکھا ہے
لیکن جذبۂ وجد و انبساط نے تجھے میرے سب سے قریبی حصۂ جسم سے بھی قریب تر کر دیا ہے۔

اس نظم میں صحو (نظریہ بحالیٔ ہوش) کی ترجمانی کی گئی ہے۔ صحو کی یوں تو اس طرح وضاحت کی گئی ہے۔ وہ نفوس جو اپنی انفرادیت گم کر کے اور انسانی وجود سے گزر کر توحید کے مقام کو پہنچ جاتے اور ذات خداوندی میں رہنے لگتے ہیں اور ان پر اس ذات مطلق کا کامل غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ پوری طرح اپنے مالک اور فاتح کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا اپنا ارادہ بھی باقی نہیں رہتا۔ بلکہ وہ اس ذات غالب کے ارادے میں ضم ہو جاتا ہے اور ان کے لیے اس دنیا میں کوئی کام کرنے یا کوئی مقصد سامنے رکھنے کی بابت سوچنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ جب کوئی انسان اس حال کو پہنچ جائے تو دنیوی زندگی کے عام قوانین اور معیار اس کے لیے اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ اب وہ ایک آلہ بن جاتا ہے خدا کے لیے۔ یہاں نیکی اور برائی کا امتیاز بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو خالق کی طرف سے آتی ہے، خوب ہوتی ہے۔ اس کے لیے سب کچھ اللہ کی رضا ہوتی ہے۔

عمرو بن عثمان کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ یہ حالت صوفی کو منطقی طور پر ایک ایسے رویّے کی طرف لے جاتی جس سے وہ خود کو معاشرے کے احکام و قوانین سے بالاتر سمجھنے لگے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض صوفیہ فی الواقع دینی احکام کو پس پشت ڈالنے لگے ہیں اور مذہبی فرائض اور واجبات سے انھوں نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔

آپ کہتے کہتے ایک دم رک گئے تو جنید بغدادی نے کہا "ہاں ہاں، بولو بولو، رک کیوں گئے؟"

آپ نے فرمایا "یہ لوگ معروف کو بجا لاتے اور منکر سے اجتناب کرنے سے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں جب ایک شخص خدا کی رضا میں محصور ہو گیا تو اسے ان احکام پر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ گویا یہ سمجھتے ہیں شریعت کے احکام اور قوانین صرف عوام الناس کے فائدے کے لیے ہوتے ہیں اور رہے وہ نفوسِ عالیہ جو خدا کائنات کے ساتھ ایک حالتِ اتحاد میں رہتے ہیں تو ان کے لیے یہ فضول اور بے فائدہ ہیں۔"

جنید بغدادی آپ کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے آپ جیسے ہی چپ ہوئے، جنید بغدادی نے کہا "کہ یا کچھ اور؟"

آپ نے فرمایا "اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مذہب کے احکام اور معاشرے کے قائم شدہ رواجوں کی طرف سے یہ بے تعلقی ایک صوفی کو ایک خاص قسم کی رندی اور آوارگی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں کئی صوفیہ میں مذہبی اعمال کی طرف ایک پورا منفی رویّہ پاتا ہوں۔"

جنید بغدادی نے پوچھا "بس یا کچھ اور؟"

آپ نے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ بعض صوفیہ ایسے بھی ہیں جن کا یہ نظریہ ہے کہ عمل سے دور رہنا ہی نیکی ہے اسی میں خشیتِ الٰہی پائی جاتی ہے۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا "یہ ان کا عقیدہ ہے جو مذہبی اعمال کو بالکل بے وقعت خیال کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص سے تو ایک زانی اور چور بھی میرے نزدیک بہتر ہے لوگ اللہ کی معرفت رکھتے ہیں، وہ اس کے احکام بہ طیب خاطر بجا لاتے ہیں اور ان پر عمل کر کے انھیں اس کی جناب واپس پیش کر دیتے ہیں۔ اگر میری عمر ایک ہزار سال بھی ہو تو میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرے اعمالِ خیر میں ایک ذرہ کمی پائی جائے۔"

اسی دوران آپ کو مکہ میں قاضی کا منصب پیش کیا گیا، آپ نے اسے قبول کر لیا۔ جب جنید بغدادی کو یہ خبر پہنچی گئی تو وہ عمرو بن عثمان سے ناراض ہو گئے اور کہا "بس جناب! اب ہماری دوستی ختم ہوتی ہے۔ آپ کو یہ منصب اور مجھے آپ سے انقطاعِ تعلق مبارک۔ اب ہم دونوں پاس پاس نہیں رہ سکتے۔"

آپ نے جواب دیا "کیوں؟ کیا ایک صوفی کو حکومت کا کوئی منصب نہیں قبول کرنا چاہیے؟"

جنید بغدادی نے فرمایا "کم از کم میرا تو یہی عقیدہ ہے۔"

آپ نے فرمایا "میں منصبِ قضاۃ سے بہتوں کو فائدے اور انصاف دے سکوں گا۔"

جنید بغدادی نے افسردگی سے کہا "بہرحال ایک دوست کی جدائی کا میں ہمیشہ غم محسوس کروں گا۔"

اس کے بعد آپ مکے چلے گئے اور منصبِ قضاۃ سے حقداروں کو فائدے پہنچانے لگے۔

آپ نے مکے میں قاضی کا منصب نہایت ایمانداری اور جرأت سے انجام دیا لیکن تصوف پر بھی کار بند رہے آپ بار ہا اعتکاف میں بھی بیٹھے۔ آپ کو حرم کعبہ سے بڑی محبت تھی اور اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہ تھے آپ حد درجہ نیک اور پرہیزگار ہونے کے باوجود توبہ و استغفار میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے ایک مرید سے

ایسا آپ کے شہر میں بھی ہو سکتا ہے
فرانس، یونان، اٹلی اور سپین میں خشک سالی سے پینے کے پانی کی قلت
ڈیم پانی سے خالی ہیں، جنگل جل رہے ہیں، چرچ بارش کی دعائیں کر رہے ہیں
پانی نعمتِ ربِّ جلیل ہے
اسے ضائع مت کیجئے
واسا چوبیس گھنٹے پانی فراہم کر رہا ہے لیکن اسے بے دریغ ضائع مت کیجئے۔ کیونکہ یہ کسی دوسرے کے کام بھی آ سکتا ہے۔
ہماری بے احتیاطی ہماری پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔
اس لیے بلا وجہ کھلا نل فوراً بند کر دیں۔
WASA
واٹر اینڈ سینی ٹیشن ایجنسی
لاہور

"حضرت! آپ سُنتِ رسولؐ پر اس حد تک کاربند ہیں کہ ایک عالم آپ سے رشد و ہدایت کا خواہش مند ہے۔ زہد و تقویٰ میں بے مثل ہیں، پھر آپ کی یہ توبہ واستغفا کیا معنی رکھتی ہے؟ آپ دن رات کیوں بارگاہِ الٰہی میں روتے ہوئے توبہ کرتے گڑگڑاتے ہیں۔"

یہ سُن کر آپ نے غمزدہ انداز میں جواب دیا۔ "یہ تو تم لوگوں کے کہنے کی باتیں ہیں، میرے رَبّ کی باتیں کون جانتے، وہ بے نیاز پروردگار ہے۔ نجانے اُس نے میرے کن اعمال کو پسند کیا ہوگا اور کن اعمال کو اُس نے ٹھکرا دیا ہو۔ مَیں تو پھر ایک گناہ گار ادنیٰ انسان ہوں۔ خاتم النبین حضرت محمّد مصطفیٰؐ جن کے لیے کائنات بنائی گئی جو خیر البشر تھے۔ جب وہ خدا سے گناہوں کی معافی کیلئے طلبگار ہوئے تو مَیں کس کھاتے میں ہوں۔ توبہ تو ہر شخص پر فرض ہے۔ اس کے لیے کوئی عُذر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔"

آپ ذکر کے قانون وقواعد بیان کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ اس کی شرط یہی ہے کہ صرف اللہ کی ذات کو ہی ہر عبادت کا سزاوار جانو۔ اُس کی واحدنیت کا پرچار کرو اور خدا کے اوصاف پہچانو۔

آپ فرمایا کرتے تھے مرّوت یہی ہے کہ بھائیوں سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو اُس سے قطع نظر کر لیا جائے۔

مکّہ سے آپ نے جدّہ کا سفر کیا تو وہاں آپ کو قاضی بنا دیا گیا مگر جلد ہی آپ جدّہ کے ماحول سے دِل برداشتہ ہو گئے بغداد جا پہنچے۔ بغداد والوں نے جب ایک صُوفی کو اپنے شہر وارد ہوتے دیکھا تو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے لیکن آپ نے اُن کے انتہائی معقول جواب دیئے۔ فہم انداز میں اُنھیں سمجھایا تو وہ آپ کی عرفان کی بُلندی کے قائل ہو گئے، آپ کے ہاتھ پر ایمان لے آئے۔

۲۹۷ ہجری میں علم و ہدایت کا یہ روشن آفتاب غروب ہو گیا۔

فاقے سے نجات!

عبدالرحمٰن بن ابی عمرۃ الانصاری نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ کسی غزوہ میں رسول اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ لوگوں پر فاقے کی مصیبت آگئی تو انھوں نے حضورؐ سے اپنی بعض سواریوں کے ذبح کرنے کی اجازت چاہی اور عرض کیا کہ اس ذریعہ سے اللہ ہمیں منزل تک پہنچا دے گا۔ عمرؓ بن خطاب نے جب دیکھا کہ آپؐ نے لوگوں کو بعض سواریاں ذبح کرنے کی اجازت دینے کا قصد فرما لیا ہے تو عرض کیا "یارسول اللہ! اگر سواریاں ذبح کر دی جائیں گی، تو ہماری کیا کیفیت ہو گی؟ کل صبح کو ہم بھوکے اور پیادہ دشمن کا مقابلہ کریں گے؟ آپ کی رائے ہو تو لوگوں سے ان کا بقیہ توشہ منگائیے، اور اسے جمع کیجیے اور اللہ سے برکت کی دعا کیجیے۔ بے شک اللہ آپ کی دعا سے ہمیں برکت دے گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقیہ توشہ منگایا تو لوگ ایک مٹھی اور اس سے زیادہ غلہ لانے لگے۔ سب سے بڑی مقدار جو لایا وہ ایک صاع کھجور تھی۔ آپؐ نے اس کو جمع کرایا، کھڑے ہوتے اور جو دعا اللہ کو منظور تھی مانگی۔ لشکر کو مع ان کے برتنوں کے بلایا اور حکم دیا کہ وہ چنگل سے بھر لیں۔ سارے لشکر میں کوئی برتن ایسا نہ بچا جس کو انھوں نے بھر نہ لیا ہو۔ اس پر بھی بچ رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنا مسکرائے کہ آپ کی کچلیاں کھل گئیں۔ فرمایا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک میں اللہ کا رسول ہوں۔ جو بندۂ مومن ان دونوں کلمات کے ساتھ قیامت میں اللہ سے ملے گا، تو اس سے دوزخ روک دی جائے گی۔"

خواجہ محمد معصوم

حضرت مجدد الف ثانیؒ امام ربانی۔ قطب سبحانی کے گھر بچے کی ولادت متوقع تھی کہ ایک روز آپ کو عالم خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔

حضورؐ نے فرمایا: "شیخ احمد! عنقریب تیرے گھر میں ایک فرزند ارجمند پیدا ہوگا اس کا نام محمد معصوم رکھنا کیونکہ وہ عمر بھر معصوم رہے گا۔" یہ خواب شیخ احمد کی ان پریشانیوں کا مداوا ثابت ہوا جن کے متعلق مجدد الف ثانی اکثر آزردہ خاطر رہا کرتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ عمر طبعی کا کوئی پتہ نہیں کب دم واپسیں ہو جائے اور وہ مشن جس کے ذریعہ اکبر بادشاہ کی لادینی حکومت کا خاتمہ ہوا تھا اور جہانگیر بادشاہ کی حکومت کو اصلاح اور احیا نصیب ہوئی تھی وہ ادھوری نہ رہ جائے۔

اس رویائے طیبہ نے آپ کو تشفی و تسلی سے ہمکنار کیا۔ آپ و فور شوق کے ساتھ اپنی اہلیہ کے پاس آئے اور ان کو حضرت محمدؐ کے روح افزا سے باخبر کرنا چاہا مگر اہلیہ محترمہ پہلے ہی ان کو کچھ بتلانے کے لیے بے چین تھیں۔ حضرت مجددؒ نے بیوی کی بے قراری محسوس کیا اور اُن سے وجۂ اضطراب پوچھی۔ بیوی نے وہی خواب من وعن پیش کر دیا جیسا خواب خود مجدد الف ثانی دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اہلیہ کو بتلایا کہ نیک بخت ایسا ہی خواب میں نے بھی دیکھا ہے۔ اب خدا ہم پر مہربانی کرنے والا ہے ہم اس بچے معصوم کا انتظار کریں گے جس کے نور سے مشرق و مغرب منور ہو جائیں گے۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی درود شریف کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔

احیائے دین اور اصلاح ملت کے متعلق جو افکار پریشان مجدد الف ثانیؒ کو لاحق تھے وہ ہمیشہ کے لیے اُن کے دل و دماغ سے معدوم ہو گئے تھے۔

۱۰۰۷ھ شوال کے مہینے کی ۱۱ تاریخ تھی۔ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بشارت جو حضرت مجدد اور اُن کی زوجہ محترمہ کو دی گئی تھی عملی شکل میں واضح ہو گئی۔ قیوم ثانی نے کائنات میں قدم رکھا۔ حکم رسولؐ کے مطابق محمد معصوم اس کا نام رکھا گیا۔ بچہ آغاز سے غیر معمولی خوبیوں کا مالک تھا۔ برہنگی سے اس کو قطعی نفرت تھی اور حجاب کا اس کو اتنا خیال رہتا کہ ذرا سی غفلت سے اگر کپڑا جسم سے سرک جاتا تو بچہ اس قدر سکڑ جاتا اور اتنی دیر سکڑا رہتا جب تک اس پر ستر پوشی نہ کر دی جاتی۔ غذا کے معاملہ

میں اُس کو قطعاً بے چینی نہ ہوتی تھی۔
ابر آلود ایام میں جب رمضان شریف کا مہینہ آیا تو چاند کے نظر آنے کے متعلق شک و شبہ تھا۔ لوگوں نے حضرت مجددؒ کے سامنے اس مشکل کا ذکر کیا آپ نے برجستہ فرمایا کہ لوگو! تم کل کا روزہ رکھ لو اگر میرے معصوم بیٹے نے کل دن کے وقت دودھ پی لیا تو روزہ نہ ہوگا اور اگر نہ پیا تو روزہ ہوگا۔ لوگ تعمیل بجالائے اور دوسرے روز روزہ رکھ لیا گیا اور اس سرمدی معصوم نے یہ ثابت کردیا کہ واقعی روزہ اس دن تھا۔ اس نے افطار سے پہلے دودھ بالکل نہ مانگا نہ پیا اور یوں اس معصوم ازلی نے لوگوں کو روزے کے ضیاع سے بچالیا۔

✦✦

فرزندِ مجددؒ خواجہ محمد معصوم باپ کی طرح بڑے لائق فائق تھے۔ عمر کے تیسرے سال ہی میں آپ کے اندر جو صفاتی رنگ تھے رونما ہونے شروع ہو گئے۔ آپ نے کم عمری میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ ۱۱ سال میں آپکی تحصیلِ علم کی تکمیل ہو چکی تھی آپ نے وہ تمام اسرار و رموز کم سنی میں حاصل کر لیے تھے جن کے لیے عمر درکار ہوتی ہے۔ جب شاہ جہاں آپ کا مُرید ہوا اس وقت محلاتی سازشوں اور امرائی رقابتوں کی وجہ سے جہانگیر کی بدظنی سے خائف تھا۔ خواجہ معصوم نے شاہ جہاں کو دعائے خیر دی اور اس کو نوید مسرت سنائی کہ حکومت بالآخر تمہی کو ملے گی اور یوں ۲۷ صفر بروز اتوار ۱۰۳۷ھ جہانگیر بادشاہ کی وفات کے بعد نورجہاں کے لاکھ جتنوں اور کوششوں کے باوجود حکومت شاہ جہاں کو ملی۔ شاہ جہاں نے عنانِ سلطنت سنبھالتے ہی خواجہ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کی "پیرومرشد مجھے آپ کی سرپرستی اور وسعت گیری درکار ہے"
"خواجہ معصوم نے فرمایا دعا تو ہمیشہ تمہارے حق میں رہے گی مگر تمہیں بھی ہمیشہ ہمارے احکام کی پیروی کرنا ہوگی"
شاہ جہاں نے دست بستہ عرض کیا۔ حضرت میں آپ کا خادم ہوں آپ کے احکام کو بسر و چشم بجالاؤں گا۔ آپ ارشاد فرمائیں۔
اس پر خواجہ معصوم نے فرمایا۔
"تو جانتا ہے تمہارے دادا اکبر اعظم سے حضرت مجددؒ کے ساتھ بہت سے اختلافات رہے اور تمہارے والد جہانگیر نے بھی مشکلات کھڑی کیں لیکن بعد میں وہ تائب ہو گیا اور اُس نے احیائے دین کے بہت سے کام کر ڈالے ہیں ہر ممکن حضرت کے احکام کی تعمیل کی مگر پھر بھی کئی سقم باقی رہ گئے ہیں جن کو تکمیل تک پہنچانا ابھی ضروری ہے"
شاہ جہاں بولا "آقا و مرشد! آپ ارشاد فرمائیں حکم کی بجا آوری فی الفور ہوگی"
خواجہ معصوم نے فرمایا کہ "مساجد کی رُکی ہوئی تعمیر کو دوبارہ جاری کیا جائے۔ رائج الوقت سکوں پر کلمہ طیبہ کندہ کیا جائے۔ علماء و فضلاء حضرات کے وظائف وافر مقدار میں جاری کیے جائیں کیونکہ مُلاؤں اور علماؤں کی حیثیت کسی بھی اسلامی معاشرے میں اہمیت کی حامل ہوتی ہے"
شاہ جہاں نے خواجہ معصوم کے احکامات پر فوری عمل درآمد کرنے کے احکام جاری کر دیئے اور یوں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نامکمل خواہشات کو عملی شکل ملی اور یہ وہی وعدہ اور بشارت تھی جو حضور اکرمؐ نے دی اور آج اسکا عملی مظاہرہ ہو رہا تھا اور بارش کا آغاز ہو گیا تھا۔

✦✦

حضرت خواجہ معصومؒ کی شادی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک مُرید اور خلیفہ بزرگ صغیر احمد رومی کی صاحبزادی بی بی سے ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۲۱ھ میں قرار پائی گئی۔ آپ پر شروع سے ایسے اسرار منکشف ہونے لگے کہ لوگ آپکی بالا بلندی کے قائل ہو گئے۔ اُن کو کائنات کے ہر ذرے سے ہی اسرار و رموز نظر آنے لگے۔ بعض اوقات آپ کو آسمان اور زمین تک نور ہی نور نظر آتا۔ لوگ آپ کو انسان و حیوان میں سے بھی نکلتا ہوا نظر آتا۔ درختوں اور پہاڑوں غرض تمام موجودات کو آپ بعض اوقات نور سے معمور

تھے لیکن آپ اس صورتحال کو مطلق سمجھ نہ سکتے تھے۔ آپ اپنے والدِ گرامی مجدد الفِ ثانیؒ سے ان واقعات کا ذکر کرتے تو وہ آپ کو بتلایا کرتے تھے کہ "محمد معصومؒ تم اپنے وقت کے قطب ہو اور یہ واقعات اور مشاہدات اس بات کی شہادت کے طور پر رونما ہو رہے ہیں۔

✦✦

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے فرزند کا از حد احترام کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ احترام حضرت مجددؒ کے مریدوں کو ناگوار بھی محسوس ہوتا مگر زبان سے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ خواجہ معصومؒ حضرت مجددؒ کے بستر پر استراحت فرما رہے تھے۔ حضرت مجددؒ نے اُن کو بیدار کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ خواجہ معصوم خود بخود بیدار ہو جائیں۔ اس انتظار میں کئی گھنٹے گزر گئے۔ حضرت مجددؒ کے مریدوں کو بہت ہی بے چینی ہو رہی تھی اُنہوں نے کئی مرتبہ گزارش بھی کی کہ حضرت کیوں نہ خواجہ معصوم کو بیدار کر لیا جائے کیونکہ اب وہ کافی دیر آرام کر چکے ہیں مگر حضرت مجددؒ نے اُن کو منع فرمایا اور سکوت جاری رکھا۔ کئی گھنٹوں بعد از خود خواجہ معصوم کی آنکھ کھلی اور اُنہوں نے یوں اپنے والدِ گرامی کو اپنی بیداری کا منتظر پایا تو بہت ملول ہوئے اور عرض کی "کہ محترم پدر گاہی! آپ نے مجھ کو بیدار کر دیا ہوتا"۔ اس پر حضرت مجددؒ نے فرمایا۔

"تو خدا کا دوست ہے اور میں خدا کے دوست کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا اس طرح کر کے میں خدا کو ناراض نہیں کر سکتا۔"

✦✦

۱۰۳۴ ہجری میں حضرت مجدد الف ثانی کا وصال ہُوا اور یکم ربیع الاوّل ۱۰۳۴ ہجری کو خواجہ معصوم نے مسند قیومیت سنبھالی اور پچاس ہزار افراد نے خواجہ معصوم کی بیعت کی جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلفاء اور بزرگ بھی دو ہزار کی تعداد میں تھے۔

وصال سے قبل حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک رات عجیب و غریب منظر چشم مکاشفہ سے دیکھا کہ خواجہ معصوم اپنے حجرے میں ذکر و اذکار میں مشغول ہیں اور دوسرے لوگ بھی تہجد گزاری میں مصروف ہیں۔ یکایک سب چیزیں اور سب لوگ حضرت مجدد کی نظروں سے اوجھل ہونے لگے اور ایک نور کا پرتو سارے زماں و مکاں پر چھانے لگا۔ جس میں اس نور کے سوا آپ کو کوئی اور چیز نظر نہ آ رہی تھی۔ پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے آپ کا لباس اتارا جا رہا ہے۔ آپ کو دُکھ ہُوا کہ آپ کا یہ لباس نہ اُتارا جائے مگر فوراً ہی آپ کو کسی دوسرے لباس میں ملبوس کر دیا گیا جو پہلے لباس سے زیادہ عُمدہ تھا پھر بھی آپ کو پہلے لباس کی طلب و محبت رہی۔ آپ نے خدا سے عرض کی "اے ربِ ذوالجلال مجھ سے یہ میرا پہلا لباس نہ واپس لے"۔ آپ کو جواب ملا "تمہارے لیے دوسرا لباس تیار کیا گیا ہے اور ایک وقت میں کیونکہ دو لباس پہننا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ ایک لباس واپس لیا جا رہا ہے اور اس لباس کو اب آپ کے بیٹے محمد معصوم کے جسم پر ڈالا جائے گا کیونکہ یہ منصب فوقیت کا لباس ہے اور اس کا تعلق تربیت و تکمیل ہے۔ یوں حضرت مجدد کو اُن کے وصال سے باخبر کیا گیا۔ اس طرح مجدد بہت خوش ہوئے کہ اُن کے بعد بھی اُن کا مشن جاری رہے گا اور یہ لباس والا واقعہ اس بات کی دلیل تھا۔

حضرت خواجہ معصوم اپنے والدِ گرامی کے نقشِ قدم پر ہُو بہو چل رہے تھے اور تلقین و تبلیغ کے سلسلہ کو جاری و ساری رکھا ہُوا تھا کہ ایک دِن آپ کی والدہ ماجدہ کا وصال ہو گیا۔ آپ کو اس قدر رنج پہنچا کہ آپ کی آنکھیں شدتِ گریہ سے متورم ہو گئیں اور کئی روز آپ کسی سے ملاقات نہ کر سکے۔ مگر جب وقت نے دِل کے کاری زخم پر مرہم رکھ دیا اور گھاؤ مندمل ہونے لگا تو آپ نے دوبارہ اپنے مشن پر کام شروع کر دیا۔ آپ اپنی بزرگی اور خدا رسیدگی کی وجہ سے تمام برصغیر کے لوگوں کے قلوب پر منقش ہو چکے تھے۔ آپ نے دُنیا بھر کے ہر گوشے میں جا کر تبلیغ کی اور مضطرب دِلوں کو سکون و طمانیت سے مالا مال کیا۔

آپ کی خدمت میں دِن بھر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ امیر و فقیر۔ بادشاہ و گدا ہر ایک بندہ اور بندہ نوازی کے فرق سے بالاتر

ہو کر ایک ہی صف میں بیٹھا کرتا تھا۔ انہی ملاقاتوں میں ایک دن شہزادہ اورنگ زیب بھی آیا۔ آپ نے اورنگ زیب کو دیکھا تو فرمایا "یہ تو بہت کام کا آدمی نظر آتا ہے"۔ آپ نے شہزادے اورنگ زیب کو بتلایا کہ "تمہاری جبین میں وہ چمک ہے جو پہلے میں نے کسی میں نہیں دیکھی"۔ شہزادے اورنگ زیب نے آپ سے بہت سی باتیں کیں جن میں یہ بھی عرض کیا کہ "میں حکومت کا لالچ نہیں رکھتا مگر دین کا احیاء ضرور چاہتا ہوں۔"

خواجہ معصوم نے اورنگ زیب کے خیالات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا "جب تک اس ملک میں محی الدین اورنگ زیب موجود ہے دین کا احیاء قائم رہے گا اور یاد رکھو تم مشیت ایزدی کا انتظار کرو کیونکہ تمہارے کندھوں پر حکومت کا بار گراں عنقریب ڈالا جائے گا۔"

شہزادہ حیران ہوا اور عرض کی یا حضرت کیا آپ نے مجھے بادشاہی کی بشارت دی ہے۔"

خواجہ معصوم نے فرمایا "بالکل تم نہ صرف دنیاوی بادشاہ ہو گے بلکہ دین کی سرداری بھی تمہیں نصیب ہو گی بس تم چوکس رہ کر انتظار کرو کہ دین و دنیا کب اور کس وقت تمہارے دروازے پر دستک دیں گے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک زنانہ سواری بھی خواجہ معصوم کی خانقاہ میں پہنچی۔ اورنگ زیب خاتون کو آورہ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ اس کی بہن روشن آرا تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران ہوئے اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہاں کس طرح آنا ہوا۔

اورنگ زیب نے اپنی بہن کو بتلایا کہ یہ وہ آستانہ ہے جہاں سے مغل شہنشاہ اپنی استقامت حکومت اور سلطنت کے دوام کی ضمانت حاصل کرتے ہیں اور دراصل ہندوستان پر حکومت ہی اس آستانے کی ہے۔ باقی سب کچھ ثانوی ہے اور اس آستانے کے زیر اثر ہے۔"

روشن آرا نے بھائی اورنگ زیب سے پوچھا کہ تمہیں اس در سے کیا ملا۔"

شہزادے نے جواب دیا "دین اور دنیا کی نویدیں۔ خوشبوئیں۔ بشارتیں اور حضرت نے مجھے دین کی سرداری اور دنیا کی حکومت کی ایک ساتھ حصول یابی کی بشارت دی ہے اور میرے ہاتھوں سے دین کا احیاء ہو گا۔ دین اور دنیا کی سعادتیں مجھ کو حاصل ہو جائیں گی۔"

بہن نے بھائی سے کہا اب تم بہت کچھ حاصل کر چکے ہو اب مجھ کو بھی کچھ حاصل کر لینے دو۔"

شہزادے کے جانے کے بعد روشن آرا نے بھی خواجہ معصوم کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور روحانیت کے خزانے حاصل کیے۔

ایک دفعہ آپ کے ایک مرید نے آپ سے عرض کی کہ میں بہت زیادہ پریشان رہتا ہوں۔ مجھے غربت اور عسرت نے تنگ کیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ موت آ جائے۔

خواجہ معصوم نے فرمایا "صرف غربت و عسرت کی تنگی ہے یا کوئی اور مسئلہ بھی ہے۔"

مرید نے جواب دیا "نہیں صرف عسرت ہی نے پریشان کیا ہوا ہے۔"

آپ نے چشم مکاشفہ سے اس کے متعلق دیکھا اور فرمایا "کون سی دولت چاہتے ہو، دینی یا دنیاوی۔"

اس پر مرید نے عرض کی "دونوں دینی بھی اور دنیاوی بھی۔"

خواجہ معصوم دوبارہ مراقبہ میں چلے گئے اور دوبارہ مرید سے فرمانے لگے "عجب بات دونوں دولتیں ایک ساتھ کیسے۔ انسان دو گھوڑوں اور دو کشتیوں میں ایک ساتھ بھی سوار ہوا ہے۔ ایسے ہونا کس قدر محال ہے تم جانتے ہی ہو گے۔"

اس پر مرید نے عرض کی حضرت محال کیا ہے یا محال کیا نہیں۔ مجھے یہ بات معلوم ہے آپ کے لیے کوئی بات محال نہیں سب کی سب آسان ہیں۔ مجھ کو دین اور دُنیا کی دولت ایک ساتھ چاہئیں۔"

خواجہ محمد معصوم ایک مرتبہ پھر مراقبہ میں گئے اور اس کو فرمایا: "اے میرے عزیز تجھ کو مبارک ہو تمہیں دینی اور دُنیاوی دونوں دولتیں عطا ہوگئیں ہیں مگر ذرا احتیاط و انصاف سے کام لینا۔"

مُرید خوش ہو کر چلا گیا اور کچھ مدت کے بعد مریدوں بہت ہی اہل کرامت ہو گیا اور اس کا شمار بڑے بڑے اولیاء کرام میں ہونے لگا۔ آپکی کرامات کا چرچا چہار سُو ہو رہا تھا۔ ناکاموں اور مایوسیوں کو آپ کے در سے کامرانیاں نصیب ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ہر ایک نے اپنا دامن اُمید سے بھر لیا تھا۔ آپ کا در ہر ایک کے لیے کُھلا رہتا۔ آپ روحانیت کا ایک سمندر اور چشمہ صافی تھے۔ جس سے ہر شخص شکم سیر ہو کر اپنی دینی پیاس بُجھاتا تھا۔ آپ کو وہ بلند مرتبہ خدا نے عطا کیا جو صرف وہ اپنے مہربان بندوں کو عطا کرتا ہے۔

خواجہ معصوم کو حج کرنے کا بہت شوق تھا اس ارادے کی تکمیل کے لیے آپ اپنے ارادت مندوں اور مریدوں کو ساتھ لیکر حج کے لیے براستہ سورت مکّہ روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ پہنچنے تک آپ کو بہت سی مشکلات سے سابقہ پڑا مگر شوق و لگن ہر مُشکل پر غالب ہے۔ کعبہ شریف پہنچ کر آپ نے روح پرور اور جان افزا مناظر دیکھے نور کے ہالے چہار سُو چادر کی طرح تنے ہوئے تھے۔ آپ نے اللہ کے آگے گزارش کی اے اللہ میں عاجز و ناتواں انسان ہوں۔ ضعیف البیان ہوں مجھے اپنے نزدیک کرلے اپنا قرب و تجلّی عطا فرما دے۔ آپ نے اس طریق سے دُعائیں کی کہ آپ کو یوں محسوس ہونے لگا کہ آپ کے جسم کا ہر عضو خدا کی حمد اور حضورؐ پر درود و سلام بھیجنے میں مصروف ہے۔

آپ نے طوافِ کعبہ کے دوران انتہائی حسین و جمیل مرد و زن کو طواف کرتے دیکھا جن کے انداز و اطوار اور شکل و صورت اور قد و قامت عام مرد و عورت سے مختلف تھے۔ آپ اس منظر سے بہت حیران ہوئے۔ آپ کو القا کے ذریعہ اللہ نے بتلایا کہ یہ میرے فرشتے اور حوریں ہیں جو دوسرے مومنین کی طرح کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔

مکہ مکرمہ میں حاضری اور حج کی ادائیگی کے بعد آپ نے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا۔ آپ کو اس راہ میں اس جگہ کے چپّے چپّے سے عقیدت و محبت تھی جہاں پر حضورؐ نے اپنا وقت گزارہ تھا۔ راستہ میں جتنے قبرستان آتے آپ اُن پر فاتحہ خوانی کرتے جاتے کہ شاید یہ صحابہ کرام کے مرقد نہ ہوں۔ آپ جب مدینہ پہنچے تو روضۃ الرسول پر اتنا روئے کہ آپکی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کچھ دیر کے بعد آپ خود بخود مسکرانے لگ گئے۔ آپ کے ساتھیوں نے مسکرانے کی وجہ پوچھی تو خواجہ معصوم نے فرمایا کہ حضورؐ نے مجھے اتنا لطف فرمایا کہ مجھے اپنے ساتھ بغلگیر کر لیا۔ جس سے میں اس قدر مسرور ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جنت البقیع کے قبرستان میں خواجہ معصوم کی حضرت عثمانؓ اور حضرت عائشہؓ سے بالمشافہ مُلاقات کروائی گئی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے کرم اور انعامات تھے جو وہ اپنے معصوم بندے پر وافر مقدار میں کر رہا تھا۔

مدینے سے خواجہ معصوم واپس مکہ معظمہ آئے۔ راستے میں آپ کو وجع المفاصل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ تکلیف کی شدت سے آپ کراہ رہے تھے پھر بغیر کسی دوا کے استعمال کے آپ نے کراہنا بند کر دیا اور پُرسکون نیند سو گئے۔ جب بیدار ہوئے تو لوگوں اور ساتھیوں نے دریافت کیا کہ حضرت بغیر دوا کے آپ کو کس طرح اس مُوذی بیماری سے نجات مل گئی۔

خواجہ معصوم نے لوگوں کو بتلایا کہ مجھے عالم رویا میں حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ ملی تھیں انہوں نے فرمایا کہ "اللہ تمہیں اس تکلیف سے فوراً نجات دے گا۔" چنانچہ میری تکلیف اسی دم رفع ہو گئی۔ آپ ۱۰۶۹ھ میں واپس ہندوستان پہنچے۔"

✦✦

ہندوستان پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں عنقریب کا مقابلہ ہوا اور اورنگ زیب کو کامیابی ہوئی۔ اورنگ زیب آپکی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے حج سے واپس آنے کے اعزاز میں

نے عید جیسے جشن منانے کا حکم دیا۔
وطن واپس پہنچ کر خواجہ معصومؒ نے دوبارہ رشد وہدایت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپکی کرامات میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔
کے مُرید بھی دن بدن بڑھ رہے تھے اور آپکی ریاضت کا شہرہ پورے ہندوستان میں پھیل چکا تھا۔
ایک روز خواجہ معصوم نے اپنے ایک مُرید کو حکم دیا کہ میرے فلاں خادم کو جلدی سے میرے پاس بلاؤ۔ خادم کو حسب حکم بلایا
خادم حاضر ہُوا۔ خواجہ معصوم نے اس خادم سے دریافت کیا کہ "تم کیوں پریشان ہو؟" خادم نے جواب دیا۔ "کہ حضرت میں تو آپ
عاؤں کا طالب ہوں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" پھر وہ خادم آپ کے پاس بیٹھ گیا آپ نے اس کو ساٹھ آم دیئے اور چھ
یاں دیں اور فرمایا کہ "میں تم سے غافل نہیں ہوں مجھ کو چشم مکاشفہ سے معلوم ہوا کہ آج تیرے گھر مہمان آنے والے ہیں اور تُو تہی
ت ہے۔ لہٰذا میں نے تمہیں اپنے پاس بُلا بھیجا اب تُو ان آموں سے اُن مہمانوں کی تواضع کر اور ان اشرفیوں سے گھر کا اسباب
رلے۔"

مُرید پر رقت طاری ہو گئی اور وہ رونے لگ گیا "کہ حضرت آپ نے میرا اتنا خیال رکھا جتنا کوئی باپ ہی رکھ سکتا ہے۔"
اس پر خواجہ معصوم نے فرمایا کہ "مُرید مرشد کا بیٹا ہی ہوتا ہے۔"
خواجہ معصوم کے ایک مُرید کو آشوبِ چشم کا مرض لاحق ہو گیا وہ بہت ہی تکلیف زدہ تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کو کہا کہ "تم علاج
تے ہو۔"

مُرید نے عرض کیا خواجہ جی! آپ ہی فرمایئے کہ "میں کس طبیب سے علاج کراؤں؟"
خواجہ معصوم نے اُس کو ایک طبیب کے متعلق بتلایا کہ "تم اس سے علاج کرواؤ انشاء اللہ تمہیں شفا ہو جائے گی۔" مُرید یک بینی دوگوش
کھڑا ہوا اور طبیب کے پاس پہنچا۔ اس طبیب نے اس کو تشفی دی کہ میرے علاج کرنے پر تم شفایاب ہو جاؤ گے۔" مُرید دوا
خواجہ معصوم سے عرض گزار ہوا کہ اس دوا سے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔
خواجہ معصوم نے پوچھا کہ کیا دوا تم کو خدا نے دی ہے؟"
مُرید بولا "نہیں۔ طبیب نے دوا دی ہے خدا کس طرح دوا دے سکتا ہے۔"
خواجہ معصوم فرمانے لگے۔ "دوا کی تعریف تو تم اس طرح کر رہے ہو جیسے یہ خدا نے تمہیں دی ہو۔"
مُرید کو خواجہ صاحب کی یہ بات ناگوار گزری کہنے لگا۔ "آپ نے خود ہی مجھے اس طبیب کے پاس بھیجا تھا اور خود اُس کی دوا
الفت کر رہے ہیں۔"

خواجہ معصوم نے مُرید سے فرمایا "تم اس دوا کو استعمال کرو تمہیں از خود میری بات کا مطلب سمجھ آ جائے گا۔"
مُرید نے دوا استعمال کی تو اسکو یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں میں مرچیں ڈال دی ہوں وہ تلملا اُٹھا اور کچھ ہی دیر بعد
کی بینائی بالکل زائل ہو گئی اور وہ ٹٹول کر چلنے لگا۔
خواجہ معصوم نے دریافت کیا سناؤ دوا نے کچھ اثر دکھایا۔
مُرید بولا۔ حضرت! میں تو نابینا ہو گیا ہوں اور آپ سے رحم کا طالب ہوں۔ اور آپ کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ دوا
چھے اور بُرے اثرات کی تاثیر خدا نے ڈالی۔ جب خدا کو صحت دینی منظور ہو تو وہ دوا میں اچھے اثرات کی تاثیر ڈال دیتا ہے اور اگر
کی نزدور کرنا مقصود ہو تو خدا دوا سے اچھی تاثیر معدوم کر دیتا ہے۔
مُرید نے بہت گریہ زاری کی اس پر خواجہ معصوم نے خدا سے اُس کی بینائی کی واپسی کی دُعا کی اللہ نے آپ کے لعاب دہن میں
بینائی کی تاثیر پیدا کر دی۔ آپ نے اپنا لعاب دہن اُس کی آنکھوں میں ڈالا اور یوں اُس کی بینائی واپس آ گئی اور وہ شخص خدا
اس گزار ہوا۔

لاہور کا گورنر نواب مکرم خان خواجہ معصوم کا مُرید تھا۔ اُسکو خواجہ صاحب سے اتنی محبّت تھی اور وہ آپ کی قربت کا اسقدر شائق و شیدائی تھا کہ اُس نے آپ کے تقرب کے لیے ملازمت چھوڑ دی۔

ایک روز نواب مکرم کی مُلاقات اورنگ زیب بادشاہ سے ہوئی۔ بادشاہ نے مکرم سے مُلازمت ترک کرنے کی وجہ پوچھی۔ نواب نے بتلایا کہ مُلازمت کی وجہ سے پیر و مرشد کے تقرب سے محرومی ہوتی تھی۔ لہذا مَیں نے مُلازمت پر پیر و مرشد کی قربت کو ترجیح دی۔

"اورنگ زیب نے نواب مکرم سے اُنکی عمر دریافت کی"

جواباً نواب نے کہا۔ "میری عمر صرف چار سال ہے" جبکہ نواب سال خوردہ شخص تھے۔ اس جواب نے اورنگ زیب کو حیران کیا نواب مکرم نے کہا بادشاہ سلامت! مَیں چار سال سے خواجہ معصوم کی صحبت میں ہوں لہذا پچھلی عمر جو کسی صاحبِ ارشاد انسان کے بغیر گزری بے معنی اور بے وقعت تھی لہذا اسکا شمار کرنا ہی فضول ہے۔ کار آمد ——— زندگی چار سال سے گزار رہا ہوں لہذا انہی چار سالوں کو شمار کروں گا۔"

خواجہ معصوم نے ایک ہندو جوگی کے متعلق سُنا کہ وہ آگ کو غیر مُضر کر دیتا ہے اور لوگ آگ میں گھُس بھی جائیں تو ان کو ضرر نہیں پہنچتا۔ اس شعبدے سے بہت سے لوگ جوگی کے معتقد ہو چکے تھے۔ آپ اپنے جملہ مُریدوں کو ساتھ لے کر اُس جوگی کے پاس پہنچے اور اُس کو کہا کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے سے باز آجائے۔"

جوگی نے جواب دیا کہ "اگر مَیں گمراہ کر رہا ہوں تو آپ یا آپکے مُریدوں میں کوئی ایسا شخص ہے جو آگ کے ضرر رساں اثرات کو زائل کر کے دکھا دے۔"

آپ نے فرمایا "کہ آگ کی شدّت و حدت کو زائل کرنے کا کیا فائدہ۔ ویسے یہ تو چٹکی بجانے کا کھیل ہے۔"

جوگی نے کہا۔ "اگر آپ کو اتنا ہی اپنے آپ پر مان ہے تو میرے مطالبہ کو پورا کر کے دکھائیں۔"

خواجہ معصوم نے ایک الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا۔ جب الاؤ روشن کر دیا گیا تو آپ نے اپنے مُریدوں کو کہا کہ تم قرآن کو ہاتھ میں پکڑ کر اس آسمان سے باتیں کرتے ہوئے آگ کے الاؤ میں داخل ہو جاؤ اور جب تک مَیں تمہیں حُکم نہ دوں اس آگ کے الاؤ میں بیٹھ کر تلاوت کرتے رہو۔

جوگی کے پرستار اور خواجہ معصوم کے مُریدوں کے ٹھٹھ بندھے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے مُرید پر آیت کریمہ کا دم کر دیا۔ وہ حسب حکم قرآن مجید لے کر آگ میں داخل ہو گیا اور وہاں بیٹھ کر تلاوت کرنا شروع کر دی۔

دیکھنے والوں کی سانسیں رُک گئیں۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مُرید نے کتنی ہی دیر آگ میں دو زانو بیٹھ کر تلاوت کی مگر آپ نے اُس پر کوئی مُضر اثر نہ کیا۔ جوگی کے اوسان خطا ہو گئے اور دوڑتا ہُوا خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ "آپ واقعی بہت بلند پایا بزرگ ہیں۔ آپ نے آگ پر قابو پا لیا۔"

خواجہ معصوم نے جواب دیا۔ "آگ پر مَیں نے قابو پایا ہے نہ مَیں نے آگ کو بے بس کیا ہے۔ یہ تو خُدا کے کلام کا اثر ہے جس نے یہ معجزہ رونما کیا اور تمہارے دعویٰ کو ناکام بنایا۔" جوگی اتنا متاثر ہُوا کہ اُسی وقت مسلمان ہو گیا۔

آپ کو ایک مرتبہ پھر وجع المفاصل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اعلیٰ طبیبوں سے علاج کروایا مگر بے سود۔ آپ فرماتے تھے کہ علاج کروانا تو سُنت نبویؐ ہے جسکی مَیں پیروی کر رہا ہوں ویسے اسکی ضرورت نہیں ہے۔ ۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ کو آپ سورۃ یٰسین شریف کی تلاوت فرما رہے تھے اور ایک دم آپ نے یا نبی سلام علیک کہا اور آپ کی رُوح پرواز کر گئی۔ آپ کا مزار جارہا تھا کہ ابر باراں ہلکی ہلکی پھوار کی شکل میں برسنے لگا۔ آپ کا جنازہ آپ کے فرزند شیخ نے پڑھایا اور عالیشان مقبرہ اورنگ زیب کی بہن روشن آرا نے تعمیر کروایا جو آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ایوانِ سلطنت اُداسیوں کے دبیز اور مایوسیوں کے گھمبیر بادلوں میں ڈُوبا ہوا تھا۔ گلی کوچے سوگوار بیوہ کے خیالوں کی طرح پریشان تھے۔ ابرائے وقت کے عشرت کدوں پر ہُو کا عالم تھا۔ آگرہ کے رہنے والوں کے چہروں پر اُبھرنے والی افسردگی صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ فرمانروائے ہند شاہ جہاں تصویرِ غم بنا بدحواسی کے عالم میں اپنے زندگی سے مایوس بیٹے دارالشکوہ کے لیے خالقِ دوجہاں کے سامنے جھولی پھیلائے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مغموم چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا ہر لفظ رقت آمیزی کی مُنہ بولتی تصویر، عالمِ کرب میں زبان سے ادا ہونے والے جملے لرزش کا مرقع۔ ایسا ہوتا بھی کیوں نہ۔ مُلک کے گوشے گوشے سے آنے والے نامور اور حاذق اطبا نے اپنی بے بسی اور عاجزی کا اعلان کر دیا تھا۔ شاید کتابِ حکمت میں کوئی ایسا نسخہ موجود نہ تھا جس کے استعمال سے ایک دُکھیارے باپ کے دل کو سکون مل سکتا۔

شہنشاہِ ہند اذیت ناک درد و کرب سے تڑپ رہا تھا کیونکہ چارہ گروں کے چہروں پر اُمید کی کوئی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شہزادے کی ظاہری حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ تھا کہ مریض اس دارِ فانی میں چند لمحوں کا مہمان ہے۔ ایسے حوصلہ شکن اور مایوس کُن حالات سے گھبرا کر شاہجہان طبیبِ حقیقی سے اپنے بیٹے کی زندگی مانگنے خلوت کدے میں چلا گیا۔

ناگاہ ایک شکستہ حال، پراگندہ بال، لڑکھڑاتی چال والا بوڑھا شخص محل کے سامنے چیختے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے بادشاہ کے پاس جانے دو میرے پاس شہزادے کا علاج موجود ہے۔" اس کے برعکس پہریدار اُسے پاگل اور دیوانہ سمجھ کر نظرانداز کر دیتے۔ شاہی ملازمین کے بار بار دھکے کھانے کے باوجود وہ وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر ایک مصاحب کا ادھر سے گزر ہوا پہریداروں سے پُورا واقعہ سُن کر بادشاہ کی خلوت گاہ کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا اور اجازت ملنے پر حاضرِ خدمت ہو کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔

"اُسے فوراً اندر بُلاؤ۔" شاہ جہاں نے قدرے چیختے ہوئے کہا۔ اگر اس نے محض بیش بہا انعامات کے لالچ میں یہ ڈھونگ رچایا ہے اور دارا کا علاج نہ کر سکا تو پاگل پن سے چھُوٹ جائے گا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "جو دانائے روزگار اپنی سی تدابیر کر چکے ہیں۔ ان کا کیا نتیجہ نکلا صحت تو اُن کو دواؤں سے بھی نہیں ملی پھر ایک مجذوب کو آزما لینے میں کیا حرج ہے۔" شاہ جہاں کے لہجے سے حسرت اور بے قراری جھلک رہی تھی۔

جیسے ہی ان الفاظ نے شاہ جہاں کے ہونٹوں سے آزادی حاصل کی مصاحبینِ خاص محل کے گیٹ کی طرف بے تابی سے دوڑے۔ دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بوڑھا شخص ابھی تک تیز مگر رعب دار آواز میں چیخ رہا ہے۔ اس کے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے "مجھے اندر جانے دو، پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر کچھ وقت اور گزر گیا تو خاندانِ مغلیہ کا یہ چراغِ سحری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے گا۔

پھر حسرت و تاسف کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہو گا اور باشندگانِ ہند پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ مصاحبین نے دیکھا کہ پہریدار بدستور اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور بوڑھے شخص کو دھکے دے کر محظوظ ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ایک مصاحب نے غضب ناک ہو کر پہریداروں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

شرم کرو! بادشاہِ ہند پر مصیبتوں اور دُکھوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے ہیں اور اس کا جواں سال بیٹا موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ نہ جانے کب رُوح نفسِ عنصری سے پرواز کر کے بوڑھے نیک دل باپ کو داغِ مفارقت دے جائے اور تم ہو کر ادھر چہل بازیوں میں لگے ہوئے ہو۔"

پہریداروں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد بوڑھے شخص کو اپنے ہمراہ لے کر اندر داخل ہو گئے۔ جاتے ہی بوڑھے نے ادب سے سلام کیا۔ اگرچہ شاہ جہاں شدید ذہنی انتشار کا شکار تھا پھر بھی اجنبی بوڑھے کے سلام کا جواب دینا نہ بھولا۔

"تم میرے پیارے بیٹے کے علاج کے لیے آئے ہو کیا تمہیں اُمید ہے کہ میرا بیٹا صحت یاب ہو جائے گا؟"

شاہ جہاں نے بڑے حسرت زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

شہنشاہِ معظم! میں معالج یا طبیب نہیں ہوں۔ بوڑھے نے باوقار مگر نہایت ادب سے جواب دیا۔

"پھر یہاں کیا لینے آئے ہو۔ دو گھنٹے سے یہ ہنگامہ آرائی کیوں شروع کر رکھی ہے۔ شاید تمہیں اندازہ نہ ہو کہ ایک بوڑھے دُکھیارے باپ کے دل پر کیا بیت رہی ہے؟"

شاہ جہاں نے غضب ناک ہوتے ہوئے کہا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اُسے بوڑھے کی اوٹ پٹانگ باتیں ناگوار گزری ہیں۔

جنابِ عالی! مجھے بات پوری تو کر لینے دیں بندہ آپ کو صرف یہ اطلاع دینے آیا ہے کہ گزشتہ رات میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ بوڑھے نے یہ الفاظ ادا کرتے وقت شہنشاہ کے غضب ناک لہجے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

بوڑھے کا خواب کے بارے میں ذکر کرنے کا انداز اس قدر دل پذیر اور اثر انگیز تھا کہ بادشاہ کا تمام غصّہ کافور ہو گیا۔ پھر دھیمے اور شیریں الفاظ میں اسے اپنا خواب بیان کرنے کو کہا اور خود ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی نامعلوم گلزار پُر بہار میں چہل قدمی کر رہا ہوں۔ چاروں طرف سے قدرت کے گویّوں کی میٹھی اور دل موہ لینے والی بولیاں سنائی دے رہی ہیں۔ سرمدی نغمے الاپنے چشمے رواں دواں ہیں۔ اچانک باغ کے مغربی کونے سے ایک روشن چہرے والے بزرگ نمودار ہوتے ہیں اور مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔

اپنے بادشاہ سے کہو کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو کر جی ہلکان کر رہا ہے۔ بلاتاخیر شہزادے کو لے کر لاہور چلے آؤ۔" اتنا کہہ کر بوڑھا خاموش ہو گیا اور اجازت طلب نگاہوں سے بادشاہ کی طرف دیکھنے لگا۔

بادشاہ چند لمحوں تک اُمید و بیم کے سمندر میں ابھرتا ڈوبتا غوطے پہ غوطے کھاتا رہا۔ پھر آہستہ سے آگے کو سرک کر بوڑھے سے پوچھا "لاہور میں رہنے والے ان بزرگوں کا اسمِ گرامی کیا ہے؟"

بزرگ نے اپنا نام نہیں بتایا صرف جلد آنے کی تاکید کی تھی۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ آپ فوراً لاہور روانہ ہو جائیں۔ یہ کہا اور ادب سے واپس جانے کی اجازت طلب کی جس کے جواب میں بادشاہ نے سر کے اشارے سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا اور بوڑھا شہزادے کی صحت یابی کی دُعا کرتا ہوا انجانی راہوں پہ چلتے چلتے دُور اُفق میں غائب ہو گیا۔

بُوڑھے کے رخصت ہونے کے بعد مغل شہنشاہ کا دماغ کافی دیر تک مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ اس کے باوجود اس کا ذہن لاہور
ں قیام پذیر مسیحا کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔

اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ شاہ جہاں کو بزرگانِ دین سے عقیدت ورثے میں ملی تھی۔
علاوہ ازیں وہ اکثر اولیاء کرام کی بارگاہ میں حاضری دیتا رہتا تھا۔ آخر کافی غور و خوض کے بعد شاہ جہاں کا ذہن حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا
گنج بخش) تک جا پہنچا جو نہ صرف اولیاء پنجاب کے پیرِ کامل بلکہ دُنیا بھر کے کاملوں کے رہنما اور امام تھے۔ جیسے ہی طائرِ ذہن نے یہاں تک
پرواز کی اسی وقت دارا شکوہ کو لاہور داتا گنج بخشؒ کے مزارِ اقدس پر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

پھر بھی فرمانروائے ہند نے دیگر علماء کرام سے مشورہ لینا ضروری سمجھا جن کے تشریف لانے پر بادشاہ نے بُوڑھے شخص کی غیر متوقع آمد
سناتے ہوتے خواب کے بارے میں تفصیلاً گفتگو کی بیشتر علماء عظام نے آپ کی رائے صحیحہ سے اتفاق کرتے ہوتے تائید کی کہ خواب
میں بلانے والے بزرگ داتاؒ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا لہٰذا بلا تاخیر داتاؒ کے دربار پر حاضری دینی چاہیے۔ مگر آگرے کے ایک
گوشہ نشین عالم نے ان تمام کی رائے رد کرتے ہوتے لاہور میں ایک باحیات صاحبِ کرامات عظیم المرتبت درویشِ کامل کی نشاندہی کی جن
کا مرکزِ پُر انوار مرجعِ خلائق بنا ہوا تھا۔

جیسے ہی اس عالم بے بدل نے لاہور میں سکونت پذیر مسیحا کا نام مبارک لیا شاہ جہاں کے اُجڑے اُجڑے اور مغموم چہرے پر رونق
آ گئی مگر اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں سب سے بڑی رُکاوٹ شہزادے کی غیر معمولی جسمانی کمزوری اور طویل دُشوار گزار مسافت تھی۔
بلکہ شہزادے کے جسم کو ذرا سی جنبش سے خوفناک صورتِ حال سے دوچار ہونے کا خطرہ لاحق ہونے کا امکان غالب تھا یا بالفاظِ دیگر
صرصر کے ایک ہی بے رحم تھپیڑے سے زندگی کا چراغ گل ہو جاتا۔ درباری مشیروں نے بُوڑھے کے خواب کو ذہنی خلل قرار دیا بلکہ تیز و تند
میں بادشاہ کو اس پُر کٹھن سفر سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی گئی۔

ماحول پہلے ہی کافی سوگوار تھا۔ اس بحث و تمحیص نے فضا کو مزید مکدر کر دیا۔ آخر اس وحشت انگیز سکوت کو اسی عالم نے یہ کہہ کر توڑ دیا
بے شک آگرے اور لاہور کا خدا ایک ہی ہے مگر تقدیرِ الٰہی کا لاینحل مسئلہ انسانی عقلوں سے ماوریٰ ہے۔ اس کی مشکل کشائی اور حاجت روائی
راز انسانی ذہن کی رسائی سے باہر ہے۔

اتنا کہہ کر وہی عالم بادشاہ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ اس کا انحصار حسنِ عقیدت اور پختہ ارادوں پر ہے اگر آپ کی نظروں میں ان بزرگ
قدر و منزلت ہے تو پھر اس پہلو پر غور کرنا ترک کر دیجیے کہ دورانِ سفر کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بلانے والا راستے کی
دشواریوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کہ شافی الامراض ہے ضرور اس کی دُعاؤں سے شہزادے کو صحت یاب کرے گا۔

اس عالم نے گفتگو اس قدر رقت آمیز اور دل گداز لہجے میں کی جسے سُن کر شاہ جہان عالم وارفتگی میں اُچھل پڑا اور آگے بڑھ کر بے ساختہ
اس کا روشن ماتھا چوم لیا۔ دیکھنے والے شاہ جہان کے اُداس چہرے پر اطمینان کی دوڑتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایسے محسوس
ہوتا تھا گویا اس کی روح کے ویرانوں کو حسین نقش و نگار سے سجا دیا گیا ہو۔ ایک مضطرب اور بے قرار باپ کو قرار نصیب ہو گیا تھا۔
فوری طور پر برق رفتار شہسواروں کا ایک ہراول دستہ لاہور روانہ کر دیا تاکہ بادشاہ کے پہنچنے سے قبل مسیحا کا کھوج لگا یا جائے۔ اس کے
بعد شاہ جہان اپنے لختِ جگر دارا شکوہ کو لے کر سوئے دربارِ مسیحا چل پڑا۔
سفر کی پے در پے صعوبتوں اور مسلسل جھٹکوں نے شہزادے کو ادھ موا کر کے رکھ دیا۔ شاہ جہاں کے خیالات متزلزل ہونے لگے مگر اس
ماحول کے سامنے آ کر اس عالم نے سہارا دیا چنانچہ قافلہ منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ آخر کئی دن اور کئی راتیں چلنے کے بعد حاجت مندوں
کا کاروان حدودِ لاہور میں داخل ہوا۔ فاصلے مٹ گئے۔ اُمید بر آتی دکھائی دی۔ شاہ جہاں نے مسیحا کی بارگاہ میں داخل ہونے کی اجازت
مانگی۔ ایک خادم نے باہر آ کر ادب سے کہا "ہمارے شیخ فرمانروائے ہند کے منتظر ہیں"۔
شاہ جہاں یہ الفاظ نوید سُن کر دیوانہ وار اندر داخل ہوا۔ مسیحا کو ایسی چٹائی پر تشریف فرما پایا۔ جو مغل حکمران کے تختِ طاؤس سے ہزار گنا

زیادہ قیمتی تھی۔

"شاہ جہاں شہزادہ کہاں ہے اسے ساتھ کیوں نہیں لاتے؟" مسیحا نے میٹھے اور تسکین بخش لہجے میں فرمایا۔

"لایا ہوں حضرت! مگر وہ آنجناب کی اجازت کا منتظر ہے" شاہ جہاں نے اپنے لہجے پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی پھر بھی مسیحا کے جلال سے آواز لرز گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو اجازت کے بارے میں، اجازت تو پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ اگر اجازت نہ دی ہوتی تو پھر تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوتی اور ہم نے تو اسے اپنا آدمی بھیج کر بلایا ہے" مسیحا نے دلنشیں لہجے میں کہا۔

چند لمحوں بعد شہزادے کو اندر لایا گیا۔

"شہزادے کو ہمارے سامنے بٹھا دو" مسیحا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"شیخ یہ نقاہت کی وجہ سے بیٹھنے سے مجبور ہے" شاہ جہاں نے سہمے سہمے لہجے میں عرض کی۔

"بھئی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہم شہزادے کو روبرو دیکھنا چاہتے ہیں" مسیحا کے ایک ایک لفظ سے شہد ٹپک رہا تھا۔ جیسے ہی مسیحا نے شہزادے کی طرف نظر کرم اٹھائی ان کے جلال سے اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اتنی عاجزی اور انکساری دیکھ کر مسیحا کے تابناک چہرے پر ایک دلنواز تبسم کھلنے لگا۔ پھر دست چارہ گر آگے بڑھا اور حیات آفریں پانی سے لبریز پیالہ شہزادے کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

بڑی مشکل سے پانی کے چند قطرے حلق سے نیچے اترنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی شہزادے کے چہرے پر ایک رنگ ابھر آیا جیسے طویل سیاہ رات کے صحن میں طلوع سحر کے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دے۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ تین دن بعد شہزادہ خود اٹھ کر بستر پر ایسے بیٹھ گیا گویا بیماری کبھی نزدیک سے ہو کر نہ گزری ہو۔

شہزادے کی مکمل صحت یابی کے بعد فرمانروائے ہند نے شہزادے کا جشن صحت دھوم دھام سے منانا چاہا لیکن مسیحا نے سختی سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔

انسان کس قدر عجلت پسند ہے، جب کوئی مصیبت یا آفت نازل ہوتی ہے تو گھبرا کر چیخنے لگتا ہے اور جب پریشانی کے دن گزر جاتے دکھوں اور مصائب سے نجات مل جاتی ہے تو وہ ان سنگین لمحات اور پرآشوب آفات کی ہولناکیوں کو فراموش کر کے خوشی سے رقص کرنے لگتا ہے یہ کیسی کفران نعمت ہے یہ کیسی ناشکری ہے اور کیسی غفلت۔

وہ ولی کامل جس کے پیالے کے چند قطرۂ آب حلق سے نیچے اترتے ہی شہزادہ دارا شکوہ موت سے نبرد آزما رہنے کے بعد دوبارہ اس رنگ و بو کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہوا۔ یہ چارہ ساز، غمگسار اور چارہ گر مسیحا قادری سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ میر لاہوری تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت اکبر کے دور حکومت کے آخری سالوں میں سیوستان میں ہوئی۔ کسی زمانے میں یہ شہر ٹھٹھہ اور بھکر کے درمیان واقع تھا مگر آج کل یہ شہر سیہون شریف کے نام سے مشہور ہے۔ آپ خاندانی اعتبار اور حسب و نسب کے لحاظ سے حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتے۔ آپ کے والد گرامی قاضی سائیں دتہ فاروقی کا پورے سندھ میں بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ آپ کے والد صاحب کے وصال کے بعد آپ کی والدہ نے بڑی استقامت کے ساتھ آپ کی پرورش میں گردش زمانہ کا مقابلہ کیا اور آپ کو مادر گرامی ہی نے سلسلہ قادریہ کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ عہد طفولیت اور لڑکپن کی حسین و پاکیزہ ماحول والی بہاروں سے متمتع ہونے کے بعد جوانی کی دہلیز پر قدم مبارک رکھا تو فطری رجحان نے کسی پیر کامل کی تلاش میں سیوستان کی پہاڑیوں میں سرگرداں رہنے لگے۔ دوران صحرا نوردی آپ کو انہی پہاڑیوں میں ایک گرم تنور نظر آیا جسے بڑے پتھر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ویرانے میں تنور کی موجودگی کسی فنا فی الہا نہ بزرگ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ چنانچہ سراغ لگانے اور ان سے ملنے کی خاطر آپ مسلسل تین دن رونہ وہیں تشریف فرما رہے۔ آخر چوتھے دن اس سنسان مقام پر قطب زماں مشہور بزرگ حضرت شیخ خضر

اور آتے ہی فرمایا برخوردار ہمیں تمہاری آمد کے بارے میں علم تھا۔ اگر تم کشمکشِ انتظار سے اکتا کر چلے جاتے تو پھر یہ ملاقات قیامت تک نہ ہوتی

اہلِ طلب کو اتنی سی مشقت اور تکلیف تو برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔

یہ سن کر آپؒ نے بڑے ادب و احترام سے جواب دیا حضرت میں آپ کی تلاش میں اس وقت تک یہاں پڑا رہتا جب تک اس تنِ خاکی

میں جستجو کی تڑپ باقی رہتی۔ آپ کی زبان مبارک سے ایسا دلنشیں جواب سن کر حضرت شیخ نے وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھ کر آپ کو گلے لگا لیا اور

آپ کی درخواست پر بیعت سے سرفراز فرمایا۔

آپ کئی سال تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں علم و معرفت کے رموز و نکات کی روحانی تربیت پانے کے بعد خطۂ پنجاب کے لوگوں کی اصلاح

کے لیے وقت کے مشہور تاریخی شہر لاہور تشریف لے آئے۔ یہاں آپ نے فروغِ اسلام اور اصلاحِ معاشرہ کا سلسلہ بڑی جانفشانی سے بذریعہ

درس و تدریس شروع کیا۔ آپ کا پہلا سبق یہی ہوتا تھا کہ انسان طلبِ نمائش اور طلبِ جاہ سے دور بھاگے۔

آپ فرمایا کرتے تھے "میں حیران ہوں شیخ بہاالدین زکریا ملتانی کیسے فقیر تھے بہتر ہوتا کہ وہ ایک بار پھر دنیا میں آتے اور مجھ سے درس

فقیری لیتے۔ نیز انہیں معلوم ہو جاتا کہ درویشی اور فقیری میں کیا فرق ہے؟"

آپ کے خیال میں جو لوگ دنیا تے ولایت میں قدم رکھنے کے بعد بھی خرقہ یا گوڈڑی پہنتے ہیں وہ صرف خود نمائی کرتے ہیں"۔ اسی وجہ

آپ کے مریدِ خاص حاجی بینائی بہت پُرتکلف لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔ آپ کے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر کسی نے اعتراض کیا جس کے جو

میں انہوں نے فرمایا کہ عالمِ تجرید میں میرے پاس صرف ایک گوڈڑی تھی جو پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں ایک دن میں بازار میں سے گز

رہا تھا جیسے ہی لوگوں کی نظر مجھ پر پڑی انہوں نے مجھے گھیرے میں لے کر میرے ہاتھ چومنے شروع کر دیئے۔ اتنی دیر میں حضرت میاں میرؒ کا

سے گزر ہوا یہ دیکھتے ہی فرمانے لگے "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے فوراً جا کر لباس تبدیل کرو اور آگے سے ایسا لباس پہنا کرو کہ کوئی یہ نہ جان

تم کس گروہ کے فرد ہو"

عین اس جیسا ملتا جلتا ایک واقعہ آپ کے خلیفہ خواجہ بہاریؒ نے آ کر آپ کی خدمت میں بیان فرمایا۔ حضرت آج میرے مکان میں

لوگ جمع تھے اچانک مکان کی کڑیاں چرچرانے لگیں۔ میں نے حاضرین کو فوراً باہر نکل جانے کو کہا لیکن میں خود وہیں بیٹھا باآوازِ بلند کلمہ طیبہ کا ور

رہا۔ میرے اندازے کے عین مطابق چھت گر گئی مگر میں اپنی جگہ محفوظ و مامون رہا۔

آپ نے خواجہؒ کا بیان کردہ واقعہ غور سے سنا پھر نہایت تلخ لہجے میں فرمایا افسوس تیرے دل سے اب تک شوقِ نمائش اور طلبِ جاہ

گیا تو کلمہ طیبہ اس لیے بلند آواز میں پڑھ رہا تھا کہ لوگ تجھے بہت بڑا خدا رسیدہ درویش سمجھیں۔

آپ نے ساری زندگی سورت فاتحہ کی اس آیت پر عمل کرتے ہوئے گزار دی "اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے

چاہتے ہیں۔

حضرت میاں میرؒ کی زندگی میں بڑے بڑے مشکل مقامات آتے مگر آپ نے ماسوائے اللہ کے کسی کو راز نہیں دی۔ یقین و عمل کی اس کیفیت

نے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں با مروت شہنشاہ بھی اگر آپ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دینا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ بظاہر آپ نے

ذات و صفات پر گہرا پردہ ڈال رکھا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ آفتاب دبیز بادلوں میں روپوش ہونے کے باوجود بھی اپنی موجودگی کا احساس

رہتا ہے۔ آپ کرامات کے اظہار کو ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن پھر بھی غیر ارادی طور پر کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہو ہی جاتا بلاشبہ اللہ

آپ کو اعجازِ مسیحائی بخشا تھا۔

ایسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں واقعات ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی رونما ہوئے جن کے چشم دید گواہ خود اپنی اپنی زبان میں فرمایا

تھے۔ سکینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ تحریر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک روز میں اپنے دوست کے ہمراہ آگرہ سے لاہور آیا۔ ہم چلتے چلتے خان

قریب پہنچے تو میرے دوست نے کہا تم اپنے پیر و مرشد کی کرامات کی تعریفوں کے پل تو بہت باندھتے ہو اور بعض اوقات تو تعریف

آسمان کے قلابے تک ملا دیتے ہو۔ میں تو اس وقت ان کی روشن ضمیری کو تسلیم کروں گا جب وہ ہماری خاطر مدارات کے لیے اس موسم میں

پیش کریں گے کیونکہ آج کل انگوروں کا موسم نہیں ہے۔ یہ سُن کر پہلے تو مجھے اَن دیکھے اندیشوں نے آن گھیرا پھر مجھے یقین ہو گیا کہ حضرت اپنے مولا کریم کے فضل سے خود ہی کوئی انتظام فرما کر مجھے میرے دوست کی نظروں میں سُرخرو ہونے کا موقع بہم کریں گے۔ غرضیکہ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت ادب سے سلام کیا۔ آپ نے اپنے خادم کو کچھ لانے کے لیے اشارہ کیا تاکہ مہمان نوازی کا حق ادا ہو جائے۔ اس دوران میرا دوست سوچ رہا تھا جب انگوروں کا موسم ہی ختم ہو چکا ہے تو پھر شیخ اپنی رُوحانی طاقت کا مظاہرہ کس طرح کریں گے وہ ابھی یہاں تک ہی سوچ پایا تھا کہ آپ کا خادم انگوروں سے دو بھرے ہوئے طباق اُٹھائے آتا دکھائی دیا۔ یہ منظر دیکھ کر میں تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور میرے دوست پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اگرچہ آپ کی بے شمار کرامتوں کا ذکر مختلف کتب میں درج ہے لیکن آپ انہیں ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے۔
کرامات کے بارے میں اکثر یہ مصرع پڑھا کرتے

کرامتِ اولیاء اضطراب است (اولیاء کے لیے کرامت اضطراب ہے)

مزید برآں آپ فرمایا کرتے تھے کہ کرامتیں دو قسم کی ہیں اختیاری اور اضطراری۔

اوّل:۔ اسمائے الٰہی کے وِرد کرنے سے ظاہر ہوتی ہیں۔

دوم:۔ جو کسی شخص سے ظاہر نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں۔ نیز کرامتوں کو پوشیدہ رکھنا عامۃ الناس کے حق میں ہے۔ آپ کا ہی فرمان ہے۔

کسی را راست باحق آشنائی   نباید ہرگز از رُوئے خود نمائی

یعنی جسے حق تعالیٰ کی آشنائی حاصل ہو وہ کبھی خود نمائی نہیں کرتا۔
آگے چل کر فرماتے ہیں۔

ہر کہ آواز کشف خود گوید سُخن   کشف او را کفش کن بر سر بزن

یعنی جو کوئی اپنے کشف و کرامات کی نمائش کرتا ہے اس کے سر پر اپنا جُوتا نکال کر دے مار

ان ارشادات سے بات واضح ہوتی ہے کہ کرامات کا اظہار آپ کو کس قدر ناپسند تھا پھر بھی آپ سے کرامات کا ظہور خود بخود ہو جایا کرتا تھا۔ حالانکہ آپ کو اس امر میں دخل نہیں ہوتا تھا۔

چنانچہ شیخ عبدالواحد کا کہنا ہے کہ ایک بار وہ آپ کی خدمتِ اقدس میں اکتسابِ فیض کی غرض سے باغ میں حاضر ہوا جہاں آپ تشریف فرما تھے۔ ابھی مجھے بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کسی گھنیرے درخت پر بیٹھی ایک قمری کی پیاری آواز سنائی دی۔ قمری اپنی میٹھی اور حلاوت بھری آواز میں ہُو ہُو اللہ کے رسیلے نغمے فضا میں بکھیر رہی تھی۔ آپ اس آواز پر خوش ہو کر فرمانے لگے۔ سنو سنو! کیسی خوش بیانی سے اپنے خالق کی حمد و ثنا میں نغمہ زن ہے۔ ابھی آپ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ سوختہ بخت شکاری نے درختوں کی اوٹ سے نکل کر غلیل سے نشانہ باندھتے ہوئے پتھر دے مارا۔ وہ ننھی سی نرم و نازک اور بھولی بھالی جان پتھر کی شدید ضرب برداشت نہ کر سکی اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ آپ یہ دردناک حادثہ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اُسے اٹھا لاؤں۔ میں جا کر اسے فوراً اُٹھا لایا اور آپ نے بڑی محبت اور شفقت سے تین بار اس پر ہاتھ پھیرا۔ میری اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب میری آنکھوں کے سامنے وہ قمری پھر سے اُڑ کر سامنے والے درخت پر جا بیٹھی اور پھر سے معصوم پرندے نے اسی انداز میں اللہ کی حمد و ثنا خوش الحانی سے بیان کرنا شروع کر دی۔

بدبخت شکاری قمری کی آواز سُن کر لوٹ آیا اور دوبارہ نشانہ باندھنے لگا۔ اب کی مرتبہ آپ شکاری کی درندگی برداشت نہ کر سکے اور شکاری سے نہایت نرم لہجے میں اس بہیمانہ شوق سے باز رہنے کی تلقین کی۔ مگر وہ سنگدل نہ مانا اور پھر جیسے ہی اس نے غلیل سے پتھر مارنے کی کوشش کی وہ چیختا ہوا درد کی وجہ سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ یہ سب کچھ آپ کی دل آزاری کا نتیجہ ہے اس لیے گریہ زاری کرنے لگا اور آپ نے اسے اس وعدے پر معاف کیا کہ وہ آئندہ کسی جاندار کو ایذا نہیں پہنچائے گا۔

یہ سوال اکثر لوگوں کے ذہنوں میں کُلبلاتا ہے کہ اگر آپ کو دارا شکوہ سے اتنا اُنس تھا اور اس پر التفاتِ بصر تو آپ نے اس کے جانشین ہونے کے احکام کیوں صادر نہ فرماتے۔ اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ اس میں ایک توشیتِ ایزدی نہ تھی اور دوسرا اورنگ زیب کے حق میں آپ کی کرامت کا ظاہر ہونا۔

قصہ یوں ہے کہ شاہجہان جب دُوسری مرتبہ دارا شکوہ اور دیگر بیٹوں کو لے کر آپ سے مُلاقات کے لیے لاہور آیا تو میاں میرؒ نے شاہجہان کے کھانے کا انتظام کیا۔ نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد سبھی آپ کے ساتھ ظہرانہ تناول فرما رہے تھے کہ اچانک آپ کو رفع حاجت کے لیے اُٹھ کر جانا پڑا۔ یہ دیکھ کر دارا شکوہ نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ درویشی سے یہ مطلب تو نہیں کہ انسان کھانا کھاتے اور مجلس کے آداب کا خیال نہ رکھے۔ اِدھر دارا شکوہ یہ کہہ کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا اُدھر اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کا چھوڑا ہوا شوربہ غٹاغٹ پی لیا۔ خیر بات ختم ہو گئی۔

شاہجہان نے واپسی کی اجازت طلب کی اور ساتھ ہی نہایت عاجزی سے دارا شکوہ کے جانشین کے حکم دینے کی عرض بھی کی۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا۔ فیصلہ تو کل ہی ہو گیا تھا جس نے پیالۂ ولایت سے فیض پایا۔ وہ دین دُنیا کا بادشاہ بھی بن گیا اور جس نے ناک بھوں چڑھائی وہ ناکام و نامراد رہا۔ یہ سُنتے ہی شاہجہان نے اپنا سر پیٹ لیا۔

بعد ازاں کے واقعات نے آپؒ کی باتوں کو صحیح ثابت کر دیا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ دارا شکوہ نے جُوں جُوں ہندو ویدانت کا مطالعہ کیا تُوں تُوں اس کا نظریہ وحدت الوجود ویدانتی توحید کا رنگ اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے تصوّف اور ویدانت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے دیر و حرم کا امتیاز مٹا ڈالا۔ ستم بالائے ستم دارا شکوہ اپنے علم و فضل کے باوجود سحر و افسوں پر اعتماد رکھنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ملحد اور کافر ٹھہرا کر قتل کیا گیا۔

یہ ایک جانشینی کا واقعہ نہیں ہے بلکہ اَن گنت کرامات سے مخلوقِ خدا نے فیض پایا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ آپ کے مریدوں میں سے ایک مرید غیاث نے حاضرِ خدمت ہو کر گزارش کی میرا لڑکا نزع کی حالت میں ہے میں خالی دامن واپس نہ جاؤں گا۔ آپ اس کی بڑھتی ہوئی پریشانی دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گئے۔ اتنے میں آپ استغراق میں چلے گئے کچھ دیر بعد آپ نے پانی کا پیالہ طلب کیا اور اس پر دم کر کے پلانے کی نصیحت کی۔ جیسے ہی پیالہ ہونٹوں سے لگا وہ لڑکا صحت یاب ہو گیا۔

وقت دبے پاؤں چلتا رہا۔ اس لڑکے کی عمر سات سال ہونے کے باوجود وہ باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دوبارہ آپ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپ نے لڑکے کو پاس بٹھا کر کہا۔ بیٹے پڑھو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" آپ کا یہ فرمانا تھا کہ لڑکے کی پھنسی ہوئی تورت گویائی لوٹ کر آئی۔ گویا وہ بولنے سے قاصر کہاں ایک سال میں حافظِ قرآن بن گیا۔

ایک مرتبہ دارا شکوہ آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضرِ خدمت ہوا اور آپ کی التفاتِ اجر سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لگا طرح طرح فرمائشیں کرنے۔

آپ نے دارا شکوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا "فقیروں کو اتنا تنگ نہیں کیا کرتے۔ انہیں دُنیا میں اور بھی بہت سے ضروری کام ہوتے ہیں۔ خیر کچھ دن کی بات ہے پھر کسے ستاؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے۔" اگرچہ آپ نے اپنے آخری سفر کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ بات اہلِ مجلس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

پھر خدا شناسی کے سالک، حقیقت، طریقت اور شریعت کے مالک، آسمان ولایت کے قطب، اکابر زمین و زماں کے پیشوا اور بزرگوں کے امام یہ وصیت کی "مجھے شور (کلر) والی زمین میں دفنانا تاکہ میری ہڈیوں کا نشان باقی نہ رہے اور قبر ہرگز پختہ نہ بنانا نیز ہڈیاں فروخت کرنا۔ نیز میری قبر پر دوسروں کی طرح دُکان نہ لگانا" فرماتے ہوئے ۱۰۴۵ھ کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

✦✦✦✦✦✦✦

فرغانہ کی شہزادی بی بی راستی اپنے حُسن و جمال میں یکتا دُور دُور تک مشہور تھیں۔ اُن کے حُسن کا شہرہ سُن کر آس پاس کی ریاستوں
زادے اور اُمرا شہزادی سے شادی کے زبردست خواہشمند تھے لیکن شہزادی کو کسی سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ عام شہزادیوں سے بہت مختلف
انتہائی پرہیزگار اور عبادت گزار۔ اپنی عبادت و ریاضت کے باعث وہ سلوک کے راستے سے مقامِ ناسوت کو عبور کر کے عالمِ ملکوت میں
ہو چکی تھیں۔ اس لیے اُن کی نظر میں دُنیاوی امور میں اُلجھے یہ شہزادے کسی طور بھی جچ نہ پاتے۔ شہزادی کے والد سلطان جمال الدین بھی
درویش صفت باکمال بزرگ تھے۔ وہ بیٹی کی منشا و رضا بخوبی جانتے تھے۔ لیکن ایک باپ ہونے کے ناطے اُن کی یہ بھی دلی خواہش تھی کہ
رح وہ جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں جسے بہرحال انہیں ادا کرنا ہی تھا اور چاہتے تھے کہ بیٹی کسی مناسب شہزادے کو
کے اُن کے کندھوں پر لدے اس فرض کے بوجھ کو ہلکا کر دے۔ لیکن شہزادی انہیں ہر بار ہی ٹال دیتیں۔ آخر ایک دن سلطان جمال الدین
ن کر بیٹی سے بات کرنا چاہی تو شہزادی نے سر جُھکا کر آہستہ سے کہنا شروع کیا کہ "بابا حضور! جب خُدا کی مرضی ہوگی تب یہ کام بھی
جائے گا۔ آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں۔ ہمیں خُدا کے حکم کا انتظار کرنا چاہیے" اور سلطان شہزادی کی اس منطق کے آگے خاموش
گیا۔

شہزادی بی بی راستی اکثر مکّہ عبادت کی غرض سے جاتی رہتی تھیں اور وہاں خانہ کعبہ میں روزانہ حاضری دیتیں اور عبادت کرتیں۔
یہ شہزادی حسبِ معمول مکّہ آکر خانہ کعبہ میں طواف کر رہی تھیں کہ انہوں نے ایک انتہائی خوبصورت اور مردانہ وجاہت کے اعلیٰ ترین
و دیکھا جو اُنہی کی طرح خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا لیکن اُس نوجوان کی پشت سے شعاعیں منعکس ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا گویا نُور کا
اندر رہا ہو اور یہ اس امر کی علامت تھی کہ اس نوجوان کے صلب میں کوئی ایسا وجود پوشیدہ ہے جو اپنے دور کا قطب الاقطاب ہو گا۔
ی جو غور سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انہیں طواف ختم کرتے دیکھ کر فوراً اُن نوجوان کی طرف لپکیں اور شرما کر بولیں "کیا میں معلوم کر سکتی ہوں
کا اسم شریف کیا ہے اور کہاں سے تشریف لاتے ہیں۔"
ن نوجوان نے حیرت سے اس حسین شہزادی کو دیکھا اور پھر خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولے۔
میرا نام صدرالدین ہے اور ہندوستان کے شہر ملتان کا رہنے والا ہوں۔"

شہزادی نے یہ سُنا اور مسکرا کر کہا "اوہ..... تو گویا آپ بہاء الدین زکریا کے ملتان سے تشریف لائے ہیں۔"

"جی ہاں اور مجھے ان کی فرزندی کا شرف بھی حاصل ہے۔"

یہ سُن کر شہزادی نے حیرت و مسرت کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ سر اُٹھا کر اُس نوجوان کو دیکھا جو بڑی دلچسپی لیکن حیا آمیز پاکیزہ نظروں کے ساتھ اُسے تک رہا تھا۔ شہزادی نے دوبارہ دریافت کیا "کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" اُس نوجوان نے جس نے اپنا نام صدرالدین بتایا تھا نفی میں جواب دیا۔ یہ سُن کر شہزادی نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا "اگر آپ شادی کے خواہشمند ہوں تو میں ایک ایسے رشتہ تک آپ کی راہنمائی کر سکتی ہوں جو آپ کے لیے بہت مناسب رہے گا۔" صدرالدین کی سوالیہ نظریں اپنی طرف اُٹھی دیکھ کر شہزادی فوراً دوبارہ بولیں "کعبہ گواہ ہے کہ میں نے جو مناسب اور موزوں رشتے کے الفاظ کہے ہیں وہ غلط نہیں کہے۔"

صدرالدین شہزادی کی باتوں کا مطلب خُوب سمجھ رہے تھے پھر بھی اُنہوں نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا "شادی کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ بات میرے والد کے متعلق ہے۔ جو بھی وہ فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔"

شہزادی نے فوراً فرغانہ کی طرف سفر شروع کیا۔ اور فرغانہ پہنچ کر اپنے والد سلطان جمال الدین سے یہ تمام ماجرا کہہ سنایا۔ سلطان جمال الدین نے یہ سُنا تو خوش ہو گئے کہ چلو شہزادی کو کوئی تو پسند آیا۔ چنانچہ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے فوراً ملتان کے سفر کی تیاری شروع کر دی اور ملتان پہنچ کر ہی دم لیا۔ جیسے ہی سلطان جمال الدین اور ان کا شاہی قافلہ ملتان کی حدود میں داخل ہوا تو بہاءالدین زکریا اپنے خلفاء کے ساتھ شاہی مہمانوں کے استقبال کے لیے راستے میں کھڑے ہو گئے اور مہمانوں کو اپنی رہائش گاہ میں لے گئے۔ ملتان میں جہاں آجکل بی بی پاکدامن کا مزار ہے وہاں اُس زمانے میں حضرت شیخ بہاءالدین زکریا کا عالی شان محل اور باغ تھا۔

ملتان پہنچنے کے دُوسرے دن دورانِ ملاقات سلطان جمال الدین نے حضرت بہاءالدین زکریا سے اس بات کی خواہش بیان کی کہ وہ اپنی صاحبزادی کی شادی کسی مخدوم زادے سے کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت بہاءالدین نے سلطان جمال سے فرمایا "میرے سبھی بیٹے آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ آپ جسے اپنی فرزندی میں لینا چاہتے ہیں اُسے اپنا بیٹا بنالیں۔" سلطان نے یہ سُن کر فوراً صدرالدین کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا اور اسے محفل میں موجود پا کر بہاءالدین زکریا سے مخاطب ہوتے "حضرت میں صدرالدین کے لیے ہی اتنی مسافت طے کر کے ملتان آیا ہوں۔" حضرت بہاءالدین زکریا نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں ہم خُوب جانتے تھے کہ تم کس مقصد کے لیے آئے ہو۔" پھر انہوں نے اپنے بیٹے صدرالدین کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً اُٹھے اور سلطان جمال الدین کے پاس ادب سے آن کر بیٹھ گئے۔

گویا یہ حضرت بہاءالدین زکریا کی طرف سے ایک قسم کی اظہارِ رضامندی کا ثبوت تھا۔ چنانچہ پوری محفل میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی سبھی نے یک آواز مبارک باد دینا شروع کر دی۔ شیخ بہاءالدین زکریا نے مسکراتے ہوئے نکاح پڑھایا اور پھر سلطان جمال الدین نے شہزادی کا ہاتھ شیخ بہاءالدین زکریا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ شیخ بہاءالدین زکریا نے شفقت سے شہزادی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور یوں شہزادی بی بی راستی اور صدرالدین کا ملاپ ہو گیا۔ جن کے وجود سے ایک ایسے آفتاب نے جنم لینا تھا جس سے ہند کا یہ خطہ منور ہونے والا تھا۔

ہر قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو شیخ بہاءالدین زکریا اپنی بہو بیٹیوں سے ملتے۔ ایک مرتبہ حسبِ معمول جب شیخ بہاءالدین کی بیٹیاں اور بہوئیں سے ملنے اور زیارت کرنے اُن کے حُجرے میں داخل ہوئیں تو اچانک شیخ بہاءالدین زکریا نے ایک ایسی حرکت کی کہ سبھی حیران و پریشان ہو گئے یوں کہ جب تمام بہو بیٹیاں آپ کو سلام کر کے ایک جگہ ہو کر بیٹھتی گئیں اور آخر میں شہزادی راستی کی باری آئی تو آپ جو اب تک بیٹھے ہوئے تھے ایک دم کھڑے ہو گئے اور تعظیماً ذرا سا جُھک گئے۔ یہ دیکھ کر جہاں دوسروں کو حیرت ہوئی وہاں بی بی راستی بھی شرمندہ ہو گئیں اور وہ انتہائی ندامت بھرے لہجے میں مخاطب ہوئیں "یا حضرت یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کیوں مجھے شرمندہ کیے دے رہے ہیں۔ میں بھلا اس تعظیم کے کہاں قابل ہوں۔"

یہ سُن کر آپ نے فرمایا "بیٹی یہ تعظیم تو ہم نے اُس وجود کے لیے دی ہے جو تمہارے بطن میں پروان چڑھ رہا ہے اور ہمارے خاندان کا چشم و چراغ ایک دن اس خطہ کی جس طرح تقدیر بدل ڈالے گا وہ ہماری نظریں دیکھ رہی ہیں۔ ہم اپنے دور کے اس قطب الاقطاب کی تعظیم

لیے کھڑے ہوتے تھے۔ تمہیں ندامت کے اظہار کی ضرورت نہیں"۔ یہ سُن کر شہزادی بی بی راستی مسّرت سے کھل اُٹھیں اور خوشی سے اپنا سارا اثاثہ غرباء و حاجت مندوں میں خیرات کر دیا۔

اب شہزادی بی بی راستی دن رات عبادت میں گزارنے لگیں۔ لیکن وہ گھر کا کام بھی خود کرتیں۔ قصرِ غوثیہ جہاں شیخ بہاالدین زکریا کا قیام تھا، یتیم بچے، بیوائیں اور امراء کی بہو بیٹیاں بھی کسبِ فیض کے لیے حاضری دیتی رہتی تھیں۔ ان سب کے قیام و طعام کی تمام تر ذمہ داری بی بی راستی پر تھی۔ وہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود خُسر اور شوہر کا کھانا بھی خود تیار کرتیں اور سردی کے موسم میں اُن کے وضو اور تہجد کے لیے پانی گرم کر کے رکھتیں تاکہ وہ آسانی سے وضو فرما سکیں۔

۹ رمضان ۶۴۹ ہجری جمعہ کا روز تھا جب وہ آفتاب طلوع ہوا جس کے لیے بی بی راستی برسوں سے پُرامّید تھیں۔ جس کے لیے انہوں نے تخت و تاج ٹھکرا دیا اور وطن چھوڑ کر ملتان آبسیں۔ شیخ زکریا نے نومولود کو اُٹھا کر اُس کے کان میں اذان دی اور نام رُکن الدین رکھا۔
شہزادی بی بی راستی جب بھی اپنے بچّے کو دُودھ پلانے لگتیں تو پہلے وضو کر لیتیں۔ پھر بچّے کو دُودھ پلانے کے دوران میں تلاوتِ قرآن پاک کرتی رہتیں۔ اور بچہ اس تمام عرصہ میں بے حد مسرور رہتا۔
رُکن الدین بے حد ذہین بچہ ثابت ہوا اور بارہ سال کی عُمر میں قرآن مجید حفظ کر کے مجاہدے اور ریاضت کی طرف راغب ہُوا۔ ...نے میں بے پناہ جوش اور انہاک کا ثبوت دیتا۔ یہ بچہ جو رُکن الدین سے شاہ رکن عالم مشہور ہوا اپنے دادا اور والد کا بے حد ادب کرتا۔ کم عُمری میں ہی کشفِ قلوب، کشفِ قبور اور بطنِ ارض کے اسرار و نکات سے آگاہ ہو گیا۔
ایک دن ایک بُوڑھی سی عورت اپنے بچّے کو ہاتھوں میں اُٹھائے شیخ بہاالدین زکریا کی خانقاہ میں روتی ہوئی داخل ہوئی اور بچّے کو آپ کے قدموں میں لٹا کر کہنے لگی "حضرت یہ مر رہا ہے۔ اسے بچا لیں۔ یہی میرا دُنیا میں آخری سہارا ہے۔"
شیخ بہاالدین زکریا نے بچّے کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا "بی بی تیرا بچّہ اب اپنے خالق کے پاس جا چکا ہے۔ اب تو میں صرف دُعائے خیر کر سکتا ہوں اس کے لیے۔"

اُس عورت نے یہ سُنا تو غم سے نڈھال ہو گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ آپ نے اُسے تسلّی دینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ قسمت ماری بچّے کو اُٹھائے روتے روتے حجرے سے باہر نکل گئی۔ خانقاہ کے صحن میں بہت سے بچّے کھیل کُود میں مصروف تھے۔ انہی میں رکن الدین بھی تھے جو ابھی چار سال کے بھی مشکل ہوں گے۔ انہوں نے جو دادا کے حجرے میں سے اس بُوڑھی عورت کو ہاتھ میں لاش تھامے روتے ہوئے باہر نکلتے دیکھا۔ تو سب کچھ چھوڑ کر اُس کی طرف تیزی سے لپکے اور اُس بوڑھی عورت سے پُوچھنے لگے "اماں.... کیا بات ہے کیوں روتی ہو؟"
وہ بُوڑھی عورت آنکھوں میں آنسو بھرے مسّرت سے آپ کو دیکھتے ہوئے بولی "بیٹا میں نے تو سُنا تھا کہ تمہارے دادا بہاالدین زکریا کے در سے کبھی کوئی خالی نہیں گیا لیکن مجھ بدنصیب کو دیکھو جو اس در سے خالی ہاتھ جا رہی ہے۔ اپنی اس بدنصیبی پر روؤں نہیں تو اور کیا کروں۔"
یہ سُن کر رکن الدین بولے "اماں.... لیکن تم نے کس بات کی خواہش کی تھی جو دادا نے — اللہ سے قبول کروانے سے معذوری ظاہر کی ہے۔"

وہ دُکھی عورت بولی "بیٹا میرا بیمار بچہ مر رہا تھا۔ میں تو اس اُمید پر تمہارے دادا کے پاس لائی تھی کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اُن کے طفیل میرا بچہ بچ جائے گا۔ لیکن اپنے بچّے کو تندرست لے جانے کی بجائے مُردہ لیے جا رہی ہوں۔"
رُکن الدین نے بچّے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اماں.... کیسی بات کہہ رہی ہو۔ تمہارا بچّہ تو زندہ ہے اور تم اسے مُردہ تصور کر رہی ہو۔"
عورت نے حیرت سے چونک کر آپ کو دیکھا پھر جلدی سے جُھک کر اپنے بچّے کو دیکھنے لگی جو اُس کے ہاتھوں میں آنکھیں کھولے مسکراتے جا رہا تھا۔ وہ عورت وفورِ مسّرت سے پاگل ہوتے ہوتے شیخ زکریا کے حجرے میں دوڑی اور بولی "حضرت..... دیکھیں میرا بچّہ زندہ ہو گیا۔ میرا بچّہ پھر سے جی اُٹھا ہے۔"
شیخ زکریا زیرِ لب بولے "اچھا تو اپنے دَور کا یہ ولی کرامت پہ چل ہی گیا ہے حالانکہ معجزات پیغمبروں کے لیے واجب ہیں اور کرامت ولیوں

کے لیے پوشیدہ رکھنا واجب ہے۔ لیکن یہ قطب تو کرامت پہ محل اُٹھا ہے۔" انہوں نے اُس عورت کو مبارک باد دے کر واپس بھیجا اور اُس کے لیے حکم جاری کیا کہ اُس بوڑھی عورت کو تاحیات وظیفہ ملتا رہے۔ پھر آپ نے اپنے کمسن پوتے کو بلایا اور پیار سے گود میں بٹھاتے ہوئے بولے۔

"رکن الدین یہ تم نے آج کیا حرکت کی ہے۔ بیٹا ایسا کام نہیں کرتے۔ سلوکِ طریقت میں یہ باتیں ممنوع ہیں۔"

رکن الدین بولے "بابا! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے دَر سے کبھی کوئی سوالی خالی نہیں گیا۔ پھر ہم اُس بوڑھی عورت کو کیسے جانے دیتے۔ اگر سلوکِ طریقت میں یہ سب منع ہے تو بابا آپ سلوکِ طریقت سے کہہ دیں کہ وہ خود کو بدل ڈالے ہم تو ہرگز ایسا نہ کریں گے کہ کسی کو در سے خالی ہاتھ روانہ کر دیں۔

آپ نے پوتے کی باتیں سُنیں تو مسکرا پڑے اور پیار و شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نیچے اُتار کر خود اپنے حجرے میں چلے گئے۔

شیخ رکن الدین کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ پیدا ہوتے تو آپ کی پیدائش کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ سلطان الاذکرین حمید الدین حاکم جو برسوں سے اپنے مُرشد کی پیدائش کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ خبر سُن کر بے چین ہو اُٹھے اور بیقراری و سرشاری میں ڈوبے دوڑتے ہوئے شیخ زکریا کے حجرے میں داخل ہوتے۔ جہاں شیخ زکریا نو مولود رکن الدین کو گود میں اُٹھائے چاہت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ حمید الدین حاکم نے شیخ زکریا کے قدموں میں گرتے ہوتے رونا شروع کر دیا اور گریبان چاک کر کے فریاد کرنے لگے کہ "حضرت نہ جانے مجھے عُمر مہلت بھی دیتی ہے یا نہیں۔ میری آپ سے التماس ہے کہ آپ مجھے ابھی اسی وقت اپنے اس ننھے مرشد کے ہاتھوں مُرید بننے کا شرف حاصل کر لینے دیں۔"

یہ سُن کر شیخ زکریا نے حمید الدین حاکم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے شیر خوار پوتے رکن الدین کے ہاتھ میں دے دیا۔

رکن الدین جب بھی دادا کو نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی طرف جاتا دیکھتے تو آپ فوراً دوڑ کر دادا کا کُرتا تھام لیتے۔ شیخ زکریا بھی مجبوراً آپ کو ساتھ لے جاتے۔ ایک دن حسبِ معمول شیخ زکریا آپ کا ہاتھ تھامے مسجد کی طرف جا رہے تھے اور مسجد پہنچ کر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوتے آپ باہر مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ شیخ بہاالدین نے آپ کو وہیں چھوڑ کر مسجد میں نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ نماز پڑھنے کے بعد شیخ زکریا باہر آتے تو دیکھا پوتا مسجد کے باہر رکھی نمازیوں کی جوتیوں سے اس طرح کھیل رہا ہے کہ انہیں علیحدہ علیحدہ دو جگہوں پر رکھتا جا رہا ہے۔ آپ جوتیوں کی ترتیب دیکھ کر ہی سمجھ گئے کہ رکن الدین کھیل کھیل میں دوزخیوں اور جنتیوں کی جوتیاں علیحدہ کیے بیٹھے ہیں۔ اگرچہ دُوسرے لوگ اسے طفلانہ کھیل سمجھ کر نظر انداز کرتے ہوتے اپنی اپنی جوتیاں پہن کر چلتے رہے۔ لیکن جو صاحب نظر تھے وہ جوتیوں کی تقسیم دیکھ کر زرد پڑ گئے اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ دُوسرے نمازیوں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ابھی قریب تھا کہ باقی لوگ بھی جوتیوں کی اس تقسیم کو دیکھتے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے شیخ زکریا نے جلدی سے جوتیوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ ملا دیا۔ اور پوتے کو لے کر مسجد سے باہر نکل آتے۔ راستے میں آپ نے رکن الدین کو پیار بھری ڈانٹ میں کہا "رکن الدین میرے فرزند ایسا مت کیا کر۔ یہ مناسب نہیں۔ خُدا کے رازوں کا انکشاف کرنا گناہ ہے۔"

شیخ رکن الدین نے ہر مقام پر اپنی ریاضت و مجاہدے کے سبب عُمر سے بڑھ کر استعداد کا مظاہرہ کیا۔ آپ کمسنی میں ہی توحید کے اسرار کو پوشیدہ رکھنے پر قادر ہو چکے تھے۔ لیکن آپ اب بھی علماء اور مشائخ کا حد درجہ احترام کرتے اور انتہائی عزت اور ادب کے ساتھ اُن کی محفل میں حاضری دیتے۔ خاموشی سے اُن کی باتیں سنتے۔ آپ کی اس عاجزی اور انکساری سے متاثر ہو کر خواجہ شمس الدین سبزواری نے آپ کو شاہ رکن الدین والعالم کا لقب دیا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ مختصر ہوتا گیا اور پھر شاہ رکن الدین العالم سے شاہ رکن عالم رہ گیا۔

شاہ رکن عالم نے سات سال کی عُمر میں ہی نماز با جماعت ادا کرنا شروع کر دی۔ شیخ بہاالدین آپ کو زیادہ تر اپنی صحبت میں رکھتے اور دل و جان سے آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں مگن رہتے۔ آپ چاہتے تھے کہ معرفت کا یہ آفتاب اُن کے سامنے ہی نصف النہار تک پہنچ جائے۔ اس لیے آپ اپنی نگرانی میں انہیں یہ تمام مراحل طے کرا رہے تھے۔

حمید الدین حاکم جس نے شیر خوار میں ہی شاہ رکن عالم کو مرشد بنایا تھا۔ اور نہ آپ کی مریدی میں آتے تھے۔ اکثر آپ کی زیارت کے لیے آتے رہتے تھے۔ اگرچہ آپ اب بھی کمسن تھے۔ اس لیے حمید الدین خاموشی سے آتے اور چُپ چاپ خاموشی سے جا کر ڈیوڑھی میں ایسی جگہ بیٹھ جاتے کہ آپ کی نظر آپ پر پڑتی رہے۔ اکثر یوں ہوتا کہ رکن عالم کھیلتے کھیلتے حمید الدین کے پاس آ جاتے۔ تب حمید الدین حاکم آپ کو گود میں بٹھا کر آپ

پیار کرتے۔ اور عقیدت سے آپ کے پاؤں اپنے سر اور آنکھوں سے لگاتے اور پھر ڈیوڑھی کے دونوں دروازے بند کر کے بیٹھ جاتے۔ رکن عالم کی حفاظت کے لیے ایک دایہ بھی رکھی گئی تھی۔ وہ اکثر حیرت سے یہ سب دیکھتی لیکن زبان سے کچھ نہ کہتی۔ تجسّس میں مبتلا دایہ ہر بار خواہش کرتی کہ آخر دیکھوں تو سہی کہ وہ بزرگ بچے کو کمرے میں علیحدہ کر کے کیا باتیں کرتے ہیں۔ لیکن پھر کسی وجہ سے اپنے ارادے سے باز رہتی۔ لیکن ایک دن جب اُس سے رہا نہ گیا تو اُس نے دروازے سے اندر جھانکنا شروع کیا اور جیسے ہی اُس کی نظر اندر کے منظر پر پڑی اُس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور بھاگتی ہوئی بی بی راستی کے پاس پہنچی۔ انہوں نے جو یوں دایہ کو بدحواس ہو کر دوڑتے ہوئے آتے دیکھا تو پوچھا "نیک بخت یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ کیوں اس طرح بوکھلائی دوڑتی آ رہی ہے۔" تو وہ دایہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے بولی "بی بی! آج میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ رکن الدین بیٹے سے ملنے ایک بزرگ حاکم الدین آتے ہیں اور اکثر کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں نے آج یہ جاننا چاہا کہ دیکھوں تو سہی کہ وہ اندر رکن الدین سے کیا باتیں کرتے ہیں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اندر رکن الدین کی بجائے ایک باریش بزرگ بیٹھے ہیں اور رکن الدین سے ملنے آنے والے بزرگ کو کوئی شرعی مسئلہ سمجھا رہے ہیں۔"

بی بی راستی نے دایہ کو کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ خود ڈیوڑھی میں جا کر دیکھنے لگیں جہاں رکن الدین معصومیت سے کھیل میں مصروف تھے۔ بی بی راستی نے دایہ کو دیکھتے ہوئے کہا "دیکھ آئندہ کے لیے خیال رکھنا۔ یہ تانک جھانک کوئی اچھی عادت نہیں ہے اور خبردار جو آئندہ کوئی ایسی بات کسی پہ ظاہر کی۔"

رکن الدین ابھی بارہ سال کے کم عمر بچے ہی تھے کہ آپ کے دادا شیخ بہاالدین زکریا کا وصال ہو گیا۔ رکن الدین کو آپ سے بے پناہ محبت تھی اور چاہت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے والد کی بجائے دادا شیخ بہاالدین زکریا سے زیادہ مانوس تھے۔ اس لیے وہ آپ کے جسد خاکی سے لپٹ لپٹ کر روتے رہے۔ حضرت شیخ بہاالدین زکریا کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے صدرالدین مسند پر بیٹھے۔ حضرت شیخ زکریا کے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں نے جب آپ کی صحبت میں بیٹھنا شروع کیا تو انہیں اس حیرت انگیز خوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے صدرالدین کو ہوبہو شیخ زکریا کا ہمزاد پایا۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے سے دریافت کرتے کہ آیا وہ حضرت زکریا کی محفل میں ہیں یا حضرت صدرالدین کی صحبت میں فیض یاب ہو رہے ہیں۔

۷۰۹ ہجری میں صدرالدین کا وصال ہوا تو حضرت شاہ رکن عالم کو اپنے دادا کی مسند سنبھالنا پڑی۔ اُس زمانے میں بزرگان دین کی تین مسندیں زیادہ مشہور تھیں۔ رشد و ہدایت کی یہ تین مسندیں دلی میں نظام الدین اولیاء، اجودھن (پاکپتن) میں شیخ علاؤالدین چشتی اور ملتان میں شاہ رکن عالم کی تھیں۔

ملتان میں ایک ہندو عورت رہا کرتی تھی۔ بیوہ تھی اور سوائے ایک اکلوتے بیٹے کے اُس کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہ تھا مگر وہ نصیبوں جلی اس بیٹے کی رفاقت سے بھی محروم تھی۔ دنیا جہان کی محنت و مشقت اُٹھا کر اُس نے بیٹے کی پرورش کی اور وہ بیٹا جس کے لیے اُس نے سب کچھ کیا۔ ایک دن تجارت کی غرض سے خراسان کے سفر پر ایسا روانہ ہوا کہ دوبارہ ملتان کی راہ ہی بھول گیا۔ نہ تو خود آیا اور نہ ہی کوئی خیریت کا پتر ماں کو بھیجا۔ وہ بیچاری ممتا کی ماری اُس کی یاد میں رات بھر روتی رہتی اور دن بھر لوگوں کی منتیں کرتی کہ کسی طرح وہ اُس کے بیٹے کو واپس لا دیں۔ لوگ بھی رحم کے جذبے سے اُسے دیکھتے اور بے بسی کا اظہار کر کے اپنی راہ لیتے آخر جب کچھ ہمدردوں نے دیکھا کہ یہ تو ممتا کی ماری اب پاگل ہونے والی ہے تو کسی نے اُسے مشورہ دیا کہ دیکھ تو ملتان کے مسلمان درویش کے پاس جا۔ اُن پر ایشور کی بڑی کرپا ہے۔ اور وہ تجھے تیرے بیٹے سے ملا سکتے ہیں۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس عورت نے جب یہ سنا کہ ایک ایسا در بھی ہے جہاں سے وہ کامیاب لوٹ سکتی ہے تو اُس نے فوراً شاہ رکن عالم کی خانقاہ کی طرف دوڑ لگائی اور سیدھی آپ کے حجرے میں پہنچ کر فریاد کرنے لگی کہ "شریمان جی مجھ ابھاگن پر دیا کریں۔ میرا اکلوتا بیٹا بڑے سمے سے مجھ سے الگ ہے نجانے کدھر ہو گا" جذبات کی شدت سے وہ عورت روتی بھی جاتی تھی اور زبان سے فریاد بھی کرتی جاتی۔ آپ نے رحمدلی سے اُسے دیکھتے ہوئے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ پھر کچھ دیر بعد آنکھیں کھولتے ہوئے اُس ہندو عورت سے بولے "گھر جاؤ تمہارا بیٹا اللہ کی رضا سے گھر پہنچ چکا ہو گا۔"

یہ سُن کر عورت خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے گھر کو دوڑی۔ ابھی وہ گھر کی دہلیز سے ذرا دُور ہی تھی کہ اُس نے دیکھا اُس کا بیٹا ہاتھ میں ہانڈی میں ڈالنے والا بڑا سا چمچ اُٹھائے دوڑتا آ رہا ہے۔ عورت نے جب طویل عرصہ کے بعد بیٹے کو دیکھا تو دوڑ کر اُسے گلے سے لگا لیا اور رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا۔ وہ نوجوان حیرت سے کبھی ماں کو دیکھتا کبھی اپنے آبائی شہر کی گلی کو تکتا اور پھر ہاتھ میں پکڑے اُس چمچ پر نظر ڈالتا۔ پھر وہ ماں کو لے کر اپنے گھر میں داخل ہوا اور حیرت سے ماں کو بتانے لگا کہ "اماں یہ تو بڑا ہی نرالا واقعہ ہو گیا۔ میں تو وہاں خراسان میں بیٹھا ہانڈی میں چمچ ہلا رہا تھا کہ ایک بلی کہیں سے نمودار ہوئی اور وہ تھالی میں رکھے گوشت کو اٹھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجھے اس پر بہت غصہ آیا۔ چنانچہ میں نے ہاتھ میں پکڑے چمچ کے ساتھ ہی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ لیکن گھر سے نکل کر اب جو دیکھتا ہوں تو اپنے شہر کی گلی میں خود کو موجود پاتا ہوں۔ ماں کیا یہ عجیب بات نہیں؟ آخر ایسا کیسے ہو گیا؟

اُس کی ماں جو فرطِ مسرت سے بیٹے کو دیکھتی جا رہی تھی پوری بات سننے کے بعد اُس نے بیٹے کو حضرت شاہ رکن عالم کے بارے میں بتایا چنانچہ اگلی صبح اُس کا بیٹا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اُسے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا "دیکھ یہ تیری ماں ہی ہے جس نے آج تجھے پال پوس کر اتنا نوجوان اور باہمت بنا دیا ہے کہ تو گھر سے نکل کر خراسان جیسے دُور دراز علاقے میں جا کر تجارت کر سکے۔ پھر بھی تو ماں بھول گیا۔ یاد رکھ جس دن تو اپنی ماں کو بھولا اُس دن تیرا رب بھی تجھے بھول جائے گا۔"

ایک مرتبہ ایک درویش کہیں سے شاہ رکن عالم کی شہرت و عظمت سُن کر انہیں ملنے ملتان آیا۔ اور آپ کی خانقاہ میں آ کر رہنے لگا۔ ایک دن جب اُس کی ملاقات آپ سے ہوئی تو اُس نے آپ کا جب ظاہری حُسن و جمال اور باطنی کمال دیکھا تو انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔ نادان یہ سمجھ بیٹھا کہ اس میں ضرور شاہ رکن عالم کی غذا کی تاثیر ہوگی۔ جو اُن کے چہرے سے یوں نُور ٹپک رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اب خواہ کچھ ہو جائے وہ ہرگز خانقاہ کی خوراک استعمال نہ کرے گا اور خانقاہ کے انتظام چلانے والوں سے ضد کرے گا کہ اُسے بھی وہی کھانا دیا جائے جو وہ لوگ شاہ رکن عالم کے لیے تیار کرتے ہیں۔ وہ اس خوش فہمی میں مکمل مبتلا ہو چکا تھا کہ شاہ رکن عالم کے چہرے سے جو روشنی پھوٹتی ہے اُس کا راز صرف اُس اعلیٰ غذا میں پوشیدہ ہے جو اُن کے لیے خاص طور پر تیار کی جاتی ہوگی۔

چنانچہ جب اگلے دن اُسے کھانا دیا گیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے بھی وہی کھانا کھلاؤ جو تم لوگ قطب الاقطاب کو کھلاتے ہو۔ خانقاہ کے لنگر چلانے والوں نے ہر طرح کی منت سماجت کر کے دیکھ لی لیکن وہ درویش بھی ایک ہٹ دھرم تھا۔ اُس نے کسی کی بات سُنی تک نہیں اور صرف یہی مطالبہ کرتا رہا کہ کھانا کھلانا ہے تو مجھے وہی کھانا کھلاؤ جو تم لوگ شاہ رکن عالم کو کھلاتے ہو۔

لوگوں نے تنگ آ کر اس بات کی آپ کو اطلاع کی۔ آپ نے اُسی وقت اپنے دسترخوان سے کھانا اُس کے لیے بھجوا دیا اور وہ جو لنگر میں پکے دُنیا کی لذیذ ترین غذاؤں کو ٹھکرا کر اُس بیش قیمت خوراک کی خواہش میں بیٹھا تھا جو اُس کے خیال میں شاہ رکن عالم کھاتے ہوں گے۔ اُس نے جب اپنے آگے جَو کی روٹی اور بے نمک اُبلی ہوئی سبزی دیکھی تو حیرت سے چلا کر بولا "یہ تم لوگ مجھے کیا کھلانے کے لیے اُٹھا لائے ہو۔"

لوگوں نے مسکرا کر کہا "بابا تم نے خود ہی تو خواہش ظاہر کی تھی کہ تم وہ غذا کھانا چاہتے ہو جو شاہ رکن عالم کھاتے ہیں۔ اب وہی تمہارے آگے سرو کر دی گئی ہے تو تم کہتے ہو کہ ہم یہ کیا اٹھا لائے ہیں۔"

وہ درویش یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اور شرمندگی کے مارے مُنہ چھپا کر بیٹھ گیا اور خود کو ملامت کرنے لگا کہ اُس نے شاہ رکن عالم کے بارے میں کیسی بے سروپا بات سوچی تھی۔ اُدھر جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے حجرے میں چلے گئے تو آپ نے اُس درویش کو اپنے پاس بُلایا۔ وہ ندامت سے سر جھکائے آپ کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا "بابا! ہماری یہ خوب روئی اعلیٰ اور مرغن کھانے کھانے سے نہیں۔ بلکہ ریاضت اور عبادت سے حاصل روحانی غذا سے ہے۔" پھر آپ نے اُس درویش کو پکڑ کر سینے سے لگا لیا اور اُس درویش نے یوں ہی محسوس کیا کہ جیسے اُس پر عرفان کے در کھل گئے ہوں۔ وہ فوراً آپ کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔ آپ نے اُسے اُٹھایا اور ریاضت و مجاہدے کرنے کی تلقین کی اور دینی تعلیم کی اہم باتیں بتائیں۔ وعظ و نصیحت کرنے کے بعد آپ نے اُسے رخصت کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ

ملتان حق کے طور پر مشہور و معروف ہو گیا اور لوگ اُس کی قسمت پہ رشک کرنے لگے کہ شاہ رکن عالم اُس سے بغل گیر ہوتے اور اپنا سینہ اُس کے سینے سے مَس کیا۔ یہ اعزاز پانے کے لیے تو برسوں سے لوگ آپ کے در پہ انتظار میں بیٹھے تھے۔

شاہ رکنِ عالم فرمایا کرتے تھے کہ "جب ایک انسان نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے تو اُس کی وہ نیکی صرف اُسی تک محدود نہیں رہتی بلکہ فرد در فرد سفر طے کرتی پورے علاقے پر چھا جاتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک انسان کی نیکی سے اُس کے ارادت مند اثر قبول کرتے ہیں تو نیکی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ پھر ہمسائے بھی اُس کی تاثیر سے فیض یاب ہوتے ہیں اور پھر نیکی کا یہ سفر آگے بڑھتا ہوا شہر بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور یوں جب ایک شہر نیکی کا اثر قبول کرتا ہے تو ایک پوری مملکت اس سے استفادہ حاصل کرتی ہے۔"

شہر ملتان میں دو ہندو بہنیں رہا کرتی تھیں۔ وہ آپ کی عظمت اور کرامات کی دل سے قائل تھیں اور آپ کی بے حد عزت کیا کرتی تھیں۔ ان میں چھوٹی والی آپ کی بہت عقیدت مند تھی اور بڑی عقیدت سے روزانہ صبح دُودھ کا ایک لوٹا آپ کی خانقاہ میں لاتی اور آپ بھی وہ دودھ بخوشی لیتے اور استعمال میں لاتے۔ اگرچہ خانقاہ کی ملکیت میں ہزارہا اعلیٰ النسل کے دُودھ دینے والے جانور موجود تھے مگر وہ لڑکی اتنی ...سے دُودھ لاتی کہ آپ کو وہ دُودھ اتنا بھا گیا کہ اُس کے انتظار میں رہنے لگے۔ آپ کو اُس لڑکی کی یہ عقیدت کچھ ایسی بھائی کہ آپ نے اُس پر اپنی خصوصی توجہ دی اور اُس کی کایا پلٹ دی۔ کل تک جو لڑکی ہزار ہا بتوں کی پجاری تھی آج وہ آپ کے ایمان افروز طرزِ عمل سے ...واحد کی عبادت گزار بن گئی۔ مسلمان ہو کر اُس نے عبادت گزاری میں وہ مقام پیدا کیا کہ ایک ممتاز زاہدہ کے طور پر مشہور ہوئی۔ اگرچہ وہ ایمان ہو چکی تھی مگر اُس نے اپنی پوشاک ہندوانہ ہی رکھی۔ چنانچہ جب اُس کا انتقال ہوا تو اُس کے عزیز اقربا نے اُس کی چتا تیار کر کے اُسے جلانے کی خاطر مرگھٹ کی طرف لے جانا چاہا تو آپ کو اس بات کا علم ہو گیا۔ آپ فوراً اُن کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ "مرحومہ جلائی نہیں جا سکتی کیونکہ اسلام میں مُردہ جلانا حرام ہے۔ اسے دفن کیا جائے۔"

لڑکی کے عزیزوں نے اسے اپنے مذہب میں دخل اندازی گردانتے ہوئے "تلخ لہجہ" میں کہا "حضرت اسلام کی باتیں مسلمان جانیں۔ ایک ہندو لڑکی کا اس سے کیا تعلق؟" یہ سُن کر آپ نے حیرت سے کہا "ہندو۔ کون ہندو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ لڑکی مسلمان ہو چکی ہے۔" پھر آپ نے ...کی چتا کی طرف مڑ کر مُردہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں مومنہ..... کیا تم مسلمان نہیں ہو؟"

لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور آپ کی ذہنی کیفیت پہ شک کا اظہار کرنے لگے کہ حضرت مُردے سے جواب کی توقع رکھ رہے ہیں لیکن پھر ...کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ لڑکی جو مُردہ بے جان چتا پر پڑی تھی۔ ایک دم اُٹھ بیٹھی اور کلمہ توحید پڑھ کر دوبارہ اُسی طرح لیٹ گئی۔

لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو اُن میں سے کچھ جنہیں خُدا نے فلاح کے لیے منتخب کر لیا تھا فوراً مسلمان ہو گئے۔ اُس لڑکی کی چھوٹی بہن بھی اسلام پہ ایمان لے آئی اور ایک کاملہ خاتون بنی۔ اُس کے انتقال کے بعد اُسے اُس کی بہن کے ساتھ ہی دفنایا گیا۔ ملتان کے محلہ کمانگراں میں آج بھی دونوں بہنوں کی قبریں موجود ہیں۔

علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بنا اور قطب الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ قطب الدین خلجی تخت نشین ہوتے ہی درباری خوشامدیوں نے اُسے یوں گھیرے میں لے لیا کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو گیا۔ جو درباری کان میں ڈالا آنکھ بند کر کے اُس کی حقیقت پہ ایمان لے آیا۔ شاہی درباریوں نے دلی میں خواجہ نظام الدین کی شہرت و دبدبہ دیکھا تو آگ ...ٹنے لگے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ہم شاہی دربار سے وابستہ ہیں لہٰذا عوام ہماری زیادہ عزت کرے گی اور اپنی مشکلات و مصائب ہمارے آگے بیان کرے گی تاکہ ہم اُسے شہنشاہِ ہند تک پہنچا سکیں یا اپنے اختیارات سے کام لے کر انہیں دُور کریں لیکن یہ لوگ تو بھولے سے بھی ...کے پاس نہیں آتے اور خواجہ صاحب کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے رہتے ہیں تو انہوں نے بادشاہ کو خواجہ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ قطب الدین ...آپ خواجہ سے عناد رکھنے لگا اور اُن کا وجود اپنی اور اپنی سلطنت کی سالمیت کے لیے حد درجہ خطرناک سمجھنے لگا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح خواجہ نظام الدین کو زک پہنچا کر دلی سے نکلوا دے لیکن پھر اُن کی درویشی و عظمت کے آگے بے بس ہو جاتا۔ اور سوچتا کہیں یہ میرے حق میں ایسی بددعا نہ دے دیں کہ مجھی کو دلی کی مسند چھوڑنی پڑ جائے۔ چالاک اور مفسد درباریوں نے جب بادشاہ کو اس کش مکش میں دیکھا تو اُسے کہنے لگے کہ اگر آپ

ملتان سے شاہ رکن عالم کو دلی بلالیں تو وہی مقاصد حاصل کر سکتے ہیں جو آپ کے ذہن میں ہیں۔ بادشاہ نے سوالیہ انداز میں درباریوں کی طرف دیکھ کر پوچھا وہ کیسے؟ اُن مفسد درباریوں نے عیاری سے کہا۔ شاہ رکن عالم اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی آپس میں بہت کم بنتی ہے اس طرح جب ایک شہر میں دونوں یکجا ہو جائیں گے تو دونوں میں رنجش بڑھے گی اور پھر ہم اسی رنجش سے بھرپور فائدہ اٹھالیں گے۔ بادشاہ کو یہ تجویز بڑی بھائی۔ اُس نے فوراً شاہ رکن عالم کی طرف ایک دعوت نامہ بھیجا اور دلی آنے کے لیے پُرزور اصرار کیا۔ شیخ رکن عالم کو اچھی طرح علم تھا کہ اس دعوت نامہ کے پس پردہ کیا عوامل ہیں۔ وہ بادشاہ کی عیاری خوب سمجھتے تھے لیکن انہوں نے دلی جانا بھی ضروری خیال کیا چنانچہ آپ نے فوراً اپنے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کو ساتھ لیا اور دلی کے سفر پہ نکل کھڑے ہوتے۔ ادھر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ اور اُس کے خوشامد پسند کھلاڑی کیا کھیل کھیل رہے ہیں تو انہوں نے اس کے توڑ کا حل بھی نکالا کہ پہلے خود شاہ رکن عالم کے استقبال کے لیے جائیں۔ اس لیے انہیں جیسے ہی اطلاع ملی کہ شاہ رکن عالم ملتان کے نزدیک پہنچ چکے ہیں تو آپ بھی اپنے ارادت مندوں، عقیدت مندوں اور مریدوں کے ساتھ دلی شہر سے نکل کر ذرا آگے جاکر رکن عالم کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے اور جیسے ہی شاہ رکن عالم دلی کے نزدیک پہنچے آپ کا انہوں نے پُرجوش خیر مقدم کیا۔ رات بھر دونوں بزرگ ایک خیمے میں بیٹھے شرعی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ صبح ہوئی تو نظام الدین اولیاءؒ نے شاہ رکن عالم سے الوداعی مصافحہ کیا اور پھر اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ دلی واپس کوچ کر گئے۔ شاہ رکن عالم نے بھی نظام الدین اولیاءؒ کے جاتے ہی دلی شہر کی طرف کوچ کا حکم صادر کیا۔ بادشاہ شہر کی فصیل کے پاس شاہی افراد کے ساتھ کھڑا آپ کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اُسے شاہ رکن عالم کی آمد کی اطلاع ملی وہ آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہو گیا اور آپ کے گھوڑے کی لگام تھام کر کچھ فاصلہ آگے بڑھنے کے بعد آپ کو گھوڑے سے اُتار کر ایک دوسری آرام دہ سواری پر بٹھایا گیا۔ پھر یہ قافلہ شاہی محل کی طرف روانہ ہوا۔ شاہی محل کے پھاٹک پر پہنچ کر بادشاہ نے جو پیچھے دوڑائی تو اُسے انسانوں کے سروں کا اژدھام نظر آیا جو شاہ رکن عالم کے استقبال کی خاطر اُن کے پیچھے چلا آیا تھا۔ بادشاہ نے یہ موقع مناسب گردانا اور شیخ رکن عالم کو وہیں ٹھہرا کر آپ سے عوام کے سامنے مخاطب ہوا "حضرت آپ کا دلی شہر میں سب سے پہلے کس نے استقبال کیا؟"

شیخ رکن عالم ملتانی بھی دلی کے تاجدار کی بات خوب سمجھ رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بلند آواز سے مجمع کی طرف دیکھ کر کہا "لوگو تمہارے اس شہر میں مجھ ملتانی درویش کا سب سے پہلے سواگت اُس نے کیا جو تمہارے شہر کا سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار انسان ہے اور جو خدا کا محبوب بندہ ہے۔" بادشاہ جو اپنی دانست میں آپ کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے تھا یہ سُن کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اُس نے پھر بھی مزید تصدیق کے لیے آپ سے کہا "حضرت وہ خوش نصیب کون تھا اُس کے نام سے بھی تو مطلع فرمائیں تاکہ دلی کے لوگ جان لیں کہ اُن کے شہر کا سب سے پرہیزگار اور عبادت گزار انسان کون ہے؟"

یہ سُن کر شیخ رکن عالم ملتانی نے مجمع کی طرف مسکراتے دیکھ کر کہا "لوگو تمہارے شہر میں داخل ہونے سے پہلے میرا جس شخص نے سب سے پہلے استقبال کیا وہ محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین بدایونی تھے اور تم لوگ اچھی طرح سے جان لو کہ وہ دلی کے سب سے اچھے بندے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین بشر ہیں۔"

دلی میں اگرچہ شاہ رکن عالم جب بھی تشریف لاتے تو شاہی دربار کے مہمان کی حیثیت رکھتے۔ اور اُنہیں محل میں ہی قیام کے لیے مجبور کیا جاتا لیکن آپ اپنا زیادہ وقت نظام الدین اولیاءؒ کی صحبت میں گزارنا پسند فرماتے۔ اکثر گھنٹوں دونوں بزرگ سر جوڑے سیر حاصل گفتگو میں محو پائے جاتے اور لوگ دونوں بزرگانِ دین کی یہ مثالی سنگت اور دوستی رشک سے دیکھتے جو ایک دوسرے کے عہدے سے بے نیاز ہو کر دو دوستوں کی طرح باتیں کرتے رہتے۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ رکن عالم دلی کی کسی مسجد میں نماز کے لیے جاتے اور خواجہ نظام الدینؒ نماز ختم کر پاتے تو اس جگہ آن کھڑے ہوتے جہاں شاہ رکن عالم عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوتے۔ انہیں عبادت میں مصروف دیکھ کر خواجہ نظام الدین چُپ چاپ خاموشی سے اُن کے پیچھے بیٹھ جاتے اور اُن کی نماز ختم کرنے تک وہیں بیٹھے رہتے۔ جیسے ہی شاہ رکن

بینکاری میں قیادت
کھیلوں میں مہارت

بینکاری کی صنعت کے پیش رو، حبیب بینک نے کھیلوں میں بھی سبقت حاصل کی ہے اور اس مقصد کیلئے ایک خصوصی اسپورٹس ڈویژن قائم کیا ہوا ہے۔

حبیب بینک نے اس میدان میں قابل فخر کامیابیاں حاصل کی ہیں متعدد اہم قومی چیمپئن شپ جیتنے کے علاوہ اس کے کھلاڑیوں کی ایک بڑی تعداد بین الاقوامی سطح پر جانی پہچانی جاتی ہے۔ بینک کی ان سرگرمیوں میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس اور اسکواش شامل ہیں۔

حبیب بینک اپنے کھلاڑیوں کے مستقبل سے بھی غافل نہیں۔ انہیں بینکاری کے قواعد وضوابط بھی سکھلائے جاتے ہیں تاکہ جب وہ کھیل سے عملاً ریٹائر ہوں تو انہیں روزگار کے مستقل مواقع فراہم رہیں۔

حبیب بینک لمیٹڈ

سلام پھیرنے وہ آپ کو دیکھ کر متبسم ہوتے اور آپ سے مصافحہ کرکے آپ کو ساتھ اُٹھا کر اُسی جگہ لے جاتے جہاں سے نظام الدین اُٹھ کر آپ کے پاس تشریف لاتے ہوتے تھے۔ اور پھر مسجد کی اُس جگہ بیٹھ کر شرعی باتیں کرنے لگتے۔ دونوں درویشوں کی پالکیاں مسجد کے باہر کھڑی ہوتی تھیں اور جب انہوں نے واپس جانا ہوتا تو پالکیوں کے پاس پہنچ کر آپس میں اصرار کرنے لگتے کہ پہلے وہ پالکی میں سوار ہوں اور اکثر یوں ہوتا کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کا اصرار غالب رہتا اور مجبوراً پہلے شاہ رُکن عالم ملتانی کو پالکی میں سوار ہونا پڑتا۔ اُن دونوں بزرگانِ دین کی آپس میں چاہت قابلِ رشک بھی اور آج کل کے علما کے لیے قابلِ تقلید بھی۔

سندھ کا ایک عابد بھی آپ کی خانقاہ میں دینِ حق کی تعلیم کے لیے ٹھہرا ہوا تھا اور آپ سے فیض یاب ہو رہا تھا۔ وہ دن رات آپ کی خانقاہ میں عبادت اور ریاضت میں وقت گزارتا۔ خانقاہ کا لنگر عظیم الشان تھا اور وہاں کسی قسم کی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ لہٰذا خانقاہ میں ٹھہرے ہوتے درویش ہر قسم کی فکر سے آزاد پوری تندہی سے خدا کی عبادت میں مشغول رہتے۔

سندھ کا وہ درویش جب ایک مرتبہ حج کی نیت سے آپ کی خانقاہ سے نکل کر مکہ کے سفر پر روانہ ہوا اور وہاں غلے کو گراں دیکھ سخت پریشان ہوا۔ غلہ کی گرانی کے سبب اُسے مکہ میں صرف ایک روٹی کھانے کو ملتی۔ جبکہ اُسے شاہ رکن عالم کی خانقاہ میں چار چاور روٹیاں کھانے کو مل جاتی تھیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ شخص سخت دل برداشتہ ہو گیا۔ اُس کی پریشانی وہاں ٹھہرے ایک اور بزرگ سے چھپی نہ رہ سکی۔ انہوں نے اُس سندھی سے کہا "جناب آپ جس خانقاہ سے آتے ہیں وہاں کا نگران و مالک بہت سخی اور فیاض ہے۔ جس کی بدولت خانقاہ کا لنگر دن رات جاری رہتا ہے۔ لیکن یہاں یہ صورت نہیں۔ مَیں آپ کی پریشانی بہت دنوں سے محسوس کر رہا ہوں اور آپ کو اس بات کی خوشخبری دوں کہ آپ کے وہ فیاض اور سخی مُرشد ہر جمعہ کو خانقاہ سے یہاں تشریف لاتے ہیں۔ آپ اُن سے مل کر اپنی مشکل حل کروا سکتے ہیں۔" یہ سُن کر وہ سندھی عابد بھی خوش ہو گیا اور شدت سے جمعہ کا انتظار کرنے لگا۔ چنانچہ جب جمعہ کی شب شاہ رکن عالم مکہ تشریف لاتے تو اُن سے سب سے پہلے ملنے والوں میں وہ سندھی عابد تھا۔ اُس نے آپ کے حضور اپنی مشکل بیان کی تو آپ مُسکرا پڑے اور کہا "چار روٹیوں کے لیے اس قدر پریشانی۔ خیر جاؤ اطمینان رکھو تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق کھانا ملتا رہے گا۔"

اور پھر کچھ دیر بعد ہی اُس سندھی عابد کے حُجرے میں ایک شخص خوان لے کر آیا جو انواع اقسام کے کھانوں سے لبالب بھرا تھا۔ کھانا لانے والے نے اُس سندھی عابد سے کہا "شیخ رکن عالم کے حکم سے آج سے تمہیں دن رات تمہاری قیام گاہ پر کھانا پہنچتا رہے گا۔ تم اطمینان رکھو۔"

شاہ رکنِ عالم نے اپنے دور میں لاتعداد بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ہندوستان کی مسند پر جب محمد شاہ تغلق بیٹھا تو اُسے ملتان کی سرکشی کا علم ہوا۔ اُس نے ملتان کی بغاوت کو فوراً کچلنے کے لیے حکم جاری کر دیا کہ فوراً لشکرِ جرار تیار کیا جائے اور ملتان پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک عظیم لشکر شاہ محمد تغلق کی زیرِ نگرانی دلی سے ملتان کی طرف بڑھا اور ملتان میں داخل ہوتے ہی عوام کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ حضرت شاہ رکن ملتانی کو جب تغلق لشکر کی اس حشر سامانی کا علم ہوا تو انہوں نے بے گناہ عوام کے قتلِ عام کو رُکوانے کی خاطر حُجرے سے ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے لشکر کی طرف جانے لگے۔ شاہ محمد تغلق نے جب آپ کو یوں ننگے پاؤں دوڑتا اپنی طرف آتے دیکھا تو گھبرا کر آپ کی طرف بڑھا۔ آپ نے اُسے پاکر چلا کے کہا "تغلق یہ تو کیا کر رہا ہے۔ بندگانِ خدا کا کیوں ناحق خون بہا رہا ہے۔ اگر تو نے یہ عمل یونہی جاری رکھا تو یاد رکھ خدا کا عتاب تجھ پر نازل ہوگا۔"

محمد تغلق آپ کی بات سُن کر کانپ اُٹھا اور اُس نے اُسی وقت اپنے لشکر کے سالارِ اعظم کو حکم جاری کیا کہ ملتان میں قتلِ عام فوراً روک دیا جائے۔ اس طرح آپ کی وجہ سے شہرِ ملتان تباہی و بربادی سے بچ گیا جو تغلق کے ہاتھوں انجام پانے والا تھا۔

شاہ رکنِ عالم نے غیاث الدین تغلق کے زمانے میں آخری مرتبہ دلی کا سفر کیا۔ غیاث الدین تغلق ملتان میں رہا کرتا تھا لیکن جب شہنشاہ بنا تو دلی جا بیٹھا۔ اُسے شیخ بہاالدین اور آپ کی اولاد سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ ایک رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ بہاالدین بنفسِ نفیس اُس کے خواب میں آتے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ ہمارے لیے ایک مقبرہ تعمیر کرو۔ سلطان نے صبح اُٹھتے ہی شیخ زکریا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوتے ملتان میں ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کروایا جو آج بھی برصغیر کی اہم اور خوبصورت عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔

شیخ علم الدین، شیخ بہاالدین زکریا کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ سلطان اس ناطے بھی آپ کی بہت عزت کرتا تھا۔ ویسے بھی وہ ایک
عبادت گزار اور باعمل بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ دربار میں شیخ علم الدین نے سلطان سے مصافحہ کیا تو اُس کی نبض پر ہاتھ پڑتے ہی انہیں
زہ ہوگیا کہ جلد ہی سلطان کے پیٹ میں درد اُٹھے گا۔ شیخ علم الدین علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ انھیں بادشاہ کے جب
ارادے کا علم ہوا کہ وہ آج شکار کی نیت سے جنگل جارہا ہے تو آپ نے بادشاہ کے ایک خاص درباری کو قریب بلا کر کہا کہ جنگل میں
لان کے پیٹ میں گرانی ہوگی لیکن تم لوگ پریشان مت ہونا اور اُونٹنی کے دُودھ میں فلاں دوا ملا کر انہیں کھلا دینا۔ اللہ نے چاہا تو وہ
پا جائیں گے۔

چنانچہ بادشاہ شکار کھیلنے کے لیے جنگل کی طرف چلا اور جنگل میں شکار کھیلتے کھیلتے اُسے پیٹ میں سخت درد کا احساس ہوا۔ بادشاہ
سے ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ اُس درباری کو اس کا علم ہوا تو وہ اُونٹنی کے دُودھ میں حضرت شیخ علم الدین کی بتائی دوا ملا کر فوراً بادشاہ کے
سے گیا اور اُسے کھانے کے لیے کہا۔ بادشاہ نے جوں ہی دوا لی اس کا درد ایک دم ختم ہوگیا۔ بادشاہ حیرت زدہ ہو کر بولا "ارے یہ تو
سمان ہوگیا۔"

وہ درباری یہ سُن کر بولا "بادشاہ سلامت جادُو سمان نہ کہیں بلکہ اُسے کرامت قرار دیں۔" پھر اُس نے بادشاہ کو وہ تمام ماجرا کہہ سنایا کہ
طرح شیخ علم الدین نے اُسے بادشاہ کے اس درد کی بابت بتایا تھا اور دوا تجویز کرکے دی تھی جس سے واقعی بادشاہ کو افاقہ ہوا۔ بادشا
کر شیخ علم الدین سے بہت متاثر ہوا اور اُس کی عقیدت میں پہلے سے بھی زیادہ چاہت کا اضافہ ہوگیا اور وہ آپ سے بہت عقیدت و محبت
پیش آنے لگا اور زیادہ وقت آپ کی صحبت میں گزارنے لگا۔

ایک دن شیخ علم الدین بادشاہ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک بول اُٹھے "شیخ رکن عالم نے اُن کا حق مار رکھا ہے۔ کیونکہ وہ
ہاالدین کے پوتے ہیں جبکہ میں اُن کا بڑا صاحبزادہ ہوں۔ سجادہ نشینی پر میرا حق اُن کی نسبت کہیں زیادہ ہے جبکہ شاہ رکن عالم، علم سے
اری ہیں اور ظاہری علوم پر تو ذرا برابر دسترس نہیں رکھتے۔"

بادشاہ شیخ علم الدین کی باتیں خُوب سمجھ رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ شیخ علم الدین اپنی سجادگی کا فیصلہ بادشاہ کے ذریعے کروانا چاہتے ہیں۔
وہ چونکہ شیخ علم الدین سے بھی بے پناہ محبت رکھتا تھا اس لیے اُس نے فوراً شیخ رکن عالم کو دلی بلوا بھیجا۔ شیخ رکن عالم کو بھی اپنے کشف
ذریعے علم ہوچکا تھا کہ بادشاہ نے کس نیت سے بلوایا ہے۔ چنانچہ آپ نے دلی کی فوراً تیاری کی اور دلی کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ قطب الاقطاب
پہنچ کر بادشاہ کے دربار میں گئے تو وہاں انہوں نے شیخ علم الدین کو بادشاہ کے پہلو میں بیٹھے دیکھا تو سب کچھ جان گئے۔ آپ نے بادشاہ
مصافحہ کرنے کے بعد اپنی نشست سنبھالی اور بادشاہ سے گفتگو شروع کردی۔ شیخ علم الدین کچھ دیر تو خاموش بیٹھے رہے اور پھر انہوں
دفعتاً بادشاہ سے کہا "میں شیخ رکن عالم سے تین مسئلے دریافت کرنا چاہتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ شیخ رکن عالم ان کا جواب نہ دے پائیں گے۔"
آپ نے سجادگی کے لیے بیقرار اپنے عم زاد پر نظر ڈالی اور مسکرا کر کہا "شیخ علم الدین ہمیں سجادگی کی کوئی خواہش نہیں اور اگر تمہیں بحث کرنے
کی ہی چاہ ہے تو ہم بازار سے ایک غلام خرید کر آپ کو لا دیتے ہیں۔ اُس سے جس قدر چاہیں جب تک خواہش ہو بحث فرماتے رہیں۔"

چنانچہ اگلے دن آپ نے منڈی سے ایک غلام خریدا اور اُسے آزاد کرکے ساتھ لے آئے۔ اپنی رہائش گاہ آکر آپ نے اپنے سب سے
مرید حمیدالدین حاکم سے کہا اپنا لعاب دھن اس غلام کے مُنہ میں ڈال دو۔ حمیدالدین حاکم نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور اُسی لمحے غلام نے
یں کیا کہ جیسے دُنیا و جہان کے اسرار اُس پر منکشف ہوگئے ہیں اور اس کا سینہ اسرارِ الٰہی سے منوّر ہوچکا ہے۔ شیخ شاہ رکن عالم نے اس غلام
شیخ محمد رکھا اور اگلے دن اُسے غیاث الدین تغلق کے دربار میں اپنے عم زاد شیخ علم الدین سے بحث کروانے لے گئے۔

چنانچہ دربار جو شاہی افراد اور دُوسرے درباریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس دلچسپ مناظر کو دیکھنے کے لیے بیقراری سے انتظار کر رہا
پھر جیسے ہی علم الدین نے شیخ رکن عالم کے اُس غلام کی طرف دیکھ کر سوال کرنا چاہا تو اُن کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہوگئی ہو۔ انہیں اپنا
ادف ہوتا محسوس ہوا اور جو کچھ وہ پُوچھنا چاہتے تھے سب کچھ بھول گئے۔ شیخ علم الدین کو اس بات سے سخت شرمندگی ہوئی اور وہ

اُسی وقت دربار سے نکل کر باہر کھڑے ہوئے ہاتھی پہ سوار ہوتے اور گھر کی طرف چل دیتے۔ اگرچہ شاہ رُکن عالم کا دلی آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور انہوں نے اپنے عم زاد شیخ علم الدین کو اُس کی خوش فہمی سے نجات دلوا دی تھی۔ لیکن اب بھی وہ کسی اہم کام کے منتظر تھے۔ کسی اہم واقعہ کی راہ دیکھ رہے تھے افسردہ سے ملول سے انتظار کی کیفیت میں۔

جس زمانے میں شاہ رکنِ عالم دلی میں قیام پذیر تھے اُن دنوں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ صحت روز بروز گرنے لگی تھی۔ آخری لمحات قریب نظر آ رہے تھے۔ آپ کو اس بات کا علم ہوا تو فوراً نظام الدین اولیاؒ کی عیادت کے لیے اُن کی خانقاہ میں پہنچے۔ وہاں انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ ہر سُو اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ خانقاہ کا لنگر لٹوایا جا چکا تھا۔ مریدوں اور عقیدت مندوں کے چہروں سے پریشانی، اداسی و غم کی کیفیت صاف عیاں تھی۔ آپ بھی افسردہ سے خواجہ کے حُجرے میں داخل ہوتے اور آپ کی علالت دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ خواجہ نے اُنہیں دیکھا تو بولے "رُکنِ عالم ہم نے رسول اللہ کو فرماتے سُنا ہے کہ نظام ہمیں تجھ سے ملنے کی بڑی چاہ ہے۔"

اور پھر کچھ دیر بعد آپ کی سانسیں بند ہو گئیں۔ ماحول پہ ایک بے نام سا سکوت طاری ہو گیا۔ اور یوں سلوکِ طریقت کا ایک سورج غروب ہو گیا۔

جنازے میں بادشاہ، امراء، عقیدت مند غرض ہر شخص شریک تھا۔ سبھی کے گریبان چاک اور بال اُلجھے ہوتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے سبھی خاموشی سے چلتے جا رہے تھے۔ جبکہ شاہ رکنِ عالم روتے بھی جاتے اور فرماتے بھی جاتے "واہ رے میرا اعزاز۔ اللہ رے میرا اعزاز۔"

اس سانحۂ عظیم سے غم زدہ شاہ رُکن عالم اب جلد از جلد دلی کی فضاؤں سے نکل جانا چاہتے تھے لیکن اُنہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نظام الدین اولیاءؒ انہیں روک رہے ہوں اور وہ مصلحت سمجھ کر وہیں رُک گئے۔ چند دنوں بعد انہیں اندازہ ہوا کہ انہیں دلی کیوں روکا جا رہا تھا۔ امیر خسرو کا جنازہ آپ کا منتظر تھا۔ نمازِ جنازہ پڑھا کر آپ دلی سے رخصت ہوتے اور دلی سے کہتے جاتے "افسوس دلی تیرا عروج کا دور ختم ہوا۔ تیرا سورج غروب ہو گیا۔"

شاہ رکنِ عالم نے انوار و تجلیات میں آنکھ کھولی اور انوار و تجلیات میں ہی نشو و نما پائی۔ آپ کی شان بڑی شان تھی۔ آپ کا جسم عشق کی آگ، حقیقی محبت، عشقِ الٰہی اور خوفِ خدا سے تپتا رہتا۔ آپ ریاضتوں اور مجاہدوں میں وقت صرف کرتے لیکن پھر بھی تپ محرقہ کی کیفیت سے نجات نہ پا سکے۔ یہ گرمی یہ خُدا کا خوف آپ کے مزاج سے کبھی علیٰحدہ نہ ہوا۔ آپ کے فیض کا دریا ہر وقت جاری و ساری رہا اور بندگانِ خدا اس سے فیض یاب ہوتے رہے۔

شاہ رکن عالم نے بہت سے سفر اختیار کیے اور دینِ حق کے عروج کے لیے دن رات محنت مشقت اُٹھائی۔ آپ اپنے سفر میں علماء سے بھی ملتے اور شاہوں سے بھی۔

۷، جمادی الاول ۷۳۵ ہجری کے دن آپ اس دُنیا سے وصال پا گئے اور یوں شریعت طریقت کا ایک چمکتا دمکتا آفتاب اپنی رعنائیوں کے ساتھ غروب ہو گیا۔

آپ نے اپنی روحانیت سے ہندوستان کی کایا پلٹ دی۔ ایک دُنیا نے آپ کے ہاتھ پر بیعت لی۔ آپ کی مدد سے لاکھوں گناہ گاروں نے توبہ کی اور راہِ حق کی جستجو میں کامیاب ہو کر فلاح پائی۔ بے نمازیوں نے صوم و صلوٰۃ کی پابندی اختیار کی۔ بدکاروں نے پیچھا چھڑوایا۔ آپ کی عبادت گزاری اور معاملات کی یہ برکتیں ہی تھیں جن سے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی میں سچائی اور دیانت کی جھلک پیدا ہوئی۔

...یہ سوانح عمری حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی ہے. جنہوں نے راہِ حق میں اپنے لہو کا نذرانہ دیا اور تاریخِ اسلام میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا.

...ظالم اور جابر سلطان کے آگے کلمۂ حق ادا کرنے کی جو نظیر اس بطلِ جلیل، روحِ جمیل اور فطرتِ خلیل، امام حنبلؒ نے پیش ...کی مثال ملنا مشکل ہے. یہ واقعات اُس برگزیدہ ہستی کے ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں وہ ظلم و ستم سہے کہ سُن کر روح تڑپ ...دل غم سے بوجھل ہو جائے.

...دن قیامت سے کم نہ تھا جب لوگوں نے دیکھا کہ اُن کا محبوب اللہ کا برگزیدہ بندہ. بیڑیوں میں جکڑا. سڑکوں پر گھسیٹا جا رہا ہے ...نے اندھیری رات کے بھٹکے گمراہوں کو سیدھا راستہ دکھایا. جس نے اُن کے دلوں کی سیاہی دھوتے دھوتے اپنے ہاتھ شل کر لیے ...زنجیروں میں جکڑا ظالم حاکم کے دربار میں لے جایا جا رہا ہے. شمشیر بکف سپاہیوں کے ہجوم میں آہنی حلقوں میں جکڑا عزم و استقلال ...رہا ہے. لوگوں میں ضبط کا یارانہ نہ رہا تھا. حلق میں تھمی چیخیں نکلیں تو فضا آہ و زاری کے شور سے گونج اٹھی. وہ پھوٹ پھوٹ ...تھے. دل کے زور سے اُن کے اندر کا غم چیخ بن کر حلق سے نکل رہا تھا.

...وار ہجوم آپ کی مدد کو بڑھا لیکن سپاہی بھی کم غافل نہ تھے: آتشیں ہتھیاروں سے لیس تھے. انھوں نے مظاہرین کو، جوش میں ...عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کے، ہجوم کو روکنے کے لیے دُور دُور تک ایک آتشیں لکیر کھینچ دی.

...چلا چلا کر پکار رہے تھے: اے حق پرست! تیرا سر بلند رہے گا. جابر سلطان تجھے نہ جھکا سکیں گے تو آج بھی سرفراز ہے کل بھی تیرا اقبال بلند رہے گا. ...نے والے خود اپنے قتل نامے تیار کر بیٹھے ہیں. تیرا لہو اپنا حساب لے گا. ہم بدقسمت تیرے ہمراہ نہ چل سکے. آزمائشوں میں تیرا ساتھ نہ دے سکے. مگر ہمارا ...ہمراہ ہے. تیری ابدی جلال کی کیا شان ہے. اس سے ناآشنا بدقسمت اور بدنصیب ہیں."

...نے زور سے پکار کر کہا: "ہر چیز فنا ہونے والی ہے. میرے مرنے کے بعد اپنے گھروں کو ہرگز ماتم کدہ نہ بنانا. کیونکہ ایسا ہونا ہے. ہر چیز فانی ہے اُسے ...سوائے خدا کی ذات اور اُس کے کلام کے. جو لافانی ہے. مَیں کلام اللہ کا پرچار کرتا رہوں گا، چاہے میرا جو بھی حشر ہو......"

...آپ نے مزید کچھ کہنا تھا مگر ہمراہ سپاہی، ہجوم کے تیور بھی خوب جان رہے تھے، وہ ڈر رہے تھے. انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں اس حق پرست کے

لفظوں کی حرارت سے بغاوت کے شعلے نہ بھڑک اٹھیں۔ تاریخ کا یہ عجیب و غریب انداز ہے کہ جب بھی عوام کی تلاش میں کسی فقیرِ راہ نشین کے گرد زخم خوردہ انسانوں کی بھیڑ لگی ہے، ایوانِ حکومت میں زلزلہ آگیا ہے اور فوری طور پر یہ تاثر لیا گیا ہے کہ حاکمِ وقت کے خلاف منصوبہ سازی کی جا رہی ہے۔ آج پھر اسی انداز میں تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

آج جس شخص کو پابہ زنجیر کیا گیا تھا اسے لوگ دیوانگی کی حد تک چاہتے تھے۔ جب انہیں خبر ہوئی کہ ان کا پسندیدہ انسان اپنی حق گوئی کے جرم میں خلیفۂ وقت کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والا ہے تو وہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اس حالت میں باہر نکل آئے کہ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور چہرے حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ خلیفہ کے حاشیہ برداروں کو قیدی کی عظمت و ہردل عزیزی کا اندازہ نہ تھا۔ وہ اسے محض ایک فاقہ کش عبادت گزار سمجھتے تھے۔ مگر آج ایک گوشہ نشین مفلس کے نام لیواؤں کا ہجوم دیکھ کر ان پر دہشت طاری ہوگئی تھی۔ انجام کار خلیفہ کے مسلح سپاہیوں نے انسانوں کے سیلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

اب وہ نسبتاً ایک پُرسکون شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ اچانک ایک قیدی نے دوسرے قیدی کو دیکھا۔ اسے بھی چند سپاہی کھینچتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔ دونوں قیدی تھے مگر ان کی منزلیں مختلف تھیں۔ ایک کو دربارِ خلافت میں پیش ہونا تھا اور دوسرے کو عدالت میں۔ ناگہاں دوسرا قیدی چیخا: "رک جاؤ، مجھے اس شخص سے ایک ضروری کام ہے۔" سپاہی ٹھہر گئے۔ چند لمحوں بعد پہلا قیدی نزدیک آگیا۔ دوسرے قیدی نے سپاہیوں سے درخواست کرتے ہوئے کہا: "میں اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میری طرح یہ بھی مجرم ہے لیکن میرے اور اس کے جرم میں بڑا فرق ہے۔"

سپاہیوں نے اسے غور سے دیکھا: "کیا تو اس شخص کو جانتا ہے؟"

لہجہ انتہائی تحقیر آمیز تھا: "یہ خلیفہ کا معتوب ہے۔ اس کے ساتھ کوئی محبت سے پیش نہیں آسکتا۔"

"اسے کون نہیں جانتا؟" دوسرے قیدی نے کہا: "ہم سب اس کے علم کے سائے میں جیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مڑا: "میں آپ کے مقدس ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں مگر قانون کے محافظوں کی نظر میں میرے ہونٹ اس قابل نہیں۔"

پہلے قیدی نے اپنے مخاطب پر نظر ڈالی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے محروم تھا: "آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں بغداد کا مشہور ڈاکو ابوالہیثم ہوں۔ میری پیٹھ پر بے شمار کوڑوں کے نشانات ہیں۔ میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں اور میں جرم کی زندہ علامت بن کر رہ گیا ہوں۔ میری سیاہ بختی کا یہ عالم ہے کہ مجھے دیکھتے ہی لوگ میرے گناہوں کی حقیقت جان لیتے ہیں۔ قانون چاہتا ہے کہ میں آیندہ کے لیے توبہ کر کے تمام انسانوں کی قطار میں شامل ہو جاؤں لیکن مجھے انفرادیت کی زندگی پسند ہے۔ اگر لوگ میرے دونوں پاؤں بھی جسم سے علیحدہ کر دیں تو میں بستر پر لیٹے لیٹے یہ تمنا کرتا رہوں گا کہ کاش میں اس قابل ہوتا اور ایک بار پھر یہ جرم کر سکتا۔" اتنا کہہ کر ابوالہیثم نے اس قیدی کی طرف دیکھا جس کی گرفتاری پر حکومتِ وقت نے اپنی پوری توانائی صرف کر دی تھی۔

"میری یہ استقامت شیطان کی راہ میں ہے مگر آپ منزلِ حق کے مسافر ہیں۔ میرے صرف اپنی ذات کو ہلاک کیا ہے لیکن آپ کی لغزش ساری دنیا کو تباہ کر ڈالے گی۔ خدا آپ کے قدموں کو آزمائش کے راستے میں جمادے کہ آپ دل کی آخری امید ہیں۔" جوشِ جذبات میں ابوالہیثم کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ سپاہیوں نے اسے جھٹکا دے کر کھینچا، زنجیریں بج اٹھیں۔ ابوالہیثم جاتے جاتے مڑا: "امام! خدا حافظ۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بغداد کا رسوائے زمانہ قزاق جا چکا تھا مگر فضا میں اس کے الفاظ کی گونج اب بھی باقی تھی۔ قیدی کے چہرے پر کئی رنگ آکر ڈوب چکے تھے اور اب وہ پہلے سے زیادہ پُرسکون نظر آرہا تھا۔ سپاہیوں کو بھی ایک ڈاکو کی جرأت کا مظاہرہ دیکھ کر شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا مگر وہ خلیفہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں بہرحال اس شخص کو زنجیریں پہنا کر دربار میں حاضر کرنا ہی تھا جس نے ایک آمر کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

آخر وہ سنگین لمحہ آپہنچا ــــ دربار میں بیڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ خلیفہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا، قیدی سامنے کھڑا تھا۔ سپاہیوں کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے وہ کسی ناقابلِ تسخیر دشمن کو شکست دے کر لوٹے ہوں۔

"بے خبر عوام تمہیں اپنے روحانی پیشوا کا درجہ دیتے ہیں مگر تم مذہبی آداب سے اس حد تک ناآشنا ہو کہ اپنے امیر کو سلام نہیں کیا۔" خلیفہ نے قیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ طنز کا نشتر تھا۔

"سلام ایک کلمۂ خیر ہے" قیدی نے باوقار لہجے میں جواب دیا۔ "میں ظلم اور جہل پر سلامتی نہیں بھیج سکتا۔"
اقتدار کی پیشانی پر ابھرنے والی شکن گہری ہو چلی تھی مگر خلیفہ نے بڑی ہوشیاری سے جذبات پر قابو پایا۔ وہ اپنے فیصلے
کو منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ "دربار کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ تمہیں خلیفہ کے احترام کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔"
اس نے دوسرے انداز سے گرفت کی۔
"سر جھکانے کو احترام نہیں کہتے۔" قیدی کے لہجے کی بے باکی بدستور تھی۔ "وہ جو شہنشاہوں کا شہنشاہ تھا اس نے بھی
ایسے کافرانہ احترام کا حکم نہیں دیا۔ پھر میں کون ہوں کہ اس بدعت کو جائز قرار دوں۔"
"ہمیں تمہاری یہ گستاخیاں بھی گوارا ہیں اگر تم قرآن کو مخلوق تسلیم کر لو۔" خلیفہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا
مگر اس نے اتمامِ حجت کی خاطر اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔
"خالق کا کلام مخلوق کس طرح ہو سکتا ہے؟" قیدی نے اپنی دلیل پیش کر دی۔
"یہ سب علم و فضل کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔" خلیفہ نے ان علماء کی طرف اشارہ کیا جو اس کے عقیدے
کو تسلیم کر چکے تھے اور نتیجتاً دربار کی آراستہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔
قیدی نے ان فاضل شخصیتوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جن کا خلیفہ نے حوالہ دیا تھا۔
"جب یہ قرآن کو علی الاعلان مخلوق کہتے ہیں تو پھر تمہارے علم کا کس دنیا سے تعلق ہے؟ کیا ان کی رائے سند کا درجہ
نہیں رکھتی؟" خلیفہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اب آہستہ آہستہ اس کے ارادے بے نقاب ہوتے
جا رہے تھے۔
"مجھے ان حضرات کی علمی فضیلت پر کوئی شک نہیں۔" قیدی کا تحمل قابلِ دید تھا۔ "مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ میں
دنیا میں سب سے کم علم انسان ہوں مگر قرآن کو مخلوق تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ حی و قیوم کا کلام ہے اسے کسی حال میں بھی موت
نہیں چھو سکتی۔" بالآخر قیدی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے کسی عالم کی تضحیک نہیں کی تھی۔ بس اپنا نقطۂ نظر واضح الفاظ میں بیان کر
دیا تھا۔
"میں تم پر اپنے بیٹے سے بھی زیادہ مہربان ہو سکتا ہوں اگر تم قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کر لو۔" خلیفہ نے قیدی کو اسیر کرنے
کے لیے نیا دام پھیلایا تھا۔ اس جال کے پھندے بظاہر ریشم سے بھی زیادہ نرم تھے مگر حقیقت میں ان کی سختی کے آگے آہنی
حلقے بھی ہیچ تھے۔ "میں اپنے ہاتھ سے تمہاری بیڑیاں کاٹوں گا۔" خلیفہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر تم مملکت
اسلامیہ کی سب سے محترم شخصیت بن جاؤ گے۔" اقتدار نے ایک بوریا نشین کو سب سے بڑی پیش کش کر دی تھی۔
"مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔ میں اس قدر عزت افزائی کو کس طرح برداشت کر سکوں گا؟" قیدی نے بے نیازی کے ساتھ
تمام عنایات کو ٹھکرا دیا۔
"پھر ایسے عاقبت نااندیش کو ہلاکت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" خلیفہ کے چہرے پر پڑا ہوا تہذیب و اخلاق کا خول اتر گیا
اس نے شدید حالتِ غضب میں تازہ دم جلادوں کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ طاقت وربازو بلند ہوتے۔ سفاکی کی صلاحیتوں کا بھرپور
استعمال کیا گیا۔ دربار کی ساکت فضا کوڑوں کی آواز سے لرز اٹھی۔ قیدی کی پشت پر تازیانے برس رہے تھے۔
"اے دلوں کے تھامنے والے! تو نے اپنے بندوں سے اسی دن کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔ میری دستگیری
فرما۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ آج کے دن مجھے تنہا نہ چھوڑ۔" کوڑوں کی خوفناک آوازوں میں قیدی کی صدائیں بھی شامل تھیں جس
نے تمام عمر پرستش کی تھی آج وہ اسی ذات کو پکار رہا تھا۔ مزاجِ شاہی اور برہم ہو گیا۔ تشدد کی لے اور تیز ہو گئی۔
خلیفہ کا خیال تھا کہ وہ مسلسل ضربوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا دے گا مگر قیدی ایک بار پھر اپنے معبود سے سرگوشیاں کر رہا
تھا۔ "زمین و آسمان فانی، مکین و مکاں فانی، تو باقی، تیرا کلام باقی، تو بھی جلیل و جمیل، وہ بھی جلیل و جمیل۔" آمرِ وقت ان کلمات
کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر انسانی قہر و غضب نے وحشت کا رنگ اختیار کر لیا اور جبر و ستم حد سے گزر گئے۔ جلادوں نے اپنے فن
کے مظاہرے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ قیدی اپنے خون میں نہا چکا تھا۔ تشدد میں کوئی کمی نہیں آئی۔ قیمتی پتھروں پر انسان
کا ارزاں لہو بہہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے قدموں پر کھڑا رہا۔ مگر کب تک؟ ناتوانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ قوتِ ارادی زائل ہونے
لگی۔ بالآخر وہ مردِ باخدا بے ہوش ہو گیا۔

خلیفہ کو یقین تھا کہ قیدی اب زیادہ دیر تک ثابت قدم نہیں رہ سکے گا۔ جلاد اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ خلیفہ کے اشارے پر اس کے سامنے پانی سے بھرا ہوا برتن پیش کیا گیا۔ پیاس کی شدت سے قیدی کی زبان خشک ہو چکی تھی۔ اس نے پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر دوسرے ہی لمحے ہاتھ کھینچ لیا۔ "میں روزے سے ہوں" دربار میں زخمی کی باوقار آواز گونجی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ خلیفہ کی جانب بے نیازانہ دیکھا۔ اہلِ دربار کی کیفیات کا جائزہ لیا۔ پھر جلادوں سے پوچھا "کیا وقت ہوا ہے؟"

"ظہر کا" جواباً کہا گیا۔

"مجھے نماز کی مہلت دی جائے" قیدی نے درخواست کی۔ اس موقع پر اس کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ خلیفہ نے اجازت دی۔ زخمی نے اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی۔ وہ عام دنوں میں بہت سکون سے اپنے خالق کی عبادت کیا کرتا تھا مگر آج اس کی جسمانی حرکات میں اضطراری کیفیت تھی۔ عملِ نماز معمول سے نسبتاً تیز تھا۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں خلیفہ اور درباری اس کے صبر و سکون کو تاخیری حربوں کا نام نہ دیں اس لیے وہ اپنی فطرت کے خلاف جلد بازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ قیدی نے نماز ختم کی۔ بہت مختصر دعا مانگی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سجدے کے بعد فرش پر ہاتھوں کے خوں رنگ نشانات ابھر آئے تھے۔

"تم لوگ اپنا کام جاری رکھو" قیدی جلادوں سے مخاطب ہوا۔ "میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ تم بھی اپنا فرض پورا کرو۔ فرض کی تکمیل ہی اقرارِ بندگی ہے۔"

اس سے پہلے کہ خلیفہ جلادوں کے لیے مشقِ ستم کا نیا حکم جاری کرتا، ایک درباری عالم درمیان میں بول پڑا "جب تمہاری نماز ہی ادا نہیں ہوئی تو پھر فرض کی ادائیگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟" بغداد کا مشہور فقیہ ایک لہولہان قیدی سے مخاطب تھا "تم نے اس وقت نماز ادا کی جب تمہارے پورے بدن سے خون بہہ رہا تھا۔ شرعی مسئلے کے اعتبار سے نہ تمہارا وضو برقرار رہا اور نہ جسمانی طہارت۔ پھر یہ کیسی نماز تھی؟"

خلیفہ اور دیگر اکابرینِ دربار قیدی کی اس گرفت پر مسکرانے لگے۔ ان کے خیال میں وہ موت کے خوف سے بدحواس ہو گیا تھا اور پھر اس نے اسی دہشت کے عالم میں نماز ادا کر لی تھی۔ قیدی کی اس غلطی نے خلیفہ کے کام کو مزید آسان بنا دیا تھا۔

"میں فقہ کے مسائل نہیں جانتا" قیدی کی آواز بدستور پرسکون تھی۔

"پھر تمہیں کس نے مسندِ امامت پر بٹھایا ہے؟" دوسرا فقیہ تیز لہجے میں بولا۔

"میں آج تک کسی مسند پر نہیں بیٹھا" قیدی اب تک روایتی تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ "میں صرف ایک خاک نشین ہوں اور خاک ہی میری مسند ہے۔"

"چرب زبانی تمہاری غلطی کی پردہ پوشی نہیں کر سکتی" پہلے فقیہہ نے قیدی کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی اپنی اس نکتہ طرازی کی داد پانے کے لیے خلیفہ کی طرف دیکھا۔ آمرِ وقت اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ قیدی کے زخمی جسم پر لپٹی ہوئی زنجیروں کے آہنی حلقے اور بھی تنگ ہوتے جا رہے تھے۔

"تمہیں اس کا پورا اختیار ہے کہ تم میرے ہر فعل میں خامیاں تلاش کرو" قیدی کا لہجہ تلخیوں اور نفرتوں سے پاک تھا۔ "میں اپنے عمل کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں مگر میں نے وہی کیا جس کا سبق مجھے فاروقِ اعظمؓ نے دیا۔ میرا امیر نماز فجر کے دوران زخمی ہوا اور اسی حالت میں اپنے فرض کو تکمیل تک پہنچایا۔" قیدی نے اپنی نماز کو درست ثابت کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کے لازوال عمل کا سہارا لیا تھا۔ جب دلیلِ آفتاب روشن ہوئی تو سطحی علم کے سارے چراغ بجھ گئے۔ خلیفہ حیران و پریشان تھا اور درباری فقیہوں کے چہرے مسخ ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ آمرِ وقت خلیفہ معتصم باللہ تھا۔ اور قیدی حضرت امام احمد بن حنبلؒ تھے جن کے خون سے تاریخِ اسلام کا اہم ترین باب لکھا گیا۔

●

حضرت امامؒ ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ بعض تاریخ نویسوں کا خیال ہے کہ آپ کی ولادت مرو میں ہوئی مگر معتبر روایت یہی ہے کہ حضرت امام احمدؒ بغداد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسمِ گرامی محمد بن حنبل تھا اور دادا کا نام حنبل بن ہلال۔ عام طور پر لوگ آپ کو حنبل کا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن یہ حضرت امامؒ کے دادا کا نام تھا جو آپ کے نام کے ساتھ قیامت تک

لیے وابستہ ہو گیا ہے۔ نسبی اعتبار سے حضرت امامؒ خالص عرب تھے۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں شیبانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ شیبان بھی عدنانی قبیلے کا دوسرا نام ہے جو معد بن عدنان کے واسطے سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے اس قبیلے کو اپنی شجاعت اور عزت کے سبب تمام عرب قبائل میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ عہدِ جاہلیت میں یہ خاندان عراق کے نزدیک آباد ہو گیا تھا۔ جب فاروقِ اعظمؓ نے شہر بصرہ کی تعمیر کی تو شیبان نے اس صحرائی علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ مشہور روایت ہے کہ جب حضرت امامؒ بصرہ تشریف لاتے تھے تو بنو شیبان کی ایک شاخ مازن کی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔ حضرتِ امامؒ سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ یہ میری آبائی مسجد ہے۔

تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت امامؒ کا خاندان مستقل طور پر بصرے میں مقیم نہیں رہا۔ آپ کے دادا خراسان منتقل ہو گئے تھے اور انہیں اموی عہدِ حکومت میں سرخس کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ پھر بساطِ سیاست پر عباسی خاندان ابھرا تو انہوں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں حضرت امامؒ کے دادا کو سخت اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ آپ کے والد محمد بن حنبل کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ وہ ایک سپاہی تھے، لیکن ابنِ جوزی نے تحریر کیا ہے کہ وہ فوجی دستے کے کماندار تھے۔ بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ محمد بن حنبل بنیادی طور پر ایک مردِ مجاہد تھے۔ اس زمانے میں عربوں کی ایک مخصوص عادت تھی کہ وہ لوگ کاشت کاری اور دوسرے ہنر مندانہ پیشوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں صرف اپنی جنگ جوئی اور سپاہ گری پر ناز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امامؒ کے والد بھی وقتی تقاضوں کے زیر اثر فوج میں شامل ہوئے تھے لیکن اپنے باپ حنبل بن ہلال کی طرح انہیں کوئی مخصوص عہدہ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔

حضرت امامؒ کے دادا نے اگرچہ عباسی حکومت کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اس راہ میں تکلیفیں بھی برداشت کی تھیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس وفاداری کے صلے میں خاندان کے کسی فرد کو شاہانہ انداز سے نہیں نوازا گیا۔ البتہ حضرت امامؒ کے چچا کو حکومت سے تھوڑی بہت قربت حاصل تھی۔ جب خلیفہ بغداد سے باہر ہوتا تو وہ بعض حکام کو تازہ ترین حالات سے باخبر رکھتے۔ یہی ان کی ذمے داری تھی اور اسی وجہ سے وہ سرکاری حلقوں میں کسی حد تک اثر و رسوخ رکھتے تھے۔

حضرت امامؒ بچپن ہی سے ایسے کاموں میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ ایک بار کسی حاکم نے آپ کے چچا سے پوچھا۔ "تم نے آج کی خبریں کیوں نہیں بھیجیں؟ میں امیر المومنین کو ایک ایک لمحے کی خبر دینا چاہتا ہوں پھر تم نے غفلت شعاری کا یہ مظاہرہ کیوں کیا؟"

"میں اپنے بھتیجے احمد کے ہاتھ ساری اہم خبریں آپ کی خدمت میں ارسال کر چکا ہوں۔ تعجب ہے کہ وہ آپ تک کیوں نہیں پہنچیں؟" چچا کو شدید حیرت تھی اور ساتھ ہی شرمندگی کا احساس بھی۔

تھوڑی دیر بعد حضرت امامؒ کو حاکم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت آپ بہت نو عمر تھے۔

"کیا میں نے تمہیں خبریں دینے کے بعد یہ نہیں کہا تھا کہ انہیں حاکم تک پہنچا دو؟" چچا نے بھتیجے سے سوال کیا۔

"ہاں! آپ نے مجھے خبریں دی تھیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میں انہیں حاکم کی خدمت میں پیش کر دوں" حضرت امامؒ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"پھر تم نے نافرمانی کیوں کی؟" چچا نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ خبریں؟"

"میں نے انہیں پانی میں پھینک دیا" حضرت امامؒ نے اس طرح کہا جیسے وہ کوئی فضول سی شے تھی اور اسے پانی میں غرق کر دینا ہی بہتر تھا۔

حاکم اور آپ کے چچا دونوں یہ جواب سن کر حیران رہ گئے۔ کچھ دیر کے لیے اُن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر حاکم نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت بُرا ہوا مگر میں اس لڑکے پر سختی بھی نہیں کر سکتا۔" حضرت امامؒ کی بے باکی نے اسکے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس واقعے سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ دربارِ خلافت اور حکامِ وقت سے آپ کے خاندان کے مسلسل تعلقات رہے لیکن حضرت امامؒ کو بچپن ہی سے یہ روش پسند نہیں تھی۔ آپ حیرت انگیز طور پر بااثر لوگوں سے دور رہتے تھے اور آپ کی اسی عادت کو دیکھ کر بعض اہلِ نظر نے سمجھ لیا تھا کہ مستقبل میں یہ لڑکا کسی نہ کسی عنوان اسلامی تاریخ پر اثر انداز ہو گا۔

حضرت امام احمدؒ کے نانا بنو شیبان کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ نہایت خلیق، سخی اور حوصلہ مند انسان تھے۔ عربوں کے لیے ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اکثر عرب قبائل ان کے گھر مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ اس قدر متواضع انسان تھے کہ اپنے مہمانوں کے لیے پُرتکلف دعوتوں کا اہتمام کرتے اور میزبانی کے فرائض انجام دیتے وقت کبھی ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ اسی طرح حضرت امامؒ کے دادا کو بھی دنیاوی عزت و آسائش حاصل تھی۔ وہ بنو امیہ کے دورِ حکومت میں گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا لیکن جب خاندانِ عباسیہ ایک نئی دعوت لے کر سیاست کے افق پر طلوع ہوا تو انہوں نے دل و جان سے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ عہدے سے بھی محروم ہوئے اور بے شمار آلام و مصائب بھی برداشت کیے۔ اگرچہ بعد میں خلافتِ عباسیہ ایک مستقل آزار بن کر رہ گئی تھی لیکن شروع میں حضرت امامؒ کے دادا اسے حق پر سمجھتے تھے اس لیے آخری سانس تک تعاون کرتے رہے۔ نسلی غیرت نے انہیں کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیا۔ حضرت امامؒ کے والد کا بھی یہی حال تھا۔ وہ غیرت و شجاعت کا بہترین نمونہ تھے۔ ہر وقت مجاہدوں کے لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ کئی بار میدانِ جنگ کا رخ کیا اور ہر مرتبہ فتح و نصرت نے ان کے قدم چومے۔ بالآخر اسی مجاہدانہ پیرہن کو اپنے جسم پر سجا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ حضرت امام احمدؒ ان ہی غیرت مند بزرگوں کی اولاد تھے۔

❋

آپ ابھی عہدِ طفلی سے گزر رہے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مادرِ مہربان پہلے ہی نہایت شفقت سے پیش آتی تھیں اب داغِ یتیمی کے بعد ان کی محبتوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد بہت مختصر تھی۔ صرف بغداد میں ایک مکان تھا یا اتنی زمین کہ جس سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی چنانچہ حضرت امامؒ نے فقر و قناعت کے ماحول میں پرورش پائی۔ مفلسی کی اس فضا میں یقیناً آپ کے بہت سے جذبے ناآسودہ رہ گئے مگر غربت نے حضرت امام احمدؒ کو صابر و شاکر انسان بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

آپ نے سب سے پہلے اسلامی معاشرے کی رسم کے مطابق حفظِ قرآن کی طرف توجہ دی۔ اپنے اس تعلیمی دور کے متعلق حضرت امامؒ خود فرماتے ہیں "میں ابھی بالکل بچہ ہی تھا کہ حفظِ قرآن کی سعادت سے سرفراز ہوا۔ چودہ سال کی عمر کو پہنچا تو تحریر و کتابت کی مشق کرنے لگا۔" یہ آپ کی ذہانت کا روشن ثبوت تھا کہ اس قدر نوعمری میں وہ مشکل مراحل طے کر لیے جن سے اکثر انسان جوانی میں بھی نہیں گزر پاتے۔ اسی زمانے کا ایک مشہور واقعہ اس طرح ہے کہ اسلامی لشکر کے سپاہی اپنی بیویوں کو خطوط لکھا کرتے تھے۔ یہ تمام خواتین حضرت امامؒ سے اپنے ذاتی خطوط پڑھواتی تھیں اور جب انہیں جواب دینا ہوتا تو آپ کے سامنے بلاتکلف اپنے جذبات اور مقاصد بیان کر دیتیں۔ حضرت امام احمدؒ عورتوں کے جذبات کو حرف بہ حرف کاغذ پر منتقل کر دیتے۔ آپ کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر فوجی کہا کرتے تھے۔

"یہ لڑکا کم سنی کے باوجود ایک شخص کا راز دوسرے تک نہیں کہتا۔ خط و کتابت میں اس نے اپنی طرف سے ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں کی۔ یہ کتنا بڑا امانت دار ہے۔"

اسلامی لشکر کا ایک اعلیٰ افسر رشید کہا کرتا تھا۔ "میں نے اپنے لڑکے کی تعلیم پر کافی دولت خرچ کی۔ اسے کئی نامور استادوں کے حوالے کیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اور احمد بن حنبل کو دیکھو۔ یہ یتیم بچہ اپنے حسنِ ادب اور ذہانت کے باعث کیسی قابلِ رشک شخصیت بن گیا ہے۔"

عام طور پر دنیا والے مادی وسائل کو سب کچھ تصور کرتے ہیں اور اس آفاقی اصول کو بھول جاتے ہیں ؎

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو!
کہ فطرت آپ کرتی ہے لالے کی حنابندی

قدرت اپنے اسی قانون کے مطابق اس لالۂ صحرائی کی حنابندی کر رہی تھی جو بچپن میں یتیم ہو گیا تھا اور جنہیں دنیا کی تمام سہولتیں میسر تھیں وہ اس دوڑ میں امام احمد بن حنبل سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ آپ کی ان ہی خوبیوں کو دیکھ کر ایک معروف شخص ہشیم بن جمیل نے کہا تھا۔

"اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو اہلِ زمانہ کے لیے حجت ثابت ہوگا۔"

❋

ابتدائی تعلیم سے فراغت پاکر حضرت امامؒ علمِ حدیث کی طرف راغب ہوئے۔ اس ذیل میں آپ نے سب سے پہلے قاضی ابو یوسفؒ کی درسگاہ کا رخ کیا۔ قاضی ابو یوسفؒ حضرت امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید تھے اور انہیں اپنے دور کے فقیہوں میں بلند ترین مقام حاصل تھا۔ حضرت امام احمدؒ بھی ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے اور یہی تاثر انہیں قاضی ابو یوسفؒ کی بارگاہ میں لے گیا تھا۔ آپ اکثر فرماتے تھے: "میں نے حدیث کا پہلا سبق ابو یوسفؒ ہی سے لیا تھا۔" مگر یہ سلسلہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ کچھ عرصے بعد ذہنی انقلاب نے آپ کو فقیہوں کے حلقے سے دور کر دیا۔ اب محدثین کی مجلسیں آپ کا مرکزِ نظر تھیں۔

حضرت امامؒ علمِ فقہ کے منکر نہیں تھے لیکن ہر حال میں حدیثِ مبارکہ ہی کے ذریعے تمام مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ اس نقطۂ نظر نے آپ کو محدثینِ کرام سے قریب تر کر دیا تھا۔ نتیجتاً آپ قاضی ابو یوسفؒ کی مجلس سے نکل کر بغداد کے نامور امامِ حدیث حضرت ہیثم بن بشیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی۔ حضرت امام احمدؒ نے ہیثمؒ کے علاوہ عمیر بن عبداللہؒ اور عبدالرحمٰن بن مہدیؒ سے بھی حدیثیں سنیں مگر بنیادی طور پر آپ ہیثمؒ ہی کے زیرِ اثر تھے۔ چار سال تک درس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر جب ہیثمؒ کا انتقال ہو گیا تو آپ بغداد کی حدود سے باہر نکلے اور طلبِ حدیث کے سلسلے میں اپنے طویل سفر کا آغاز کیا۔ حضرت امامؒ سب سے پہلے بصرہ تشریف لے گئے۔ پھر حجازِ مقدس کی جانب روانہ ہوئے۔ اس کے بعد منزلیں طے کرتے ہوئے یمن پہنچے۔ کوفے میں بھی قیام کیا۔ آپ کی دلی تمنا تھی کہ رے بھی تشریف لے جائیں تاکہ جریر بن عبدالحمیدؒ سے حدیثوں کی سماعت کر سکیں۔ آپ ان بزرگ سے بغداد میں فیض یاب نہیں ہو سکے تھے۔ اگرچہ آپ اس ملاقات کی شدید خواہش رکھتے تھے لیکن گردشِ حالات کے باعث اپنے ارادوں کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ اقتصادی بدحالی نے آپ کو اس سفر کا موقع فراہم نہیں کیا۔ کوفہ بغداد سے بہت قریب تھا مگر وہاں بھی آپ کی زندگی مشکلات و مصائب سے دوچار رہی۔ حضرت امامؒ فرماتے ہیں: "جب میں گھر میں سوتا تھا تو سر کے نیچے تکیے کی جگہ اینٹ رکھ لیا کرتا تھا۔" اسی طرح رے کے سفر کے متعلق آپ ہی کا بیان ہے: "اگر میرے پاس چند درہم ہوتے تو میں بھوکا رہ کر بھی رے کا سفر ضرور اختیار کرتا اور جریر بن عبدالحمیدؒ کے نورِ علم سے اپنے دل و دماغ کو ضرور روشن کرتا لیکن اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔" ان مسلسل واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امامؒ علم کے راستے میں تکلیفیں برداشت کرنے کے لیے کس قدر پرجوش نظر آتے تھے۔ اگر کبھی آپ بالکل بے دست و پا ہو جاتے تو پھر جذبات کی تڑپ ناقابلِ بیان ہوتی تھی۔

آپ نے طلبِ حدیث میں پانچ بار حجازِ مقدس کا سفر کیا اور اتنی ہی مرتبہ آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں: "میں نے پانچ میں سے تین حج پا پیادہ کیے۔ میں ایک حج پر صرف تین درہم خرچ کر سکا۔ ایک بار میں راستہ بھول گیا۔ کئی دن تک پیدل سفر کرتا رہا۔ آخر میں نے پکارنا شروع کر دیا۔ خدا کے بندو! مجھے راہ پر لگا دو۔ یہاں تک کہ میں صحیح راستے پر ہو لیا۔" علم کی خاطر حضرت امامؒ کی یہ قربانیاں ایک ایسا کارنامہ ہیں کہ جن کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں بہت کم نظر آئیں گی۔

حضرت امامؒ حج سے فارغ ہو کر صنعا (یمن) تشریف لے گئے۔ اس سفر کی روداد اتنی اثر انگیز ہے کہ اسے پڑھ کر دل پگھلنے لگتا ہے۔ راستے میں آپ کا مختصر سا اثاثہ ختم ہو گیا تو بار برداروں کے گروہ میں شامل ہو گئے اور اس وقت تک مزدوری کرتے رہے جب تک زادِ راہ کے لیے کچھ رقم جمع نہیں ہو گئی۔ کتنی مشقتیں اٹھائیں، کتنے فاقے کیے؟ اس کا حساب خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بالآخر صنعا پہنچے۔ امام عبدالرزاقؒ نے آپ کی مدد کے خیال سے دیناروں کی ایک تھیلی سامنے رکھ دی اور انتہائی محبت آمیز لہجے میں کہا: "احمد! اسے قبول کرو۔ یہ تمہاری ذات کے لیے نہیں، علم کی خاطر ایک حقیر سا تحفہ ہے۔"

"میری پرسشِ حال پر خدا تمہیں جزائے خیر دے لیکن میں جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں۔" حضرت امامؒ نے بے نیازانہ جواب دیا اور اٹھ کر چلے آئے۔

صنعا میں دو سال تک آپ کا قیام رہا۔ اس طویل عرصے میں آپ پر کیا گزری، ان کیفیات کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا ناکافی ہے۔ حضرت امامؒ نے کسی قسم کی استعانت قبول کیے بغیر مسلسل آزار جھیلے اور امام زہریؒ کے طریقے پر حدیث کی سماعت کی۔

ایک بار حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شناسا نے آپ کو حالتِ سفر میں دیکھ کر اعتراض کیا "اس قدر حفظ کر لیا اتنی روایت کر لی مگر پھر بھی حالت یہ ہے کہ آج کوفے کا سفر درپیش ہے تو کل بصرے کی طرف گامزن ہو۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟" حدیث کی طلب اور روایت میں حضرت امام احمدؒ کی کوشش و جستجو کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب آپ درجۂ امامت پر پہنچ گئے تو ایک ہم عصر عالم نے آپ کو مسلسل لکھتے دیکھ کر کہا "احمد! تمہیں دنیا امام المسلمین کہہ کر پکارتی ہے مگر یہ سب کچھ کیا ہے؟"

حضرت امامؒ نے اس شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "دنیا اپنے کام میں مصروف ہے، مجھے میرا کام کرنے دو۔ جب تک قبر میں نہ پہنچ جاؤں قلم دوات کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔"

❁

حضرت امام احمدؒ کو علمِ حدیث و فقہ کی چند برگزیدہ شخصیات سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ ان نامور ہستیوں میں حضرت امام مالکؒ سرِفہرست تھے۔ آپ کو حضرت حماد بن زیدؒ سے بھی ملاقات کا بڑا ارمان تھا مگر زمان و مکاں کے فرق نے حضرت امامؒ کو علم کے ان سمندروں تک پہنچنے نہیں دیا۔ حضرت حماد بن زیدؒ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے استادِ محترم تھے جو حضرت امام احمدؒ کی پیدائش سے بہت پہلے انتقال فرما چکے تھے۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ بھی حضرت امام احمدؒ کی دنیا میں آمد سے قبل ہی وفات پا گئے تھے یا پھر وہ آپ کا عالمِ شیرخواری ہوگا۔ بہرحال امام احمدؒ ان دونوں عظیم بزرگوں کا زمانۂ حیات نہ پا سکے اور تمام عمر اپنی اس محرومی پر افسوس کرتے رہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگردِ خاص تھے مگر آپ ان سے بھی ملاقات نہ کر سکے۔ جب حضرت امام احمدؒ نے سولہ سال کی عمر میں علمِ حدیث لکھنا شروع کیا تو عبداللہ بن مبارکؒ بغداد سے طرطوس جا چکے تھے پھر واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۱ ہجری میں ہیت کے مقام پر انتقال فرمایا۔ حضرت امام احمدؒ کو عبداللہ بن مبارکؒ سے نہ ملنے پر ساری زندگی قلق رہا۔ بے شک یہ امامؒ کی محرومیاں تھیں مگر ان محرومیوں میں آپ کے ارادوں کو کوئی دخل نہ تھا۔ اگر آپ کسی طرح حضرت امام مالکؒ یا حضرت حمادؒ کی قربت پا سکتے تو شاید اپنی جان دے کر بھی علم و عمل کی ان عظیم درس گاہوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ بظاہر یہ وہ نقصان تھا جس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہ تھی مگر قدرتِ الٰہی کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ اس نے عجیب انداز میں آپ کی محرومیوں کا ازالہ کر دیا۔ آخری عمر میں حضرت امامؒ خود فرمایا کرتے تھے "میں حضرت حمادؒ کے حضور نہ پہنچ سکا لیکن خدا نے مجھے ان کے بجائے اسمٰعیل بن علیہ سے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔ میں حضرت امام مالکؒ کے علم سے فیض یاب نہ ہو سکا مگر اللہ نے میرے لیے سفیان بن عیینہؒ کا دروازہ کھول دیا۔"

❁

علمِ حدیث کی تکمیل کے بعد حضرت امام احمدؒ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ آپ علمِ فقہ کو اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ حضرت امامؒ فقہ کو پسند فرماتے تھے مگر قرآن و حدیث کی طلب کے بعد آپ کو اس طرف توجہ دینے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ نتیجتاً یہ غلط بات مشہور ہو گئی کہ حضرت امام احمدؒ فقہ کے منکر ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ حضرت امام شافعیؒ کی شاگردی کیوں اختیار کرتے جو واقعتاً ایک بہت بڑے فقیہہ تھے۔ اس سلسلے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مشہور قول ہے۔

"جو حدیث سیکھتا ہے فقہ نہیں جانتا اس شخص کی مثال اس دواساز کی سی ہے جو دوائیں تو جمع کرتا رہتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون سی دوا کس مرض میں کام آئے گی۔ یہاں تک کہ طبیب آتا ہے اور دواؤں کے استعمال کا طریقہ بتاتا ہے۔ اسی طرح طالبِ حدیث ہے جو حدیثیں تو یاد کر لیتا ہے مگر ان کی ماہیت سے ناواقف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ فقیہہ آتا ہے اور حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔" ممکن ہے حضرت امام احمدؒ کی نظر سے ابوحنیفہؒ کا یہ قول گزرا ہو یا پھر آپ نے خود اس ضرورت محسوس کی ہو، بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپ نے حضرت امام شافعیؒ کی صحبت اختیار کی اور فقہ کے رموز و نکات کو سمجھا۔

آپ امام شافعیؒ سے ایک خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ایک بار حدیث کی خصوصی مجلس آراستہ تھی۔ سفیان بن عیینہؒ کی بیان کردہ احادیث تحریر کی جا رہی تھیں کہ اتنے میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ تشریف لائے اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "اے ابو یعقوب! اٹھو، میں تمہیں ایسا شخص دکھاؤں جسے تمہاری آنکھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔"

حضرت امامؒ کی بات سن کر تمام ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جو عمر کے اعتبار سے نوجوان تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس، روشن و تابناک چہرہ، آنکھوں میں ذہانت و فراست کا سمندر موجزن، یہ تھا اس شخصیت کا مختصر خاکہ۔ جب تمام لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو حضرت امام احمدؒ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا "ابو یعقوب! اس سے فیض حاصل کرو کہ میں نے آج تک ایسا کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا۔" حاضرینِ مجلس اس نوجوان کی شکل دیکھ کر حیرت زدہ تھے جسے آج ساری دنیا امام شافعیؒ کے نام سے جانتی ہے۔

ایک اور موقع پر حضرت امام احمدؒ نے اپنے استاد حضرت امام شافعیؒ کے بارے میں اس طرح رائے ظاہر کی "رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میری اُمت کے لیے خداوندِ ذوالجلال ہر صدی کے شروع میں ایک ایسا شخص پیدا کرے گا جو دین کے بگڑے ہوئے اُمور کو سلجھایا کرے گا۔ اسی قولِ رسولِ کریمؐ کے مطابق حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ اُس صدی کے مجدد تھے اور میرا خیال ہے کہ امام شافعیؒ اِس صدی کے مجدد ہیں۔" ان واضح مثالوں سے ایک طالب علم بھی اندازہ کرسکتا ہے کہ حضرت امام احمدؒ کے دل و دماغ پر امام شافعیؒ کے کس قدر گہرے اثرات تھے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ امام احمدؒ، فقہ کے قائل نہیں تھے۔ آپ نے اپنے زمانے کے کم و بیش تمام مروّجہ علوم حاصل کیے مگر انہیں اپنے مذہبی جہاد کی بنیاد نہیں بنایا۔

○

یوں تو دنیا کا ہر مسلمان پیغمبر اسلام کا نام لیوا ہے مگر کچھ لوگ جاںنثاروں کی صف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا اسمِ گرامی بھی اِن ہی سرفروشانِ رسولؐ میں شامل ہے جو سرورِ کونینؐ کی ہر سنت کو زندہ کرنے کے لیے اپنے نفس کے ساتھ ساتھ شاہانِ وقت سے بھی جنگ کرتے رہے۔ رسالت مآبؐ سے آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنی ایک ایک سانس کو مزاجِ نبوت کے تابع کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت امامؒ کو یہ روایت معلوم تھی کہ حضور اکرمؐ ایک باندی رکھتے تھے، چنانچہ آپ نے بھی اس سنت پر عمل کرنے کے لیے ایک باندی کا انتظام کیا۔ حالانکہ حضرت امامؒ کو باندیوں سے فطری طور پر کوئی رغبت نہیں تھی۔ اگر کسی کام کے صلے میں رسولِ خدا نے کسی شخص کو ایک دینار عطا کیا تھا تو حضرت امامؒ بھی وہ کام ضرور کرتے اور اجر کے طور پر ایک ہی دینار دیتے۔ خواہ اس روز آپ کو فاقہ کرنا پڑ جاتا۔ غرض انسانی حد تک جس قدر اتباعِ سنت ممکن تھا حضرت امام احمدؒ نے اس کا عملی مظاہرہ کیا۔

عشقِ رسولؐ کی یہ کیفیت تھی کہ آپ احادیث مبارکہ کے علاوہ کسی بھی تقریر و تحریر کی ترتیب و تدوین کو ناجائز سمجھتے تھے۔ حضرت امامؒ کو سب سے زیادہ یہ بات ناگوار تھی کہ لوگ آپ کے دیئے ہوئے فتووں کو جمع کریں۔ اگر کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ آپ کے علم میں آجاتا تو صاف انکار فرما دیتے کہ "اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" ایک بار خراسان کا رہنے والا ایک شخص حضرت امامؒ کے پاس کچھ کتابیں لے کر آیا۔ ایک کتاب پر نظر پڑی تو اس میں آپ کا کلام درج تھا۔ یہ دیکھ کر آپ سخت غضب ناک ہوگئے اور وہ کتاب اٹھا کر پھینک دی۔ پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ لوگ گواہ رہیں کہ اس کتاب کو مجھ سے کوئی نسبت نہیں۔"

ایک بار کسی شخص نے سوال کیا "کیا میں فقہ حنفیہ کی کتابیں تحریر کرسکتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں!" امام احمدؒ نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔

"لیکن ابنِ مبارکؒ تو لکھ لیا کرتے تھے۔" اس شخص نے مثال پیش کی۔

"ابنِ مبارکؒ آسمان سے نہیں اترے تھے۔ ہمیں تو حکم ہے کہ ہم آسمان سے علم حاصل کیا کریں۔" حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بے جھجک ہو کر فرمایا۔ حالانکہ یہ وہی ابنِ مبارکؒ تھے جن سے ملاقات نہ ہونے پر آپ تمام عمر افسوس کیا کرتے تھے۔ لیکن جب عقائد کا مسئلہ سامنے آتا تو آپ سارے تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیتے اور وہی بات کہتے جسے حق سمجھتے۔

حضرت امام احمدؒ کی قوتِ حافظہ بے مثال تھی لیکن پھر بھی حدیثِ رسولؐ کے سلسلے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک لفظ تحریر کراتے اور بعد میں کاتب کے املا کو بغور ملاحظہ فرماتے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا کہ زیر و زبر کی غلطی کا بھی امکان باقی نہ رہے۔ پھر جب کبھی حدیث بیان کرنے کا مرحلہ درپیش ہوتا تو آپ اسی کتاب کا سہارا لیتے۔ حضرت امامؒ کے صاحبزادے عبداللہ فرماتے ہیں۔

وبابلے آج تک کبھی حدیث محض اپنی یادداشت کے سہارے بیان نہ فرمائی تھی۔"
حضرت امام حنبلؒ کو سیرت النبیؐ اس قدر عزیز تھی کہ آپ نے مسندِ درس چالیس سال کی عمر میں سنبھالی۔ کیونکہ آنحضورؐ نے بھی چالیس سال کی عمر میں نبوت کا اعلان کیا تھا۔

عزتِ نفس اور وقارِ عزت یہ وہ نمایاں پہلو تھے جو آپ کے درس میں ہوتے۔ آپ کا سلوک ہر جگہ یکساں ہوتا۔ اخلاق و ادب سیرت و کردار کے پیکر تھے، کم تر مفلوک الحال انسان بھی آپ کی محفل میں بے انتہا عزت و احترام پاتے تھے۔
آپ کے درس میں تقریباً پانچ ہزار کے لگ بھگ شاگردوں عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ آپ وعظ و نصیحت اس قدر حلیمی اور نرمی سے باادب کرتے کہ گویا کوئی معمولی غلام شہنشاہ کا شاہی فرمان عزت سے سنا رہا ہے۔

جامع مسجد بغداد آپ کا گڑھ تھی۔ آپ یہاں درس کا آغاز کرتے اور بڑے ہی دلنشیں انداز میں احادیث بیان کرتے تھے۔
آپ انتہائی سادہ طرزِ زندگی گزارتے تھے اور آپ کی تعلیم بھی انتہائی سادہ اور قابلِ فہم ہوا کرتی تھی۔ آپ ہر اُس چیز کو مسترد کر دیتے تھے جس کا ثبوت حضورؐ کی زندگی سے نہ ملتا ہو۔ اسی وجہ سے آپ علمِ فقہ پر یقین نہ رکھتے۔ صرف وہی علم آپ کے نزدیک قابلِ قبول تھا جس کا عملی نمونہ حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ سے ملتا ہو۔

آپ اپنی مادری زبان کے علاوہ فارسی پر بھی خاصا عبور رکھتے تھے۔ ہمیشہ سادہ اور آسان فہم میں قرآن اور احادیث بیان فرمایا کرتے۔ تمام عمر آپ نے محنت و مشقت کر کے گزاری۔ آپ کے تقویٰ کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ جو شخص سخت گرمی کے عالم میں محنت مشقت کر کے روزی کمائے اور پھر اُسے راہِ علم میں صرف کر کے خالی پیٹ رہے۔

غرض امام احمد بن حنبل نے علم و حدیث کی تعلیم میں جو مشکلات اور مصائب کا سامنا کیا اُس کا شمار مشکل ہے۔
یہ مردِ مومن اور اسلام کی برگزیدہ ہستی، راہِ حق میں عظیم المرتبت ٹھہری اور ایک دنیاوی بادشاہ کے ہاتھوں اپنے ربِ لافانی کی طرف پرواز کر گئی لیکن آپ کا بے گناہ لہو آج بھی حق پرستوں کے لیے راہِ عمل ہے اور ظالم حاکم کے سامنے حق کا علم بلند کرنے کی سب سے بڑی مثال۔

دارا و سکندر سے مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

مولانا رومی

کسی نے کسی شریف صورت اور بہترین وضع قطع کے بُرے انسان کو دیکھ کر کہا: "اس کی ظاہری وضع قطع پر مت جاؤ کیونکہ یہ اندر سے بُرا ہے!"
کسی نے پوچھا: "اسے تو آپ پہچانتے تھے، مطلع فرما دیا لیکن اس جیسے اور بہت سے لوگ ہیں، انہیں کس طرح پہچانا جائے؟"
مولانا نے جواب دیا: "معاملات سے، کیونکہ معاملات ہی بہترین کسوٹی ہوتے ہیں جن سے کسی انسان کا کھرا کھوٹا پن سامنے آجاتا ہے ورنہ کتابت میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے لیکن دونوں کے فوائد اور نقصانات میں زمین آسمان کا فرق ہے!"

نو بہ نو

- بینکنگ: جو انہی کو قرض دینے کے لیے پریشان رہتا ہے جو ہمیشہ کے لیے پریشان نہیں ہیں۔
- کاہلی: تھکاوٹ سے پہلے آرام۔
- کفایت شعاری: غریبوں کے لیے مشکل، امیروں کے لیے ناممکن۔
- زلزلہ: وہ بات جو تم ہر ایک سے الگ الگ کہتے ہو۔
- وزارتِ خارجہ: جو وزارتِ دماغ کے استعمال سے بچائی ہے۔
- انسان: واحد مخلوق جو سگریٹ پیتی ہے۔
- شراب: جسے پی کر آپ اس کی قیمت بھول جائیں گے۔
- زمانہ آمکیو: وہ رقم جس پر آپ ایمانداری کا ٹیکس دو۔

شیخ علاؤالدین علا الحق چشتی بنگال کی بلند پایہ شخصیت تھے۔ آپکی رُوحانیت اور ریاضت کا چرچا پورے بنگال میں تھا آپ شیخ سراج دین عثمان کے خلیفہ تھے۔ آپ کا پورا خاندان حکومتِ وقت میں سرکردہ عہدوں پر فائز تھا مگر آپ
وسنِ آغاز سے ہی خدا رسیدگی اور اہل اللہ سے رغبت تھی۔ آپ نے علوم وسلوک میں اتنی دسترس حاصل کر رکھی تھی کہ ہر وقت آپ کے اردگرد
عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ فیاضی میں آپ کا مرتبہ بادشاہوں سے بھی زیادہ تھا سلاطین آپ کی عالی شان خانقاہ پر رشک
کیا کرتے تھے۔ روزانہ بے شمار مسافر اور فقراء آپ کے دَر سے طعام وزادِ راہ حاصل کرتے تھے۔ آپ کا جلال اس قدر تھا کہ آپ سے آنکھ ملا
کر بات کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن گذشتہ کئی روز سے سب مرید اور عقیدت مند یہ بات شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ حضرت
پر سخت قسم کا اضطراب طاری ہے کبھی اپنی خانقاہ کے اندر جاتے کبھی باہر آتے، کبھی گاؤں سے باہر جا کر چہل قدمی کرتے ہیں اور ٹھنڈی سانس
کے ساتھ آہ بھرتے ہیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کا ان کو شدت سے انتظار ہو آخر ایک دن دوپہر کے وقت جب شیخ علاؤالدین آرام فرما رہے
تھے یکایک اُن کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے اپنے سارے مریدوں اور عقیدت مندوں کو جمع کیا اور فرمایا " جس کا دو سال سے میں منتظر تھا آج
وہ ہمارے پاس آرہا ہے، چلو سب اس کا استقبال کریں" کسی کو پوچھنے کی ہمت نہ تھی کہ وہ کون ہے سب مرید حضرت کے ساتھ چل پڑے۔
گاؤں سے باہر ایک کوس کے فاصلہ پر سب کو رُکنے کا حکم ملا سب رُک گئے۔ سب نے دیکھا کہ کالا کمبل کاندھے پر ڈال کر ایک نورانی شکل کے
بزرگ پگڈنڈی پر چلتے آرہے ہیں۔ جب اس آنے والے نے شیخ علاؤالدین کو دیکھا تو دوڑ کر ان کے قدموں پر گر گیا۔ شیخ علاؤالدین نے اس
کو اٹھایا اور گلے سے لگالیا۔ پھر وہ جلوس کی شکل میں اس مہمان بزرگ کو اپنی خانقاہ میں لے آئے۔ اس کی بہت تعظیم کی گئی اور اسی روز مغرب کی نماز
کے بعد شیخ علاؤالدین نے اس نوآورد کی بیعت لی۔ یہ نوآورد سید اشرف تھے۔ سید اشرف بیعت کرنے کے بارہ سال تک شیخ علاؤالدین کی
خدمت میں رہے۔ خلافت کے خرقے حاصل کیے۔ جہاں گیر کا لقب حاصل کیا۔ سید اشرف فرماتے ہیں: "کہ مرشد نے مجھ ناچیز کو جہاں گیر کا لقب
عطا کرکے گویا جہاں گیری کا فرمان جاری کر دیا ہے"

❋

سید اشرف سمنان کے حاکم سلطان محمد ابراہیم کے اکلوتے فرزند تھے۔ سلطان محمد ابراہیم تین لڑکیوں کے بعد اولادِ نرینہ کے شدید متمنی تھے۔

اپنی سلطنت کے وارث اور جانشین تھے۔ انہوں نے خدا سے بہت دعائیں کیں۔ سلطان ابراہیم کی بیوی ملکہ خدیجہ بھی تہجد گزاری اور شب زندہ داری کے بعد بیٹے کے لیے بہت دعائیں کرتی تھیں یہی وجہ تھی سلطان محمد ابراہیم کو سید اشرف کی ولادت سے تین ماہ قبل ہی ایک مجذوب سید ابراہیم نے اس وقت بشارت دی تھی، جس وقت سمنان کے باب سمرقندی کا آہنی پھاٹک بند تھا اور فصیل ناقابل عبور تھی۔ سید ابراہیم مجذوب پھاٹک کھلوائے بغیر اور فصیل عبور کیے بغیر سلطان محمد ابراہیم کے شاہی محل میں پہنچ گئے اور اس کو خوشخبری سنائی کہ "جہاں گیر زماں اشرف دوراں تشریف لا رہے ہیں"۔ چنانچہ تین ماہ کے بعد ۶۸۸ھ میں وہ خورشید طریقت طلوع ہوا جس کی پیشین گوئی مجذوب سید ابراہیم کر چکے تھے اس کے بعد نہ کسی نے سید ابراہیم مجذوب کو دیکھا نہ ہی انکی قبر کا کوئی نشان ملا۔ گویا وہ صرف سید اشرف کی آمد کی بشارت دینے ہی آئے تھے۔

سید اشرف کی والدہ جب تک باوضو نہ ہوتیں وہ دودھ نہ پیتے تھے۔ آپ کی تربیت اعلیٰ انداز سے شروع کی گئی۔ آپ نے مشہور عالم سلطان سے قرآن مجید کی قرات سیکھنا شروع کی۔ سید اشرف جب قرآن مجید قرأت سے پڑھتے تو زمان و مکاں اور شجر و حجر پر وجد طاری ہو جاتا تھا آپ نے چودہ سال کی عمر میں منقولات و معقولات کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ آپ بلا کے ذہین تھے۔ آپ جب علماء اور مشائخ کے سامنے کوئی دقیق نکتہ پیش کرتے تو جید علماء ورطۂ حیرت بن جاتے آپ علم و فضل کی آبشار تھے۔ آپ الفاظ و معنی کے ایسے رنگ تھے جن سے کائنات مزین تھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدائشی طور پر ولایت سے سرفراز فرمایا تھا۔

سید اشرف نے والد کی وفات کے بعد بادل ناخواستہ عنان حکومت سنبھالا۔ آپ کو بحیثیت حکمران ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ آپ کی حکومت میں کوئی شخص بھوکا تو نہیں سویا، کسی پر ظلم تو نہیں ہوا۔ انہی امور کی خاطر آپ شہر کا گشت کرتے، اپنی رعایا کی خبر گیری کرتے اور حکومت کے کاموں سے جو وقت بچ جاتا وہ یاد الٰہی میں بسر کرتے۔ آپ تلاوت قرآن مجید کرتے کرتے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ آپ کو یوں لگتا جیسے کائنات میں صرف خدا ہے اور یہی وجہ تھی کہ آپ کئی کئی روز تک جنگلوں میں رہ کر مراقبہ کیے رکھتے تھے۔ آپ کو عبادت کے وقت شیطان عجیب انداز سے تنگ کرتا۔ کبھی آپ کے سامنے آپکی والدہ کی شکل میں آتا کبھی کسی ضعیف آدمی کی شکل میں آتا کبھی کسی سترہ سال خوردہ عورت کی صورت میں آتا اور کبھی دوشیزہ کے روپ میں آکر آپ کو آپ کی منزل سے بہکانے اور بھٹکانے کی کوشش کرتا مگر آپ کو اللہ تعالیٰ نے استقلال اور حوصلہ عطا فرمایا تھا اس کی وجہ سے آپ کے عزم میں کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ اسی کشمکش میں آپ کی زندگی بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن آپ کی ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی۔ انہوں نے مختصر ملاقات میں آپ سے بڑی عمدہ اور جامع باتیں کیں جن سے آپ کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ آپ کو امور سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ آپ نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیا اور مسجد کے حجرے میں معتکف ہو گئے۔ آپ کے حجرے میں کسی کو ماسوائے آپ کی والدہ کے جانے کی جرأت نہ ہوتی جو جانے کی کوشش کرتا۔ بے ہوش ہو جاتا۔ لوگ دور سے دیکھتے کہ حجرے میں عجیب و غریب قسم کی شخصیات، عجیب و غریب راستوں اور طریقوں سے آتیں اور چلی جاتیں کبھی کبھی حجرے سے نور کی شعاعیں نکلتیں جو دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر دیتیں۔

اسی اعتکاف میں سید اشرف کی دوسری ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی۔ حضرؑ نے فرمایا " اشرف جیسے ایک حکومت میں دو والی نہیں رہ سکتے اسی طرح دو سلطنتیں ایک بادشاہ نہیں سنبھال سکتا "۔ سید اشرف نے جواب دیا " حضرت میں تو کئی سالوں سے اپنا آپ کے لیے کوشاں ہوں "۔ اس پر حضرت خضرؑ نے فرمایا " ابھی ہندوستان چلے جاؤ "۔

سید اشرف حضرت خضرؑ کا اشارہ سمجھ گئے۔ فوراً اپنی والدہ سے مشورہ کیا۔ اجازت کے ساتھ اپنے نانا خواجہ احمد یسوی کی عطا کردہ دعا حاصل کی۔ آغاز سفر سے پہلے اپنا سارا سامان و اسباب غرباء، مساکین میں تقسیم کیا۔ اپنے ساتھ ایک کمبل اور مٹی کا پیالہ لیا اور چل پڑے۔ اُچ کے مقام پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے اپنے مریدوں کے ہمراہ آپ کا والہانہ استقبال کیا مصافحہ و معانقہ کرنے کے بعد مخدوم جہاں گشت نے فرمایا " اشرف! آپ جلدی کرو۔ راستے میں مت ٹھہرو کیونکہ بھائی علاؤالدین آپ کے منتظر ہیں "۔ مریدوں نے لاکھ کوشش کی مگر مخدوم جہاں گشت نے سید اشرف کو نہ روکا بلکہ سفر جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ اُچ سے سید اشرف

ئے یہاں آکر آپ نے بہت سے جید علماء اور مشائخ حضرات سے علوم باطنی حاصل کیے۔ دلی سے آپ صوبہ بہار پہنچے اس وقت شام ہونے کو تھی
شہر سے باہر لوگ ایک جنازہ لا رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر جنازہ روک دیا گیا۔ اور آپ سے لوگوں نے کہا کہ یہ جنازہ مخدوم الملک شرف الدین منیری
ہے انہوں نے وصیت کی تھی کہ "میرا جنازہ لے کر شہر سے باہر نکلنا تو مغرب کی طرف سے ـــ کالے کمبل والا ایک شخص آئے گا وہ میرا جنازہ
ھائے گا" چنانچہ مخدوم الملک منیری کے فرمان کے مطابق آپ ہی وہ شخص ہیں اس لیے آپ ان کا جنازہ پڑھائیے"۔ سید اشرف نے مخدوم الملک
جنازہ پڑھایا۔ پھر ان کے مزار پر چلہ کشی کی اور کئی اسرار باطنی سے مستفید ہوئے۔ آپ کو چشم مکاشفہ سے مخدوم الملک منیری کئی مرتبہ ملے اور انہوں
ے فرمایا کہ کاش! سید اشرف تم میرے حصے میں آئے ہوتے۔ لیکن تم تو شیخ علاؤ الدین کی امانت ہو"۔ یہاں سے سید اشرف نے بنگال کا رخ کیا۔
پ کو اپنی منزل پر پہنچنے کا شدت سے اشتیاق تھا۔ آپ ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد بنگال کے قصبہ پنڈوہ پہنچے۔ جہاں آپ نے دیکھا
مرشد عالی شیخ علاؤ الدین از خود مریدوں اور عقیدت مندوں کے جلوس کے ساتھ سید اشرف کے منتظر ہیں اور تلطف اور مہربانی کا یہ عالم تھا
مرشد مرید کی پذیرائی کے لیے گاؤں سے ایک کوس باہر آکر والہانہ استقبال کر رہے تھے۔ بارہ سال کی طویل مدت شیخ علاؤ الدین کی خدمت
ادہنے کے بعد سید اشرف کو حکم ملا کہ وہ جون پور چلے جائیں آپ کو اپنے مرشد سے جدا ہونا گوارہ نہ تھا مگر حکم آخر حکم ہوتا ہے اس سے سرتابی
ا بھی بڑی مشکل بات تھی۔ چنانچہ دل پر پتھر رکھ کر سید اشرف جون پور تشریف لے گئے آپ کو راستے میں اعظم گڑھ کے مقام پر بہت سے لوگوں
ے مناظرے کرنا پڑے۔ آپ لوگوں کے ان سوالوں کے جواب بھی دے دیتے جو ابھی ان کے دل ہی میں ہوتے تھے لوگ آپ کی علمیت و ذہانت
ے ساتھ آپ کی روحانیت کے بھی قائل ہوتے جاتے تھے آپ کے علم کے چشمے سے سینکڑوں اور ہزاروں لوگ بہرہ مند ہو رہے تھے۔

جون پور پہنچ کر آپ نے مسجد میں قیام فرمایا۔ یہاں ایک نہایت عابد و زاہد اور علم کے سرچشمہ قاضیِ شہر شہاب الدین دولت آبادی آپ کی قدم
ی کے لیے حاضر ہوئے۔

قاضی شہاب الدین خود کئی کتابوں کے مصنف اور علم و فضل کی وحید العصر شخصیت تھے۔ تیموری دور میں انہیں ممتاز مقام حاصل تھا جون پور
ے لوگوں نے جب قاضی شہاب الدین جیسی جید ہستی کو سید اشرف کی قدم بوسی کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے دھڑا دھڑ سید اشرف کی
ھٹ کو بوسے دینا شروع کر دیئے۔

جون پور کے والی سید ابراہیم نے قاضی شہاب الدین کی وساطت سے حضرت سید اشرف سے بہت کچھ حاصل کیا۔ وہ اکثر و بیشتر قاضی شہاب
ین کے ہمراہ سید اشرف کی خدمت میں حاضر ہوتا اور سید اشرف اس کی دل دہی فرماتے۔ چنار کے قلعہ کی فتح سید اشرف کی دعاؤں کے نتیجے ہی میں
ی تھی۔ سلطان ابراہیم چنار کے قلعہ کی فتح سے اس قدر خوش تھا کہ اس نے نہ صرف خود بلکہ اپنی ذریت کو بھی سید اشرف کا مرید کروا دیا سید اشرف
خواہش پر ہی قاضی شہاب الدین کو سلطان کی طرف سے ملک العلماء کا خطاب ملا۔ سلطان ابراہیم اس بات کا شدت سے متمنی تھا کہ سید اشرف جون
ر ہی رہیں۔ اس کا اظہار اس نے کئی مرتبہ حضرت سے کیا مگر آپ کے فیض سے پورے ہندوستان کو آبیار ہونا تھا آپ نے سلطان ابراہیم سے
دہ کیا کہ اگر میں جون پور سے چلا بھی گیا لیکن رہوں گا تمہاری سلطنت کی حدود میں ہی۔

ایک روز سید اشرف دلی کی مسجد میں نمازِ فجر ادا کرنے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ممتاز بزرگ مولانا محمد کریم الدین سے ہوئی۔ مولانا محمد کریم الدین
ت سے نماز میں لذت حاصل نہیں ہو رہی تھی وہ سجدے میں حضوری کے خواہش مند تھے۔ مولانا صف میں سید اشرف کے ساتھ شانہ جوڑ کر کھڑے
ئے تھے۔ جب نماز شروع ہوئی تو مولانا کریم الدین کو یوں محسوس ہوا کہ ان کے پاؤں زمین پر نہیں ہیں اور کعبہ شریف ان کے سامنے ہے دوسری رکعت
انہوں نے اپنے آپ کو عرشِ معلیٰ پر پایا اور نماز ختم ہونے سے پہلے مقام جبروت پر پہنچ گئے۔ نماز جب ختم ہوئی تو مولانا محمد کریم الدین کی حالت
ہو چکی تھی۔ آپ کو سید اشرف نے سہارا دیا اور فرمایا "مولانا! لذت سفر میں ہے، قیام میں نہیں"، ایک جگہ کھڑے رہ رہ کر تو حیوان بھی تنگ
جاتے ہیں۔ آپ سالوں سے ایک جگہ مقیم ہیں۔ مولانا محمد کریم الدین نے سید اشرف کو ایسا دریا کہا جس کا کوئی ساحل نہ ہو اور آپ وہ شہباز تھے کو نین
ن کے بازو ہوتے ہیں"۔

سیداشرف کچھوچھے اور اس کے مضافات میں اکثر لوگوں کی اصلاح اور تربیت کے لیے جایا کرتے تھے یوں ادھر کے بہت سے مشائخ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں کے ہی حاکم نواب سیف اللہ خاں نے اپنی عقیدت وارادت کی وجہ سے سیداشرف سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ کی ملاقات نامور عالم و فاضل مولانا شیخ شمس الدین سے ہوئی۔ آپ مولانا سے بہت متاثر ہوئے اور شیخ شمس الدین کو سیداشرف نے لفظ "اللہ" کے معنی اس طرح سمجھائے کہ وہ اپنی کتابیں اور علم بھول گئے۔ لفظ "اللہ" کہہ کر مولانا شمس الدین بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آنے پر آپ کے مرید ہو گئے اور ساری عمر صرف ایک لفظ "اللہ" کا ذکر کرتے رہے اور وہ مقام حاصل کیا جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتا۔ مولانا شمس الدین سیداشرف کے اس قدر چہیتے اور مقرب خلیفہ تھے کہ سیداشرف ان پر بہت ناز کیا کرتے تھے۔

ردوی کے ممتاز عالم شیخ صفی الدین صفی اور شیخ سماء الدین بھی آپ کے فیض سے مستفید ہوئے اور آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ شیخ صفی کو آپ نے نورالانور کی دعا دی۔ اس دعا کے بعد شیخ صفی کا چہرہ چاند کی طرح چمکا اور دمکا کرتا تھا۔ شیخ سماء الدین بھی سیداشرف کے مقرب خلیفوں سے تھے اور انہیں بھی بے پناہ تلطف حاصل تھا۔

جون پور سے سیداشرف جب مینی پہنچے تو اس کے ساتھ ہی آپ نے بھدونڈ کو بھی دیکھا۔ یہ جگہ چھوٹے بڑے مندروں سے بھری پڑی تھی۔ یہاں زیادہ ہندو لوگ ہی رہا کرتے تھے ہندو جوگی اپنے تعصب کی وجہ سے مسلمانوں کو اس علاقہ میں آنے ہی نہ دیتے۔ یہاں کے بڑے مندر کا جوگی اپنے آپ کو اژدہا کی شکل میں تبدیل کر کے لوگوں کو حراساں کیا کرتا تھا کبھی دفعہ مسلمانوں کی مسجد میں داخل ہو جاتا اور مسجد کے صحن میں کنڈلی والا سانپ بن جاتا۔ لوگ خوفزدہ ہو جاتے۔

سیداشرف جب بھدونڈ پہنچے تو ان کو ہندو جوگیوں کی کارستانیوں سے مطلع کیا گیا آپ کو بھی مندروں کے علاقے میں جانے سے لوگوں نے منع کیا مگر آپ نے فرمایا "اب تو میں اپنا قیام بھی بڑے مندر میں ہی رکھوں گا۔" یہ کہہ کر سیداشرف بڑے مندر کی طرف گئے۔ مندر کے اندر پہنچے تو آپ نے بہت سے جوگیوں کو بیٹھا دیکھ کر فرمایا "وہ جوگی کہاں ہے جو اپنے آپ کو اژدہا کی شکل میں تبدیل کر لیتا ہے" یہ بات سن کر ایک نوجوان پجاری جو کھڑا ہو گیا اور سیداشرف کی طرف حملہ کرنے کی نیت سے بڑھا۔ سیداشرف نے نظر بھر کر دیکھا اور آن کی آن میں سارے کے سارے پجاری پتھر کے بن گئے۔ پھر سیداشرف مندر کے اندر چلے گئے۔ وہاں ایک بے لباس جوگی ایک بت کے آگے بیٹھا جاپ کر رہا تھا۔ آپ کی آہٹ پا کر غصے سے آپ کی طرف مڑا اور نہایت بدتمیزی سے بولا "تم نے میرے چیلوں کو پتھر کا بنا دیا ہے اب میری تپسیا میں مخل ہونے آگیا ہے آج تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤ گے"۔ سیداشرف مسکرائے اور فرمایا "تم ایک باکمال پنڈت ہو مگر ابھی نامکمل ہو" یہ بات سیداشرف کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پنڈت نے چمگادڑ کی طرح مندر کے ستونوں کے درمیان اڑنا شروع کر دیا۔ سیداشرف نے مسکرا کر فرمایا "تم اژدہا کے ساتھ ساتھ چمگادڑ کا روپ بھی دھار لیتے ہو۔" یہ کہنا تھا کہ پنڈت ایک کیڑے کی شکل میں تبدیل ہو کر زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا۔ اب سیداشرف کو اس پر ترس آنے لگ گیا آپ نے ہاتھ کو سیدھا کیا اور وہ اس طرح اپنی اصلی شکل میں واپس آگیا مگر اس کی تڑپ ویدانی تھی۔ وہ فوراً سیداشرف کے قدموں میں گر گیا اور آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ آپ نے اس کا نام کمال پنڈت ہی رکھ دیا بعد میں اس کے ۵۰۰ چیلے بھی مسلمان ہو کر سیداشرف کی مریدی میں داخل ہو گئے اور وہ مندر ایک بڑی خانقاہ میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس قصبہ کا نام بھی مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے کثرت آباد رکھ دیا گیا۔ آپ جس حجرہ میں سلوک و عرفان کے درس دیا کرتے تھے اس کو دارالامان کہا جاتا تھا۔ یہاں بڑے بڑے علماء اور مشائخ حضرات تشریف لاتے اور علم کے چشمۂ صافی سے شکم سیر ہوتے سیداشرف کو اللہ تعالیٰ نے وہ عالی مرتبہ عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے ولی ——— آپ کی خدمت میں رہنا فخر سمجھا کرتے تھے آپ کے درس و تدریس کو نہایت شوق و لگن سے سننے کے لیے دور دراز سے لوگ آیا کرتے تھے آپ نے لوگوں کی بھلائی اور فلاح کیلئے بہت سی خدمات سرانجام دیں جو ناقابلِ فراموش ہیں۔

سیداشرف کے ایک مرید شیخ کمال جوان کے خلیفہ بھی تھے لوگوں کے روحانی پیشوا تھے۔ ایک دن ان کے مریدوں کو کسی ضیافت کے

کا حکم دیا گیا لیکن کسی وجہ سے ضیافت کا انتظام بروقت نہ ہو سکا۔ شیخ کمال نے جلال میں آکر ضیافت کے منتظمین کو بددعا دی۔ اچانک پورا قصبہ آگ کی لپیٹ میں آگیا جن میں بے گناہ طفل و مستورات بھی خاکستر ہوگئیں۔ بعد میں شیخ کمال کو بہت پچھتاوا ہوا۔ وہ اس شرمندگی کے آزار کے لیے سید اشرف کے پاس پہنچے مگر سید اشرف بہت غصہ میں تھے انہوں نے کہا کہ "تم نے میری ذریت کو بے خانماں برباد کر دیا۔ لہٰذا میں تمہارے ساتھ ملاقات بالکل نہیں کروں گا"۔ یہ بات سن کر شیخ کمال مہینوں اپنے مرشد سید اشرف کے در پر پڑے استغفار کرتے رہے اور کئی مہینوں کے بعد ایک دن سر پر انگاروں سے بھرا ہوا طشت لے کر مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سید اشرف نے معاف تو کر دیا مگر فرمایا "کہ تم اور تمہاری آئندہ نسل بہت پریشان رہا کرے گی۔ تم نے معافی مانگی ہے چنانچہ تمہیں میں معاف کر دیتا ہوں۔

☆☆☆

قصبہ انہونہ کے تمام سادات آپ کے مریدوں میں داخل ہو چکے تھے ان کے لیے سید اشرف کی دعا تھی کہ ان کی ساری زندگی آسائش و آرام سے گذرے۔ سدھورہ کے ممتاز عالم شیخ خیر الدین نے آپ سے کچھ سوالات کیے جن کے متعلق ایک مدت سے شیخ خیر الدین پریشان تھے۔ سید اشرف نے ان مسائل کی تشریح و توضیح اس انداز سے پیش کی کہ شیخ خیر الدین کیا ان کے جملہ ساتھیوں کی بھی تشفی ہوگئی اور وہ آپ کے ارادت مندوں میں شامل ہوگئے۔

☆☆☆

آپ نے شیخ بدیع الدین مدار کے ساتھ بیت اللہ شریف کا رخ کیا۔ کعبہ کی زیارت سے فارغ ہو کر سید اشرف مدینہ، نجف، کربلا، ارم کی سیاحت کرتے رہے۔ اس طرح آپ نے یکے بعد دیگرے کئی حج کر لیے آپ نے بہت بڑے اولیاء کرام کے مزاروں پر حاضریاں دیں کئی اولیاء عظام سے ملاقاتیں کرتے کراتے واپس اپنے وطن سمنان پہنچے آپ کی ہمشیرہ حیات تھیں ان کی آپ نے بہت خدمت کی۔ یہاں سے آپ شہر میں سید امام علی رضا کے مزار پر تشریف لے گئے وہاں بادشاہ تیمور بھی حاضری دینے کے لیے آرہا تھا چنانچہ عام لوگوں کو مزار پر جانے کے لیے پابندی تھی جو شخص آنے کی کوشش کرتا، منگولوں کے نیزوں کا نشانہ بن جاتا تھا۔ جب منگول فوج سید اشرف کی طرف بڑھی تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سب کے سب فوجی اندھے ہو گئے۔ حتیٰ کہ پوری فوج مزار کی طرف آتی ہوئی گذر رہی تھی۔ پھر تیمور نے سید اشرف سے بہت عاجزی کے ساتھ معافی مانگی اور روضہ شریف میں آنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا "تو اگر اس قدر آدم بیزار ہے تو مزار پر آنے کی بجائے قبرستان چلا جا"۔ تیمور نے نہایت شرمندگی کے ساتھ معذرت طلب کی۔ آپ نے اس کو اجازت دے دی وہ آپ کا عقیدت مند ہو گیا۔

سید اشرف کی خدمت میں تیمور کا ایک امیر شیخ مرکام حاضر ہوا اس نے آپ کی کیمیائی نظروں کا وہ اثر لیا کہ وہ تخت و تاج چھوڑ کر آپ کی خدمت میں رہنے لگا اور بارہ سال تک ریاضت میں مصروف رہا اور خلافت پا کر سمرقند چلا گیا۔ سید اشرف کے مریدوں میں ہزاروں کی تعداد میں ازبک، ابرمک، چغتاق، لاچین اور قوچیں قبائل شامل ہو چکے تھے۔ اس طرح آپ کے مریدین کی ایک فوج تیار ہو چکی تھی تیمور جب سمنان پر قابض تھا تو اس کو معلوم ہوا کہ سمنان کے سابق والی سمنان پر تیمور کے خلاف لشکر کشی کر رہے تھے۔ تیمور سید اشرف کے انوار اور جلالیت سے واقف تھا۔ اس نے اپنے امیر جمشید بیگ کو بے شمار لعل و جواہر دے کر سید اشرف کی خدمت میں بھیجا اور عرض کی کہ "اگر اس غلام کا سر چاہیے تو میں خود آپ کے قدموں میں پیش کرتا ہوں"۔ سید اشرف نے لعل و جواہر لوگوں میں تقسیم کر دیے اس بات پر امیر جمشید بڑا چراغ پا ہو گیا اور کہنے لگا "حضرت! یہ جواہر ہم نے سالوں جنگوں میں لڑائی اور تباہی کے ذریعے حاصل کیے تھے جن کو آپ نے اس طرح ضائع کر دیا"۔ اس پر سید اشرف نے فرمایا "تمہیں جواہر کی پرکھ ہی نہیں آتی۔ ورنہ تم تیمور جیسے پتھر کی پوجا کی بجائے اپنے خدا کی عبادت کرتے"۔ امیر جمشید پر اس بات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً آپ کے ہاتھ بیعت کر کے ایسی ریاضت میں مصروف ہوا کہ عمر بھر اشرف کے ساتھ رہا اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔

☆☆☆

بنارس کے ایک مندر میں پتھر کا بت کچھ عجیب طریقہ سے بنا ہوا تھا جب وہ آنکھیں کھولتا تو مندر جگمگا اٹھتا۔ اس کرامت کو دیکھنے کے لیے ہندوستان کے طول و عرض سے ہندو یاتری اس مندر میں آتے۔ سید اشرف جب بنارس تشریف لے گئے تو آپ نے بھی اس مندر میں جا کر بت کو دیکھنے کا ارادہ کیا جب آپ مندر میں داخل ہوئے تو وہاں کا بڑا یاتری جو کہ سید اشرف کی ریاضت و کرامات سے واقف تھا۔ آپ کو اندر لے گیا۔ بت کی روشنی پھیلانے

والی آنکھوں کی کرامت دکھائی۔ اور کہنے لگا "دیکھیے! آپ اپنے اَن دیکھے بھگوان کو مانتے ہیں جب کہ ہمارا بھگوان پتھر کا ہے پاک صاف اور ٹھوس ہے۔
سیّد اشرف اس کی باتیں سن کر مسکرائے۔ اور بت دیکھا۔ ان کا دیکھنا تھا کہ بت ریت کی مانند زمین بوس ہوگیا۔ ہندو پنڈت اور پجاری اس کو نظروں کا فریب سمجھے۔ اسی اثناء میں مندر میں اس قدر تاریک اندھیرا چھا گیا کہ پجاریوں پر سکتہ طاری ہوگیا اور بڑا پجاری بالکل پتھر کا ہوگیا۔ پجاریوں نے اس کو دوبارہ اصلی حالت میں لانے کے بڑے بڑے جاپ کیے مگر بے سود۔ پجاری سیّد اشرف کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن سیّد اشرف نے ان کو کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا جس سے ان کا مندر دوبارہ آباد ہوسکتا تھا اور پنڈت اصلی حالت میں آسکتا تھا۔ وہ واپس چلے گئے۔ اپنی ہندو ریاضت بدستور کرتے رہے آخر کار تمام کے تمام پجاری سیّد اشرف کے قدموں میں گر گئے اور اسلام قبول کیا۔ یوں بڑا پجاری بھی پھر اصلی حالت میں آگیا اور سیّد اشرف کا مرید ہوگیا۔ رفتہ رفتہ پورے کا پورا بنارس سیّد اشرف کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا۔ اور اس مندر اور بت کا نام و نشان مٹ گیا۔

سیّد عبدالرزاق سیّد اشرف کی روحانی اولاد کہلاتے تھے۔ ان کا لقب نورالعین تھا انھوں نے بارہ سال کی عمر سے سیّد اشرف کی خدمت کرنا شروع کی اور اڑسٹھ سال تک سیّد اشرف کی خدمت میں رہے اور ایک سو بیس ۱۲۰ سال کی عمر تک سجادہ نشین رہے۔

سیّد اشرف نے پوری دنیا کی سیاحت کی ایک سو نوے اولیاء کرام سے فیض حاصل کیا ان کے مرید بھی بڑے صاحبِ کرامت تھے آپ کے مرید سیّد عبدالرؤف کو آپ نے دہلی جانے کا حکم دیا۔ وہ پیدل دلی گئے اور ان کے تلوے خون آلود ہوگئے لیکن عزم زندہ رہا۔ اس حالت میں جب وہ سیّد اشرف کی خانقاہ پہنچے تو مرشد نے سیّد وہاب کو اپنے پاپوش عطا فرمائے جن کو چوم کر سیّد وہاب نے سَر پر رکھ لیا۔
سیّد اشرف نے بابا فرید شکر گنج، معین دین چشتی اجمیری، خواجہ گیسو دراز اور حضرت شہاب الدین نقش بندی کے آستانوں پر حاضری دی اور روحانی فیض حاصل کیا۔
۲۷ محرم ۸۰۸ھ کو آپ نے اپنے تمام مریدوں کو جمع کیا۔ ان کو وعظ و نصیحت کی۔ ان میں تبرکات تقسیم کیے۔ سیّد عبدالرزاق نورالعین کو سجادہ نشین مقرر کیا۔ قوالوں سے سعدی کی غزل سنی۔ غزل کے اشعار اور قوالوں کے ساز و سوز نے ان کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپا دیا اور اسی حالت میں آپ کا وصال ہوگیا۔ آپ کی عمر وصال کے وقت ۱۲۰ سال تھی۔
آپ کا مزار آسیب کے مریضوں کے لیے چشمۂ شافی ہے جو وہاں حاضری دیتا ہے اس کا آسیب دُور ہوجاتا ہے۔

صالحین
میں سے ایک شخص کا کہنا ہے "میں نے ایک غلام خرید لیا تھا۔ میں نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟"
غلام نے جواب دیا "آقا! جو بھی آپ رکھ لیں۔"
[illegible]
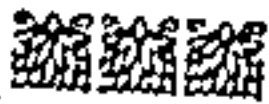
امام رازیؒ

کا ایک ارادت مند غصّے میں بڑبڑاتا اور ہول ہکتا رازی کے سامنے پہنچا۔ رازی نے نہایت تحمل سے پوچھا "یہ تم اپنے آپ سے کیوں گزر رہے ہو؟"
مشتعل شخص نے جواب دیا "حضور! ان کلتہ چینوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے اور میرے عیب بڑھا کر بیماریاں پھیلانے والی مکھیوں کی طرح ہر وقت میرے آس پاس بھنبھناتے رہتے ہیں!"
رازی نے نہایت تحمل سے جواب دیا "اس سلسلے میں تمہیں ایک ہی مشورہ دے سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم اپنے دل کی قوت پوری طرح کام میں لا کر عیب جو اور نکتہ چیں حضرات کو یوں نظر انداز کر دیا کرو گویا تم عبادت میں مصروف ہو؟"

وہ ایک شاندار اور عالی شان عمارت کے آثار تھے جو آہستہ آہستہ تکمیل کے مراحل کے دوران اُبھر کر سامنے آرہے تھے۔ عمارت کی طرزِ تعمیر اور اُس کی وسعت اس بات کی غماز تھی کہ اس پر غیر معمولی زرِ کثیر خرچ کیا جارہا تھا جو نہ لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ ہندسوں میں تحریر ہوسکتا ہے۔ دِلی والے حیرت سے اُس عالیشان عمارت کو تعمیر ہوتا دیکھ رہے تھے اور زیادہ حیرانگی اُنھیں اس اَمر پر تھی کہ اس کثیر المصارف منصوبے کا مالک سیدی مولہ نامی وہ اجنبی ہے جسے دِلّی والوں نے حال ہی میں شہر وارد ہوتے دیکھا تھا، جو اس حالت میں تھا کہ اُس کی ظاہری حالت اُس کی معاشی بدحالی کا مُنہ بولتا ثبوت پیش کررہی تھی، جو اس شہر میں بے نوا تھا، بے سہارا تھا۔ نہ کوئی ہمدرد تھا اُس کا، اس اجنبی شہر میں نہ کوئی شناسا۔ نہ حکومت نے اُس کی سرپرستی کرتے ہوئے وظیفہ مقرر کیا تھا نہ کوئی گاؤں جاگیر بخشی تھی۔ پھر یک لخت اس کنگال درویش کے پاس اس قدر سرمایا کہاں سے آگیا کہ وہ اس منفرد اور یکتا، روزگار عمارت کی تعمیر کرا رہا ہے؟ یہ تھا وہ سوال جو دِلّی کی عوام و سرکار میں یکساں زیرِ بحث تھا۔ حکومتی اہلکار اور لوگ جب عمارت کے مزدوروں کے پاس معاوضہ میں ملے چمکتے دمکتے سونے و چاندی کے نئے سکّے دیکھتے تو انگشت بدنداں رہ جاتے۔ لوگ خیال کرنے لگے کہ یہ شخص جو سیدی مولہؒ کے نام سے خود کو درویش ظاہر کیے ہوئے ہے یقیناً کوئی دُنیا دار انسان ہے۔ سرکاری حُکام کو شبہ تھا کہ اس نے کہیں غیر قانونی ٹکسال لگا رکھی ہے جہاں چاندی اور سونے کے سکّے ڈھالے جاتے ہیں۔ غرض ہر شخص دن رات اُس درویش کی ٹوہ میں رہنے لگا۔ سرکاری حکاّم نے اُس کی باقاعدہ جاسوسی کے لیے ایک شعبہ بنا کر نگرانی شروع کردی مگر وہ اس راز کو نہ پاسکے کہ آخر یہ دولت اس اجنبی کے پاس آتی کہاں سے ہے؟ اس محاسبے میں اگرچہ اُس کی اَمارات کا راز تو فاش نہ ہوسکا البتہ اُس کی درویشی مزید مشکوک بن کر اُبھری۔ کیونکہ لوگوں نے جو اُسے مسلسل اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا کسی لمحہ بھی عبادت و ریاضت میں مشغول نہ پایا تھا جو درویشوں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ نہ کبھی اُنھوں نے اُس سیدی مولہؒ نامی شخص کو نماز ادا کرتے دیکھا۔ خانقاہ میں چھپ کر وہ عبادت کرتا ہو تو علیحدہ بات ہے ورنہ لوگ اَب اس درویش کی درویشی کو مکمل شبہ سے دیکھ رہے تھے۔

لوگوں میں پھیلی اس غیر یقینی کی فضا میں عمارت کی تعمیر مسلسل ہوتی رہی اور خانقاہ کی تعمیر مکمل ہوتے ہی لوگوں کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا تب لگا جب اُس عمارت میں ایک عظیم الشان لنگر جاری کیا گیا جہاں سینکڑوں نہیں ہزاروں افراد کے لیے لذیذ ترین کھانوں

کے انبار لگنے لگے۔ زمانے بھر کے ستائے، معذور، بے سہارا، بے روزگار، دکھوں کے مارے اور پریشان حال، مجمع کی صورت میں آتے پناہ لیتے اور پیٹ بھر کھانا کھا کے خدا کا شکر ادا کرتے اور وہیں کے ہو رہتے۔ یہ ایک نئی صورتحال تھی جو دلی کے حکام اور امراء کے سامنے آئی تھی، وہ حیرت سے یہ سب دیکھتے اور تجسس سے دوچار ہو جاتے۔ آخر جب ضبط کا یارا نہ رہا تو انھوں نے اس عجیب و غریب شخص سیدی مولہؒ سے ملنے کا فیصلہ کیا چنانچہ وہ اُس کی زیارت کو خانقاہ جاتے جہاں سیدی مولہؒ اُن کا انتہائی پُرجوش انداز میں استقبال کرتا۔ خوش خلقی سے پیش آتا اور جب یہ امراء اور حکام دل میں سیدی مولہؒ کی پُراسرار مکین مقدس و سکون بخش محبت سے اُٹھ کر واپس آنے لگتے تو انھیں حیرت کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا جب سیدی مولہؒ اُن کے ہاتھوں میں ہزار ہا کی تعداد میں بھری اشرفیاں کی تھیلی تھماتا جسے وہ عقیدت واحترام اور حیرانگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ تھام لیتے۔ یہ طرزِ عمل یقیناً اُن کے لیے ایک چونکا دینے والا عمل ہوتا۔

سیدی مولہؒ عموماً چادر لپیٹ کر دراز ہوتے تھے۔ آس پاس ہر وقت ضرورت مندوں کا ہجوم ہوتا۔ ان میں وہ حاجت مند بھی ہوتے جو بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ کوئی اس قدر بڑھاپے کا شکار تھا اور لاولد تھا کہ دُنیا میں بے سہارا و لاچار تھا کوئی صاحبِ اولاد تھا مگر اولاد ایسی کہ نالائق اور نافرمان کے زمرے میں آنے والی۔ سو اولاد کے ہاتھوں تنگ آنے والے بھی مدد کے طالب ہوتے تو ملازمت سے نکالے جانے والے بھی، بے روزگار حالات کے ہاتھوں معتوب ہونے والے بھی اور سرکاری معتوب بھی غرض مُصیبت زدہ اور حاجت مندوں کا ایک ہجوم ہوتا جس میں سیدی مولہؒ گھرے ہوتے۔ سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ ضروریات پُوری کرتے۔ کسی سے کہتے جاؤ بستر کے نیچے ہاتھ ڈال کر جو ملے نکال لو۔ جب حاجت مند ایسا کرتا تو اشرفیوں سے بھری تھیلی پاتا، کسی کو حکم ملتا "جاؤ ہانڈی میں جو کچھ ہے نکال لو۔" تو وہ بھی اشرفیوں بھری تھیلی ہی نکالتا۔

اسی طرح ایک دن سیدی مولہؒ حاجت مندوں میں گھرے اُن کی ضروریات پُوری کر رہے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر سا شخص مجمع کو چیرتا آپ کے نزدیک آن بیٹھا۔ اور لگا زارو قطار رونے۔ اُس کی حالت دیکھ کر اکثر کا دل بھر آیا۔ لیکن سیدی مولہؒ بے نیازی سے بیٹھے اُسے روتا دیکھ رہے تھے۔ کافی دیر گزر گئی مگر اُس کی ہچکیاں تھمنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ تب سیدی مولہؒ ہنس کر اُس سے بولے "اب یہ رونا بند کرو اور جو تکلیف ہے وہ بیان کرو۔ تمہارا یہ مگرمچھ کے آنسو بہانا مجھے متاثر نہیں کرے گا۔"

وہ شخص یہ سُن کر آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُٹھا کر شاکی نظروں سے دیکھنے لگا اور درد بھرے انداز میں بولا "واہ سیدی صاحب! مَیں تو آپ کو ہمدرد اور شفیق درویش سمجھ کر آیا تھا لیکن آپ نے میری اس حالتِ زار پر توجہ ہی نہیں دی۔ اُوپر سے میرے غموں کے ساتھی آنسوؤں کو مگرمچھ کے آنسو کہہ کر میرے دل پر آرا چلا دیا۔ مجھ فلک زدہ، زمانے کے مارے کو کیا معلوم تھا کہ آپ کی خانقاہ سے بھی مَیں نامراد ہو کر نکلوں گا۔" یہ کہہ کر اُٹھنے لگا تو سیدی مولہؒ نے ہنس کر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ "تم چلے کہاں؟ ہم نے کب تمہیں لوٹ جانے کو کہا ہے۔ جو کہنا ہے فی الفور کہہ دو۔ دوسروں نے بھی اپنا حال سنانا ہوتا ہے۔"

یہ سُن کر وہ شخص بیٹھ گیا اور کہنے لگا "حضرت کل تک مَیں بھی اس دُنیا کا معزز انسان تھا۔ لوگ سر جھکا کر سلام کرتے تھے لیکن جونہی بادشاہ کے دربار سے دھتکارا گیا اُس کا معتوب قرار دیا گیا تب سے دُنیا نے بھی نظریں پھیر لی ہیں۔ نہ کوئی ہمدرد ہے کوئی غمگسار۔ سرکاری اہلکار میری تلاش میں ہیں۔ نہ ملازمت کر سکتا ہوں نہ کہیں جم کر ملازمت کر پاتا ہوں۔ اُوپر سے صاحبِ اولاد ہوں ایک بیٹا ہے بے روزگار۔ چار جوان جہان بیٹیوں کا بوجھ کندھوں پر ہے۔ بیوی بیمار ہے دوا دارو کے لیے رقم نہیں۔ گھر فاقہ کشی کی زد میں ہے اب آپ ہی مجھ پر انصاف فرمائیں، میری معاشی بدحالی کو دُور کریں۔"

سیدی مولہؒ نے اُس کی داستان کا رتی برابر اثر نہ لیا اور غیر متاثر لہجے میں بولے "تمہاری ضروریات کیا ہیں؟ آخر پتہ تو کچھ کریں۔"

یہ سُن کر وہ شخص بولا "حضرت میری خواہش ہے کہ جوان بیٹیوں کا بوجھ سب سے پہلے کندھوں سے اتاروں۔ اگر اس مد میں

ر اشرفیاں مل جائیں تو میرا یہ بوجھ بڑی آسانی سے اُتر جائے گا۔"
"ٹھیک ہے، اور کچھ؟" حضرت سیدی مولہؒ بولے۔
"اور ..... اور یہ کہ میری بیمار بیوی کا علاج ہونا ہے اُس کے علاج پر بھی کم از کم پانچ ہزار اشرفیاں خرچ ہوں گی۔ اگر یہ پانچ ہزار اشرفیاں مل جائیں تو میری بیوی صحت یاب ہو جائے گی۔"
"اور کچھ؟" سیدی مولہؒ "اور کچھ" کو اپنا تکیہ کلام ہی بنا کر دوبارہ بولے۔
"اور یہ کہ حضرت میں چاہتا ہوں کہ کہیں دل لگا کر کاروبار کروں تاکہ پھر در در کی ٹھوکریں نہ کھانا پڑیں۔ آج کل معمولی سے کاروبار کے لیے بھی کم از کم دس ہزار کی ضرورت ہوتی ہے اگر آپ مجھے دس ہزار اشرفیاں عنایت فرما دیں تو میں دیانت داری سے اپنا کاروبار چلاؤں اور سکھ سے رہوں۔"
"ٹھیک ہے یہ بھی ہو جائے گا اور کوئی خواہش؟"
وہ شخص بھی بڑے درجے کا حریص ثابت ہوا ــــ فوراً بولا "حضرت اب اور کیا عرض کروں حالات کی گردش میں آکر آٹھ اشرفیوں کا مقروض ہو چکا ہوں۔ قرض خواہوں سے منہ چھپائے پھرتا ہوں۔ اگر آپ میرا یہ بوجھ بھی اتار دیں تو کرم ہوگا۔"
سیدی مولہؒ بولے "اور کچھ؟"
"نہیں حضرت۔ فی الحال تو یہی بہت ہے۔ آپ یہی کر دیں تو بندہ پروری ہوگی۔ اب آگے کیا عرض کروں۔"
یہ سن کر سیدی مولہؒ بولے "ٹھیک ہے تم کل رقم بتاؤ کتنی رقم بنتی ہے۔"
وہ شخص منہ ہی منہ میں رقوم جمع کرتا رہا پھر کچھ دیر بعد بولا "حضرت کل رقم ۲۵ ہزار بنتی ہے۔ آپ خود بھی حساب لگا لیں۔"
یہ سن کر سیدی مولہؒ ہنس پڑے اور بولے "تم ایک حریص اور لالچی انسان ہو۔ ساتھ میں دغا باز اور جھوٹے بھی لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تم ہماری خانقاہ سے نامراد ہو کر لوٹو۔ جاؤ وہ سامنے دیگ رکھی ہے اُس کے نیچے سے اشرفیاں نکال لو۔ اگرچہ وہ بنتی تو ہزار ہیں لیکن تم نے چونکہ ۲۵ ہزار کہا ہے سو تمہیں اتنی ہی ملیں گی جتنی کہ تم نے خواہش ظاہر کی ہے۔"
یہ سن کر وہ شخص بھاگا بھاگا دیگ کے پاس پہنچا اور اُسے کھسکا کر نیچے سے اشرفیوں کی تھیلیاں نکالنے لگا۔ جو کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد اُس کے ہاتھ میں آگئیں۔ اُس شخص نے بے چینی دبے قراری سے اُسے کھولا تو اُس کی نگاہیں ایک دم خیرہ ہو گئیں۔ اندر سونے کی اشرفیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ شخص حیران تھا کہ آخر یہ اشرفیاں آئی کہاں سے اور پھر اتنی ہی مقدار میں جتنی کہ اُس نے خواہش کی تھی لیکن پھر سر جھٹک کر وہ شخص سیدی مولہؒ کے پاس گیا اور بولا "حضور تھیلیاں بندے کو مل گئی ہیں میں کس منہ سے آپ کا شکر ادا کروں۔ آپ نے اس غریب پر کرم نوازی کر کے اسے غلام بنا لیا ہے۔"
حضرت سیدی مولہ نے اُسے گھور کر دیکھتے ہوئے غصے میں کہا "اے دغا باز انسان اب یہ الفاظی رہنے دے ہم جانتے ہیں کہ تم نے ہمارے سامنے جو کچھ بیان کیا ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ تمہاری ساری داستان غلط ہے۔ اس میں رتی برابر سچ نہیں۔" یہ سن کر وہ شخص تھر تھر کانپنے لگا۔
سیدی مولہ نے پھر ایک دم نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا "درومت۔ بے شک تم جھوٹے انسان ہو لیکن ہم یہ گوارا نہیں کرتے کہ ہماری خانقاہ سے کوئی ناامید ہو کر واپس ہو۔ پھر تم بادشاہ کی طرف سے بھیجے گئے ہو۔ تم اُس کے جاسوس ہو۔ تم یہ جھوٹی داستان بادشاہ ہی کی ایما پر بنا کے لائے تاکہ جب ہم تم پر ترس کھا کر تمہاری امداد کریں۔ تب تم اُس جگہ کو دیکھو جہاں سے ہم تمہیں اشرفیاں فراہم کردیں۔ تاکہ تم بادشاہ کو جا کر بتا سکو کہ اشرفیاں کہاں سے نکلتی ہیں اور وہ جگہ تم نے اب دیکھ تو لی ہے جاؤ اب اپنے بادشاہ کو بتاؤ کہ دیگ کے نیچے والی زمین اشرفیاں اُگلتی ہے۔ اگر تم اپنی کارکردگی کا بادشاہ پر مزید رعب ڈالنا چاہو تو ہم تمہیں چند اور جگہیں بھی دکھا سکتے ہیں جہاں سے ہم اشرفیاں نکال کر حاجت مندوں کی خدمت میں دیتے ہیں لیکن یہ سب فضول ہوگا۔ تم اپنے بادشاہ

سے کہا "فقیروں اور درویشوں کی ٹوہ میں رہ کر اُسے کچھ نہیں ملے گا' ہم تو وہ ہیں کہ پتھروں کے ڈھیر پر نظریں گاڑیں تو وہ سونے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گا۔ جا اُس دُنیا دار بادشاہ سے کہہ دے اللہ والوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دے کہیں اُس کی چھیڑ خانی اُس کے لیے کسی نقصان کا پیش خیمہ نہ ثابت ہو۔"

یہ سُن کر وہ شخص آپ کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر معافی مانگنے لگا ساتھ ہی کہتا جاتا "حضرت جو کچھ آپ نے فرمایا سچ ہے حرف بحرف سچ ہے۔ سیّدی مولہ! مجھے معاف کر دیں۔ میں بادشاہِ وقت کے کہنے میں آ کر آپ کی عظمت کو جھٹلا بیٹھا۔"

سیّدی مولہ نے اُسے دیکھا اور پھر کہا "جو ہُوا سو ہُوا، اب تم یہ اشرفیاں لے جاؤ اور آئندہ اس بات کا خیال رکھنا کسی درویش کی ٹوہ میں رہنا ہے تو پہلے انجام کی خبر سوچ لینا۔" وہ شخص یہ سُن کر ہتھیلیوں سمیت تھر تھر کانپتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

سیّدی مولا اس بات کے قائل تھے کہ ہر گناہ کا پس منظر صرف اور صرف معاشی بدحالی ہے۔ معاشی پریشانیوں میں اُلجھا انسان ہی ہر اُلٹا کام کرنے کے لیے آمادہ رہے گا۔ یہ وہ موذی مرض ہے جو ہر خرابی کی جڑ ہے۔ اگر اس مرض کو ہی ختم کر دیا جائے تو انسان بہت حد تک برائی کی دلدل سے نکل آئے گا۔ سو آپ نے اس بات کو ہی اپنا مشن بنا لیا اور دن رات لوگوں کی معاشی بدحالی علاج اور تدارک کرنے میں گزار دیتے۔ خود سیّدی مولہ کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ کروڑہا اشرفی لوگوں میں بانٹنے والا خود سادہ لباس میں رہتا ہے۔ خوراک کے نام پر چاول پانی میں بھگو کر کھاتا ہے یا روٹی کو شوربے میں ڈبو کر نرم کرتا ہے' پھر کھاتا ہے۔

دوسری طرف خانقاہ کا خرچ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ دُور دُور سے آنے والے مسافر بجائے سرائے میں ٹھہرنے کے خانقاہ کا رُخ کرنے لگے۔ منوں کے حساب سے گندم' چاول' گھی' آٹا آتا اور سب گھنٹوں میں صرف ہو جاتا اور لوگ حیرت زدگی سے کھاتے بھی جاتے اور سوچتے بھی رہتے کہ آخر اتنا سب کچھ آ کہاں سے رہا ہے۔ آخر سیّدی مولہ کی آمدنی کے وہ کون سے ذرائع ہیں جو اس قدر خلقت کو نواز رہے ہیں۔ شاہِ ہند بلبن کا انتقال ہوا تو نئے آنے والے بادشاہ نے ہزاروں کی تعداد میں پرانے ملازم نکال کر اپنے حامی رکھ لیے۔ سو ان پُرانے ملازموں کی پناہ گاہ سیّدی مولہ کی خانقاہ بنی۔ اس طرح خانقاہ کے مصارف اور بڑھ گئے۔ لوگ ہزارہا کی تعداد میں آتے خوراک کھاتے اور جاتے ہوئے کچھ نہ کچھ نقدی کی صُورت میں بھی لے کر پلٹتے۔

لوگ آتے اور کہتے "حضرت ہم پر اتنے افراد کی کفالت کا بار ہے دُعا کریں۔"

سیّدی مولا جواب دیتے "نہیں! دُعا سے کام نہیں بنے گا۔ تمہیں دُعا سے زیادہ دوا کی ضرورت ہے۔ یہ معاشی بدحالی وہ چیز ہے جو انسان کو خدا تک سے مُنکر کرا دیتی ہے۔" اس کے بعد کہتے "جاؤ سامنے والے طاق میں سے جو کچھ ملتا ہے لے لو۔"

اسی طرح ایک مرتبہ ایک لنگڑا شخص سیّدی مولہ کے پاس آیا اور کہنے لگا "حضرت نئے بادشاہ نے مجھے اپنی ملازمت سے بے دخل کر دیا ہے میں کنبہ دار آدمی ہوں اب کہاں سے اُن کے لیے کھانے کا بندوبست کروں؟"

آپ نے دریافت کیا "تمہارا کنبہ کتنے افراد پر مشتمل ہے؟"

وہ شخص ادب سے بولا "پانچ افرادِ خانہ ہیں۔"

اس پر سیّدی مولہ بولے "ٹھیک ہے تم ہمارے کسی آدمی کو اپنا گھر دکھا دو تمہیں دو وقت کھانا گھر پہنچ جایا کرے گا۔"

یہ سُن کر اُس لنگڑے شخص نے بجائے شکریہ ادا کرنے کے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا "حضرت یہ آپ کیسا فیصلہ سُنا رہے ہیں کیا خیال ہے کہ ہمارا کنبہ صرف کھانے پینے کی ہی ضروریات رکھتا ہے۔ واہ حضرت واہ! کیا ہماری اور کچھ ضروریات نہ ہوں گی۔ ایسا آپ نے کیسے سمجھ لیا؟"

یہ سُن کر سیّدی مولہ ہنس پڑے اور بولے "بڑا بے صبرا شخص ہے۔ بھئی! پہلے ہماری پُوری بات تو سُن لی ہوتی۔ تُو نے ہماری بات سُنی ہی کہاں ہے جو ہمارے فیصلے کو غلط قرار دے رہا ہے۔" پھر آپ نے حکم دیا "جاؤ جا کر اُس سوراخ میں ہاتھ ڈال کر جو ملے

د۔" یہ سُن کر وہ لنگڑا نوجوان سوراخ تک گیا اور ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو ہاتھ میں ایک بھاری بھرکم سونے کی اشرفیوں سے بھری
ں تھی، وہ لنگڑا نوجوان یہ دیکھ کر تشکر کے آنسو بہاتا وہاں سے واپس چلا گیا۔

جب ان حاجت مندوں کا سلسلہ ذرا تھما تو آپ نے اپنے ایک خاص مُرید کو بُلایا اور اُسے کہا" جاؤ دیکھو خانقاہ میں بادشاہوں
تو ب زدہ کتنے سرکاری اہلکار و حکام ہیں۔"

مُرید یہ سُن کر چلا گیا اور واپس آکر بولا" حضرت ان میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں سرکاری ملازم ہیں۔"

یہ سُن کر سیّدی مولہ سوچوں میں گُم ہو گئے۔ اُن کی آنکھوں میں پاکپتن کا وہ مقام گھوم گیا جہاں حضرت بابا فرید گنج بخش شکرؒ کا قیام
تھیں وہ باتیں وہ منظر یاد آنے لگا جب وہ پہلی مرتبہ بابا فرید سے ملے تھے۔ وہ اُن کے لیے اجنبی تھے پہلے کبھی نہیں اُن سے ملے تھے۔
بافرید نے انھیں دیکھتے ہی اُن کو اُن کے اصلی نام سے پُکارتے ہوئے کہا۔"سیدی مولہ! ہم جانتے ہیں تو کس ارادے سے ہمارے
ہے اور آگے چل کر کیا کرنے والا ہے۔"

پھر اُنھوں نے آنکھوں میں کرب آمیز پرچھائیوں سے اُنھیں دیکھتے ہوئے نصیحت کی" یاد رکھ بابا فرید کی نصیحت ہمیشہ یاد رکھ۔
بھی تو ہم سے جُدا ہو۔ اس جگہ سے باہر کہیں بھی ڈیرہ جمائے تو ہرگز امراء کو ساتھ نہ بٹھانا۔ ہم فقیروں کو امراء کی صحبت راس نہیں
بھی طرح ذہن نشین کر لے کہ ملوکیت اور امارت کا سایہ تجھے کبھی راس نہ آئے گا۔ تُو ان امراء سے اس طرح بھاگنا جس طرح سورج سے
ے بھاگتے ہیں۔"

لیکن آج سیّدی مولہ کے آس پاس سرکاری حکام اور امراء کا ایک ہجوم تھا اور وہ تھے۔ سیّدی مولہ نے غمزدہ ہو کر زیرِ لب کہا:
ید! آپ ہی بتائیں ہم ان سرکاری حکام سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔ یہ بے چارے حالات کے مارے ہوئے ہیں۔ گردشِ زمانہ کے
ہوئے اور وہ ربِ عظیم جو ربّ العالمین ہے سب انسانوں کا پالن ہار، بلا تمیز انسانوں کا رازق اور پھر میں، جسے اُس نے اس رزق کی
ریقہ سونپا ہے کس طرح اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انسانوں میں فرق روا رکھے۔ میں بھلا ایسا کیونکر کر سکتا ہوں۔"

اور پھر ایک دن کیقباد کی بھی حکومت کو زوال آگیا اور اقتدار اُس سے چھن گیا۔ اب پھر سرکاری ملازم زیرِ عتاب آ گئے اور پھر اُن
ی ٹھکانہ سیّدی مولہ کی خانقاہ ہوتی۔ اس طرح ایک بار پھر آپ کی خانقاہ میں لوگ جوق در جوق آنا شروع ہو گئے اور اس طرح
کا خرچ بھی پھیلتا گیا۔

ایک دن خانقاہ کے سامنے ہزارہا لوگوں کا مجمع آن لگا اور وہ آہ و فغاں مچی کہ کان پڑی آواز تک نہ سنائی دی۔ سیّدی مولہ نے
سے یہ بے ہنگم شور سُنا تو وہ باہر نکلے۔ اُن کے باہر نکلتے ہی خانقاہ کے سامنے جمع ہجوم میں ایک جوش و خروش پیدا ہو گیا اور ہر
گے بڑھ کر آپ کو صورتحال سے آگاہ کرنے کا خواہشمند ہوا۔ آپ نے جب یہ حال دیکھ کر ہاتھ اُٹھا کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ
ک دم مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ تب آپ نے اپنی گرجدار آواز میں کہا" تم لوگوں نے اگر مجھ سے کچھ کہنا ہے تو اس طرح شور و غل
کے کیوں دیر کر رہے ہو۔ تم لوگ اپنا ایک نمائندہ یا چند ایسے آدمی ہمارے پاس بھیج دو جو تمہارے مسائل بہتر طریقے سے ہمیں
ں۔"

بات صاف اور سمجھ میں آ جانے والی تھی۔ سو مجمع بھی جلد ہی اسے سمجھ گیا اور پھر مجمع میں تھوڑی سی ہلچل ہوئی اور چند آدمی مجمع کو
ھکوں سے چیرتے باہر نکلے اور آہستہ آہستہ چلتے سیّدی مولہ کے نزدیک آن کھڑے ہوئے۔ اُن میں سے ایک ذرا پُر رُعب
ر سا دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے آپ کے نزدیک پہنچ کر کہنا شروع کیا" حضرت بندے کو جلال الدّین کاشانی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ
ں مجمع میں شامل پریشان حال لوگوں میں سے نہیں ہوں مگر چونکہ میں ایک حساس اور ترحم طبیعت کا مالک ہوں اس لیے ان سے
ندی ہونے کے ناطے میں سمجھتا ہوں کہ ان دُکھوں کے مارے لوگوں کے مسائل میں بہتر طریقے سے آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔"
سیّدی مولہ نے اُس کی بات غور سے سُنی پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر نرمی سے بولے" اتنی لمبی چوڑی تہمید بیان کرنے

سے بہتر ہے کہ مقصد کی بات پہلے کر لی جائے۔
کاشانی نے شرمندگی سی محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہنا شروع کیا۔" حضرت آپ فخرالدین کوتوال سے تو واقف ہی ہوں گے۔ ان کی وفات ہو چکی ہے اور یہ پریشان حال لوگ جو اس وقت آپ کے سامنے بڑی اُمیدیں وابستہ کر کے آئے ہیں۔ بیکار ہو چکے ہیں اور نہ ہی ان کو روزی فوراً ملنے کی کوئی اُمید ہے۔ چونکہ ہر فرد ایک کنبے کا سرپرست ہے۔ اس لیے لازمی طور پر فکرمندی میں ہے کہ اب اُن کی خوراک کا انتظام کہاں سے کرے۔ کیونکہ شاہی خزانہ اتنا بوجھ تو سہہ نہیں سکتا کہ ہزارہا آدمیوں کو لامحدود مدت کے لیے روزانہ خوراک مہیا کرتا رہے اس لیے لوگ آپ کی خانقاہ پر اُمیدیں وابستہ کیے آئے ہیں کہ سیدی مولہ کی خانقاہ جہاں پہلے ہی سے ہزارہا لوگ فیض یاب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ وہاں ان بدنصیبوں کے دُکھوں کا بھی مداوا ہو جائے گا۔"

امیر کاشانی کی بات سُن کر سیدی مولہ نے مجمع کی طرف دیکھا اور پھر کاشانی سے مخاطب ہو کر کہا۔" ان سب سے کہہ دو کہ جب تک ان کے معاشی مسئلے کا حل نہیں نکلتا تب تک یہ لوگ اس خانقاہ سے ہی کھانا اور روزمرہ کے اخراجات کے لیے رقم وصول کر لیا کریں۔"

امیر کاشانی آپ کی بات سُن کر خوشی سے کھل اُٹھا۔ اُس نے اور اُس کے ساتھ آئے آدمیوں نے آپ کا بہت دلی شکریہ ادا کیا اور مجمع کو اس بات کی خوش خبری دینے کے لیے اُن میں شامل ہو گئے۔

اس طرح سیدی مولہ کی خانقاہ جو پہلے ہی ہزارہا افراد کا معاشی بوجھ سنبھالے ہوئی تھی وہاں اب ان نئے آنے والوں کی کفالت کا انتظام بھی انتہائی خوش اسلوبی سے کیا جانے لگا۔

اس واقعے کے ایک دو دن بعد امیر کاشانی دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑی ہی عاجزی اور انکساری سے بولا۔
" حضرت آپ کے پاس آکر آپ کی صحبت میں بیٹھ کر مجھے دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مَن پر پڑا منوں وزنی بوجھ فوراً اُتر گیا ہو۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں روزانہ ہی آپ کی خانقاہ میں حاضری دینے آجایا کروں؟"

کاشانی کی بات سُن کر سیدی مولہ بولے" امیر کاشانی بادشاہوں کی صحبت میں رہتے رہتے تجھے درویشوں کے طور طریقے کا ہی نہیں رہا۔ کاشانی یہ خانقاہ کسی بادشاہ کا محل نہیں ایک فقیر کا ڈیرہ ہے جہاں بلا اجازت، بلاتفریق ہر کوئی ہر وقت آسکتا ہے اور تب تک رہ سکتا ہے جب تک اس کا مَن چاہے۔ بھلا کبھی درویشوں سے بھی اُن سے ملنے کی اجازت طلب کی جاتی ہے۔ تو جب شوق سے آ اور جب تک تیرا دل چاہا کرے رہا کر۔"

آپ کی یہ بات سُن کر امیر کاشانی کے چہرے پر مسرت پھیل گئی اور اُس نے خوش ہو کر وہیں حضرت سیدی مولا کے قدموں میں بیٹھ کر باتیں چھیڑ دیں۔

اب یہ امیر کاشانی کا معمول بن چکا تھا کہ جب بھی وہ دُنیاوی کاموں سے فارغ ہوتا سیدھا آپ کی طرف آجاتا اور گھنٹوں آپ کی صحبت میں رہا کرتا۔

ایک دن امیر کاشانی حسبِ معمول سیدی مولا کے پاس بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ دو آدمی آپ کے حجرے میں داخل ہوئے جو خانقاہ میں ہی ایک طرف بنا ہوا تھا۔ یہ دونوں اشخاص جنہوں نے چادر سے اپنے چہرے تقریباً ڈھانپ رکھے تھے علاقے کے دو مشہور ہندو گھرانوں کے سربراہ تھے۔ ان میں ایک غیاث الدین بلبن کے زمانے میں شہر کا کوتوال رہ چکا تھا جب کہ دوسرا پہلوان اوّل الذکر کا نام برنا بھن اور موخرالذکر ہیتا پالک کہلاتا تھا۔ دونوں کو معاشی مجبوری سیدی مولہ کے پاس لے آئی تھی لیکن جب اُنہوں نے سیدی مولہ کے سامنے شہر کے ایک مسلمان امیر کو بیٹھے دیکھا تو شرم سے واپس پلٹنے لگے لیکن سیدی مولہ کی نظر بھی اُن پر پڑ چکی تھی انھوں نے انہیں آواز دے کر بُلایا اور پوچھا" تم لوگ بنا ملے ہی واپس جا رہے ہو؟"

برنا بھن ہشیار بندہ تھا فوراً ہاتھ بنا کر بولا" شرمان جی آپ کے درشن کرنا تھے سو کر لیے اب جا رہے تھے۔" یہ سُن کر امیر کاشانی

برا سا منہ بنا کر دوسری طرف رُخ کر لیا۔

ہتیا پانک پہلوان تھا۔ ڈیل ڈول بھی خاصا وزنی تھا اور جسم کی مناسبت سے دماغ بھی موٹا تھا۔ دوسرے لفظوں میں سیدھا سادہ انسان تھا۔ اُس کے پاس برناتھن جیسی بدّھی تو تھی نہیں کہ موقع محل کے مطابق بات بنا لیتا۔ سو صاف صاف جس کارن آیا تھا کہہ ڈالا:

"شریمان جی! آپ مہاتما ہیں، سنسار میں آپ جیسا دیالو نہ دیکھا نہ سُنا۔ آپ کی دیا کے چرچے سُنے تو ہم آپ کی چوکھٹ پر آ گئے۔ ہم بھی بڑے ابھاگی ہیں۔ بلبن مہاراجہ کے دربار میں تھے تو عیش میں تھے۔ وہ سورگ سدھار سے تو ہمارا بھی سہارا چھن گیا۔ آپ یُگ کے مہا دیالو ہیں۔ اس آس پر آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ کا اُپکار ہماری جیون کی نیّا کو پلٹا سے پار لگا دے گا۔"

سیّدی مولہ پہلوان کی بات سُن کر زیرِ لب مسکرائے پھر نرمی سے اُسے سمجھاتے ہوئے بولے "دیکھ بھلے انسان ہم سب یہاں کسی کے غلام ہیں خادم ہیں۔ پھر بھلا ہم میں اتنی جرأت کہاں کہ کسی دوسرے کو فائدہ پہنچا سکیں یہ تو خدا ہی ہے جو ہماری من کی کامناؤں کو پورا کرنے والا ہے۔ ہم اُس کے نائب ہیں، اللہ نے چاہا تو تم دونوں کی معاشی حالت بھی یقیناً بہتر ہو جائے گی اور تمہیں چنتا نہ کرنا پڑے گی۔"

برناتھن کو بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ چنانچہ جونہی ہتیا پانک نے اپنی بات مکمل کی برناتھن نے اُسے مزید کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور فوراً بولا: "مہاتما جی اب آ گیا دیں کل کو پھر آپ کے در پر آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم بے فکر ہو جاؤ اللہ سب کا رازق ہے۔" سیّدی مولہ نے انھیں ہاتھ اُٹھا کر جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

اُن کے جاتے ہی امیر کاشانی جو اب تک منہ موڑے بیٹھا تھا، سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سیّدی مولہ سے کہنے لگا "حضور یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ خانقاہ میں غیر مذہب کے لوگوں کو گھسنے دیا۔ کیا آپ اُن کی باتوں سے اندازہ نہیں لگا رہے تھے کہ وہ کون سے مذہب سے ہیں۔ بھلا ہندوؤں کا ایک مسلمان کی خانقاہ سے کیا تعلق؟"

"کاشانی یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو بھلا اسلام میں کب ذات پات کی تمیز سکھائی گئی ہے جو تم اب ہمیں یہ سمجھا رہے ہو۔ جہاں تک رزق کا سوال ہے تو وہ رب عظیم جو تمام انسانوں کا پروردگار ہے۔ سبھی کو رزق دیتا ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو، عیسائی ہوں یا یہودی، پھر میں بھلا اُس رب العالمین کے عطا کردہ رزق کو ہندوؤں سے دُور کیوں رکھوں سب انسانوں کا وہی پالن ہار ہے۔ رنگ کسی تعلق کے، نسل کے۔"

امیر کاشانی لاجواب ہو گیا۔ پھر بھی اپنی بات پر ڈٹے ہوئے بولا: "سیّدی مولہ پھر بھی یہ بات کیا بہتر نہیں کہ خانقاہ کو صرف مسلمانوں کے لیے ہی وقف رہنے دیا جائے۔"

"ناممکن..... یہ قطعی ناممکن ہے۔" سیّدی مولہ نے امیر کاشانی کو دیکھتے ہوئے غصّے سے کہا "خلجی امیر! اگر خدا قرآن میں یہ کہتا الحمد للہ رب المسلمین" تو پھر مَیں بھی اس خانقاہ کو مسلمانوں کے لیے وقف کر دیتا مگر ہم سب کا پیدا کرنے والا تو رب العلمین ہوتا ہے۔ تمام عالم کا رب۔"

امیر کاشانی اب اس موضوع پر بات کرنے سے ہچکچا رہا تھا چنانچہ اُس نے مزید بحث نہ کی اور خاموشی سے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سیّدی مولہ سے اجازت طلب کی اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

اگلی صبح برناتھن اور ہتیا پانک آپ کے پاس حاضری دینے کے لیے آ گئے۔ اتفاق سے امیر کاشانی ابھی نہیں آیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور آپ کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ برناتھن اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد سیّدی مولا سے بولا "شریمان جی! یوں تو آپ دلوں کا حال جاننے والے ہیں۔ ایشور آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔ کل ہم خلجی امیر کی وجہ سے جلد چلے گئے تھے، وہ صحیح انسان نہیں۔ اُس کے بارے میں بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک شر پسند انسان ہے اور ہر دم فساد پھیلانے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔"

سیّدی مولہ نے اُس کی بات سُن کر سر ہلا کر کہا "ہاں بات تو کچھ ایسی ہی نظر آ رہی ہے لیکن ہم بھی کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے

وہی کرتا ہے اور یہ بھی اللہ کا ہمارے اُوپر مسلّط کیا ہوا بندہ ہے، بھلا ہم کیسے اِسے دھتکار سکتے ہیں، اب اُس کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

یہ سن کر برناتھن خاموش ہوگیا۔ البتہ ہیتا پاٹک نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ چالاک برناتھن نے اُسے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس مسئلے پر مزید بحث سیّدی مولہ کو اُن سے بدظن کر دے گی چنانچہ وہ خاموش بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر سیّدی مولہ بھی خاموشی اختیار کیے بیٹھے رہے پھر انھوں نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "جاؤ سامنے رکھے گھڑوں کے نیچے جو کچھ بھی پڑا ملے اُٹھا لو۔" دونوں اپنی جگہ سے اُٹھے اور گھڑوں کے نیچے جا کر دیکھا تو وہاں اُنھیں سونے کے چمکتے ہوئے ٹکے نظر آئے انھوں نے مُٹھی بھر کر اپنے کپڑوں میں ڈالے اور پھر اُٹھ کر عقیدت سے آپ کے پاس آ بیٹھے۔ اُنھیں بیٹھا دیکھ کر سیّدی مولہ بولے "اب وقت کیوں برباد کرتے ہو رہے۔ جاؤ! بازار سے چیزیں وغیرہ لے کر گھر جاؤ۔ بچّے نجانے کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے جا کر اُن کے کھانے پینے کا انتظام کرو۔" وہ دونوں سر جھکا کے اُٹھے اور اجازت لے کر باہر چلے گئے۔

خانقاہ میں لنگر کا انتظام اُسی طرح جاری وساری تھا۔ سونے چاندی کی اشرفیاں اب بھی لوگوں میں بانٹی جاتی تھیں اور سیّدی مولہ کی یہ خانقاہ اب بھی مُصیبت زدوں کے لیے واحد پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

امیر کاشانی کی آمدورفت اب پہلے کی نسبت کچھ بڑھ گئی تھی۔ فارغ انسان تھا اس لیے آتا تو رات گئے تک آپ کی صحبت میں بیٹھا رہتا۔ اگرچہ سیّدی مولہ کو اُس کی باتیں پسند نہیں تھیں پھر بھی وہ اُسے توجّہ ضرور دیتے تاکہ وہ ہرگز نہ سمجھے کہ اُس کی آمد سیّدی مولہ کو ناگوار گزرتی ہے۔

برناتھن اور ہیتا پاٹک بھی باقاعدگی سے آ رہے تھے۔ شروع شروع میں تو امیر کاشانی اور اُن دونوں میں خاصی دُور دُور کی صورتحال رہی۔ اُن کے تعلقات کھینچاؤ کا ہی شکار رہے لیکن پھر رفتہ رفتہ کُفر اور اسلام کا دونوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ آپس کی رواداری اور روز روز کے مِلنے سے کم ہوتا رہا۔ پہلے امیر کاشانی جو اُن دونوں سے جلتا تھا اب اُن سے گھُل مِل گیا تھا اور اکثر تینوں اکٹھے ہی بیٹھا کرتے تھے۔

ایک دن تینوں اکٹھے بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے ساتھ ہی سیّدی مولہ بھی بیٹھے تھے جو اُنھیں یوں یکجا دیکھ کر مُسکرا رہے تھے۔ اُن کے ذہن میں وہ پہلے دن کا منظر گھوم گیا۔ جب امیر کاشانی ان دو ہندوؤں کو دیکھ کر دوسری طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا تھا۔

آپ کو یُوں اپنی طرف متوجہ پا کر امیر کاشانی نے سیّدی مولہ کی طرف دیکھ کر کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ پھر اُس نے چُپ سادھ لی۔ یہ بات سیّدی مولہ سے چھُپی نہ رہ سکی۔ انھوں نے مُسکراتے ہوئے امیر کاشانی سے کہا: "خلجی امیر! تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو لیکن کہہ نہیں پا رہے۔ آخر ایسی کون سی بات ہے جو تمہارے دل میں ہوا کرے وہ بلا جھجک کہہ دیا کرو۔"

حوصلہ افزائی پا کر امیر کاشانی بولا: "حضور آپ کو دیکھ کر نجانے کیوں احساس ہوتا ہے کہ کسی عظیم مصلح کی رُوح آپ میں سما گئی ہے۔"

دونوں ہندوؤں نے بھی امیر کاشانی کی تائید کرنا ضروری خیال کیا اور بیک زبان بولے "بے شک! بھلا اس میں کیا شُبہ ہے، آپ کا طرزِ عمل ہی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔"

برناتھن اور ہیتا پاٹک کی تائید پا کر امیر کاشانی کا حوصلہ بڑھا تو اُس کی زبان فر فر چلنے لگی اور وہ کہنے لگا "حضور جس قدر خصوصیات اور خوبیاں اللہ نے آپ میں پیدا کی ہیں اس عہد میں شاید ہی کسی اور انسان میں اتنی یکجا ہوں۔ آپ خدا کے اوصاف کو جس طرح سمجھتے ہیں شاید ہی کوئی اس کا دعویٰ کر سکے۔ آپ نے تو اُس دن مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا جب آپ نے فرمایا کہ خدا 'رب المسلمین' نہیں بلکہ 'رب العالمین' ہے۔ آپ کا یہ انکشاف میرے لیے کم حیرانی کا موجب نہ بنا تھا۔ چنانچہ آپ کا علم، انسانی ہمدردی اور خدا پرستی دیکھ کر میں یہی کہوں گا کہ ہند کے تخت پر جلال الدّین خلجی کی نہیں آپ کی حکمرانی ہونا چاہیے آپ جب بھی اپنے مُریدوں، ارادت مندوں کو حکم دیں گے وہ آپ کے ایک اشارے پر سلطنت کا تختہ اُلٹ دیں گے، پھر آپ یہ دیر کس بات کی کر رہے ہیں۔ اگر آپ میری اس تجویز سے انکاری ہیں تو پھر آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ نے ہند میں ظالموں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے موجب بننے کی خواہش کر رکھی

Herbs
SHAMPOO

ہے۔ قیامت کے دن آپ خدا اور رسولؐ کو کیا منہ دکھائیں گے؟"
برناتھن اور ہیتا پاٹک نے بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ امیر کاشانی کی تائید کی اور وہ تینوں آپ کو تقریباً نظر انداز کر کے آپس میں اُن تجویزوں پر تبادلہ خیال کرنے میں مصروف ہو گئے جن کے تحت آپ کو برسرِ اقتدار آنا تھا۔
سیّدی مولہ حیرت، دُکھ اور توجہ سے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ اُن کے منصوبوں کو بنتا اور پھر وہ ہوتا بھی دیکھ رہے تھے لیکن خاموش تھے۔ اُن کی نگاہوں میں اجودھن کی وہ خانقاہ اُبھر آئی تھی جس میں بابا فرید گنج بخش شکر، سیّدی مولہ کو پاس بٹھا کے نصیحت کر رہے تھے کہ "سیّدی مولا جس دن تم نے امراء اور سرکاری اہلکاروں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا وہ دن تمہارے لیے انتہائی الم ناک دن ہوگا۔ سیّدی مولا یاد رکھو امراء کی صحبتیں ہم جیسے درویشوں کو راس نہیں آیا کرتیں۔ تم کبھی بھی خود پر ملوکیت اور امارت کا سایہ نہ پڑنے دینا ورنہ خود کو تباہ کر لو گے۔"
اور اب بھی سیّدی مولہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بابا فرید انھیں منع کر رہے ہوں کہ ہرگز اس شیطانی اور شر انگیز منصوبے پر عمل نہ کرنا۔ اُنھیں بابا فرید کی سرگوشیاں اپنے کانوں میں پڑتی سنائی دیں۔ چنانچہ اُنھوں نے سخت لہجے میں امیر کاشانی اور دونوں ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "یہ تم لوگ کن فضولیات میں پڑے ہوئے ہو۔ مجھے بھلا بادشاہی کی کب خواہش رہی ہے جو تم میری بابت یوں منصوبے بنا رہے ہو۔ درویشی اور بادشاہی کا کیا جوڑ۔ اگر ہم نے تمہارے منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی تو یہ بات اس کے مترادف ہوگی کہ گویا ہم نے اپنی ہلاکت اور بربادی کا انتظام کر لیا ہے۔ جلال الدین اتنا بُرا انسان ہرگز نہیں جو تم اُس کے خلاف یہ سازشیں کرتے پھر رہے ہو۔ تمہارے ارادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں مجھے پھنسا کر چھوڑو گے۔ آخر تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا کیوں کہ میں بادشاہ بن بیٹھوں؟ یہاں میرے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ دولت کی وہ فراوانی ہے کہ ہزارہا لوگ دن رات یہاں سے کھانا حاصل کرتے ہیں اور اپنی دیگر ضروریات پوری کرتے ہیں، پھر ہم اقتدار کے چکروں میں کیوں پڑوں۔"
برناتھن اور امیر کاشانی نے کچھ کہنا چاہا مگر سیّدی مولہ بولے، "بس! خبردار جو اب کسی نے یہ شر انگیز باتیں میری خانقاہ میں کیں۔ تم ایک درویش کے حجرے میں بیٹھ کر اُسے بادشاہی کا لالچ دے رہے ہو اُس درویش کو جس کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اور جو بندگانِ خدا کی ضروریات پوری کر رہا ہے۔"
چنانچہ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھا جن میں فی الحال ایک دوسرے کو چُپ چاپ رہنے کی تلقین کی جا رہی تھی۔ برناتھن اور ہیتا پاٹک تو اُٹھ کر اجازت طلب کر کے چلتے بنے۔ اُن کے سبھی خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ برناتھن کا خیال تھا کہ سیّدی مولہ اس تجویز پر فوراً اپنی رضامندی کا اظہار کریں گے اور پھر ایک دن وہ اس ملک کے ہی حکمران بن بیٹھیں گے۔ اس طرح وہ بھی سیّدی مولہ کے طفیل شہر کا پھر سے کوتوال بن جائے گا۔ پہلوان ہیتا پاٹک جوان سپنوں میں کھویا تھا کہ ایک مرتبہ پھر مجھے دربار میں پہلوان لکھا جا رہا ہے اور ہاتھی جیسے پلے اُس کے شریر کی اور رکھشا کی جائے گی، تو وہ بھی اُدھورے رہ گئے۔
اُن دونوں کے جاتے ہی امیر کاشانی نے ذرا جھجکتے ہوئے سیّدی مولہ سے دریافت کیا، "حضرت میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں میری اس میں کوئی غرض نہیں۔ ہاں البتہ اتنا کہنا ضرور چاہوں گا کہ حضور کا سچا ہمدرد اور غم خوار اگر کوئی ہے تو یہی ناچیز ہے۔ اگر حضرت مناسب سمجھیں تو مجھے بتا دیں کہ آخر اتنا خزانہ آ کہاں سے رہا ہے جو اس طرح دن رات ہزارہا لوگ خانقاہ سے فیض یاب ہو کر جا رہے ہیں؟"
یہ سن کر سیّدی مولہ بولے، "امیر کاشانی میں نے واقعی تجھ جیسا شک و شبہ کا اظہار کرنے والا اور یوں شر انگیزی پھیلانے والا دوسرا کوئی انسان نہیں دیکھا۔ یہ سب کچھ جو تجھے نظر آ رہا ہے مولا کا کرم ہے۔ پھر کیوں تو اس سیدھی سادی بات کو چکروں میں لپیٹ رہا ہے۔"
امیر کاشانی یہ سن کر ڈھٹائی سے لیکن کسی قدر عاجزی سے بولا، "حضرت خدا آپ کو ہزار ہا سال زندہ رکھے۔ لیکن پھر بھی انسان کی زندگی کا کیا بھروسہ۔ اگر کل خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو جائے تو اس خانقاہ میں پلنے والوں کا کیا ہوگا۔ اگر حضرت مناسب سمجھیں تب مجھے وہ عمل بتا دیں کہ جس سے یوں ضروریات پوری ہوتی ہیں۔"

یہ سُن کر سیّدی مولہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات چھا گئے اور وہ بولے: "امیر کاشانی اس دستِ غیب عمل کے حصّوں کے
ے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دماغ سے رعونیت اور دل سے خباثات نکال کر ریاضت کر پھر دیکھ تجھے کیا حاصل ہوتا ہے۔"

لیکن امیر کاشانی جیسا شخص بھلا ان باتوں پر کہاں عمل کرنے والا تھا۔ سو اُس نے ہر ممکن کوشش کی کہ بس کسی طرح سیّدی مولا اُسے
عمل ہی بتا دیں جس سے دولت کی یوں فراوانی ہو جاتی ہے لیکن جب کسی صورت بھی کامیابی نہ ہوئی تو وہ جھنجھلاتے ہوئے اُٹھا اور یہ
چلا گیا کہ "ہم تو سیّدی مولا کو بادشاہت تک دلوا رہے تھے اور سیّدی مولہ ہیں کہ دستِ غیب کا عمل تک بتانے کو تیار نہیں۔ گویا
ری اتنے عرصے کی رفاقت سیّدی مولہ کے نزدیک ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ حضرت نے انکار کر کے جس طرح ہمارا دل توڑا ہے اَب
ید ہی یہ حضرت کی طرف مائل ہو سکے۔"

اُدھر بادشاہ کے مخبر بھی حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ جب سے بلبنی حکومت ختم ہوئی تھی، ہزارہا لوگوں کو سابقہ حکومت
ے وفاداری کے شبے میں حکومت سے علیحدہ کیا جا چُکا تھا۔ چنانچہ ایسے لوگ جوشِ وطیش میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اسی لیے بادشاہ
ے شہر بھر میں اپنے مخبر پھیلا رکھے تھے کہ جہاں بھی دربار اور محکموں سے نکالے گئے افراد کا مجمع ہو وہاں یہ لوگ بھی جا کر اس بات
پتا لگانے کی کوشش کریں کہ یہ لوگ مل کر نئے بادشاہ کے خلاف کس قسم کی باتیں کرتے ہیں اُن کے خیالات کیا ہیں۔ سیّدی مولہ کی
نقاہ چونکہ ایسے لوگوں کا سب سے بڑا ٹھکانہ تھی۔ اس لیے اس خانقاہ میں ان مخبروں کا جال پھیلا ہوا تھا اور وہ پل پل کی خبریں بادشاہ
پہنچاتے تھے۔ جس دن برناتھن۔ ہیتیا پائک اور امیر کاشانی بادشاہ کے خلاف سازش کر رہے تھے اُس دن مخبر بھی اُن کی ٹوہ میں
ے، حالات سے آگہی کے لیے سخت بے چین اور جیسے ہی اس سازش کی بھنک اُن کے کانوں میں پڑی وہ فوراً بادشاہ کو اس سے مطلع
نے کے لیے دوڑے۔

بادشاہ نے یہ سُن کر فوراً امیر کاشانی کو دربار میں طلب کیا اور پُوچھا "امیر کاشانی اس بات میں کہاں تک سچ ہے کہ تم ہمارے خلاف
ی مولہ کی خانقاہ میں سازشیں تیار کرتے رہے ہو کہ ہمیں قتل کر کے اقتدار پر اُس درویش کو بٹھا دیا جائے جو غالباً اسی لیے لوگوں کے
تھ ہمدردی کا برتاؤ کر رہا ہے کہ اپنے حکمرانی کے جذبے کی تسکین کی خاطر جب محل پر حملہ آور ہو تو اُس کے مُرید اور ارادت مند اُس کا
تھ دیں۔"

امیر کاشانی کے پاس اب سوائے اقرار کے کچھ نہ تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ بادشاہ کو پل پل کی معلومات ہیں۔ پھر بھی چالاک انسان
س نے اس زائل نہ ہونے دیئے اور اپنی آواز کو پُراثر بناتے ہوئے بولا "بادشاہ سلامت جو کچھ آپ نے سُنا وہ حرف بحرف درست
ے۔ بندے کو اس بات کا بھی اقرار ہے کہ وہ اس سازش میں ملوّث تھا لیکن بخدا کسی بدنیتی سے نہیں۔ مَیں چاہتا تھا کہ سازش کی
ٹی سے چھوٹی بات معلوم کر کے آپ کو آگاہ کرتا۔ وقت، دن، طریقہ کار۔ تاکہ بادشاہ کو اس گھناؤنی سازش سے نمٹنے کیلئے پوری آسانی
ہے۔ اَب بادشاہ اسی بات کو دیکھیں اگرچہ میرے بتانے سے پہلے ہی بادشاہ کو اس سازش کا علم ہو گیا لیکن گواہ تو سوائے ایک کے
کوئی ہاتھ نہ لگا اور مجھ ایک کی گواہی شریعت کے خلاف ہے۔ اَب آپ کس طرح سیّدی مولہ کے خلاف قدم اُٹھا سکیں گے۔"

امیر کاشانی کی بات سُن کر بادشاہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے امیر کاشانی کے خلاف بادشاہ جس غیظ وغضب کا شکار
ا، اَب وہ کیفیت نہ رہی تھی۔ اُس چالاک انسان نے اس طرح خود کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا تھا کہ صاف بچ گیا اور الزام دوسرں
ر لا ڈالا۔

بادشاہ نے کچھ سوچ کر کہا "اچھا یہ بتا کہ اس سازش میں اور کون کون شریک تھا؟"

امیر کاشانی نے فوراً اُن لوگوں کے نام گنوانے شروع کر دیئے جن سے اُس کی نہیں بنتی تھی۔ ان میں جہاں برناتھن، ہیتیا پائک اور
یدی مولہ کے نام تھے وہاں شاہی خاندان کے افراد اور سابق حکمران بھی کثیر تعداد میں تھے۔ جنہیں اصل حالات کا علم تک نہیں تھا۔
چنانچہ بادشاہ نے فوراً اُن سب کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور سیّدی مولہ سمیت سبھی کو رسیوں میں جکڑ کر

دربار میں لایا گیا۔

بادشاہ نے سیّدی مولا کو سامنے دیکھ کر طیش میں کہا "او دُنیا دار جھوٹے درویش یہ ہے تیری درویشی اور فقیری کہ بادشاہ بننے کی خواہش رکھتا ہے؟"

سیّدی مولہ نے جب اس جُرم سے صاف انکار کیا تو بادشاہ نے امیر کاشانی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ امیر کاشانی کو گواہی دینے کا صِلہ بدالیوں کے قاضی کی صورت میں مِلنے والا تھا۔ اس لیے وہ بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے سیّدی مولہ کے سامنے ہی اس جھوٹ کا اقرار کرنے لگا کہ سیّدی مولہ نے ہندوؤں اور سابق مسلمان اہلکاروں کے ساتھ مل کر یہ سازش تیار کی کہ بادشاہ کو قتل کر کے اُس کی جگہ تخت خود سنبھال لیں۔

سیّدی مولہ نے امیر کاشانی کی بات سُنی تو دُکھ سے بولے "کاش امیر کاشانی تُو اس طرح جھوٹ نہ بولتا لیکن ہم پھر بھی تجھے معاف کرتے ہیں، جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ تقدیر میں جو لکھا ہوا انسان اُسے بھگت کر ہی رہتا ہے۔"

بادشاہ کو اب جواز مل چکا تھا۔ اُس نے فوراً مفتیانِ دین، علمائے کرام اور مشائخِ عظام سے فتویٰ حاصل کیا اور پھر باری باری سازش میں شریک سبھی کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میدان بادشاہ کے مخالفوں کی لاشوں سے بھر گیا۔ اب سیّدی مولہ کی باری تھی۔ بادشاہ کے حکم سے بندھے ہوئے سیّدی مولہ کو میدان میں لٹا دیا گیا اور پھر ایک بدمست ہاتھی کو سیّدی مولہ پر چھوڑ دیا گیا۔ ہاتھی نے چند ہی لمحوں میں سیّدی مولہ کو کچل ڈالا اور سیّدی مولہ کی روح آسمان پر پرواز کر گئی۔

سیّدی مولہ کے عقیدت مندوں نے آہ و فغاں بلند کی اور ابھی سیّدی مولہ کے اس دردناک انجام کو کچھ وقت بھی ایسا نہ گزرا تھا کہ ایک سیاہ آندھی نے پُورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لوگ خوف و ہراس سے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے لیکن انھیں کہیں بھی پناہ نہ مل رہی تھی۔ سیّدی مولہ کے بعد خانقاہ ویران ہو گئی۔ وہ خانقاہ جہاں کبھی ہزارہا افراد کا مجمع ہوا کرتا تھا۔ اب بالکل ہی سُونی ہو گئی۔

بادشاہ کا بھی انجام بُرا نکلا۔ سیّدی مولہ کو ناحق مروا کر وہ چند دن بھی چین سے نہ جی سکا اور اپنے بھتیجے کے ہاتھوں اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ بادشاہ کے تمام ساتھی اور وارث محمد شاہ خلجی کے ہاتھوں قتل ہوئے جو بادشاہ کا ہی بھتیجا تھا۔ اس طرح بادشاہ اپنے عبرت ناک انجام کو پا گیا۔

حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ

نے وفات کے وقت چار کروڑ نقد ترکہ چھوڑا تھا جس میں سے ایک کروڑ ان کے بڑے صاحبزادے شیخ صدرالدین کے حصے میں آیا۔ اس کثیر دولت کے باعث اُن کے ذکر و فکر میں خلل پڑنے لگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے حصے کا تمام زر پیہ فقرا میں تقسیم کر دیا۔ لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ "آپ کے والدِ بزرگوار دولت رکھنے کے باوجود ذکر و فکر میں لگے رہتے تھے، دولت اُن کے راستے میں تو کبھی حائل نہیں ہوئی۔ پھر آپ نے ایسا کیوں محسوس کیا؟"

شیخ صدرالدین نے جواب دیا "میرے والد بہت عالی ظرف انسان تھے ان کی کثیر دولت نے انھیں یادِ الٰہی سے کبھی نہیں روکا مگر جب سے یہ دولت مجھے ملی ہے، میرے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اس دولت کے سبب میں خدا سے غافل نہ ہو جاؤں۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کروں۔"

حضرت علیؓ

کہیں جا رہے تھے۔ آپ کو ایک شخص نے دیکھتے ہی بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور اُنہیں بُرائیوں سے متصف قرار دیا۔ آپ اُس شخص کے قریب پہنچے اور اُس سے فرمایا:

"کیا یہ سب کچھ تم میری بابت کہہ رہے ہو؟"

اُس شخص نے جواب دیا۔ "ہاں میں آپ ہی کو کہہ رہا ہوں کیونکہ"

حضرت علیؓ نے فرمایا "جو کچھ تم نے کہا۔ اگر مجھ میں واقعی یہ بُرائیاں موجود ہیں تو خدا مجھ پر رحم فرمائے۔"

اُس شخص نے مرعوب ہو کر دریافت کیا۔ "اگر نہ ہوں تو؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا "تب پھر خدا تم پر رحم فرمائے۔"

شیخ حسام الدین چشتیہ سلسلے کی ایک مشہور برگزیدہ ہستی ہیں۔ آپ کی روشن تعلیمات ایک ایسے روشن چراغ کی مانند ہیں کہ جسکی روشنی سے دُنیا آج بھی منور ہے اور فلاح کی راہ پائی ہے۔ آپ اللہ کے ایک یسے نیک اور پرہیزگار بندے ہیں جو واصل بحق ہو کر تا ابد زندہ ہو گئے۔ شیخ حسام الدین ایک صُوفی تھے، ولی تھے، عارف سالک تھے۔ ایک ایسے شخص کی عظمت سے کیسے انکار ممکن ہے جسے بیک وقت اتنا کچھ ملا ہو۔ اُن کے دل و دماغ اس قدر روشن تھے کہ نہیں ہر بات کی بابت آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ظاہری اور باطنی علوم میں یکتا تھے اور کیوں نہ ہوتے آپ کے دادا بھی بلند پایہ صُوفی تھے اور آپ کے والد شیخ جلال الدین بھی ایک بزرگ کامل تھے۔ درویش صفت۔ خدا کی راہ میں خود کو فنا کیے ہوئے۔ جن کا تمام ر رجحان صرف اور صرف تصوف کی طرف تھا۔ شیخ جلال الدین مانک پور (یوپی۔ بھارت) میں رہا کرتے تھے۔ انتہائی قناعت پسند اور گزیدہ بندے۔ کتابت میں کمال حاصل تھا۔ سو رزقِ حلال کی خاطر قرآن مجید کی کتابت کیا کرتے اور جو کچھ بطور ہدیہ حاصل ہوتا اُس ے گزر بسر کرتے۔ دہلی، اُن دنوں ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔ اُمراء کا گڑھ بھی۔ دینی علماء کا مسکن بھی۔ اس لیے آپ اپنے کتابت ندہ قرآن مجید دہلی بھجوا دیا کرتے جہاں سے آپ کو خاصا معقول ہدیہ مل جاتا تھا۔ رزقِ حلال کو عین عبادت سمجھا کرتے اور اس کی تلقین ھی فرمایا کرتے۔ ایک دن شیخ حسام الدین نے دیکھا کہ اُن کے والد شیخ جلال الدین وضو میں مشغول ہیں۔ اُنہیں اس پر سخت تعجب ہوا۔ نماز کا وقت نہیں تھا پھر وہ وضو فرما رہے تھے، لہٰذا وہ بھی وہیں بیٹھ گئے تاکہ دیکھ سکیں کہ آخر وضو کے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔ شیخ ین بیٹے سے بے خبر اپنے فعل میں مصروف رہے۔ وضو کرنے کے بعد اُنہوں نے قلم دوات سنبھالی اور قرآن مجید لکھنا شروع ردیا۔ شیخ حسام الدین والد کے پیچھے کھڑے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں حیرت ہوئی کہ ابھی پچھلے دنوں ہی تو اُنہوں نے ایک رآن شریف لکھا ہے پھر یہ دوسرا کیوں لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ضبط نہ کر سکے اور والد سے پوچھا "بابا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ابھی ل ہی تو ایک قرآن مجید مکمل کیا ہے آپ نے"

شیخ جلال الدین نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا اور شفقت سے بولے۔ "بیٹا ــــــ یہی تو ہمارا رزق ہے۔ اسی سے ملنے لے ہدیہ سے تو گزر بسر کرتے ہیں ہم۔" شیخ حسام الدین نے ایک بات اور محسوس کی کہ جب تک گھر والے

جاگتے رہتے۔ جلال الدین آرام کرتے رہتے اور جب گھر والے سو جاتے تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ اور فجر کے وقت تک عبادت میں مشغول رہتے۔

پھر ایک دن مولانا خواجہ نے دیکھا کہ گھر میں گوشت پکانے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور نہ تو وہ خود کھا رہے ہیں اور نہ کسی اور کو کھانے دے رہے ہیں۔ مولانا خواجہ کا جی چاہتا کہ گوشت کھائیں مگر جلال الدین کا حکم یہ تھا کہ اس کی اجازت نہیں مل سکتی۔ جب بات برداشت کی حد سے گزر گئی تو مولانا خواجہ نے اپنے والد سے پوچھ ہی لیا۔ "پدر بزرگوار! آپ کی باتیں کبھی کبھی میری ناقص عقل سے بالا ہوتی ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ گوشت پر پابندی کیوں لگا دی آپ نے؟"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "بیٹے! آج کل جانوروں کی چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ میں خوفزدہ رہتا ہوں کہ کہیں کسی چوری کے جانور کا گوشت نہ کھلا دیا جائے ہمیں۔"

مولانا خواجہ خاموش ہو گئے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو مزید سمجھایا، کہا۔ "بیٹے! میں نے جو زندگی گزاری ہے وہ تمھارے سامنے ہے میری خواہش ہے کہ تم میری اتباع کرو۔ اس کے علاوہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تمھاری پشت سے ایک ولی ظاہر ہوگا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں تمھاری تعلیم و تربیت کرتا ہوں اور تمھیں وہ نکات بتاتا اور سمجھاتا ہوں جو آنے والے مرد باکمال کی رہنمائی کریں۔ کیونکہ قدرت کا ازل سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ وہ پہلے بساط بچھاتی ہے پھر اس پر کھیل شروع ہوتا ہے آنے والے کے لیے میری زندگی اور میرے اعمال نمونہ ثابت ہوں گے۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اپنی زندگی شرع اور سنت نبوی کے مطابق گزاروں اور حرام لقمے سے خود کو محفوظ رکھوں۔ پتا نہیں میں اس میں کتنا کامیاب رہا اور کتنا ناکام لیکن میں نے یہ کوشش ضرور کی ہے۔ دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔"

مولانا خواجہ کا ذہن رسا ان باتوں کا کچھ اور مفہوم بھی لے رہا تھا۔ اُن کا دل بھر آیا اور پوچھا۔ "پدر بزرگوار! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ ہمیں۔۔۔۔؟"

جلال الدین نے اپنے بیٹے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، کہا۔ "نہیں اس طرح نہیں سوچتے بیٹے! کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا اور کب مر جائے گا۔ اسی طرح میں بھی لاعلم ہوں اور کچھ پتا نہیں کہ کتنی زندگی لے کر آیا ہوں۔"

شیخ جلال الدین اس گفتگو کے بعد زیادہ دن نہیں جیے اور ۱۳۲۵ء میں انتقال فرما گئے۔ ۱۲۳۱ء میں پیدا ہونے والا یہ ولی چورانوے سال زندہ رہا اور جب سفر آخرت پر روانہ ہوا تو اپنے بیٹے مولانا خواجہ کو اپنے عکس کی طرح اس دنیا میں چھوڑ گیا۔ اس گھر میں شیخ جلال الدین مرحوم کے وصال کے تقریباً سولہ سال بعد ۱۳۴۱ء میں وہ بچہ پیدا ہوا جس کی وہ پیش گوئی کر گئے تھے۔ مولانا خواجہ نے اس بچے میں وہ نشانیاں بھی دیکھ لیں جن کا بہت پہلے ذکر کیا جا چکا تھا۔ نو مولود کا نام حسام الدین رکھا گیا یعنی دین کی تلوار۔

مولانا خواجہ نے اس بچے پر خاص توجہ دینا شروع کر دی۔

حسام الدین نے ہوش سنبھالا تو گھر میں فقر و فاقہ کے علاوہ کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ہاں اس فقر و فاقے میں توکل، استغنا اور قناعت کو بے پایاں دیکھا۔ باپ نے خود ہی تدریس کا فریضہ انجام دیا اور ظاہری و باطنی علوم میں نمایاں اور ممتاز کر دیا لیکن حسام الدین کو معلوم نہیں کیوں ایک تشنگی سی محسوس ہوتی رہتی۔

انھوں نے اپنے والد سے جو کچھ بھی پڑھا تھا، وہ تقریباً ازبر ہو گیا تھا۔ اُن میں فقہ کی مشہور و معروف کتاب "الہدایہ" بھی شامل تھی۔ حسام الدین اس کتاب کو نہایت ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اسی دوران انھیں بحالت خواب ایک بزرگ نظر آئے۔ انھوں نے حسام الدین سے کہا۔ "حسام الدین! میرے پاس آ جاؤ، میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"

حسام الدین نے پوچھا۔ "آپ کہاں ملیں گے؟ میں کہاں آؤں؟"

جواب ملا۔ "پنڈوہ۔۔۔ بنگال میں۔"

اس کے بعد حسام الدین کی آنکھ کھل گئی۔ اب ان کی بے قراری میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ مضطرب و بے قرار ادھر اُدھر پھرنے لگے۔ مولانا خواجہ نے بھی اپنے بیٹے کی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ پوچھا۔ "حسام الدین! کیا بات ہے؟ آج کئی دن سے میں تمھیں بہت زیادہ پریشان محسوس کر رہا ہوں، کوئی خاص بات ہے؟"

حسام الدین خواب کی بات بتلاتے ہوئے شرم محسوس کر رہے تھے۔ کیونکہ انھیں اندازہ تھا کہ ان کا صوفی باپ اس خواب سے خوش نہیں ہوگا، جواب دیا۔ "بابا جان! مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں نے کچھ کھو دیا ہے۔ میں ناقص ہوں میں نا مکمل ہوں معلوم نہیں

ایسا کیوں ہے؟"

مولانا خواجہ نے بیٹے کو سمجھایا "حسام الدین! ذکر و فکر میں مشغول ہو جاؤ ساری بے چینی اور بے قراری دور ہو جائے گی۔"

حسام الدین نے عرض کیا "لیکن ذکر و فکر میں بھی تو دل نہیں لگتا۔"

مولانا خواجہ نے اپنے بیٹے کو ذرا غور سے دیکھا "ذکر و فکر میں دل نہیں لگتا! کیا مطلب؟"

حسام الدین نے جھجکتے ہوئے جواب دیا "پتا نہیں کیوں؟ میں خود پریشان ہوں۔"

مولانا خواجہ نے بیٹے کو تسلی دی اور حکم دیا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمھیں جب بھی وقت ملے' اللہ اکبر کی ضربیں لگایا کرو' یہ تو کر سکتے ہو؟"

حسام الدین نے جواب دیا "کوشش کروں گا۔"

مولانا خواجہ نے کہا "کوشش کروں گا کیا معنی؟ اگر تم یہ نہیں کرو گے تو سوز سے محروم رہو گے' یہ تو تمھیں کرنا ہی ہو گا۔"

مولانا خواجہ کی کوئی بات بھی اُن پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھے کہ آخر یہ ہے حسام الدین کو ہو کیا گیا؟

حسام الدین نے اپنے باپ کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ وہ جب بھی موقع ملتا' اللہ اکبر کی ضربیں لگانا شروع کر دیتے' لیکن اُن کی اِن ضربوں میں زور نہیں ہوتا تھا۔ اسی دوران حسام الدین نے ان بزرگ کو پھر خواب میں دیکھا' وہ سامنے کھڑے کہہ رہے تھے "کیا بات ہے حسام الدین! تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں تیرا انتظار کر رہا ہوں تو میرے پاس کیوں نہیں آتا؟"

حسام الدین نے جواب دیا "حضرت! میں تو کبھی اپنے گھر سے نکلا بھی نہیں پھر میں آپ کے پاس کس طرح آ جاؤں؟"

بزرگ نے کہا "بندہ خدا۔ بس اتنا ہی یاد رکھو جب بھی میرے پاس آؤ گے' میں تمھیں بآسانی مل جاؤں گا۔"

حسام الدین کی آنکھ کھل گئی' یہ پریشان ہو کر بیٹھ گئے اور دیر تک اس خواب کے بارے میں سوچتے رہے۔ اب اُن کے دل میں یہ ارادہ جنم لے چکا تھا کہ اس میں وہ اپنے باپ کی بھی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ مولانا خواجہ نے اپنے بیٹے کو پھر اپنے پاس بلایا اور کہا "بیٹے حسام الدین! میں نے تجھ کو کبھی جبر سے کسی کام پر مجبور نہیں کیا۔"

حسام الدین نے جواب دیا "اور میں نے بھی کبھی آپ کو پریشان نہیں کیا۔"

مولانا خواجہ نے کہا "لیکن آج کل تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔ میں تم سے تمھاری پریشانی کا سبب پوچھتا ہوں مگر تم نہیں بتاتے' پتا نہیں کیوں؟"

حسام الدین نے سوچا کہ اب خواب کا ذکر ضروری ہو گیا ہے کیونکہ شاید وہ اِس پریشانی کا کوئی حل بتا دیں۔

مولانا خواجہ نے انھیں سوچتے ہوئے دیکھا تو نہایت شفقت سے کہا "بیٹے حسام الدین! پریشان مت ہو۔ اگر تم کچھ بتانا نہیں چاہتے مت بتاؤ' میں نہیں پوچھوں گا۔"

یہ کہہ کے وہ سامنے سے ہٹ گئے۔

اُن دنوں معاشی حالت بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ کئی کئی دن کچھ کھائے پیئے بغیر ہی گزر جاتے۔ یہ پریشانی اپنے عروج پر اس طرح پہنچ گئی کہ گھر میں تین دن تک کچھ بھی نہیں پکا۔ بھوک نے سب کا بُرا حال کر دیا تھا۔ حسام الدین کی ماں نے مولانا خواجہ سے کہا "کچھ کیجیے۔ اب تو مرنا ہی باقی رہ گیا ہے۔"

مولانا خواجہ نے جواب دیا "مت پریشان ہو نیک بخت! یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے۔"

بیوی نے افسردگی سے کہا "اگر یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے لیکن یہی حالت رہی تو ہم بھی چند دنوں بعد نہیں رہیں گے۔"

مولانا خواجہ کو بیوی کی یہ بات بہت گراں گزری' انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ایک شخص مولانا خواجہ سے ملنے آیا' بولا "حضرت! میں ایک فتویٰ لینے آیا ہوں آپ کے پاس۔"

مولانا نے خندہ پیشانی سے جواب دیا "میں حاضر ہوں' ارشاد فرمائیں۔"

اس شخص نے آپ کے پاس ایک مسئلہ رکھ دیا' اور کہا "میں نے اس سلسلے میں کئی علماء کو زحمت دی مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آخر کئی آدمیوں نے آپ کا نام لیا کہ آپ ہی اس کا تسلی بخش جواب دے سکتے ہیں۔"

آپ نے کچھ دیر بعد فتویٰ تیار کر دیا۔ اس شخص نے اُسے پڑھا اور بے حد خوش ہوا' بولا "واہ واہ' ماشاء اللہ' سبحان اللہ۔ آپ کی بابت جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا' واللہ جی خوش کر دیا۔"

ضعف ولقاہت سے آپ سے بات نہیں ہو رہی تھی، بولے "تیرا کام ہو گیا، اب جا پھر جب بھی تیری ضرورت ہو، میرے پاس آ جانا"
اس شخص نے اپنے نیفے سے ہمیانی نکالی اور اس میں سے دس اشرفیاں نکال کے آپ کی طرف بڑھائیں، بولا "حضرت! آپ نے میرا جو کام کیا ہے اس کا محنتانہ تو آپ کو دے نہیں سکتا مگر یہ حقیر نذرانہ پیشِ خدمت ہے قبول فرما کر شکر گزار فرمائیں"
نفسِ امارہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ آج فاقوں کا تیسرا دن ہے قبول کر لے لیکن نفسِ مطمئنہ نے انھیں روک دیا اور کہا "خبردار! جو تُو نے یہ رقم قبول کی۔ تُو خدا کے دین کو بیچے گا کیا؟"
بیوی بھی یہ باتیں سن رہی تھی اور حسام الدین نے بھی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سن لیا۔ ماں نے بیٹے کو اندر بلایا اور کہا "بیٹے حسام الدین! کچھ دیکھا تو نے؟ تیرے باپ کو یہ ہو کیا گیا ہے آخر؟"
حسام الدین نے جواب دیا "میرے باپ کو کیا ہو گیا؟ مجھے تو کوئی ایسی ویسی بات نظر آ نہیں رہی"
انھوں نے اپنے بیٹے کو غور سے دیکھا اور اس پر افسوس کرتے ہوئے کہا "اچھا تو یہ بات ہے۔ تو بھی اپنے باپ ہی کا ہم خیال ہے"
حسام الدین نے جواب دیا "ماں! میں تقویٰ میں اپنے باپ کا ہم خیال ہوں۔ والدِ محترم نے جو کچھ کیا، انھیں یہی کرنا چاہیے تھا"
ماں بہت برہم تھی، شاید پریشانی اور غصے میں اپنے بیٹے کی پوری بات سنی بھی نہیں اور حکم دیا "جا اپنے باپ کو بلا کر لا میرے پاس۔ جو کچھ میں نے تجھ سے پوچھا تھا، اب میں اُن سے براہ راست پوچھوں گی"
آخر لوگوں نے حسام الدین کے باپ مولانا خواجہ کو اُن کی بیوی کے پاس بھیج دیا۔ بیوی نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا، کہا "گھر میں تین دن سے کچھ بھی نہیں پکا۔ خدا جو عالم الغیب ہے، اُس نے ہم پر ترس کھا کے اس شخص کو بھیجا تھا۔ تم نے اُس کو فتویٰ مفت میں یوں ہی دے دیا۔ وہ اشرفیاں خوش ہو کر دے رہا تھا مگر تم نے بھی اسی خندہ پیشانی سے اُسے واپس کر دیا۔ میں پوچھتی ہوں تم نے ایسا کیوں کیا آخر؟"
مولانا خواجہ نے جواب دیا "مجھے تقویٰ نے اجرت لینے سے روک دیا تھا، میں کیا کرتا۔ میں مجبور تھا"
بیوی نے جل کر کہا "تم جو چاہو کہو۔ میں ان سب کو بآسانی رد کر دوں گی۔ بتاؤ ہم کیا کھائیں؟ وہ اشرفیاں لے لیتے تو ہمارے فاقے ٹل جاتے لیکن تم کیوں لیتے، تمھارا تو اس میں نام مشہور ہو رہا ہے"
حسام الدین نے اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی "ماں! جو بات ختم ہو گئی، اب اس کے ذکر سے حاصل؟ اشرفیاں جو چلی گئیں آپ کے شور وغل سے واپس تو آئیں گی نہیں۔ بابا جان آپ کے جارحانہ انداز سے پریشان ہو رہے ہیں"
ماں نے رونا شروع کر دیا "اپنے تو مقدر ہی میں پریشانیاں لکھ دی گئی ہیں، کسی اور کا کیا شکوہ۔"
شام تک یہی ہوتا رہا۔ اس روز کسی دوسرے شہر سے ملک عین الدین نامی ایک امیر مانک پور آیا ہوا تھا۔ وہ دورانِ سفر ایک دعا پڑھا کرتا تھا۔ اس روز دعا کے کسی لفظ نے اس کو شبہے میں ڈال دیا۔ وہ دیر تک اسی الجھن میں مبتلا رہا لیکن جب وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا تو کسی شخص سے اس نے پوچھا "آپ کے اس مانک پور میں کوئی ایسا عالم بھی ہے جو ہماری علمی مشکلات کو حل کر سکے؟"
امیر کو جواب ملا "یہاں عالم تو کئی ہیں لیکن مولانا خواجہ کا کوئی جواب نہیں۔ وہ آپ کی علمی مشکلات کو فوراً حل کر سکتے ہیں"
امیر پتا پوچھتا ہوا مولانا خواجہ کے پاس پہنچ گیا اور اُن کے سامنے اپنی مشکل رکھ دی۔ آپ نے اس کو لمحوں میں حل کر دیا۔ امیر بہت خوش ہوا۔ اس نے مولانا خواجہ کی خدمت میں بیس اشرفیاں اور چند جوڑے لباس کے پیش کیے اور عرض کیا "حضرت! یہ حقیر نذرانہ ہے، اسے قبول فرمائیں، انکار نہ کیجیے کیونکہ یہ میں اپنی الجھن دور ہونے کی خوشی میں دے رہا ہوں"
مولانا خواجہ نے اس نذرانے کو قبول کر لیا اور اندر جا کے بیوی کے حوالے کر دیا، کہا "نیک بخت! دیکھا تو نے۔ میں نے ناجائز کو ٹھکرا کے جائز کو قبول کر لیا۔ اب تم سب اس نکتے پر غور کرو کہ جو اپنے اللہ پر بھروسا کرتا ہے اور ناجائز چیز ٹھکرا دیتا ہے اس کو اللہ اس طرح جائز طریقے سے نواز دیتا ہے۔ میں نے تو آج رات کو شکرانے کی نمازوں کے لیے وقف کر دیا ہے"
گھر والے اس نذرانے سے بہت خوش تھے۔ حسام الدین نے انھیں سمجھایا "آپ لوگوں کو پدرِ محترم کا خاص خیال رکھنا چاہیے کیونکہ یہ ہم میں غنیمت ہیں"
باپ نے اپنے بیٹے کو گلے لگا لیا اور کہا "بیٹا! کوئی میرا خیال کرے نہ کرے، کوئی میری بات سمجھے نہ سمجھے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ تو تو اس گھر میں ایک ایسا شخص ہے جو میری بات سمجھ لیتا ہے، اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے"
اس واقعے نے حسام الدین کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی، ایک تہلکہ برپا ہو گیا، مگر حسام الدین کو اپنے گھر میں کسی کمی کا احساس

بدستور رہا۔ وہ معلوم نہیں کیوں اب یہ سمجھ رہے تھے کہ اُن کی تعلیم و تربیت کسی اور ہی کے ذمے ہے۔ مولانا خواجہ کو اپنے بیٹے کی کیفیت کا کسی قدر علم ہو چکا تھا اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حسام الدین گھر کو چھوڑ کر کہیں اور جائیں۔

حسام الدین پر نیم غنودگی طاری تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ انھیں اپنی طرف بُلا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں "حسام الدین! تم میرے پاس آتے کیوں نہیں آخر رکاوٹ کیا ہے؟"

حسام الدین اپنے باپ سے جو کچھ حاصل کر رہے تھے، اُسے بند کر دیا۔ باپ نے پوچھا "کیا بات ہے حسام الدین تم نے پڑھائی کیوں بند کر دی؟"

حسام الدین نے جواب دیا "پدر بزرگوار! مجھے بنگال بلایا جا رہا ہے کوئی بزرگ ہیں جو مجھے بُلا رہے ہیں اب میں اُن سے پڑھوں گا۔"

باپ نے پوچھا "بنگال سے کون بلا رہا ہے تمھیں؟ اور اگر کوئی بُلا بھی رہا ہے تو کیا وہ مجھ سے بہتر تیری تعلیم و تربیت کر سکتا ہے؟"

حسام الدین نے جواب دیا "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں میرے مقدر کی ڈور کا ایک سرا اُنہی بزرگ کے ہاتھوں میں ہے اور مجھے جانا پڑے گا۔"

باپ نے روکنے کی کوشش کی کہا "اگر تُو نے کوئی ایسا ویسا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تجھے میرے کہنے سے اس پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔"

حسام الدین نے کراہت اور اکتاہٹ سے مُنہ بنایا اور کہا "پدر بزرگوار! آپ اگر اس مسئلے میں خاموش رہیں تو کرم ہو گا کیونکہ میرے پاس اب اس پر غور کرنے کا وقت نہیں ہے۔"

باپ نے کہا "حسام الدین معلوم نہیں تجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں تیرے بنگال جانے سے خوش نہیں ہوں، اگر تو وہاں جائے گا تو اپنی مرضی اور خوشی سے جائے گا۔"

حسام الدین کو باپ کی ناخوشی گوارا نہیں تھی اور انھوں نے بنگال جانے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا۔ لیکن بعد میں اُن کی حالت غیر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُن پر ایسا وقت بھی آ گیا کہ وہ توانائی سے محروم ہو گئے۔ اللہ اکبر کی ضرب لگایا کرتے تھے مگر ایک دن جو ضرب لگائی تو چکرا کے گر گئے۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا اس لیے کچھ دیر بعد اُٹھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے لیکن کئی دن بعد جب پھر اللہ اکبر کی ضرب لگائی تو وہ سب کے سامنے گر گئے۔ لوگوں کو علم تھا کہ باپ بیٹے میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو گیا ہے، سوچا شاید بزرگ باپ کی ناخوشی نے یہ حال کر دیا ہے وہ آپس میں حسام الدین کی طرف اشارے کر کے باتیں کرنے لگے، ایک نے کہا "افسوس کہ یہ نوجوان کتنا عقل مند اور اچھا ہوا کرتا تھا مگر اب شاید پاگل ہو گیا ہے، اللہ اس پر رحم کرے۔"

انہی باتوں کے دوران حسام الدین نے بنگال جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور لوگوں سے کہا "لوگو! میں پاگل نہیں ہوں اور نہ ہی میری عقل میں کسی قسم کی کمی آئی ہے بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے پیر و مرشد سے دُور ہوں۔"

کسی نے پوچھا "تمھارا پیر کہاں ہے تمھارا مُرشد کون ہے؟"

حسام الدین نے جواب دیا "وہ بنگال میں ہیں۔ میں نے انھیں اپنی زندگی میں ابھی تک نہیں دیکھا۔۔۔۔"

بڑے امراض کا کفارہ

رسُول اللہ نے فرمایا کہ چار امراض کے لیے چار امراض کو بُرا نہیں سمجھنا چاہیے۔

۱: آنکھ کا دُکھنا اندھے ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔
۲: زکام کا ہونا برص کے روگ سے نجات دیتا ہے۔
۳: کھانسی کا ہونا فالج سے محفوظ رکھتا ہے۔
۴: پھوڑے پھنسی ہو جانے سے کئی بڑے امراض سے نجات ملتی ہے۔

لوگ ہنسنے لگے، بولے "پاگل ایسے نہیں تو اور کیسے ہوتے ہیں۔"
حسام الدین کو اپنے حال پر رونا آرہا تھا، اُن کا دل بھر آیا اور آنکھیں آنسو بہانے لگیں، وہ دل ہی دل میں کہنے لگے "پیر مرشد! میں کتنا مجبور ہوں کہ آنا چاہتا ہوں لیکن نہیں آپاتا۔ اللہ! اب میں کیا کروں، میری مدد فرمائیے۔"
حسام الدین اسی حال میں سو گئے، انھوں نے دیکھا کہ اُن کے پیر مرشد اُن کے پاس کھڑے ہیں اور پوچھ رہے ہیں "حسام الدین! کیا بات ہے؟ تو اداس کیوں ہے، تو رو کیوں رہا ہے؟"
حسام الدین نے جواب دیا "پیر مرشد! مجھے اپنے پاس بلاتے کیوں نہیں؟ اب تو لوگ مجھے احمق اور پاگل کہنے لگے ہیں؟"
مرشد نے کہا "حسام الدین! فکر نہ کر، غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تیرے ساتھ تیرے پاس ہوں اور اب تجھ کو میرے پاس آجانا چاہیے۔ دیر کیوں اور کس بات کی؟"
حسام الدین نے بیدار ہوتے ہی رختِ سفر باندھا اور بنگال روانہ ہو گئے۔ جب خشکی کا سفر ختم ہو گیا تو کشتی کی فکر ہوئی۔ سامنے وسیع و عریض پاٹ والا دریا تھا۔ آپ دوسرے مسافروں کی طرح کشتی پر بیٹھ گئے۔ اُن کے پاس ہی ایک گدڑی پوش فقیر بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ شخص کچھ شناسا سا نظر آتا ہے، شاید اس سے پہلے بھی کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کشتی چلتی رہی اور حسام الدین فقیر کو دیکھتے رہے۔ کئی بار اُن کے جی میں آئی کہ وہ فقیر سے پوچھیں کہ حضرت میں آپ سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں، کہاں؟ یہ آپ بتائیں گے، کیونکہ میرا حافظہ ساتھ نہیں دے رہا۔
لیکن اس سوال کی ہمت نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ دوسرا کنارہ قریب ہونے لگا۔ وہ دم بہ دم اُن کے قریب آتا جا رہا تھا۔ حسام الدین نے اس فقیر سے سوال کیا "حضرت! میں آپ سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں، ذرا آپ ہی میری کچھ مدد فرمائیں کہ کب اور کہاں؟"
درویش نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے انھیں نظر بھر کے دیکھا اور ہنستا ہوا دریا میں پھاند گیا۔ لوگوں کو شبہ ہوا، چند پیراکوں نے فقیر کا تعاقب کیا اور دریا میں پھاند گئے۔ وہ لوگ فقیر کو دیر تک ادھر ادھر تلاش کرتے رہے اور آخرکار ناکام اور مایوس واپس آگئے۔ حسام الدین نے اُن سے پوچھا "وہ فقیر ملا؟"
ایک غوطہ خور نے جواب دیا "ہم نے تو انھیں دور دور تک اور گہرائی میں جا کے تلاش کیا، وہ فقیر اندر اگر ہوتا تو ضرور مل جاتا لیکن وہ تو اندر ہے ہی نہیں۔"
حسام الدین سوچتے رہے کہ اگر وہ فقیر دریا کی تہ میں بھی نہیں تو کہاں چلا گیا؟ اس سوال کا جواب انھیں سفر کے دوران کہیں بھی نہ مل سکا۔ اب انھیں یہ بھی سوچنا تھا کہ انھیں جانا کہاں ہے۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھا "بنگال میں درویش کہاں ملیں گے؟"
کسی نے جواب دیا "پنڈوہ میں۔ یہیں چشتیہ سلسلے کا ایک نامور خانوادہ رہتا ہے۔"
حسام الدین اللہ کا نام لے کر پنڈوہ روانہ ہو گئے۔ وہاں کسی نے انھیں ایک خانقاہ کے دروازے پر جا کے کھڑا کر دیا اور اندر خبر پہنچائی گئی کہ ایک طالب بہت دور سے چل کے آیا ہے اور باریابی چاہتا ہے۔
اندر سے جواب آیا "حسام الدین سے کہو میں کافی دنوں سے تیرا انتظار کر رہا ہوں، اندر آجا۔"
حسام الدین ڈرے سہمے اندر داخل ہوتے اور وہاں جن بزرگ کو اپنے سامنے دیکھا، وہ وہی تھے جنھیں خواب میں وہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ یہ پنڈوہ کے نامی گرامی بزرگ نور الحق نور قطب عالم تھے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "حسام الدین! تو جھجکتا کیوں رہا ہے؟ میں تو تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"
حسام الدین نے جواب دیا "حضرت کیا عرض کروں، پدرِ بزرگوار مجھے یہاں آنے نہیں دے رہے تھے۔"
نور قطب عالم نے افسوس کا اظہار کیا، کہا "نوجوان! فقیر یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا تابع رہے اور صاحبِ عقل کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اپنے ہوش و حواس درست رکھے لیکن جواں مرد وہ ہے جو اپنا تابع بھی رہے اور اپنے ہوش و حواس بھی درست رکھے۔"
حسام مسحور ہو چکے تھے اور نور قطب عالم کہتے رہے "صاحبزادے! اس کی مثال یوں ہے جیسے پانی اور غسل کرنے والا۔ غسل کرنے والا بھی اپنی حالت پر قائم رہتا ہے اور پانی بھی اپنی حالت پر قائم رہتا ہے۔"
جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو حسام الدین اُن کی شکل میں گدڑی پوش فقیر کو دیکھ رہے تھے جو دریا میں چھلانگ لگا کے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ حسام الدین نے اس کی تصدیق کرنا چاہی، پوچھا "حضرت! ابھی جب میں آپ کے پاس آرہا تھا تو میرے پاس ایک گدڑی پوش فقیر تشریف فرما تھے کیا وہ......"

نور قطب عالم نے بات کاٹ دی، کہا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں، وہ ایک بزرگ تھے، بس تمھارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

اب حسام الدین اپنے پیر مرشد کے پاس رہنے لگے، پہلے حسام الدین کو پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن اب کتابیں سامنے موجود ہوتیں اور ان کا اس طرف دل ہی راغب نہ ہوتا۔ ایک دن نور قطب عالم نے ان سے کہا "کیوں حسام الدین، کتابیں کیوں نہیں پڑھتے؟"

حسام الدین نے جواب دیا "میں کیا جواب دوں، مجھے تو یہاں آکے ایسا لگتا ہے گویا میرے علم میں شب و روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

نور قطب عالم مسکرانے لگے۔

یہاں مواعظ حسنہ، مجاہدے، ریاضت اور نفس کشی نے انھیں کندن بنا کے رکھ دیا۔ ایک عرصے بعد نور قطب عالم نے انھیں خرقہ خلافت بخش کے حکم دیا کہ اپنے وطن مانک پور واپس جاؤ۔

حسام الدین نے عاجزی سے عرض کیا "میں یہیں رہنا چاہتا ہوں آپ مجھے اپنے سے جدا نہ کریں۔"

نور قطب عالم نے جواب دیا "حسام الدین! جو کچھ تیری قسمت میں تھا وہ میں نے تجھے بخش دیا، اب یہاں تیرا کیا کام ہے؟"

حسام الدین نے کہا "لیکن میں خود تو اپنے آپ میں بڑی کمی محسوس کر رہا ہوں۔"

نور قطب عالم نے مزید تسلی دی، کہا "ہاں ایسا محسوس ہوتا ہوگا لیکن میں جانتا ہوں کہ تجھ کو اتنا کچھ مل چکا ہے کہ مزید کی گنجائش نہیں رہی اور جو کچھ تجھے ملا ہے اگر تو اس کو کام میں لائے اور اسے آگے بڑھائے تو یہی بہت کچھ ہے۔"

حسام الدین نے بدرجہ مجبوری جدائی گوارا کر لی اور اپنے وطن واپس آگئے۔ یہاں ان کے والد نے اپنے بیٹے کو اب جو دیکھا تو خوش ہوئے کیونکہ اب حسام الدین پہلے کے مقابلے میں زیادہ عالم، زیادہ درویش اور زیادہ صاحب حال و قال تھے۔

اب حسام الدین کے پاس بھی لوگ آنے لگے تھے۔ لوگ آتے، مرید ہوتے اور پند و موعظت کے تحائف لے کر واپس جاتے۔ آپ کی تدریس و تربیت دوسروں سے مختلف تھی۔ باتوں ہی باتوں میں جو چاہتے بتا دیتے اور وہ باتیں سامع کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتیں۔ اس کے علاوہ سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کا ایک اور طریقہ بھی تھا۔

آپ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے کہ "دیکھو، اگر تم کسی ایسے درویش سے ملو جو کمزور درجے کا درویش ہو مگر وہ جس سلسلے سے بیعت ہو، وہ مضبوط اور اعلیٰ ہو تو ایسے درویش سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔"

ایک مرید نے پوچھا "وہ کیوں؟ ہمیں تو اس کمزور درویش سے شایان شان سلوک کرنا چاہیے یعنی اگر وہ کمزور اور معمولی درجے کا درویش ہے تو اسے وہ عزت کیوں دی جائے جو کسی اور کا حق ہے؟"

حسام الدین نے فرمایا "تو ٹھیک کہتا ہے لیکن میں نے جو کچھ کہا اس کو میں کسی اور طرح سمجھاؤں گا کیونکہ کسی تمثیل کے بغیر ایسی باتوں کا سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے مریدوں کو ساتھ لیا اور ایک دوسرے درویش کی طرف چل دیے۔ یہ درویش شہر سے باہر ایک کٹیا میں رہتا تھا۔ اس نے حسام الدین کے پہنچنے سے پہلے ہی شور کر دیا "وہ آ رہا ہے، وہ یہیں میرے پاس آ رہا ہے، مجھ سے ملنے۔"

چنانچہ جب حسام الدین وہاں پہنچے تو دیکھا درویش ان کے انتظار میں سر راہ کھڑا ہے۔ درویش نے ان کو دیکھا تو کہا "بھئی خوب حسام الدین! یہ کیا تماشا ہے کہ تم نے سمجھانے کے لیے میری کٹیا کو پسند کیا۔"

حسام الدین نے جواب دیا "حضرت! میں بھی کیا کروں، میری باتیں اگر کسی کی سمجھ میں آ بھی جاتی ہیں تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان میں کچھ تشنگی باقی رہ گئی۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو میں نے تمثیلی طریقے کو اپنا لیا۔"

درویش ان سب کو اپنی کٹیا میں لے گیا۔ یہاں درویش کے کئی چیلے پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ درویش نے اپنے چیلوں سے کہا "دیکھو آج ہماری کٹیا میں یہ کون آگیا ہے؟"

چیلوں نے انھیں دیکھا تو احتراماً کھڑے ہوگئے۔ درویش نے حسام الدین سے کہا "میاں حسام الدین! تم نے دیکھا مجھے اور میرے چیلوں کو؟"

حسام الدین نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا "ہاں دیکھا، کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

درویش نے جواب دیا "ہاں خاص بات یہ ہے کہ ہم درویش لوگ انسانوں سے نفور، بستیوں سے دور کب کسی کا استقبال کرتے ہیں۔ ہم تو شہریوں کے آداب معاشرت کو اپنے لیے پسند ہی نہیں کرتے لیکن ایک تم ہو، تمہارے ساتھی ہیں، شہر سے آتے ہو اور ہم تمہارے آداب احترام میں چند قدم چلتے ہیں اور میرے چیلے احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں کیا اس رتبے میں تمہیں کوئی خاص بات نظر آتی؟"

حسام الدین نے جواب دیا "بابا! ہم سب جس کے تابع فرمان ہیں اسی کے حکم پر تم اور تمہارے چیلے میرے استقبال کو آگے بڑھے یا کھڑے ہو گئے۔"

درویش نے کہا "تم بھی ٹھیک کہتے ہو، لو کیسے آئے؟"

حسام الدین نے کہا "بابا! میں نے اپنے مریدوں سے کہا کہ اگر کوئی درویش مرتبہ و مقام میں کم بھی ہو تو ہمیں اس کو کم نہیں سمجھنا چاہیے بشرطیکہ اس کے پیروں کا سلسلہ اور مقام بہت زیادہ بلند ہو۔"

درویش نے کہا "ٹھیک کہا مگر اس میں ادق بات کون سی ہے؟ کیا بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی؟"

حسام الدین نے جواب دیا "اس میں ادق بات یہی ہے کہ مریدوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر بات سمجھ میں آ جاتی تو یہی بات آسان ہو جاتی یا آسان سمجھی جاتی۔"

درویش نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اس مجلس میں ایک مینڈک پھدکتا ہوا داخل ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی درویش کے چیلوں میں سے ایک وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ درویش نے اس کو روکنا چاہا مگر وہ نہیں رکا۔ درویش نے اپنے چیلوں سے کہا "دیکھو وہ کہاں گیا؟ اور یہ بھی دیکھو کہ یہ مینڈک تنہا ہے یا اس کے پیچھے اور بھی کچھ ہے۔"

درویش کے چیلوں نے حکم کی تعمیل کی اور چند چیلوں نے مینڈک جس طرف سے آیا تھا اُدھر دور تک دیکھ کر پتا لگانے کی کوشش کی کہ مینڈک کے پیچھے کوئی اور چیز تو نہیں ہے اور ایک چیلا راہ فرار اختیار کرنے والے اپنے ساتھی کی تلاش میں ذرا آگے نکل گیا۔ وہ کچھ دیر بعد اس کو پکڑ لایا۔ درویش نے حسام الدین کے مریدوں سے کہا "میں راہ فرار اختیار کرنے والے چیلے سے ایک سوال کروں گا۔ اور یہ اس سوال کا جواب دے گا۔ تم سب سوال اور اس کے جواب کو ذرا غور سے سُننا، بس انہی میں حسام الدین کی ادق بات کا جواب موجود ہے۔"

حسام الدین کے مرید تیار ہو کر بیٹھ گئے۔

درویش نے چیلے سے سوال کیا "میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تو مینڈک کو دیکھتے ہی فرار کیوں ہو گیا تھا؟"

چیلے نے جواب دیا "جناب والا! میں مینڈک سے نہیں، اس سانپ سے ڈرا تھا جو مینڈک کے پیچھے متوقع تھا۔"

اس کے بعد درویش نے مریدوں کو سمجھایا "دوستو! اگر کوئی درویش کمزور ہے اور کوئی اعلیٰ مقام رُوحانیت نہیں رکھتا تو اس سے مت ڈرو۔ ڈرو اُن بزرگوں سے جو اس کمزور درویش کی پشت پر موجود ہوں گے۔ کیونکہ یہ بزرگ اپنے ارادت مند کی تحقیر ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔"

اب حسام الدین کے مرید اپنے پیر مرشد کی باتوں کا اصل مفہوم اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

خلافت تو مل چکی تھی لیکن اب حسام الدین بہت زیادہ پریشان رہنے لگے تھے۔ عسرت اور تنگ دستی نے انہیں بہت زیادہ پریشان کر دیا لیکن اُن کے پائے استقامت اور جبین تحمل پر کوئی رنگ نہ آیا، نہ لرزش ہوئی نہ شکن پڑی۔

اسی عالم میں آپ نے شادی کر لی اور دونوں میاں بیوی صبر شکر سے زندگی گزارنے لگے۔ جب بھوک زیادہ ستاتی اور گھر میں کچھ کھانے کو نہ ہوتا تو آپ پانی پی کر پیٹ بھر لیتے۔ اسی عسرت اور تنگدستی میں ایک بیٹا پیدا ہوا، وہ بھی اسی طرح پرورش پانے لگا۔ آپ کے ذکر و فکر میں کوئی فرق نہ آیا، وہ اسی ذوق و شوق سے جاری رہا۔

جب بچہ کچھ سمجھ دار ہو گیا تو ایک دن بھوک کی حالت میں آپ کے پاس گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا، بولا "بابا جان بھوک۔" آپ نے اس کی اشک آلود آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کے کہا "خدایا! میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا، اس پر رحم فرما۔" اس کے بعد اپنے بیٹے سے کہا "جا بیٹے! جا، میں نے تیری درخواست بھیج دی ہے اور اس دربار سے کبھی مایوسی نہیں ہوتی۔"

جو کچھ ہوگا بہتر ہی ہوگا۔"

صابر شاکر باپ کا صابر بیٹا جس طرح آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد کسی نے دروازے پر دستک دی، آپ نے پوچھا: "کون ہے؟"

باہر سے کسی نے پوچھا: "کیا پیر مرشد حسام الدین یہیں رہتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "ہاں حسام الدین یہیں رہتا ہے اور یہ جواب بھی عاجز و ناچیز حسام الدین ہی دے رہا ہے۔"

باہر سے کسی نے کہا: "تب پھر آپ یہ لے لیں۔"

حسام الدین باہر گئے، دیکھا، دروازے پر ایک صاحب کچھ سامان لیے کھڑے تھے، انھوں نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا: "کھانے کا سامان۔ یہ سامان آپ کو بھیجا گیا ہے۔"

آپ نے یہ سامان لے لیا، یہ کھانا تھا، پکا ہوا، لذیذ کھانا، آپ نے پوچھا: "یہ کھانا کس نے بھیجا ہے؟"

لانے والے نے جواب دیا: "میں نام نہیں بتا سکتا کیونکہ مجھے نام بتلانے سے منع کیا گیا ہے۔"

وہ شخص کھانا دے کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد پھر کسی نے دستک دی۔ آپ نے پوچھا: "کون ہے؟"

باہر سے پھر وہی سوال کیا گیا: "کیا پیر مرشد حسام الدین یہیں رہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں میں عاجز و ناچیز حسام الدین ہی بول رہا ہوں۔"

آپ نے باہر نکل کے پوچھا: "کیا ہے؟ مجھ سے کوئی کام؟"

آپ نے اس شخص کو دیکھا، اس کی پشت پر ایک بڑا سا گٹھر رکھا ہوا تھا۔ اس شخص نے اپنا گٹھر زمین پر رکھ دیا اور کہا: "یہ ماش ہیں ایک من، انھیں آپ کی خدمت میں بھیجا گیا ہے۔"

آپ نے اس سے بھیجنے والے کا نام پوچھا، تو اس شخص نے جواب دیا: "میں اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گا لیکن یہ آپ ہی کو بھیجے گئے ہیں۔"

آپ نے ماش اندر پہنچا دیے۔ آپ نے یہ چیزیں اپنی بیوی کے حوالے کر دیں اور ایک گوشے میں جا کے آنسو بہانے لگے۔

بیوی نے پوچھا: "یہ تو خوشی کی بات ہے کہ آج اللہ نے ہماری سن لی۔ اور۔۔۔۔"

آپ نے اپنی بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا: "بیوی! یہ نہ کہو۔ آج میں اپنے رب کے سامنے بہت شرمندہ ہوں۔"

بیوی نے پوچھا: "اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "میں نے آج تک رزق کے بارے میں کوئی دعا نہیں مانگی تھی، آج اپنے بیٹے کو بھوکا دیکھ کر دستِ طلب دراز کر دیا۔ اللہ نے میری سن لی لیکن میں خود بے حد پشیمان ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے اپنی زبان بھی کھولی تو نفس کو خوش کرنے کے لیے۔"

اس جواب نے بیوی کو بھی افسردہ کر دیا، بولیں: "لیکن اللہ واقف ہے کہ آپ نے اس سے جو کچھ مانگا وہ اپنے لیے نہیں، اپنے بیوی بچوں کے لیے مانگا تھا۔"

آپ نے جواب دیا: "ہاں، بس اسی بات سے دل کو ذرا اطمینان ہوتا ہے ورنہ کھانے اور ماش کو دیکھ کر میں لرز گیا تھا۔"

اس کے بعد آپ نے اس سلسلے میں دستِ طلب دراز نہیں کیا اور اللہ نے بھی ان کا بھرم رکھ لیا اور پھر کبھی انھیں کھانے پینے کی تکلیف نہیں ہوئی۔

اب ان کے پاس جو لوگ آتے تھے وہ آپ سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے جاتے۔ آپ سے طرح طرح کے سوال کیے جاتے اور آپ انھیں ایسے تسلی بخش جواب دیتے کہ وہ مطمئن ہو کر واپس چلے جاتے۔

آپ سے پوچھا گیا: "درویش سالک کیونکر بن جاتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ذکر کرتے کرتے۔۔۔ اور اسی ذکر سے سالک عاشق بھی بن جاتا ہے۔"

اس شخص نے دوسرا سوال کیا: "اور سالک عارف کیوں کر بن جاتا ہے؟"

آپ نے فوراً جواب دیا: "فکر کرتے کرتے۔"

آپ اپنے ارادت مندوں کو صبر و تحمل کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ آپ نے فرمایا: "لوگو! کیا تمھیں معلوم ہے کہ اللہ کے انعامات کیونکر

ظاہر ہوتے ہیں؟" پھر خود ہی جواب دیا "اللہ کے انعامات اچانک ظاہر اور نازل ہوتے ہیں اور ولی ان سے آگاہ بھی ہو جاتا ہے اس لیے دوستو! میرا آپ کو یہ مشورہ ہے کہ ہمیں اس کا ہمیشہ منتظر رہنا چاہیے کیونکہ اس انتظار کے دوران ہی پردۂ غیب سے وہ ظاہر ہو گا جس کی ہمیں توقع بھی نہیں ہو گی۔ وہ ہمیں طلب کے بغیر ہی اتنا کچھ دے دیتا ہے کہ اس کی تعریف اور توضیح نہیں کی جا سکتی۔"

آپ سے پوچھا گیا "حضرت! یہ فراق کیا ہے؟"

جواب دیا "انسان کا اصل وطن عالمِ بطون ہے۔ جب انسان عالمِ ظہور میں آتا ہے تو اسے اپنے وطن سے فراق ہو جاتا ہے۔ فراق کا ایک مفہوم تو یہ ہے اور فراق کے بارے میں دوسری بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ فراق یا تو وہ خود ہے یا اس کا نور ہے یا اس کے نور کا عکس ہے۔"

آپ کی باتوں میں بڑی گہرائی ہوتی تھی اور جن کی سمجھ میں یہ باتیں آ جاتی تھیں وہ مست و بے خود ہو جاتے تھے۔

ایک بار آپ وعظ فرما رہے تھے، دورانِ وعظ فرمایا "لوگو! درویش کے پاس چار چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے۔ سامعین بے چین ہو گئے۔ آخر ایک مرید نے دریافت کیا "کون کون سی؟"

آپ نے سوال کا جواب تو دیا نہیں مزید فرمایا "اور ان چار میں سے دو تو درست اور صحیح ہوں اور دو شکستہ، ٹوٹی ہوئی۔"

کسی نے پھر سوال کیا "کون کون سی؟"

آپ نے جواب دیا "دو درست چیزیں تو ہیں دین، اور یقین اور دو شکستہ چیزیں ہیں پاؤں اور دل۔"

ان عارفانہ کلمات نے کئی کو مست و بے خود کر دیا اور عالمِ وارفتگی میں شور اٹھا "حق ہے، سبحان اللہ۔"

آپ نے دورانِ وعظ ایک چھوٹی سی حکایت سنائی، فرمایا "لوگو! ایک حکایت سنو۔ اس حکایت میں ہمارے لیے بہت کچھ ہے۔"

مرید خاموشی سے حکایت سننے لگے۔ آپ نے کہا "ایک درویش دوسرے درویش کے گھر گیا۔ یہ درویش مست و بے خود ہو رہا تھا۔ میزبان درویش نے اس کو جو اس حال میں دیکھا تو اپنی بیوی کو پردہ بھی نہیں کرایا۔ درویش بھی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد مہمان درویش نے سر اوپر اٹھایا اور کہا "یا اللہ!"

میزبان درویش نے اپنی بیوی کے چہرے پر آستین رکھ دی اور اس کو حکم دیا "اے نیک بخت! اب تو اندر چلی جا۔"

عورت اندر چلی گئی اور وہاں اپنے شوہر کو بھی بلا لیا۔ پوچھا "آپ تو اپنے اس مہمان کو بڑی محبت سے لائے تھے اور اس سے پردہ بھی نہیں کرایا تھا پھر یہ اچانک پردے کی کیا سوجھ گئی؟"

درویش نے جواب دیا "بیوی! بات تو ذرا سی ہے مگر قابلِ غور اور اہم ہے۔"

بیوی نے پوچھا "وہ کیا؟"

درویش نے جواب دیا "بیوی! جب یہ شخص میرے ساتھ آیا تھا، اس پر بے خودی طاری تھی لیکن جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اللہ کو آواز دی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ بے خودی سے نکل کر خودی میں داخل ہو گیا ہے اور خودی میں آنے کے بعد پردہ واجب ہو جاتا ہے۔"

آپ کا دستور تھا کہ ہر روز صبح نصف قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اگر کسی جگہ قرآن پاک کے معانی و مطالب سمجھ میں نہیں آتے تھے تو اس عہد کی تفسیر مدارک کی مدد سے اس کو سمجھ لیتے تھے۔ اس طرح قرآن پاک پڑھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

ایک دن جب آپ سرور اور کیف کے ساتھ قرآنِ پاک پڑھ رہے تھے، آپ نے سنا، کوئی کہہ رہا ہے "حسام الدین! قرآنِ پاک کو اسی طرح پڑھنا چاہیے۔ اللہ کو بھی اسی طرح پڑھنا پسند ہے۔"

کسی مرید نے آپ کو سالہا سال اسی طرح پڑھتے دیکھا تو پوچھا "حضرت! آپ تو اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شمار کیے جاتے ہیں پھر یہ ہر روز دن کا خاصا حصہ تلاوت کی نذر کیوں کر دیتے ہیں؟ کیا آپ کو بھی اس محنت کی ضرورت ہوتی ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میری کیا ہستی ہے؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کوئی قطب بھی بن جائے تو بھی قرآن پاک کی تلاوت بہت ضروری ہے۔ اگر وہ زیادہ نہ پڑھ سکے تو ایک پارہ ضرور پڑھے۔"

کسی کے بارے میں آپ کو بتایا گیا کہ وہ بے حد لالچی ہے۔ آپ نے جواب دیا "تب تو وہ ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔"

سوال کرنے والے نے حیرت سے پوچھا "ہماری ہمدردی کا مستحق ہے؟ ملامت کا نہیں، آخر کیوں؟"

آپ نے جواب دیا "لالچ ایک بیماری ہے اور ہم بیمار سے ہمدردی کرتے ہیں۔"

آپ کی تعلیمات سے اُس زمانے میں پورا برصغیر فیض یاب ہو رہا تھا۔ آپ نے اپنی روشن تعلیمات سے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائی اور اپنے آبا و اجداد اور پیر و مرشد کا ایسا نام روشن کیا کہ دُنیائے تصوف میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ کے ارد گرد ہر وقت مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ آپ اپنے مُریدوں پر بھی گہری نظر رکھتے اور جونہی اُنہیں کوئی خلافِ شرع بات کرتے دیکھتے تو فوراً ٹوک دیتے۔

ایک مرتبہ آپ نے دیکھا کہ آپ کا ایک مُرید ایک مخیر شخص کو اُس کی دریادلی پر لعن طعن کر رہا ہے اور اُسے میانہ روی کی تعلیم دے رہا ہے۔ آپ نے اُسے ناگواری سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کیوں اُسے سخاوت سے روک رہا ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ حاجت مندوں پر خرچ کرنا بے جا اسراف میں شامل نہیں ہوتا۔"

آپ کا ایک مُرید بہت سیدھا سادا اور شریف سا تھا۔ بیچارا اتنا بھلا مانس تھا کہ سبھی لوگ اُس سے مطلب نکلوا لیا کرتے اور بعض اوقات اُسے نقصان تک پہنچانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ آپ نے اُسے بُلا کر نصیحت کرتے ہوئے فرمایا "اے شخص! انسان کو اتنا کڑوا بھی نہ ہونا چاہیے کہ لوگ تھو تھو کریں اور نہ ہی اتنا شریں ہونا چاہیے کہ نگل جائیں۔ بس میانہ روی اختیار کیے رکھو۔"

آپ اپنے مُریدوں سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ بڑی محبت سے ہر ممکن بچیں اور خاص کر اپنے دُشمنوں کو جانیں اور اگر کبھی وہ دوستی کا اقرار کریں تو بیشک اُس کا جواب درستی میں دیں لیکن ہشیار رہیں کیونکہ دُشمن کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا کہ وہ کب تمہیں گمراہی کی راہ پہ لگا دیں اور تمہیں بُرائیوں اور نقصانات کی گہری کھائی میں دھکیل دیں۔ جہاں کے اندھیرے تمہارا مقدر بن جائیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ دُنیا ایک سائے کی مانند ہے اور آخرت آفتاب کی مانند۔ اگر انسان سائے کے پیچھے لپکے تو کبھی اُس پر قابو نہ پا سکے گا، لیکن اگر وہ آفتاب کے پیچھے چلے تو یہ سایہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلے گا۔

آپ کے مُرید آپ سے فیض یاب ہو کر آپ کی تعلیمات کو ہند بھر میں بطور تبرک پھیلاتے رہے اور گمراہی کے اندھیروں کو آپ کی روشن تعلیمات سے روشن کرتے رہے۔

آپ کا وصال ۶۴۹ھ میں ہُوا۔ آپ کے انتقال پہ لوگوں پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُنہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ رشد و ہدایت کا یہ روشن مینارہ ایک دن اُن سے یوں بھی جُدا ہو سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فاتح ایران سعد بن وقاصؓ کو خط میں کچھ ہدایتیں لکھیں اور سب سے آخر میں لکھا: "اے ابن وقاص! تم خود نیکی اور تقوے پر قائم رہو اور اپنی فوج کو اس پر عمل پیرا رکھو اور میری یہ بات یاد رکھو کہ اگر ہم نیکی اور تقوے سے اپنے دشمن پر غالب نہ آسکے تو انہیں اپنی فوجی قوت سے بھی مغلوب نہ کر سکیں گے۔"

حکم اندلس کے حکمران ہشام کا بیٹا تھا۔ ابتدا میں وہ ایک عیاش نوجوان تھا لیکن بعد میں عیاشی سے تائب ہو کے خدمتِ خلق میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے کسی غلام پر ناراض ہو کے حکم جاری کیا کہ "اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔"

حسنِ اتفاق سے امام مالکؒ کے ایک شاگرد وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "میں نے اسلوب میں لے اپنے استاد سے سنا ہے کہ جو شخص اپنا غصہ پیے گا، قیامت کے روز اُسے سکون عطا کیا جائے گا۔"

حکم نے غلام کا قصور معاف کر کے اپنا حکم واپس لے لیا۔

اُستاد عربی قواعد کی پہلی کتاب الصّرف کا درس دے رہا تھا۔
جب وہ لفظ ضَرَبَ یَضرِبُ تک پہنچا تو سامنے بیٹھے شاگرد کو اس کی گردان کرنے کو کہا تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔
ضَرَبَ یَضرِبُ ضَرَبَ یَضرِبُ ضَرَبَ یَضرِبُ کم عمر شاگرد نے لفظ یاد کرنے کی خاطر دُہرانا شروع کر دیا۔ دفعتاً وہ سبق دہراتے دہراتے خاموش ہو گیا اور اُستاد سے پُوچھنے لگا "محترم استاد! اس کے معنی کیا ہیں؟"
اُستاد نے جواب دیا "اُس نے مارا۔ ایک مرد نے مارا۔"
"اس نے مارا۔ ایک مرد نے مارا۔" شاگرد نے زیرِ لب دہرایا۔ پھر بولا "اُستادِ محترم! راہِ حق میں مارا جانے والا؟"
"بے شک اس سے فضیلت والا اور کیا فعل ہوگا۔" اُستاد نے شفقت سے جواب دیا۔
یہ سُن کر شاگرد بولا "ہاں۔ اور ہو بھی خالص حق کی راہ میں۔ اِنتقاماً نہ ہو۔"
پھر وہ بولا "اُستادِ محترم! مجھے ان کُتب سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں اللہ کی چاہ میں تڑپ رہا ہوں۔ مجھے تو وہ علم سکھائیں جو خُدا تک میری رسائی کرے۔ مجھے بتائیں آخر وہ علم مجھے کہاں سے حاصل ہوگا۔ میری راہ نمائی کیجیے۔"
اساتذہ سمجھ گئے کہ یہ شاگرد دُوسروں سے جُدا ہے۔ اور جان گئے کہ اس کی سیری اُسی بارگاہ سے ہی ہو سکے گی جو اس کے مقدر میں ہے۔
خُدا کی خوشنودی کا یہ کمسن طلبگار تاریخ تصوّف میں شیخ احمد عبدالحق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ خُدا کی یاد میں فنا ہونے کا جذبہ رکھنے والے بچپن سے ہی ایسی تعلیم کے خواہش مند تھے جس سے انہیں خُدا کا احوال معلوم ہوتا ہو۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب آپ کی والدہ بستر سے صبح عبادت کے لیے اٹھتی تھیں تو آپ بھی فوراً بستر سے نکل کر ایک گوشے میں عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ آپ کی والدہ جب واپس آ کر آپ کو نہ پاتیں تو تمام گھر میں تلاش کرنا شروع کر دیتیں۔ بالآخر انہیں آپ سجدے میں گرے نظر آ جاتے۔ سخت ناراض ہوتیں۔ ابھی آپ کی عمر بمشکل سات سال بھی نہ تھی۔ اس عمر کے بچے پہ فرض نمازیں تک عاید نہ ہوتی تھیں اور اُن کا بیٹا تھا کہ نفلیں تک ادا کرتا تھا۔ ایسا انہوں نے پہلے کب سُنا تھا اور دیکھا تھا۔ چنانچہ ایک دن غُصّہ میں جب ٹوکا تو بیٹے نے جواب دیا "ماں جو کام تم اپنے لیے پسند کرتی ہو اُسے میرے لیے کیوں مُضر خیال کرتی ہو۔"

ماں بیٹے کی عبادت و بندگی دیکھ کر خوش بھی ہوتی تھیں ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کہیں بیٹا گمراہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ بڑے بیٹے شیخ تقی الدین کے پاس دلی بھیجا۔ تاکہ بڑا بھائی ہی چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے اور دلی تو ویسے بھی علماء و مشائخ کا گڑھ تھی۔ شیخ تقی نے بھائی سے بڑے پیار و محبت کا برتاؤ کیا اور اُسے دلی کے مشہور علماء اور اساتذہ کے پاس بھیجا۔ مگر جلد ہی شیخ احمد نے اپنے سوالات سے اساتذہ کو پریشان کر ڈالا۔ اور انہوں نے آپ کے بڑے بھائی سے صاف کہہ دیا کہ ہمارے بس میں تو نہیں ہے۔ اسے علم کے حصول کے لیے کسی بہت ہی برگزیدہ ہستی کے پاس بھیجو۔

احمد باطنی علم کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ دلی سے بھی نکل کھڑے ہوتے۔ آپ ہر فکر سے آزاد ہو چکے تھے۔ کسی کی روک ٹوک نہ رہی تھی۔ ہر وقت اپنے خیال میں مست رہتے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ جنگلوں، بیابانوں میں گھومتے ہندوستان کے طول و عرض کو چھان مارا مگر دل کا قرار میسر نہ آیا۔ جس شہر جس قصبے میں قدم رکھتے سب سے پہلے وہاں کسی بزرگ کا مزار، خانقاہ یا صحبت کی تلاش میں رہتے لیکن دل میں بھڑکی آگ سرد نہ ہو سکی۔ لوگوں سے پوچھتے "کیا تم نے اللہ دیکھا ہے؟" سبھی حیران ہو کر انہیں دیکھتے اور کہتے اللہ تو ہم سب کے ساتھ ہے ہر جگہ۔ تم خود ہی کسی ایسی جگہ کی نشان دہی کر سکتے ہو تو کرو جہاں اللہ موجود نہ ہو۔ شیخ احمد خود بھی خیال کرتے تھے کہ لوگ کہتے تو درست ہیں۔ واقعی اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے نزدیک۔ مگر اس بے چین دل کا کیا کرتے جو تمنا کرتا تھا کہ سب حجاب دُور ہوں اور اللہ کا دیدار ہو۔ اس بینائی کی خاطر دَر دَر گئے۔ جس سے اللہ کا نظارہ کر سکیں۔ لوگ آپ کو جب دیوانہ واریوں بھاگتے دیکھتے تو آپ سے کنارہ کر لیتے۔ دیوانہ سمجھ کر۔ شیخ احمد کی حالت بھی تو ایسی تھی دیوانوں جیسی کبھی قبرستان میں ڈیرہ ڈالے بیٹھے ہیں تو کبھی مسجد کی سیڑھیوں پر گم صم نہ جانے کن خیالوں میں گم ہیں۔

ایک طویل عرصہ بعد پھر دلی کی راہ لی۔ اور بھائی کے پاس گئے۔ بھائی نے دیکھا تو گلے سے لگا لیا۔ اور پیار و شفقت سے برتاؤ کیا۔ کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کی کہ یہاں اتنا عرصہ کہاں رہے۔ کیا کرتے رہے۔ کم سے کم اطلاع کر کے ہی جاتے۔ یوں پریشان کر کے تمہیں کیا ملا مگر چپ رہے۔ جانتے تھے کہ بھائی کسی اور ہی آگ میں جل رہا ہے۔ یہ حرفِ شکایت کہیں ناگوارِ خاطر نہ ہو۔ شیخ تقی نے اب کی مرتبہ اس بات کی طرف زیادہ دھیان دینا شروع کر دیا کہ کسی طرح آپ کو دُنیا کی طرف راغب کر لیں اور اس کا سب سے بہترین حل یہ تھا کہ آپ کی شادی کر دی جاتی۔ خیال اچھوتا تھا اور قابلِ عمل بھی۔ جانتے تھے کہ شادی ہی ایسی چیز ہے جو انسان کی زندگی کا رُخ بدل دیتی ہے چونکہ بڑے بھائی تھے اس لیے شیخ احمد سے پوچھنا گوارا تک نہ کیا اور خود ایک مناسب جگہ دیکھ کر رشتہ طے کر دیا۔ شیخ احمد کو اس بات کی اطلاع کی تو اس اُمید کے ساتھ کہ چھوٹا بھائی بڑے کا لحاظ رکھے گا، عزت کا پاس کرے گا۔ لیکن جب شیخ احمد نے صاف انکار کر دیا تو سمجھانے لگے میاں میں بڑا بھائی ہوں۔ کچھ میری آبرو کا ہی خیال کر لو۔ کیوں انکار کر کے میری رسوائی اور ذلت کا سبب بنتے ہو۔ آپ نے یہ سُن کر چُپ سادھ لی۔ بھائی نے سمجھا کہ نیم خاموشی ہی رضامندی کی علامت ہے۔ سو خوش ہو کر چل دیے۔ مگر یہ حضرت بھی لڑکی کے گھر جا پہنچے اور ان سے ایسی بات کہہ دی کہ جسے جان کر کوئی عقل کا اندھا ہی بیٹی کو کنوئیں میں دھکیلنے کے لیے رضامند ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے شیخ تقی کو رشتے سے انکار کہلا بھیجا۔

دلی سے بھی اب دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ جس چیز کے حصول کے لیے بچپن سے دَر دَر کی خاک چھانی تھی اُسے تا حال نہ پایا تھا۔ پھر سکون کیسے ہوتا طبیعت میں وہی بیقراری تھی وہی بے چینی تھی جو ازل سے ان پر طاری تھی۔ دلی سے دوبارہ نکلے۔ اب کی مرتبہ پھر بادِیہ جنگلوں، بیابانوں کی طرف لپکے۔ چھالے مول لیے۔ سفر جاری رکھا۔ طویل عبادتیں، ریاضتیں، مجاہدے غرض یادِ الٰہی میں ڈوبے رہتے مگر من شانتی نہ ملی۔ خانقاہوں میں وقت گزارا مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ انہی دنوں پانی پت میں قطبِ ربانی حضرت شیخ مخدوم محمد بن محمود کا بڑا شہرہ تھا۔ نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ پانی پت کی راہ لی۔ یا شاید خُدا کو ہی اُن کی اس بے چینی پہ ترس آ گیا تھا۔ سو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے سب سبب فراہم کر ڈالا۔

مخدوم نے بھی حضرت احمد کی آمد کا کشف کے ذریعے علم حاصل کر لیا۔ مریدوں اور ارادت مندوں کو حکم دیا ہمارا پیارا اور محبوب مرید آ رہا ہے۔ خانقاہ کو یوں سجا دو کہ شاہی محل بھی شرما جائیں۔ مریدوں نے مرشد کا حکم سُنا۔ حیرت ہوئی۔ پہلے کبھی مرشد نے ایسا نہ کیا تھا۔

تھا۔ یہ اب نہ جانے کیا ہوگیا۔ سوچتے تھے۔ حیرت زدہ ہونے تھے اشتیاق سے اُس شخص کے منتظر تھے کہ آخر وہ ہے کون خوش نصیب کہ حضرت نے جس کی خاطر اتنا اعلیٰ انتظام کرنے کو کہا ہے۔ احمد جب آپ کی خانقاہ پہ پہنچے تو اُس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہی حیرت زدہ ہو گئے۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید کسی غلط جگہ آگیا ہوں۔ کیا کسی فقیر اور خُدا کے محبوب کی جگہ ایسی دنیاوی اشیاء سے سجی بھی ہو سکتی ہے۔ بھلا فقیروں کو اس تزک و احتشام اور شان و شوکت کے مظاہروں سے کیا غرض۔ دل میلا ہوا تو واپس پلٹے۔ پھر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ سوچا اندر تو جا کر دیکھوں۔ خانقاہ کے اندر گئے دیکھا تو مخدوم بانہیں پھیلاتے کھڑے ہیں۔ بڑے تپاک سے استقبال کرتے ہوئے دسترخوان پر لے گئے۔ دسترخوان دیکھ کر شیخ احمد کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ درویشوں کے دسترخوان پہ تو ایسے رنگ ڈھنگ کبھی نہ دیکھے تھے۔ نہ آج تک سُنا۔ انواع و اقسام کے لاتعداد کھانے اور پھر ظلم یہ کہ ممنوعہ اشیاء بھی ساتھ رکھی تھیں۔ ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اُٹھے اور باہر کی طرف لپکے۔ مخدوم آوازیں دیتے رہ گئے۔ مگر شیخ احمد میں اب بھلا ضبط کا یارا کہاں رہا تھا جو رُکتے۔ کتنی آس کتنے مان سے آئے تھے۔ کیا کیا سوچا تھا۔ دل کی آگ سرد کرنے آئے تھے جو بجائے کم ہونے کے بڑھ گئی۔ دیوانہ وار بھاگے تو سامنے جنگل آیا۔ جنگل ہی گھس گئے۔ چلتے چلتے تھکن کا احساس ہوا ساتھ ہی یہ پریشانی بھی ہوئی کہ آخر جنگل ہے کتنا طویل کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ جتنا آگے بڑھتے اتنا ہی جنگل اور گھنا ہو کر آگے آجاتا۔ جب کوئی راستہ نہ پایا تو حیران پریشان ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ چند سوار چلے آرہے ہیں۔ جلدی سے اُٹھے اور انہیں ہاتھ ہلا کر متوجہ کرنے لگے۔ سوار آپ کو دیکھ کر تھم گئے اور اُن میں سے ایک خود ہی گھوڑا آپ کے نزدیک لاتے ہوئے بولا "معلوم ہوتا ہے کہ حضرت راہ بھول چکے ہیں۔"

آپ نے بے بسی سے جواب دیا "ہاں جوان۔ تیرا اندازہ دُرست ہی ہے۔ نہ جانے یہ کیسا جنگل ہے۔ ختم ہونے کو ہی نہیں آرہا جتنا بڑھو اتنا ہی طویل ہو جاتا ہے۔"

وہ سوار گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے بولا "جناب راستہ تو خود ہی گم کر بیٹھے ہیں۔ اب لوگوں سے کیا معلوم کرتے پھر رہے ہیں۔" یہ کہا اور ساتھیوں سمیت چلتا بنا۔

نہ جانے اُس کے کہنے کا انداز تھا یا حضرت نے خود ہی ایسا سوچا کہ وہ راستہ تو مخدوم کی خانقاہ میں ہی گم کر آئے تھے۔ یہ خیال آیا تو دل میں شیخ مخدوم کی خانقاہ میں جانے کا ارادہ ہوا تو راستے خود بخود عیاں ہونے گئے۔ خانقاہ میں داخل ہوتے تو مُرشد مسکراتے ہوئے ملے۔ ندامت سے قدموں میں جا گرے۔ برسوں کے ضبط کیے آنسو بہہ نکلے۔ روتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شیخ مخدوم نے خود ہی انہیں اکیلا چھوڑ دیا۔ اور آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر روتے جاتے تھے اور حق حق کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ یوں کئی دن گزر گئے۔ شیخ مخدوم نے بھی آپ کو نہ چھیڑا۔ جب دل کا غبار دھل گیا تو احساس ہوا کہ جسم جل رہا ہے، تن من سبھی جُھلس رہا ہے۔ مُرشد کے پاس گئے عاجزی سے بولے "حضرت! ابھی کچھ جل رہا ہے کچھ کیجیے۔ میں تو تباہ ہوتا جا رہا ہوں۔"

شیخ مخدوم نے جواباً کہا "احمد! ہوش میں آؤ گے تو سنبھلو گے۔ یہ آگ یوں نہیں بجھے گی۔ طلب کرو کسی چیز کی طلب جس کی تمہیں خواہش ہو۔"

شیخ احمد نے لاچاری سے جواب دیا "حضرت کیا مانگوں۔ مجھے تو اپنا ہی ہوش نہیں۔ اب تو کسی چیز میں تمیز کا احساس تک نہیں رہ گیا۔ نہ جانے میرا کیا ہوگا۔ مَیں تو اندھیرے کا مسافر ہو چکا ہوں۔ مُرشد مجھے روشنی سے نوازیں ورنہ میرا دم نکل جائے گا۔"

شیخ مخدوم نے توجہ دی۔ تلقین و ارشاد کرتے رہے۔ صبر و رضا، توکل و استغنا کی تعلیم دی۔ دل کی بیقراری کو ذرا قرار آیا۔ خانقاہ ایک گھنی چھاؤں کی مانند لگی تو سکون سے رہنے لگے۔ خانقاہ میں سکون تھا۔ فقیری کا سرور حاصل ہوتا تھا۔

شیخ احمد عبدالحق خانقاہ میں ایک طویل عرصہ رہے۔ عبادت و مجاہدے میں مشغول رہتے۔ اب یہاں سے جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ پہلے جو اضطراب کی کیفیت ہوا کرتی تھی وہ اب کہیں نہ تھی۔ تزکیۂ نفس سے آشنا ہوتے۔ توحید، علم و عفو، مقاماتِ سلوک غرض دینی علوم اور ظاہری و باطنی علوم کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

ایک روز مخدوم نے آپ کو سینے سے لگاتے ہوئے خرقہ خلافت عطا کیا اور فرمایا "احمد! تجھ جیسا اس خانقاہ میں حاجت مند، مدعی اور

دیوانگی نہیں۔ تو ہی میری خلافت کا مستحق ہے۔" پھر مخدوم نے آپ کو عبدالحق کا لقب دیا۔ شیخ احمد عبدالحق۔ کیونکہ حق حق کی صدا لگانا اب آپ کی پہچان بن چکی تھی۔

شیخ مخدوم نے آپ کو خلافت عطا کرنے کے بعد سنام جانے کی ہدایت کی۔ پانی پت سے نکلے تو دل ایک مرتبہ پھر بیقرار ہو گیا۔ خلش میں اضافہ ہوتا گیا۔ طلب بڑھ گئی تھی۔ من کو جو شیخ مخدوم کے ہاں شانتی ملی تھی اب دوبارہ اضطراب کا شکار تھا۔

ایک طویل عرصہ کے بعد اپنے گھر لوٹے۔ ابتدا میں محدود رہے لیکن جلد ہی علاقہ بھر میں آپ کی بزرگی اور علم کے چرچے ہونے لگے۔ لوگ عقیدت سے آپ کی صحبت میں آ کر بیٹھنے لگے۔ آپ کی ایک جھلک کی خاطر لوگ دُور دُور کا سفر کر کے آنے لگے۔ آپ کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئیں۔

اور پھر جلد ہی ایک عالی شان خانقاہ بھی وجود میں آ گئی۔ آپ جب خانقاہ میں تشریف فرما ہو کر اپنی نرم اور دلنشیں آواز میں وعظ و نصیحت کرتے تو ایک عالم پر بے خودی طاری ہو جاتی۔ انکساری اور عاجزی کے پیکر شیخ احمد عبدالحق کے جلد ہی عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

لوگوں نے اب آپ کو شادی کے لیے آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ سنت کا حوالہ دیا تو انکار نہ کر سکے۔ خاموش ہو گئے۔ چنانچہ شادی کا بندوبست کیا گیا۔ اور یوں انتہائی سادگی سے یہ فریضہ بھی سرانجام پا گیا۔ لیکن آپ کے معمولات میں فرق نہ پڑا۔ روز و شب ہمیشہ کی طرح یادِ الٰہی میں بسر ہونے لگے۔ شیخ احمد کو سنتِ رسول کی پیروی کرنا ہی بھاتا تھا۔ روز مسجد میں خود جھاڑو دیتے۔ پانی لگاتے۔ دوسروں سے بھی اس قسم کا کام لیا کرتے۔ چنانچہ آپ کے مرید اور ارادت مند آپ کو جب کام میں یوں مصروف دیکھتے تو وہ بھی کوئی کام کرنے میں عار محسوس نہ کرتے۔ ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک شخص مرید ہونے آیا۔ انتہائی بیش قیمت لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ اتفاق سے اس وقت آپ مریدوں کے ساتھ مل کر خانقاہ کی مرمت کے لیے گارا بنا رہے تھے۔ آپ نے زرق برق لباس پہنے اس شخص سے کہا "آؤ۔ تم بھی ہماری مدد کرو۔" یہ سن کر وہ شخص اپنے قیمتی لباس کی پروا کیے بنا گارا بنانے فوراً آپ کے مریدوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ آپ نے فوراً اُسے مرید بنا لیا۔

بختیار نامی ایک غلام آپ کی صحبت میں اپنے آقا سمیت آیا تو اُسے آپ اتنا بھائے کہ اُس کا من آپ کی خانقاہ سے ہٹنے کو ہی نہ چاہے۔ اُس کا آقا کاروبار کے سلسلے میں آیا تھا۔ کام مکمل ہوا تو واپسی کا ارادہ کیا مگر بختیار تو حضرت کے آستانے کا ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن آقا بھی ساتھ لے جانے کو مُصر تھا۔ بختیار کی حالت اب شیخ احمد سے بچھڑ کر ایک دیوانے کی سی ہو گئی تھی۔ نہ کھاتا نہ پیتا۔ بس چُپ چاپ بیٹھا رہتا۔ غلام کی یہ حالت اُس کے آقا سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ اس کا کارن بھی خوب سمجھتا تھا۔ سو اُسے بختیار پہ رحم آیا اور آزاد کر کے شیخ کی خانقاہ جانے کی اجازت دے دی۔ بختیار کو تو گویا دو جہان کی دولت مل گئی۔ خوشی سے بے قابو ہوتا آپ کی خانقاہ آیا اور آپ کے قدموں میں گر گیا۔

کہا جاتا ہے کہ بختیار شیخ احمد کی اتنی عزت و احترام کرتا کہ کوئی اور مرید اس کے درجے کو نہ پا سکے۔ وہ آپ کا انتہائی عقیدت مند تھا۔ شیخ شرف الدین فرمایا کرتے تھے کہ بختیار شیخ احمد عبدالحق کا ایسا مرید تھا جو حضرت کو خوب جانتا پہچانتا تھا۔ اُس سے زیادہ اپنے مرشد کو کوئی واقف نہ تھا۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالحق نے چاہا کہ خانقاہ میں کنواں کھودنا چاہیے۔ انہوں نے بختیار کے سامنے اس کا اظہار کیا تو بنا کچھ کہے فوراً پھاوڑا لے کر زمین کی کھدائی میں لگ گیا اور دیوانہ وار کام میں یوں تندہی سے مصروف رہا کہ زمین سے پانی نکل آیا۔ بختیار نے برتن سے پانی بھرا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے پانی لے کر بختیار کو حکم دیا۔ باہر سے مٹی لا کر کنواں بھر دے۔ اور کنوئیں سے مٹی کو ہمارے لیے خانقاہ میں چبوترہ بنانے کے استعمال میں لا۔ اور پھر بختیار نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے شیخ احمد سے یہ تک نہ پوچھا کہ حضرت کنواں کھدوا ہی لیا تھا تو بند کیوں کروایا اور بند ہی کروانا تھا تو نئی مٹی سے کیوں بند کروایا۔ چبوترہ بھی تو نئی مٹی سے بن سکتا تھا۔

شیخ احمد کے ہاں بیٹے نے جنم لیا تو ساتھ ہی نت نئی داستانوں نے بھی جنم لیا۔ بچہ کوئی بزرگ ہستی کا نشان لیے دُنیا میں آیا تھا۔ پیدائش کے وقت منہ سے کلمہ حق حق کی صدائیں بلند کر رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس بچے کی بابت بہت سی کرامات بھی مشہور ہو گئیں اور اس قدر شہرت ہوئی

باتیں آپ کے علم میں بھی آگئیں۔ آپ نے اس پر سخت افسوس اور ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا "میرا بیٹا جلد ہی دُنیا کی نظروں سے روپوش ہو جائے گا"۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کی اس بات کے چند دن بعد ہی بچے کا انتقال ہو گیا۔

ایک مرتبہ پرگنہ رُدولی کا حاکم محمد خاں آپ کی خدمت میں تشریف لایا اور ادب سے ہو کر آپ کے سامنے وعظ و نصیحت سے فیض یاب ہونے بیٹھا رہا۔ آپ کے ساتھ ہی آپ کے داماد میاں جہان شاہ بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے جب حاکم محمد خاں کو دیکھا تو حضرت کے پاس آہستہ سے کھسکتے ہوتے آن بیٹھے اور آہستہ سے کان میں کہنے لگے۔ "حضرت۔ محمد خاں سے کہہ کر مجھے چند بیگھے زمین دلا دیں تو کیا ہی بہتر ہو گا"۔

شیخ احمد نہ جانے کن خیالوں میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے داماد کی بات سُن کر حرف بحرف اُسی کا جملہ دہرایا۔ رُدولی کا حاکم سمجھا کہ شاید حضرت کا اس سے مراد یہی ہے کہ جو کچھ جہان شاہ کہہ رہے ہیں اُس کی تعمیل کی جائے۔ چنانچہ جہان شاہ کی فرمائش پوری کرے محمد خان کی نظروں میں سُرخرو ہونے کا احساس دل میں جاگا تو فوراً باہر کو دوڑ لگائی۔ جہان شاہ کو اشارہ سے باہر لیتا گیا اور اُسی وقت سات سو بیگھے زمین کا فرمان لکھ کر جہان شاہ کے حوالے کر دیا۔ جہان شاہ خوشی سے دیوانے ہو گئے اور فوراً اس کا فرمان لے کر دوبارہ خانقاہ میں گئے اور شیخ احمدؒ کو دکھاتے ہوتے بولے مصفرت میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں آپ نے میری برسوں کی تمنا پوری کر دی"۔ پھر اس نے شیخ احمدؒ سے تمام واقعہ کہہ سنایا کہ کس طرح رُدولی کے حاکم محمد خاں نے آپ کے حکم کا پاس رکھا اور میرے نام فوراً زمین لکھ دی۔ آپ یہ سُن کر سخت طیش کے عالم میں آگئے اور داماد سے شاہی فرمان لے کر ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوتے بولے "محمد خان کون ہوتا ہے اس طرح زمینوں کی تقسیم کرنے والا۔ جاؤ اس سے پوچھو اس کے پاس یہ زمین کہاں سے آئی جو درویشوں کو دے کر اُنہیں دُنیاداری کے (جھمیلوں) میں ڈال رہا ہے"۔

اُدھر جب محمد خان تک یہ پیغام پہنچا تو وہ گھبرایا ہوا حضرت کی خانقاہ میں داخل ہوا اور عرض کی "حضور! کیا مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے"۔

آپ نے فرمایا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم درویشوں کو زمینوں کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ مال و زر ہمارے کس کام کے"۔

محمد خان نے کہا "حضرت میں آپ کی باتوں کا مطلب کیا جانوں۔ آپ نے جہان شاہ کی فرمائش دہرائی تو میں سمجھا شاید آپ حکم دے رہے ہیں۔ آپ کا عندیہ میں کیسے جان سکتا تھا بس آپ کا دہرانا ہی میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے"۔

آپ یہ سُن کر مسکرا پڑے۔

شیخ احمد کو سماع کا بہت شوق تھا۔ سماع کے بعد اگر آپ قوالوں سے خوش ہوتے تو جو کچھ اُن کے پاس ہوتا سبھی اُن پر لُٹا دیتے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک قوال نے وہ سماع کا منظر باندھا کہ آپ وجد میں آگئے۔ خوش ہو کر آپ نے اس قوال سے فرمایا "بول کیا چاہتا ہے۔ آج ہم تجھ سے بے انتہا خوش ہیں۔ تو جو کچھ بھی طلب کرے گا ہم تجھے عنایت کریں گے"۔ وہ قوال آپ کی عظمت و بزرگی سے آگاہ تھا۔ بولا "حضرت! مجھے اپنا خرقہ ہی عنایت کر دیں"۔

یہ سُن کر آپ نے اُسے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوتے کہا "نہیں۔ کچھ اور مانگو"۔ وہ قوال بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔ نہ مانا اور بولا۔ "حضرت! میں تو خرقہ ہی لوں گا"۔

چنانچہ آپ نے اُسے اپنا خرقہ عنایت فرما دیا۔ وہ قوال خرقہ لے کر خوشی خوشی چلتا بنا۔ لیکن پھر چند دن بعد ہی وہ قوال آپ کا خرقہ لیے واپس آیا اور بولا "حضرت! یہ آپ نے مجھے کیا تھما دیا تھا میرے تن بدن میں آگ لگ چکی ہے۔ یہ اپنا خرقہ واپس لیں۔ میں باز آیا اس سے"۔

آپ نے مسکراتے ہوتے وہ خرقہ واپس لے لیا۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک بہت بڑی دیگ عوام الناس کے لیے پکوا کر بازار میں رکھوا دی۔ لوگ آتے اور دیگ میں سے بھر بھر کر کھانا لے جاتے۔ لیکن اس دیگ نے ختم ہونے کا نام ہی نہ لیا۔ تین دن تک لوگ اُس دیگ سے فیض یاب ہوتے رہے لیکن ایک دن نہ جانے حضرت کے دل میں کیا سمائی کہ دیگ اُٹھا کر پٹخ دی اور فرمایا "خدا ہی سب کا رازق ہے۔ یہ شہرت تو ایک آفت ہے۔ نہ جانے کیوں ہم اس کے جھانسے میں آگئے تھے"۔

ایک مرتبہ آپ کا ایک مرید آپ سے خلافت لے کر بنا اجازت خانقاہ بنا کر بیٹھ گیا بلکہ دُکان سجا کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ جو بھی لوگ اس کے پاس آتے وہ اُن سے نذرانے وصول کرتا اور مزید لانے کی تلقین کرتا۔ شیخ احمد کو اپنے اس مرید کی روش سخت ناپسند آئی۔ ایک دن جب آپ اپنے اُس مرید کے خلاف سخت غصّے کے عالم میں بیٹھے تھے تو وہی مرید آپ کے لیے کھانے کی کوئی چیز لایا جو اُسے بھی کسی نے نذرانے میں دی تھی۔ آپ نے بے اختیار طیش کے عالم میں اُس سے خلافت چھین لینے کا اعلان کیا اور اُسے خانقاہ سے نکال دیا۔

شیخ بدرالدین کی وفات سُن کر آپ کو سخت رنج ہوا۔ آپ ان کے کمسن صاحبزادے نصیرالدین کے پاس تعزیت اور خبر گیری کے لیے راسیری گئے تو ایک ہجوم آپ کو دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑا۔ راسیری میں آپ اس وقت تک ٹھہرے رہے جب تک شیخ نصیرالدین کی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہوئی۔

آپ کا بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ اُس کے فرض کی ادائیگی آپ کو بُری طرح ستا رہی تھی۔ چنانچہ آپ نے بیٹے کی شادی کا فرض ادا کرنے کا سوچا اور ایک مناسب گھرانہ دیکھ کر رشتہ بھجوا دیا۔ اُس گھرانے سے منظوری ملتے ہی آپ مکمل تیاری کے ساتھ وہاں جا پہنچے اور فرمایا "ہم عقد کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ بس اللہ کا نام لے کر نکاح پڑھا دیں۔"

لیکن اُس گھرانے کے سربراہ شیخ نورالدین کے ایک رشتہ دار قاضی ثمن نے اس کی مخالفت کرتے ہوتے کہا "ہم تو کبھی اپنی بیٹی کو درویش کے حوالے نہ کریں گے۔ جن کے مزاج کا ہی کچھ علم نہیں ہوتا۔" چنانچہ لڑکی والوں نے بھی آپ سے کہا کہ ابھی شادی کا سامان تیار نہیں ہے لہٰذا شادی نہیں ہو سکتی۔ نیز لڑکی کی عمر ابھی کم ہے۔

چنانچہ آپ اُس گھر سے ناامید ہو کر واپس خانقاہ لوٹ آتے اور اپنے معمولات میں کھو کر اس واقعہ کو بُھلا بیٹھے۔

اُدھر قاضی ثمن ـــــ کسی بیماری میں گھر گیا۔ لوگ آپ کے پاس اُسے خانقاہ میں اُٹھا کر لاتے اور معافی کے لیے درخواست کی تو آپ نے فرمایا "اچھا ٹھیک ہے۔ شادی تک تندرست ہو جائے گا۔" آپ کے بیٹے شیخ عارف کی شادی ہو گئی۔ لیکن شادی کے بعد وہ زندہ نہ بچا اور انتقال کر گیا۔

شیخ احمد نے اپنے مریدوں کی اس طرح تعلیم و تربیت کی اور خلفائے مقرر کیے کہ عرب کا شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں آپ کے کیے ہوتے خلیفہ علم و ہدایت کا پیغام لیے باطل اور جہالت کے اندھیروں کو دُور نہ کر رہے ہوں۔

۱۵ جمادی الثانی ۸۳۷ ہجری میں شیخ احمد نے اس دُنیا سے پردہ کر لیا اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

شیخ احمد عبدالحق علم و حکمت، شریعت و طریقت کا ایک روشن آفتاب تھے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی نے خدا سے لو لگانی ہے اور بارگاہِ الٰہی تک رسائی پیدا کرنی ہے اُسے چاہیئے کہ وہ خُدا کی ذات میں خود کو فنا کرلے۔ کیونکہ خود کو بُھلا دینے سے ہی عشقِ الٰہی دل میں پیدا ہوتا ہے۔

آپ کہا کرتے تھے جس طرح نمک پانی میں مل کر حل ہو جاتا ہے اور اُس کی اپنی علیحدہ شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ گویا اس کا پانی کے وجود میں فنا ہو جاتا ہے تو اسی طرح انسان بھی اگر درگاہِ خداوندی کا طلب گار ہے تو اپنی ہستی کو ذاتِ الٰہی میں فنا کر دے۔

سلطان بہاالدین کو چار سلسلہ سے خلافت نامے حاصل ہو چکے تھے مگر اُن کی عقیدت اور لگاؤ حضرت غوث پاکؒ سے زیادہ تھی۔ آپ نے زیادہ مُرید قادری سلسلے میں ہی بیعت کئے۔ اُنھوں نے ہندوستان کی تمام بڑی بڑی
ا‌ہوں سے فیض یاب ہونے کے لیے میلوں پیدل سفر کیا۔ سات مرتبہ پیدل حج کیا۔ قافلۂ حجاز کے بیماروں کی تیمار داری کرتے اور اُن کی
یات پوری کرتے۔

بنگلور میں کچھ عرصہ قیام رکھنے کے بعد بمبئی روانہ ہوگئے اور سنّتِ رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے تجارت کا پیشہ اپنایا۔ ایمانداری لگن اور
نے اُن کو چند ہی سالوں میں نہایت متموّل کردیا۔ ایک روز اُن کو احساس ہوا کہ دولت اور درویش کا کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ پائیں
ت رکھوں گا یا درویشی اختیار کروں۔ پھر اُنہوں نے دولت لوگوں میں تقسیم کرکے جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لی اور ایک غیر آباد علاقے
ی مسجد میں گوشہ نشین ہو رہے۔

بمبئی میں آپ نے تین سال قیام کیا۔ آپ کے پاس مایوس سے مایوس مریض عالمِ نزع میں بھی آئے اور آبِ حیات کا جام نوشین
حیاتِ نو سے ہمکنار ہوئے۔ آپ اپنے عمل سے آسیب کا ایسا علاج کردیتے کہ مریض ہمیشہ کے لیے صحت یاب ہو جاتا۔ آپ کے حجرے
ہر وقت حاجت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور آپ خدمتِ خلق میں معروف رہا کرتے تھے۔

سلطان بہاالدین قادری کے متعلق مشہور تھا کہ انھوں نے طویل عمر پائی تھی۔ اُن کے بال کئی مرتبہ سفید ہوئے اور کئی مرتبہ سیاہ، اِس
اُن کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔

آپ کا تعلق مُرشد آباد ضلع بُلند شہر سے تھا۔ آپ مختلف ناموں مثلاً۔ احمد، عبداللہ، ابراہیم، عبدالرحمٰن، محی الدّین اور بہا الدّین
پکارے جاتے تھے۔ آپ کو سیّدنا غوث الاعظمؓ کی طرف سے سُلطان العاشقین اور قطب العارفین کے خطابات عنایت ہوئے تھے۔ آپ
ب اور کشف و مراقبے کا یدِطولیٰ حاصل تھا۔ آپ کی سطوت اس قدر تھی کہ وقت کے ہم نشین بھی نظر ملا کر بات کرنے سے قاصر رہتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ کے مُرشد پیر مصطفےٰ بغدادی نے اپنے خلفاء اور مریدین سے سلطان بہاالدین کی بابت دریافت کیا۔ لوگوں نے کہا۔

"حضرت وہ دیوانہ تو یہاں سے بہت مدّت پہلے جا چکا ہے اُس کی کوئی خبر نہیں نامعلوم زندہ بھی ہے کہ نہیں۔"

اس پر مُرشد بولے "وہ زندہ ہے اور دریا کے کنارے پر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہے اور اب ہم اُس کو اپنے پاس بُلانے کے متمنی ہیں۔" یہ کہہ کر مُرشد نے اپنے دو خدام کو بہاؤ الدین کو لانے کے لیے بھیجا تو خدام دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ دریا کے کنارے زمین پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لیٹا ہوا ہے لیکن اُس کو اُٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس ڈھانچے کی جڑیں درخت کی جڑوں کی طرح زمین میں دھنس چکی تھی۔

دونوں خدام عاجز آ گئے آخر کار اُن دونوں نے کہا "سُلطان بہاالدین ہم اپنی مرضی سے تمہیں یہ لے جانے کے خواہش مند نہیں مُرشد کا حکم تھا اب ہم آئے ہیں اگر تمہیں مُرشد کے حکم کا پاس نہیں تو ہم جاتے ہیں۔" یہ بات اِدھر خدام نے کہی اُدھر وہ ڈھانچہ فوراً انسانی وجود کی شکل میں تبدیل ہو گیا اور وہ فوراً مُرشد کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو گئے۔

خانقاہ میں مرشدِ عالی سفید براق دستار سے سجے دمکتا ہوا آفتابی چہرہ لیے تشریف فرما تھے۔ سُلطان کو دیکھ کر فرمایا "ہندوستان کا شہنشاہ آ رہا ہے۔" یہ سُن کر سُلطان بہاالدین مُرشد کے قدموں میں گر گئے اور عرض کی "یا حضرت! اس ناچیز کو ہندوستان کی بادشاہی نہیں درکار، آپ کے جوتوں میں جگہ چاہیے یہاں سے دُور نہ کیجیے۔" مگر حکم آخر حکم ہے۔ آپ کو آخر کار ہندوستان آنا پڑا۔

❋

سلطان بہاالدین، سلطان ٹیپو شہید کے سلسلۂ نسب سے تعلق رکھتے تھے اور انگریزوں کے خلاف جہاد میں جو مقام و مرتبے اس خاندان کو نصیب ہوئے وہ مقدّر والوں کا ہی حصّہ ہوا کرتے ہیں۔ اس رنج و الم کی داستان کے آخری اسباق میں اس خاندان کو بھی حکومت کرنے کا موقع قدرت نے فراہم کیا۔ چنانچہ سلطان شہاب الدّین کے بعد سلطان بہاالدین نے کم سنی میں سلطنت کا قلم دان سنبھالا۔ آپ نے لندن سے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ جامعہ ازہر مصر سے شرعی علوم حاصل کیے اور بیس سال کی محنتِ شاقہ کے بعد شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر کی اسناد حاصل کیں۔ آپ نے خواجہ عبدالرحمان سے نقشبندی سلسلہ کے کمالات حاصل کیے۔ اس خلافت کا حصول بھی بڑا دلچسپ ہے۔ مولانا نور محمّد سہروردی کو ایک مرتبہ سلطان بہاالدین راستے میں ملے۔ مولانا نے بہاالدین سے کہا کہ تم اس جگہ (جائے ملاقات) پر ٹھہرو میرا انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں۔ مولانا یہ بات بھول گئے۔ سلطان بہاالدین کئی روز اسی جگہ کھڑے رہے اور مولانا کے منتظر رہے۔ کھڑے رہنے سے اُن کی پنڈلیاں سُوج گئیں۔ ساتویں روز مولانا نور محمّد واپس آئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ سُلطان بہاالدین کو سینے سے لگا لیا اور مسندِ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد سلطان بہاالدین کے اندر سے انوار و تجلیات کے سوتے پھوٹ پڑے، وہ بغداد سے مدارس اور مدارس سے بہار آئے اور اندھیروں میں نور کے چراغ روشن کیے۔

❋

ماسٹر عبدالحکیم اڑکی کے رہائشی تھے اور اُن کے دل میں سلطان بہاالدین کی بیعت کا بڑا شوق تھا۔ وہ گیارہویں کی نیاز کے دن مرشد آباد جانے کے لیے تیار ہوئے۔ اس دن ماسٹر صاحب سخت علیل بھی تھے۔ اُن کو چھٹی بھی سکول سے نہ ملی، انھوں نے ایک خط سلطان بہاالدین کو تحریر کیا جس میں اپنی علالت اور سکول کے ہیڈ ماسٹر کی سرد مہری کا ذکر کیا۔ سلطان بہاالدین نے جواباً لکھا کہ چھٹی کے لیے دوسری درخواست دے دو۔ انشاء اللہ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ ہیڈ ماسٹر نے دوسری درخواست دیکھی تو سخت برہم ہوا اور ماسٹر عبدالحکیم کو بُلا کر اُس کی نہ صرف گوشمالی کی بلکہ ان کی درخواست انسپکٹر آف سکول کے پاس بھجوا دی۔ ہیڈ ماسٹر نے جس مقصد کے لیے درخواست انسپکٹر کو روانہ کی تھی اُس کا اُلٹا اثر ہوا۔ چھٹی کی درخواست منظور ہو گئی اور ہیڈ ماسٹر کی سخت سرزنش کی گئی۔ چھٹی ملتے ہی عبدالحکیم سلطان بہاالدین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا "عبدالحکیم اتنی لمبی درخواست نہ لکھا کرو صرف اتنا بتا دیا کرو کہ تم ہمارے پاس آنا چاہتے ہو ہم تم کو فوراً بُلا لیا کریں گے۔"

❋

ایک مرتبہ سلطان بہا الدین ۱۲ سال کی چلہ کشی کے بعد جنگل سے واپس لوٹے۔ آپ کے بال اور ناخن بہت زیادہ بڑھ چکے تھے۔ ہندو آباد کے ایک ہندو حجام کے پاس آئے اور اُس سے حجامت بنوائی۔ حجام نے آپ کو مسلمان بزرگ سمجھ کر ایک دودھ کا گلاس لیا۔ پھر اس خیال سے کہ مسلمان کا ہاتھ لگنے سے گلاس نجس ہوگیا ہے اُس کو دھونے کے لیے تالاب پر گیا۔ جب اُس نے گلاس کو یں ڈالا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پورے کا پورا تالاب میٹھے دودھ کا چشمہ بن گیا۔ یہ واقعہ پورے گاؤں میں مشہور ہوگیا۔ پورے کا ؤں آپ کی زیارت کو اُمڈ آیا۔ آپ نے سب گاؤں والوں کے سامنے ایک جامع تقریر کی۔ اہلِ گاؤں پر وعظ کا ایسا اثر ہوا کہ کا سارا گاؤں غنودگی میں مبتلا ہوگئے۔ آپ اُن کو اُسی عالم میں چھوڑ کر چلے آئے تاکہ آپ کو لوگ تنگ نہ کریں اور آپ کی عبادت خل اندازی نہ ہو۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلطان بہا الدین جذب کی کیفیت میں جنگل کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں اُن کو اس علاقے کے کا بیٹا ملا جو اپنی موٹر میں سوار کہیں جا رہا تھا اُس نے حضرت کو دیکھا اور آپ کے پیچھے ہولیا اور آپ کو گاڑی میں سوار ہونے کی ں کی آپ نے اپنے رومال میں چند پتھر کے ٹکڑے ڈال کر اُس کو دیئے اور فرمایا "یہ ہیرے جواہرات لے لو اور میرا پیچھا چھوڑو"۔ نوابزادہ ب رومال دیکھا تو اُس کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ اتنے عمدہ ہیرے اور جواہر و لعل اُس نے نہ دیکھے تھے نہ سُنے تھے مگر اُس نے حضرت سے ی کہ میں ان پتھروں کو لے کر کیا کروں گا۔ مجھے تو آپ کی رفاقت چاہیے"۔ یہ کہہ کر سلطان بہا الدین نے رومال اُس سے لے لیا اور لعل زمین پر پھینک دیئے جب جواہر و لعل زمین پر گرے تو وہ دوبارہ کنکریوں کی شکل میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اس پر حضرت ن بہا الدین تو نواب زادہ سے بہت خوش ہوئے اور اُن کی موٹر میں سوار ہوگئے اور ہاتھ موٹر سے باہر نکال لیا۔ موٹر جہاں سے گزرتی وگ حضرت کا ہاتھ چومتے جاتے۔ جوں جوں لوگوں کی تعداد عقیدت مندی کی وجہ سے بڑھتی جاتی توں توں حضرت کا ہاتھ لمبا ہوتا جاتا۔ ھ کر نواب زادے نے عرض کی "حضرت شریعت کا کچھ خیال فرمائیں"۔ یہ بات سُن کر سلطان بہا الدین نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

صوفی عبدالمجید سلطان بہا الدین کے خاص مُریدوں میں سے تھے اُن کے ایک دوست حافظ غلام محمد نے اُن کو بتایا کہ کافی عرصہ ات کے وقت اُن کے کمرے کی دیوار شق ہو جایا کرتی تھی اور اس میں سے ایک حسن بلاخیز دوشیزہ آتی اور اُن کے ساتھ دادِ عیش ور صبح کے وقت رُخصت ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ حافظ غلام محمد اس دوشیزہ پر فریفتہ ہوگئے اور اُس سے شادی کرنے کی خواہش کی۔ اس شیزہ ناراض ہوگئی اور کئی روز نہ آئی۔ پھر اچانک دوبارہ وہ آنا شروع ہوگئی۔ اب حافظ غلام محمد شادی کا مدعا بیان کرتے ہوئے گھبراتے شادی کا خیال بھی اُن کو ہر وقت بے چین کیے رکھتا۔ اس اُلجھن کی سُلجھن کے لیے وہ کسی عامل کے پاس گئے اور کوئی ایسا نقش طلب کیا سے وہ دوشیزہ از خود حافظ کے ساتھ شادی کے لیے تیار ہو جائے۔ نقش مل گیا تو حافظ نے اس نقش کو حسبِ ہدایت استعمال کیا مگر سے دوشیزہ دوبارہ کبیدہ خاطر ہوئی اور کئی روز تک حافظ کے پاس نہ آئی۔ حافظ بہت پریشان ہوا مگر کچھ دنوں کے بعد دوشیزہ ہ آنا شروع ہوگئی اور حافظ غلام محمد سے کہا کہ تم اس قسم کے نقش لینے سے باز آجاؤ' تمہاری اور میری شادی نہیں ہوسکتی۔

حافظ غلام محمد بڑے ہی کرب و اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد ایک مرتبہ سلطان بہا الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مسئلہ ں کیا اس پر سلطان نے فرمایا "حافظ غلام محمد وہ لڑکی کسی دوسری مخلوق سے متعلق ہے لہٰذا تم اُس کا خیال دل سے نکال دو۔" اور رات قت سلطان بہا الدین نے اُس لڑکی کے والد جو کہ جنات کا سردار تھا اُس کو طلب کیا اور کہا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کسی اپنے جیسی وق کے کسی فرد سے کر دے اور اپنی لڑکی سے کہے کہ وہ حافظ غلام محمد کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ اُس کی لڑکی کے لیے اچھا نہ ہوگا۔

ہ اُسی رات وہ دوشیزہ ایک مرتبہ پھر حافظ غلام محمد کے پاس آئی اور کہا کہ میں آج آخری بار تمہارے پاس آئی ہوں۔ آج میری شادی ہ قبیلے کے ایک جن سے ہو رہی ہے۔ تم نے سلطان بہا الدین سے یہ قصہ نہ کیا ہوتا تو تمہارے میرے تعلقات برقرار رہتے۔ اب میں

آئندہ تمہارے پاس کبھی بھی نہیں آسکتی۔ حافظ غلام محمد بہت ہی رنجیدہ خاطر ہوا مگر اُس کے بعد وہ دوشیزہ دوبارہ کبھی حافظ غلام محمد کے پاس نہ آئی۔"

عبدالحق ایک بہت ہی غریب شخص تھا اور سلطان بہاالدین کا مُرید تھا۔ ایک مرتبہ سلطان منگلور گئے اور عبدالحق سے کہا کہ میں نے آج سفر پر روانہ ہونا ہے لہذا گھر میں جو کچھ بھی کھانے کیلئے ہے فوراً میرے پاس لے آؤ۔ تاکہ میں اور میرے ساتھی کھانا کھا کر سفر پر روانہ ہوں۔ یہ بات منگلور کا ایک بہت بڑا رئیس بھی سن رہا تھا حضرت سلطان بہاالدین سے عرض کرنے لگا کہ حضرت! عبدالحق جیسا غریب اور قلاش انسان اتنے لوگوں کی ضیافت کا کیسے متحمل ہوسکتا ہے۔ آپ کھانا اس خادم کے غریب خانے پر تناول فرمائیں۔ یہ بات سن کر سلطان بہاالدین کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ آپ نے اس رئیس سے کہا کہ ہم کھایا نہیں کرتے بلکہ کھلایا کرتے ہیں۔"

عبدالحق سے کہا کہ کتنی دیر میں کھانا تیار ہوگا۔"

عبدالحق نے عرض کی "حضرت! کچھ دیر تو لگے گی آپ تھوڑی دیر اور زحمت فرمائیں۔"

یہ بات سُن کر سلطان بہاالدین مُسکرائے اور فرمایا "ہمیں معلوم ہے تمہیں قرض دیر سے ملا ہوگا اس لیے کھانا تاخیر سے تیار ہو رہا ہے۔ خیر ا ہم انتظار ضرور کریں گے۔" اس کے بعد اُنھوں نے اپنا عصا عبدالحق کی کمر پر لگاتے ہوئے فرمایا" حاتم کو حضرت غوث الاعظم کے خزانوں میں سے خطیر دولت عطا کی۔"

کھانا تیار ہوا تو حضرت سلطان بہاالدین نے کھانا کھایا اور رُخصت ہوگئے۔ ایک سال کے بعد حضرت سلطان دوبارہ منگلور تشریف لائے تو حیران رہ گئے۔ عبدالحق کے پاس ایک شاندار محل تھا اور کاریں۔ دولت بے شمار تھی۔ عبدالحق نے عرض کی کہ حضرت آپ کی چھڑی کی ضرب کا فیضان ہے جو اللہ نے میرے اُوپر اتنی نوازشات کی ہیں۔ اگر ایک چھڑی اور لگ جاتی تو پتہ نہیں کیا سے کیا ہوجاتا۔

سلطان مُسکرائے اور فرمایا" تمہارے لیے ایک چھڑی ہی کافی تھی مزید کے تم متحمل نہیں ہوتے"

سلطان بہاالدین اپنی نگرانی میں گیارہویں شریف کی نیاز دیا کرتے تھے۔ کھانوں کا انتخاب و اہتمام از خود فرماتے۔ لنگر خانے میں جا کر ہر چیز کی جانچ پڑتال کیا کرتے تھے۔ رات کے وقت میلاد کی محفل ہوتی جس میں ذکر و سماں کرتے۔ وجد و کیف کا عالم ہوتا اس کے بعد لنگر تقسیم ہوا کرتا تھا۔

سلطان بہاالدین نے گیارہویں شریف کی نیاز کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "کہ مکے میں ایک نابینا حافظ عبدالرزاق لوگوں کو واعظ کیا کرتے تھے اور واعظ کے بعد لوگوں سے سوال کرتے کہ اپنے مسائل اور اُلجھنیں ہمیں بتاؤ ہم خدا سے دُعا کرکے کل روز تمہارے مسائل کا حل اور اُلجھن کی سُلجھن تمہیں بتلائیں گے۔" حافظ عبدالرزاق کے والد صاحب کا معمول تھا کہ وہ گیارہویں شریف بڑے اہتمام سے دلایا کرتے تھے۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو عُسرت و تنگی کی وجہ سے گیارہویں کی نیاز اس اہتمام سے دلانا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی عبدالرزاق کی والدہ جو بھی میسر آتا اس پر ختم دلوا دیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ گھر میں کچھ بھی نہ تھا۔ عبدالرزاق کی والدہ بڑی آزردہ خاطر ہوئیں اور رونے لگ گئیں۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی۔ عبدالرزاق باہر نکلے کیا دیکھتے ہیں ایک بزرگ چاول کے دو بھرے ہوئے طباق لائے ہیں۔ عبدالرزاق جب طباق گھر کے اندر لائے تو اُن کی والدہ نے پُوچھا کہ یہ چاول کہاں سے آئے عبدالرزاق نے اُن کو تمام واقعہ عرض کر دیا۔ ان کی والدہ نے چاولوں کا ایک طباق تقسیم کر دیا۔ دوسرے میں سے جب اپنے چاول نکالے تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دوسرا طباق سونے کی اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اگلے روز دوبارہ وہ بزرگ تشریف لائے اُن کے ہاتھ میں پھر وہ چاولوں کے طباق تھے۔ عبدالرزاق کی والدہ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ پُوچھو کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ اور یہ برابر چاول کیوں لا رہے ہیں؟ عبدالرزاق نے ماں کے حکم کے مطابق چاول لانے والے بزرگ سے پُوچھا تو انھوں نے جواب دیا: تمہارے والد ہماری گیارہویں

...ز بافاعدگی سے دیا کرتے تھے اب وہ نہیں رہے اور تم لوگ متحمل نہیں ہو، چنانچہ اب ہمارا فرض ہے تمہاری مدد کریں ہم محی الدین جیلانی
...ں اور فی الحال یہ اشرفیاں تمہاری گزر اوقات کے لیے کافی ہیں. آئندہ سے تم لوگوں کو وعظ کیا کرو اور اُن سے مسائل پوچھا کرو. رات
...م آئیں گے ہم تمہیں مسائل کے حل بتلائیں گے تو اگلے روز اُن کو بتلا دیا کرنا. یُوں تمہاری گزر اوقات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ چلاتا رہے گا."
...ہ نابینا واعظ لوگوں کے ہر مسئلہ اور اُلجھن حل کر دیا کرتے تھے. سلطان بہاالدین نے یہ واقعہ سُنا کر لوگوں کو گیارہویں شریف کی
...کی اہمیت کے متعلق بتلایا کہ یہ ایک رسم نہیں ہے بلکہ اِس کے فضائل اور خصائص بھی ہیں جن کے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔

ایک شخص کا لڑکا بیمار ہو گیا. اُس نے ایک روپے کی منت مانی کہ لڑکا ٹھیک ہو گیا تو ایک روپیہ خدا کی راہ میں دوں گا. اللہ
...الی کے فضل سے لڑکا تندرست ہو گیا. اب وہ شخص سلطان بہاالدین کی خدمت میں حاضر ہوا. اور عرض کی کہ "حضرت! اس طرح میں
...منت مانی تھی اب اس روپیہ کو کس طرح خرچ کروں." حضرت نے فرمایا "تم اس روپے کی شرینی لاکر مسجد میں تقسیم کر دو." وہ بولا
...حضرت! ایک روپیہ کی شرینی پُوری مسجد کے لیے ناکافی ہو گی میں زیادہ قسم کی شرینی لاتا ہوں." مُرشد سلطان بہاالدین نے جواب
..."نہیں تم صرف گیارہ آنے کی شرینی لاؤ." اُس شخص نے سوچا گیارہ آنے کی تو بالکل ہی تھوڑی ہو گی. کم از کم ایک روپے کی تو ہونی
...ہیے. وہ جب مٹھائی کی دُکان پر گیا تو دُکان دار سے کہا کہ "ایک روپے کی جلیبی دو" دُکاندار نے جواب دیا بھائی جلیبی فروخت ہو
...ہے اس وقت صرف گیارہ آنے کی جلیبیاں ہوں گی وہ لینی ہیں تو لے لو." اب اُس شخص کو سلطان بہاالدین کی بات یاد آئی۔
...رحال اُس نے گیارہ آنے کی جلیبیاں خریدیں اور سلطان بہاالدین کی خدمت میں لے آیا. سلطان نے اپنا رومال جلیبیوں والے
...ن پر ڈال دیا اور فرمایا "مسجد کے اندر باہر جتنے لوگ ہیں اُن میں جلیبیاں تقسیم کرتے جاؤ مگر اُوپر سے رومال نہ ہٹانا." چنانچہ اُس
...ص نے یہی کیا. پُوری مسجد کے اندر باہر جلیبیاں بانٹیں پھر بازار میں بانٹیں پھر بھی ختم نہ ہوئیں تو وہ اپنے محلے میں آگیا اپنے گھر والوں
...والوں کو دیں جب وہ تقسیم کرتے کرتے تھک گیا اور عاجز آگیا تو اُس نے اُوپر سے رومال ہٹا دیا اور دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اندر سے
...ال خالی تھا۔

سلطان بہاالدین کے ایک مُرید سائیں پیرن شاہ کو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے والہانہ عقیدت تھی اور اُن کے عُرس
...جانے کے بڑے مشتاق رہتے تھے مگر سفری سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے یہ حسرت دل میں ہی دبا لیتے اور عُرس کے دنوں میں
...ت آزردہ رہا کرتے تھے. ایک بار عُرس کا زمانہ آیا تو سائیں پیرن شاہ نے مغرب کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے سلطان بہاالدین نے
...ی محرومی کا ذکر کیا کہ اس سال بھی خواجہ اجمیری کے دربار کی حاضری سے محرومی رہی۔
...سلطان بہاالدین کو بڑا خیال ہوا انھوں نے کہا "سائیں پیرن شاہ! آؤ جنگل کی سیر کو چلیں. دونوں چل پڑے. ابھی چند ہی قدم
...چلے تھے کہ سائیں پیرن شاہ حیران رہ گئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو خواجہ غریب نواز کی درگاہ میں پایا اور کوئی سوال سلطان بہاالدین
...سے کرنے لگے کہ انھوں نے انگلی کے اشارے سے خاموش کر دیا اور پھر دونوں نے خواجہ صاحب کے مزار اقدس پر فاتحہ پڑھی اور
...رب کی نماز وہیں ادا کی اور اُلٹے پاؤں مزار سے باہر نکل آئے. باہر آکر پیرن شاہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ اپنے قصبے مُرشدآباد
...مسجد میں پہنچ چکے تھے۔

ایک مرتبہ سلطان بہاالدین نے اپنے مُریدوں کو بتایا کہ ایک دفعہ ہم سوئے ہوئے تھے. لیٹے لیٹے ہم نے اپنا خاکی جسم کچھ دیر کے
...ے چھوڑ دیا. لوگ سمجھے کہ ہمارا وصال ہو گیا. انہوں نے ہماری تجہیز و تکفین کر کے ہمارا جنازہ پڑھا اور ہمیں دفن کر دیا. ہم اُن کی اِس
...دگی پر مسکرائے مگر خاموش رہے. جب تمام لوگ ہماری قبر چُونے اور اینٹوں سے پکی کر کے چلے گئے تو ہم نے رات کے وقت
...ی قبر کھودی اور اس میں سے باہر نکل کر خاموشی سے کسی دوسری آبادی میں چلے گئے تاکہ لوگوں کو ہمارا پتہ ہی نہ چل سکے۔

کچھ لوگوں کو اس بات سے سخت اختلاف تھا کہ انسان جو ساری زندگی گناہ کرتا ہے، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے قول کے مطابق اگر وہ ایک مرتبہ بہشتی دروازہ سے گزر جائے گا تو اس پر جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ مخالف اور موافق لوگوں میں گرم بحث ہو رہی تھی۔ حضرت سلطان بہا الدین نے بحث سُنی تو اُنھوں نے مخالف فریق کو پاس بُلایا اور کہا "تم کچھ آٹا لے کر آؤ اور اُس آٹے کو لے کر اس بہشتی دروازے میں سے گزارو۔ اُس کے بعد اُس آٹے کی روٹی پکاؤ اگر اس آٹے پر آگ نے اثر کیا تو تم بابا فرید کے اس قول کو جھوٹ سمجھ لینا اور اگر روٹی نہ پکی تو پھر تمہیں از خود ہی حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے۔"

چنانچہ آٹا لایا گیا اُس کو مخالف فریق خود لے کر بہشتی دروازہ سے گزرے اور بعد میں آٹا گوندکر اُس کو سُرخ گرم توے پر ڈالا گیا مگر آٹا برف کی طرح ٹھنڈا رہا کئی توے بدلے گئے کئی چولہے بدلے گئے کئی مرتبہ آٹا تبدیل کر کے بہشتی دروازے میں گزارا گیا مگر جو آٹا بہشتی دروازے میں سے ایک دفعہ گزر جاتا اس پر تیز سے تیز آگ بھی اثر انداز نہ ہوتی تھی۔ مخالفین خود بخود ہی شرمندہ ہو گئے۔

ایک مرتبہ مکّہ میں حیات النبیؐ پر بحث چھڑ گئی۔ ایک بدو نے جو سلطان بہاالدین کا مُرید تھا اُس نے بحث کرنے والوں سے کہا کہ میری کمر کے گرد ایک چادر لپیٹو۔ چادر لپیٹ دی گئی پھر اُس بدو نے کہا کہ اب اس چادر کو زور لگا کر دونوں طرف سے دو آدمی کھینچیں چادر کھینچی گئی چادر اُس بدو کی کمر کے پار ہو گئی۔ لوگ ششدر رہ گئے۔ بدو مسکرایا اور بولا کہ میں اپنے آقا محمدؐ کا ادنیٰ سا غلام ہوں۔ چادر تلوار کی طرح میرے جسم میں سے پار ہو گئی مگر میں اب بھی زندہ ہوں وہ تو خدا کے نبی اور حبیبؐ ہیں ان کی حیات کس طرح مشتبہ ہو سکتی ہے۔ مخالفین نہایت شرمندہ ہوئے۔

شیر کوٹ کا ایک شخص حج کے لیے گیا وہ بیان کرتا ہے کہ میں مدینہ میں موجود تھا کہ اچانک آواز آنی شروع ہوئی کہ سلطان بہاالدین ہندی کون ہیں؟ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یاد فرماتے ہیں اور جب آواز سُن کر سلطان بہاالدین روضہ مبارک تک پہنچے تو خدام اُن کو بصد احترام روضۃ المبارک کے اندر لے گئے۔

ایک عورت اپنے بیٹے کو سلطان بہاالدین کی خانقاہ میں اس وقت لائی جب بچّے پر نزع کا عالم تھا۔ بچّہ خانقاہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ اُس کی وفات ہو گئی۔ وہ عورت سلطان بہاالدین سے شاکی ہوئی کہ میں تو شفا پانے کے لیے آپ کی خانقاہ میں اپنا بچّہ لائی تھی مگر وہ شفا کی بجائے اجل کے حوالے ہو گیا۔ یہ سُنکر سلطان بہاالدین کو بہت ملال ہوا انہوں نے اُس عورت سے بچّہ لے کر اپنی گود میں لے کر اپنے سینے سے لگایا اور عورت سے کہا "یہ تو زندہ ہے جب عورت نے دیکھا تو بچّہ سچ مچ زندہ تھا اور ایسا صحت مند ہو گیا جیسے کبھی بیمار تھا ہی نہیں۔ عورت سلطان بہاالدین کو دُعائیں دینا شروع ہو گئی۔ سلطان بولے "نادان! کوئی بندہ مُردہ زندہ نہیں کر سکتا یہ خدا کے کام ہیں وہ ہی کر سکتا ہے۔ بس اُس کی جب مرضی ہو اپنے بندوں سے اپنے علم اور کلام کی لاج رکھنے کے لیے کوئی کام کرا دیتا ہے ورنہ عاجز بندوں کی کیا مجال کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکیں۔

حضرت سلطان بہاالدین کو پیرانِ پیرؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک دفعہ ایک رئیس حاجی حشمت علی جو کہ سلطان بہاالدین کے مُرید تھے اُن کو موت کا مرض لاحق ہو گیا۔ حکیموں اور ڈاکٹروں نے مرض کا علاج کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ مُرید سیدھا مُرشد آباد آیا اور سلطان بہاالدین سے عرض کی مجھے اس مرض سے نجات دلائیے۔" سلطان بہاالدین بولے کہ میری کیا مجال کہ میں مشیتِ ایزدی میں دخل اندازی کروں۔ خدا سے گزارش کروں گا" اُس کے لیے آپ نے خدا سے درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور

جی حشمت علی صحت یاب ہو گئے۔ اُس نے الفاظِ سپاس پیش کئے تو سلطان بہا الدین فرمانے لگے۔ یہ حضرت غوث اعظمؓ کی نظر کا لطف ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ ناچیز بندے کی گذارشات قبول فرما لیتا ہے۔

آپ نے اپنے وصال سے قبل گیارہویں شریف کی نیاز پہلے سے کہیں زیادہ اہتمام سے دینا شروع کر دی۔ آپ کے پاس ہر وقت مجذوب اور درویش لوگ آنے جانے لگے۔ ہر وقت لنگر گرم رہتا۔ پھر آپ یکایک بیمار ہو گئے۔ سال بھر میں کبھی تندرست ہو جاتے کبھی بیمار ہو جاتے۔ آپ کے مریدوں نے آپ کو علی گڑھ لے جانا چاہا۔ آپ نے انکار نہ کیا۔ چنانچہ آپ کو ایک رئیس مرید کی عالیشان کوٹھی میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اور حکیم اپنی اپنی بساط کے مطابق علاج کرتے رہے لیکن آپ کی کمزوری دن بدن بڑھتی گئی۔ آخر کار نومبر ۱۹۲۳ء آپ نے مرشد آباد جانے کی خواہش ظاہر کی مگر عمر نے وفا نہ کی اسی روز آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ کے جسدِ خاکی کو آپ کی خواہش پر مرشد آباد لے جایا گیا یوں یہ مردِ حق واصلِ حق ہو گیا۔

شاہ فیروزؒ مشہور صوفی گزرے ہیں۔ ان سے ان کے شاگرد اکثر پوچھا کرتے تھے کہ وہ انہیں جلد از جلد سب کچھ کیوں نہیں سکھا دیتے۔ شاہ فیروزؒ نے کہا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ سیکھنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد کے آگے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ شاگرد سامنے تو بیٹھا رہے گا لیکن ذہنی طور پر کہیں اور ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں سکھانے کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔"

اپنے جواب کو انہوں نے ایک مثال سے یوں مزین کیا:

"کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا، جو صوفی بننا چاہتا تھا چنانچہ اس سلسلے میں جب اس نے ایک صوفی سے رابطہ قائم کیا تو صوفی نے کہا۔ "جہاں پناہ۔ آپ لاپرواہ آدمی ہیں۔ ایسے آدمی کو میں اپنی شاگردی میں قبول نہیں کر سکتا۔"

"حضرت۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ کیا میں اپنے مذہبی فرائض پورے نہیں کرتا؟ کیا میں اپنے عوام کے مسائل کی طرف توجہ نہیں دیتا؟ میری سلطنت میں کوئی ایک شخص ایسا بتایئے جو کہے کہ میں لاپروا ہوں۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ دراصل لاپروائی آپ کے رگ و ریشے میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ آپ کو احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ آپ لاپرواہ ہیں۔" صوفی نے کہا۔

"حضرت۔ شاید آپ مجھے اپنے شاگردی میں اس لئے قبول نہیں کر رہے ہیں کہ میں آپ کے نکتے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"

"یہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی مرید اپنے پیر سے بحث نہیں کرتا۔ صوفی کا تعلق علم سے ہوتا ہے، وہ بحث نہیں کرتا۔ لیکن اگر آپ مصر ہیں تو میں ثابت کروں گا کہ آپ لاپروا ہیں۔"

بادشاہ رضامند ہو گیا۔ اس پر صوفی نے کہا کہ اب میں جو کچھ کہوں، آپ اس کے جواب میں 'آپ درست کہتے ہیں' کہیئے گا۔

بادشاہ نے دل ہی دل میں کہا کہ صوفی بننے کا یہ تو بڑا آسان طریقہ ہے۔ حضرت خوامخواہ اس کو مشکل بتا رہے تھے۔

چند لمحوں بعد صوفی نے بادشاہ کا امتحان لینا شروع کیا۔ "میں دوسری دنیا کا باشندہ ہوں۔" صوفی نے کہا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔" بادشاہ نے کہا۔

"عام لوگ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور صوفیوں کے پاس اتنا علم ہوتا ہے کہ وہ اسے استعمال نہیں کرتے۔" صوفی نے کہا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔" بادشاہ نے گردن ہلائی۔

"لیکن میں جھوٹا بھی ہوں۔!" صوفی نے کہا۔

"آپ درست کہتے ہیں۔" بادشاہ بولا۔

"بادشاہ سلامت جب آپ پیدا ہوئے تھے تو کمرے میں اس وقت میں موجود تھا۔"

"آپ درست کہتے ہیں۔"

"آپ کے والد جو ایک معمولی کسان تھے، وہ بھی اس وقت موجود تھے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" بادشاہ چیخا۔

اس پر صوفی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کتنے لاپرواہ آدمی ہیں آپ۔ چند لمحوں میں بھول گئے کہ آپ کو "آپ درست کہتے ہیں" کہنا تھا۔ نہیں حضور آپ کبھی اچھے مرید نہیں بن سکتے۔"

سیّد مہر علی شاہ ۱۸۵۹ء میں راولپنڈی سے گیارہ میل کے فاصلہ پر قلعہ گولڑہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سیّد نذر دین شاہ ایک مجذوب تھے۔ آپ کا پیدائشی نام مہر منیر تھا مگر آپ نے مہر علی کے نام سے دُنیا میں شہرت پائی۔ آپ کے والد نذر شاہ کو آپ کی ولادت کی خوشخبری ایک مجذوب نے دی تھی۔ مجذوب نامعلوم علاقہ سے آیا تھا اور سیّد مہر علی شاہ کی ولادت کے فوراً بعد آپ کی زیارت کر کے وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ اُس کا کسی کو کوئی پتہ نہ چل سکا۔

سیّد نذر شاہ فرماتے ہیں کہ جب مہر علی میرے صلب میں تھا تو مجھ پر اس قدر بے قراری ہوا کرتی تھی کہ چین کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں ساری ساری رات عبادت گزاری میں بسر کر دیتا۔ پورے قصبہ میں جتنی مساجد تھیں اُن میں پانی بھر دیا کرتا تھا مگر سکون تھا کہ میرے دل و دماغ سے کوسوں دُور تھا۔" نوافل کی کوئی تعداد نہ تھی اور روزوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ بس عشقِ الٰہی کی ایک حدت تھی جو نذر شاہ کو اندر ہی اندر جلا رہی تھی اور یہ خدا کا عاشق اس کی طلب میں جان کو جانِ آفرین کے سپرد کرنے کو بے قرار تھا۔

سیّد مہر علی شاہ نے چار سال کی عُمر میں ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ آپ کو عربی، فارسی اور صرف و نحو کی تعلیم ہزارے کے ایک عالم مولانا غلام محی الدین نے دی تھی۔ "کافیہ" کے علوم بھی شاہ صاحب نے مولانا غلام محی الدین سے ہی حاصل کیے تھے۔ ذہانت شاہ صاحب میں اس قدر تھی کہ جو پارہ ایک روز پڑھتے اگلے روز ازبر ہوتا۔ اسی طرح آپ نے قرآنِ حکیم بہت جلد حفظ کر لیا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا غلام محی الدین نے آپ کی پیدائشی ولایت کو آزمانا چاہا اور ایک ایسی کتاب جس کی کچھ عبارت کرم خوردہ تھی اور اس کا پڑھنا اور اس کے متعلق اندازہ لگانا عام آدمی کے لیے مشکل تھا، سیّد مہر علی شاہ کو دی اور "کہا کہ کتاب کے یہ کرم زدہ صفحات کل تمہیں یاد ہونے چاہئیں ورنہ سخت سزا ملے گی۔" اگلے روز شاہ نے وہ صفحات زبانی مولانا کو سُنا دیئے۔ مولانا حیران تو ہوئے مگر تصدیق کے لیے ان کو راولپنڈی جانا پڑا وہاں کتاب کے اصل اور صحیح نسخہ سے کرم خوردہ عبارت کی صحت کے متعلق پڑھا اور انگشت بدنداں ہو گئے کہ وہ بالکل وہی تھی جو مہر علی شاہ نے سُنائی تھی۔

اس دن کے بعد مولانا غلام محی الدین نے پیر مہر علی شاہ کو تعلیم دینے سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "عرش کی طرف پرواز کرنے والے شاہین کو ایک مولا کیا تعلیم دے سکتا ہے۔"

پیر مہر علی شاہ نے مولانا محمد شفیع قریشی کی درس گاہ سے منطق اور نحو کی تعلیم حاصل کی۔ آپ عموماً روزے سے رہا کرتے تھے اور اپنے گھر سے جو خرچہ آپ کو ملتا وہ آپ اپنے نادار ساتھیوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ قصیدہ غوثیہ کے ایک عامل مولانا سلطان محمود کے درس میں تشریف لائے۔ تمام طلبا اُن کی تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے مگر مہر علی شاہ ہنوز بیٹھے رہے۔ یہ دیکھ کر عامل قصیدہ کو سخت غصہ آیا اور وہ مہر علی شاہ کو مخاطب ہو کر بولا "پڑھوں قصیدہ غوثیہ کہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہو"

جواباً مہر علی شاہ بولے "تم قصیدہ پڑھو اور میں قصیدے والے کو بلاتا ہوں" یہ سن کر عامل کو غش پڑ گیا۔ مولوی سلطان محمود صاحب کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ تشریف لائے اور مہر علی شاہ سے کہا کہ تم شرعی درس گاہ کے طالب علم ہو۔ شرعی حدود سے تجاوز مت کرو"

پیر مہر علی شاہ نے ندامت سے سر جھکا لیا معذرت کی اور عرض کیا۔ استادِ محترم آپ بھی آئندہ ایسے شعبدہ بازوں کو یہاں آنے سے روکیں۔

سید مہر علی نے ہندوستان کی اعلیٰ درس گاہوں سے تعلیم حاصل کی اور خواجہ شمس الدین سیالوی المعروف شمس العارفین کے مرید ہوئے۔

پیر مہر علی شاہ کو اپنے مرشد خواجہ شمس العارفین سے اتنی عقیدت اور محبت تھی کہ ایک روز خواجہ شمس العارفین سیالوی اپنے مریدوں میں تشریف فرما تھے۔ اچانک خواجہ صاحب نے اپنے سارے مریدوں کو فرمایا جاؤ مسجد کے صحن میں۔ وہاں حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اُن سے اپنی اپنی مشکلات کے حل معلوم کر لو۔ لوگ ایک دم مسجد کے صحن کی طرف بھاگے۔ نفسا نفسی کا سماں پیدا ہو گیا۔ مگر پیر مہر علی شاہ اپنی جگہ پر جوں کے توں بیٹھے رہے۔ آپ کی اس طرح کی بے نیازی کو خواجہ شمس العارفین نے بہت محسوس کیا اور فرمایا مہر علی! کیا تم نے حضرت خضر سے کچھ نہیں طلب کرنا" مہر علی شاہ نے عرض کی "حضرت میں تو یک در گیر محکم گیر کا قائل ہوں اور میرے لیے حضرت خضر علیہ السلام آپ ہیں۔ جب ایک خضر موجود ہے تو پھر کسی دوسرے کے پیچھے کیا بھاگنا"

خواجہ شمس العارفین یہ سن کر اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے پیر مہر علی شاہ صاحب کو ظاہری باطنی طور پر مالا مال کر دیا اور لوگ حضرت خضر سے اتنا کچھ نہ حاصل کر سکے جتنا مہر علی شاہ نے اپنے مرشد سے حاصل کیا۔

ایک مرتبہ مولانا سلطان محمود جو کہ پیر مہر علی شاہ کے استادِ محترم تھے کسی سفر پر روانہ ہوئے۔ وہ گھوڑے پر سوار تھے اور پیر مہر علی شاہ اُن کے گھوڑے کی لگام تھامے چل رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت سلطان باہو کی ایک مرید خاتون جو عابدہ اور زاہدہ بھی تھیں بولیں "مولوی سلطان محمود تمہیں اس سیّد زادے کے مرتبے کا اندازہ نہیں ہے ورنہ تم یوں گھوڑے پر سوار ہو کر لگام اس کے ہاتھ میں نہ تھماتے۔ ایک ایسا دن آئے گا جب تم اس کے گھوڑے کے پیچھے بھاگو گے"

چنانچہ اس عفیفہ اور متقیہ خاتون کی پیش گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ پیر مہر علی جب شمس العارفین سے بیعت ہو چکے اور روحانیت میں اعلیٰ مراتب طے کر چکے تو ایک روز پیر مہر علی گھوڑے پر سوار عرس پر آ رہے تھے اُن کو دیکھ کر مولانا سلطان محمود نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اُن کو دوڑتا دیکھ کر احتراماً پیر مہر علی شاہ گھوڑے کو روک کر اُترنے لگے۔ تو مولانا نے اُن کو سختی سے روکا اور کہا "اگر تم میرے احترام کے لیے گھوڑے سے اُترے تو میں تمہیں اپنی شاگردی سے خارج کر دوں گا" پیر مہر علی شاہ کو مجبوراً گھوڑے پر بیٹھا رہنا پڑا۔ یوں مولانا سلطان محمود نے اس واقعہ کی تلافی کی جب ان کے گھوڑے کی لگام پیر مہر علی تھام کر چلے تھے۔

پیر مہر علی شاہ کان پور میں مولانا احمد حسن محدث کے پاس حصولِ تعلیم کے لیے تشریف لے گئے۔ تب شاہ صاحب کی عمر ۱۵ سال تھی۔ مولانا اُن دنوں حج کے لیے جا رہے تھے لہٰذا شاہ صاحب مولانا کی استادی سے محروم رہے اور علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

بہت عرصہ گزر جانے کے بعد جب پیر مہر علی شاہ روحانی کمالات اور تقویٰ کی ارتقائی منازل پر فروکش ہو گئے تو مولانا احمد حسن محدث بہت متاسف ہوئے کہ کاش اس عالی شان انسان کی استادی کے فرائض مجھے نصیب ہوتے ہوتے تو میری بھی بخشش کے سامان ہوتے۔ اسی احساس محرومی کو لیے وہ ایک روز مولانا بابا فرید گنج شکر کے روضہ پر پاک پتن شریف پر حاضر ہوئے وہاں پیر مہر علی بھی تشریف فرما تھے وہ مولانا احمد حسن کو دیکھ کر احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کو اپنے گھر لے گئے۔ مولانا نے پیر مہر علی سے عرض کی کہ کاش آپ کی استادی مجھے حاصل ہو جاتی اور میں بھی

آپ کی دعاؤں اور تلطف میں شامل ہو جاتا۔" پیر مہر علی شاہ نے یہ بات سنی تو اس دن سے وہ مولانا احمد حسن کو اپنے حجرے میں اپنے مصلے پر ساتھ ساتھ بٹھایا کرتے تھے اور انتہائی محبت اور تلطف فرماتے تھے۔ مولانا احمد حسن کے وصال کے بعد بھی کثرت سے پیر مہر علی ان کا ذکر کرتے تھے۔ اور فرماتے مولانا احمد حسن جیسا انسان اب دنیا میں نہیں آسکتا یہ کہہ کر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک پٹھان پشاور سے پیر مہر علی شاہ کے پاس آیا اور عرض کی کہ "حضرت میں آپ سے بیعت ہونے آیا ہوں۔" پیر مہر علی شاہ صاحب نے فرمایا "خان صاحب آپ کچھ مدت انتظار کریں اور اس دوران مسجد کی خدمت کریں۔ اس عرصہ میں خدا کی جانب سے جو حکم ہو گا ویسا کریں گے۔" خان صاحب نے حسب حکم مسجد کی خدمت کرنا شروع کر دی۔ اس طرح کوئی تین چار ماہ کے بعد خان صاحب دوبارہ پیر مہر علی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حرف مدعا بیان کیا۔ پیر مہر علی صاحب نے سکوت فرمایا اور خان صاحب کو مزید انتظار کرنے کے لیے کہا۔ خان صاحب انتظار کرنے لگے۔

ایک رات پیر مہر علی شاہ صاحب نے اسی پٹھان کو طلب کیا اور کہا "ایک کدال لے لو اور میرے ساتھ چلو" پٹھان کدال لے کر پیر مہر علی صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں ایک گاؤں میں پہنچے۔ ایک گھر کے پاس پہنچ کر پیر مہر علی صاحب نے فرمایا کہ "خان صاحب اس گھر کو نقب لگاؤ۔" خان صاحب بڑے حیران ہوئے مگر خاموش رہ کر نقب لگانی شروع کر دی۔ پھر مکان کے اندر داخل ہو کر پیر صاحب نے پٹھان کو کہا کہ "سارے صندوقوں میں ملبوسات و زیورات اور نقدی نکال لو اور ایک گٹھڑی میں باندھ لو۔" پٹھان نے حسب حکم گٹھڑی باندھ لی اور پیر صاحب کے ساتھ چل پڑا اور واپس خانقاہ پہنچ کر پیر صاحب نے پٹھان سے کہا کہ "یہ اسباب میرے حجرے میں رکھ دو۔" سامان رکھ دیا گیا۔ پٹھان بہت حیران ہوا اور سوچنے لگا "شکر ہے کہ میں نے بیعت نہ کی تھی۔ اس شخص نے تو چوری کا کام بھی شروع کر رکھا ہے۔" مگر پٹھان اس قدر خوف زدہ تھا کہ کہیں اس چوری میں میرا نام بھی نہ آجائے اور خاموش رہا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہاں سے مجھ کو بھاگ جانا چاہیے۔ اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا کہ ایک روز کچھ لوگ روتے چیختے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فریاد کرنے لگے کہ "ہم گاؤں سے باہر تھے گھر میں ہماری لڑکی کی شادی کے پارچہ جات، زیورات اور نقدی پڑی تھی کہ ڈاکو آ کر سارے گاؤں کا سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ اب ہم کیا کریں جبکہ ہماری لڑکی کی شادی سر پر ہے۔"

پیر مہر علی شاہ نے پٹھان کو بلایا اور فرمایا "خان صاحب وہ سامان لاؤ جو آپ نے سنبھال رکھا ہے۔" خان صاحب سامان اٹھا لائے لوگوں نے سامان دیکھا تو اچھل پڑے "حضرت یہ تو ہمارا ہی سامان ہے یہ یہاں کیسے پہنچا۔"

پیر مہر علی شاہ مسکرائے اور فرمایا "وہ کیسا مرشد ہے جو اپنے مریدوں سے غافل رہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ گاؤں پر ڈاکہ پڑنے والا ہے اور ہمارے مرید اپنے گاؤں سے باہر ہیں اور ان کے سامان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں چنانچہ یہ ہماری ذمہ داری تھی کہ ہم تمہارے سامان کی حفاظت کرتے۔ ہم نقب لگا کر قیمتی سامان نکال لائے اور نقب زدہ مکان کو دیکھ کر ڈاکوؤں کو اس مکان کا خیال نہ آیا اور باقی سامان بھی محفوظ رہا۔ خان صاحب یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کو دیکھ کر پیر صاحب نے فرمایا کہ "خان صاحب آپ کا یقین متزلزل تھا چنانچہ ہم آپ کو بیعت لینے میں تامل کر رہے تھے اور یہ واقعہ بھی آپ کے یقین و اعتقاد کی آزمائش کے لیے تھا۔"

پٹھان آپ کے قدموں پر گر پڑا اور زار زار رونے لگا اور آپ سے معافی مانگنے لگا۔ آپ نے اس کو معاف کر دیا اور اپنی مریدی میں لے لیا۔

۱۸۷۶ میں پیر مہر علی شاہ صاحب کی شادی ہو گئی۔ لیکن آپ پر جذب کی کیفیت اس قدر طاری رہتی کہ آپ اکثر اوقات گھر سے باہر ہی رہا کرتے تھے۔ اس عالم میں آپ کئی کئی مہینے جنگلوں میں رہ کر وردو وظائف میں مشغول رہتے۔ آپ آگرہ، دہلی اور اجمیر کی درگاہوں کی زیارت کے بعد حجاز کے سفر پر بھی گئے۔ اجمیر میں رہ کر ان کو اسرار و رموز کی علمی تعلیم بھی ملی اور طویل سیاحت کے بعد ۱۳۰۷ھ میں آپ گولڑہ شریف واپس آ گئے۔

چشتی سلسلہ کے ایک بزرگ کے ایک مرید غلام فرید نامی پیر مہر علی شاہ صاحب کے عقیدت مند تھے اور معماری کا کام کیا کرتے تھے

اُن کو اہلِ اللہ سے ملاقاتوں اور اُن کی کرامات و دیدار کرنے کے شوق کے علاوہ ذاتی تجلی کا شوق تھا۔ انہوں نے اپنے مُرشد سے اس بات کی تحریری اجازت لے لی کہ مَیں ذاتی تجلی کے لیے کسی بھی بزرگ کی خدمت میں جا سکتا ہوں اور اس معاملہ میں انہوں نے کسی صاحب ارشاد ہستی کو تلاش کرنے میں کئی سال گزار دیے۔ جنگلوں، ویرانوں، شہروں، قصبوں غرضیکہ جہاں تک اُن کی ہمت تھی انہوں نے تلاش کیا۔ اس غرض سے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزارِ اقدس پر چلّہ بھی کیا۔ اس چلّہ کے دوران ایک دن عالم رویا میں ان کی ایک گیسو دراز خوش ریش بزرگ سے ملاقات کروائی گئی۔ پھر یہی خواب غلام فرید کئی روز تک مسلسل دیکھتے رہے۔ مگر جگہ معلوم ہوتی تو اس خواب میں نظر آنے والی ہستی کو ڈھونڈتے۔ داتا صاحب کے مزار پر ایک روز کوئی بزرگ آئے انہوں نے غلام فرید کو بتایا کہ گولڑہ شریف میں ایک صاحبِ ارشاد رہتے ہیں وہ ذاتی تجلی کروانے پر قادر ہیں۔ غلام فرید اسی وقت گولڑہ کے لیے عازم سفر ہوتے۔ جب گولڑہ پہنچے تو انہوں نے پیر مہر علی شاہ کو دیکھا اور ان کا خواب میں نظر آنے والی ہستی سے موازنہ کیا تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ تو بالکل وہی ولی اللہ نکلے۔ جب پیر مہر علی شاہ نے غلام فرید کو دیکھا تو اُس پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ خدام اٹھانے لگے اور ہوش میں لانے لگے تو پیر صاحب نے روک دیا اور فرمایا اُس کو ایسے ہی پڑا رہنے دو۔ دُوسرے روز پیر صاحب کو بتلایا گیا کہ غلام فرید کی تڑپ دیدنی ہے اس پر پیر صاحب نے فرمایا "غلام فرید سے کہو کہ اگر ورد و وظائف سے تمہاری تسلی نہیں ہوتی تو چالیس یوم کا روزہ رکھ لو"۔ غلام فرید نے سوچا "تڑپ تو رہا ہی ہوں اگر چالیس یوم کا روزہ رکھ لیا تو کم از کم بُھوک کی وجہ سے دم تو نکل جائے گا اور جان خلاصی ہو جائے گی"۔

کئی روز بُھوک اور پیاس برداشت کیے ہوتے گزر گئے۔ ایک روز اچانک پیر مہر علی شاہ صاحب نے خدام سے فرمایا کہ "غلام فرید کو لاؤ" چنانچہ غلام فرید کو لایا گیا۔ پیر صاحب بولے! "خوشخبری مبارک ہو تمہارا کام ہو گیا اب روزہ افطار کر لو"۔ چنانچہ غلام فرید نے روزہ افطار کر لیا۔ اُس کے بعد غلام فرید نے معمول بنا لیا۔ ہر وقت ورد وظائف میں مشغول رہا کرتے اور ایک چادر میں اپنے آپ کو لپیٹے رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد غلام فرید کو حج پر جانے کا حکم ملا وہ حج پر چلے گئے مگر واپسی پر پیر مہر علی شاہ کے سامنے آکر رونے لگ گئے کہ اے مرشد "آپ یہاں بھی میرے سامنے تھے اور وہاں بھی میرے سامنے تھے تو پھر مجھے اپنی شان دکھلانے کے لیے اتنی دُور کیوں بھیجا تھا۔ اس بوڑھے کو اپنے ہی قدموں میں رہنے دیتے"۔ یہ سُن کر پیر مہر علی مسکرائے اور غلام فرید پر خصوصی تلطف فرمایا۔

ایک مرتبہ پیر مہر علی شاہ اور مولانا لطف اللہ مستورات کے ہمراہ بہلی کے سفر پر جا رہے تھے کہ راستے میں آپ کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ ڈاکوؤں نے مال و زر کا مطالبہ کیا آپ نے ڈاکوؤں کے سردار سے کہا کہ تم مستورات سے دُور رہو۔ اور ہم اپنا سارا مال و زر و دیگر اسباب تمہارے حوالے کیے دیتے ہیں۔ سردار رضامند ہو گیا۔ آپ نے سارے قافلہ میں جتنی عورتوں کے زیورات، نقدی وغیرہ تھی حسبِ وعدہ ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا۔ جب ڈاکو چلے گئے تو قافلہ کی ایک عورت نے آپ کو بتلایا کہ مَیں نے کسی طرح اپنے زیورات ڈاکوؤں سے بچا لیے ہیں۔ پیر مہر علی شاہ کو بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے فوراً زیور عورت سے لیے اور ڈاکوؤں کا پیچھا کیا اور ان تک پہنچ کر اُن سے کہا "بھائی وعدہ خلافی ہوئی ایک عورت کے زیورات رہ گئے تھے وہ دینے آیا ہوں اور وعدہ خلافی کی معذرت کرتا ہوں۔ ڈاکوؤں کا سردار آپ کے اس طرزِ عمل سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً آپ کے ہاتھ پر اپنے ساتھیوں سمیت تائب ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے راہزنی سے کنارہ کش ہو گیا۔

پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف کی کرامات سے ان کی زندگی بھری پڑی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کذاب و دجال۔ نُوطی فرتوتی کا قصہ کون نہیں جانتا جس نے نبوت کا جُھوٹا دعویٰ کر رکھا تھا اور طرح طرح کے جھوٹے پروپیگنڈے کرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے پیر مہر علی شاہ صاحب کے ساتھ بھی مناظرہ کرنے کی جرأت کی۔ آپ نے فرمایا "تو میرے ساتھ کیا مناظرہ کرے گا اگر تو سچا ہے تو ہم دونوں جلتے ہوئے تندور میں چھلانگ لگاتے ہیں جو سچا ہو گا وہ بچ جائے گا اور جو جھوٹا ہو گا وہ جل مرے گا"۔ مرزا غلام احمد علیہ لعنت فرار ہو گیا۔ آپ نے اُس کو بددعا دی کہ تمہاری موت انتہائی ذلت اور غلاظت میں ہو گی اور اللہ تعالیٰ نے اُس مرتد کو بیت الخلاء میں انتہائی ذلت کی موت دی۔

پیر مہر علی شاہ صاحب اپنے حج کے احوال میں بیان فرماتے ہیں کہ "وادیٔ حمرا میں ڈاکوؤں کے خوف کی وجہ سے مَیں نے عشاء کی سنتیں وجہ مجبوری موقوف کر دیں اور مَیں نے رات خواب میں خود کو مسجد نبوی میں پایا اور دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ تشریف لاتے ہیں اور مجھ کو بُلاتے بھی نہیں،

میں درخواست کرتا ہوں کہ "حضورؐ میں تو آپ کے دیدار کے لیے اتنی دُور سے آیا ہوں لیکن آپؐ نے مجھے اپنے لطف و کرم سے محروم رکھا ہے۔" آپؐ نے فرمایا "تم نے میری سنتیں ترک کر دی ہیں تو پھر تلطف کا مطالبہ کیسا؟" اُسی دم پیر صاحب کی آنکھ کھل گئی فوراً دوبارہ مکمل عشا کی نماز ادا کی۔ اور حضورؐ سے عشق و محبت کی والہانہ لہر آپ کے اندر اس قدر جذب و شیفتگی سے پیدا ہوئی اور آپ نے اپنی مشہور نعت اُسی شکر و جذب سے مغلوب ہو کر کہی۔

کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء ۔۔۔ گستاخ اکھیں کتھے جا لڑیاں

پیر مہر علی صاحب کا معمول تھا کہ آپ فجر کی نماز کے بعد اپنے حجرے میں۔ اپنے تک ذکر و اذکار میں مصروف رہتے۔ آپ کے وِرد و ظائف اس قدر جلالی ہوا کرتے تھے کہ حجرے کی حدود میں جو بھی آنکلے بے ہوش ہو جاتا۔ اپنے کے بعد آپ ارشاد و تلقین کا سلسلہ جاری فرماتے۔ دُور دراز سے لوگ اپنی تکالیف، مسائل اور اُمیدیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دامنِ اُمید بھر کر جاتے۔

آپ کا دستور تھا کہ آپ کم کھاتے، کم بولتے اور کم سوتے تھے۔ کڑی عبادات نے آپ کو خواب اور نیند سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اکثر اوقات آپ مراقبے میں رہا کرتے تھے۔ خلوت ہو یا جلوت آپ پر وجدانی کیفیت طاری رہتی۔ جس کو مسکرا کر دیکھ لیتے اس کی تقدیر بدل جاتی تھی۔

پیر مہر علی شاہ صاحب سے کسی نے سوال کیا کہ شاہ صاحب "آپ سیدگھرانے سے متعلق ہیں اور آلِ رسولؐ ہیں مگر بیعت آپ نے جٹ گھرانے کے مُرشد سے کی ہے اس کی کیا وجہ ہے کیا یہ سادات کی توہین کے مترادف نہیں" پیر مہر علی مسکراتے اور فرمایا کہ "جٹ کے سبز کھیت اپنی ہریالی کی وجہ سے مجھے اپنی طرف کھینچ کر لے گئے۔ جٹ کے پاس کچھ تھا تب ہی سید نے اس کی غلامی قبول کر لی۔ معترض خاموش ہو گیا۔

وقتِ وصال آپ اُٹھ کر بیٹھ گئے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ تھا "بے شک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا پروردگار ہے اور اس بات پر ثابت قدم رہے اُن پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خوف مت کرو اور غم مت کھاؤ اور بشارت سنو! اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم دُنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جس کی تم خواہش کرو اور مانگو۔"

جب آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے تو آپ کا چہرہ نورِ الٰہی سے منور تھا۔ آپ اس کے بعد لیٹ گئے۔ منہ سے اسم ذات کا ذکر کرنا شروع کیا اور اسی ذکر میں آپ پردہ فرما گئے اور یوں اس خورشید طریقت کا وصال ہو گیا۔

یادِ حبیبؐ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایامِ خلافت میں رات کو گشت کے لیے نکلے۔ ایک مکان کے قریب سے گزرے تو آواز آئی، ایک عورت روئی دُھنک رہی تھی اور یہ اشعار پڑھ رہی تھی:

محمدؐ پر ابرار کے درود!
اُن پر پاک لوگ اور نیک لوگ درود پڑھ رہے ہیں!
وُہ تو راتوں کو جاگنے والے اور سحر کو رونے والے تھے!
مَوت تو بہت طرح سے آتی ہے، اے کاش مجھے
یقین ہو جاتا کہ مرنے کے بعد مجھے حضورؐ کی زیارت نصیب ہو گی!

حضرت عمرؓ وہیں بیٹھ گئے اور روتے رہے۔ ان اشعار نے حضورؐ سے جدائی کے زخم ہرے کر دیے۔ اس صدمے سے بیمار ہو گئے اور چند روز تک صاحبِ فراش رہے۔ (قاضی سلیمان منصور پوری)

کسی انسان کی روحانی بلندی و پستی کا اندازہ لگانا ہو تو یہ دیکھو کہ وہ شریعت محمدیؐ پر کس حد تک کاربند ہے جس قدر وہ شریعت میں پابندی ملحوظِ خاطر رکھے گا اُتنا ہی اُس کا روحانی درجہ بلند ہوگا اور جس قدر وہ شریعت ے دُور ہوگا اُتنی ہی پستی اُس کا مقدر ہوگی۔ وہ شخص جس کا ظاہر شریعت سے عاری اور باطن عشقِ الٰہی سے خالی ہو۔ وہ شریعت و یقت کی منازل کبھی بھی نہیں پا سکتا۔ ایسا شخص محض ایک گمراہ، اندھیری رات کا بھٹکا مسافر ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس نے اپنی ن پر ظلم کیا اور خود کو گمراہی کی ان دیکھی تاریک راہوں کا مسافر بنا ڈالا اور تباہی و بربادی مول لی۔

شاہ کلیم اللہ، وہ صوفی منش انسان تھے جنہیں شریعت و طریقت کے بین بین ایک شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ فنا فی اللہ، ی باللہ صوفی تھے۔ قطبِ عالم شاہ کلیم اللہ، چشتی، قادری، سہروردی اور نقشبندی چاروں سلسلوں میں شامل تھے۔

گیارہویں صدی ہجری میں آنکھ کھولی۔ مشہور و معروف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ہندوستان، جو ایک عالم میں اپنی فنونِ یرات کے شاہکار نمونوں کی وجہ سے مشہور ہے وہ آپ ہی کے خاندان کے مرہونِ منت ہیں۔ آگرہ کا تاج محل ہو یا دلی کا لال قلعہ و مع مسجد، شمشیر گڑھ کے قلعے ہوں یا نواب آصف خاں کا محل، سرزمینِ ہند کی یہ عالیشان عمارتیں آپ ہی کے خاندان کے فنی کمالات یک یکتا روزگار نمونہ ہیں۔ آپ کے والد، حاجی نور اللہ تعمیرات و خطاطی کے فن میں باکمال مشہور تھے۔ جامع مسجد دہلی کے دروازہ ندہ کتبے آپ ہی کے تراشے ہیں۔ حاجی نور اللہ عمر کا ایک طویل حصہ گزار چکے تھے۔ اولاد کی بڑی چاہ تھی۔ ڈھلتی عمر میں تندرست و سرخ و سفید بچہ ملا تو خوشی سے بے قابو ہوگئے۔ مبارکباد وصول کرتے تھک گئے۔ خوش تھے اور خدا کے آگے شکر گزار تھے ان کی قسمت کا ستارہ آج کل عروج پر تھا۔

کلیم اللہ ان خوش قسمت بچوں میں شمار کیے جا سکتے تھے جو حقیقتاً منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کی آمد زندگی نے ایک خوش گوار بھرا پُرا پاک ظاہر کیا۔ بچہ ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا تو باپ کے دل کا بھی سکون تھا۔ باپ کو بڑھاپے سہارا ملا تو اُس نے بھی سہارے کی بڑی قدر کی عزت کی۔ پیار و محبت سے پروان چڑھایا۔ مستقبل کے لیے مضبوط بنانا چاہا۔ پہلا تعلیم و تربیت کا تھا۔ اچھی تعلیم ہی بیٹے کو عروج پر لے جا سکتی تھی۔ بُرے بھلے کی تمیز کرا سکتی تھی۔ ناز و نعم میں پلنے والے کے

لیے تعلیم کا بھی خصوصی طور پر یہ بندوبست کیا جاتا تھا۔ سو وقت کے مشہور و معروف بزرگ علماء سے درخواست کی گئی کہ بچے کو اپنے ہاتھوں تعلیم کی راہ پر چلائیں۔ حتیٰ کہ شیخ مہلوال اور شیخ ابوالرضا جیسے جید علماء تک کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ بھی بچے کو اپنے سایہ عاطفت میں لیں۔ چنانچہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو بچے نے بھی فطری خوبیوں اور ذہانت کا ایسا برملا اظہار کیا کہ اساتذہ نے بھی شوق سے مزید تعلیم کا درجہ بڑھایا۔ جو دیکھتا، اس کی وضاحت کے لیے بیقرار رہتا۔ جو سنتا اس کی گہرائی کی جستجو کی تڑپ پیدا ہو جاتی۔ کلیم اللہ کے اساتذہ نے دیکھا کہ وہ جتنا آگے بڑھتا ہے، اتنا ہی گم ہو جاتا ہے۔ علم کو اس جوش، اخلاص اور صداقت سے حاصل کرتا کہ اساتذہ کا دل بھی خوشی سے معمور ہو جاتا اور یوں کم عمری میں ہی علم کی مسند پر جا بیٹھا۔ نوجوانی میں مستند علم داں مانا گیا۔

نور اللہ نے بیٹے سے کچھ اور ہی خواہشات وابستہ کر رکھی تھیں، لیکن جب دیکھا کہ بیٹا تو دیواروں پر نقش و نگار کندہ کرنے کی منزل سے بہت آگے جا چکا ہے اور اب لوٹ کے آنے کا نہیں۔ خیال کی عمارتیں بنانے، ڈھلنے والا، کاغذ، قلم لیے علیحدہ، گوشہ نشین ہوئے نجانے کیا کیا تصنیف کرتا رہا۔ ذہن کی پیچیدگیاں کتابوں میں منتقل کرنا شروع کیں تو اس میں بھی ایک کمال حاصل کیا۔ فلسفہ و منطق پر لاتعداد تصانیف تحریر کرنے کے بعد خطابت کا ایسا شوق چرایا کہ جب کلام کی خاطر منبر پہ کھڑا ہوتا تو لوگ ہمہ تن گوش ہوتے اور پھر دلائل، براہین اور ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں منہ سے ادا ہوتیں کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ ایسے ایسے رموز بیان، حیات و کائنات کے عقدے کھولتا کہ لوگ خطابت میں یہ موہنی دیکھ کر وجد میں آ جاتے۔ خواہش ہوتی کہ ندرت و دل آویزی کی آبشار بہتی رہے۔ کہیں نہ تھمے۔

باپ نے چند برس تو خاموشی اختیار کیے رکھی مگر جب دیکھا کہ بیٹا کسی صورت بھی روش بدلنے کو تیار نہیں تو صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔ ایک دن پاس بلا کر کہا: "کلیم تم تو ماشاءاللہ خیر سے علم و فضل میں بڑی مہارت رکھتے ہو۔ آج ذرا مجھے یہ تو سمجھاؤ کہ ساکن کنواں بہتر ہے یا رواں دواں چشمہ؟"

بیٹے نے کچھ دیر تو باپ کے سوال کو حیرت سے سنا پھر جواب دیا۔ "یقیناً بہنے والا چشمہ ہی بہتر ہوگا۔"

یہ سن کر باپ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: "جب تمہیں اتنی عقل ہے تو پھر تم کیوں ساکن کنویں کی مانند ہو۔ علم و ہدایت کے خزانے چھپائے بے حس و بے فکر۔ خود تک ہی محدود، کیا یہ خود غرضی کی اعلیٰ ترین مثال نہیں؟ تم نے روشنی حاصل کی مگر دوسروں کو دینے کے لیے یہ جھجک کیسی؟ دوسرے تم سے فائدہ اٹھائیں۔ کیا تم یہ برداشت نہیں کر سکتے؟"

باپ کی بات سن کر کلیم اللہ پر ایسا اثر ہوا کہ آنکھیں بھیگ گئیں اور پھر دلی کی فضا آپ کی خطابت اور بلاغت کی آبشار کے شور سے گونج اٹھی۔ درس و تدریس کی جلوتیں آراستہ کیں تو بڑے بڑے علماء کو کھینچ لیا۔ شاگردی اور صحبت اختیار کرنا بھی باعث فخر سمجھا جانے لگا۔ دلی کی مساجد میں درس دیتے تو ایک عالم اکٹھا ہو جاتا۔ آپ شاہ کلیم جہاں آبادی کہلائے۔

باپ نے جب علم و ہدایت میں فضیلت رکھنے والے بیٹے کا یہ عروج یہ شان دیکھی تو مطمئن ہوا۔ لائق فائق بیٹے نے سکون چھین لیا۔ کر دیا تھا۔ علم کی اشاعت تندہی سے جاری رکھے آٹھ سال کا طویل عرصہ ہونے کو آیا لیکن معمولات میں بھی فرق پیدا نہ ہوا۔ وہی مطالعہ، تحریر، جو شوق دل میں رچ بس گیا ہو۔ وہ بھلا کب چھوٹتا ہے۔

ایک دن اسی طرح علم کے پیاسوں کو ارد گرد بٹھائے درس سے فیض یاب کر رہے تھے کہ ایک بزرگ، خستہ حال بنا کسی کو خبر دیئے بغیر سیدھا آپ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور کڑک دار آواز میں بولا: "نادان! خود تو حقیقت پا نہیں سکا، بنے کیف و بے ہدایت رہ کر اب دوسروں کو کیا ہدایت دیتا ہے۔ جا! کھلے آسمان کے نیچے جا، ہدایت پا۔"

یہ سننا تھا کہ شاہ کلیم اللہ کی حالت میں ایک تغیر سا رونما ہوا۔ گریبان چاک کیا اور بھاگتے ہوئے مدرسے سے باہر نکل گئے۔ شاگردوں نے حیرت سے دیکھا۔ سمجھنے کی کوشش کی مگر وہ اس بزرگ کی کہی بات کی گہرائی میں نہ جا سکے۔ جس نے ان کے استاد کا یہ حال بنا دیا۔

شاہ کلیم اللہ کی یہ حالت دیکھ کر سبھی نے حیرت سے اُنہیں دیکھا۔ کہاں وہ کلیم اللہ کہ حریری عبا زیب تن کیے درس و تدریس کا فرض سرانجام دے رہے ہوتے۔ ایک شان سے آن بان سے۔ لیکن کہاں یہ عالم کہ جسم سے لپٹے کپڑے کا ہوش ہی نہیں میلا ہے یا صاف۔ بیٹھے کدھر ہیں دھیان کہاں ہے۔ نہ کسی سے بات چیت نہ کسی سے لین دین۔

یہ جذب و مستی کا ابتدائی دَور تھا۔ نہ گھر نہ دُنیا اور نہ آرام کی فکر۔ سب سے بے نیاز بنا کسی کی زیرِ نگرانی اعتکاف میں بیٹھنا تو پھر مہینوں ہی بیٹھے رہنا۔ متعلقین اور شناساؤں نے دیکھا تو یقین نہ آتا کہ کیا یہ کلیم اللہ ہے۔

اُنہیں اس حالت میں دیکھ کر ایک بزرگ نے گھورتے ہوئے کہا "زنجیریں کاٹ کر ہی بے فکر ہوا چلا جا رہے۔ دل میں تو آگ بھر دل کو کاٹ۔ زنجیریں کاٹنے سے کیا ہوتا ہے؟"

یہ سُن کر آپ نے کہا "بزرگ! زنجیریں میرے بس میں تھیں، کاٹ ڈالی تھیں۔ اب آگ کہاں سے بھروں۔ کہاں سے لاؤں؟"

"تلاش کرو۔ جستجو کیے بنا کہاں کچھ ملا ہے چلتے جاؤ کہیں قدم نہ رُکیں۔ کچھ نہ کچھ تو پا ہی لوگے"

یہ واضح بات سُنی تو راہِ نجات کا علم ہُوا۔ شہر سے میلوں دُور جنگلوں میں جانکلنا۔ ویرانوں میں عبادت و ریاضت کرتے رہنا اور پھر آہ و فریاد کی قبولیت کا وقت آیا تو ایسے شان سے کہ حضورؐ کی زیارت ہوئی۔ ملاقاتیں بڑھیں تو غوثِ اعظمؒ، خواجہ معین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، بہاؤالدین زکریاؒ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہُوا۔

چنانچہ اب دو ہی مشاغل رہ گئے۔ اللہ کے کسی برگزیدہ بندے کا سُنتے تو اُس کی صحبت میں وقت گزارنا ضروری خیال کرتے یا پھر اللہ کے نیک بندوں کے مزاروں پر حاضری دیتے اور کسبِ فیض کرتے۔ جذب و شوق بڑھتا رہا۔ دل میں ایک ایسی آگ بھڑکتی رہتی جو اُنہیں بے چین و بے کل کیے رہتی۔ بالآخر شاہ کلیم کو دل کی آگ بجھانے کا جذبہ مدینہ لے گیا۔ جہاں ایک بزرگ کامل حضرت شیخ یحییٰ فرکش تھے۔ مدینے کے قطب کہلاتے تھے۔ مضطربانہ انداز میں حضرت یحییٰ کی چوکھٹ پہ پہنچے تو دیوانہ وار آپ کو پکارنے لگے "یا شیخ۔ غلام حاضر ہے۔ یا شیخ غلام حاضر ہے"

شیخ یحییٰ نے آپ کو قریب بُلایا اور اشتیاق آمیز لہجے میں بولے "فرزند ___ آؤ ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔ آؤ ہمارے سینے میں سما جاؤ۔"

چنانچہ اب شاہ کلیم اللہ کو شیخ یحییٰ کا سایہ نصیب ہوا تو وجود پہ چھائی بے کلی دُور ہوئی۔ بیقراری و بے چینی کو قرار آیا۔ عبادت و ریاضت کا اب تو کوئی ثانی نہ تھا۔ دونوں بنا کچھ کھائے پیئے مسلسل یادِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ مجاہدے کیے۔ رضا و توکل کو شعار بنایا اور پھر عرفان کی اُس بُلندی پر فائز ہوئے کہ کامل عارف کہلائے۔ زہد و ریاضت۔ کشف میں لاثانی۔ جو کہا۔ تکمیل کو پا گیا۔

مدینہ میں اب شاہ کلیم اللہ کو ایک طویل عرصہ ہونے کو تھا۔ ایک رات خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ حضورِ اکرمؐ بہ نفسِ نفیس خود آئے ہیں۔ سامنے کلیم اللہ کے مُرشد شیخ یحییٰ بھی تشریف فرما ہیں۔ حضورؐ نے ایک خرقہ اُنہیں عطا کرتے ہوئے فرمایا "لو۔ یہ کلیم اللہ کو پہنا دو۔" اور پھر شیخ یحییٰ نے آنحضورؐ کے حکم کی تعمیل میں خرقہ اُٹھا کر آپ کو پہنا دیا۔

خواب سے بیدار ہوئے تو دل ایک عجیب سی کیفیت سے گزر رہا تھا کہ شیخ یحییٰ کا بلاوا آیا۔ دھڑکتے دل سے گئے تو دیکھا مُرشد خرقہ تھامے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بے تابانہ بڑھے۔ مُرشد نے مسکراتی نظروں سے مُرید کو دیکھا اور خرقہ عنایت کرتے ہوئے فرمایا۔

"آنحضورؐ نے عنایت کیا ہے تمہارے لیے۔"

اب آپ کا مدینہ سے رُخصت کا وقت قریب آگیا تھا۔ مُرشد نے اجازت دی تو رختِ سفر باندھا اور ایک طویل سفر طے کرتے ہوئے دِلّی واپس آگئے۔ دِلّی آکر سب سے پہلے حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دی اور رات بھر خدا کی یاد میں عبادت و ریاضت جاری رکھی۔

دلی میں جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان ایک علاقہ خانم بازار کے نام سے مشہور تھا۔ آپ نے خانم بازار میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک عالیشان خانقاہ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ خانقاہ کیا تھی اپنے وجود میں سمٹی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ایک طرف درس گاہ تھی تو دوسری طرف کتب خانہ۔ دائیں طرف لنگر خانہ تھا تو بائیں جانب زنان خانہ۔ جلد ہی خانقاہ نے وہ شہرت حاصل کی کہ دور دور سے علم کے پیاسے پیاس بجھانے آنے لگے۔ ایک ہجوم سا رہتا۔ عقیدت مندوں، ارادت مندوں اور پھر حصول تعلیم کی خاطر آئے طلبہ غرض ایک میلہ سا لگا رہتا۔ اخراجات بے انتہا ہوتے۔ دلی دربار، آپ کی دینی خدمات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ قدر کی نگاہ سے عزت و احترام سے ——— سو اخراجات اپنے ذمے لیے۔

شاہ کلیم کی ذاتی آمدنی تو بہت کم تھی۔ درویش انسان تھے۔ خدا پہ توکل کرنے والے۔ کھانا کھا لیا تو بے فکر ہو گئے کہ آج کھلانے والا کل بھی کھلانے کی قدرت رکھتا ہے۔ رزق مہیا کرنے والا اس کا وعدہ کر چکا ہے تو پھر فکر کیسی۔ اچھے وقتوں میں آپ کا ایک مکان بن گیا تھا جس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ آپ نے اپنی رہائش کے لیے ایک اور چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اور اخراجات بھی اسی میں سے نکالنے لگے۔

طبیعت میں استغنا بے انتہا تھی۔ خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کا تصور تک نہ لاتے۔ نہ کبھی کسی کا نذرانہ قبول کیا اور نہ اس چیز کے حق میں تھے۔ ہاں البتہ اگر کوئی بہت خاص مرید صاف نیت سے کوئی چیز لاتا تو اس کا دل نہ توڑتے۔ لے کر رکھ لیتے اور پھر حاجت مندوں میں اسی وقت تقسیم کر دیتے۔

شاہ کلیم اللہ نے خواجہ نصیر الدین محمود کی وفات کے بعد دلی کی مرکزیت کو دوبارہ اجاگر کیا۔ چشتیہ سلسلے کی شیرازہ بندی کی اور پھر آپ ہی کی کوششوں کے طفیل دلی ایک مرتبہ پھر اسی علم و فضل کا مرکز بن گیا جو محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کے دور میں اس کا خاصہ تھا۔

شاہ کلیم اللہ پیار و محبت کا ایک پیکر تھے۔ امن و آشتی کی علامت۔ مریدوں سے اس قدر چاہت اور الفت سے پیش آتے کہ سبھی یہی خیال کرتے کہ بس حضرت کو مجھی سے پیار ہے۔ مجھی پہ نظرِ کرم زیادہ ہے۔ سنتِ رسولؐ کے سخت قائل تھے۔ حضور کی پیروی کرتے ہوئے عفو و درگزر کی وہ مثالیں قائم کیں کہ لوگ آپ کی ہمت اور قوتِ برداشت پہ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ امراء نے اپنے اختیارات کے بل بوتے پہ آپ کو تنگ کیا، چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے مگر انہیں کبھی بددعا نہ دی، نہ برا بھلا کہا۔ ہر مرید سے بلا امتیاز سلوک کرتے۔ ان میں سے کسی کو ذرا برابر تکلیف ہوتی تو آپ بیقرار ہو جاتے اور اس کی عیادت کو جاتے اور صحت کے لیے دعاگو رہتے۔

شاہ کلیم اللہ تلخیاں خندہ پیشانی سے سہہ کر فرماتے "ہمیں تکلیف میں مبتلا کرنے والے کو شادمانی کا سامنا کرنا پڑے۔ یہی ہماری اس کے لیے دعا ہے۔"

حضرت شاہ کلیم اللہ، بندگانِ خدا کے مسائل حل کرنے میں بھی پیش پیش رہتے۔ یہ مسائل خواہ اجتماعی نوعیت کے ہوں یا انفرادی۔ آپ دونوں پہ توجہ فرماتے۔

ایک مرتبہ شاہ کلیم اللہ حج پہ جا رہے تھے۔ ہمراہ ایک قافلہ تھا۔ مریدوں اور ارادت مندوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی تھے۔ قافلہ سفر طے کرتا رہا۔ عین درمیان میں پہنچ کر قافلہ کے پاس پانی بوند تک کو نہ رہا۔ لوگ حیران پریشان چاروں طرف ریت کے خشک ٹیلوں کو دیکھتے اور انجام سے خوفزدہ ہو جاتے۔ پیاس نے جس طرح انہیں نڈھال کر رکھا تھا وہ ایک انتہائی علامت تھی۔ حضرت سے مشکل بیان کی گئی تو آپ نے حکم دیا کہ چاروں طرف پھیل کر تلاش کرو کہیں نہ کہیں تو کوئی کنواں مل ہی جائے گا۔ جستجو کرنے سے کیا نہیں مل جاتا۔ ہدایت پہ عمل ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد قافلے والوں نے بالآخر ایک کنواں تلاش کر ہی لیا مگر بدقسمتی نے ابھی پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ کنواں ملا تو چہروں پہ مسرت کی لہر ابھری مگر کنوئیں کی حالت دیکھ فوراً ماند پڑ گئی

ہی مگر سطح اُس قدر نیچے کہ پانی بھرنا مشکل ہی نہیں ناممکن سا لگتا تھا۔ دوبارہ شاہ کلیم سے رُجوع کیا گیا۔ آپ نے مسکراتے
کہا "اطمینان رکھو ۔۔۔ مَیں نماز کی نیّت باندھتا ہوں۔ تم خدا کی شان دیکھو" یہ کہہ کر آپ نے نماز کی نیّت باندھی اور لوگوں
نے دیکھا کہ کنوئیں کا پانی خود بخود سطح پہ اس قدر اُبھر آیا کہ کنوئیں کی منڈیر سے بھی باہر چھلکنے لگا۔ لوگوں کے چہرے
شادمانی سے چمکنے دمکنے لگے۔ پھر آپ نے اُنہیں پانی استعمال کرنے کی اجازت دی تو اُنہوں نے خوب سیر ہو کر پانی
تھ مُنہ دھوئے۔ اتنے میں ایک مُرید نے اپنی طرف سے دُور اندیشی ظاہر کرتے ہوئے ایک مشکیزہ تھاما اور پانی بھرنا چاہا
س نے مشکیزہ پانی سے بھر کر نکالا۔ پانی کی سطح گرتی چلی گئی اور کنوئیں کی تہہ تک جا پہنچی۔ لوگوں نے حیرت سے یہ منظر
ں آپ نے افسوس بھرے لہجے میں فرمایا "افسوس۔ نادانو! تم نے اللہ پہ بھروسہ نہ کیا۔ وہ جو پتّھر میں کیڑے کو رزق پہنچا
ہ تمہیں کیوں پیاسا مارتا۔ کاش تم اللہ پر توکّل کرنا سیکھ لو۔"

ی طرح ایک مرتبہ دِلّی پر ایسا سخت وقت آن پڑا کہ سارا سال ہی خشک سالی چھائی رہی۔ لوگ بارش تک کو ترس
شدید ترین خطرہ دیکھ کر چند با اثر حضرات آپ کی خدمت میں آئے اور دست بستہ عرض کی "حضرت۔ کچھ کریں اگر
رہا تو دِلّی کو اُجڑنے سے کوئی نہ بچا سکے گا" ۔۔۔

ن کر آپ نے فرمایا "مَیں کیا کر سکتا ہوں۔ میرا آقا ہی سبھی کو بچانے والا ہے۔ بچانا چاہے گا تو ابھی بارش ہو جائے گی"
کا یہ کہنا تھا کہ اللہ نے اپنے اس نیک بندے کے الفاظ کی لاج رکھ لی اور ایسی مُوسلا دھار بارش ہوئی کہ دِلّی شہر دھل کر
اور پیاسے کھیت سیراب ہوئے۔

ب میں ہمدردی کا جذبہ بدرجہ اُتم تھا۔ کسی کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے کسی مصیبت زدہ کو دیکھتے تو اپنے ربّ سے
حال میں بہتری لانے کے لیے دُعا گو ہوتے اور بڑی دیر تک اُس کے لیے خُدا سے فریاد کرتے رہتے۔ نرم دِل اور
تھے۔ ایک مرتبہ ایک نابینا کو دیکھا تو دِل غم سے اُمڈ آیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں تو ہاتھ دُعا کے لیے بُلند کرتے ہوئے خدا سے
ن میں دُعا کی۔ دُعا کرنا تھی کہ اُس شخص نے پلکیں کھول کر حیرت سے دیکھنا شروع کر دیا۔

پ نے رشد و ہدایت کا ایک چشمہ جاری کر رکھا تھا۔ دینِ اسلام کی تعلیمات کے بارِغ اور سُنّتِ رسولؐ کی پیروی کے لیے
ام کرتے۔ اتباعِ سُنّت کے سختی سے قائل تھے اور دوسروں سے بھی اس کی اُمّید رکھتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ اور
فریضہ بھی سرانجام دیا۔ غیر مُسلم آپ کے حُسنِ سلوک، سادہ طرزِ زندگی اور آپ کی عبادت اور ریاضت سے بے پناہ
اسلام کے دائرے میں آجاتے۔

✖

ت میں ایک کٹر آتش پرست رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا تو آپ نے اُسے نزدیک بُلا
ے فرمایا "فیروز۔ تم برسوں سے آگ کی پُوجا کر رہے ہو۔ عُمر کا ایک طویل حصّہ آتش پرستی کی نذر کیا۔ مگر مجھے معلوم ہے
ا تو نہیں پا سکتے۔"

ر آپ نے سامنے جلتے الاؤ میں ہاتھ ڈال دیا۔ جو حرارت کے لیے جلایا گیا تھا۔ فیروز نے آپ کو یوں ہاتھ آگ میں
ا تو اُس کے مُنہ سے ایک سسکاری سی نکلی اور اُس نے جلدی سے آپ کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچا مگر یہ دیکھ کر حیرت زدہ
جھلسنا تو الگ رہا۔ رُواں تک متاثر نہیں ہُوا۔ صحیح و سالم ہاتھ دیکھ کر اُس پر بڑا اثر ہُوا اور وہ اپنی غفلت میں گزری
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور آپ سے التجا کرتے ہوئے بولا "حضرت ۔۔۔ میری مدد کیجئے۔ مَیں ہدایت و فلاح کا راستہ چاہتا
راہنمائی کریں۔"

ر شاہ کلیم نے اُسے کلمۂ توحید پڑھایا اور اُسے تعلیم دی کہ اس پوری کائنات میں صرف خدا کی واحد ذات ہی عبادت و

پوجا کی سزاوار ہے۔ وہی سب کا خالق ہے۔ سورج چاند ستارے سبھی اسی کے تابع ہیں۔ پھر محکوم چیزوں کی عبادت کیا معنی رکھتی ہے؟ اچھی طرح جان لو کہ صرف اور صرف اللہ کی واحد ذات ہی عبادت کے لائق ہے۔

ایک مرتبہ آپ حج کی نیت سے مکہ کی طرف گامزن تھے۔ ہمراہ ایک قافلہ بھی تھا۔ قافلہ کے شرکاء، سفر کی طوالت سے آگہی رکھتے تھے۔ چنانچہ راستہ بھر لاپرواہی سے زادِ راہ کا استعمال کرتے رہے۔ پیٹ میں گنجائش نہ بھی ہوتی تو خود کو اس سے آمادہ پیٹ پوجا کر لیتے کہ سفر میں طاقت ہی کام آتی ہے۔ جسم میں قوت ہو گی تو سفر آسانی سے طے ہو گا۔ سفر تے تو کیا طے تھا زادِ راہ ضرور ان کا ساتھ چھوڑ گیا۔ بقول ایک شریکِ قافلہ ابو حمزہ "ہمارے پاس کھانے کے نام پر ایک دانہ تک نہ تھا" کلیم اللہ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے بے نیازی سے فرمایا اللہ پر توکل اختیار رکھو اور بے فکری سے راستہ طے کرو۔ لوگوں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا لیکن دل ہی دل میں خوف زدہ تھے کہ بجانے آگے کیا حشر ہو مگر جلد ہی انہیں حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب شام ہوتے ہی ان کے لیے روٹی، کھجور اور پانی کا خود بخود بندوبست ہو گیا اور راستہ بھر خوان خود بخود بچھا سے اتارا۔ قافلے کے شرکاء نے بہت چاہا کہ اس بھید کو پالیں مگر سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

حضرت شاہ کلیم اللہ کی نگاہوں میں وہ تاثیر تھی کہ پتھر سے پتھر دل بھی نرم پڑ جاتے تھے۔ بدعقیدہ اور بد اطوار لوگ آپ کی نظرِ کرم کے سبب فلاح پا گئے اور حق کی راہ کے مسافر ٹھہرے۔ آپ سے فیض پانے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جو تحریر نہیں لائی جا سکتی۔ اصفہان سے ایک شخص کلیم اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بدتمیزی و درشتی سے معرفت کے تنقیدا اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہوئے کہنے لگا "حضرت آپ خواہ کچھ کہیں میں تو روحانیت پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔"

آپ اس وقت کھانا کھانے میں مشغول تھے لیکن اس کی باتیں بھی تحمل و بردباری سے بغور سن رہے تھے۔ چہرے کی نرمی طاری تھی۔ ماتھا شکنوں سے بے نیاز۔ کھانا کھا چکے تو روٹی کا ایک نوالہ بچا لیا اور محبت سے اس شخص کو دیکھتے کھانے کا حکم دیا۔ اس شخص نے بلا چوں وچرا روٹی کا ٹکڑا لے کر عقیدت سے منہ میں رکھ کر چبانے لگا۔ نوالے کا حلق میں اترنا تھا کہ اس شخص کی حالت میں ایک تبدیلی سی پیدا ہو گئی۔ چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی چمک میں یوں اضافہ ہوا کہ جا سکتا۔ اپنے اندر اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ تو بجانے دل میں کیا آیا کہ آپ کے قدموں میں گر گیا اور لگا پھوٹ پھوٹ کر رونے سے ذرا حالت سنبھلی تو عاجزی و انکساری کا مجسّم بنے معافی کا طلبگار رہا اور اقرار کرتے ہوئے کہا۔

"حضرت! میں ہی غلطی پر تھا۔ سخت غلطی پر۔ میرے گناہ اور گستاخیاں معاف فرمائیں۔ میں روحانیت پر مکمل یقین رکھتا ہوں۔ بجانے کیوں شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا!" پھر اس شخص نے اٹھ کر روحانیت کے موضوع پر ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی کہ جس میں خود اپنے عائد کیے اعتراضات کی نفی کی۔

آپ کے الفاظ میں بجانے کیا سحر تھا کیا کشش تھی کہ لوگ آپ کے الفاظ کے سحر میں جکڑے بنا نہ رہ سکتے تھے کہ ایک ہی لفظ سے لوگوں کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں۔ جس شہر میں آپ مقیم تھے وہاں ایک شخص ایک حسینہ کے عشق میں دیوانہ بنا گلیوں میں گھومتا پھرتا اور اس عورت کے مکان کے گرد چکر پہ چکر لگاتا اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کے گھر کے آگے ڈیرہ جمائے رہتا مگر وہ عورت بھی بے مروتی میں اپنی مثال آپ تھی اور اس دیوانے پر ذرا التفات نہ کرتی اس کا دیوانہ، حال سے بے حال ہوا اسی کے نام کا ورد کرتا رہتا۔ ایک دن وہ آپ کے ہاتھ لگا تو آپ نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میاں، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ایک عورت کے لیے یہ دیوانگی یہ مشقت اٹھاتے پھرتے ہو۔ جہاں سے حاصل بھی کچھ ہوا اور نہ ہونے کی امید ہے اگر یہی محنت و مشقت، ربّ العزت، اپنے خالق کی عبادت میں اٹھائی ہوتی تو بجانے

ں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے۔ تُو اُس بے مروت کا خیال دل سے نکال کر اللہ کی محبت میں کیوں گرفتار نہیں ہوتا۔ اب
ت سے سنبھل جا۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ خدا کی رحمت کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ تم اس میں یقیناً سما جاؤ گے۔ اُس کے
ت میں تو ایک کائنات آسکتی ہے۔"

ر پھر یہ آپ کی باتوں کا نصیحت کا سحر ہی تھا کہ وہ شخص جو اپنی محبوبہ کے پیچھے مرنے مارنے پر تُلا رہتا تھا اُس کے لیے
ٹھکرانے کو تیار تھا وہ آپ کی باتوں سے محبوبہ بھلا کر خدا سے لو لگا بیٹھا۔ آپ نے بھی اُس کی راہ پر مکمل راہ نمائی کی۔
فلاح کی ایسی راہ دکھائی کہ جلد ہی وہ ایک کامل عارف کے طور پر جانا پہچانا جانے لگا اور یہ سب آپ کی قابل اثر تبلیغ
تھا۔ تاثیر تھی۔

✖

اجہ محمد یوسف کا ایک عزیز تھا۔ جس کے طور طریقوں سے وہ سخت نالاں تھے۔ اس کے طور طریقے بھی ایسے تھے کہ
وں کو ہاتھ لگائیں۔ اُس آوارہ اور بد عمل شخص کو خواجہ محمد یوسف نے اور دیگر متعلقین نے بے انتہا سمجھایا۔ بدی۔ نیکی
ائی مگر مجال ہے جو اُس نے کسی کا اثر قبول کیا ہو۔ اُس کے رنگ ڈھنگ وہی رہے جو تھے۔ لوگوں نے جب دیکھا
نے گڑھے کی مانند ہے۔ ہر نصیحت پھسل کر اس سے اُتر جاتی ہے تو انہوں نے فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ ناقابل اصلاح ہے۔
اتو درست ہو جائے گا ورنہ یہ بدی کی راہ کا ایسا مسافر ہے جو نیکی پر آ ہی نہیں سکتا۔ خواجہ محمد یوسف اور دوسرے
اُس سے قطع تعلق کر لیا۔ اس بات سے وہ شخص اور زیادہ ضد میں آگیا اور اُنہیں چڑانے کی خاطر جان بوجھ کر مزید غلط
حرکات کرتا۔ آخر خواجہ یوسف نے تنگ آکر اُسے زبردستی پکڑا اور شاہ کلیم کی خانقاہ میں لے گئے۔ رقت آمیز لہجے

رت اس نے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ خاندان کا نام سربازار اُچھالتا پھر رہا ہے۔ ایک نظر کرم اس پر بھی ڈالیں۔"
نے اُس شخص کو دیکھا اور پھر نرمی سے ہاتھ بڑھا کر اُس کے سینے پر رکھتے ہوئے فرمایا "کیوں رے۔ کیوں ایسی حرکات
ہے کہ جن سے عزیزوں کا دل جلے۔"

کی نصیحت کا اُس شخص پر اتنا اثر ہوا کہ اُس نے فوراً توبہ کی اور آپ سے خواہش ظاہر کی کہ آپ اُس کی تعلیم و تربیت
ام دیں تاکہ وہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے لائق بن سکے۔ آپ نے اُس پر بھرپور توجہ دی۔ اُس کے بعد اُس
آپ کی خانقاہ میں ہی عبادت و ریاضت میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔ دو دفعہ مکہ حج کے لیے گیا اور تیسری مرتبہ حج
حضور کے روضہ کی زیارت کو گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

✖

ہر تبہ، دریائے جنا میں پانی کی سطح اس قدر بڑھنی شروع ہو گئی کہ صاف نظر آرہا تھا کہ یہی صورتحال رہی تو جلد ہی دِلی
جائے گا۔ سرکاری کارندوں اور رفاکاروں نے باہمی طور پر ہر ممکن کوششیں کیں کہ کسی طرح دِلی کو اس ہلاکت خیز طغیانی سے
ی صورت برنظر نہ آتی تھی۔ ہر کسی پر گھبراہٹ طاری تھی۔ دِلی کی تباہی، کچھ دیر کی ہی بات رہ گئی تھی۔ خوف زدہ اور
ں کے اس ہجوم میں ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ اس سلسلے میں حضرت کلیم اللہ کی مدد چاہی جائے۔ اُن کی عظمت
ے کلام تھا۔ سبھی آپ کی عبادت، ریاضت اور افادیت سے آگاہ تھے اور پھر ڈوبتے کیلئے تو تنکے کا سہارا بھی غنیمت
ہ پھر فوراً حضرت کلیم اللہ کی خانقاہ میں حاضری دی گئی اور اس آفت سے نازل کیا گیا جو لمحہ بہ لمحہ دِلی کو ہڑپ کرنے
آپ نے بھی صورتحال کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے فوراً قدم اُٹھانے کا قصد کیا اور قرآن پاک تھام کر دریائے جمنا کے
ڑے ہوئے جہاں پانی اب اتنا اُبھر کر بھر رہا تھا کہ جلد ہی کناروں سے نکل کر دِلی کی حدود میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا۔

لوگ اُمید بھری نظروں سے آپ کو دیکھتے اور خوف زدہ ہو کر جمنا کی تیزی سے بلند ہوتی سطح پر بھی ایک نگاہ ڈال لیتے۔ آپ قرآن پاک تھام کر اللہ سے دُعا کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے مشکلات و آفات سے بچانے والی برتر و اعلیٰ ذات! آج میں تمہارے سامنے، تمہاری ہی مقدس کتاب لیے مدد ہوں۔ کیا تم اپنی اس مقدس کتاب کی موجودگی میں بھی، ہمیں اس جمنا کے حوالے کر دو گے۔"

شاہ کلیم اللہ کی زبان سے جُوں جُوں کلمات کی ادائیگی ہوتی جا رہی تھی۔ توں توں جمنا کی سطح گرنا شروع ہوئی اور پھر لوگ دیکھا کہ بپھرا ہوا جمنا یکدم سکون میں آگیا۔ پانی کی سطح گر گئی اور دِلّی اُس کی وحشت کا شکار ہونے سے بچ گیا۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا اور اس دن آپ کی خانقاہ میں تو تِل دھرنے کی جگہ نہ رہی تھی۔ کیا ہندو کیا سکھ سبھی کے دوش بدوش آپ صحبت سے فیض یاب ہونے پہنچے ہوئے تھے۔ بہت سوں نے اسلام کے آفاقی پیغام کو تسلیم کرتے کلمۂ توحید کا وِرد کرنا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے۔

جو بھی آپ کا ایک مرتبہ مُرید بن جاتا۔ وہ عزم و استقلال اور ہمت کے ایک پیکر میں ڈھل جاتا۔ مصائب و تکالیف ہوتا یا افلاس کے ہاتھوں تنگ دستی کا اُن کا سینہ عزم سے بھرا رہتا۔ دل میں رقت اور سوز و گداز کی فراوانی ہوتی اور ہمت سے ان مشکلات کا سامنا کرتے اور مقابلہ کرتے۔

شاہ کلیم کا شف صوفی تھے۔ آپ کا معمول ہوتا تھا کہ جو شخص بھی آپ کی خانقاہ میں داخل ہوتا آپ اُسے اُسی کے نام ہوئے انتہائی محبت سے پیش آتے۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ کوئی انجان بندہ بھی آپ کی خانقاہ میں داخل ہوتا اور اس سے کہ وہ اپنا تعارف کرائے آپ اُسے پہلے ہی اُس کے نام سے پکار کر اپنے پاس بُلا لیتے اور وہ حیرت زدہ رہ جاتا۔

ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ وہ آپ کا چرچا و شہرہ سُن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آپ اُس نووارد کو دیکھتے ہی اُس کے نام سے پکارا اور اتنی محبت و چاہت سے پاس بُلایا گویا ایک طویل عرصے کی رفاقت ہو اُس کے ساتھ۔

وہ شخص آپ کے مُنہ سے اپنا نام سُن کر حیران رہ گیا اور کہنے لگا "حضرت! جہاں تک میرا خیال ہے بلکہ مجھے اس ہے کہ میں آج پہلی مرتبہ آپ سے مِل رہا ہوں۔ پھر آپ کو میرا نام کیوں کر معلوم ہوا؟"

آپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جس کا معلم اللہ ہو، تمام عالموں کا عالم اُس سے کچھ بھی بعید نہیں۔"

شاہ کلیم کو اللہ اور سُنتِ رسول سے کس حد تک لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے ایک مرتبہ آپ حجاز روانہ ہوئے۔ مدینہ پہنچ کر مسجدِ قبا میں حاضری دینے کی خواہش ہوئی تو پیدل ہی چل پڑے۔ مُریدوں نے یہ دیکھا تو عرض "حضرت ـــ یہ کیا کرتے ہیں؟ ہم ابھی آپ کے لیے سواری کا بندوبست کرتے ہیں۔"

لیکن آپ نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ سواری کی ضرورت نہیں۔ جب حضورؐ پیدل چل کر مسجدِ قبا کر نماز کی ادائیگی فرماتے تھے تو میں حضورؐ کا ادنیٰ سا غلام ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔"

غرض آپ کی زندگی سنتِ رسول کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

آپ فرمایا کرتے تھے۔ "مبارک ہیں وہ پاؤں جو اللہ کی راہ میں گرد و غبار سے میلے ہوئے۔ جن میں چھالے پڑے۔ جو دوڑ کی راہ میں اُٹھے تھے۔ اس لیے اللہ نے بھی اُن پہ دوزخ کی آگ حرام قرار رکھی ہے۔"

حضورؐ کی زندگی سادگی کا ایک بہترین اور بے مثل نمونہ تھی۔ آپؐ کو شان و شوکت کا لباس پہننے سے سخت نفرت تھی۔ کھیلنے کی چادر استعمال کرتے تھے۔ اس لیے شاہ کلیم اللہ بھی آپؐ کی پیروی کرنے کو راہِ نجات سمجھتے تھے۔ وہ آپؐ کی بیدار ہو کر غسل کرتے اور صاف شفاف کپڑے پہنتے۔ چونکہ حضورؐ نے اپنا ہر کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیا تھا۔ اس

اپنے کام خود کرنے کے عادی تھے۔ آپ کی سادگی اور عاجزی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کے جاہ و جلال میں کسی قسم کا فرق آیا ہو۔ بڑے بڑے امراء حتیٰ کہ بادشاہ تک آپ کے آگے بات کرنے سے ہکلاتے تھے۔

آپ نے اُس دور میں تبلیغ و حق کا پیغام دینا شروع کیا جب انصاف نام کا رہ گیا تھا۔ ہر سُو نفسانفسی کا عالم تھا۔ لوگ عیش و عشرت کے دلدادہ تھے۔ بُرائی کو اچھا سمجھنے لگے تھے۔ ایسے میں آپ نے جہاد کا علم بلند کیا۔ بدی کے خلاف بُرائیوں کے خاتمے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی۔ آپ کے پُرتاثیر، سحر آفریں کلام اور نصیحت کی برکت ہی ہوتی کہ گمراہی کی راہ پر چلنے والے اور گم گشتہ راہ سیدھی راہ پر آجاتے، فلاح پاتے اور پرہیزگاری میں مثالیں قائم کرتے۔ لوگوں کو نصیحت کرتے سمے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آپ جلال میں آجاتے۔

ایک مرتبہ آپ کا ایک ارادت مند دودھ کا پیالہ آپ کی خدمت میں لایا اور پیش کیا۔ آپ کی عادت تھی کہ کبھی اکیلے نہ کھایا کھانا نہ پیا کرتے، چنانچہ جب اُس ارادت مند نے وہ دودھ کا پیالہ آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اُسے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ پہلے حاضرین محفل سے شروع کرو۔

یہ اشارہ پاکر بیچارہ ارادت مند سخت حیران ہُوا اور سوچنے لگا نجانے حضرت کو کیا ہو گیا ہے اچھی طرح جانتے ہیں کہ پیالے میں اتنا دودھ کہاں ہے جو یہ تمام لوگ پی سکیں۔ بلکہ ایک بُوند تک مُنہ میں لے جا سکیں۔ حاضرینِ محفل بھی آپ کے اس اشارے کو مذاق سمجھنے لگے اور خیال کرنے لگے کہ آپ شاید ارادت مند سے یونہی مذاق کر رہے ہیں بہرحال ارادت مند ہاتھ میں پیالہ لیے کھڑا ہی رہا یہ دیکھ کر آپ نے اُسے دوبارہ اشارہ کیا۔ اب کی مرتبہ آپ اُس شخص کی حیرانگی کو دیکھ کر محظوظ بھی بہت ہوئے۔

وہ شخص آپ کا اشارہ پاکر پیالہ پہلے شخص کے پاس لے کر گیا۔ اُس نے جی بھر کر دودھ پیا۔ دوبارہ جو دیکھا تو پیالہ ویسے ہی لبالب بھرا تھا۔ دوسرے کی باری آئی۔ پھر تیسرا دودھ پینے لگا مگر پیالہ خالی نہ ہوا۔ بالآخر تمام لوگوں کے بعد آپ نے خود بھی اس پیالے سے دودھ پیا۔

✠

شاہ کلیم اللہ کا ایک مُرید باغبانی میں بے پناہ مہارت رکھتا تھا۔ اُس کا اپنا ایک ذاتی باغ بھی تھا۔ جس میں وہ انار کی کاشت کرتا تھا یہ ایک وسیع باغ تھا جس پر وہ بھرپور توجہ دیا کرتا —— زمین کی بوائی سے لے کر ہر کام وہ خود کرتا۔ تجربہ و علم کا بھرپور استعمال کرتا مگر نجانے کیا بات تھی کہ جب بھی فصل پک کر تیار ہوتی وہ انار کھٹے نکلتے اور اس طرح اُس کی ساری محنت اکارت جاتی۔ کیونکہ اس کے کھٹے اناروں کو کون منڈی میں خریدتا اور اگر کوئی آمادہ بھی ہو جاتا تو اُس قیمت پر جو اُس مُرید کی لگی لاگت سے بھی کہیں کم ہوتی۔ یہ صورتحال جب لگاتار رہی تو وہ پریشان حال آپ کے پاس آیا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے اس پریشان مُرید کو جب یوں اپنی محنت کے رائیگاں جانے پر افسوس کا اظہار کرتے دیکھا تو فوراً اُس سے ہمدردی ہُوئی اور آپ اُس کے ساتھ اُس کے باغ میں چلنے کو تیار ہو گئے۔

وہ شخص خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اُس کے لیے یہی بات کیا کم قابلِ عزت تھی کہ آپ اُس کے باغ کو سعادت بخشنے جا رہے تھے۔ باغ میں جاکر آپ نے اپنے مُرید سے کہا: "ذرا ہمیں بھی تو چکھاؤ اپنے باغ کا پھل۔ ہم بھی تو دیکھیں کہ آخر اس میں کیا ترشی ہے جو اچھے داموں بِک نہیں پاتا۔"

مُرید نے عقیدت و احترام سے ایک انار آپ کی طرف بڑھایا۔ آپ نے چکھا تو کہا۔

"کیوں رے تُو تو کہا کرتا تھا کہ تیرے باغ کے سبھی انار اتنے ترش ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ مگر میں نے تو اس سے زیادہ میٹھا انار آج تک نہیں کھایا۔" اُس نے بے یقینی سے آپ کو دیکھا تو آپ نے مسکراتے ہوئے کہا "دوسرا انار توڑ کر خود ہی اندازہ لگا لو۔"

اُس شخص نے فوراً ایک انار توڑ کر کھایا تو وہ واقعی بہت میٹھا تھا۔ اُس کے بعد اُس نے کئی اور انار توڑ کر کھائے مگر سبھی شیریں نکلے۔ یوں اُس کے باغ کی شہرت اور انار کی مٹھاس دُور دُور تک پھیل گئی۔

شاہ کلیم اللہ کے مُرید ہندوستان کے طُول وعرض میں پھیلے دینِ اسلام کی تبلیغ میں بھرپور جدّوجہد کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ آپ نے دِلّی میں بیٹھے بیٹھے بھی اُن کی نگرانی جاری رکھی اور جہاں کوئی سنّتِ رسولؐ کی پیروی سے ہٹا آپ نے سختی سے اُس سے بازپُرس کی۔ آپ نے مُریدوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لیے ایک مکمل نظام کر رکھا تھا۔ آپ مُریدوں پر زور دیا کرتے کہ وہ وقت کی پابندی سختی سے کیا کریں اور کام کو تکمیل کے مراحل میں پہنچا کر ہی دم لیا کریں۔

آپ کی ذات بندگانِ خدا کے لیے فیوض کے ایک رواں دواں چشمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ لوگ آپ کے پاس مکمل یقین و اعتماد سے آتے۔ اُلجھے ذہنوں کو مختلف مسائل اور شبہات گھیرے لاتے۔ آپ انہیں جواب کیا دیتے جواہر ریزوں سے لاد دیتے اور وہ مطمئن و پُرسکون ہو کر ہی لوٹتے۔ اس لحاظ سے آپ کی ذات بابرکت ذات تھی۔ خدا کے بندوں کے لیے برکات کا سرچشمہ۔

آپ اپنے خلیفہ مقرّر کرنے میں انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرتے تھے۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ انجانے میں کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں خلافت تھما دیں جو علم میں ناقص ہو اور گمراہی پھیلانے کا موجب بنے۔ آپ ہمیشہ اُسی کو خلیفہ مقرّر کرتے جس کے بارے میں خود آپ کو یقین ہو کہ یہ شخص صحیح عالم و فاضل ہے اور تبلیغ و اشاعت کا جذبہ رکھتا ہے اور حضورؐ کی سُنت کا پیروکار ہے۔

آپ اپنے خلفاء کو ارشاد فرمایا کرتے تھے "دولت مندوں سے کبھی ربط وضبط نہ بڑھانا۔ فقراء اور دولت مندوں کا راستہ جُدا جُدا ہے۔ یہ لوگ دولت کے سحر میں اس قدر جکڑے ہوتے ہیں کہ خونی رشتوں کا احترام تک بھلا دیتے ہیں۔ اس لیے ان سے کبھی بھلائی کی اُمید نہ رکھنا۔ اس لیے ان کے ساتھ میل جول بڑھانے میں احتیاط اور عاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرنا۔ اتنا میل جول نہ بڑھا لینا کہ وہ تمہارے معاملات میں دخل انداز ہوں، البتہ اگر کوئی خود آ جاتا ہے اور مدد کا خواہش مند ہوتا ہے تو اس کی راہ نمائی ضرور کرنا مگر دیکھو ــــــ اُن کے پاس خود کبھی نہ جانا۔"

✻

ایک مرتبہ آپ اپنے مُریدوں اور ارادت مندوں میں گھرے انہیں وعظ و نصیحت فرما رہے تھے۔ دُور سے آنے والوں کو خاص طور پہ پاس بٹھا کر نصیحت کرتے تھے۔ ایک شخص کی جب باری آئی تو وہ ذرا جھجکتے ہوئے عاجزی سے بولا "حضرت! میں ایک کم متاعِ انسان ہوں۔ مجھے اس طرح کی کوئی نصیحت کیجئے کہ میں اُس کو انجام دے سکوں۔"

آپ نے یہ سُنا تو مسکرا پڑے اور نرمی سے بولے "کیوں نہیں۔ ہم تمہیں صرف ایک نصیحت کریں گے مگر وہ بہت سی باتوں پر حاوی ہو گی۔ اگر تم نے اِس پر عمل کیا تو فلاح کو پا جاؤ گے۔ غور سے سنو ــــــ جب بھی کوئی تمہیں بدتمیزی سے پکارے بداخلاقی سے پیش آئے تم ہرگز اُس سے ویسا ہی برتاؤ مت کرنا۔ خوش اخلاقی سے ہی جواب دینا۔ کیونکہ خدا اور اُس کے رسولؐ کے نزدیک قیامت کے دن جو شخص زیادہ قریب ہوگا وہ وہی ہوگا جس کا اخلاق اچھا ہوگا۔ خدا تمہیں خوش وخرم رکھے اِس پر ہر آن عمل کرنا۔"

آپ فرمایا کرتے تھے وہ شخص زندگی اور آخرت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں رقّتِ طبع نہ ہو۔ جو سنگ دل ہو ایسا شخص ہر مرحلے پر ناکامی کا شکار ہوتا ہے۔

ایک شخص روزانہ شاہ کلیم اللہ کی خانقاہ پہ آتا۔ بنا کسی سے مخاطب ہوئے بس خاموشی سے بیٹھے رہتا۔ جو کچھ آپ نے فرمایا نشین کرتے جاتا۔ آپ بھی روزانہ اُسے دیکھتے مگر آپ نے بلایا کبھی نہ اُسے۔ ایک دن آپ خانقاہ میں داخل ہوئے تو وہ پہلے بیٹھا ہُوا تھا۔ آپ کو داخل ہوتے دیکھ کر ایک دم احترام سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

آپ نے بنا کچھ تمہید میں کہے صرف ایک جملہ اُس سے کہا کہ "جا۔ خدا کے کوچے میں جا بیٹھ۔"
یہ سُن کر وہ شخص عاجزی سے بولا "حضرت! خدا کا کوچہ کدھر ہے؟"
شاہ کلیم نے اس مرتبہ پھر مختصر سا جواب دیا "جہاں تو نہ ہو۔"
ان الفاظ میں نجانے کیا سحر تھا کہ وہ شخص جب دوبارہ آپ کی خانقاہ میں آیا تو اس حال میں کہ خود کو فراموش کیے ہوئے اللہ کا وِرد کرتا رہتا۔
کسی نے آپ سے پوچھا "حضرت! وہ عارف جو حق پرست بھی ہو اور حق شناس بھی، وہ کیسے پہچانا جائے گا؟"
آپ نے فوراً کہا "جو خود کو اپنی تمام تر خواہشات سمیت اللہ کی راہ میں فنا کر دیئے۔"
شاہ کلیم اللہ کو صرف معین الدین چشتی کی طرح سماع سننے کا بہت شوق تھا۔ اگرچہ اُس زمانے میں سماع کے وہ طور طریقے نہ رہے جو حضرت اجمیریؒ کے دور کا خاصہ تھے۔ اسی لیے آپ اپنی سماع کی محفلوں میں صرف اپنے مُریدوں کو ہی شرکت کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ آپ نے سماع کو اصولوں کا پابند کرنے میں سختی سے کام لیا۔ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم میری طرح سماع کی محفلیں نہیں سجا سکتے تو اس سے بہتر ہے کہ تم مراقبے میں چلے جایا کرو۔ خواہ مخواہ سماع کی محفلیں نہ جما لو۔ جب دل چاہے اور راغب ہو تب سماع سے لطف اندوز ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ قوال ہمیشہ وہی بلاؤ جو پاکباز ہوں، شریعت کے پابند ہوں اور نمائش سے بے نیاز، لہو و لعب سے عاری سماع کی محفلیں جمانا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔
شاہ کلیم اللہ نے بہت سی کتب بھی تصنیف کیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد بتیس کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے لیکن زمانے کے ہاتھوں صرف چند کتب ہی بچ سکی ہیں جن میں عشرۂ کاملہ ـــــ مرقعِ کلیمی ـــــ کشکولِ کلیمی مشہور و معروف کتب ہیں اور شائع ہو چکی ہیں۔
آپ فرمایا کرتے تھے: "انسان کی حقیقت لفظ "میں" میں پوشیدہ ہے۔ جب تک انسان میں اس شے کا وجود رہتا ہے اس میں زندگی کی رمق باقی رہتی ہے لیکن جیسے ہی انسان اس چیز سے محروم ہوتا ہے تو اس کا نام موت ہوتا ہے اس لیے اگر کوئی بزرگی ہے تو وہ صرف روح کی بزرگی ہے۔ جسم کی بزرگی کچھ نہیں۔ جسم نے ایک دن فنا ہو جانا ہوتا ہے۔"
آپ نے ابتدا سے ہی گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی۔ آپ زیادہ تر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ وظائف پڑھتے یا کتب بینی میں مصروف رہتے۔ لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم تھا۔ جس سے ملتے انتہائی احتیاط سے۔ ایک مرتبہ ایک مُرید نے آپ سے کہا "حضرت! آپ رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ لوگ آپ کے علم و فضل سے افادہ حاصل کرنے کے لیے تڑپتے ہیں۔ مگر آپ گوشہ نشینی اختیار کر کے انہیں اس سے محروم کیے ہوئے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"
یہ سُن کر آپ نے فرمایا "آجکل کے لوگوں میں خود غرضی اور اغراض زیادہ ہے خلوص اور اخلاق سے دُور یہ لوگ مفادات کی دلدل میں دھنسے ہیں۔ ان کے دل و دماغ فریب سے بھرے ہیں۔ بظاہر یہ خوش اخلاقی سے ملتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں سے میں کیونکر تعلق قائم رکھ سکتا ہوں۔"
شاہ کلیم اللہ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جنت و جہنم کے چکروں میں نہ پڑو۔ عشق کرو۔ عشقِ الٰہی میں اس قدر ڈوب جاؤ کہ تمہارے دلوں میں اس کی تڑپ پیدا ہو اور جان کے عشاق کے دلوں میں سُلگی آگ سے تو جہنم کی آگ بھی پناہ مانگتی ہے۔
آپ اپنے مُریدوں کو نصیحت فرماتے: "جھوٹا آدمی اپنے ہمراہی کو ضرور خرابی و بدی کی راہ پہ لیجاتا ہے اس سے تم جتنا دُور رہو گے اتنا ہی اپنے حق میں بہتر کرو گے۔ جھوٹی تعریف کرنے والے سے بھی بچو، جھوٹی تعریف کرنے والا خوشامد پرست انسان سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ انسان کو مغرور بنا دیتا ہے اور زمین پر ایک مغرور متکبر انسان سے بدتر کوئی شے نہیں، خود غرض آدمی سے بچو وہ کبھی کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اُسے بھلا کر اُس کی نیکی یاد رکھو مگر اپنی نیکی

بھلانے میں ہی تمہاری فلاح ہے۔
آپ کو قرآن پاک کی تلاوت کا بے انتہا شوق تھا، اس طرح خوش الحانی سے تلاوت کرتے کہ سُن کر لوگوں پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ جہاں خدا کی نعمتوں کا بیان ہوتا اُسے والہانہ انداز میں پڑھتے اور بار بار دُہراتے۔
آپ کا چہرہ سراپا نور تھا۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نوافل کے اس حد تک پابند تھے کہ برسوں عشاء کے وضو فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔
۲۴ ربیع الاوّل ۲۴۲ھ میں آپ کا وقتِ آخر آن پہنچا اور آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔
آپ کا مزار ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ طالبِ علموں کے ہجوم سے ہر وقت آباد رہنے والی درس گاہ۔

پاک قلوب

نجد کے وحشی، تہامہ کے بدو، اور یمن کے مسکین دوش بدوش کھڑے ہونے پر نازاں ہیں۔ یہودیوں کا زرخرید غلام سلمان پارسی مِنا اھل البیت کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ فاروق اعظم، جس کی سطوت ہیبت سے قیصر و کسریٰ پر لرزہ طاری ہے، بت پرستوں کے زرخرید غلام بلال حبشی کو آقا آقا کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ عمرو بن عاص، جو نجاشی کے دربار میں مسلمانوں پر فردِ جرم عاید کرنے گیا تھا، عمان کے بادشاہ کے پاس اسلام کا داعی بن کر جاتا ہے۔ وہی خالد بن ولید جو اُحد میں بُت پرستوں کے رسالے کی کمان کر رہا تھا کچھ عرصہ بعد حاضر ہوتا ہے، لات و عزیٰ کے بتوں کو اپنے ہاتھوں سے گراتا ہے اور اسلامی فتوحات میں گرم جوش جنرل کا درجہ پاتا ہے۔ وہی عُروہ بن مسعود، جو حدیبیہ میں کفار کا سفیر بن کر آیا تھا، اپنی قوم میں اشاعتِ اسلام کی اجازت چاہتا ہے اور اسی خدمت میں جان قربان کر دیتا ہے۔ وہی ابوسفیان بن حارث جو حقیقی چچا کا بیٹا ہو کر بھی نبی کریمؐ کی ہجو میں اشعار کہتا تھا حُنین کے میدان میں اکیلا رکابِ نبوی تھامے آتا ہے۔ وہی ابوسفیان بن حرب، جو سات برس تک برابر آں حضرتؐ کے مقابلے میں فوجیں لاتا رہا، اور مسلمانوں کے خلاف سارے ملک میں آتش فساد بھڑکاتا رہا، اسلام لاتا ہے اور نجران کے عیسائی علاقے پر حاکم مقرر کیا جاتا ہے۔ وہی طفیل دوسی، جو کانوں میں روئی ٹھونسے پھرتا کہ مبادا محمدؐ کی آواز کانوں میں پڑ جائے اپنے وطن میں گھر گھر جا کر محمدؐ کی آواز کو پہنچاتا ہے۔ وہی عبدیالیل ثقفی جس نے طائف کے لونڈوں کو حضورؐ پر حملے کے لیے اکسایا تھا، مدینے میں حاضر ہوتا ہے اور جواہر ایمان سے مالا مال ہو کر اپنی قوم کے پاس واپس جاتا ہے۔ یہ سب کرشمے اس پاک تعلیم کے تھے، جو آہستہ آہستہ دلوں کو فتح کرتی جاتی تھی۔ اکثر انبیاء علیہم السلام نے معجزے دکھائے۔ دیکھنے والوں کو لاٹھی، سانپ، پتھر، دریا اور آگ کی قلب ماہیت یا سلب خاصیت کا نظارہ نظر آیا۔ لیکن نبی صلعم (فداہ ابی و امی) نے دلوں کو بدل دیا اور روحوں کو آلودگیوں سے پاک کر

درگی کا اِدعا ایسا تکبر ہے کہ جسے پہاڑ تک برداشت نہیں کر پاتے۔
ارف سراپا کرامت ہوتا ہے۔
ر جو کرامت کو بلاوجہ ظاہر کرے وہ گویا کرامت فروش ہے اور اُس کا خریدار کُتّا!
سی شخص کی ریاکاری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی عبادتوں کا کیف بیان کرتا پھرے۔

یہ اقوالِ زریں اُس درویش کے ہیں جسے جنوبی افریقہ کے اندھیروں میں باطل طاقتوں کو شکست دے کر دینِ حق کی روشنی پھیلانے کا
رف حاصل ہے۔ وہ جس کی نگاہِ حقیقت آشنا نے صرف طلبِ حق کی جستجو کی اور پھر اُس پہ تجلیات کے ہزارہا عالم منکشف ہوتے چلے گئے اور
و اندھیری رات کے بھٹکے مسافروں کی خاطر مینارۂ نور بنے۔

ام ابوالخیر اقطعؒ مرید تھے حضرت جنید بغدادیؒ کے۔ وہ جن کا مُرشد عالمِ اسلام کا مسلّمہ شیخ الشیوخ ہو۔ جسے اہلِ طریقت، اہل اللہ کہہ کر پکاریں اُس کے
رید کی عظمت سے کیسے انکار ممکن ہے۔

عہد کر رکھا تھا کہ خواہ کیسے ہی حالات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑ جائے لبوں پر راہِ رضائے دوست میں حرفِ شکایت نہ لاؤں گا ہر آزمائش کا مقابلہ
روں گا اضطراب کو ہی سکون جانوں گا۔

چنانچہ سنگلاخ پہاڑوں میں رہے۔ درختوں کی جڑوں اور پتّوں پہ گزارا کیا عبادت و ریاضت میں عرفان کی وہ بلندی حاصل کی کہ روحانی قوتوں کا
شمار ہی مشکل ہو گیا لیکن بندگی کا یہ عالم کہ نفس سے کہا جا رہا ہے" دیکھ رزق کی طلب سے بے نیاز ہو جا۔ رازق اللہ کی ذات ہے کھلائے گا تو
کھا لینا۔ نہ کھلائے تو اُف نہ کرنا۔ وہی مالک ہے، وہی آقا ہے۔ ہر حال میں اُسی کی خوشی ملحوظِ خاطر رکھنا ہے"

جب انسان توکل کے اس بلند ترین مقام تک رسائی حاصل کرے، اور عہد میں اتنی استقامت رکھے کہ بھُوکا پیاسا اس حد تک رہے کہ جان
کے لالے پڑ جائیں مگر لقمہ تک نہ لے، تو پھر خُدا بھی ایسوں کا حامی و ناصر بنتا ہے۔ استقامتِ عہد وہ موثر وسیلہ بن جاتا ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے
ضیافتِ ربانی کا نزول ہوتا ہے اور معمول بن جاتا ہے۔

مرشد (جنید بغدادی) سے کسبِ فیض حاصل کر چکے تو دمیاط کی راہ لی۔ دمیاط، بحیرۂ روم کا ایک ساحلی شہر ہے جزیرہ نما عرب میں آجکل جہاں لبنان

آباد ہے، وہاں جا کر ساحل کے کنارے گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ اللہ نے جو رزق عطا کیا تھا وہ برابر مل رہا ... آبادی سے دُور، تنہا اُس ویرانے میں صرف آپ کی ہی وہ ذات واحد تھی جو نظر آتی تھی۔ آس پاس نہ لوگ نہ کھیت کھلیان، نہ پھل درخت صاف پانی۔ اتفاقاً کسی کا اُدھر سے گذر ہوتا تو حیرت کرتا کہ آخر یہ درویش کس طرح رہتا ہے؟ کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟ کیا اسے اس ویرانے ڈر نہیں لگتا؟

وہ آٹھ دس افراد پر مشتمل ایک قافلہ تھا، راہزنوں کا، لوٹ مار کرتا اُدھر سے گذرا تو اُس درویش کے ٹھکانے پر نظر پڑی حیران ہوئے کہ اکیلا انسان رہ رہا ہے۔ زندہ کیسے ہے؟ آس پاس کھانے کو تو کچھ ہے نہیں تو پھر پیٹ میں ایندھن کہاں سے بھرتا ہے۔ رہزن تھے۔ مذہب جنگا ہو تھا۔ باطن خباثت سے بھرا ہُوا۔ آنکھوں سے کمینگی صاف عیاں ہوتی تھی۔ مکر و فریب جن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ قتل و غارت کرنا دل پسند شغلہ ناحق کو تنگ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھنا۔

لیٹرے سر پہ پہنچے تو آنکھ اُٹھا کے دیکھا۔ تعداد میں نو تھے۔ حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا پایا تو پوچھ بیٹھے "کہو، کیا کہتا ہے۔ اس فقیر بس میں ہوا تو ضرور پورا کروں گا۔"

وہ ابوالخیر اقطع کی بات سن کر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ یعقوب، ان میں سردار تھا۔ آگے بڑھا اور پوچھنے لگا "کب سے رہ ہے اِدھر؟" "ایک ماہ سے!" جواب ملا۔ ہونٹ حیرت سے سُکڑ گئے۔ نظریں سوالیہ بن گئیں۔ تحقیرانہ انداز میں ہنسی ہنسے اور بولے "تو پھر زندہ یہاں تو کھانے کو درختوں کی جڑیں تک نظر نہیں آتی!"

عزم و استقلال میں ڈوبا جواب ملا "اللہ کی ذات اُس کے بندے کے لئے بہت ہے۔"

چہروں پہ درشتی آگئی۔ یہ تو مسلمان نکلا یعنی وہ مخلوق کہ جسے مارنا ثواب اور بچانا حرام۔ شقی القلب یہودیوں کا مسلک ہی مُسلم دشمنی ہے۔ اب ایک مسلمان اور وہ بھی صوفی، درویش نظر آیا تو ثواب کمانے کا خیال بھی دلوں میں اُمڈ آیا۔ نظروں میں فیصلہ ہُوا اور تلواریں نیاموں سے نکل آئیں اس مسلمان درویش ابوالخیر اقطعؒ کے قتل سے خود کو اپنے مسلک کی نظروں میں سُرخرو ہونے کا خواہش مند تھا۔ فضا میں تلواریں لیے ہاتھ بلند ہو پھر نظروں نے دیکھا، لیکن عقل و شعور نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حقیقت سامنے تھی یقین کرتے ہی بنا۔ اِدھر درویش کی طرف تھامے بڑھا، اُدھر ہاتھ تلوار سمیت کلائی سے جُدا ہو کر گرا۔ حلق سے دھاڑتی چیخیں بلند ہوئیں۔ درد میں ڈوبی خوفزدہ سی چیخیں۔ وہ سمجھ کر، بے یار و مددگار جان کر اُس کے خون کے نذرانے سے اپنے گناہوں کا کفّارا ادا کرنا چاہتے تھے۔ کانپ گئے۔ اچھی طرح جان گئے۔

.... درویش درست ہی کہہ رہا تھا بندے کے لئے اللہ کی ذات ہی کافی ہے۔

اور پھر قدموں میں گر گئے۔ گڑگڑانے لگے۔ ناروا سلوک پہ نادم ہوئے۔ معافی مانگنے۔ آپ نے بھی ان کی تمام لغزشوں اور غفلتوں کو معاف پھر کٹے ہاتھوں کو اُن کی کلائیوں سے جوڑ کر قرآنی آیات کا دم کیا اور ہاتھ یوں جُڑ گیا کہ گویا کبھی کٹا ہی نہ تھا۔ یہودی حیران پریشان دیکھ رہے تھے۔ انگشت بدندان ہوئے کہ آخر کٹا ہاتھ کیونکر جڑ گیا۔ حیرت و سکتہ کی کیفیت سے نکلے تو دینِ حق کی عظمت فوراً ایمان لے آئے اور کلمۂ توحید کا ورد کرنے لگے۔

اَب وہ اس بات پر مُصر ہوئے کہ رہنا ہے تو آپ کے قدموں میں۔ اَب تو جان ہی پیچھا چھوڑے گی تو آپ کا در جُدا ہو گا تو کہیں جانے کے نہیں۔

ابوالخیر اقطعؒ نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ٹال دیں۔ مگر انہوں نے ڈیرہ جمائے رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ سو وہ اطمینان سے گرد اکھٹے ہو کر بیٹھ گئے۔ آخر عاجز آ کر آپ نے فرمایا "دیکھو اگر خُدا کی طرف سے تمہارا بھی رزق نازل ہُوا تو میں سمجھوں گا کہ خُدا کی مرضی ہے۔ تب تم اس صورت میں میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ ورنہ نہیں۔" چنانچہ اُن سب نے شام کا بیقراری سے انتظار کر دیا۔ شام ہوئی تو اُن کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔ انہوں نے دیکھا غیب سے آنے والا ابوالخیرؒ کا کھانا مقدار میں اتنا تھا کہ گیارہ بارہ آدمی بآسانی اُس سے اپنا پیٹ بھر سکتے تھے۔ چنانچہ ابوالخیرؒ بھی جان گئے کہ خُدا کی بھی یہی منشا ہے کہ

ں کے ساتھ رہیں۔
آپ نے ان لوگوں پہ بھرپور توجہ دینی شروع کی اور انہیں دین اسلام کی تعلیم سے آراستہ کرنے لگے۔ آپ نے اُن سے فرمایا۔
ے دوستو! یہ مت سمجھنا کہ مَیں تمہیں کسی مذہب کی تعلیم دے رہا ہوں۔ یہ وہی مذہب ہے جو حضرت موسیٰؑ لے کر آئے تھے۔
ن تکمیل کی انتہا کو ہمارے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ نے اسے پہنچایا۔
وگ آہستہ آہستہ خُدا کی عبادت و ریاضت میں گم ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ اُن کے بارے میں اُن کی آبادی میں بھی خبریں
ینا شروع ہوگئیں۔ لوگ حیران تھے کہ آخر یہ رہزنوں کا ٹولہ جن کا مذہب یہودیت ہے۔ ایک مسلمان صوفی سے کیوں اتنی عقیدت و
ردی کا اظہار و برتاؤ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اُن کی بستی سے ایک شرپسند شخص اس بات کی ٹوہ لینے آیا اور اُن کے پاس جاکر
لگا "دوستو! میں تمہاری بستی شطا کا رہنے والا ہوں۔ وہاں لوگوں کو اس پر سخت حیرت ہے کہ آخر تم ایک غیر مذہب اور وہ بھی مسلما
ں سے اس قدر ہمدردی کا برتاؤ کیوں کیے ہوئے ہو"۔
قوب چونکہ ان نو مسلم افراد کا سردار تھا۔ اُس نے اُس شخص کو جواب دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ وہ کہنے لگا۔ "اے شخص! یہ ہمدردی کیا
تی ہے؟ ہم تو اس مسلمان درویش سے محبت کرتے ہیں اور سُنو! تمہیں یہ سُن کر اور بھی حیرت ہو گی کہ ہم بھی دین باطل کو ٹھکرا کر اسلام
سائے میں آگئے ہیں"۔
اُس شخص نے یہ سُنا تو طیش میں آگیا اور بولا، بدبختو! تم جانتے ہو کہ تم نے اپنی جانوں پہ کتنا ظلم کیا ہے میں ابھی بستی میں جاکر انہیں
س امر کی اطلاع دیتا ہوں تاکہ وہ تمہیں راہ راست پہ لا سکیں تم لوگ مرتد بن چکے ہو اور مرتد کا جو انجام ہوتا ہے وہ تم خوب جانتے ہوئیں
رہا ہوں۔ جب تک بستی والوں کو اکٹھا کر کے لاؤں تم اس دوران اچھی طرح سوچ لینا کہ تمہارا حشر کیا ہونے والا ہے۔ خود ہی راہ راست پہ
ؤ تو یہ تمہارے لئے مناسب ترین ہوگا"۔
قوب نے اُس شخص کی برہمی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "جاؤ میاں! تم جاکر جو مرضی چاہے کرو ہم تو راہ حق کو چھوڑنے والے نہیں۔ ہاں
بتہ ہم تمہیں بھی اس کی دعوت دیتے ہیں"۔
سُن کر وہ شخص حقارت سے ہنسا اور بولا "راہ حق۔ یہ تو ابھی کچھ دیر بعد اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ راہ حق کونسی ہے وہ راہ جو تم نے
ختیار کر رکھی ہے یا وہ جس پہ ہم گامزن ہیں"۔
وہ شخص یہ کہہ کر پلٹا اور جاکر بستی کے لوگوں کو اس امر کی اطلاع کی کہ وہ لوگ تو دین اسلام کو قبول کر بیٹھے ہیں۔ بستی والوں نے یہ سُنا
غیض و غضب میں بھرے تھوڑی ہی دیر بعد ابوالخیرؒ کے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔
چیخ و پکار سے کان پڑی آواز تک سنائی نہ دے رہی تھی۔ لوگ سخت اشتعال کے عالم میں آپ کا گھر گھیرے ہوئے تھے۔ اور اُسے تباہ و
رباد کرنے پہ تُلے ہوئے تھے۔ تب آپ نے خُدا کے حضور دُعا مانگی کہ "اے پروردگار! اس وقت میں اور میرے ساتھی تیری مدد کے حق دار
یں۔ اگر ہمیں تیری مدد نہ ملی تو ہم ان دین کے منکروں کے ہاتھوں فنا ہو جائیں گے"۔
دعا لبوں سے نکلنا تھی کہ قبولیت کو پا گئی۔ ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سی پیدا ہوئی اور آپ کے گھر کے اِرد گرد کی زمین یوں دھنس گئی کہ ایک
ناقابل عبور کھائی کی شکل اختیار کر گئی۔ جس جگہ زمین دھنسی تھی وہاں موجود لوگ بھی زمین کے ساتھ ہی تہہ میں چلے گئے تھے۔ مشتعل ہجوم
نے یہ منظر دیکھا تو خوفزدہ ہو گیا۔ لوگ حیرت و خوف سے دُور ہٹنے لگے۔ دفعتاً ہجوم میں ایک شخص ہارون نامی چلا کر بولا "اے لوگوں تمہیں
خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ غلطی ہماری تھی ہم نہیں جانتے تھے کہ یعقوب کا یہ ساتھی جادوگر ہوگا اب جبکہ وہ اس کا اظہار کر ہی
چکا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح ہمارے سامری جیراڈ کے عتاب سے بچ سکتا ہے"۔ جیراڈ کا نام سُن کر لوگوں کے چہروں پر خوشی دوڑ
گئی۔ جیراڈ اُس زمانے کا ایک مشہور سامری تھا چنانچہ ایک شخص دوڑا دوڑا جیراڈ کو بلانے گیا۔
ادھر ابوالخیرؒ کے ساتھی باہر کا منظر دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب آخر کیسے ہوگیا۔ آپ نے حیرت زدہ

ساتھیوں کو دیکھا تو اُن سے کہا "مَیں نے تمہیں ایک بات پہلے بھی سمجھائی تھی۔ اگر وہ تمہیں یاد ہے تو تمہیں اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے۔ مَیں نے تم سے کہا تھا کہ بندے کے لیے اللہ کی ذات ہی کافی ہے اور تم اس کا دوسری مرتبہ مظاہرہ دیکھ رہے ہو۔"
آپ کے ساتھیوں نے جو یہ بات سُنی تو فرطِ جذبات سے کلمۂ توحید کا ورد کرنے لگے۔

اُدھر یہودی، سامری جیراڈ کو لیے آپ کے گھر تک لائے۔ سامری جیراڈ نشۂ طاقت میں چُور جھومتا آیا اور لوگوں کے نعروں کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کچھ منتر پڑھنے شروع کیے۔ پھر ایک پھونک ماری تو ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے جنہوں نے آہستہ آہستہ ابوالخیرؒ کے گھر کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا مگر جونہی وہ شعلے آپ کے گھر تک پہنچے تو وہیں سرد ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سامری جیراڈ جھلا کر رہ گیا۔ اب کی بار اُس نے پھر بڑے جوش و خروش سے منتر پڑھنا شروع کیا تو ایک بلند قامت چٹان نمودار ہوئی۔ سامری نے فخریہ انداز میں لوگوں کے ہجوم کی طرف نگاہ ڈالی، پھر چٹان کو حکم دینے لگا کہ "جا۔ جا کر اس مسلمان درویش اور یہودیت کے منکروں پر ٹوٹ پڑ۔" چنانچہ وہ چٹان آپ کے گھر کی طرف بڑھنا شروع ہوئی۔ جب وہ آپ کے گھر سے چند کوس کے فاصلے پر ہی پہنچی تو آپ نے چٹان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ "اے چٹان! جا واپس جا کر جیراڈ کے سر پہ معلق ہو جا۔ جدھر وہ جائے اُس کا پیچھا کر۔"
چٹان نے یہ حکم سُنا تو جیراڈ کے سر پر پہنچ گئی۔ جیراڈ سامری گھبراہٹ میں منتر پہ منتر پڑھنے لگا لیکن چٹان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر جیراڈ کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ جدھر کا رُخ کرتا چٹان اُس کا پیچھا کرتی۔ بالآخر تھک ہار کر وہ چلا اُٹھا "یعقوب تجھے، تیرے رب کا واسطہ اپنے درویش سے کہہ مَیں نے ہار مان لی ہے۔ مَیں انہیں خدا کا نیک بندہ سمجھتا ہوں۔ میری جان اس چٹان سے چھڑائیں۔"
جب جیراڈ کی یہ صدا ابوالخیرؒ کے کانوں میں پڑی تو آپ نے چٹان کو حکم دیا "اے چٹان! جا، جدھر سے تجھے لایا گیا تھا تو وہیں جا کر ڈھیر ہو جا۔"

اور پھر چند لمحوں بعد چٹان نظروں سے اوجھل ہو گئی اور دھنسی زمین بھی ہموار ہونا شروع ہو گئی۔ جیراڈ ڈرتا ہوا آیا اور ابوالخیرؒ کے قدموں میں گرتا ہوا بولا۔ "میں غلطی پہ تھا۔ مجھے معاف فرما دیں۔ مَیں دینِ اسلام پہ ایمان لے آیا ہوں۔ مجھے اس میں داخل کریں۔" آپ نے اُسے کلمۂ توحید پڑھایا اور مسلمان کیا۔ یہودیوں نے جب یہ دیکھا کہ اُن کا سب سے بڑا سامری بھی اللہ کے اس نیک بندے کو زک نہیں پہنچا سکا تو وہ بھی مسلمان ہو گئے۔
آپ نے کچھ عرصہ وہاں رہ کر اُس نومسلم بستی کی دینی تعلیم و تربیت پہ توجہ دی اور اُنہیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ اس طرح بستی کی اکثریت دین کی مبادیات سے مکمل طور پر آگاہ ہو گئی۔
مشرقِ وسطیٰ سے اب آپ کی اگلی منزل افریقہ تھی۔ مصر کے شہر اسکندریہ، آپ کو جانا تھا۔ ابوالخیرؒ کو اللہ نے یہ طاقت عطا کی تھی کہ جو اُن کے ذہن میں آتا وہ ہو کر رہتا۔ جو آپ چاہتے وہ خواہش تکمیل کا جامہ پہنے آپ کے سامنے آ جاتی۔ اسکندریہ جانے سے پہلے آپ کو مکہ معظمہ کی زیارت کی چاہ ہوئی۔ چنانچہ آپ پہلے مکہ تشریف لے گئے۔ خانہ کعبہ جا کر نماز پڑھی پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اس کے بعد آپ اپنی روحانی پرواز کے ذریعے اسکندریہ جا پہنچے۔
اسکندریہ، بحیرۂ روم کے کنارے ایک مشہور ساحلی شہر تھا۔ آپ نے سب سے پہلے اسکندریہ کی جامع مسجد میں نماز کی ادائیگی کی۔ پھر واپسی کے خیال سے جونہی صدر دروازے سے باہر نکلے ایک شخص نے آپ کا راستہ روک لیا اور کہنے لگا "حضرت! کیا آپ میرا ایک سوال پورا کریں گے؟"
آپ نے اُس شخص کو دیکھتے ہوئے کہا "بھائی! اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور پورا کروں گا۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"
وہ شخص بولا "حضرت میں ایک چلہ کاٹنے کا ارادہ کیے ہوئے ہوں لیکن حلال غذا کا کسی طور بندوبست نہیں ہو پا رہا جو مجھے دورانِ چلہ بلاناغہ ملتی رہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے چالیس یوم تک اپنا مہمان بنا لیں۔"
آپ نے اُس کی بات سُننے کے بعد کچھ دیر سوچا پھر بولے "ضرور، مَیں تمہارا سوال پورا کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ آؤ تم میرے ساتھ چلو۔"

آپ اگرچہ پہلی مرتبہ اسکندریہ آئے تھے لیکن اپنے علم کی بدولت آپ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں سے کچھ کوس کے فاصلے پر ایک گھنا
ں ہے چنانچہ آپ اُس شخص کو جنگل میں لے جاکر بولے "جناب، آپ ذرا دیر میرا یہاں انتظار کریں میں بس ابھی آیا"
یہ کہہ کر آپ جنگل میں داخل ہوگئے اور جب محسوس کیا کہ اُس شخص کی نظریں آپ کو نہیں دیکھ سکتیں تو آپ ۔۔۔ ذہن میں ایک جھونپڑی
ورلائے۔ اور پھر جیسا آپ نے سوچا تھا ہوبہو اُس کے مطابق جھونپڑی تیار ہو کر آپ کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ جھونپڑی کے
داخل ہو کہ آپ نے اُس کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر اپنے مہمان کے پاس پہنچے جو آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ سیدھے اُسے جھونپڑی
لے آئے۔ جھونپڑی دیکھ کر خوشی سے اُس کی باچھیں کھل گئیں اور اُس نے آپ کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے اُسے نرمی سے کہا "جناب!
اطمینان سے چالیس دن یہاں جو چلّہ کاٹنے آئے ہیں، مکمل کریں۔ آپ کو باقاعدگی سے حلال کھانا ملتا رہے گا۔"
ص اگرچہ آپ کی عظمت اور بزرگی سے ناواقف تھا۔ لیکن آپ کی گفتگو اور طرزِ عمل سے اندازہ لگا چکا تھا کہ آپ ضرور کوئی مخلص اور
کے نیک بندے ہیں۔ چنانچہ اُس نے آپ سے یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ آخر آپ وہ حلال خوراک لائیں گے کہاں سے
لہ آس پاس کی حالت سے تو یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ آپ کا نہ کوئی کاروبار ہے۔ نہ کھیت کھلیان۔"
نچہ رات ہوئی تو آپ نے جنگل میں جاکر کھجور کے پتے حاصل کئے اور اُن سے بڑی مہارت سے ایک زنبیل تیار کی۔ اس کے بعد
یادِ الٰہی میں ڈوب گئے۔ صبح ہوئی تو آپ نے زنبیل تھامی اور بازار میں لے جاکر کھڑے ہوگئے۔ زنبیل خوبصورت اور نفاست سے
تھی۔ اسی لئے فوراً دو درہم میں بک گئی۔ آپ نے اس رقم سے اُس مہمان کے لئے کھانا خریدا اور لے جاکر اُس کے سپرد کر دیا اور
آپ کا یہ معمول تھا کہ زنبیل بازار میں فروخت کرکے اُس کے لئے کھانا لے آتے۔
کے مہمان کو یہ چھٹا دن تھا۔ وہ بڑے انہماک سے وظیفہ پڑھنے میں مشغول تھا۔ آپ کے پاس ایک شخص آیا۔ اُسے دیکھ کر آپ مسکرا
ے اور بولے "آؤ، آؤ ریحان، کہو کیسے آنا ہوا؟"
ن نوجوان نے بھی مسکرا کر آپ کے سواگت کا جواب دیا۔ پھر بولا "حضرت! آپ جان تو گئے ہوں گے کہ آج کل آپ جس شخص کو مہمان بنائے
ئے ہیں وہ جنوں کو قابو کرنے کا چلّہ کاٹ رہا ہے۔"
پ نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "ہاں۔ کیوں؟"
نوجوان ریحان بولا "حضرت ۔۔ جن کسی کی گرفت میں مشکل سے ہی آتے ہیں مگر آپ کا لحاظ کرتے ہوئے ہم آپ کے مہمان کو ذرا برابر
ک نہیں کر رہے اور وہ اطمینان سے اپنا چلّہ مکمل کرتا جا رہا ہے۔"
سن کر آپ نے بیزاری سے جواب دیا۔ "دیکھو ریحان! بیشک وہ میرا مہمان ہے لیکن میں اُس کی صرف اس حد تک ذمہ داری قبول
کے ہوئے ہوں کہ اُسے چلّہ کے دوران حلال رزق پہنچاتا رہوں۔ اور بس۔ اب وہ کس قسم کا چلّہ کاٹ رہا ہے میرا اس سے کچھ تعلق نہیں اور
ی کسی قسم کی غرض۔ ویسے بھی میں اس بات کو بے حد معیوب سمجھتا ہوں کہ انسان اپنے پست مقاصد کے لئے اللہ کی عبادت
ے۔ اگر تم اپنا بچاؤ کرنا چاہو تو بے شک جس طرح جی چاہے کرو میں کل سے اس شخص کو حسبِ وعدہ کھانا پہنچا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔
ب تم جانو اور یہ شخص میں عامل اور معمول کے درمیان آنا پسند نہیں کروں گا!"
اُدھر وہ شخص اطمینان و خوشی سے اپنا چلّہ مکمل کرتا جا رہا تھا۔ آج ۔۔ اُس نے جھونپڑی میں سانپ کی پھنکار سنی۔ فطری طور پر
اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو اُسے ایک سیاہ بڑے سے پھن والا سانپ پھنکارتا نظر آیا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے بہت سے سانپ
اکٹھے ہوتے گئے۔ جن کی پھنکار سے جھونپڑی کی فضا گونجنے لگی۔ وہ شخص فوراً سمجھ گیا کہ اب "جن" مدافعت کے لئے آ گئے ہیں چنانچہ
اُس نے اپنے ذہن کو منتشر نہ ہونے دیا اور مضبوطی سے وہ کلمات ادا کرنے لگا جو اُس کے چلّہ کا حصّہ تھے۔ چنانچہ اب وہ آنکھیں بند
کے حصار میں محفوظ بیٹھا اپنا ذہن قابو میں رکھے اپنے عمل میں مصروف رہا۔ بالآخر وہ پھنکارتی آوازیں یکایک ختم ہو گئیں۔ اُس شخص نے
اطمینان سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور کچھ نہ پاکر مطمئن ہو گیا اور پھر دوبارہ اپنے عمل میں مصروف ہو گیا لیکن ابھی زیادہ دیر نہ گذری

تھی کہ اُس نے محسوس کیا کہ کوئی جھونپڑی میں داخل ہوا ہے۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اُس کے سامنے ایک شخص گھبرایا ہوا دیوار سے لگا بیٹھا ہے اور پھر ایک اور شخص تیزی سے دوڑتا اندر داخل ہو کر اُس کے نزدیک تھر تھر کانپتا بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر چلّہ کاٹنے والا شخص گھبراہٹ محسوس کرنے لگا کہ نجانے اِن پر کیا آفت آن پڑی ہے کہیں یہ اُسے بھی نہ ساتھ لپیٹ لیں۔ ابھی وہ شخص یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور شخص گھبرایا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا اور اُن دو کے ساتھ بیٹھ گیا تینوں کے رنگ زرد پڑ چکے تھے ہونٹ خشک تھے۔ اتنے میں چلّہ کاٹنے والا کیا دیکھتا ہے کہ ایک خونخوار سا انسان ہاتھ میں ننگی تلوار بلند کئے جھونپڑی میں داخل ہوا جسے دیکھ کر جھونپڑی میں موجود وہ تینوں اشخاص خوف سے کانپنا شروع ہو گئے۔ اور پھر اُس شخص نے دیکھا کہ نوارد نے تلوار بلند کی اور یوں کھینچ کر ایک شخص کی گردن پہ ماری کہ وہ تن سے جدا ہو کر الگ جا گری۔ پھر دوسرے کے ساتھ یہی حال ہوا۔ اور تیسرا بھی اس سے نہ بچ سکا۔ اب چوتھا وہ خود تھا تلوار والا تیزی سے اُس کے حصار کی طرف بڑھا لیکن چلّہ کاٹنے والا بیہوش پڑا تھا۔

ابوالخیرؒ جھونپڑی میں داخل ہوئے تو وہ شخص ابھی تک بیہوش پڑا تھا۔ آپ نے اُسے اُٹھا کر پوچھا "کیوں حضرت۔ یہ کیا حال رکھا ہے آپ نے اپنا۔ یہ کیسا چلّہ ہے جو آپ سو کر کاٹ رہے ہیں؟"

وہ شخص آپ کو دیکھ کر شرمندگی سے بولا "بس جناب۔ مجھے اور شرمندہ نہ کریں۔ یہ بتائیں آپ نے وہ لاشیں کدھر کیں؟"

آپ مسکرا پڑے اور بولے "جناب والا! وہ لاشیں زندہ ہو کر جدھر سے آئی تھیں اُدھر لوٹ گئیں تمہارا وظیفہ ناکام ہو چکا ہے۔ جنّہ نے آپ سے مذاق کیا اور یوں آپ کو ناکام کر دیا"

یہ سُن کر وہ شخص رونے لگا اور کہنے لگا "ہائے افسوس! مَیں تو دولتمند بننے کے لئے اُنہیں قابو میں کر رہا تھا۔ اب میرا کیا بنے گا کیسی کیسی مُصیبتیں نہ اٹھائی تھیں مَیں نے اس وظیفہ کے حصول کے لئے لیکن سب کچھ ہی چوپٹ ہو گیا"

یہ سُن کر آپ بولے "جناب والا! کیا یہی بہتر ہو کہ آپ دنیاوی آرام اور آسائش کو بھلا کر آخرت کو سنواریں۔ اپنی تمناؤں کو شائستہ بنائیں اس چند روزہ دُنیا کی خاطر کیوں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اس کی فانی چمک پہ ابدی راحت کو کیوں قربان کئے دے رہے ہیں؟"

یہ سُن کر وہ شخص سخت نادم ہوا اور آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ آپ نے اُسے اُٹھایا اور نصیحت کی کہ آئندہ اس جھونپڑی میں ہی رہ کر خُدا کی عبادت و ریاضت میں وقت گذارو۔ "اور جن، جنّہ کو اُس نے قابو میں کرنے کا وظیفہ شروع کیا تھا۔ اُنہیں بلا کر آپ نے اُس شخص سے مِلوایا اور اُن کی آپس میں دوستی کرا دی۔

یہاں سے فارغ ہو کر آپ پھر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

دریائے نیل کے ساتھ ساتھ آپ کا سفر جاری تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آپ نے دریا کے کنارے وضو کر کے نماز ادا کی وہیں کچھ دیر دھوپ میں آرام کرنے بیٹھ گئے۔ ابھی بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ چند عیسائی راہب اُدھر سے گذرے انہوں نے جو ایک درویش سے شخص کو بیٹھا دیکھا تو ایک رحمدل راہب، اپنے عبا میں سے چند سکے نکال کر اُن کی طرف بڑھانے لگا لیکن اُن میں موجود معمر راہب نے اپنے نوجوان ساتھی راہب کو اس عمل سے منع کرتے ہوئے کہا "یہ ان چیزوں سے بے نیاز ہیں تم ان سے خود کچھ مانگو۔ یہ تمہیں مالا مال کر دیں گے۔" نوجوان راہب اپنے معمر ساتھی کی باتوں کی وقعت جانتے تھے۔ لہٰذا فوراً اپنی عبا کا دامن پھیلا کر ابوالخیرؒ کے سامنے بیٹھ گئے۔

آپ نے آنکھیں کھول کر سامنے بیٹھے نوجوان راہبوں کو دیکھا۔ پھر اُن کے نگران معمر راہب پر نظر ڈالی۔ اُسے دیکھ کر آپ مسکراتے ہوئے بولے "انہیں میرے سامنے کیوں بیٹھا دیا ہے۔ تم اپنا باطنی حُسن ان پر عیاں کر دو یہی ان کے لیے سب سے بڑی دولت ہے"

وہ معمر راہب بولا "حضرت مَیں نے بہت کوشش کر کے دیکھ لی لیکن خود مَیں اتنی ہمت نہ پا سکا کہ انہیں اپنے باطن سے آگاہ کر سکوں۔ خُدارا اب آپ ہی کچھ کیجیے۔"

آپ نے نوجوان راہبوں کو اپنے اور نزدیک آکر بیٹھنے کی ہدایت کی جب وہ آپ کے سامنے آ بیٹھے تو آپ نے فرمایا "اب تم سب آنکھیں بند کر کے ایک مشاہدہ کرو اس کے بعد جو محسوس کرو۔ وہ بے خوف و خطر بیان کر دینا۔"

ان راہبوں نے جونہی آنکھیں بند کیں انہوں نے محسوس کیا کہ منظر پہ حضرت عیسیٰؑ کا ظہور ہوا ہے اور وہ ان سے فرما رہے ہیں۔ میں نے برسوں قبل جس نبی برحق کی آمد کی پیش گوئی کی تھی۔ وہ آچکا ہے اور تمہارے سامنے جو شخص بیٹھا ہے۔ یہ اس عظیم پیغمبر آخرالزماںؐ کا ایک امتی ہے۔ اگر تم دنیا اور آخرت میں فلاح چاہتے ہو اور میری خوشنودی کے طلبگار ہو تو اس کے دین کو اختیار کر لو۔"

اس نصیحت کے بعد حضرت عیسیٰؑ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان راہبوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ابوالخیرؒ بیٹھے تھے آپ نے پوچھا "ہاں! ذرا بتاؤ تو تم نے حضرت عیسیٰؑ کا کس حد تک اثر قبول کیا ہے۔"

یہ سن کر وہ نوجوان راہب بولے "خدا آپ پر اپنی رحمتوں کا نزول کرے ہمیں آپ دائرہ اسلام میں لے لیں"۔ اور پھر انہوں نے کلمہ طیبہ کا ورد کیا۔

اب آپ کا سفر پھر شروع ہو گیا تھا حسب معمول دریائے نیل کے ساتھ ساتھ آپ کا سفر جاری تھا ایک جگہ مسجد دیکھی تو عبادت کے لیے رک گئے۔ مسجد میں داخل ہوئے عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ نماز عصر ادا کی پھر ذرا دیر کے لیے وہیں بیٹھ گئے۔ حتیٰ کے مغرب کی نماز کا وقت آن پہنچا۔ نماز ادا کی۔ اور پھر اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کانوں میں دو۔۔۔ جوانوں کی گفتگو کی آواز پڑی۔ ایک بول رہا تھا۔ دوسرا غور سے سن رہا تھا کبھی کبھی وہ بھی درمیان میں اپنی رائے یا تبصرہ کر دیتا تھا۔ آپ چونکہ نزدیک بیٹھے تھے۔ اس لیے آپ کو ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

ان دونوں کی باتیں اس قدر دلچسپ تھیں کہ آپ سنے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا "یار، یہ درست ہے کہ جنوبی افریقہ میں ابھی اسلام اس حد تک فروغ نہیں پا سکا جتنا کہ اس کا حق تھا لیکن تم اس بات کا بھی اعتراف کرو گے کہ آج جتنا اسلام بھی وہاں پھیل چکا ہے وہ بھی کم، کارنامہ نہیں تمہیں وہاں کی صورت حال کا اندازہ نہیں۔ گھنے جنگلات، وحشی قبائل، زبان کا مسئلہ غرض کونسی مشکل نہیں جو وہاں درپیش نہ ہو۔ ایسے میں بھلا اسلام وہاں تک کون لے جائے۔"

دوسرا بولا "شعیب، کہہ تو تم بھی درست ہی رہے ہو۔ لیکن آخر ہمیں کچھ تو کرنا ہی چاہیئے۔ جب ہم راہ حق کی خاطر قدم بڑھائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ خدا بھی ہماری مدد کو ضرور پہنچے گا ہمیں خدا پہ توکل کر کے وہاں جانا ہی پڑے گا۔"

جس کا نام شعیب تھا۔ ہنس کر بولا "یار مخدومی! تمہیں اس کا بھی تو علم ہو گا کہ جنوبی افریقہ میں ایسے بھی قبائل آباد ہیں جو اجنبی کو دیکھتے ہی فوراً پکڑ کر کھانے کی سوچتے ہیں۔ اور وہ بیچارا جو بھولے بھٹکے سے ان میں جا پھنستا ہے تو راہ نجات پا نہیں سکتا اور ان وحشیوں کے پیٹ میں جا بستا ہے۔" یہ کہہ کر شعیب نامی نوجوان ہلکا سا ہنسنے لگا۔ ابوالخیرؒ کو بھی اس نوجوان کی زندہ دلی پہ ہنسی آئی لیکن خاموشی سے سننا جاری رکھا۔

اب کی بار مخدومی بولا "تم چاہے کچھ بھی کہو، ایک بات ہے جب انسان تمام خطرات کو بھلا کر اللہ کے بھروسے پہ کسی کام کا آغاز کرے اور یہ جان لے کہ اس کے لیے صرف اور صرف اللہ کی ذات ہی کافی ہے تو پھر مشکل مشکل نہیں رہتی۔ آسانیاں خود بخود پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔"

یہ سن کر شعیب بولا "واہ یار! تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بھلا دین اسلام کے فروغ کی خاطر ہم اپنی جانوں کا نذرانہ تک دینے سے گریز کریں گے۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے لیکن ہمیں چاہیئے کہ سوچ سمجھ کر کسی حکمت عملی کے تحت قدم اٹھائیں بے شک موت آنی چیز ہے۔ اور ہمیں ہر حال میں فنا ہونا ہے لیکن عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ تبلیغ کی راہ میں اپنی زندگی کو یوں استعمال کریں کہ پوری قیمت وصول ہو۔"

مخدومی نامی نوجوان نے سر ہلاتے ہوئے کہا "شعیب! جو تم کہہ رہے ہو مجھے بھی اس پر صد فی صد اتفاق ہے میں بھی کب چاہتا ہوں کہ یوں بلا سوچے سمجھے قدم اُٹھا کر وحشیوں کے نرغے میں جا پھنسیں۔ جن کی زبان تک سے ہم ناآشنا ہیں۔ اس طرح گویا ہم خودکشی کر لیں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اب مزید دیر نہ کریں۔ جو کچھ کرنا ہے جلد از جلد کریں"۔

مخدومی اور شعیب کی باتیں اس قدر دلچسپ تھیں کہ آپ کو وقت گذرنے کا احساس تک نہ ہُوا عشاء کی اذان ہوئی تو آپ نماز کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ نوجوان بھی ادائیگی فرض کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ سیدھے اُن کے پاس جا بیٹھے اور سلام کرنے کے بعد نرمی سے بولے "آپ نوجوانوں کا جذبۂ تبلیغ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں آپ کی باتیں سُنتا رہا ہوں۔ اگرچہ ایسا کرنا مناسب تو نہیں تھا لیکن چونکہ آپ کی باتیں عام سے زمرے میں آتی تھیں اور کسی قسم کے ذاتی پن کی نہ تھیں۔ سو میں نے سُن لیں"۔

وہ نوجوان خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولے "حضرت، یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے آپ اتنی صفائی پیش کر رہے ہیں"۔ یہ سُن کر ابوالخیرؒ بھی مسکرا پڑے۔ اور بولے "میں اگر آپ کے کسی کام آسکا تو یہ میری بہت خوش قسمتی ہوگی۔ مجھے خُدا نے اپنے فضل سے بے پناہ وسائل عطا کر رکھے ہیں۔ آپ بلا تکلف مجھ سے اپنی ضروریات اور مشکلات بیان کر سکتے ہیں میں خُدا کے فضل سے انہیں پورا کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں"۔

وہ نوجوان اَب حیرت سے آپ کو دیکھنے لگے پھر اُن میں سے شعیب نامی لڑکا بولا "حضرت ہم حال ہی میں ایک دینی مدرسے سے فارغ ہوئے ہیں۔ ہمارے دِل میں دین کی خدمت کا جذبہ ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم جنوبی افریقہ کے دشوار گذار علاقے میں شمعِ رسالت کے پروانے بن کر جائیں اور دینِ اسلام کو فروغ دیں۔ اس لحاظ سے ہمارا یہ سفر خالص تبلیغی سفر ہوگا سو ہماری ضروریات بھی محدود ہیں"۔

مخدومی درمیان میں ہی بول اٹھا اور اَدب سے کہنے لگا "حضرت! اگر آپ کے وسائل واقعی لامحدود ہیں تو آپ ہمیں جنوبی افریقہ ہی پہنچا دیں۔ بس آپ کی یہی مدد ہمارے لئے بے انتہا مشکلات کے خاتمے کا موجب ہوگی"۔

یہ سُن کر آپ ہنس پڑے۔ پھر بولے "نوجوانو! بے شک تمہارا جذبہ قابلِ تحسین ہے مگر اتنی جلدی بھی کیا ہے شعیب تم پہلے اپنی ضعیف دادی کو تو اس بات سے آگاہ کر دو۔ اور مخدومی تم اس نیک کام کو ماں کی اور وہ بھی بیوہ ماں کی دعاؤں کے بغیر شروع کرنا چاہتے ہو"۔ وہ نوجوان آپ کے مُنہ سے یہ معلومات سُن کر حیران رہ گئے۔ آپ نے دوبارہ فیصلہ کُن لہجے میں جواب دیا "بس میرا خیال ہے اَب تم دونوں گھر جاؤ اور تین دِن بعد دوبارہ مسجد میں عصر کی نماز کے بعد آجاؤ۔ اُس دِن جمعہ کا روز ہوگا۔ اس طرح تمہیں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رہنے کو وقت بھی مل جائے گا۔ اور اجازت بھی"۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ دونوں نوجوان گھر چلے گئے اور آپ اعتکاف میں بیٹھ کر خُدا کی یاد میں عبادت اور ریاضت میں کھو گئے۔

جمعہ کے دِن وہ دونوں نوجوان دمکتے چہرے اور ایمانی جذبے سے شادمان اور خوش خوش آپ کے پاس آئے اور نماز ادا کرنے کے بعد تینوں مسجد سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔ اور آہستہ آہستہ شہر سے باہر جانے والی راہ پہ ہو لئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شہر کو بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن جب پیدل چلنا بند نہ ہُوا تو شعیب کی حسِ مزاح پھڑکی اور وہ بولا "حضرت! جس رفتار سے ہمارا سفر طے ہو رہا ہے آپ کے خیال میں جنوبی افریقہ پہنچتے پہنچتے ہم کتنی بہاریں دیکھ چکے ہوں گے؟"

ابوالخیرؒ اِس سوال میں چھپے تشویش اور ظرافت کے دونوں پہلو دیکھ کر مسکرا پڑے اور بولے "نوجوان! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم تمہیں کتنی جلد جنوبی افریقہ پہنچا دیں گے۔ ہاں البتہ ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ تم پہلے ہمارے بارے میں یہ اچھی طرح جان لو کہ ہم بھی تم جیسے انسان ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ہماری ذات کو فرشتوں سے منسوب کر دو۔ جو کچھ دیکھو محسوس کرو۔ اُسے تم یہی سمجھنا کہ اللہ نے انسان کے تصرفات کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے۔ اللہ نے دُنیا کو کہہ رکھا ہے کہ اے دُنیا اگر کوئی میری خدمت کرے تو

اُس کی تابع ہوجا اور جو تیری خدمت کرے اُسے تُو اپنا تابع کرلے ہم نے اللہ کی خدمت کی سو دُنیا ہمارے تابع ہے۔"
پھر آپ نے اپنے کندھے سے لٹکے تھیلے میں سے ایک چادر نکالی۔ اُسے زمین پر بچھا کر خود بھی اُس پر بیٹھ گئے اور اُن نوجوانوں کو بھی بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ تب آپ نے اُن سے کہا "اب تم ایک نئے تجربے سے رُوشناس ہونے لگے ہو۔ گھبراہٹ کا مظاہرہ ہرگز نہ کرنا۔" اور پھر نوجوانوں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ چادر آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونا شروع ہوگئی۔ اُن کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے اور اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہوگیا لیکن جلد ہی وہ معتدل کیفیت میں آگئے اور نیچے پھیلے سرسبز و شاداب مناظر کے حسن میں کھو گئے۔
اس طرح وہ اس حیرت انگیز سواری پہ سفر کر کے منزل کی طرف گامزن تھے جب نماز کا وقت قریب آنے لگتا تو ابوالخیرؒ کسی مناسب سی جگہ اُترے اور پھر سبھی نماز ادا کرتے۔ کھانا کھاتے اور پھر سفر کا آغاز ہوجاتا۔
ایک مقام پہ وہ نوجوان آپ کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے بولے۔"
"حضور آپ سے مل کر ہمیں احساس ہوا ہے کہ ہم عِلم کے حصول کے بعد بھی ہنوز تشنۂ علم ہیں۔ ہمارا علم ظنّی ہے اور آپ کا علم حقیقی۔ آپ کے عِلم نے آپ کو خُدا سے نزدیک کردیا ہے جبکہ ہمارا علم ہمارے لئے حجاب کا موجب بنا ہُوا ہے ہمیں شدت سے احساس ہے کہ ہم آپ کی راہنمائی کے بغیر اُدھورے ہیں ہمیں بیعت کی عزت سے سرفراز فرمائیں تاکہ ہم فلاح کی راہ پاسکیں۔
چنانچہ آپ نے دونوں نوجوانوں کی درخواست قبول کرتے ہوئے اُن سے بیعت لی۔ اب سفر کا دوبارہ آغاز شروع ہوچکا تھا۔ آپ سے بیعت کے بعد اب دونوں نوجوان ہر خوف سے بے نیاز تھے سفر تیز رفتاری سے طے ہورہا تھا۔ بالآخر وہ زمبیا کی حدود میں داخل ہوئے۔ ایک گھنا جنگل دیکھ کر مناسب جگہ سمجھتے ہوئے آپ نیچے اُترے۔ وہاں سے ذرا ہٹ کر ایک وحشی آدم خور قبیلہ بھی آباد تھا۔ اُن میں ایک آدم خور نے جب تین اجنبی انسانوں کو آسمان سے اُترتے دیکھا تو دوڑا دوڑا قبیلہ کو اس سے آگاہ کرنے گیا۔
قبیلہ والوں نے جب ان کے متعلق سُنا تو فیصلہ کیا کہ چونکہ اجنبی آسمان سے اُترے ہیں۔ اس لئے یقیناً کوئی جادوگر ہی ہوں گے۔ لہٰذا اُن کا جادوگر ہی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے اپنے قبیلے کے سب سے بڑے جادوگر کو اُن کے مقابلے کے لئے تیار کیا۔ وہ جادوگر اپنی حقیقت سے باخبر تھا۔ اُس نے سوچا جو آسمان سے اڑتے نیچے اُترے ہیں۔ وہ یقیناً کوئی طاقتور حیثیت ہی رکھتے ہوں گے۔ لہٰذا اُن پہ یوں جاکر دھاوا بول دینا خود کو عذاب میں ڈالنا ہوگا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ رات کو اُن پر شب خون مار کر ہی کامیابی حاصل کرے گا۔ ورنہ دوسری صورت میں تو سارا بھرم ہی کھُل جائے گا۔ چنانچہ اُس نے قبیلے میں سے دس بہترین تیرانداز چُنے اور قبیلے والوں کو یہ کہہ کر بھیج دیا کہ "اب تم لوگ جاؤ" اگلے دِن صُبح آجانا تاکہ اِن اجنبیوں کے لذیذ گوشت میں حصہ دار بن سکو۔ ہمارے یہ نوجوان اُن کی لاشیں اور سامان اکٹھا کرنے میں میری مدد کریں گے۔"
رات ذرا ڈھلی تو وہ جادوگر اپنے ساتھیوں سمیت اُس جگہ پہنچا جہاں اُن اجنبیوں کو اُترتا دیکھا گیا تھا۔ جادوگر نے ایک درخت کی اوٹ میں ہوکر دیکھا تو اُسے وہ اجنبی صاف نظر آنے لگے۔ دو نوجوان اور ایک بوڑھا۔ جادوگر نے زبان ہونٹوں پہ پھیرتے ہوئے خود سے کہا "تو گویا کل کی دعوت واقعی مزے دار ہوگی۔ خاص طور پہ اس بوڑھے کا دماغ اور زبان تو بے حد لذیذ ہوگی۔"
چنانچہ اُس نے فوراً اپنے نوجوان ساتھیوں کو تیر کمان دیتے ہوئے تیروں کی بوچھاڑ کرنے کو کہا۔ ابوالخیرؒ نے سونے سے قبل اپنے اور اُن دو نوجوان کے گرد ایک حصار کھینچ رکھا تھا جس نے انھیں ان تیروں سے بچائے رکھا۔ تیر برسانے والے خود اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے تیر کسی اندیکھی چیز سے ٹکرا کر گر پڑتے ہیں۔ اور وہ اجنبی محفوظ ہیں۔
اب وہ وحشی نوجوان خوف محسوس کرنے لگے تیروں اور اُن وحشی انسانوں کی آہٹ سے ابوالخیرؒ کی آنکھ کھُل گئی۔ آپ نے ایک نگاہ میں ہی ساری صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا۔ چنانچہ آپ نے اسی وقت کام کرنے کا سوچ لیا اور جادوگر کے دماغ کو اپنی گرفت میں لے کر اُسے اپنے تابع کرلیا۔ جو نصیحت آپ نے اُسے کی وہ تسلیم کرتا چلا گیا۔ اور پھر جلد ہی وہ خُدا اور رسالتؐ پر ایمان لے آیا پھر

آپ نے اُس کے ذریعے معلوم کیا کہ یہ قبیلہ کیا چیز شوق سے کھاتا ہے۔ اُس کے بعد آپ نے شعیب اور مخدومی کو بھی جگایا۔ وہ اپنے گرد وحشیوں کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ آپ نے انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا پھر خدائے واحد کا نام لے کر انہیں ایک ایسی بھرپور نظر سے دیکھا کہ وہ اللہ العالمین کی عنایت سے اور آپ کے وسیلے سے ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگے۔ جادوگر، عربی زبان بولنے پہ قادر ہوگیا۔ اور وہ دونوں نوجوان افریقی زبان بولنے پر۔

اس کے بعد آپ نے جادوگر کا نام فصیح الدین رکھا۔ پھر آپ نے شعیب اور مخدومی سے فرمایا کہ وہ فصیح کو وضو کرنے اور نماز کی ادائیگی کا طریقہ سمجھائیں۔ فصیح کے ساتھ آنے والے وہ دس نوجوان اب تک گم صم اپنے جادوگر کو اُن اجنبیوں کے ساتھ گھلتے ملتے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور انہیں خود کیا کرنا چاہیئے۔ اتنے میں کو خود ہی اُن کا خیال آیا اور اُس نے ابوالخیرؒ کی ہدایت کے موجب انہیں حکم دیا کہ وہ واپس قبیلے میں جائیں اور قبیلہ والوں کو اُس کی طرف سے اطلاع کریں کہ کل صبح اُن کی دعوت ضرور ہوگی۔ اور وہ صبح وقت پر آجائیں۔

ادھر ابوالخیرؒ نے فصیح سے معلوم کرنے کے بعد قبیلہ کی پسندیدہ خوراک جنگلی بکروں اور نمک کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے ایک کثیر تعداد میں جنگلی بکرے اکٹھے کیے اور نزدیک کے پہاڑوں کے دامن میں ایک باڑ بنا کہ انہیں اس میں بند کرنے کے بعد صبح کا انتظار کرنے لگے۔

اگلی صبح وحشیوں کا قبیلہ ادھم مچاتا شور و غل کرتا آموجود ہوا۔ فصیح ایک دم اُن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا "دوستو! ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں ایک طاقتور قوت میسر آگئی ہے۔ اب ہمیں نہ دشمن قبیلوں کا خوف رہے گا۔ نہ بیماریوں اور طوفانوں کا۔ اب تم مجھے بتاؤ کیا تم اس خوش نصیبی کی اطاعت کرنا پسند کروگے؟"

قبیلہ کا سردار فصیح سے بولا "خوش نصیبی کو سامنے لاؤ تاکہ ہم اُس کے سامنے سر جھکا کر اُس سے وابستہ رہنے کا اقرار کریں۔"

چنانچہ طے شدہ طریقے کے مطابق شعیب کو سامنے لایا گیا۔ اور اُس نے وحشی قبیلے کو انہی کی آواز میں برکتوں اور نصیحتوں کی سنائیں تو وہ حیرت اور خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ اور پھر اُن کے سامنے پہاڑی بکروں کا گوشت اور نمک کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ قبیلہ کے تمام افراد یہ دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوگئے۔ لیکن شعیب نے پہلے اُن سے عہد لیا کہ وہ آج سے اقرار کریں کہ آئندہ کبھی حرام گوشت نہ کھائیں گے۔ اور پھر انہیں اُس گوشت کو کھانے کی اجازت دی۔ قبیلہ والوں نے ڈٹ کر گوشت کھایا۔ وہ بہت مسرور نظر آرہے تھے۔ اُس کے بعد پورا قبیلہ اپنے گھروں کو لوٹ گیا۔

ابوالخیرؒ نے فصیح، شعیب اور مخدومی کو اکٹھے پاس بٹھا کر کہنا شروع کیا "مبارک ہو تمہیں! جنوبی افریقہ میں اب تمہارے ہاتھ ایک مضبوط مرکز آگیا ہے۔ اب تم یہاں سے اسلام کی کرنوں کو جنوبی افریقہ کے چپے چپے تک پھیلاؤ اور جہالت و گمراہی میں ڈوبے اس خطہ کو منور کردو۔"

اُس کے بعد آپ نے تینوں کو باری باری گلے لگایا جس سے اُن کے دل منور اور کرامات کی اہلیت سے مالا مال ہوگئے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا "اب میں مطمئن ہوں۔ اب تم لوگ تن تنہا بھی اس فریضہ کو آگے بڑھا سکتے ہو۔ اب تم مجھے اجازت دو میں تم لوگوں کے ساتھ زیادہ طویل عرصہ نہ گذار سکوں گا۔" یہ سُن کر تینوں کے آنسو بہہ نکلے لیکن وہ آپ کو روک کہاں سکتے تھے۔

چنانچہ آپ یہاں سے رخصت ہو کر سیدھے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حرم کی تجلیوں میں ایسے کھوئے کہ دس سال مکہ اور مدینہ منورہ میں ہی قیام کئے رکھا۔

اور پھر ایک دن آپ نے یعقوب کے پاس جانے کا ارادہ کیا اور وہاں پہنچ گئے۔ قصبے میں آپ کی آمد کا چرچا ہوا تو بھی مرد، بچوں اور عورتوں نے آپ کا جوق در جوق آکر استقبال اور زیارت کی۔

کا شطا جو کبھی یہودی بستی تھی۔ اب خالص اسلامی قصبہ بن چکا تھا۔ بالآخر ایک دن آپ نے شطا والوں سے کہا "اے شطا والو! تم مجھ سے ناراض تھے ناں کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ لو دیکھ لو۔ اب میں دوبارہ آگیا ہوں۔ اب میں قیامت تک تم میں ہی رہوں گا۔"

محرم الحرام کی سترہ تاریخ تھی اور ۳۰۴ ہجری کا سن ملک الموت نے رُوح قبض کرنی شروع کی اور ابوالخیرؒ کے لبوں سے ادا ہو رہا تھا اللھم لبیک، اللھم لبیک۔

ابوالخیرؒ فرمایا کرتے تھے "اسلام ایک سیدھا سادہ مذہب ہے۔ انسان خواہش کی پیروی سے بچے کیونکہ یہی گمراہی کی سمت لے جانے والی ہے۔ اللہ نے کتاب نازل فرمائی جو رہتی دنیا تک ہدایت کا سرچشمہ رہے گی۔ لہٰذا کتاب اللہ کے مطابق زندگی گزارو۔ یہی فلاح پانے والا راستہ ہے۔ وہ شخص یقیناً فائز المرام ہوگا جو اپنے ہر فعل سے پہلے یہ سوچے کہ خدا کی رضا کیا ہے۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ کے نیک بندے اخلاص کے ساتھ اسلام کی دعوتِ حق کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اُن کے ساتھ نہ ہو۔

حضرت علیؓ کا بیان

حضرت حسنؓ کہتے ہیں: میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ اپنے ہم نشینوں میں آں حضرتؐ کی سیرت کیسی تھی؟ انھوں نے کہا: رسول اللہؐ ہمیشہ خندہ پیشانی سے رہنے والے، نرم اخلاق والے، سہولت کی زندگی بسر کرنے والے تھے۔ نہ دُرشت خو تھے، نہ بدمزاج۔ نہ بے ہودہ بکنے والے، نہ عیب جوئی کرنے والے۔ جس چیز کی خواہش نہ ہوتی، اُس سے تغافل برتتے۔ نہ اس کا عیب بیان کرتے، نہ اُس سے رغبت ظاہر فرماتے۔ تین چیزیں آپؐ نے خود ترک فرمادی تھیں: شک کرنا، مالِ کثیر جمع کرنا اور غیر مفید باتیں کرنا۔ تین چیزوں سے آپؐ نے لوگوں کو چھوڑ دیا تھا: کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے، کسی کو عار نہیں دلاتے تھے، کسی کی پوشیدہ بات کا تجسس نہیں کرتے تھے۔ صرف وہی کلام کرتے جس میں آپؐ کو ثواب کی امید ہوتی تھی۔ جب گفتگو فرماتے تو اہلِ مجلس اس طرح خاموش ہو جاتے جیسے ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں۔ پھر جب آپؐ خاموش ہو جاتے تو لوگ کلام کرتے۔ مسافر و غریب کے بات کرنے یا سوال کرنے میں اس کی بے ادبی پر صبر فرماتے۔ اس وقت اصحاب اُسے دور ہٹانا چاہتے تو آپؐ فرماتے: "جب کسی ضرورت مند کو دیکھو کہ کچھ طلب کرتا ہے، تو اس کی مدد کرو۔" سوائے تلافی کرنے والے کے اور کسی کی مدح و ثنا قبول نہیں کرتے تھے۔ آپؐ کسی کی بات کو قطع نہ کرتے، تاوقتیکہ وہ خود ہی نہ قطع کر دے۔ حلم و صبر کے جامع تھے۔ آپؐ کو نہ تو کوئی چیز غضب ناک کرتی، نہ بے زار۔ احتیاط صرف چار باتوں پر منحصر تھی: نیکی کے اخذ کرنے میں کہ اُس کی پیروی کریں، بدی کے ترک کرنے میں کہ اس سے باز رہیں، بہبودِ اُمّت کے امور میں عقل سے غور و فکر میں، اور ان امور کے قائم کرنے میں جن سے اُمّت کی دنیا و آخرت جمع ہو۔ (ابن سعد)

حافظ اسحاق قادریؒ ملتِ اسلامیہ کی ایک نادر الوجود شخصیت تھیں۔ بزرگِ کامل تھے۔ فنافی اللہ، باقی اللہ صوفی، روحانی کم
اور علمی تصرفات میں عرفان کی وہ بلندی حاصل کی کہ ایک عالم کو انگشت بدنداں کیا۔ برصغیر کا وہ علاقہ جو آجکل مشرقی اور مغربی پنجاب
میں تقسیم ہے۔ آپ کی علمی ضیا پاشیوں کے طفیل منور ہوا۔ اندھیری رات کے بھٹکے مسافروں نے آپ سے اسلام کی روحانیت
درس حاصل کیا اور فلاح کی راہ پائی۔ زہد و تقویٰ میں بے مثل تھے۔ انسانی سیرت کی تعمیر میں اپنی علمیت اور تصوف سے ایسا بھر
کام لیا کہ عام و خاص سبھی آپ سے فیض یاب ہوتے۔ آپ کے دور میں ہندوستان، افراتفری کی شکار ایسی سرزمین تھی جو ایک عبوری
سے گزر رہی تھی۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں آپ نے ملی روایات کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور معاشرے میں پھیلی برائیوں کے خلاف
سرگرم عمل ہو گئے۔

حافظ اسحاق قادریؒ شریعت محمدیؐ کے اتباع کے شدت سے قائل تھے۔ اطاعتِ رسولؐ ہی منزلِ مقصود تھی۔ جانتے تھے کہ شریعت
راہ سے بھٹکا مسافر گمراہی کی راہ کی تاریکی میں کھو جاتا ہے۔ اسی لیے شریعت پر چلنا ہی نصب العین قرار دے رکھا تھا۔ خدا کی عبادت اور
ریاضت میں دن رات گزارا کرتے۔ سخت مجاہدے اور ریاضتوں سے اللہ کے نزدیک ہونے کی جستجو میں لگے رہتے۔

آپ کے آباؤ اجداد کا اصل وطن نور جوٹا ملہ (ضلع ساہیوال) تھا لیکن پھر مغلیہ حکمران شاہ جہان کے زمانے میں لاہور کے نزدیک آ
ہوتے۔ جوٹا ملہ سے ہجرت کر کے آنے کی متعدد روایات بیان کی جاتی ہیں جن میں سے دو خاصی مشہور اور مستند مانی جاتی ہیں۔ ایک روایت
مطابق ساہیوال جب قحط کی لپیٹ میں آیا تو سبھی نے یہاں سے نکلنا شروع کیا۔ ایسے میں آپ کے آباؤ اجداد نے بھی ساہیوال کو خیر
کہا جبکہ دوسری روایت کے مطابق ساہیوال میں ان دنوں دو قومیں آباد تھیں وڑائچ اور چندھڑ۔ دونوں ایک دوسرے کی سخت مخالف بلکہ خون
کی پیاسی تھیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر ایک دوسرے پہ حملہ کرنے میں پہل کا مظاہرہ کرتیں۔ علاقے بھر کو تصادم کی کیفیت
ڈال رکھا تھا۔ خون ریزی ایک معمول بن چکا تھا۔ ایسی صورت میں آپ کے آباؤ اجداد نے فیصلہ کیا کہ یہاں رہنا خطرناک ہی نہیں دانشمندی
بھی منافی ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے ساہیوال سے ہجرت کی اور "چلتے چلتے" لاہور کے نزدیک ایک جگہ آن آباد ہوتے۔ یہ جنگل سے گھری ایک جگہ
آبادی سے کوسوں دور، سرکنڈوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اُن دنوں سوائے چند گوجر آبادی کی جھونپڑیوں کے کچھ بھی نہ تھا۔ گوجر آبادی چند گھر

پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ آپ کے والد حضرت محمد قاسم نے اس جگہ کو بہت پسند کیا۔ حافظ اسحاق کو بھی عبادت و ریاضت کے لیے یہ جگہ بہترین لگی۔ انہوں نے رفقاء سے صلاح و مشورہ کے بعد اس جگہ کو "شرق پور" کا نام دیا اور کچے پکے مکانات بنا کر بارگاہِ خداوندی میں شکرانے کے نفل ادا کیے۔

حضرت اسحاقؒ کے ماموں حافظ محمد صاحبؒ ایک درویش صفت انسان تھے اور زہد و تقویٰ میں لاثانی۔ متعدد تصانیف کے مصنّف تھے۔ جن میں بدر المسائل، مصباح العاشقین نمایاں اہمیت رکھتی ہیں۔ آپ کے ماموں کا انتقال ہوا تو مسندِ خلافت آپ نے سنبھالی۔ آپ اپنی پُرکشش شخصیت اور شریعت کے پابند روز و شب گزارنے والے عالم کے طور پہ علاقے بھر میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

حافظ اسحاق قادری انتہائی خوش الحان قاری تھے۔ آپ کی تلاوت سننے والے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر اس میں ڈوب جاتے اور اُن پر رقت طاری ہو جاتی۔ مغلیہ دَور کے بہت سے عہدے دار آپ کی قرأت سننے کے لیے آپ کی خانقاہ آتے اور آپ کی تلاوت کے سحر میں جکڑ جاتے۔ دلی دربار کی نظروں میں آپ کی بڑی وقعت و عزّت تھی۔ مغلیہ حکمران آپ کی علمی و دینی خدمات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ آپ کی سادہ طرزِ زندگی اور سنتِ رسُولؐ کی پیروی دیکھ کر آپ کی بہت عزّت کرتے۔ چونکہ آپ کی خانقاہ پہ ہمہ وقت علم کے حصول کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اسی لیے اُن کے قیام اور کھانے وغیرہ پر بھی ایک زرکثیر کی ضرورت ہوتی تھی۔ مغلیہ حکمران یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے حافظؒ صاحب کی خانقاہ کے نام بے شمار جاگیریں وقف کر دیں تاکہ اُن کی آمدنی سے آپ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی ضروریات آسانی سے پوری کر سکیں۔

شرقپور کی قدیم ترین مسجد ٹاہلی والے میں قائم ہے۔ یہ مسجد حافظ اسحاقؒ کے ہاتھوں تعمیر ہوئی۔ اس کا سنگِ بنیاد آپ کے ماموں صُوفی حافظ محمد صاحبؒ نے اپنے ہاتھوں سے ۱۱۱۱ھ میں رکھا۔ جلد ہی یہ مسجد اپنی علمیت اور تصوف کے درس میں مشہور ہو گئی۔ دُور دُور سے علم کی پیاس بجھانے طالبِ علم آتے اور اس درس گاہ سے طریقت اور تصوف کی تعلیم پاتے اور ادھر سے فارغ ہو کر برصغیر کے طُول و عرض کو اپنے عِلم کی روشنی سے منوّر کرنے نکل کھڑے ہوتے۔ آپ کی درس گاہ سے ایسے بے شمار علما نکلے ہیں جنہوں نے ہند میں کفر کے اندھیروں کو دینِ حق سے منوّر کرنے کی جدوجہد کی۔

مغلیہ فرماں روا اورنگ زیب عالمگیر ایک درویش صفت انسان تھا۔ خُدا کا خوف اُس کے دل میں باقی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ دنیاوی چند روزہ بادشاہت ہی سب کچھ نہیں۔ اس دُنیا کے علاوہ بھی ایک اور دُنیا ہے جہاں اُسے جانا ہے جہاں اُس کا آقا خالق اُسے سامنے بُلا کے پوچھے گا کہ دُنیا میں تم نے میری خوشنودی کے لیے کیا کیا کام کیے جواب صلۂ انعام کے طلب گار بنتے ہو۔ چنانچہ وہ آخرت سنوارنے کے لیے حتی المقدور اسلامی تعلیمات اور سنتِ محمدیؐ کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ بزرگانِ دین کی صحبت میں اُٹھنا بیٹھنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ کسبِ فیض کے لیے ہر عالِم اور صُوفی کے دَر پہ حاضری دیتا۔ اس نے جب شرقپور کے حافظ اسحاقؒ کے زہد و تقویٰ ! تو وہ آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوا اور آپ کی خانقاہ میں خود چل کے دو مرتبہ حاضری دینے آیا۔ وہ آپ کی بے لوث دینی خدمت کا بے حد معترف تھا۔ اور دل سے آپ کی عزّت کرتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کو ہر مشکل مرحلے پہ اپنی ہر قسم کی حمایت و امداد کا یقین دلا رکھا تھا۔

حافظ اسحاق قادریؒ اُن چند مسلمان اولیا میں سے ہیں جنہوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے محض وعظ و نصیحت سے ہی کام نہیں لیا بلکہ جہاں ضرورت پڑی وہاں جہاد بھی کیا۔ تلوار بلند کی اور دشمنانِ دین پہ قہرِ الٰہی بن کے ٹوٹے اور مجاہد کہلائے۔

حافظ اسحاق قادریؒ دینِ اسلام کے عرُوج کے لیے دن رات اپنے مشن میں سرگرمِ عمل تھے۔ آپ کی شخصیت اور علم وہ پُرکشش وجوہات تھیں کہ لوگ آپ کی صحبت میں بیٹھنا ایک اعزاز خیال کرتے۔ مسجد ٹاہلی والی میں ہر وقت مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم رہنے لگا تھا۔ تلاوت بلند آواز میں کی جاتی تو آس پاس کا علاقہ اس مقدس ذکر سے وجد میں آ جاتا۔ غرض ایک عجیب ہی شان و شوکت میں دن گزر رہے تھے۔ اسلام کا بول بالا ہو رہا تھا۔ باطل قوتیں اسلام کی اس کامیابی اور شادمانی پر سخت نالاں تھیں۔ وہ حافظ اسحاقؒ اور اُن کی درس گاہ کے سخت مخالف بن کر

اُبھریں۔ یہ باطل طاقتیں آپ کو نیچا دکھانے اور اسلام کی جڑیہاں سے اکھاڑنے کے لیے متحد ہو کر شرقپور پر حملہ آور ہوئیں تو آپ نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ سکھوں اور ہندوؤں نے جب ایک جتھہ کی صورت میں دینِ حق کے نام لیواؤں کو للکارا تو انہوں نے ایسی ایسی جواں مردی اور مردانگی کے مظاہرے کیے کہ سکھوں اور ہندوؤں کی لاشوں سے میدانِ جنگ میں تل دھرنے کو جگہ نہ بچی۔ حافظ اسحاقؒ، ان کے مریدین اور ارادت مندوں نے ایسی جواں مردی سے سکھ ہندو لشکر کو منہ توڑ جواب دیا کہ وہ زخم چاٹتے اُلٹے قدموں دوڑ لگانے پر مجبور ہو گئے۔

اس تصادم سے جب علاقہ کا سکھ راجہ شیر سنگھ آگاہ ہوا تو وہ حافظ اسحاقؒ کی عظمت اور دلی دربار سے گہری وابستگی سے بہت خوفزدہ ہوا۔ اس نے فوراً ایک فرمان جاری کیا جس میں سکھ اور ہندو اقوام کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ آئندہ شرقپور میں قدم تک نہ رکھیں بلکہ شرقپور سے باہر اپنی آبادیاں بنائیں اور نہ آئندہ آپ کے اور آپ کے مُریدوں کے خلاف کسی قسم کی ناجائز اشتعال انگیزی اور مزاحمت کریں۔ چنانچہ سکھوں نے اپنے راجہ کی ہدایت کے مطابق شرقپور سے باہر اپنی آبادیاں بسانا شروع کیں اور آہستہ آہستہ شرقپور سے الگ ہو گئے۔ شرقپور سے باہر آج بھی سکھوں کی بسائی اُن آبادیوں کے آثار قلعہ لال سنگھ اور قلعہ رام سنگھ کے نام سے موجود ہیں۔

حضرت حافظ اسحاق قادری بے حد سخی اور دریا دل انسان تھے۔ انہیں مغلیہ حکمرانوں سے ملی ہوئی جاگیروں سے بے پناہ آمدنی وصول ہوتی مگر سادگی کا یہ عالم تھا کہ روکھی روٹی پانی میں بھگو کر کھاتے۔ اور بلا بستر کی چارپائی پہ سوتے۔ جاگیروں سے وصول شدہ آمدنی سے آپ نے خانقاہ میں ایک عظیم الشان لنگر جاری کر رکھا تھا۔ جو دن رات کھلا رہتا اور علاقہ کے حاجت مندوں، غریبوں اور مسافروں کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ دن یا رات کے کسی بھی حصے میں آ کر وہ اس لنگر خانے سے پیٹ کی آگ بجھا سکتے تھے۔

حضرت حافظ اسحاق نے عوام الناس کی بھلائی کی خاطر علاقے بھر میں آرام گاہوں اور لنگر خانوں کا نظام جاری کیا۔ آپ نے بے شمار کنوئیں لوگوں کے لیے بنوائے جن میں چاہ عیدگاہ اور چاہ گوروالا کے کنوئیں اب بھی باقی ہیں۔

آپ کی پُرسوز آواز اور پُرکشش شخصیت کا سبھی پہ بے پناہ اثر پڑتا۔ انسان تو انسان جنّ بھی آپ سے فیض یاب ہونے آتے۔ جنّ کے بہت سے بچے انسانی بچوں کی شکل میں آپ کے پاس آتے اور درس و تعلیم حاصل کرتے۔ در حقیقت جنّ کے بچے آپ کے شاگرد تھے اور آپ کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ آپ انہیں انتہائی دلنشیں انداز میں قرآنی تعلیمات سے آراستہ کرتے اور اُن کے دل و دماغ کو اپنے خالق کی اطاعت گزاری کا پابند کرنے میں لگے رہتے۔

آپ کی خانقاہ میں تعلیم پانے والے دُوسرے شاگرد بچے ان جنّ کے بچوں سے قطعی لاعلم تھے اور وہ بھی اُن انسانی بچوں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتے جو انسانوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے کبھی کسی کو اس میں شک تک نہ ہوا کہ آپ کے پاس جنوں کے بچے بھی پڑھنے آتے ہیں لیکن پھر یکے بعد دیگرے ایسے واقعات ہونا شروع ہو گئے کہ آپ کے شاگردوں کو علم ہو گیا کہ اُن کے ساتھ چند خاص قسم کے شاگرد بھی زیرِ تعلیم ہیں۔

ایک مرتبہ آپ کی خانقاہ کے بچے خانقاہ کے صحن میں "بیری" کے درخت پر چڑھے بیر اُتارنے کی کوشش میں معروف تھے ہر ممکن طریقہ اپنایا مگر وہ بیر تک ہاتھ نہ لے جا سکے۔ شاخیں خاصی اُونچی تھیں جن پہ بیروں کے گچھے لگے تھے۔ اُن کے جنّ ساتھیوں نے جب یہ دیکھا کہ ساتھی بیر اتارنے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں تو اُن بچوں نے پورا درخت ہی اکھاڑ کر اپنے ساتھیوں کے آگے ڈھیر کر کے رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر بچے بہت خوفزدہ ہو گئے۔ مگر بعد میں آپ نے ان سب کو آپس میں اس طرح پیار و محبت سے سمجھایا کہ اُن کے دلوں میں جنوں کا خوف جاتا رہا اور وہ پہلے کی طرح مل جل کر بے خوف ہو کر تعلیم کے حصول میں مگن ہو گئے۔

حافظ اسحاق قادریؒ ایک وسیع اور عظیم الشان کتب خانہ کے مالک تھے۔ آپ کے پاس بیش بہا اور قدیم کتب کا ایک نادر الوجود ذخیرہ تھا۔ دُور دراز سے علم کے پروانے اپنی پیاس بجھانے آپ کے کتب خانہ آتے اور استفادہ حاصل کرتے۔ آپ کے قلمی نسخوں کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا۔ چند عاقبت نااندیشوں نے معمولی سے معاوضے میں انہیں بیچ ڈالا۔ ۱۱۸۰ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کا مزار شرقپور کے محلہ عیدگاہ کے پاس پُرانے قبرستان میں ہے۔ ہر سال نومبر میں آپ کے عُرس پر ایک جشن کا سا سماں ہوتا ہے دُور دُور سے عقیدت مند عقیدت و احترام سے اس میں شرکت کرنے آتے ہیں۔

سفیان ثوری ایک روز مسجد میں داخل ہوئے۔ غلطی یا بے خیالی سے آپ کا الٹا پاؤں مسجد کے اندر رکھا گیا۔ آپ کو فوراً غیب سے تہدیدی آواز نے حیران کر دیا کہ "اے ثور (بیل) مسجد میں اس کے ادب کے ساتھ داخل ہو اور گستاخی کے ارتکاب سے بچ اور اپنا سیدھا پاؤں مسجد کے اندر رکھ..... اس شدید سرزنش پر سفیان ثوری بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد آپ سے لوگوں نے بے ہوشی کی وجہ دریافت کی تو آپ پر اس قدر خوف طاری تھا کہ آپ بات تک نہ کر سکتے تھے۔ کافی دیر کے بعد آپ نے بتلایا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی اور خدا نے میری تہدید کی اور اس ڈانٹ کی وجہ سے میں سخت متفکر ہوں کیونکہ مجھے ثور (بیل) کہہ کر پکارا گیا ہے اور انسانیت میں سے مجھے خارج کر دیا گیا ہے۔ لفظ ثور کی مناسبت سے ہی آپ کا نام ثوری پڑ گیا۔

خشیت الٰہی اور محبت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ آپ شب و روز عبادت میں مشغول رہتے۔ نوافل، صوم و صلوٰۃ کے باوجود آپ کو یہ خیال رہتا کہ کہیں خدا کی محبوبیت اور قربت سے محروم نہ ہو جاؤں..... آپ اکثر خدا کی بارگاہ میں گریہ زاری میں مصروف رہا کرتے تھے۔

حضرت سفیان ثوریؒ سنہ ۹۶ھ میں سعید بن سروق کے گھر کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین علم حدیث اور زہد و تقویٰ میں وحید العصر تھے۔ آپ ابھی کم سن ہی تھے کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ آپ کی والدہ کو آپ کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بیٹے کی تعلیم کے لیے دن رات عرق ریز محنت کی۔ وہ سارا دن سوت کاتتیں اور جو مزدوری ملتی اس میں سے نصف اپنی اور اپنے بیٹے کی گزر اوقات پر صرف کرتیں اور بقیہ نصف کو اپنے لخت جگر کی تعلیم پر خرچ کرتیں۔

سفیان ثوری کو علم کا بہت شوق تھا مگر اپنی مادر محترم کو وہ مزدوری کرتے دیکھ کر بہت آزردہ خاطر ہوا کرتے تھے کئی مرتبہ انہوں نے تعلیم اور مزدوری کو بیک وقت کرنے پر غور کیا مگر والدہ نے سختی سے ان کو روک دیا۔ انہوں نے بیٹے کو حکم دیا کہ ایک وقت میں صرف ایک کام ہی ہو سکتا ہے جو ضروری ہو وہی کام پہلے کر دینا چاہیئے علم کی حصول یابی ضروری ہے چنانچہ تم اس کام کو اولیت دو۔

سفیان ثوری نے اتنا علم حاصل کیا کہ اُن کو خود یقین ہو گیا کہ وہ واقعی عالم ہو گئے ہیں۔ والدہ کے احکام و نصیحت پر عمل پیرائی کے بعد آپ کے تحصیل و علم کو جلا ملی اور آپکی علمیت کا شہرہ چہار دانگ عام ہو گیا۔ علم کے ساتھ ریاضت اور عبادت پر بھی آپ نے محنتِ شاقہ صرف کی۔ آنحضرتؐ کی احادیثِ شریفہ کی آپ علمی تفسیر تھے۔ آپ جو حدیث سُنتے اُس پر سختی سے عمل پیرا ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ سفیان ثوری کا ہمسایہ وفات پا گیا۔ آپ اُس کی تعزیت اور نمازِ جنازہ کے لیے تشریف لے گئے۔ جنازہ پڑھنے کے بعد مرحوم کے لواحقین اور دیگر احباب اُس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے حالانکہ سب جانتے تھے کہ مرنے والا سخت قسم کا گنہگار اور بدکار انسان تھا۔

سفیان ثوری نے تمام احباب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "اللہ تعالیٰ کو منافقت سخت ناپسند ہے تم جس شخص کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ سخت قسم کا بدکار اور گنہگار شخص تھا اور کل تک تم اس کو سخت ناپسند کرتے تھے آج بعد از موت اُس کی جھوٹی تعریف کر کے جھوٹ اور منافقت کا ارتکاب کیوں کرتے ہو" لوگوں نے جواب دیا "حضرت مرنے والا تو اب اس دُنیا میں موجود نہیں تو اُس کی بُرائی کا کیا مذکور اب اس کی اچھائی اور تعریف جو کہ بلا شبہ سچی ہے اگر دینے میں کیا حرج ہے"۔

سفیان ثوری نے جواب دیا کہ بے شک تم اُس کی بُرائیوں اور گناہوں کا ذکر مت کرو اور یاد نہ کرو لیکن جھوٹی تعریفیں بھی نہ کرو بلکہ احسن ترین عمل خاموشی ہے وہ تم اختیار کرو جس میں تمہاری فلاح ہے۔

✖

آپ نوجوانی میں ہی درویشی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اگر لوگ آپ سے اس کے متعلق سوال کیا کرتے تھے کہ ایسی حالت تو عموماً پیراں سالی میں ہوا کرتی ہے۔ آپ تو ابھی جوان ہیں یہ کوزپشتی چہ معنی دارد؟ آپ جواباً خاموش رہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ بیمار جو کہ مرض الموت میں مبتلا تھا اُس نے آپ سے اس کوزپشتی کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے جواب دیا، کہ میرے ایک اُستاد سخت بیمار تھے میں اُن کی عیادت کو گیا اور اُن کو بہت آزردہ پایا۔ میں نے اس آزردگی کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ۵۰ سال شبینہ روز عبادت بے لوث میں مشغول رہا مگر مجھے خدا نے اپنی بارگاہ میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بات کرنے کے بعد سفیان ثوری مزید بولے کہ اسی طرح میرے تین اور اُستاد جو کہ روحانیت میں یکتائے روزگار تھے آخری عمر میں یہودی، نصرانی اور آتش پرست ہو گئے اور انہیں خدا کے دربار کی حضوری نصیب نہ ہوئی۔

ان لوگوں کے اعمال ریاضت اور ان کے انجام کو دیکھ کر مجھے اس قدر خوف الٰہی پیدا ہو گیا ہے کہ اس خشیت الٰہی کی وجہ سے میری کمر خمیدہ ہو گئی ہے اور اس خمیدہ کمری کے باوجود ہر وقت اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے خدا تعالیٰ کے آگے گریہ زاری کرتا ہوں تاکہ مجھے وہ ہمیشہ اپنے مقرب مومنوں میں رکھے۔

✖

سفیان ثوری حج کے سفر پر عازم تھے اور خدا کے حضور عبادت و ریاضت کے ساتھ نوافل دُعاؤں اور گریہ زاری کے نذرانے پیش کرتے جا رہے تھے۔ گریہ زاری کی وجہ سے آپ کی آنکھیں متورم ہو چکی تھیں۔ آپ کے ایک ساتھی نے آپ سے کہا کہ گنہگار تو ہم سب لوگ ہیں مگر خدا کی رحمت سے بڑے پُر امید ہیں جبکہ آپ خدا کی نوازش و فضل سے نااُمید دکھائی دیتے ہیں اور اپنے گناہ پر اس قدر نادم ہیں کہ مسلسل گریہ زاری کر رہے ہیں۔

سفیان ثوری نے جواب دیا کہ کیا تمہیں اپنے حج کی مقبولیت کا مکمل یقین ہے۔

اس شخص نے کہا: بالکل بلاشبہ حج قبول بھی ہو جائے گا اور گناہ بھی معاف ہو جائیں گے اور ہم نومولود بچے کی طرح معصوم

ں گا۔"

سفیان ثوری مسکرائے اور فرمایا "خدا کی رحمت کے آگے گناہ ایک بے معنی سی چیز ہے۔ لہذا میں گناہ گاری کی وجہ سے
ن نہیں ہوں۔ ہاں مجھے یہ یقین نہیں کہ اللہ میرا حج قبول کرتا بھی ہے کہ نہیں کیونکہ میرے ایمان کی صداقت کے متعلق وہی
ے اور یہی تمہارے اور میرے درمیان فرق ہے۔"

✖

ب دفعہ ایک شخص نے آپ کے سامنے اپنی مشکلات کا ذکر کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ "اللہ نے مجھے سخت آزمائش و امتحان
ہوا ہے۔" سفیان ثوری نے سخت جلال سے اس شخص کو جواب دیا کہ پوری دنیا میں مجھے تجھ سے زیادہ ذلیل شخص نہیں ملا
شکوہ میرے ساتھ کرنا شروع کر دیا ہے۔" یہ سن کر وہ شخص بہت نادم ہوا اور چلا گیا۔
پکے ایک مرید نے ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی پیش کی اور عرض کی "میرے والد وفات پا
آپ کے گہرے دوست تھے اور ان کی وصیت کے مطابق یہ اشرفیاں پیش خدمت ہیں۔ ان کو قبول فرمائیے اور اپنے
یں لائیے۔"

سفیان ثوری نے اشرفیوں کی تھیلی واپس کرتے ہوئے اس شخص سے کہا، کہ تمہارے والد میرے دینی دوست تھے نہ کہ دنیاوی
ینی تھیلی واپس لے جاؤ چنانچہ انہوں نے اشرفیاں واپس کر دیں۔

✖

ب مرتبہ سفیان ثوری نے ایک نوجوان کو بڑی درد بھری آہ بھرتے ہوئے دیکھا۔ آہ کے درد کو آپ نے بڑا محسوس کیا اور اس
ی آہ کرنے کا سبب پوچھا۔" وہ شخص بتلانے سے انکاری ہوا کہ یہ میرا اور خدا کا معاملہ ہے۔"
فیان ثوری نے اس نوجوان سے کہا کہ "تمہاری آہ میں جو سوزش ہے تم میرے چار حج لے لو اور اپنی آہ کا اجر مجھے دے دو۔"
نوجوان حیران ہوا کہ ایسا کیونکر ممکن ہوگا۔ یہ سن کر سفیان ثوری سجدے میں گر گئے اور خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ رب
یرے چار حجوں کے بدلے مجھے اس نوجوان کی آہ کا اجر عطا فرمائے۔ کافی طویل دعا اور گریہ زاری کے بعد آپ کو طمانیت
ل ہوئی۔ آپ نے خوشی میں چلانا شروع کر دیا کہ خداوند عالم نے میری دعا قبول کر لی ہے اور مجھے اطمینان و تسکین عطا
ہے۔

ب مرتبہ آپ کے پاس کوئی شخص آیا اور اس نے آپ سے بہت سے سوال کیے جو کہ حسب ذیل تھے۔
کوئی بادشاہ کسی زاہد سے بلند مرتبہ حاصل کر سکتا ہے؟
مخلوق کے کون لوگ زیادہ مقبول ہوتے ہیں؟
انسان کس چیز کو زیادہ محبوب رکھتا ہے؟
یقین کا مفہوم کیا ہے؟
گوشت خوروں کو خدا اپنا دشمن کیوں سمجھتا ہے؟"
پ نے سب سوالوں کے فرداً فرداً جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "بادشاہ زاہد سے بالکل بلند مرتبہ ہو سکتا ہے۔ زاہد کی صحبت
رنے والا بادشاہ اس زاہد سے بہتر ہے جس کو بادشاہ کا قرب حاصل ہو۔"
نچ قسم کے افراد مخلوق میں مقبول ہوتے ہیں۔"
اہد عالم
قیہہ صوفی

متواضع تونگر
شاکر درویش
شریف سُنی

"قلبی آواز یقین کا مفہوم ہے ہر مُصیبت کو من جانب اللہ تصور کرنا یقین ہے اور اسی سے اہل اللہ معرفت تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔"

"گوشت خوری سے مراد غیبت ہے اور اہل غیبت کو اللہ تعالیٰ گوشت خور کہتا ہے اور ناپسند کرتا ہے۔ کیونکہ مسلمان بھائی کی غیبت کرنا مُردار کے گوشت کھانے کے مترادف ہے۔"

سفیان ثوری ہمیشہ کھانا کھاتے وقت اپنے پالتو کُتّے کو اپنے ساتھ بٹھاتے اور پہلے اُس کو کھلاتے اور بعد میں خود کھاتے حالانکہ آپ کی شادی ہو چکی تھی، بیوی بچے موجود تھے مگر یہ تلطف جو کُتّے کو حاصل تھا اہل و عیال اس سے محروم تھے: اس معاملے کے متعلق کسی رشتہ دار نے یہ سوال سفیان ثوری کی اہلیہ محترمہ سے کیا۔ "وہ خاتون بولیں کہ اس کا جواب ہم تو اُن سے لے نہیں سکے آپ خود ہی سوال کریں۔"

سفیان ثوری کے رشتہ دار نے کُتّے کو فوقیت اور اہل و عیال کو نظر انداز کرنے کے متعلق اُن سے سوال کر ہی دیا۔

سفیان ثوری نے جواب دیا کہ بیوی بچے عبادات میں خارج ہوتے ہیں جبکہ یہ کتا چند لقمے کھانے کے بعد میری نگہبانی کرتا ہے اور میں بے فکر خدا سے لَو لگائے بیٹھا رہتا ہوں۔

✖

ظہر کی نماز کا وقت تھا سفیان ثوری مسجد کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ کے مُرید بھی ساتھ تھے۔ راستے میں ایک سوئے ہوئے سپاہی کو دیکھ کر آپ کے مُریدوں نے جگانا چاہا تاکہ وہ بھی نماز ظہر میں شریک ہو جائے۔ سفیان ثوری نے مریدوں کو روک دیا کہ اس کا سونا ہی عبادت ہے اور اس کی بھلائی کے باعث کیونکہ یہ جاگے گا تو مخلوق خدا کو آزار پہنچائے گا اور گنہگار ہوگا جبکہ سویا رہے گا تو اس کے شر سے خلق خدا محفوظ رہے گی اور یہ گنہگار ہی ہے۔

✖

سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ لوگوں نے غفلت کی وجہ سے چار چیزوں سے چشم پوشی اختیار کی ہوئی ہے۔

۱۔ الزام تراشی کرکے ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنا یہ احکام خداوندی سے غفلت کا باعث ہے۔
۲۔ عروج مومن پر حسد کرنا ناشکری کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔
۳۔ ناجائز دولت کا حصول اور اکٹھا کرنا خدا فراموشی کا موجب ہوتا ہے۔
۴۔ خدا کے عذاب سے بے خوفی۔ اس کے وعدوں پر عدم اعتمادی کیونکہ ایسا کرنا کفر کے برابر ہوتا ہے۔

✖

بخارا میں سفیان ثوری کا کوئی عزیز وفات پا گیا۔ شرعاً اس کے ورثہ کے آپ وارث قرار دیئے گئے۔ قاضی نے آپ کو اطلاع دی کہ مالِ وراثت آ کر لے جائیں۔ آپ نے بخارا پہنچ کر مالِ وراثت معلوم کیا اور تمام اسباب فروخت کرکے اُس کی اشرفیاں لیں اور واپس آ گئے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ سفیان ساری زندگی مال و زر جمع کرنے اور حاصل کرنے کے مخالف رہے ہیں لہٰذا وہ یہ مال وراثت قبول کرنے سے انکار کر دیں گے ـــــ لیکن حضرات! یہ آپ نے کیا کیا؟ عمر بھر جس چیز کی مخالفت کرتے رہے اب وہ مال حاصل کرنے اتنی دُور گئے اور حاصل کرکے لے آئے۔

سفیان ثوری نے سکوت اختیار کیا اور فرمایا کہ خدا کے حکم سے مَیں نے ایسا کیا ہے اس لیے تم لوگ بدظنی کر کے گناہ کے ...ب سے بچو۔ مناسب وقت پر اس بات کی حقیقت مجھے معلوم ہو جائے گی۔

ابوجعفر منصور بڑا مدبر اور سیاست دان فرماں روا تھا۔ وہ سفیان ثوری کی شہرت سُن سُن کر عاجز آ گیا اور اُن کا سخت مخالف ...یا اور ایک دن اُن کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ آپ نے ٹال دیا مگر جب مسلسل اُس کے بلاوے آئے تو سفیان ...ی دربار میں چلے آئے۔

ابوجعفر منصور نے کہا! "سفیان ثوری تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو جو اس طرح اکڑ کر زندگی گزار رہے ہو۔"

سفیان ثوری نے رسانیت سے جواب دیا کہ "مَیں خود شناس ہوں اکڑ کر رہنا مجھے پسند نہیں۔"

ابوجعفر منصور بولا: "اچھا خود شناس ہے کہ خوش اخلاقی سے ذرا بھی واقف نہیں ہم نے تمہیں بُلا بھیجا مگر تم نے پہلوتہی سے ...لیا۔"

آپ نے جواب دیا: "خوش اخلاقی تو اسوۂ رسولؐ میں سے ہے اور مَیں اس پر کاربند ہوں مگر تمہارے بلاوے میں کہ بداخلاقی ...حالانکہ اخلاق کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم خود میرے پاس چل کر آتے۔"

درباریوں نے ابوجعفر کو سفیان کی حاضر جوابی کو گستاخی کے مترادف قرار دیتے ہوئے اُن کے قتل کی تجویز پیش کی مگر ابوجعفر ...قتل سے باز رہا اور سفیان سے کہا کہ اب چلے جاؤ اور آئندہ میرے اور میری حکومت کے متعلق کسی قسم کی بات نہ کرنا جس ...لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہو۔

سفیان نے جواباً فرمایا: "غیبت انسان اور ایمان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے لہٰذا مجھے تمہاری بُرائی کر کے گنہگار ہونے ...ی شوق نہیں۔"

ایک شخص ابوجعفر منصور کا درباری تھا اور وہ آپ کی اور ابوجعفر منصور کی گفتگو دربار میں سُن چکا تھا۔ وہ آپ کو مشورہ دینے لگا کہ ...بوجعفر کا درباری ہوں اور اُن کے رمز و مزاج سے آشنا ہوں۔ آج تو آپ کی جان بچ گئی آئندہ محتاط رہیں۔" آپ نے اس ...ص سے کہا کہ دربار میں تُو رہ کر تو خواہ مخواہ گناہوں میں حصہ دار بن رہا ہے۔ لہٰذا تم دربار سے کنارہ کشی اختیار کر لو اور اپنی ...ی کو گناہ سے بچاؤ۔"

وہ شخص بولا حضرت! "مَیں عیال دار ہوں اگر مَیں دربار کی نوکری چھوڑ دوں تو میرے بچے فاقہ سے مرجائیں گے!" آپ ...تال سے فرمایا کہ تم عجیب انسان ہو کہ خدا کی نافرمانی سے تم اپنے بچوں کا پیٹ پال رہے ہو اور خدا کی فرمانبرداری سے ...ں اپنے بچوں اور بیوی کے بھوک سے مرجانے کا خطرہ ہے۔" آپ نے مزید کہا کہ "اکثر لوگ حرام مال کی حلال مال میں آمیزش ...ی لیے جائز قرار دے دیتے ہیں کہ اُن کو بیوی بچوں کے پیٹ کا خیال ہوتا ہے۔ حالانکہ روزی و مال خدا کے اختیار میں ہے ...نے جس کو پیدا کیا ہے اس کا رازق وہی ہے۔ پھر یہ تاویلیں کیا معنی رکھتی ہیں۔

ایک مرتبہ سفیان ثوری حج پر تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ ابوجعفر منصور بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ...زن تھا۔ نماز کا وقت تھا سب لوگ باجماعت نماز ادا کرنے لگے۔ صف میں سفیان ثوری کو جگہ ابوجعفر منصور کے ساتھ ملی۔ دوران ...جعفر نے اپنا ہاتھ کئی مرتبہ اپنی ڈاڑھی پر پھیرا۔ بعد نماز سفیان ثوری نے جعفر سے کہا۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہوئی اور ایسی نماز ...امت کے روز انسان کے مُنہ پر ماری جائے گی۔

جعفر منصور سخت برہم ہوا اور بولا "کہ مَیں تمہاری اس گستاخانہ طرزِ گفتگو سے سخت نالاں ہوں۔"

سفیان بولے: "حق گوئی کو گستاخی کہنا زیادتی ہے تو صرف خلیفہ ہونے کی وجہ سے میری حق بات کو زیادتی کہہ رہا ہے جب کہ

میں نے بالکل حقیقت کہی ہے۔"

ابوجعفر منصور اس وقت تو چُپ ہو گیا مگر بعد میں درباریوں اور حواریوں کی شہ پر اُس نے سفیان ثوری کو قتل کروانے کا پروگرام سوچا اور جلاد کو حکم دیا کہ سفیان ثوری کو فی الفور پھانسی دے دی جائے کیونکہ میں سفیان کا خون زمین پر بہانا نہیں چاہتا لہٰذا اس کی سزا تجویز کی گئی ہے۔

جلاد حسبِ حکم بڑھئی کو پھانسی گھر بنانے کے لیے اپنے ساتھ لے کر سفیان ثوری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جب وہ جنگل میں پہنچے تو انھوں نے سفیان ثوری کو بلند پایہ عالموں فضیل بن عیاض اور سفیان عیینہ کے ہمراہ دیکھا۔ سفیان ثوری اس وقت آرام فرما رہے تھے۔ آپ کا سر فضیل بن عیاض کی ران پر اور پاؤں سفیان عیینہ کی گود میں تھے۔

ان دونوں حضرات نے بڑھئی اور جلاد کو روکا اور کہا کہ سفیان ثوری کی بیداری کا انتظار کرو مگر جلاد مُصر تھا کہ میں فی الفور پھانسی دینے کے حکم کا پابند ہوں۔ اس گفتگو کی وجہ سے سفیان ثوری کی آنکھ کھُل گئی۔ اُن کو ابوجعفر منصور کا فرمان پڑھ کر سُنایا گیا۔ آپ نے فرمایا "ٹھیک ہے میں پھانسی چڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ اِدھر پھانسی گھر تیار ہو رہا تھا اُدھر سفیان سجدہ ریز ہو کر خدا کے حضور دُعا میں مصروف تھے کہ "اے خداوند عالم اگر میں نے خلیفہ ابوجعفر منصور سے گستاخی واقعی کی ہے تو مجھے اس سزا کو قبول کرنے میں کوئی عُذر نہیں ہو گا اور اگر میں بے خطا اور بے گناہ ہوں تو میری دستگیری فرما اور مجھے اس سزا سے بچا۔ آپ دُعا سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ جلاد نے آپ کو پکارا کہ پھانسی گھر تیار ہے لہٰذا آپ پھانسی کے لیے آئیں۔ آپ نے جلاد سے کہا کہ "میرا مقدمہ خدا کی عدالت میں پہنچ چکا اور اُس نے فیصلہ کرنے کے لیے ابوجعفر منصور کو اپنے پاس طلب کر لیا ہے لہٰذا اس کا یہ حکم اب موقوف ہو چکا ہے اس لیے تو مجھے پھانسی لگا کر گناہ کے ارتکاب سے بچ۔ جلاد کیونکہ آپ کو پھانسی لگانے کا پابند تھا، اُس نے آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

ابھی یہ تکرار ہو رہی تھی کہ جلاد کو درباریوں کی طرف سے پیغام دیا گیا کہ ابوجعفر اچانک وفات پا گئے ہیں اور اُن کی جگہ اُن کے بیٹے مہدی نے سنبھال لی ہے۔ یہ سُن کر جلاد نے آپ کی جان چھوڑ دی۔ ابوجعفر کا بیٹا مہدی آپ سے باخبر تھا، چنانچہ عنانِ خلافت سنبھالتے ہی اُس نے سفیان ثوری کو طلب کیا مگر آپ رُوپوش ہو چکے تھے۔

مہدی آپ کو مسلسل تلاش کر رہا تھا مگر آپ ہنوز رُوپوش تھے۔ لوگ آپ سے اس رُوپوشی اور مہدی کے سامنے پیش ہونے سے پہلوتہی کا سبب پوچھتے۔ آپ جواب دیتے "وہ مجھے اہم عہدے پر فائز کرے گا اور میں وہ فرائض انجام نہ دے سکوں گا۔"

اسی دوران آپ کی مُلاقات مہدی کے ایک مقرّب سے ہو گئی۔ آپ نے اس کے ساتھ مہدی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے پوچھا "کیا تم مہدی کی صحبت میں کراہت محسوس نہیں کرتے؟" اُس نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا "مہدی کی بداعمالیوں میں تم سب لوگ شریک ہو۔ تم اُس کو بیش قیمت زرتار پوشاک سے نہیں ٹوکتے۔ نوکروں اور خدام کو فضول خرچی سے نہیں روکتے، حالانکہ بیت المال اُس کے پاس مسلمانوں کی امانت ہے جس میں وہ خیانت کرتا ہے لیکن تم سب دیکھتے ہو۔"

اُس شخص کو سخت غصّہ آیا اُس نے کہا "اس قسم کی جواب طلبی ہم تو امیر المومنین سے کرنے سے رہے، آپ خود ہی اُس کو مل کر اس کی گوشمالی کر سکتے ہیں تو کر لیں ویسے بھی وہ آپ کا متلاشی ہے۔" یہ کہہ کر وہ شخص واپس دربارِ مہدی میں چلا گیا۔

اب سفیان ثوری کو خیال ہوا کہ یہ شخص اب سارا ماجرا مہدی کو سُنائے گا۔ آپ کے دوستوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور رُوپوش ہو جائیں تاکہ مہدی کے آدمی آپ کو تلاش نہ کر سکیں۔ مگر آپ نے انکار کر دیا اور کلمۂ حق کہنے کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔

خلیفہ مہدی کے آدمی تلاش کرتے کرتے آپ تک پہنچ ہی گئے اور مہدی کے دربار میں آپ کو پیشی کا حکم سُنایا۔ سفیان ثوری نے جواب دیا "میں تو آپ ہی لوگوں کا منتظر تھا لہٰذا چلیے میں تیار ہوں۔"

جب آپ دربار میں پہنچے' وہاں آپ نے اس مقرب مہدی کو دیکھا تھا جس سے آپ کی ملاقات اور تلخ گفتگو ہو چکی تھی، آپ نے شاہی کروفر کو نظر انداز کرتے ہوئے دربار کے حاضرین کو السلام علیکم کیا اور مہدی کے سامنے بیٹھ گئے۔ مہدی کے باڈی گارڈ جو کہ برہنہ تلوار تھامے ہوئے تھا فوراً مہدی کے آگے عرض گزار ہوا اور سفیان ثوری کی گردن مارنے کی اجازت طلب کی مگر مہدی نے اُس کو روکا اور کہا مَیں سفیان ثوری سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

خلیفہ مہدی نے سوال کیا۔" سفیان ثوری! مَیں نے سُنا ہے کہ میرے والد ابو جعفر منصور کا انتقال آپ کی بددُعا سے ہوا ہے؟"

سفیان ثوری نے جواب دیا" مَیں نے اُسکو کبھی بددُعا نہیں دی اُس کی موت خدا کی پکڑ کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

مہدی نے دوسرا سوال یہ کیا کہ" پھر آپ کی رُوپوشی کی کیا وجہ ہے؟"

سفیان ثوری نے جواب دیا" مَیں دُنیا دار نہیں ہوں تمہارے درباری مجھ سے حسد کی وجہ سے ناخوش ہیں اور مجھے تمہارے ذریعے ذلیل و خوار کر کے تمہارا نامۂ اعمال خراب کرنے کے درپے ہیں جو کہ مَیں نہیں چاہتا۔ اس لیے مَیں نے رُوپوشی اختیار کی ہوئی ہے۔"

مہدی نے تیسرا سوال کیا" سفیان اَب تُو میرے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اب تم اپنی گستاخیوں اور بدعنوانیوں کی سزا سے کس طرح بچ سکتے ہو۔ تم اَب بھی شاہی آداب کو بالائے طاق رکھ کر اکڑے کھڑے ہو۔"

سفیان ثوری نے جواب دیا" تم کو میرے قتل اور رہائی کا اختیار ہے مگر اس عزیز و منتقم حاکم کو بھی یاد رکھ جو تم سے زیادہ حق و باطل کا فیصلہ کرنا جانتا ہے۔"

آپ کے جواب سے وزیر بڑا مشتعل ہوا اور آپ کے قتل کی اجازت طلب کی مگر مہدی نے اُسکو سختی سے حکم دیا کہ تم خاموش رہو مَیں ایسے شخص جو کہ خدا رسیدہ ہو اُسکو قتل کر کے اپنی دُنیا اور آخرت خراب کروں، تم میرے اور سفیان کے معاملہ میں اپنی زبان بند رکھو۔"

اس کے بعد مہدی نے آپ کو کوفہ کا قاضی بنانے کا فرمان جاری کیا اور لکھا کہ" سفیان یہ حکم جاری کر کے ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تم اس منصب کے اہل تھے لہٰذا تمہیں اس پر فائز کیا۔"

سفیان حکم نامہ لے کر دربار سے نکلے اور رونے لگے کہ جو شخص لوگوں پر حاکم بنایا گیا ہے وہ چھری کے بغیر ذبح کر دیا گیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے فرمان پھاڑ کر دجلہ دریا میں پھینک دیا اور فرمایا کہ قاضی بن کر مَیں خلیفہ کے عیوب و جرائم اپنے کندھے پر نہیں لینا چاہتا۔ اس کے بعد آپ ایسے رُوپوش ہوئے کہ باوجود کوشش بلیغ کے آپ کو مہدی تلاش نہ کر سکا۔

بصرہ کے بازار میں ایک دُکان دار کے پاس ایک طوطا تھا جو بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ سفیان ثوری ایک روز وہاں سے گزرے تو طوطا زور زور سے آپ کو بلانے لگ گیا آپ نے دُکان پر جا کر پرندے سے بُلانے کی وجہ دریافت کی۔ پرندہ آپ کو اور زور سے پکارنے لگ گیا۔

آپ نے دُکان دار سے کہا" دیکھو اس طوطے کو رہا کر دو اور اس کی قیمت مجھ سے لے لو کیونکہ یہ رہائی کا طلبگار ہے۔" دُکاندار نے انکار کر دیا اور کہا" مَیں نے تو اتنے شوق سے اس کی پرورش کی ہے اب اس کو کیوں رہا کروں۔"

دُکاندار سفیان ثوری کے مرتبہ سے ناآشنا تھا چنانچہ ایک اور شخص نے جس کی قریب ہی دُکان تھی اُس کو بتایا کہ یہ بہت بڑے حدیث کے عالم ہیں اور نامور صُوفی ہیں۔ دُکاندار مرعوب ہوا اور طوطے کو رہا کر دیا۔ سفیان ثوری نے دُکاندار کو طوطے کی قیمت پیش کی مگر اُس نے تامل کیا اور عرض کی حضرت! مجھے مزید شرمندہ نہ کریں کیونکہ ناواقفیت کی بنا پر مَیں قیمت لے لیتا اب مرتبہ آشنا ہو کر ایسی بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

طوطا آزاد ہو کر اُسی وقت ایک مکان کی منڈیر پر جا بیٹھا۔ اس کے بعد آپ جس جگہ بیٹھے ہوتے تو طوطا اُڑ کر وہیں پہنچ جاتا اور آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کو دیکھتا رہتا تھا۔ وہ آپ کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھا کہ زبانِ حال سے آپ کا معترف

ہوتا رہتا تھا۔

حضرت سفیان ثوری نے علماء کرام کی تین خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا" ایک عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ اور اللہ کے احکام کا عالم ہوتا ہے اسکو اللہ کا ڈر ہوتا ہے اور یہ حدود کے اندر رہتا ہے دوسرا عالم اللہ کا عالم ہوتا ہے، جو اللہ سے ڈرتا ضرور ہے مگر حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ تیسرا عالم اللہ کے احکام کا عالم ہوتا ہے مگر اللہ کا نہیں اُسکو نہ اللہ کا خوف ہوتا ہے اور نہ حدود سے تجاوز کرنے کا خیال۔ لہٰذا سب سے بہتر عالم پہلا عالم ہے۔"

آپ لوگوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر تمہیں کہیں موت مل جائے تو میرے لیے خرید لینا تاکہ دیدارِ الٰہی سے جلدی میں بہرامند ہو سکوں۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں موت بڑی کٹھن اور اذیت ناک چیز ہوتی ہے۔ لاٹھی ٹیک کر ساری دُنیا کا سفر کرنا آسان ہے جب کہ موت کا سفر دُشوار چیز ہے مگر خدا سے مُلاقات کا شوق تمام مصائب کو سہل بنا دیتا ہے۔

✖

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سفیان ثوری کے فضل و کمال سے بہت متاثر تھے اور فرماتے تھے اگر وہ ابراہیمؒ (ابو حنیفہ کے استاد الاساتذہ) کے زمانے میں ہوتے تب بھی لوگ حدیث کے علم میں سفیان کے محتاج ہوتے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے آپ کو غلطیوں سے پاک حافظ قرار دیا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ عراق پر خدا نے اشرفیوں کی بارش کی ہے جب کہ سفیان ثوری پر علم کی بارش کی ہے۔ شریعت و طریقت میں آپ کامل علوم و رسالت کے وارث تھے یہی وجہ تھی کہ آپ نے بھی امیرالمومنین کا خطاب پایا تھا۔

✖

آپ کو پیچش کا عارضہ لاحق ہوگیا اسی بیماری سے آپ کا وصال ہوا۔ آپ کو حاکمِ بصرہ نے علاج کروانے کی پیشکش کی مگر آپ نے اُس کو قبول نہ کیا۔ انتہائی تکلیف وہ بیماری کی حالت میں بھی بار بار وضو کرتے اور فرماتے کہ نا معلوم کس وقت خدا کی طرف سے بلاوا آجائے اور میں بغیر وضو کے خدا کے حضور پیش نہیں ہونا چاہتا۔ آپ پر نزع کا عالم طاری تھا آپ نے اپنے مُرید صُوفی عبداللہ مہدی سے کہا کہ میرا سر اور منہ زمین پر رکھ دو کیونکہ میرا وقت قریب ہے۔ صُوفی عبداللہ باہر سے لوگوں کو اور ان کے دوسرے مُریدوں کو بُلانے گیا کیونکہ مسجد کے باہر لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا اور سب سفیان ثوری کے معتقد تھے۔ آپ نے عبداللہ مہدی سے کہا کہ میرے بستر پر اشرفیوں کی وہ تھیلی پڑی ہے جو متوفی کے ورثہ نے بخارا میں مجھے دی تھی وہ ان لوگوں میں تقسیم کردو۔ میں نے اُن میں سے ایک پائی بھی صرف نہیں کی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے صرف شیطان کی ورغلاہٹ اور وسوسوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اشرفیاں اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ جب اشرفیاں تقسیم ہوچکیں تو سفیان ثوری نے کلمہ طیبہ پڑھا اور آنکھیں بند کرلیں یوں آپ کا وصال ہوگیا۔

وہ طوطا جو آپ نے خریدا تھا آپ کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر قیام پذیر ہوگیا۔

وصیت

آنحضرت صلعم نے ایسے وارثوں کے حق میں وصیت کرنے کو منع فرمایا ہے جو فرمان الٰہی کے بموجب پہلے سے وارث ہیں کیوں کہ اس طرح دوسرے وارثوں کے حصص میں کتر بیونت ہو سکتی ہے۔ آپؐ وصیت کے ذریعے جائز وارثوں کو نقصان پہنچانے کے خلاف تھے اور ان کے نزدیک ایسا فعل احکام الٰہی میں مداخلت کے مترادف ہے۔ آپؐ کا منشا یہی تھا کہ ترجیحی حیثیت پانے والے کسی طرح رشک و حسد کا نشانہ نہ بنیں۔

ھلی

اپنے بائیس خواجگان کی وجہ سے ایک عالم میں شہرہ رکھتا ہے۔ انہی بائیس خواجگان میں مولانا شمس الدین دہلوی بھی ایک بزرگ کامل شامل ہیں۔ اپنے دور کی ایک یگانۂ روزگار ہستی مولانا شمس الدین دہلوی جنہیں ...ل میں وہ کمال حاصل تھا کہ لوگ انھیں دریائے علم و زہد کا ایک آبدار موتی کہا کرتے تھے۔ انتہا درجے کے انکسار پسند اور ...ا مروت بھری طبیعت پائی تھی۔ جسکی بدولت اکثر لوگ آپ سے خوب فائدہ بھی اٹھا لیا کرتے تھے۔

...ولانا شمس الدین دہلوی کو اُس عہد کے تصوف کے روشن آفتاب حضرت محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین سے ملنے کی بڑی چاہ تھی۔ حضرت ...علمیت اور تصوف کا ایک عالم میں شہرہ تھا۔ عوام اور خواص دونوں ہی آپ کی تعلیمات کے زور کے آگے مفتوح اور مغلوب تھے۔ غرض ...مانے میں ہند میں حضرت خواجہ کی ہستی ہی ایک ایسی تھی کہ لوگ دیوانہ وار آپ کی طرف لپکتے اور آپ کے دیدار کی خاطر سفر کی ...ت برداشت کرتے آپ کی خانقاہ پر پہنچتے۔ مولانا شمس کو بھی حضرت خواجہ کے دیدار کی بہت خواہش تھی اور وہ اپنے ہم عمر اور ہم جماعت خالہ زاد ...مولانا صدر الدین سے اکثر اس خواہش کا ذکر کرتے رہتے تھے لیکن کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ وہ خود اپنی ہی علمیت کے غرور میں اس حد ...ودشناس اور خود نما بن جاتے کہ خیال کرنے لگتے کہ بس حضرت خواجہ تو یوں ہی مشہور و معروف ہو گئے ہیں۔ ٹھیک ہے اُن میں کچھ قابلیت ...ہو گی لیکن اب اتنا بھی نہیں کہ انھیں باکمال قرار دیا جا سکے۔

ایک دن مولانا شمس اور مولانا صدر دونوں جمنا کے کنارے میلے کپڑے دھونے کی خاطر گئے۔ باتوں باتوں میں حضرت خواجہ کا ذکر نکل آیا۔ ...شمس الدین نے اپنے خالہ زاد بھائی سے کہا "صدر الدین آج تو ہم حضرت خواجہ کی خانقاہ سے نزدیک ہی ہیں کیوں نہ اُن سے ملاقات کر لی جائے۔" مولانا ...الدین نے بے دلی سے جواب دیا: "ہاں بات تو تمہاری معقول ہے مگر فی الحال دل نہیں چاہتا۔" مولانا شمس الدین نے مولانا صدر کی بات سنتے ...ے کہا "ٹھیک ہے پھر کبھی چلے چلیں گے لیکن ہم جب بھی جائیں ہم حضرت خواجہ کی اتنی عزت و تکریم نہیں کریں گے جتنی اُن کے مرید کیا کرتے ہیں۔ ہم اُن کے مرید ...ا ارادت مند تھوڑی ہیں جو انھیں اتنی عزت دیں۔" یہ سُن کر صدر الدین ہنستے ہوئے بولے "مجھے تو یہ صوفی لوگ ویسے بھی عجیب و غریب لگتے ہیں۔ نجانے ...ب لوگوں کو بیوقوف بنانا بند کریں گے۔" یہ سُن کر شمس الدین نے گھبرا کر صدر الدین سے کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

صدر الدین بولے: "خیر! حضرت خواجہ سے ملنے کی تجویز چونکہ تم نے پیش کی ہے تو اب میرا بھی اُن سے ملنے کا ارادہ بن رہا ہے لہٰذا اگر اُن سے ملنا ہو

تو کس طرح؟ نظام الدین کی مجلس میں ان کے مرید اور ارادت مند کیا ہماری اس بات کو پسند کریں گے کہ ہم وہاں اس طرح داخل ہوں ان کے پیر و مرشد کے آگے جھکیں اور نہ ہی ان کی قدم بوسی کریں۔"

شمس الدین نے اپنے بھائی کی باتوں سے اتفاق کیا، کہا "بیشک میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ ہم دونوں ان کی حد سے زیادہ نہ تو نہ قدم بوسی کے لیے ان کے آگے جھکیں گے۔ جاتے ہی انہیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ جائیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ ان کا رویہ ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے؟"

دونوں حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ ڈھیلے ہوئے کپڑوں کی گٹھری پشت پر تھی اور دونوں ایک شانِ بے لاپرواہی سے حضرت محبوب الٰہی کی مجلس میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کے چاروں طرف سے مریدوں اور ارادت مندوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ان دونوں ہی نے مجلس میں داخل ہوتے ہوئے السلام علیکم کہا اور محفل میں اپنی جگہ تلاش کرنے لگے۔

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا "ادھر آؤ میرے پاس، یہاں جگہ ہے۔"

دونوں آپ کے پاس چلے گئے، حضرت محبوب الٰہی نے ان دونوں کو نظر بھر کے دیکھا۔ دونوں کی آپ سے نظریں جو ملیں تو ان کے جسم میں لرزہ ساطاری ہو گیا۔ دونوں بے اختیار محبوب الٰہی کے قدموں میں گر کر پاؤں کو بوسہ دینے لگے۔

حضرت محبوب الٰہی نے مسکرا کر پوچھا "حالانکہ تم دونوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ نہ تو میرے سامنے جھکو گے اور نہ ہی میرے قدم کو بوسہ دو گے، پھر اب کیا کر رہے ہو؟"

شمس الدین نے کہا "حضرت! آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔"

صدر الدین نے کہا "کیا ہم نے قدم بوسی کی ہے؟ لیکن ہمیں تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔"

حضرت محبوب الٰہی مسکرا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا "کیا تم دونوں اسی شہر میں رہتے ہو؟"

دونوں نے جواب دیا "جی پیر و مرشد، ہم دونوں اسی شہر میں رہتے ہیں۔"

آپ نے دریافت فرمایا "کچھ پڑھتے بھی ہو؟"

دونوں نے جواب دیا "ہاں، ہم پڑھتے بھی ہیں۔"

آپ نے پوچھا "کیا پڑھتے ہو اور کس سے پڑھتے ہو؟"

مولانا ظہیر الدین بھکری سے بزدوی پڑھتے ہیں۔"

مولانا ظہیر الدین بھکری کا تعلق سندھ سے تھا۔ سندھ کا شہر بھکر آج بھی مشہور اور موجود ہے۔ مشہور مورخ ضیاء الدین کے بقول مولانا مختلف فنون میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن اس عالم بے بدل نے بھی بزدوی کے کچھ حصے نہیں پڑھائے تھے کیونکہ بزدوی کے یہ حصے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور مولانا ظہیر الدین نے اپنے دونوں شاگردوں سے وعدہ کر رکھا تھا کہ میں بزدوی کے ان مشکل مقامات پر تحقیق کر رہا ہوں جس روز بھی میں ان حصوں کو سمجھ لوں گا، تم دونوں کو بھی سمجھا دوں گا۔"

حضرت محبوب الٰہی نے دریافت کیا "لیکن انہوں نے پوری بزدوی تو نہیں پڑھائی۔ جو حصہ مشکل ہے اور مولانا جس پر تحقیق فرما رہے ہیں اگر تم مناسب سمجھو تو اسے میں سمجھا دوں؟"

دونوں حیرت زدہ ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا "دونوں ایک دوسرے کی صورت کیا دیکھ رہے ہو؟ ہم تم سے مخاطب ہیں، ہماری طرف دیکھ کر بات کرو۔"

دونوں نے بیک زبان عرض کیا "کیا آپ ان مشکل مقامات کی تشریح فرما سکیں گے؟"

آپ نے فرمایا "کیوں نہیں!"

دونوں نے کہا "پھر فرمائیے۔ اس سے بڑی خوش نصیبی ہمارے لیے اور کیا ہو گی کہ ہمیں جو نہیں معلوم ہے وہ بھی معلوم ہو جائے گا۔"

حضرت محبوب [illegible] بزدوی منگوا کر اس کا درس دینا شروع کر دیا اور حل دیتے دیتے حیرت انگیز طور پر کتاب کے مشکل ترین مقامات تک پہنچ گئے [illegible] ت روانی اور عالمانہ انداز میں [illegible] تشریح فرمانے لگے۔ جب پوری تشریح فرما چکے تو دریافت فرمایا [illegible] آیا؟"

دونوں [illegible] نے جواب دیا "پیر و مرشد! سمجھ میں آ گیا یعنی [illegible] سب پوری طرح دل و دماغ میں اتر گئی ہے۔ واہ واہ، سبحان اللہ۔" [illegible] کو ممنون درویش ہی [illegible] ہوئے تھے۔"

مولانا ظہیر الدین نے پوچھا "تو تم دونوں وہاں گئے تھے؟"
دونوں نے جواب دیا "ہاں، ہم دونوں خوش قسمتی سے آج وہاں چلے گئے تھے۔"
مولانا نے پوچھا "پھر وہاں کیا ملا تم دونوں کو؟"
دونوں نے جواب دیا "ہمیں سب کچھ مل گیا وہاں سے۔"
مولانا شمس الدین نے استاد کو بتایا "استادِ محترم! بزدوی کے وہ مشکل حصے جن پر آپ تحقیق فرمانے والے ہیں، ہمیں اپنے معانی و مطالب اور تشریح کے ساتھ گویا ازبر ہو گئے ہیں۔"
مولانا نے حیرت سے پوچھا "مگر کس طرح؟ کیونکر ازبر ہو گئے اور کس نے ازبر کرا دیے؟"
مولانا شمس الدین نے جواب دیا "حضرت محبوبِ الٰہی نے۔"
مولانا نے فرمایا "مگر وہ تو محض درویش ہیں، ایک صوفی۔ انہیں بزدوی کا کیا علم؟"
شمس الدین نے جواب دیا "استادِ محترم! یہ راز تو آج ہی ہم دونوں پر منکشف ہوا کہ وہ شخص درویش یا صوفی ہی نہیں ایک جید عالم بھی ہیں، ان کے علم کا کیا کہنا! سبحان اللہ! جب بولتے ہیں تو گویا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے۔"
مولانا ظہیر الدین نے پوچھا "کیا میں بھی ان سے مل سکتا ہوں؟"
شمس الدین نے جواب دیا "کیوں نہیں، جب چاہیں ملاقات فرمائیں۔ وہ بہت سادہ اور منکسر المزاج انسان ہیں۔"
مولانا ظہیر الدین دوسرے دن حضرت محبوبِ الٰہی کے پاس گئے اور شرفِ ملاقات سے خود کو روشناس خاص و عام کیا۔
کئی دن بعد شمس الدین اور صدر الدین دوبارہ ملاقات کو پہنچے اور آپ نے ان دونوں کو اپنا مرید کر لیا۔

⬤

مولانا شمس الدین حد درجہ خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔
آپ کے پاس ایک ایسا شخص آیا جس کے حالات بہت خراب تھے اور قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آپ نے اس شخص کے لباس اور وضع قطع کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ وہ کسی خوشحال گھرانے کا فرد ہے۔
وہ آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے؟ کوئی خاص بات ہے؟"
وہ شخص رونے لگا، بولا "حضرت! میں بہت پریشان حال انسان ہوں۔"
آپ نے فرمایا "میں تیری مدد کر دوں گا۔"
اس شخص نے بعجلت کہا "حضرت آپ کو جو مدد کرنی ہو فوراً کر دیجئے۔"
آپ نے اس کی مدد تو کر دی مگر آپ کو ذرا دکھ ہوا کیونکہ آپ اس کو اس مدد کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ آپ کے کسی معتقد نے پوچھا۔
"حضرت! جب آپ کو اس شخص سے کراہت سی محسوس ہو رہی تھی تو اس کی مدد کیوں کی؟"
آپ نے جواب دیا "اگر کوئی کام میرے بس میں ہے تو میں انکار نہیں کر سکتا۔"
آپ نے تعلیم سے فراغت پانے کے بعد زہد و ریاضت کی طرف توجہ دی اور اس میں اتنے مشغول ہو گئے کہ ہر وقت ذکر و شغل میں لگے رہتے۔ آپ کے آس پاس ارادت مند جمع ہونے لگے۔ فتوح نامی ایک خادم ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ یہ خادم آپ کے بہت کام آتا۔ جب تک یہ نہیں تھا، لوگوں سے آپ کا براہِ راست واسطہ رہتا تھا لیکن فتوح نے آپ کو بہت آرام پہنچایا۔
آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں وعظ فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا "حضرت! میں آپ کا وعظ نہیں سنوں گا۔"
آپ نے پوچھا "مگر کیوں؟ کیوں نہیں سنے گا تو میرا وعظ؟"
اس نے جواب دیا "حضرت! میں ایک پریشانی میں مبتلا ہوں جب تک میں اس پریشانی سے نجات نہیں حاصل کر لوں گا، میرا کسی بھی کام میں دل ہی نہیں لگے گا۔"
آپ نے دریافت فرمایا "کیا پریشانی ہے تجھے، مجھے بھی تو بتا۔"
اس شخص نے جواب دیا "حضرت! میں کیا بتاؤں۔ آپ شاید مجھے پہچان نہیں سکے، میں پہلے بھی آپ سے مل چکا ہوں اور آپ پہلے بھی میری مدد کر چکے ہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے کہ میں نے تجھ کو نہیں پہچانا۔ میں نے تجھ کو پہچان کر ہی یہ سوال کیا ہے کہ اپنی پریشانی بتا تاکہ میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

اس شخص نے عرض کیا۔ "حضرت! میں کیا عرض کروں؟ مجھ کو کافی قرض اتارنا ہے۔"

آپ نے فتوح خادم کو آواز دی۔ "فتوح! اس عزیز سے معذرت کرو۔"

یہ شخص حیران رہ گیا کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟

فتوح نے اس شخص سے کہا۔ "حضرت! آپ میرے ساتھ آئیں۔"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کہاں؟"

فتوح نے جواب دیا۔ "گھبرائیں نہیں، میں آپ کو کہیں نہیں لے جاؤں گا، آپ آئیے تو میرے ساتھ۔"

وہ شخص فتوح کے ساتھ چلا گیا۔ فتوح اس کو اپنے حجرے میں لے گیا اور کہا۔ "حضرت! آپ کو کچھ دیر یہاں پر انتظار کرنا پڑے گا، میں ابھی آیا۔"

ان صاحب کو بادلِ ناخواستہ اس حجرے میں بیٹھ جانا پڑا۔

کچھ دیر بعد فتوح اس شخص کے لیے گرما گرم کھانا لے کر آگیا۔ خوان کو اس شخص کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ "پہلے کھانا تو شکم سیر ہو کر کھا لیں، اس کے بعد کوئی دوسری بات ہو گی۔"

یہ شخص بھوکا بہت تھا، بلا عذر کھانے لگا۔

فتوح نے کہا۔ "جناب! آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ میرے مرشد نے جب مجھ سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا۔ 'جاؤ، ان سے معذرت کرو' تو ان سے ان کا یہ مطلب بھی تھا کہ میں آپ کی خاطر تواضع کروں اور کھانا کھلاؤں۔"

اس شخص پر فتوح کی باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ بولا۔ "فتوح! میں بہت شرمندہ ہوں۔ پہلے میرا یہ خیال تھا کہ مولانا سادہ لوح اور بھولے بھالے انسان ہیں، لیکن آج مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ ایک خدا رسیدہ روشن ضمیر بھی ہیں۔"

فتوح نے پوچھا۔ "جناب! میں نے آپ کی بات سن لی۔ اب آپ یہ فرمائیں کہ آپ یہاں کیوں تشریف لائے تھے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "میں بابا شمس الدین کی تحقیر اور بار بار ذات سے کچھ نقد مانگنے آیا تھا۔"

فتوح نے کہا۔ "پھر! آپ نے ان کا جواب بھی سن لیا۔ اس بار انھوں نے خود معذرت نہیں کی بلکہ مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے معذرت کر لوں۔"

اس آدمی نے پشیمانی سے کہا۔ "اب میں خود بھی کچھ نہیں مانگوں گا۔ میں اپنی سابقہ حرکت پر بھی بہت نادم ہوں، مزید غلطی نہیں کروں گا۔"

❁

مولانا شمس الدین کی علمیت کا غیر معمولی شہرہ دہلی سے نکل کر دوسرے شہروں میں بھی پہنچ چکا تھا۔ آپ کے شاگردوں میں یگانۂ روزگار شخصیات بھی شامل تھیں۔ ایک دن آپ کے حلقۂ درس میں حضرت چراغ دہلی بھی نظر آئے۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ کسی نے چراغ دہلی سے دریافت کیا۔ "حضرت! کیا یہ شخص درست کہہ رہا ہے یا سراسر جھوٹ بول رہا ہے؟"

حضرت چراغ دہلی نے فرمایا۔ "یہ شخص سچا ہے۔ مولانا شمس الدین صرف میرے ہی نہیں بہتوں کے استاد ہیں۔"

اس دوران چند آدمی آپ سے ملنے آئے۔ آپ ان سے ملے اور پوچھا۔ "آپ لوگوں کی آمد کا کوئی خاص مقصد؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "ہم نے آپ کی علمیت اور روشن ضمیری کے چرچے سنے ہیں، آپ ہمیں اپنا مرید بنا لیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "جاؤ، کوئی اور کام کرو، اس لاحاصل کام سے حاصل؟"

آنے والوں نے کہا۔ "لاحاصل کام؟ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے مریدی کو لاحاصل اس لیے کہا کہ میں جانتا ہوں، مریدی کے لیے کتنا درد و سوز ضروری ہے۔ کیا تمہارے دلوں میں مذکورہ درد و سوز موجود ہے؟"

انھوں نے کہا۔ "آپ ہمارا امتحان لے لیں، اس کے بعد مرید بنائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہم تمہارا امتحان آخر لیں کیوں؟ جاؤ، ہم تمہیں مرید نہیں بنائیں گے۔"

ایک امیدوار نے آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ رو رو کر بولا۔ "حضرت! ہم جس مقصد سے آئے ہیں اس کو پورا کیجیے، ہر دیس میں جا مرگئے

یہ ہمارا اٹل فیصلہ ہے اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوگی۔"

آپ نے پوچھا "اے نوجوان! یہ تو کس طرح کہہ سکتا ہے کہ تو اپنے مقصد میں کوئی ترمیم نہیں کرے گا، کیا تو خدا سے بھی بڑا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا "توبہ توبہ۔ اگر میں ایسی بات سوچوں بھی تو خدا مجھے معاف نہ کرے۔" وہ اپنے دونوں گال پیٹ پیٹ کر رونے لگا۔

آپ نے فرمایا "ہمیں تمہارے جذبے کے احترام میں تمہیں مرید بنانا ہی پڑے گا۔"

نوجوان نے حیرت سے پوچھا "لیکن حضرت! انکار کے بعد اقرار، اس کا مطلب؟"

آپ نے جواب دیا "ہمیں تمہارے دل میں جس سوز اور جذبے کی تلاش تھی۔ وہ مل گیا۔ اس کا علم ہو گیا۔"

آپ نے اس نوجوان کو مرید کر لیا اور آپ ہمیشہ اسی آدمی کو مرید کرتے جو آپ کی آزمائش اور امتحان میں پورا اترتا۔

آپ کے ایک ہم عصر مولانا سلیمان کو بھی دوسرے علمائے عصر کی طرح مولانا شمس الدین سے بڑی عقیدت تھی۔ دوسرے علماء کی طرح مولانا سلیمان بھی آپ کی خدمت میں حاضریاں دیتے رہتے تھے اور ان سے علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔

ایک دن مولانا سلیمان نے پوچھا "حضرت! تصوف کی اساس کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "آداب شریعت کی محافظت۔ حرام اور مشتبہ چیزوں سے۔ پرہیز ممنوعات سے اپنے حواس کی حفاظت غفلتوں سے بچنے کے لیے ہر سانس میں خدا کی یاد۔"

مولانا سلیمان عش عش کر اٹھے، پوچھا "حضرت! انما الاعمال بالنیات۔ اعمال کا اعتبار و انحصار نیتوں پر ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "مولانا! امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ اعمال کا اعتبار نیتوں سے ہوتا ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ جس کی ہجرت اللہ اور رسولؐ کی طرف ہے۔ اور جس کی ہجرت کسی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہے تو وہ اسی کے لیے ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہوگی۔"

مولانا سلیمان نے پوچھا "اس حدیث کا پس منظر کیا ہے؟ براہ کرم اس کی بھی وضاحت فرما دیں۔"

آپ نے فرمایا "جب مکے کے مسلمان آپؐ کے حکم اور تقلید میں مدینے ہجرت کر رہے تھے تو ان ہجرت کرنے والوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کو مدینے میں ایک عورت سے شادی کرنی تھی۔ اس عورت کا نام ام قیس تھا چنانچہ اس شخص کو مہاجر ام قیس کہا جانے لگا۔"

کچھ توقف کے بعد آپ نے فرمایا "سب سے پہلے تمہیں یہ بات جاننی ہوگی کہ اس حدیث میں اعمال سے کون سے اعمال مراد ہیں۔ تو سنو۔ اعمال کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ عبادات و طاعات، مباحات، سیئات۔

عبادات و طاعات: اس میں تمام نیکی کے کام داخل ہیں۔

مباحات: اس میں ہر جائز کام شامل ہوتا ہے۔

سیئات: اس میں تمام برائیاں شامل ہوتی ہیں۔

اس حدیث میں اعمال سے مراد پہلی دو قسموں سے ہے۔ سیئات۔ یعنی معاصی اور برے اعمال یہاں مراد نہیں ہیں کیونکہ انسان کا کوئی برا عمل کسی اچھی نیت سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک ڈاکو اس نیت سے لوگوں کے مال و دولت پر ڈاکے ڈالے کہ اس طرح جو مال حاصل ہوگا وہ غریبوں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرے گا تو اس اچھی نیت کی وجہ سے اس کا عمل نیک اور اچھا نہیں ہو سکتا۔ یعنی برائیاں نیت کی وجہ سے اچھائیوں میں تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا کسی جاہل کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ اچھی نیت کی وجہ سے معصیت طاعت بن سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو خوش کرنے کے لیے کسی کی غیبت کرے یا کسی دوسرے کا مال لے کر کسی فقیر کو کھلا دے یا کوئی مدرسہ کوئی مسجد کوئی مسافر خانہ حرام مال سے بنائے اور نیت خیر کی کرے تو یہ سب جہالت اور نادانی کی باتیں ہیں۔ ان برے کاموں کو اچھی نیت ظلم، زیادتی اور معصیت ہونے سے خارج نہیں کر سکتی۔ جو چیزیں شرعاً ممنوع ہیں ان کو خیر کی نیت سے کرنا ایک دوسرا شر ہوگا۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تو وہ شریعت کا دشمن ہے اور اگر نہیں جانتا تو اپنے عمل کی وجہ سے گنہگار رہے کیونکہ خیر و شر کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

مولانا سلیمان کے دل پر آپ کی باتیں اثر کرتی رہیں۔ انہوں نے کہا "مولانا! مجھے فخر ہے کہ آپ کی صحبت میں رہتا ہوں، باتیں کرتا اور سنتا ہوں۔ آپ کی آواز اور آپ کی صورت شکل کو اور دیکھ سکتا ہوں اور میری ہی طرح ہر وہ شخص آپ پر فخر کر سکتا ہے جس نے آپ کی نشست میں کچھ وقت گزارا ہوگا۔"

آپ نے فرمایا "ایسا نہ کہیے، یہ نفس بڑا سرکش ہوتا ہے مجھے ڈر ہے کہ آپ کی تعریفیں کہیں مجھے ورغلا کر کہیں کا بھی نہ رکھیں۔"

سلیمان نے عاجزی سے کہا: "مولانا! میں نے جو کچھ کہا انتہائی خلوص اور صدق دل سے کہا ہے۔"

دن تو مولانا سلیمان چلے گئے۔
جمعہ کے دن نماز سے فارغ ہو کر پھر مولانا شمس الدین کی خدمت میں پہنچ گئے۔ مولانا سلیمان نے دیکھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد مولانا شمس الدین
تبدیل کیے اور اس کے بعد کتابت میں مشغول ہو گئے۔

نا سلیمان نے اپنے دل میں سوچا۔ نماز جمعہ کے بعد تو مشائخ عموماً عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور آپ کتابت میں مشغول ہیں۔
ہے۔ کیا آپ کو ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہے؟ اتنا بڑا درویش۔ اتنا بڑا عالم اتنی سی بات نہ جانے تو حیرت کی بات ہے۔"
ب مولانا سلیمان یہ سب سوچ رہے تھے، اسی وقت مولانا شمس الدین نے لکھتے لکھتے اپنا سر اٹھایا اور مولانا سلیمان کو مخاطب کیا: "مولانا
پ کیا سوچنے لگے؟ کیا آپ میری طرف سے میرے بارے میں بدگمان ہیں؟ آپ تو مجھے دوسروں سے زیادہ ہی جانتے ہیں۔ میں اس
ہوں۔ میں اس وقت جو کچھ کر رہا ہوں اس کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں جس چیز کی نقل کر رہا ہوں وہ عاریتاً لیا ہوا ہے
ل صبح واپس کر دینا ہے۔ براہ کرم آپ خود فرمائیں کہ اگر میں اس وقت کتابت نہیں کروں گا تو کب کروں گا؟"
نا سلیمان نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ بولے: "حضرت! میں آپ سے اور اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہا ہوں براہ کرم مجھے معاف فرما دیں۔"
پ نے فرمایا: "معافی کس بات کی؟ آپ نے میرے کام اور میری بابت جو کچھ سوچا، اس میں خلوص اور ایمان شامل ہے۔"
لانا سلیمان اس تسلی اور تشفی کے باوجود اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوئے اور عرصہ تک توبہ و استغفار کرتے رہے۔

❀

پ کو حضرت محبوب الٰہی نے جو خلافت نامہ مرحمت فرمایا تھا، اس کی عبارت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت محبوب الٰہی نے اس

تھا:
تمام شکر و احسان خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے اپنے دوستوں کو جان اور اہل جان کی طرف مائل ہونے سے روکا۔ کیونکہ دنیا خدا کی
ہے۔ مبغوض یعنی اس پر غضب نازل کیا گیا۔ صبح و شام اللہ تعالیٰ کے دوستوں پر دلدار محبوب کی شراب محبت کے ساغر کا دور چلتا ہے
ہے جب رات ہوتی ہے تو ان کے دل شوق کی آگ سے روشن ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں بارش کی طرح آنسو بہانے لگتی ہیں۔ آنسو
بارش کی جھڑی کی طرح آنکھوں سے جاری ہو جاتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں کہ انہیں ہر لمحہ تازہ عرفان نصیب ہو جاتا ہے اور اس کے انوار
ف عالم منور ہو جاتے ہیں۔ ایسے شخص کا کلام گویا کلام حق ہے اور وہ خلقت کو اللہ کی طرف بلاتا ہے تاکہ انہیں تاریکی سے نکال کر نور کی
لے جائے اور اپنے رب کا قرب حاصل کرے۔
اس کے بعد صلوٰۃ و سلام ہو صاحب شریعت کاملہ پر جنہوں نے ہمیں سیدھی راہ دکھائی اور وہی ہمیں اعلیٰ مقام پر پہنچا سکتے ہیں۔
دنیا والوں کی رحمت کے لیے اللہ کے خلیفہ بننے کے لیے مختص کر دیے گئے ہیں۔
سلام خلفائے راشدین پر جنہیں اعلیٰ مقام حاصل ہوا اور اسی پر وہ فائز ہیں اور سلام ہو رسول مقبول کی آل پر جو صبح و شام اپنے پروردگار
ذکر کرتے ہیں۔
اس سب کے بعد۔ خدائے واحد کی طرف خلقت کو بلانا اسلام کا سب سے اعلیٰ اور ایمان کا سب سے مضبوط کام ہے چنانچہ حدیث میں
کہ آپ نے فرمایا: "مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے اگر تم چاہو تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے
دوں میں سے وہی اس کے دوست ہیں جو اللہ تعالیٰ کی دوستی بندوں پر اور بندوں کی دوستی اللہ تعالیٰ پر ظاہر کرتے ہیں یعنی عشق
کا طریقہ اور محبت سکھاتے ہیں اور جو زمین پر امر بالمعروف کے لیے چلتے ہیں اور لوگوں کو منکرات سے روکتے ہیں۔ اللہ نے ان
ں کی مدح کی ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے پروردگار! ہمیں بیویوں اور اولاد کا سکھ عطا فرما اور پرہیزگاروں کا امام بنا۔ سو اس
لب کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رسول مقبول کی پیروی واجب کر دی۔ رسول مقبولؐ نے فرمایا کہ بہترین پیروی ان پیغمبروں کی
ہے جن کی امت کے اعضائے وضو سے روشن ہوں گے اور وہ اپنی امت کو بہشت میں لے جائیں گے چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے
یا: "اے محمدؐ! کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے اور یہ میرا دین ہے میں تمہیں اللہ کی طرف از روئے بصیرت بلاتا ہوں۔ میں اور میرے متبعین"
وہ جنہوں نے میرے اقوال اور اعمال کی اتباع کی، یہ سب اسی راستے پر ہیں۔ رسول اکرمؐ کی پیروی اس بات کا نام ہے کہ آپ کے اقوال کو
نظر رکھ کر آپ کے افعال کی پیروی خالصۃً للہ کی جائے اور ماسوائے قطع تعلق کر کے معبود حقیقی کی طرف دھیان لگایا جائے۔
پس ولد عزیز متقی، عالم برگزیدہ رب العالمین کی طرف متوجہ شمس الملت والدین محمد بن یحییٰ اللہ تعالیٰ اپنے انوار کا فیض اس کے دسیلے

اہلِ یقین اور پرہیز گار لوگوں کو سنبھالے۔

چونکہ شمس الدین ابن یحییٰ صدقِ دل اور صدقِ نیت سے ہمارا مرید ہوا ہے اور اس نے ہم سے خرقہ خلافت پہنا ہے۔ اس نے ہم سے خاصا و کافی فائدہ اٹھایا ہے اس لیے ہم اسے اپنی طرف سے اجازت دیتے ہیں بشرطیکہ وہ اتباعِ سنت و پیغمبر میں دل بہ پرستی اور اپنے تمام اوقات کو طاعتِ الٰہی میں صرف کرے اور دل کو خواہشاتِ نفس اور ہجومِ غم سے محفوظ رکھے اور دنیا اور اسبابِ دنیا سے احتراز کرے اور اس کے دل میں عالمِ قدس کے اسرار روشن و ظاہر ہوں اور اس کے لیے شناختِ حق کا دروازہ کھلا ہے تاکہ وہ اپنے مریدوں کو سنبھالے اور راہِ حق کی طرف رہنمائی کرے۔ جس طرح مجھے میرے شیخ سے نظرِ خاص سے ملاحظہ فرمانے کے بعد خرقہ خلافت عطا ہوا۔ میرے شیخ کی عظمت اور بزرگی کی خوشبوئیں عالم میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی کرامت کی روشنی سے دنیا کا گوشہ گوشہ منور، ان کے افکار عالمِ قدس تک پہنچے ہوئے ہیں میرے شیخ محبتِ الٰہی کو ظاہر کرنے والے، زمانے کے قطب علامہ فرید حق و شرع والدین طیب اللہ ثراہ ہیں اور آپ کا مقبرہ جو کہ میرے آرام گاہ ہو۔ آپ نے خرقہ خلافت ملک مشائخ سلطان الطریقت قطب محبت قطب الدین بختیار روشی سے پہنا اور انھوں نے بدر العارفین معین الملت والدین معین الدین حسن سنجری سے پہنا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ رسولِ مقبول تک پہنچ جاتا ہے۔ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ نازل ہو جو آنحضرت سے نسبت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں محمد اور اصحابِ محمد پر۔ پس جو ہم تک نہیں پہنچ سکا اسے چاہیے کہ وہ شمس الدین یحییٰ تک پہنچے۔ ہم نے ان کو اپنا خلیفہ و قائم مقام بنایا ہے۔ وہ بڑا قطب ہے۔ دین اور دنیوی امور میں اس کے حکم کو بجا لانا در اصل میری تعظیم ہے حق تعالیٰ ایسے شخص کو عزیز رکھے۔ جو حق تعالیٰ شخص کو ذلیل و خوار کرے کہ وہ اس شخص کی توہین کرتا ہے جس کے حقوق کا میں لحاظ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی مدد کرنے والا ہے جو مدد مانگتے ہیں اور اس خدائے تعالیٰ پر بھروسہ کرکے یہ خلافت نامہ لکھا گیا ہے۔ یہ سلطان المشائخ نظام الدین محمد نے کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی عظمت اور بزرگی کو ہمیشہ قائم رکھے اور حق تعالیٰ ان کو جملہ آفات سے محفوظ رکھے اور ان کی خوبیوں کو ... ۔

ان سطور کا کاتب فضلِ رحمن کا امیدوار حسین بن محمد بن محمود متوطن کرمان ہے اس خلافت نامے کی کتابت بتاریخ ۔۔ ماہ ذی الحجہ ۷۲۴ (۱۳۲۴ء) میں کی ہے۔

❀

ایک محفلِ سماع میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت سلطان المشائخ کے روضہ مبارک پر عرس ہو رہا تھا۔ جہاں یہ محفل گرم تھی وہ گنبد تھا۔ آپ کے علاوہ اس مجلس میں مسافروں، مجذوبوں اور قلندروں کی جماعتیں بھی تھیں۔ قوال اور درویش دف بجا رہے تھے اور شیخ سعدی کی ایک غزل نہایت پرسوز آواز میں سنا رہے تھے۔

سنتے سنتے مولانا شمس الدین اچانک اٹھے اور بڑے گنبد سے باہر آ گئے پھر قوالوں اور درویشوں کے پاس گئے۔ آپ غزل کھڑے سنتے رہے۔ آپ اپنا ہاتھ بار بار اپنے سینے پر ملتے تھے اور بے اختیار رقص کرنے لگے تھے۔

جب محفلِ سماع اختتام کو پہنچی تو سبھی کو ہوش آ گیا۔ مولانا شمس الدین کو لذتِ سماع نے بہت زیادہ متاثر کر رکھا تھا۔ اس محفل کے دوسرے جو موجود تھے مولانا کی از خود رفتگی کو محسوس کرکے خود بھی از خود رفتہ ہوئے جا رہے تھے۔

یہ سلطان محمد تغلق کا دور تھا۔ اس کی سختیاں اور خون آشامیاں عروج پر تھیں اور وہ اپنی پشت پر دونوں ہاتھ باندھے جسے ٹہل رہا تھا، پھر کھڑے ہو کر تالی بجائی اور جب خادم آ گیا تو اس کو حکم دیا "جاؤ اور اسی وقت مولانا شمس الدین کو بلا لاؤ۔"

خادم نے قدرے تامل اختیار کیا، پوچھا "کیا مولانا شمس الدین کو؟"

بادشاہ کو غصہ آ گیا۔ چھڑی اٹھا کر خادم کے رسید کر دی، بولا "ہاں ہاں مولانا شمس الدین کو۔ اسی وقت انہیں پیش کرو۔"

خادم مولانا کے پاس پہنچا اور کہا "آپ کو بادشاہ سلامت نے یاد فرمایا ہے۔"

آپ نے پوچھا "تو کیا کہہ رہا ہے؟ بادشاہ کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟"

خادم نے عرض کیا "میں جھوٹ نہیں بول رہا، آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔"

آپ اٹھے اور اسی وقت بادشاہ کے روبرو حاضر ہو گئے۔

بادشاہ نے مصاحبین کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ سب باہر چلے گئے تو بادشاہ نے آپ سے پوچھا "تم دانشمند بنے بیٹھے ہو۔ میں تم سے پوچھتا ہوں تم یہاں دہلی میں کیا کر رہے ہو؟"

مولانا نے جواب دیا "میں لوگوں کو برائیوں سے روکتا ہوں اور اچھائیوں پر کاربند کرتا ہوں۔"

بادشاہ کو غصہ آ گیا، طنزاً پوچھا "کتنوں کو صبح لہ پر لگایا؟"

مولانا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میرے پاس اس کا کوئی حساب نہیں ہے اس لیے میں اس کا کوئی صحیح جواب نہیں دے سکتا۔"

بادشاہ نے سختی سے کہا "مولانا! ہوش میں آؤ اور یہ بات ذہن میں تازہ رکھو کہ اس وقت تم کسی معمولی آدمی سے باتیں نہیں کر رہے ہو۔"

مولانا نے جواب دیا "اور بادشاہ کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بھی کسی عام آدمی سے مخاطب نہیں ہیں۔"

بادشاہ عاجز آیا ہوا تھا، چیخ کر پوچھا "میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم دہلی میں کیا کر رہے ہو؟"

مولانا نے جواب دیا "میں بادشاہ کے اس سوال کا جواب پہلے ہی دے چکا ہوں، اس لیے بار بار ایک ہی بات کو نہیں دہرا سکتا اور میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ بادشاہ کے اس سوال کا مقصد کیا ہے؟"

بادشاہ نے کہا "تم کشمیر کیوں نہیں جاتے، وہاں جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں کے شہروں میں گھومو پھرو اور دیکھو کہ وہاں ایک خدا کے بجائے بتوں کی پرستش ہو رہی ہے۔"

مولانا نے کہا "اچھا اگر میں کشمیر چلا جاؤں تو؟ وہاں مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "تبلیغ۔ انہیں اسلام کی دعوت دو۔"

مولانا نے سکوت اختیار کیا۔

بادشاہ نے کہا "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ کشمیر جاؤ اور وہاں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دو۔"

مولانا نے جواب دیا "میں بادشاہ کے اس حکم پر عمل کر سکوں گا یا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ میں گھر جا کے کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا "میں تمہیں کشمیر جانے کا حکم دے رہا ہوں، کیا اس ملک میں کوئی ایسا شخص ہے جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے؟"

مولانا نے جواب دیا "حکم اللہ کا چلتا ہے انسان کے حکم کی حیثیت ہی کیا ہے بہر حال میں گھر جا کے کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

مولانا بادشاہ کے پاس سے چلے آئے۔

بادشاہ نے چند ملازمین کو بلایا اور ان سے پوچھا "کیا تم لوگ مولانا شمس الدین سے واقف ہو؟"

ان سب نے جواب دیا "خوب اچھی طرح، وہ واقعی سراج ملت ہیں ان کی علمیت کا کوئی جواب نہیں اور ان کی روشن ضمیری کا ایک زمانہ معترف ہے۔"

بادشاہ کو ان لوگوں پر غصہ آ گیا۔ بولا "میں نے تم لوگوں کو مولانا کی مدح سرائی کے لیے نہیں بلایا، اور ہمیں حیرت ہے کہ تم لوگ ایک ایسے شخص کی تعریفیں کر رہے ہو جو اس کا قطعاً مستحق نہیں۔"

ملازمین نے سکوت اختیار کیا۔

بادشاہ نے پوچھا "تم لوگ جانتے ہو کہ ہم نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "جب تک ہمیں بتایا نہ جائے کہ ہمیں کیوں بلایا گیا ہے ہم کس طرح بتا سکتے ہیں؟"

بادشاہ نے کہا "ہم نے مولانا شمس الدین کو حکم دیا ہے کہ وہ دہلی کی سکونت ترک کریں اور کشمیر چلے جائیں اور وہاں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیں۔"

بادشاہ کے ملازمین نے کہا "حضور والا! ہم ایک بار بادشاہ سلامت کو یہ باور کرائیں گے کہ مولانا کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اچھا ہے ورنہ مولانا کسی کا حکم نہیں مانیں گے۔"

بادشاہ نے چیخ کر کہا "کیسے نہیں مانیں گے ہمارا حکم۔ میں ان کا حاکم ہوں، اولی الامر منکم۔ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ اپنے حکم کی تعمیل کرالیں۔"

ملازمین نے پوچھا "حضور والا! ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ ہمیں کیوں یاد فرمایا گیا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا "ہم نے تم سب کو مولانا شمس الدین پر متعین کر دیا ہے جاؤ اور ان کے آس پاس موجود رہو اور انہیں یاد دلاتے رہو کہ میں نے انہیں کشمیر جانے اور فریضہ تبلیغ انجام دینے کا حکم دے رکھا ہے اس کی تعمیل ہونی چاہیے اور اگر وہ ٹال مٹول سے کام لیں گے، تو یہ ان کے حق میں بہت برا ہوگا۔"

ملازمین میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مولانا سے رُو در رُو بات کر سکتے۔ وہ چپ چاپ بادشاہ کے پاس سے چلے آئے اور مولانا کی خدمت

میں حاضری دی۔

مولانا نے پوچھا: "تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

ایک نے جواب دیا: "آپ کی خدمت کرنے۔"

مولانا نے کہا: "لیکن اس سے پہلے تو اس کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ آخر کیوں؟"

جواب ملا: "آج سے پہلے شاید ہمیں خدمت کی توفیق نہیں عطا ہوئی تھی۔"

مولانا نے پوچھا: "تمہیں بادشاہ نے بھیجا ہے، اس لیے کہ تم لوگ مجھے کشمیر جانے پر مجبور کر دو۔"

انہوں نے سر جھکا دیے، کہا: "جس بات کا حضورِ والا کو علم ہے اس پر ہماری لب کشائی فضول ہے۔"

مولانا نے پوچھا: "سچ بتاؤ بادشاہ نے تم سے کیا کہا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "بادشاہ نے کہا کہ ہم آپ کو کشمیر روانہ کر دیں تاکہ تبلیغِ اسلام کا فریضہ انجام دیا جائے۔"

مولانا نے خاموشی سے یہ سب کچھ سن کر سر جھکا لیا، فرمایا: "ہم بادشاہ کو پہلے ہی یہ بتا چکے ہیں کہ جب تک ادھر کا اشارہ نہیں ہوگا میں نہیں جاؤں گا۔"

ایک شاہی ملازمین نے پوچھا: "حضورِ والا! یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوگا کہ آپ کو اُدھر کا اشارہ مل گیا ہے؟"

مولانا نے جواب دیا: "میں خود جواب دوں گا۔"

کئی دن بعد بادشاہ نے اپنے ملازمین کو طلب کیا اور پوچھا: "کیا میرا حکم اس دنیادار درویش تک پہنچا دیا گیا؟ اس نے اس کا کیا جواب دیا ہے؟"

ایک نے جواب دیا: "بادشاہ سلامت! آپ کا حکم مولانا کو پہنچایا جا چکا ہے اور اللہ نے چاہا تو اس کا کوئی شاندار نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔"

بادشاہ نے کہا: "اگر وہ شخص میرا حکم نہیں مان رہا تو میں بھی اپنا حکم منوانا جانتا ہوں۔ تم لوگ ان کے پاس ایک بار پھر جاؤ۔ اور اس سے کہہ دو کہ آج دہلی کو اس کے وجود سے پاک ہو جانا چاہیے۔"

شاہی ملازمین منہ لٹکائے ایک بار پھر آپ کی خدمت میں پہنچے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔

آپ نے انہیں دیکھا اور فرمایا: "عزیزانِ گرامی! میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کشمیر چلا جاؤں لیکن آج میں نے اپنے شیخ کو خواب میں دیکھا میں نے دیکھا، مجھ کو میرے شیخ نے اپنی خدمت میں طلب فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب میں کشمیر نہیں جا سکتا۔"

شاہی ملازمین نے پوچھا: "حضرت! یعنی آپ کشمیر نہیں جائیں گے؟"

آپ نے فرمایا: "ہاں میں کشمیر نہیں جاؤں گا۔ اس لیے کہ مجھ کو میرے شیخ نے اپنے پاس بلایا ہے۔ اب میں کشمیر کے بجائے اپنے شیخ کے پاس چلا جاؤں گا۔"

شاہی ملازمین نے پوچھا: "ہم بادشاہ کو کیا جواب دیں گے؟"

مولانا نے فرمایا: "یہی۔ جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ میں اپنے شیخ کے پاس جانے والا ہوں۔"

شاہی ملازمین نے دبی زبان میں عرض کیا: "حضرت! ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر بادشاہ کو یہ احساس ہو گیا کہ ہم سب بے بس اور مجبور ہیں تو وہ ہماری جگہ بے ادبوں کو بھیج دے گا اور وہ آپ کی شان میں گستاخیاں کریں گے۔"

مولانا نے بڑے وثوق سے کہا: "تم لوگ بادشاہ کے پاس جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ وہ مجھے کشمیر نہیں بھیج سکتا۔"

شاہی ملازمین بادشاہ کے پاس گئے اور مولانا کا جواب بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔

بادشاہ نے پوچھا: "وہ کشمیر کیوں نہیں جائے گا؟ کیا اس کا یہ چھوٹا مدرسہ اس کو میرے حکم کی خلاف ورزی پر قائم رکھے گا؟"

شاہی ملازمین نے عرض کیا: "حضورِ والا! ان کے لہجے کا اعتماد یہ بتاتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی صداقت اس کی سچائی پر انہیں پورا یقین ہے۔"

بادشاہ نے چند سرکش اور تند خو ملازمین کو مولانا کی خدمت میں بھیجا۔ اس وقت مولانا بستر پر دراز آہستہ آہستہ کراہ رہے تھے۔ انہیں مولانا کے بستر کے قریب پہنچا دیا۔ مولانا نے مسکرا کر کہا: "وہ گئے تم آ گئے، کہو کیا بات ہے؟"

انھوں نے کہا: "ہمیں بادشاہ نے اس لیے بھیجا ہے کہ ہم تم سے معلوم کریں کہ آخر تم بادشاہ کی حکم عدولی کیوں کر رہے ہو؟"

مولانا شمس بولے۔" میں جس سفر پہ جارہا ہوں وہاں جانے سے مجھے نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہی ساتھ جاسکتا ہے۔ اگر بادشاہ سمجھتا ہے کہ اُس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مجھے اُس سفر پہ جانے سے روک سکتا ہے تو پھر وہ بھی اپنے دل کی حسرت پوری کرلے۔"

پھر آپ نے اُنھیں نزدیک بُلایا اور قمیص اُٹھا کر پیٹ پہ ایک پھوڑا سا دکھاتے ہوئے بولے" بادشاہ سے جاکر کہو کہ اُس کے جسم پر پروانۂ سفر کا ظہور ہوچکا ہے اور وہ کسی بھی دم اس دُنیا سے رُخصت ہوسکتا ہے۔"

شاہی ملازمین نے غور سے اُس پھوڑے کو دیکھا اور چُپ چاپ چلے گئے۔

بادشاہ کو جب اس امر سے مطلع کیا گیا تو اُس نے حقارت سے کہا" وہ صُوفی اَب مکر و فریب بھی کرنے لگا ہے۔ خیر میں جاکر خود ہی اُس کا جائزہ لیتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے کتنا بیوقوف بناسکتا ہے۔"

چنانچہ بادشاہ خود آپ کے حُجرے میں آیا اور آپ کا زخم دیکھنے کے بعد شاہی طبیب کو حُکم دیا کہ وہ اس زخم کا جائزہ لے کر بتائے کہ یہ کس قدر سنگین ہے۔ جرّاح نے بادشاہ کی موجودگی میں ہی زخم کا جائزہ لیا اور پھر افسردگی سے بولا۔

" بادشاہ سلامت! یہ درویش غلط نہیں کہہ رہا۔ واقعی یہ زخم اُس کی موت کا پروانہ ہے۔ یہ سرطان کی نشانی ہے اور کسی بھی وقت اس صُوفی کی جان جسم سے ناطہ توڑ سکتی ہے۔"

چنانچہ بادشاہ کو اَب کسی حد تک اطمینان ہوا اور وہ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ اُس حُجرے سے نکل کر اپنے پُرتعیش محل لوٹ گیا۔

بادشاہ کے اس طرزِ عمل سے مولانا شمس الدین کو بہت دکھ پہنچا۔ اَب آپ کی تکلیف میں بے پناہ اضافہ ہوچکا تھا۔ تکلیف برداشت کی حدود کو پھلانگنے لگی تو آپ نے اندازہ لگا لیا کہ اَب آخری وقت آن پہنچا ہے۔ آپ نے اپنے مُریدوں اور ارادت مندوں کو بُلایا اور نصیحت کرتے ہوئے فرمایا" میری بات غور سے سُن لو۔ شاید اب میرا تم سے پھر کبھی سامنا نہ ہوسکے۔ میں تمہیں اس بات کی تلقین کرتا ہوں کہ کبھی دین کا دامن نہ چھوڑنا اور سُنّتِ رسول ﷺ پر مکمل کاربند رہنا۔ دین کی رسمیں بھی ادا کرنا۔ دینی رُسوم سے فرار تمہارے لیے بربادی اور ذلّت کا باعث بنے گا۔"

لوگوں نے جب آپ کے مُنہ سے یہ باتیں سُنیں تو اُنھیں یقین آگیا کہ اَب مولانا شمس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ رونا شروع ہوگئے۔ وہ روتے جاتے اور آپ کی باتوں اور نصیحتوں کے جواب میں اقرار سے سر بھی ہلاتے جاتے۔

اس کے چند روز بعد آپ کا انتقال ہوگیا۔ سخت دِل بادشاہ کے سوا ہر شخص آپ کی جُدائی سے بے انتہا غمگین اور افسردہ ہوگیا۔

دنیا سے محبّت کا نتیجہ

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ تمھارے خلاف دنیا کی قومیں ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں گی، جس طرح بھوکے اپنے خوان کی طرف دعوت دیتے ہیں"۔ ایک پوچھنے والے نے دریافت کیا:" کیا یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اس زمانے میں ہم تعداد کے اعتبار سے کم ہوں گے؟" فرمایا:" نہیں، اُس زمانے میں تم بہت زیادہ ہوگے، لیکن اُس زمانے میں تمھاری حیثیت سیلاب کے رُخ پر بہنے والے خس و خاشاک کی ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں سے تمھاری ہیبت نکال دے گا اور تمھارے دلوں میں وھن پیدا کر دے گا۔ سوال کرنے والے نے دریافت کیا:" وھن کیا ہے؟" ارشاد ہوا:" دنیا کی محبت اور موت سے کراہت و نفرت"۔ (ابوداؤد)

خواجہ حسین ناگوری

دربار

عقیدت مندوں سے بھرا پڑا تھا۔ لوگ بڑے اہتمام سے وعظ سن رہے تھے۔ مُریدوں کا جوش اور ولولہ قابلِ دید تھا۔ ایک بزرگ شیخ کبیر اسرار و رموز کے پردے اُٹھانے میں مشغول تھے۔ پہلے تو آپ کافی دیر تک حقوق العباد پر لوگوں کو درس دیتے رہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص کسی دوسرے کی حق تلفی کرے گا قیامت کے روز اللہ کے دربار میں اُس سے جواب طلبی ہوگی اور وہ سخت سے سخت سزا پائے گا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ دوسروں کو گالیاں دینا، کسی کے جسم یا اُس کے کسی عضو کو نقصان پہنچانا بھی ظلم کے مترادف ہے۔ اس پر محفل میں ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور انتہائی ادب سے بولا: "یا شیخ! آپ نے مذہب کی حق تلفی کے بارے میں جو فرمایا ہے اُس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔" اس پر شیخ کبیر نے اُس شخص سے پُوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔

اُس شخص نے کہا کہ آپ کے سوال کا میری ذات سے کیا تعلق ہے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ اس پر شیخ کبیر نے فرمایا۔ اے شخص! تیرے سوال سے حمید الدین ناگوری کی بُو آرہی ہے۔ یہ سُن کر وہ شخص تھر تھر کانپنے لگا اور بولا حضرت! آپ نے تو کمال کر دیا مگر آپ جس کو جانتے ہیں اُس سے اُس کا تعارف کیوں دریافت فرما رہے ہیں۔

شیخ نے مسکراتے ہوئے حسین ناگوری کو اپنے پاس بُلایا اور گلے لگاتے ہوئے فرمایا۔ بابا حسین! تم نے کیا پوچھا تھا ذرا اُونچی آواز میں ایک بار پھر اپنا سوال دہراؤ۔

نوجوان نے کھڑے ہو کر پھر اپنا سوال دہرایا، دراصل مَیں نے یہ پُوچھا تھا کہ دین اور مذہب میں بھلا کس طرح حق تلفی ہوتی ہے۔

شیخ نے جواباً فرمایا۔ بابا حسین اور اہلِ محفل! اگر کوئی شخص راسخ العقیدہ مسلمان کو بُرائی اور گمراہی کی دعوت دے اور اس کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے گمراہی کے گڑھے میں لے جائے تو اسے دین کی حق تلفی کہا جائے گا اور اللہ ایسے بہکانے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

سامعین نے واہ واسبحان اللہ کی صدائے تحسین سے اپنے پیر مرشد کی تعریف کی اور نوجوان حسین کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔
یہ نوجوان جو شاید ناگور سے چل کے پہلی بار اس مجلس میں شریک ہوا تھا، شیخ کی نظروں میں اتنا برگزیدہ اور عزت دار ہو گیا تھا کہ آپ نے اس کو ہجوم سے بلوا کے اپنے سینے سے لگایا اور اپنے پاس بٹھایا۔

نوجوان حسین نے شیخ سے عرض کیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو اس ضمن میں کچھ یہ ناچیز بھی عرض کر دے۔"
شیخ نے جواب دیا۔ "بالکل، بالکل۔ اجازت ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"
نوجوان حسین نے جواب دیا۔ "آج کل بعض واعظین بھی حق تلفیاں کرتے ہیں۔"
شیخ نے پریشان ہو کے پوچھا۔ "وہ کس طرح ہے کیا ان میں میں بھی شامل ہوں؟"
حسین نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں آپ ان میں شامل ہیں یا نہیں لیکن دوسرے بہت سے واعظین ان میں ضرور شامل ہیں۔"
شیخ کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، پوچھا۔ "بابا حسین! کس طرح، کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"
حسین نے جواب دیا۔ "شیخ! وہ واعظین جو اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت اور خوف و خشیت کے پہلو کو دبا کر اس کی رحمت اور مغفرت کے پہلو کو ابھار دیتے ہیں، یہ بندوں کی حق تلفی کرتے ہیں کیونکہ اس سے لوگوں میں معصیت کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔"
شیخ تو وارد نوجوان حسین کی باتوں سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ "حسین اپنے جد اعلیٰ حمید الدین سوالی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ ایسی بچی تلی اور برعزم باتیں حمید الدین سوالی کا خون ہی کر سکتا ہے۔"

حسین نے کہا۔ "شیخ! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا اب آپ اپنا وعظ جاری رکھیں۔"
شیخ نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ "تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں سے ایک دفتر ایسا ہے جو بخشا نہیں جا سکتا، اور یہ ہے کفر و شرک کا دفتر۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں معاف کرے گا۔ دوسرا دفتر وہ ہے جو بخشا جا سکتا ہے اور اس دفتر کا تعلق ہے ان حقوق اور فرائض سے جو اللہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بندوں پر فرض ہیں۔ تیسرا دفتر وہ ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا اور یہی وہ دفتر ہے جس کا تعلق بندوں سے ہے یعنی بندوں کے حقوق بندوں پر۔ اگر کسی بندے کے حقوق تلف کیے گئے ہیں تو اللہ انھیں معاف نہیں کرے گا جب تک متعلقہ بندہ یا بندے خود معاف نہ کر دیں۔ ایک بار رسول اللہ نے فرمایا کہ اے لوگو! کیا تمھیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟ آپ کے صحابیوں نے جواب دیا کہ ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ساز و سامان۔
آپ نے فرمایا، ہاں دنیا کی نظروں میں یہی مفلس ہوگا لیکن میری اُمت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور حج و زکوٰۃ اپنے ساتھ لائے گا مگر اس حال میں کہ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر اتہام لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا تو ان میں سے ہر ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی اور اگر تمام مطالبات پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ اس نمازی، روزے دار، حاجی اور زکوٰۃ ادا کرنے والے پر ڈال دیا جائے گا جس نے ان کے حقوق تلف کیے ہوں گے اور یہ مفلس شخص جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔"
مجلس میں سناٹا طاری تھا۔ اس پُراثر واعظ نے سامعین کو خوفزدہ کر دیا۔ ان کے دل و دماغ میں خشیت الٰہی نے جگہ بنالی تھی۔ ان میں بعض تو اپنے گھٹنوں میں سر ڈالے زار و قطار رو رہے تھے۔ انھیں اپنا ماضی اپنا کردار یاد آ رہا تھا اور وہ حق تلفیاں جو نادانستگی میں ان سے سرزد ہو چکی تھیں۔ اس ہنگامہ خیز واعظ نے سننے والوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا اور انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان لوگوں سے معافیاں مانگیں گے، جن کی ان سے حق تلفیاں ہو چکی ہیں اور اس وقت تک معافی مانگتے رہیں گے جب تک انھیں معاف نہیں کر دیا جائے گا۔
شیخ کو حسین ناگوری بہت اچھے لگے تھے۔ انھوں نے تخلیے میں حسین سے پوچھا۔ "بابا حسین! اب تم کہاں جاؤ گے؟"
حسین نے جواب دیا۔ "حضرت! ناگور سے چل کے گجرات آیا ہوں، اب یہاں سے کہاں جاؤں گا؟"
شیخ بہت خوش ہوئے، بولے۔ "حسین! تم یہاں رہو، میرے بیٹے کی طرح، صالح، نیک اور جانشین بیٹے کی طرح، میں تم پر فخر کر سکوں گا۔"
اس وقت تک حسین نے باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ شیخ نے انھیں ظاہری علوم کے ساتھ ہی باطنی علوم کا درس دینا شروع کر دیا۔ اکتساب علوم کا یہ حال تھا کہ شیخ حیران رہ جاتے، انھیں ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ حسین کو وہ پڑھا نہیں رہے ہیں بلکہ پڑھے ہوئے اسباق کی نظر ثانی کرا رہے ہیں۔ آخر کچھ عرصے بعد شیخ نے ان سے کہہ دیا۔ "بابا حسین! میں تمھیں کیا پڑھاؤں، ایسا لگتا ہے گویا سب کچھ تو

تمہارا پڑھا ہوا ہے۔"

حسین نے عاجزانہ عرض کیا۔ "حافظے اور مذاق نے آپ کو مغالطے میں ڈال دیا ہے، ورنہ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی حاصل کر رہا ہوں آپ ہی سے حاصل کر رہا ہوں۔"

شیخ نے اپنے ہونہار مرید میں تقریر اور وعظ کی زبردست صلاحیت اوّل دن ہی سے محسوس کر لی تھی۔ یہ جب کسی موضوع پر بولتے تھے تو موتی رولتے چلے جاتے تھے۔ لفظوں کا برمحل اور مناسب ترین انتخاب اور استعمال ان کے مافی الضمیر کی شاندار ترجمانی کرتا تھا۔ بعض مریدوں کو شیخ کی خصوصی توجہ گراں گزرتی تھی اور وہ آپس میں بیٹھ کر حسین اور شیخ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

کسی مرید نے دوسرے سے پوچھا۔ "کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ شیخ اس نووارد اور اجنبی نوجوان پر اتنے زیادہ کیوں مہربان ہیں؟"

کسی دوسرے مرید نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں خوب جانتا ہوں۔"

پہلے مرید نے پوچھا۔ "تب پھر چپ کیوں ہو، بتاؤ نا ذرا، میں بھی تو وہ خاص بات سنوں جس نے حسین کو شیخ کی نظروں میں تارا بنا کے رکھ دیا ہے۔"

دوسرے مرید نے جواب دیا۔ "سنتے ہیں، حسین مشہور صوفی شیخ حمید الدین ناگوری سوالی کے اخلاف میں سے ہیں، بس یہی نسبت خاص ان کے لیے کافی ہے۔"

ایک اور مرید سرد آہ بھر کے بولا۔ "اے کاش ہم بھی کسی مشہور خانوادے یا مشہور شخص کے بیٹے ہوتے، ہمیں بھی یہی عزت اور توقیر حاصل ہو جاتی۔"

یہ باتیں شیخ کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک دن آپ نے ایسے تمام مریدوں کو اپنے سامنے بٹھایا اور ان سے پوچھا۔ "ہم نے سنا ہے تم سب آپس میں یہ پوچھتے رہتے ہو کہ میں خواجہ حسین کو اتنی زیادہ اہمیت اور عزت کیوں دیتا ہوں۔"

مریدوں کے چہرے فق ہو گئے اور ان میں سے اتنی جرأت کسی ایک میں بھی نہ تھی کہ وہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیتا کہ ہاں ہم وہ وجہ خصوصیت اور اہمیت جاننا چاہتے ہیں، جس کی وجہ سے آپ نے اس نووارد کو اپنے سر چڑھا لیا ہے اور اپنے دل میں بٹھا لیا ہے۔

شیخ اپنے معترض مریدوں کی شکلیں دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد انھوں نے اپنے معترض مریدوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ کمالِ محبت پر تقریر کرے، ایسی تقریر جو وعظ بن جائے، وعظ کہلائے۔

وہ مرید کھڑا ہو گیا، کچھ دیر کھنکار کھنکار کے اپنا گلا صاف کرتا رہا اور بار بار یہی کہتا رہا کہ "معزز سامعین! کمالِ محبت کہتے ہیں اس جذبے کو جو ہو..." اور اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی ہو۔

آپ نے ایک دوسرے مرید کو حکم دیا۔ "تم وعظ شروع کرو، شکل کیا دیکھتے ہو؟"

یہ مرید بھی کھڑا ہو گیا، اس نے بھی بولنے کی بار بار کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا، وعظ کے لیے اس کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

اب شیخ نے سبھی کو مخاطب کیا اور فرمایا۔ "تم میں کوئی ایسا ہے جو کمالِ محبت پر لب کشائی کر سکے؟"

مریدوں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اور ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو سامعین کو مسحور اور از خود رفتہ کر دیتا۔

آخر خواجہ حسین کا نمبر آ گیا، مرشد نے انھیں مخاطب کیا اور کہا۔ "بابا حسین! خاموش کیوں بیٹھے ہو، آؤ اور میری طرح انھیں بھی مسحور کر دو۔"

حسین اپنی جگہ سے اٹھے اور پیر مرشد کے قدموں میں کھڑے ہو گئے —— دل و دماغ میں اتر جانے والی نگاہ سامعین پر ڈالی اور بولنا شروع کر دیا۔ "سامعین کرام! کیا آپ جانتے ہیں کہ محبت اور ملکیت ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اپنی جان، اپنا مال اور اپنا نفس سب کچھ اس کے حوالے کر دیتا ہے، وہ اللہ کے تصرفات پر اعتراض نہیں کرتا۔ اللہ کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے اسے قبول کر لیتا ہے، ایک سمت (یعنی اللہ) کے سوا جملہ سمتیں اس کے لیے بند ہو جاتی ہیں۔ اے اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والے! جب تک تیرے حق میں جملہ اطراف مسدود ہو کر صرف ایک طرف باقی نہ رہ جائے گی تیری محبت کامل نہ ہو گی۔ جب محبت رگ رگ میں سما جاتی ہے اس وقت کسی کی نصیحت ایسی لگتی ہے گویا ٹھنڈے لوہے پر چوٹ لگائی گئی ہو۔ نصیحت بے کار و بے اثر ہو جاتی ہے۔"

حسین کی تقریر سننے والوں کے دلوں میں اترتی جا رہی تھی، اچانک تقریر نے ایک عجیب انداز اختیار کر لیا۔ حسین اپنی تقریر کے

نشے میں ڈوب چلے تھے' وہ کہہ رہے تھے "اے اللہ! ہمیں اپنی رحمت سے مایوس نہ کر کیونکہ اس صورت میں ہم دنیا اور وجود کے دریا میں ڈوب جائیں گے۔ اے کرم، عقل اور تقدیر کے بخشنے والے! ہمیں سہارا دے۔ اور اے وہ شخص جو میری باتیں سن رہا ہے' میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا تو میری باتوں پر عمل کرے گا؟ عمل تو تو اس وقت کرے گا جب تو میری باتیں سمجھے گا لیکن میں جانتا ہوں کہ تو مجھ سے حسنِ ظن نہیں رکھتا۔ جب تو مجھ سے حسنِ ظن رکھے گا تو میری بات بھی سمجھے گا لیکن جب حسنِ ظن ہی نہیں اور میں جو کچھ کہتا ہوں' اس پر تیرا یقین ہی نہیں تو پھر تو میری بات کس طرح سمجھے گا؟ تو بھوکا ہے اور میرے سامنے کھڑا ہے' تو میرے ساتھ کھانے میں نہیں شریک ہوتا۔ پھر تیرا پیٹ کیونکر بھرے گا؟

لوگو! تم بیمار ہو مگر خوش فہمی سے خود کو تندرست سمجھتے ہو۔ تمہارے پاس کھوٹ ہے مگر تم اس کو اصل اور جوہر سمجھتے ہو۔ تم جھوٹے ہو مگر خود کو سچا سمجھتے ہو۔ میرا تمہارے ساتھ یہی کام ہے کہ میں تم کو جھوٹ سے منع کروں اور سچ کی تلقین کروں۔ تم مجھ سے پوچھو گے کہ سچ کیا ہے اور میں اس کو کس طرح پرکھتا ہوں۔ تو سنو میری باتیں بہت غور سے سنو۔ میرے پاس تین کسوٹیاں ہیں۔ کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے لیے۔ اللہ کی کتاب' رسول اللہ کی سنت اور میرا قلب۔ آخری کسوٹی یعنی قلب پر عکس پڑتا ہے' قلب اس وقت تک مطمئن اور راضی نہیں ہوتا جب تک کتاب اور سنت سے اس کی تصدیق نہیں ہو جاتی۔ سامعین کرام! علم پر عمل کرنا علم کا تاج ہے۔ علم پر عمل کرنا علم کا نور ہے۔ صفائی کی صفائی' جوہر کا جوہر اور مغز کا مغز ہے۔ علم پر عمل کر کے قلب پاک صاف ہو جاتا ہے۔ جب قلب درست ہوتا ہے تو بقیہ اعضاء بھی درست اور پاک وصاف ہو جاتے ہیں۔ جب قلب کو خلعت (تقویٰ) عطا ہوتا ہے تو جسم کو بھی خلعت مل جاتا ہے۔ جب گوشت کے اس ٹکڑے کی اصلاح ہو جاتی ہے تو بدن کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ قلب کی صحت اس باطن کی صحت پر موقوف ہے جو پروردگار اور انسان کے درمیان ہے۔ باطن پرندہ ہے اور دل اس کا پنجرہ' دل پرندہ ہے تو بدن اس کا پنجرہ' قبر ساری مخلوق کا پنجرہ ہے کیونکہ انجام کار سبھی کو اس میں جانا ہے۔"

حسین کے وعظ نے ہر دل پر ایک سحر طاری کر دیا تھا۔ آج ان کے مخالفین اور حاسدین کو ان کے مرتبے اور مقام کا صحیح اندازہ ہوا تھا۔

شیخ بھی اس سحر میں گرفتار تھے۔ جب سکوت ہوا تو انھیں ہوش آیا اور انھوں نے حاضرین سے پوچھا "تم لوگ اب حسین کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

کئی مریدوں نے کھڑے ہو کر معافی مانگی اور کہا "بخدا ہمیں حسین کی اس عظمت کا کوئی علم ہی نہ تھا' آج ہم بہت شرمندہ ہیں۔"

شیخ نے جواب دیا "شرمندہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں' بابا حسین بہت نیک ہے' اس سے معافی مانگ لو' معاف کر دے گا۔ تم لوگوں نے اس کا بہت دل دکھایا ہے اب اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ تم اس شریف انسان سے معافی مانگ لو۔"

معافی چاہنے والوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور معافی مانگنے لگے۔ آپ نے ہر شخص کو بہت آسانی سے معاف کر دیا۔

شیخ نے ان سے کہا "بابا حسین! میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ خدا نے تمھیں جو کچھ دے رکھا ہے وہ کافی ہے اور میں اس میں مزید اضافہ نہیں کر سکتا۔"

حسین اپنے پیر مرشد کی منشا سمجھ گئے' پوچھا "پھر اب میں کہاں جاؤں؟"

شیخ نے جواب دیا "پہلے اجمیر جاؤ اور سلطان الہند کے دربار میں حاضری دو' وہی تمہارے جدِ اعلیٰ کے مرشد تھے وہیں سے تمھیں کل کے لیے حکم اور اجازت ملے گی۔"

ان کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اپنے شیخ سے جدا ہوں لیکن مرشد کی ایما پا لینے کے بعد وہ گجرات میں مزید رک بھی نہیں سکتے تھے۔ چپ چاپ اجمیر کے لیے روانہ ہو گئے۔

خواجہ حسین اجمیر پہلی بار جا رہے تھے۔ آپ اس مشہور اور مقدس جگہ کے لیے اپنے دل میں بے پناہ جذبۂ عقیدت محسوس کر رہے تھے۔ ان دنوں یہ جگہ زیادہ آباد نہیں تھی۔ آپ ایک جنگل کے کنارے پر تنہا چھوڑ دیے گئے۔ جس قافلے نے آپ کو یہاں تک پہنچایا تھا' اس نے اس جنگل کے پاس سے اپنا راستہ بدل دیا تھا۔ قافلے والوں نے اس جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جناب! اس جنگل کے اس پار اجمیر ہے اور قافلہ اس جنگل میں نہیں جائے گا۔"

خواجہ حسین نے پوچھا "کیوں' اس جنگل میں کیا خاص بات ہے؟"

میرِ قافلہ نے جواب دیا "یہ جنگل درندوں کا مسکن ہے اس لیے انسان اس جنگل میں نہیں جاتے۔"

خواجہ حسین نے اس ہرے بھرے گھنے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: "کیا اجمیر میں داخلے کا اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے؟"
میرِ قافلہ نے جواب دیا: "ہاں کئی راستے ہیں لیکن ہر راستے میں اس قسم کا جنگل ضرور ہے اور یہ جنگل درندوں کے مسکن ہیں۔"
خواجہ حسین نے قافلے والوں کو چھوڑ دیا اور جنگل کی طرف جاتے ہوئے بولے: "جنگل میں شیر ہوں یا بھیڑیے مجھے تو خواجہ معین الدین چشتی کے دربار میں حاضری دینا ہی ہے۔"
میرِ قافلہ نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، بولا: "جوان انسان! تو مجھے ضرورت سے زیادہ ناعاقبت اندیش نظر آتا ہے، درندے تجھے کھا جائیں گے۔"
انھوں نے جواب دیا: "میں جس کے دربار میں جا رہا ہوں، وہ ہندوستان کا سلطان ہے اور اس سلطان کا اقبال ہر جگہ کارفرما ہے یہاں تک کہ جنگل کے درندے بھی اس کا احترام کرتے ہیں، اللہ نے چاہا تو میں اس سلطان کے اقبال کے زیرِ سایہ بحفاظت اجمیر میں داخل ہو جاؤں گا۔"
قافلے والے افسوس ہی کر سکتے تھے، وہ افسوس کرتے رہے اور آپ اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ خودرو درختوں اور پودوں کی جھاڑیاں ان کا راستہ روک رہی تھیں اور بڑے بڑے اونچے اونچے گھنیرے درختوں نے شام کی سیاہی جیسا اندھیرا پھیلا رکھا تھا۔ یہاں کہیں اور کسی طرف سے بھی ان پر حملہ ہو سکتا تھا، احتیاط اور حفاظت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔
چلتے چلتے جب کچھ تکان محسوس ہوئی تو آپ ایک درخت کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پُرلطف ہواؤں نے سکون پہنچایا اور ان کی آنکھ لگ گئی، کچھ دیر بعد پرندوں کے شور سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ انھیں اپنے قریب ہی کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ آس پاس کا جائزہ جو لیا تو دیکھا ان سے دس بارہ قدم دور ایک شیر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے آس پاس درختوں پر پرندے شور کر رہے ہیں۔ جب یہ شیر کی طرف دیکھ رہے تھے تو شیر نے بھی ان کی طرف دیکھا۔ اس کی لاتعلقی بتا رہی تھی کہ اس کو حسین کی کوئی فکر نہیں اور نہ وہ حسین میں کسی قسم کی دلچسپی لے رہا ہے۔ حسین اٹھ کر بیٹھ گئے اور شیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "میں نہیں جانتا کہ تو یہاں کیوں

رحمت للعالمین

آج کے مسلمانوں کو مت دیکھیے آج کی پوری دنیا کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھیے اور قرآن سے قبل کی دنیا کا جائزہ لیجیے۔ دنیا اسی بہاؤ میں بہتی نظر آئے گی جسے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہایا تھا۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے لیے علم و عمل کے نئے سرچشمے کھول گئے ہیں اور دنیا کو غور و خوض کی بالکل نئی شاہراہیں دکھا گئے ہیں۔ انسان اور انسانیت کی ترقی کی وہ کون سی چیز ہے جس کی ابتدا حضورؐ نے نہیں کی۔ غلامی کا سدباب سب سے پہلے حضور (صلعم) کے ہاتھوں ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام سب سے پہلے حضورؐ کے ہاتھوں مٹا۔ نسلی اور جغرافیائی امتیازات کا سب سے پہلے حضورؐ نے خاتمہ کیا۔ اکتسابِ علم کی طرف سب سے پہلے حضور (صلعم) نے متوجہ فرمایا۔ دنیا کو ایک مرکز پر آنے کی سب سے پہلے حضور (صلعم) نے دعوت دی۔ وغیرہ وغیرہ۔ جذبات کو تھوڑی دیر کی چھٹی دے دیجیے۔ اور طالب علم کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کا اور حضورؐ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے۔ حضور (صلعم) ہمیں وہ مسلک عطا کر گئے ہیں جس کا خلاصہ باہمی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت ہے اور جس نے دنیا اور آخرت میں سنگم پیدا کر دیا ہے۔ حضور (صلعم) نے ڈرائنگ روم شاہت اور پاپائی قسم کی مذہبی پیشوائی کی جڑیں اس وقت کھود دیں جب ان باتوں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ حضور (صلعم) نے اور حضور (صلعم) کی تربیت کی ہوئی جماعت نے اپنی بجائے اللہ کی حکومت قائم کی تھی۔ بقول ایک یورپین مصنف کے "لفظ اسلام میں تمام فرائض انسانیت سمیٹ دیے گئے ہیں۔"

جاتا ہے مگر تیری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ہندوستان کے بادشاہ خواجہ معین الدین سنجری چشتیؒ کے دربار میں جا رہا ہوں۔"
اپنی باتوں کے دوران حسین کو یہ احساس ہوا کہ ان کے گرد و پیش شیر کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ ان کی تیز اور تجسس نگاہوں نے ان بھیڑیوں، چیتوں اور دوسرے درندوں کو بھی دیکھ لیا جو شیر کے آس پاس اس سے دور گویا موقع کی تلاش میں کھڑے تھے، لیکن شیر کی موجودگی انھیں آگے نہیں آنے دے رہی تھی۔

حسین کو پہلے تو کسی قدر خوف سا محسوس ہوا مگر پھر اللہ کو اپنے دل میں بسا کے اور اس کا نام لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھیں شیر کے پاس سے گزرنا تھا۔ حسین نے شیر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا: "اے درندے! مجھے نہیں معلوم کہ تو کس کے حکم اور کس نیت سے یہاں آیا ہے لیکن میں اپنی نیت سے آگاہ ہوں۔ میں اللہ کا بندہ اللہ ہی کے حکم سے ہند کے سلطان کے دربار میں جا رہا ہوں، اگر تجھ کو اللہ کی طرف سے یہ حکم مل چکا ہے کہ تو مجھے ہلاک کر کے اپنی غذا بنا لے تو میں راضی بہ رضائے الٰہی ہوں۔ تو اپنا کام کر، میں دم بھی نہ ماروں گا اور اگر تجھ کو میری ہلاکت اور تغذیہ کا حکم نہیں ملا ہے تو مجھ کو جانے دے اور دوسرے درندوں سے میری حفاظت کر۔"

اتنا کہہ کے آپ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ شیر بھی آپ کے آگے آگے چلنے لگا، شیر کی موجودگی میں کسی بھی درندے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حسین کے قریب آتا۔

حسین اس خطرناک جنگل سے بخیر و خوبی اور آرام سے صاف نکل گئے، اب اجمیر ان کے سامنے تھا۔ یہاں حضرت خواجہ کے مزار پر اس وقت تک کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے مزار پر حاضری دی اور دست بستہ عرض کیا: "حضرت! میرے جد اعلیٰ حمید الدین ناگوری آپ کے مرید تھے۔ انھوں نے آپ سے فیض پایا، اب میں آپ کے پاس امید کرم لے کر حاضر ہوا ہوں، مجھ پر بھی لطف و کرم کی پھوار پڑ جائے، آپ کی نوازش زبان زد خلائق ہے۔"

آپ نے خواجہ غریب نواز کے روضے کی تعمیر کا آغاز کیا۔ آپ نے روضے کی عمارت کی بنیاد ڈالی اور محنت و مشقت کے دوران فرماتے تھے:
"یہ کیا بات ہے کہ سلطان الہند کی آخری آرام گاہ یوں بے عمارت رہے۔"

آپ اس عمارت کی جتنی تعمیر تن تنہا کر سکتے تھے، کرتے رہے۔ خواجہ حسین کے شیخ نے ان سے کہا تھا کہ تمھیں اب جو کچھ ملے گا اجمیر سے ملے گا۔ چنانچہ خواجہ حسین اللہ سے لو لگائے، خواجہ کے در پر پڑے ہوئے تھے۔

دوپہر کی شدید گرمی میں خواجہ حسین نے چند مسافروں کو پانی پلایا اور پھر عمارت کے طاق میں اور دیواروں پر پرندوں کے لیے پانی سے بھرے پیالے رکھ دیے۔ دھوپ اور گرمی کے ستائے ہوئے پرندے اس پانی سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ اس دن دوپہر کے بعد ظہر کی نماز حضرت خواجہ کے مزار کے پاس ادا کی اور وہیں قدموں میں سو گئے۔ خواجہ حسین کو ایسا لگا گویا وہ سو نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے خواب میں دیکھا، حضرت خواجہ غریب نواز ان کے پاس کھڑے انھیں غور سے دیکھ رہے ہیں۔ خواجہ حسین ادب سے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا، خواجہ غریب نواز نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: "خواجہ حسین! تو نے جس طرح ہماری خدمت کی ہے، خدا اس کا شاندار اجر عطا فرمائے گا۔"

خواجہ حسین نے عرض کیا: "حضرت! میں تو گجرات کے شیخ کبیر کے پاس گیا تھا۔ ان سے میں نے فیض بھی حاصل کیا لیکن بعد میں انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اجمیر جاؤں، چنانچہ میں آ گیا اور اب آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

حضرت خواجہ اجمیری نے فرمایا: "بابا حسین! اچھا کیا جو یہاں آ گئے، کچھ دن یہیں میرے قریب رہو، اس کے بعد اپنے وطن ناگور چلے جانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ناگور ہی کو پسند فرمایا ہے، وہیں جا کے رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کرنا۔"

خواجہ حسین نے عرض کیا: "حضور بندہ نواز! بندے کی تو یہ خواہش تھی کہ اسے یہیں اجمیر ہی میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔"
جواب ملا: "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو ناگور جائے گا اور وہاں کے لوگوں کو اپنی تعلیمات سے فائدے پہنچائے گا۔"

خواجہ حسین کو اس وقت جتنا سکون اور جتنی خوشی میسر آ رہی تھی، وہ ناقابل بیان تھی۔ پورا ماحول پوری فضا مہک رہی تھی، ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی، ایک کیف ایک نشہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ان کا پورا وجود اس کیف اس نشے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ خواجہ حسین نے ایک بار پھر عاجزی سے عرض کیا۔

"حضرت! مجھے اجمیر ہی میں رہنے دیجیے، اس مقدس اور پاک بستی میں۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میری آنکھوں کا تارا اور دل کو پیارا ہے۔"
خواجہ غریب نواز نے جواب دیا: "صاحبزادے! مشیت ایزدی نے تیرے لیے ناگور کو مخصوص کر دیا ہے۔ اب اس زمین میں تو پہنچے گا اور سلوک کی راہ طے کرے گا۔ جا، ناگور جا، تیرے ہم وطن تیرا انتظار کر رہے ہیں اور اپنی محنت اور ریاضت سے تو نے جو کچھ یا جتنا کچھ حاصل کر لیا ہے اس سے اہلیان ناگور ہی کو فیض پہنچنا چاہیے۔"

خواجہ حسین نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ اسی وقت آنکھ کھل گئی وہاں وہ تنہا پڑے ہوئے تھے اور وہاں کی فضا خوشبو سے مہک رہی تھی۔

اب انہیں ناگور جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ خواجہ حسین نے یہاں کچھ دن مزید قیام کیا اور پھر ناگور چلے گئے۔ ناگور والوں کو آپ کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی یہاں آپ نے شادی بھی کر لی اور پہلے سے بھی زیادہ ریاضت کرنے لگے ان کی شہرت دور دور تک پھیلتی جا رہی تھی ناگور والے آپ پر جان چھڑکتے تھے۔

کچھ دنوں بعد خواجہ حسین نے اپنے ارادت مندوں سے مشورہ کیا، کہا۔ "دوستو جیسا کہ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں مولانا حمید الدین سوالی کی نالائق اولاد ہوں۔"

آپ ابھی یہیں تک ہی کہہ سکے تھے کہ ایک ارادت مند کھڑا ہو گیا۔ بولا "شیخ! آپ کا جو منصب ہے وہ آپ کو جھوٹ نہیں بولنے دے گا کیا آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ آپ نے ہم سے یہ تعارف کیوں نہیں کرایا تھا کہ آپ حضرت حمید الدین ناگوری سوالی کی اولاد میں سے ہیں۔ اور یہ کہ....."

آپ نے اس کی بات کاٹ دی، فرمایا "اے بھولے بھالے انسان! مجھے ذاتی طور پر وہ تعارف پسند نہیں جس میں کسی کی تعریف و توصیف اس کے اعلیٰ خاندان اور ولی صفت انسانوں کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ حالانکہ کسی کا صحیح تعارف یہ ہے کہ انسان کی شناخت اور پہچان اس کے اپنے نام اور کام کے حوالے سے کی جائے۔"

آپ کے ارادت مند آپ کی باتوں سے اس حد تک متاثر اور مرعوب تھے کہ اب ان میں سے کسی کی بھی بولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا "لوگو! میں اپنی بات کو بلاوجہ کیوں طول دوں، میں اپنے جد امجد کا عرس کرنا چاہتا ہوں اور لوگوں کو اس عرس کا کھانا کھلانا چاہتا ہوں کیونکہ اس وقت میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کے لطف و کرم سے ہوں۔"

کئی مریدوں نے بڑی سرگرمی اور جوش سے جواب دیا "آپ یہ عرس ضرور کریں، ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ ہم سے جو خدمت لینا چاہیں ہم انجام دینے کو تیار ہیں۔"

آپ نے مریدوں اور ارادت مندوں کی سرگرمی اور جوش کو دیکھتے ہوئے شاندار عرس کی تقریب منعقد کر دی۔ اس تقریب میں آپ نے اپنی طرف سے جو کھانا تیار کرایا تھا وہ تو تھا ہی، اس کے علاوہ ناگور والوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان لوگوں نے چاول اور ساگ کی کئی دیگیں اپنی طرف سے پکوائی تھیں۔ پورا ناگور اور قرب و جوار کے لوگوں نے اس کھانے کو جی بھر کے کھایا۔ آپ نے اس روز روزہ رکھ لیا تھا اور اس کھانے میں سے اپنا حصہ الگ کر کے اپنی افطار کا بندوبست کر لیا تھا۔

شام کو افطار سے کچھ دیر پہلے چار اجنبی آپ کے پاس آئے اور دور ہی سے آواز بلند کی "خواجہ حسین کہاں ہیں؟ ذرا انہیں بلوا تو"۔ خواجہ حسین اندر افطار کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ جب آپ نے یہ آواز سنی تو کسی مرید سے کہا "باہر جا کے دیکھنا تو سہی یہ کون لوگ ہیں؟ کہتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

مرید باہر گیا تو وہاں چار اجنبی چہرے اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ مرید نے پوچھا "تم لوگ کون ہو؟"

ایک نے جواب دیا "اللہ کے بندے"

مرید نے دوسرا سوال کیا "کہاں سے آئے ہو؟"

دوسرے نے جواب دیا "اللہ کے شہر سے"

مرید نے تیسرا سوال کر دیا "کیوں آئے ہو؟"

تیسرے نے جواب دیا "اللہ کے ایک نیک بندے سے ملاقات کرنے"

مرید نے کہا "تب پھر تم لوگ اللہ کے اس نیک بندے کا انتظار کرو، افطار اور نماز کے بعد ملاقات ہو جائے گی"

چوتھے نے طنزاً کہا "واہ! یہ کیا بات ہوئی، اللہ کا نیک بندہ اکیلے اکیلے افطار کرے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا ہم بھی تو اس کے پاس بھوکے آئے ہیں۔ اس سے کہہ دو کہ یہ مروت سے بعید ہے ملنا ہے تو ابھی ملے۔ اس کے بعد تو ہم خود نہیں ملیں گے"

مرید نے ان چاروں میں ایک مرض مشترک دیکھا یہ چاروں کسی جلدی مرض میں مبتلا تھے اور ان کے ہاتھ قطعی اس لائق نہیں تھے کہ کوئی صحت مند انسان ان کے پاس یا ان کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھا سکے۔ مرید نے سوچا ان چاروں کو مرشد سے نہیں ملوانا چاہیے بلکہ یہیں سے ٹال دینا چاہیے۔ چنانچہ مرید نے کہا "صاحبان! آپ کے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ کچھ توقف فرمائیے، اب گیا افطار اور کھانے کا وقت

ں کا انتظام میں خود کر دوں گا۔"
ایک نے ذرا بے مروتی اختیار کی، بولا "تو کون ہوتا ہے بچر مچر کرنے والا۔ ہم خواجہ حسین کے پاس آئے ہیں، انھوں نے ہمارے
ے ہیں جو کچھ پوچھا تھا، تجھ کو بتا دیا گیا، اب تو اندر جا اور ہماری باتیں ان تک پہنچا دے۔ بابا حسین ہم سے ملنا چاہیں گے تو مل لیں گے
ں ملنا چاہیں گے تو ویسا بتا دیں گے۔"
مرید جز بز ہو کے اندر گیا اور آپ سے کہا "پیر مرشد! عجیب گندے اور ضدی مہمان آئے ہیں چاروں کا کوئی شریف آدمی ان کے ساتھ
ی دو گھڑی بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرے گا چہ جائیکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا۔"
آپ نے پوچھا "وہ کہتے کیا ہیں؟"
مرید نے جواب دیا "وہ کہتے ہیں، ہم اسی وقت آپ سے ملاقات کریں گے۔ جب میں نے ان سے یہ کہا کہ پیر مرشد نے آج روزہ
ا ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہم بھی روزے سے ہیں اور ہم چاروں ان کے ساتھ ہی افطار بھی کریں گے اور کھانا بھی کھائیں گے۔"
آپ نے فرمایا "یہ بات ہے تو میں ان کے پاس جاتا ہوں۔"
مرید نے عرض کیا "پیر مرشد! جیسا کہ میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت آپ کا ان کے پاس جانا ٹھیک نہیں ہے، بخدا!
کا گھناؤنا مرض آپ کو پریشان کر دے گا اور آپ مشیوں اپنی طبیعت پر قابو نہیں پا سکیں گے۔"
آپ نے فرمایا "کوئی بات نہیں۔ وہ چاروں میرے مہمان ہیں، مجھ سے ملنے آئے ہیں چنانچہ میرا فرض ہے کہ میں ان کی تواضع کروں،
ں جوئی کروں، میں ان سے ابھی اور اسی وقت ملوں گا۔"
مرید نے آخری بار کوشش کی کہ یہ باہر نہ جائیں۔ اس نے کہا "حضرت! خدا کے لیے آپ ان کے پاس نہ جائیں وہ بڑے ڈھیٹ اور
ناؤنے لوگ ہیں، آپ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گے ان سے مل کر۔"
لیکن آپ نہیں مانے اور باہر چلے گئے۔ چاروں درویش انہیں دیکھتے ہی برا بھلا کہنے لگے۔ ایک نے کہا "بابا حسین! ہم نے تو آپ کا بڑا
ہرہ سنا تھا لیکن آپ کے مرید نے تو آپ کی تصویر ہی بگاڑ کے رکھ دی۔"
دوسرے نے کہا "بابا وہ تو ہم سے ایسی بحث کرنے لگا کہ ہم کیا کہیں۔"
تیسرا بولا "اور کمال تو یہ ہے کہ اس نے ہمیں کھانے تک کو نہ پوچھا۔"
چوتھے نے کہا "ہم نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ جب تا گور آئے ہیں تو تم سے ملے بغیر نہیں جائیں گے چاہے ہمیں کتنا ہی انتظار کرنا پڑے۔"
خواجہ حسین نے دیکھا، ان کی انگلیوں سے خون رس رہا ہے، انھیں کراہت تو ہوئی لیکن پھر بھی بڑے تحمل سے جواب دیا "بزرگو!
یرے مرید نے اگر آپ کو کسی قسم کی تکلیف پہنچائی ہے تو میں اس پر شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔"
درویش مسکرانے لگے، ایک نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا، کہا "بابا! تم بھی کیا کہو گے، چلو معاف کیا، لیکن شرط یہ ہے کہ ہمیں
فطار کراؤ، کھانا کھلاؤ لیکن تم خود بعد میں کھاؤ وہ بھی پس خوردہ، ہم جو کھانا چھوڑیں گے وہ تم کھاؤ گے۔"
یہ بڑے ظلم و کراہت کی بات تھی لیکن آپ نے ان کی یہ شرط مان لی۔
مغرب کا وقت ہو چکا تھا آپ نے اپنے حصے کا کھانا ان کے پاس ہی منگوا لیا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ ان درویشوں نے ہاتھ
دھوئے بغیر کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے سوچا یہ کیسے درویش ہیں کہ مغرب کی اذان کا بھی انتظار نہیں کیا اور کھانا کھانے لگے۔
وہ کھا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ایک نے آپس ہی میں کہا "بھائیو! بابا حسین بہت پریشان ہے کہ ہم نے ذرا پہلے ہی افطار
کیوں کر لی۔ اب اس کو بتاؤ کہ ہم مسافر ہیں اور حالتِ مسافرت میں روزہ فرض ہی نہیں۔"
آپ شرمندہ ہو گئے۔ وہ چاروں کھانا کھاتے رہے اور آپ پر ہنستے رہے۔ آخر میں اپنا جھوٹا، تھوڑا سا کھانا ان کے لیے چھوڑ دیا۔ بولے
"بابا! ہم نا انصاف لوگ نہیں ہیں، یہ تمہارا حصہ ہے اس کو تم کھا لو۔"
خواجہ حسین نے ان کا پس خوردہ لے لیا اور جیسے ہی اذان ہوئی، اس سے افطار کرنے لگے افطار کے بعد نماز ادا کی اور سلام پھیرنے
کے بعد اپنے پیچھے دیکھا تو وہ چاروں درویش شاید کہیں ادھر اُدھر ہو گئے تھے۔ آپ کو حیرت تو ہوئی لیکن کچھ بولے نہیں۔
نماز کے بعد آپ نے کھانا کھایا اور اب جو دوبارہ مڑ کے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چاروں درویش موجود ہیں اور انھیں کھانا
کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں، وہ چاروں بہت خوش ہوئے۔
ایک نے پوچھا "بابا حسین! تم نے ہماری یہ زخمی انگلیاں دیکھیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں دیکھیں، کیوں پھر؟"
دوسرے نے پوچھا۔ "تمھیں ان سے گھن نہیں آتی ہے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "نہیں تو، آپ اللہ والے لوگ ٹھہرے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔"
تیسرے نے اٹھ کر آپ کو گلے لگا لیا، کہا۔ "شاباش بابا حسین، تم امتحان میں پورے اترے، اللہ نے چاہا تو آج کے بعد تم کامل ہو جاؤ گے۔"
اس کے بعد بقیہ تین نے بھی انھیں باری باری گلے سے لگایا اور انھیں دعائیں دیں۔ اب جو آپ نے انھیں دیکھا تو وہ سارے کے سارے پہلے خاصے صاف ستھرے کھڑے تھے۔ ان کی انگلیاں بالکل صحیح تھیں، ان سے خون نہیں ٹپک رہا تھا، خوبصورت پاک صاف شہزادوں جیسے۔
آپ کو وہ چاروں دعائیں دیتے رہے۔
اب تو آپ نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی طمانیت محسوس کی، آپ خود کو مالا مال محسوس کر رہے تھے۔
آپ نے ان سے پوچھا۔ "بزرگو! آپ نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔"
ایک درویش نے جواب دیا۔ "ہم عالم بالا کے لوگ، کبھی کبھی اللہ کے نیک بندوں کو اس کے حکم سے جب کچھ دینے آتے ہیں تو اسی طرح پہلے انھیں آزمائش میں ڈال دیتے ہیں پھر جب وہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو جو کچھ انھیں دینا ہوتا ہے بخش کر چلے جاتے ہیں۔"
باتیں کرتے کرتے آپ نے دیکھا وہ چاروں درویش ہوا میں تحلیل ہو چکے ہیں، اب ان کا کہیں وجود تک نہ تھا۔ آپ خاموشی سے اندر گئے اور مرید سے کہا۔ "آج تو نے ان درویشوں کو ناراض کر کے ہمارا بڑا نقصان کر دیا تھا، وہ تو خیر ہوئی کہ ہم نے اس بگڑے معاملے کو سنبھال لیا۔"
مرید نے کہا۔ "کیا آپ نے ان زخمی گھناؤنے درویشوں پر غور نہیں کیا؟"
آپ نے فرمایا۔ "غور کرنا کیا معنی، میں نے تو ان چاروں کا پس خوردہ تک کھایا ہے۔"
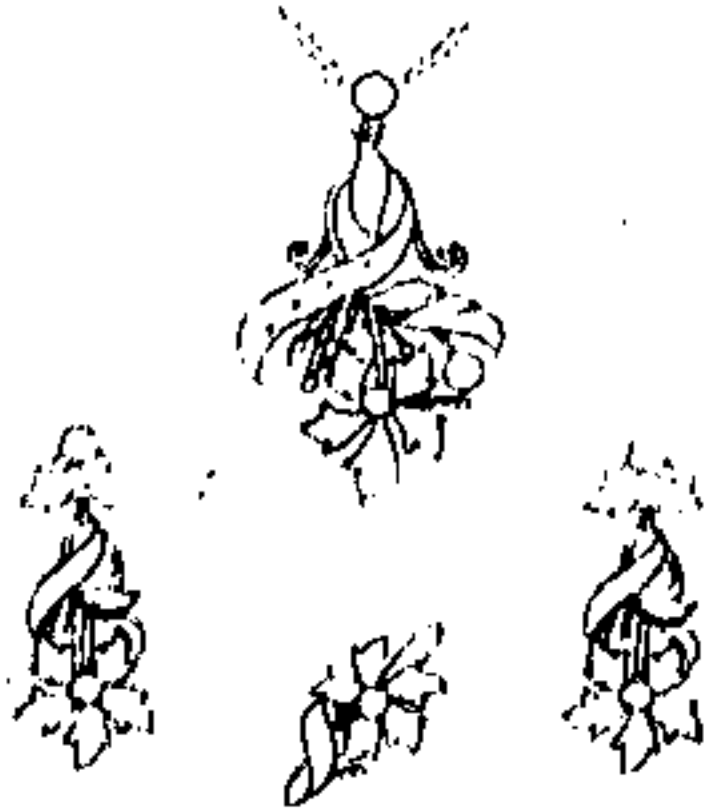
مرید کو حیرت تھی کہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا "اللہ کے بندے! نظر پیدا کر، حوصلہ پیدا کر، اللہ کے بندوں کو پہچانتے ہی نظریں پیدا کر۔ وہ کون تھے؟ کیا دینے آئے تھے؟ کس کے حکم سے آئے تھے؟ یہ ساری راز کی باتیں تھیں اور میں خوش ہوں کہ میں انھیں سمجھے اور پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔"

مرید حیرت سے آپ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ کچھ دیر بعد باہر گیا اور درویشوں کو تلاش کیا، وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ مرید نے سوچا۔ یہ تھا کیا؟ درویش کہاں چلے گئے اور یہ پیر مرشد ان کے لیے کیا فرما رہے ہیں۔

ناگور میں یہ دستور تھا کہ ان کے ساز و سامان میں ایک گھوڑا گاڑی کا ہونا بہت ضروری تھا اور لوگ سوچ سمجھ کر کے اس کا انتظام کر لیتے تھے۔ آپ کے پاس بھی ایک گھوڑا گاڑی تھی اور اسے آپ خود چلایا کرتے تھے۔ اس گاڑی میں کبھی کبھی بیل بھی جوت لیے جاتے تھے۔ آپ دو...ر کے کاموں کو اس کی مدد سے انجام دیا کرتے تھے۔

انھیں سماع کا بے حد شوق تھا، آپ محفلِ سماع خود بھی منعقد کرتے تھے اور دوسروں کے ہاں بھی جاتے تھے۔ محلے کا خاکروب ایک مدت سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے رئیسوں اور امیروں کو بھی دیکھا تھا۔ ان میں اور خواجہ حسین میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا تھا۔ وہ اکثر آپ کے آس پاس رہنے لگا تھا اور آپ کی باتیں اور صحبت اپنا کام کیے جا رہی تھیں۔

ایک دن محفل میں یہ خاکروب حاضر تھا اور حسبِ معمول باتیں بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔ جب آپ باتیں کر چکے تو خاکروب نے آپ سے کہا "حضرت! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "ضرور کر، تو ایک نہیں ہزار بار میری صحبت میں اٹھتا بیٹھتا بھی رہ، اب مجھ کو ذرا یہ تو بتا کہ میری ہم نشینی نے تجھ کو کیا دکھایا؟"

خاکروب نے جواب دیا "یہ کہ اب میں اپنے آبائی دین کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا چاہتا ہوں اور آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ کو اس کی باتوں پر نہ تو حیرت ہوئی اور نہ ہی دہشت۔ آپ نے پوچھا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو اسلام کیوں قبول کرنا چاہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "میرا دل اسلام کی طرف معلوم نہیں کیوں کھنچتا رہتا ہے، اسلام کا سحر مجھ پر اثر کر چکا ہے۔"

آپ نے خاکروب کو مسلمان کر لیا۔ یہ پاک صاف بندہ الا انسان مسلمان ہو جانے کے بعد آپ کے کھانے پینے میں اس طرح شریک و شامل رہتا جیسے وہ بھی اس گھر کا ایک فرد ہے۔ وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بہت زیادہ معزز ہو گیا تھا۔ وہ آپ کے مشاغل کا ایک ضروری اور لازمی ساتھی تھا۔

آپ کے ایک ارادت مند نے محفلِ سماع منعقد کی اور اس میں شرکت آپ کو بھی دعوت دی گئی۔

جب آپ اس محفل میں شریک ہوئے تو آپ کے ساتھ یہ خاکروب بھی تھا اور دوسرے مرید اور ارادت مند بھی۔

قوالوں نے حقانی کلام شروع کیا اور آپ پر اس کا اثر شروع ہو گیا یہاں تک کہ جب قوالی ختم ہو گئی تو آپ اس کے زیرِ اثر جنگل کی طرف چل دیے خاکروب آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جنگل سے پہلے مگر ناگور کے باہر ایک حوض تھا اور اس حوض میں ہر وقت پانی رہتا تھا آپ اس حوض پر چلنے لگے۔ پانی کی سطح پر یوں چلے، جیسے وہ کسی مسطح شے پر چل رہے ہوں۔ خاکروب نے آپ کی اتباع کی اور وہ بھی اسی طرح چلتا ہوا حوض میں داخل ہو گیا، اس کو بھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ لوگ اس غیر معمولی فیضان پر رشک و حسد میں مبتلا ہو رہے تھے۔

آپ کے پاس غیر مسلموں کا تانتا لگنے لگا۔ یہ لوگ اسلام قبول کر رہے تھے اور خاکروب جیسی حیثیت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

ان دنوں مانڈو پر غیاث الدین خلجی کی حکومت تھی سلطان کو آپ کی ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ایک دن اس نے اپنے کئی آدمی آپ کے پاس بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ میں آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں، اس لیے آنے کی اجازت دی جائے۔"

آپ نے ان آدمیوں سے کہہ دیا کہ اپنے بادشاہ کے پاس واپس جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ وہ اپنی دنیا میں مگن رہے میں اپنی دنیا میں خوش ہوں، ہمیں اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔"

سلطانی وفد کے ایک رکن نے کہا "وہ تو آپ بجا فرما رہے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ مانڈو کا سلطان یہ درخواست کر رہا

ہے ورنہ وہ اگر چاہے تو یہی بات شاہی فرمان کی صورت میں مسلط کر سکتا ہے۔"

آپ نے جواب دیا "بابا! ہم درویشوں کی دنیا میں شاہی فرمان نہیں چلتے۔ کیونکہ یہاں تو کسی اور ہی کی بادشاہت ہوتی ہے اور کسی جگہ بیک وقت دو بادشاہوں کے فرمان نافذ العمل نہیں ہو سکتے۔"

اس شخص نے کہا "جناب والا! میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ضد نہ کیجیے اور بادشاہ کو زحمت نہ دیجیے۔ بلکہ آپ خود میرے ساتھ چلیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں سلطان سے آپ کو کئی لاکھ کی جاگیر دلوا دوں گا۔"

آپ کو غصہ آگیا، جوش میں فرمایا "بابا! میں اس بات کا خیال کر رہا ہوں کہ تم لوگ میرے پاس چل کر آئے ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تم لوگوں کو یہاں سے ہلنے بھی نہ دیتا۔"

وفد کے ناعاقبت اندیش رکن نے پوچھا "ورنہ آپ کیا کرتے؟"

آپ نے جواب دیا "میں کیا کرتا جو کچھ بھی کرتا میرا خدا میرا اللہ کرتا۔ میں کیا کرتا؟"

اس شخص نے کہا "تو ہم یہ سمجھ لیں کہ آپ شرافت سے سلطان کے پاس نہیں جائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں میرا یہی جواب ہے۔"

سلطانی نمائندے نے کہا "اے شخص! یہاں شور نہ کر۔ ہم نے ابھی تک انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیا ہے، اپنی حدود میں رہ اور بات اتنی نہ بڑھا کہ ہمیں بھی کچھ کرنا پڑ جائے۔"

شاہی وفد کے دوسرے ارکان آپ کی حمایت میں بولنے لگے۔

آپ نے ان سب سے کہا "صاحبان! آپ لوگ معمولی سی رقم کے عوض زندگی بھر کی غلامی خرید لیتے ہیں۔ بڑی ہمت کا کام ہے یہ۔ خدا تم پر رحم فرمائے اور اس کی توفیق دے کہ تم ان سے محفوظ رہو اور اپنی دین دنیا کی تعمیر و تشکیل کرو۔"

ایک اعتدال پسند رکن نے جواب دیا "حضرت! آپ ناراض نہ ہوں، پتہ نہیں آپ کن خیالوں میں پھنس گئے ہیں جو ہم غریبوں پر توجہ نہیں دیتے۔"

آپ نے جواب دیا "فضول باتیں نہ کر، تجھے تیرے سوالوں کے جواب مل گئے۔ اب واپس جا اور ہمارا وقت برباد نہ کر۔"

وہ لوگ واپس چلے گئے تو آپ نے مریدوں سے کہا "ملاحظہ فرمایا آپ نے یہاں کیا ہو رہا ہے، ہم فقیروں کو سلطانی لشکر اور ادنیٰ سی سپاہ دھمکیاں دیتی پھر رہی ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ کیا میں ان سے ڈروں اور ڈرا کروں؟"

لوگ آپ کی پھر خوشامدیں کرنے لگے۔

کئی مریدوں نے عرض کیا "حضرت! ان ناداتوں کو معاف فرما دیں۔ انھیں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

آپ نے فرمایا "اللہ نے چاہا تو ایک بار سلطان سے ضرور ملوں گا۔ نہ وہ۔۔۔"

خاکروب نے پوچھا "کیا آپ سلطان کے پاس تشریف لے جائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں، میں وہاں کیوں جانے لگا۔"

خاکروب نے پوچھا "کیا سلطان آپ کے پاس آئے گا؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں، وہ میرے پاس کیوں آنے لگا۔"

خاکروب نے کہا "پھر دونوں کی ملاقات کس طرح ہوگی؟"

آپ نے جواب دیا "وہ جس طرح چاہے گا ملاقات کرا دے گا۔"

کچھ عرصہ بعد ہر طرف یہ خبر پھیل گئی کہ سلطان غیاث الدین خلجی کے پاس کہیں سے رسولِ مقبولؐ کی ریش مبارک کا ایک بال آیا ہوا ہے۔ آپ کو اس خبر نے بے چین کر دیا۔ آپ نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، گاڑی میں بیل جوتے اور اس پر بیٹھ کر چل دیے۔

خاکروب نے پوچھا "حضرت! کہاں؟ یہ کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں آپ؟"

آپ نے جواب دیا "میں رسول اللہ کی ریش مبارک کے بال کی زیارت کو جا رہا ہوں۔"

خاکروب خاموش ہو گیا۔

سلطان یہ بال لے کر آپ کے پاس آ رہا تھا، راستے میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔

سلطان کے مصاحبوں نے آپ کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ارے یہ خواجہ حسین کہاں سے آ رہے ہیں؟"

سلطان نے پوچھا "خواجہ حسین ؟ کہاں ہیں وہ ؟"
ایک صاحب نے ان کی بیل گاڑی کی طرف اشارہ کیا، کہا "وہ رہے خواجہ حسین"
سلطان نے اس گاڑی کو پرشوق نظروں سے دیکھا، اس نے گاڑی میں ایک ایسے شخص کو بیٹھے دیکھا، جس کا لباس زیادہ صاف نہیں تھا اور لباس میں کئی پیوند بھی موجود تھے۔ سلطان نے کہا "یہ تو کوئی دیہاتی یا نوکر معلوم ہوتا ہے کسی کا"
سلطان کے مصاحب نے بادشاہ کو یقین دلایا "حضور والا! آپ یقین کریں، یہی خواجہ حسین ہیں"
سلطان نے کہا "خوب یہ میری خوش قسمتی کہ ہماری اچانک ان سے ملاقات ہو گئی۔ مگر یہ یہاں تک آئے کیوں ہیں ؟"
مصاحب نے جواب دیا "موئے مبارک کی زیارت کرنے انھیں یہ بات اپنے کشف سے معلوم ہو گئی ہو گی"
سلطان نے حیرت سے کہا "اچھا تو یہ بات ہے۔ خوب، تو انھیں موئے مبارک کا پتہ چل گیا۔ جب میں نے انھیں بلوایا تھا تو یہ نہیں آئے تھے لیکن آج یہ بن بلائے مہمان بن کے نازل ہو گئے ہیں۔ دیکھتا ہوں یہ موئے مبارک کی کس طرح زیارت کرتے ہیں"
آپ نے سلطان کے ایک سپاہی سے کہا "جا، سلطان سے کہہ دے کہ وہ ہمیں کیا زیارت کرائے گا، اس وقت وہ موئے مبارک ہمارے پاس ہے اگر سلطان چاہے تو میں اس کی زیارت کرا سکتا ہوں"
جب یہ بات سلطان کے کانوں تک پہنچی تو اس نے گھبرا کے موئے مبارک کی ڈبیہ نکالی اور اس کو کھول کر بال تلاش کیا، وہاں کچھ بھی نہ تھا، بال غائب تھا۔
سلطان گاڑی کو آگے بڑھا لے گیا، بالکل آپ کے پاس سلطان نے ان سے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کچھ دیر پہلے ایک چیز ہمارے پاس تھی اب وہ چیز آپ کے پاس ہے ایسا ہوا کیونکر ؟"
خواجہ حسین نے جواب دیا "کیا ہم نے پچھلے دنوں یہ نہیں کہا تھا کہ یہاں دو بادشاہوں کے فرمان نہیں چلیں گے۔ سلطان تو دکھاوے کا بادشاہ ہے یہاں کا سلطان تو کوئی اور ہی ہے"
جب بادشاہ کے کہنے پر آپ نے موئے مبارک دکھایا تو بادشاہ کا حال ہی کچھ اور ہو گیا۔ اس دن بادشاہ نے آپ کی بے حد تعظیم کی۔

آپ کی کوشش سے آس پاس اور دور دور تک اسلام پھیل گیا، سلطان غیاث الدین خلجی نے بارہا بہت کچھ دینا چاہا۔ مگر آپ نے انکار کر دیا، سرکار دربار سے ہمیشہ نفور رہے۔ ایک مرتبہ سلطان نے آپ سے معلوم کیا کہ کشف سے بتائیے قبر میں میرے باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔
آپ نے سلطان کے باپ کی قبر پہ جا کے مراقبہ کیا اور سلطان کو بتایا کہ صاحب قبر اچھے حال میں ہے، اللہ نے اس پہ بڑی مہربانیاں کی ہیں" خواجہ حسین ۱۳۹۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۴۹۵ء میں معمولی علالت سے انتقال فرما گئے۔ ان کے وصال سے ہر طرف کہرام برپا ہو گیا، سلطان غیاث الدین خلجی نے جنازے میں شرکت کی اور آپ کے مزار اور عمارت کی تعمیر اپنی نگرانی میں کروائی۔
کہتے ہیں ان کے جد اعلیٰ حمید الدین سوالی ناگوری کا مزار سلطان محمد تغلق نے تعمیر کرایا تھا۔ حالانکہ سلطان محمد تغلق صوفیائے کرام سے چڑتا تھا، بات پھر وہیں پہنچ جاتی ہے، ایک ہی ملک میں دو بادشاہ ہوتے ہیں، بظاہر حکم کسی کا چلتا ہے اور یہ باطن حکومت کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ نہ دکھائی دینے والے حکمراں ایسے ایسے فرمان جاری کر دیتے ہیں کہ جب ان کی تعمیل ہو جاتی ہے تو اس پر صد درجہ حیرت ہوتی ہے۔ ایسا کیونکر ہو گیا ہے، ایک سوال جس کا کوئی جواب نہیں ملتا، جس کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہوتا۔

حضرت مجدد الف ثانی

لیلئ شب سعادِ صبح کا رخِ زیبائی دیکھنے کے لیے دبے گام بڑھ رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ شیخ عبدالاحدؒ اپنے کمرے میں استراحت فرما رہے تھے۔ نمازِ تہجد کے قریب خواب میں دیکھا کہ ایکا ایکی ساری کائنات میں تاریکی و ظلمت پھیل گئی ہے خنزیر، بندر اور ریچھ مخلوقِ خدا کو ہلاک کر رہے ہیں۔ معاً آپ کے سینے سے ایک نور کا ظہور ہوا۔ اور اس میں ایک تخت نمودار ہوا جس پر ایک شخص جس کے چہرے سے نور اور جلال ہویدا تھا متمکن تھا۔ اس کے سامنے ظالموں، زندیقوں اور ملحدوں کو لا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا جاتا ہے اور پھر آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی با آواز بلند کر رہا ہو۔

"وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ٥"

جب آپ نے یہ سُنا تو فوراً خواب سے بیدار ہو گئے۔ اس وقت تہجد کا وقت تھا۔ فوراً بارگاہِ صمدیت میں سجدہ ریز ہو گئے جب اپنے معمولات سے فارغ ہوئے تو حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنا خواب بیان کیا۔ انہوں نے اس مردِ باصفا کے ہاں ایک بچے کی ولادت کی بشارت دی اور فرمایا کہ اس کے دم قدم سے الحاد و بدعت کی سیاہیاں اور زندیقیت و بدمذہبی کی ظلمتیں دُور ہوں گی۔

جمعہ ۱۴ شوال ۹۷۱ ہجری کی شب مسعود تھی کہ حضرت عبدالاحدؒ کے ہاں وہ بچہ تولد ہوا جس کی بشارت دی گئی والد بزرگوار نے اپنے اس لختِ جگر کا نام شیخ احمد فاروقیؒ رکھا ایامِ طفولیت میں ایک مرتبہ آپ سخت علیل ہو گئے تو آپ والدہ ماجدہ حضرت شاہ کمالؒ کیتھلی کی خدمت میں لے گئیں حضرت شاہؒ صاحب نے اپنی زبانِ مبارک حضرت شیخ احمد فاروقیؒ کے منہ میں دے دی جسے وہ کافی دیر چوستے رہے۔ پھر حضرت صاحب نے فرمایا "یہ لڑکا بڑی عمر کا ہو گا اور عالم عامل اور کامل ہو گا اور ہم جیسے کئی اس سے پیدا ہوں گے۔

آپ سات برس کے تھے تو قرآن مجید حفظ کر لیا پھر ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کرنا شروع کی ایک دن مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ آپ کے ہاں تشریف لائے تو فرمایا "گویائی زبان کی صفت ہے۔ دل ایک پارچہ گوشت ہے وہ کس طرح ذکر کر سکتا ہے؟" یہ سن کر آپ نے کہا۔ "زبان بھی پارچہ گوشت ہے جس قادرِ مطلق نے زبان کو عطا کی وہی قلب کو قوتِ ذکر عطا فرماتا ہے۔" مولانا نے آپ کا نطق حق سُنا تو فرمایا۔ "بنیرۂ مجدد کو ایسا ہی ہونا چاہیے" ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ سرہند سے سیالکوٹ

گئے جہاں آپ نے حضرت مولانا کمال کشمیریؒ سے معقولات
بعض کتب مثلاً عضدی وغیرہ، حضرت مولانا یعقوبؒ سے
دیث کی بعض کتابیں اور عالم ربانی حضرت قاضی بہلول بدخشانیؒ
تفسیر واحدی، مؤلفات واحدی، تفسیر بیضاوی، بخاری، مشکوٰۃ
جامع و شمائل ترمذی و جامع صغیر سیوطی اور قصیدہ بُردہ وغیرہ
علیم حاصل کی۔ انہیں دنوں حضرت ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ نے
پ کے کمالات وغیرہ کا مشاہدہ کرکے آپ کے دستِ حق
ت پر بیعت کرلی۔ اکیس برس کی عمر تک آپ مزید علوم و
ارف سے بہرہ ور ہوئے اور پھر وطن مالوف تشریف لاکر
ں و تدریس میں مشغول ہوگئے۔

شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کو سرہند تشریف سے خاص تعلق و
بط تھا۔ اسے آباد کرنے کا سہرا آپ کے چھٹے جدامجد حضرت
م رفیع الدینؒ کے سر ہے جو حضرت سید جلال الدین بخاریؒ معروف
مخدوم جہانیاںؒ کے خلیفہ و امام نماز تھے۔ ۷۶۰ ہجری میں
ں وحشتناک جنگل تھا خونخوار درندوں کا مسکن تھا۔ اس جنگل
م سہرند تھا جس کے معنی بیشۂ شیر تھا۔ اس جنگل کے درندوں
انسانی جانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ تنگ آکر گردو پیش
رعایا نے اوچہ شریف جاکر حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خدمت
عرض کی کہ وہ سلطان فیروز شاہ کو جو آپ کا مرید تھا سہرند
مقام پر شہر بنادے۔ رعایا کی تکلیف کے پیشِ نظر آپ
تشریف لے گئے سلطان فیروز شاہ نے آپ کا استقبال کیا
مرشد کے حسب ارشاد فوراً شہر آباد کرنے کی منظوری دے
ی اور اپنے وزیر خواجہ فتح اللہ کو جو حضرت امام رفیع الدینؒ کا
بھائی تھا اس کام کی انجام دہی کے لیے مقرر کردیا۔ وزیر
وف دو ہزار افراد کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے اور تعمیرات کا کام
روع کردیا۔ ۷۶۰ ہجری میں قلعہ کی بنیاد اس ٹیلہ پر رکھی جہاں
کل تھا، مگر ہر روز جتنی دیوار تعمیر ہوتی دوسرے دن گر جاتی۔
ورتِ حال سے بادشاہ نے اپنے مرشد کو اطلاع دی تو
ضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اپنے خلیفہ حضرت شیخ رفیع الدینؒ
جو اس وقت شام میں مقیم تھے حکم دیا کہ وہ جاکر قلعے کی بنیاد
کھے۔ اور سکونت بھی وہیں اختیار کرے۔ مرشد کا حکم ملتے ہی آپ
ہاں پہنچے۔ آپ نے بذریعہ کشف معلوم کرلیا کہ دیوار تعمیر کرنے
والوں میں ایک اللہ کا دوست حضرت شرف الدین بوعلی قلندر
رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہے جس کو زبردستی مزدوروں میں شامل
کرلیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ رات کو توجہ ڈال کر دیوار گرا دیتا ہے
آپ نے منع کردیا کہ کوئی اللہ کے اس ولی سے کام نہ لے اور
خود قلعہ کی بنیاد رکھی اور جب تعمیر کا کام مکمل ہوگیا تو وہیں سکونت
اختیار کرلی۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اگرچہ بہ دل و جان
درس و تدریس میں مشغول تھے لیکن زیارت روضۂ مقدسہ رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شوق روز افزوں دو چند ہوتا گیا لیکن والدِ
بزرگوار کی کبر سنی کی بنا پر ہمیشہ اپنا ارادہ ملتوی کردیتے تھے۔
۲۷ جمادی الآخر ۱۰۰۷ ہجری میں جب شیخ عبدالاحدؒ واصل بحق
ہوئے تو اس سے اگلے سال آپ بہ ارادہ حج روانہ ہوئے۔ دہلی
کے قیام کے دوران حضرت مولانا حسن کاشمیریؒ نے جو آپ
کے دوستوں میں سے تھے حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کی بے حد
تعریف کی اور ملنے کی ترغیب دی۔ آپ کے دل میں سلسلۂ
نقشبندیہ عالیہ کی طرف پہلے سے رغبت بدرجہ اتم موجود تھی لہٰذا
دوست کے کہنے پر آپ حضرت خواجہ باقی باللہ کی زیارت
کے لیے تشریف لے گئے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ حضرت مولانا خواجگی امکنگی کے
مرید تھے۔ آپ بخارا میں اپنے مرشد کی خدمت میں تھے کہ ایک
روز خواب دیکھا کہ ایک طوطی شاخِ شجر پر بیٹھا ہے۔ آپ نے
ادھر توجہ کی تو پرندہ اڑ کر آپ کے ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ آپ نے
اپنا لعاب دہن پرندے کے منہ میں ڈالا اور اس نے حضرت
خواجہ باقی باللہ کے منہ میں شکر ڈالی۔ دوسرے روز آپ نے
خواب اپنے مرشد کو سنایا تو آپ نے فرمایا۔ "طوطی ہندوستان
کا پرندہ ہے وہاں تمہارے دامن برکت سے ایک بزرگ کا
ظہور ہوگا جس سے ایک جہان روشن ہوگا اور تم بھی اس سے
بہرہ ور ہوگے۔" چنانچہ بخارا سے شہر سرہند پہنچے تو بتایا گیا کہ
وہ حضرت شیخ احمدؒ کے پڑوس میں مقیم ہیں اور ان کا حلیہ بھی بتایا۔
آپ نے شہر کے درویشوں اور فقیروں سے ملاقات کی لیکن
حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حلیہ مبارک کا کوئی شخص نظر نہ آیا۔
خیال کیا کہ شہر والوں میں سے کسی میں قطبیت کی قابلیت ہوگی

جو بعد میں ظاہر ہوگی چنانچہ سرہند سے دہلی جا کر سکونت اختیار کرلی۔ جب آپ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ مہربانی سے پیش آئے اور آپ کا قصہ دریافت فرمایا۔ مطلع ہونے پر حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے ارشاد فرمایا۔ "چند دن فقراء کی صحبت میں رہو تو کوئی حرج نہیں۔" حسب الارشاد آپ ایک ہفتہ کے لیے رُک گئے۔

ابھی دو روز ہی بیتے تھے کہ حضرت خواجہؒ کی خصوصی توجہ سے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے دل میں اخذ طریقہ نقشبندیہ کا طریقہ غالب آگیا۔ عرض کیا تو حضرت خواجہؒ آپ کو خلوت میں لے گئے۔ توجہ فرمائی تو آپ کا دل ذاکر ہو گیا اور داخلِ طریقہ کر لیا۔ پھر کیا تھا روز افزوں آپ کی روحانی ترقی میں معتدبہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آپ کے مُرشد فرمایا کرتے تھے کہ مَیں نے ایک بہت بڑا چراغ روشن کیا ہے جس کی روشنی ساعت بساعت بڑھتی جائے گی جس سے کثیر لوگوں کے چراغ روشن ہوں گے۔ آپ تھوڑے ہی عرصے میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ اور قرب والوں کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حوالے کر کے خود گوشہ نشین ہو گئے۔ صرف نمازِ با جماعت کے لیے باہر تشریف لاتے تھے۔

ماہِ رمضان کی ایک رات حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک خادم کے ہاتھ مُرشد کی خدمت میں فالودہ بھیجا۔ خادم نے دروازہ خاص جا کھٹکھٹایا۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ بہ نفسِ نفیس اُٹھ کر تشریف لائے۔ فالودہ لے لیا اور فرمایا۔ "تم ہمارے شیخ احمدؒ کے خادم ہو اس لیے ہمارے ساتھ ہو۔" یہ فرمانا تھا کہ اس خادم پر سکر و مستی کا غلبہ طاری ہو گیا۔ شور مچاتا اپنے مخدوم کی خدمت میں پہنچا۔ مُرشد نے حال دریافت کیا تو بولا ہر ذرّے شاخ اور پتے، زمین و آسمان میں نہایت بے رنگ نور دیکھتا ہوں۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ تو حضرت مُرشد خواجہ باقی باللہؒ کے سامنے چلا گیا تھا اور اس آفتاب کا ایک پَرتو تم پر پڑ گیا ہے۔

جب آپ کو مُرشد نے اجازتِ کاملہ کی خلعت عطا فرما دی تو سرہند روانہ کر دیا اور اپنے طالبوں کی ایک جماعت بھی خدمت کے لیے ہمراہ کر دی۔ چنانچہ آپ وطن میں پہنچ کر حسبِ ارشاد طالبوں کی تربیت میں مشغول ہو گئے اور قلیل عرصے میں بہت سے لوگوں کو اَنگِنت فیوض و برکات سے نواز دیا۔

امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے چاروں سلاسل کے بزرگوں سے انتساب باطنی کیا۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں آپ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مُرید و خلیفہ تھے۔ سلسلہ قادریہ میں آپ مرید و خلیفہ حضرت شاہ سکندرؒ کیتھلی کے تھے۔ خاندانِ چشتیہ اور سہروردیہ میں آپ مُرید اپنے والد محترم کے تھے۔ ان کے علاوہ آپ کو شطاریہ، مداریہ اور کبرویہ وغیرہ سلاسل کی تلقین کی بھی اجازت تھی۔ کچھ عرصہ سرہند میں قیام کے بعد اپنے آپ مُرشد کی زیارت کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ جہاں ان کی صحبت میں رہ کر اَنگِنت مزید درجات و کمالات حاصل کئے۔ آپ اپنے مُرشد کے اس قدر مودّب تھے کہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ جب واپس سرہند لوٹے تو طالبوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا۔ آپ ہمیشہ اپنے حالات اپنے اصحاب کی ترقیات و کمالات اور پیر بھائیوں کے بارے میں اپنے مُرشد کو لکھ بھیجا کرتے تھے اور دُعا و توبہ کے خواستگار ہوتے تھے۔

حضرت باقی باللہؒ اپنے اس مُرید کے درجات و مقامات سے بخوبی آشنا تھے۔ لہٰذا تیسری مرتبہ جب آپ دہلی تشریف لے گئے تو مُرشد آپ کے استقبال کے لیے قلعہ فیروزی سے پیدل روانہ ہوئے اور کابلی دروازے سے بڑے اعزاز کے ساتھ لائے۔ اور پھر اپنی موجودگی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کو سر حلقہ اور صبح و شام کے حلقہ مراقبہ کا مقتدا بنایا۔ ادھر مُرید کے ادب کا یہ عالم تھا کہ جس طرف مُرشد ہوتا تھا اُدھر پُشت نہیں کرتا تھا۔

تیسری مرتبہ مُرشد سے رخصت لے کر وطن واپس تشریف لے گئے۔ چند روز قیام فرمانے کے بعد آپ لاہور چلے گئے۔ جہاں خواص و عوام میں سے بے شمار لوگ حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ لاہور میں اربابِ فضل و کمال کے ساتھ صحبت گرم تھی کہ مُرشد کے وصال کی خبر پہنچی۔ فوراً اضطراب کی حالت میں دہلی پہنچے۔ روضہ مقدس کی زیارت کی اور صاحبزادگان اور پیر بھائیوں سے تعزیت کی۔ حضرت خواجہؒ کے مُریدین آپ کے حلقہ

داخل ہونے لگے۔ آپ بھی ان کی طرف پوری توجہ اور انہماک سے منعطف ہوتے جس کی وجہ سے انہیں باطنی طراوت و تعلیم میں کمی محسوس نہ ہوئی، لیکن بعض نے راہِ حسد اختیار کی، آپ نے انہیں بہت سمجھایا مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نصیحت کے طور پر آپ نے بعض افراد کی نسبتیں سلب کر لیں مگر وہ اپنے حسد سے باز نہ آئے۔ چنانچہ وہ سب حضرت باقی باللہؒ کے مزارِ پاک پر حاضر ہوئے۔ ان میں سے ایک صاحب کشف و کرامت کے بھی حامل تھے۔ اس نے دیکھا کہ مزار پر حاضر تمام درویشوں نے چراغ جلایا ہے لیکن ایک چمکتی ہوئی بجلی نمودار ہوتی اور وہ ہر ایک چراغ گُل کر دیتی۔ یہ سب آپ سے حسد کا نتیجہ تھا۔ چندے قیام فرمانے کے بعد حضرت مجدّد الف ثانیؒ واپس سرہند تشریف لے گئے۔ اس کے بعد حاسدین نے جب دیکھا کہ ان کی روحانی ترقی رُک گئی ہے بلکہ روز افزوں اس میں کمی آ رہی ہے تو انہوں نے آپ سے معافی مانگ لی۔

۲۷ رمضان المبارک ۱۰۱۰ ہجری سوموار کا دن تھا آپ نمازِ ظہر کے بعد مراقبہ میں بیٹھے تھے کہ معًا آپ نے خود کو ایک خلعتِ نورانی میں لپٹے ہوئے پایا۔ اسی اثنا میں صاحب لولاک سیّد المرسلین و رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اپنے دستِ مبارک سے حضرت مجدّد الف ثانی کے سر پر دستار باندھی اور منصبِ قیومیت کی مبارک باد دی۔ یہ جو کچھ بھی آپ کو عطا ہوا تھا وہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و اطاعت کا ثمرہ تھا۔ آپ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اس قدر غلبہ تھا کہ ایک دن جب کہ آپ کے حجرے میں درویشوں اور فقیروں کی ایک جماعت بیٹھی تھی فرمایا: "آنسرور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت اس طرح غالب آ گئی ہے کہ میں حق سبحانہٗ و تعالےٰ کو اس لیے دوست رکھتا ہوں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ربّ ہے۔"

بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی اپنی کوئی بات نہیں رہتی اور وہ جو کہتا ہے بارگاہِ صمدیت میں مقبول ہوتا ہے۔ ایک روز آپ اپنے جدِ امجد حضرت امام رفیع الدینؒ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ فاتحہ کے بعد مزار پر کھڑے ہو کر قبرستان کی مغفرت کے لیے بارگاہِ خداوندی میں التجا کی تو الہام ہوا کہ ہم نے ایک ہفتہ کے لیے اس قبرستان سے عذاب اُٹھا لیا ہے۔ آپ اللہ کی رحمت کی لاانتہا ہی کا ذکر کرتے رہے حتیٰ کہ باری تعالیٰ نے القا کیا کہ ہم نے اپنے فضل سے تمہاری خاطر اس قبرستان سے قیامت تک عذاب اٹھا لیا۔

ایک دن آپ تشریف فرما تھے کہ سلسلۂ گفتگو طریقۂ نقشبندیہ میں داخل ہونے کا چل پڑا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ زن و مرد جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے طریقہ میں داخل ہوئے ہیں یا قیامت تک ہوں گے وہ سب ہمیں دکھائے گئے ہیں اور ہر ایک کا نام و نسب اور مولد و مسکن بتایا گیا ہے اگر چاہیں تو ایک ایک کو بیان کر دیں۔

ایک روز آپ حلقہ ذکر میں تشریف فرما تھے کہ ارشاد فرمایا "میں نے اس حلقہ میں موجود ایک شخص کے ماتھے پر لفظ شقی لکھا ہوا دیکھا ہے اور وہ مرتد ہو جائے گا۔ حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ خوف سے کانپنے لگے۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ شیخ طاہر لاہوری جو آپ کے صاحبزادگان حضرت خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کا استاد تھا ایک کافر عورت پر عاشق ہو کر مرتد ہو گیا۔ صاحبزادوں نے اپنے استاد کے لیے دُعا کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ پھر مسلمان ہو جائے۔ آپ نے شیخ طاہر لاہوری کے لیے نہایت عجز و انکساری سے اللہ کے حضور درخواست کی۔ دُعا قبول ہوئی۔ شیخ طاہر لاہوری عشقِ مجازی کو خیر باد کہہ کر حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف با اسلام ہو کر تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی صحبت میں رہ کر بے انتہا مراتب حاصل کیے۔

حضرت امام ربانیؒ کے دورِ مسعود میں اکبر بادشاہ کے گرد ملّا مبارک کے صاحبزادگان ابوالفضل و فیضی، کچھ پنڈتوں اور دیگر مذاہب کے لوگ اس طرح پھیل گئے کہ انہوں نے اُسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ انہوں نے مختلف مذاہب کے اصولوں کو یکجا کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جس نے اُسے دینِ الٰہی کا نام دے کر اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ جو کہ حقیقتًا دینِ اکبری تھا۔ اس کے مطابق پیشانی پر قشقہ لگانا، جینو پہننا روا تھا۔ مسجد و مندر کو یکساں مقام دیا گیا۔ بادشاہ کو خدا کا اوتار سمجھ

کر سجدہ تعظیمی لازمی قرار دیا گیا۔ ادھر اہل رفض ہندوستان میں اربابِ حشمت وجاہ تھے۔ دربارِ شاہی میں مقرب و منظورِ نظر تھے۔ بادشاہِ وقت بھی دینِ اسلام اور بزرگانِ دین سے دشمنی رکھتا تھا۔ ان حالات و واقعات کو دیکھ کر خاموش رہنا آپ کی شان کے منافی تھا۔ ناممکن تھا کہ آپ دینِ اسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی تضحیک و بے ادبی پر مہر بلب رہتے۔ اس لیے کہ آپ کی رگوں میں تو وہ پاک خون گردش کر رہا تھا جو ستائیسویں پُشت میں سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے جا کر ملتا تھا۔ آپ نے ردِّ روافض میں ایک رسالہ لکھا اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید فرمائی اور حکومتِ وقت کی اسلام دشمن حرکات کو باطل کرنے کے لیے عملی اقدام کیے۔ اس طرح کرنے سے رافضی آپ کے جانی دشمن ہو گئے اور حکومت بھی آپ پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے حیلے تلاش کرنے لگی۔ انہی دنوں اکبر راہی ملکِ عدم ہوا اور اس کی جگہ جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ وہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلا۔ اندریں حالات آپ نے خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے چہار اکناف اپنے خلفاء بھیجے اور اپنے خلیفہ حضرت شیخ بدیع الدین سہارنپوریؒ کو جہانگیر کے لشکر کی خلافت دے کر بھیجا۔ وہاں پہنچتے ہی آپ کو قبولیت عام نصیب ہوئی اور بڑے قلیل عرصے میں خانخاناں، اعظم خاں۔ خانجہاں لودھی۔ سکندر خاں، مہابت خاں وغیرہ ارکانِ سلطنت آپ کے سلسلہ میں داخل ہو گئے اور اکثر آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔

جہانگیر کا وزیر آصف جاہ جو رافضی تھا اس نے جب حضرت شیخ بدیع الدین سہارنپوری کے بارے میں سُنا تو انگاروں پہ لوٹنے لگا اور بادشاہ سے کہا کہ سرہند میں شیخ احمدؒ نامی سیاسی شخص ہے جس کے غیر ممالک کے بادشاہ بھی نیازمند اور مرید ہیں۔ اس کا ایک خلیفہ لشکرِ شاہی میں موجود ہے جس کے بہت سے ارکانِ سلطنت حلقہ بگوش ہو گئے ہیں خدشہ ہے کہ جس طرح شاہ اسمٰعیل صفوی اپنے مریدین کے ذریعے تختِ ایران پر قابض ہو گیا تھا یہ شخص بھی ہندوستان کی حکومت پر قبضہ نہ کر لے۔ بادشاہ سیخ پا ہو گیا۔ آپ کے خلیفہ کے حلقہ بگوش ارکانِ سلطنت کو دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیا گیا اور حاکمِ سرہند کو لکھا کہ وہ خود شیخ احمد سرہندیؒ کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو۔

ایک رافضی طالب علم نے ایک روز مکتوبات امام ربانیؒ میں پڑھا کہ حضرت امام مالکؒ حضرت شیخینؓ اور حضرت امیر معاویہؓ پر سب وشتم کرنے والوں پر حد جاری فرمایا کرتے تھے تو اس نے غصے سے مکتوبات کو یہ کہہ کر زمین پر پھینک دیا کہ یہ کیسی بے مزہ نقل ہے اور اسی حالت میں سو گیا۔ خواب میں حضرت شیخ سرہندیؒ تشریف لائے اور اس لڑکے کے دونوں کان پکڑ کر فرمایا۔ "اے طفل نادان! تو بھی ہماری تحریر پر اعتراض کرتا ہے۔" چنانچہ اسے پکڑ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں لے گئے آپؓ نے اُسے فرمایا کہ خبردار! حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہؓ کی شان کے خلاف ایک لفظ بھی منہ پر نہ لانا اور نہ ہی کدورت رکھنا۔ ہم جانتے ہیں اور ہمارے بھائی کہ کن نیک نیتوں سے ہمارے اور ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ اور نہ ہی حضرت شیخ کی تحریر سے منہ موڑنا۔ اس نصیحت کے باوجود اس لڑکے کا دل صاف نہ ہوا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سخت ناراض ہوئے اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے فرمایا کہ اسے مارو۔ آپ نے پوری قوت سے اُسے ایک تھپیڑ رسید کیا تو اس نوجوان کے دل سے حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں کدورت دُور ہو گئی۔ فوراً بیدار ہو گیا اور حضرت امام ربانیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا عرض کیا تو آپ خندہ بہ لب ہو گئے۔ اسی وقت حاکم سرہند حاضر خدمت ہوا اور نہایت ادب کے ساتھ فرمان شاہی سے آگاہ کیا۔ چنانچہ آپ اس کے ہمراہ دہلی روانہ ہو گئے۔

جب آپ بارگاہِ سلطانی میں پہنچے تو آپ نے بادشاہ کو سجدہ تعظیمی نہ کیا۔ آصف جاہ ششدر رہ گیا۔ جہانگیر نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا لیکن آصف جاہ نے اپنی بدنیتی کا ثبوت دیا اور بادشاہ کے کان بھرے۔ آپ پر کئی قسم کے بے سروپا سوالات کیے جس کا آپ نے مدلل و شافی جواب دیا۔ جب کوئی اور بات نہ بن پڑی تو آپ کو سجدہ تعظیمی کرنے کے لیے کہا تو آپ نے فرمایا۔ "یہ سر سوائے ربِّ قدوس کے کسی اور کے سامنے نہیں

جھک سکتا۔" چنانچہ آصف جاہ کے کہنے پر بادشاہ نے آپ کو قید کا حکم دیا اور گوالیار کے قلعہ میں بھیج دیا جہاں حکومت کے باغیوں کو رکھا جاتا تھا۔

جب ارکین سلطنت نے آپ کی اسیری کے بارے میں سُنا تو ان میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ خصوصاً وہ حضرات جو آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے انہوں نے باہم خط و کتابت کے بعد بغاوت پر آمادگی ظاہر کی تو آپ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور فرمایا کہ علیم مطلق نے کوئی ایسا کام سونپا ہے جو صرف جیل کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے جیل کے اندر جاتے ہی رشد و ہدایت کا کام شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیشمار لوگ جو گناہوں میں آلودہ تھے تائب ہوئے اور کئی لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور انگنت لوگ آپ کے مُرید ہو گئے۔ جب کبھی دوسرے اسیر آپ کو قید کرنے کے خلاف لب کشائی کرتے اور بد دعا کے لیے عرض کرتے تو آپ فرماتے "مَیں اُس کا مشکور ہوں کہ اس نے مجھے قید کر دیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اتنے لوگ جو فوائد دینی سے مالا مال ہوئے ہیں محروم رہ جاتے۔"

دو سال بیت گئے تو بذریعہ خواب جہانگیر کی بیٹی کے ذریعے اُسے متنبہ کیا گیا تو وہ اپنے کئے پر سخت نادم ہوا اور پروانۂ رہائی جاری کر دیا۔ لیکن آپ نے رہا ہونے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جب تک چند شرائط تسلیم نہ کی جائیں گی۔ جیل سے نہیں جائیں گے۔ دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ تمام مسمار شدہ مساجد از سر نو تعمیر کی جائیں۔ کفار سے شریعت محمدیہ کے مطابق جزیہ لیا جائے۔ مسلمانوں پر سے گائے کے ذبح کرنے کی پابندی واپس لی جائے اور سجدہ تعظیمی بند کر دیا جائے۔ بادشاہ نے انہیں فوراً تسلیم کر لیا اور آپ کا ایسا محب بن گیا کہ اکثر قریب رکھنے کی سعی کرتا لیکن اس نے جو بے ادبی آپ سے روا رکھی تھی اس کی پاداش میں اس کی حکومت میں بہت شور و فتور برپا ہوا۔ اور وہ خود بھی کئی کمزوریوں میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن شہزادہ خرم جو کہ بعد میں شاہجہان کے لقب سے مشہور ہوا اور عالمگیر اورنگ زیب آپ کے مرید ہو گئے۔

۱۰۳۲ ہجری میں آپ اجمیر سے واپس تشریف لے گئے اور اللہ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے چراغ دلوں میں روشن فرمانے لگے۔ جگہ جگہ رشد و ہدایت کے گلہائے رنگین کھلا دیئے اور زندیقیت و ملحدیت کے بھیڑیئے، بدمذہبی کے خنزیر، تاریکیوں کو جنم دینے والے بندر اور بدعتوں کو پالنے والے ریچھ سسک سسک کر دم توڑنے لگے۔

جب حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقیؒ سرہندی باسٹھ سال کے ہوئے تو ماہ ذی الحجہ ۱۰۳۳ ہجری کے وسط میں آپ ضیق النفس کا شدید حملہ ہوا۔ لیکن آپ اپنے مولا کی رضا میں راضی و شاکر و صابر رہے۔ جب آپ کی عمر پچاس سال کی تھی تو آپ نے گوالیار کے قلعہ میں اسیری اور اپنے وصال کے بارے میں پیشگوئی فرما دی تھی۔ گوالیار کے قلعہ میں قید کا سانحہ تو بیت گیا تھا اور اب سانحہ عظیم ظہور میں آنے والا تھا۔ جو مقربین تھے انہیں بھی یہ بات یاد تھی لہٰذا وہ اکثر و بیشتر آپ کے قرب میں ہی رہتے اور زیادہ سے زیادہ فیوض و برکات سے اپنے دامن بھرتے رہتے تھے۔ روز افزوں خیرات صدقات میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوران بیماری آپ کو مقام اخروی بھی دکھایا گیا۔ ۲۳ صفر المظفر ۱۰۳۴ ہجری کو آپ نے درویشوں میں کپڑے تقسیم فرمائے۔ اگرچہ آپ پر ضعف غالب تھا لیکن عبادات و وظائف اور دیگر معمولات میں فرق نہیں آیا۔ بدستور ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے۔ نماز تہجد ادا کرتے اور شریعت و طریقت کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ ہجری کی شب تھی۔ خدام جو رات کو خدمت کرتے تھے ان سے فرمایا۔ "تم نے بہت محنت کی ہے صرف آج کی رات اور محنت کر لو کل خلاصی ہو جائے گی۔" اور پھر ہندی کا یہ مصرعہ پڑھا۔ "اج ملا وا کنت سوں سکھی سب جگ دیوان وار" جس کا مطلب ہے خدائے محرم! آج وصالِ دوست ہے اس لیے میں سارا جہاں نثار کرتا ہوں۔ رمز آشنا و مقربین نے جب سنا تو سمجھ گئے کہ ان کے مخدوم کی یہ شب وصال ہے۔ ان کی روحیں بلبلا اٹھیں۔ آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو گئے۔ نیند کوسوں دُور بھاگ گئی۔ اس رات آپ نے

وہ تمام دعائیں پڑھیں جو صحیحین میں مندرج ہیں۔ نمازِ تہجد ادا کی۔ نمازِ فجر با جماعت پڑھی۔ پھر حکم دیا کہ مجھے فرش پر لٹا دو۔ چنانچہ آپ سنتِ نبویؐ کے مطابق اس طرح لیٹے کہ سرِ مبارک بطرف شمال، چہرہ بسوئے کعبہ اور دایاں ہاتھ زیرِ رخسار تھا اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوگئے کہ اسی حالت میں اپنی جان اپنے مولا کے حضور پیش کر دی۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال جب آپ کے روضہ مبارک پہ حاضر ہوئے تو بے ساختہ انہوں نے کہا:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ سنِ ہجرت کے لحاظ سے دوسرے ہزار سال کے مجدد تھے۔ آپ نے میر محمد نعمان کو یوں لکھا کہ معلوم رہے کہ ہر صدی کے سر پہ ایک مجدد گزرا ہے لیکن صدی کا مجدد اور ہے اور الف (ہزار) کا مجدد اور۔ سو اور ہزار میں جتنا فرق ہے اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کے مجددوں میں فرق ہے۔ مجدد وہ ہوتا ہے کہ اس مدت میں جو فیوض امتیوں کو پہنچتے ہیں خواہ وہ اس وقت کے اقطاب و اوتاد اور بدلا و نجباء ہوں اسی کی وساطت سے پہنچتے ہیں۔

آپ کی ساری زندگی روشنی کا ایسا مینار ہے جس سے ہزاروں لاکھوں لوگ مستفید ہوں گے اور آپ کے کلماتِ قدسیہ کے نور میں اپنی تاریک راہوں کو روشن و منور کریں گے۔ فرماتے ہیں:

❁ اللہ کا قرب بخشنے والے اعمال فرائض ہیں یا نوافل۔ لیکن فرائض کے مقابل نوافل کا کچھ اعتبار نہیں۔ فرائض میں سے ایک فرض کا ایک وقت میں ادا کرنا ہزار سال کے نوافل ادا کرنے سے بہتر ہے اگرچہ خالص نیت سے ادا ہوں۔

❁ مکلفین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عقائد کو علماء اہلِ سنت و جماعت کے کہنے کے مطابق درست کریں کیونکہ نجاتِ اخروی ان بزرگوں کی صواب نما رایوں کی پیروی سے وابستہ ہے اور فرقہ ناجیہ یہی بزرگوار اور ان کے پیرو ہیں اور یہی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اکرام رضی اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے طریق پر ہیں۔

❁ موت کے آنے سے پہلے اپنا کام کرنا چاہیے۔ اول اعتقاد کی درستی جو طریق ضرورت و تواترِ دین سے معلوم ہے۔ دوئم جاننا اور عمل کرنا جو علم فقہ سے متعلق ہے اور سوئم سلوک طریق صوفیہ بھی درکار ہے۔ طریقِ صوفیہ درحقیقت علوم شرعیہ کا خادم ہے۔

❁ مرشد کے حقوق تمام حقوق والوں کے حقوق سے زیادہ ہیں۔ بلکہ پیر کے حقوق سبحانہٗ کے احکامات اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کے بعد دوسروں کے حقوق سے نسبت نہیں رکھتے۔ بلکہ سب کے پیر حقیقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگرچہ ظاہری ولادت والدین سے ہے مگر ولادتِ معنوی مرشد کے ساتھ مخصوص ہے۔ ظاہری ولادت کی زندگی چند روزہ ہے اور ولادتِ معنوی کی زندگی ابدی ہے۔

❁ اگر دو چیزوں میں خرابی نہ ہو تو پھر غم نہیں۔ ان دو اشیاء میں سے ایک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت ہے۔ دوسرے اپنے شیخ کی محبت اور اخلاص ان دو چیزوں کی موجودگی میں اگر ہزاروں تاریکیاں اور تیرگیاں طاری ہو جائیں تو کچھ خوف نہیں۔ آخر ان کو ضائع نہ چھوڑا جائے گا۔ العیاذ باللہ ان دو میں سے ایک میں نقصان آگیا تو خرابی پر خرابی ہے۔ حق سبحانہٗ و تعالےٰ سے تضرع و زاری کے ساتھ ان دو چیزوں کا ثبات طلب کریں اور ان دونوں پر استقامت کی دعا کریں۔ کیونکہ یہی دونوں کارِ دین کا مدار اور نجاتِ اخروی کا مدار ہیں۔

❁ ذکر سے مراد غفلت کا دور کرنا ہے۔

میرپور کے جنوب میں تقریباً پانچ چھ کوس کے
فاصلے پر پہاڑوں کے دامن میں نہر اپر
ـے کے بائیں کنارے پر موضع کھڑی شریف ہے جہاں آج سے
سال قبل ایک مردِ قلندر قطب دوراں اور افصح الفصحاء نے
تھا۔ اس کے عارفانہ کلام کی گونج اور مہک اب بھی انسانوں
وب واذہان میں اس طرح رچی بسی ہے کہ سنتے ہی معرفت
کے نزول کا احساس ہوتے لگتا ہے۔ شام کے لمبے سایوں میں
ی راستوں کے نشیب و فراز میں میدانوں کی وسعتوں میں سرد
کے گہرے سناٹوں میں گرمیوں کی آگ برساتی دوپہروں میں
ں کی پگڈنڈیوں پر، پہاڑوں کے دامنوں میں اور برساتوں کے
پرور لمحات میں جب لوگ اپنے اپنے حال کے مطابق اس
ردِ عارف کے اشعار بآوازِ بلند پڑھتے ہوئے سنائی دیتے
یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں سے کوئی اپنے محبوب کے
و ہجر میں ماہی بے آب ہو کر کہہ رہا ہو ؎

آپ دلوں میں پوئے کیتے حق محبت والے
لکھ میری اک ککھ نہ بھی لعل بنے وٹ کالے

دلبر مینوں منہ نہ لاندا عشق پسند نہ کردا
کھوہ پئی سبھ کیتی کتری سکہ بنیاں زر دا •

ترجمہ: میں نے اپنی طرف سے تو محبت کا حق پورا ادا کیا ہے لیکن میری محنت ثمر بار ثابت نہیں ہوئی اور میرے ہیرے جواہرات سیاہ پتھر ثابت ہوئے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرا محبوب مجھے منہ تک نہیں لگاتا اور نہ ہی میرے عشق کو پسند کرتا ہے میرا سب کیا کرایا ضائع ہو گیا ہے اور میرا سونا بھی پیتل بن گیا ہے۔

کوئی جادۂ معرفت کی تلاش میں مضطرب و بے چین ہو کر پکار رہا ہو ؎

جے لکھ زہد عبادت کریئے بن عشقوں کس کاری
جاں جاں عشق نہ ساڑے تینوں تاں تاں نبھے نہ یاری
کامل عشق خدایا بخشیں غیر دلوں مکھ موڑاں
ہکو جاناں، ہکو تکاں، ہکو آکھاں، لوڑاں

ترجمہ: عشق کے بغیر زہد و تقوے سب بیکار ہے اور جب تک تن من کو جلا کر خاکستر نہ کر دے اس وقت تک دوستی نبھ نہیں سکتی۔ اے خدایا! مجھے عشقِ کامل عطا فرما جو ماسوا سے بیگانہ کر دے

تاکہ صرف تو ہی دل میں بسے، تیرا ہی جلوہ نظر آئے، ہر دم تیرا ہی ذکر کروں اور تیری ہی جستجو میں کھویا رہوں۔ کوئی دنیائے دنی کی بے ثباتی کا رد رو کر اظہار کر رہا ہو ۔

مان نہ کیجے روپ گھنے دا وارث کون حسن دا
سدا نہ رہسن شاخاں ہریاں سدا نہ پھل چمن دا
سدا نہ وست بازاراں وکسی سدا نہ رونق شہراں
سدا نہ موج جوانی والی سدا نہ ندئیں لہراں

ترجمہ: بے حد حسن پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا کوئی مالک نہیں ہے۔ بالکل اس طرح جیسے درختوں کی شاخیں نہ تو ہمیشہ سرسبز رہتی ہیں۔ اور نہ ہی باغ میں ہمیشہ پھل دستیاب ہوتا ہے۔ بازاروں میں سدا اشیاء بھی فروخت نہیں ہوتیں اور شہر بھی ہمیشہ بارونق نہیں رہتے۔ جوانی کی ترنگ بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں اور نہ ہی سدا ندی میں لہریں موجزن رہتی ہیں۔

کوئی مصائب و آلام کی چکی میں پسا ہوا چیخ رہا ہے ۔

دکھیا دی گل دکھیا سندا سکھیے دی گل سکھیا
دکھیا ہائے کرے تاں کولوں سکھیا ہوندا دکھیا

ترجمہ: غمزدہ کی بات ہمیشہ مصیبت زدہ ہی سنتا ہے اور جو سکھ میں ہو اس کی بات صرف سکھ والا سنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مصیبت زدہ کسی سکھ والے کے پاس اپنے دکھوں کا اظہار کرتے ہوئے آہ بھرتا ہے تو اسے ناگوار گزرتا ہے۔

اور کوئی غریق بحر عصیاں اپنے مولا کریم کی رحیمی و کریمی دیکھ کر بے اختیار کہہ رہا ہو ۔

واہ وا صاحب بخشنہارا تک تک ایڈ گناہاں
عزت، رزق نہ کھسے ساڈا دیندا پھیر پناہاں
عیب میرے پر پلا دیندا ہنر کریندا ظاہر
حدوں کرم دا واڑا کردا کوئی نہ دہندا باہر

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی کیا شان ہے کہ میرے بے انتہا گناہوں کے باوجود میری عزت اور رزق کو ختم نہیں کرتا بلکہ اپنی پناہ میں رکھتا ہے۔ میرے عیبوں کو چھپا کر میری خوبیوں کو ظاہر فرماتا ہے اور اپنے کرم سے اس طرح احاطہ کرتا ہے کہ کوئی اس سے باہر نہیں رہتا۔

یہ عارف و صاحب حال بزرگ جن کے کلام کی تاثیر سے بیمار روحوں کو شفا نصیب ہوتی ہے حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے ۱۲۴۶ ہجری میں میرپور کے علاقہ کھڑی شریف کے ایک دیہات چک ٹھاکرہ میں جنم لیا۔ بوقت ولادت آپ کی والدہ ماجدہ کو عجیب و غریب کیفیات کا مشاہدہ ہوا جس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ نومولود عام بچوں کی طرح نہیں ہوگا۔

جب آپ کی عمر پانچ چھ سال کی ہوئی تو ان دنوں حضرت بکا شیرؒ کے خلیفہ حضرت صاحبزادے عبدالحکیمؒ اپنے مرشد کے مزار پر بغرض حاضری تشریف لائے۔ حضرت میاں محمد بخشؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے دیکھا تو آپ کے سر پر دست شفقت پھیرا اور فرمایا:۔

"یہ بچہ اپنے وقت کا بہت بڑا بزرگ و ولی ہوگا۔"

حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے چک بہرام کے رہنے والے تھے۔ آپ کے خاندان کا تعلق گوجر قبیلہ کی پسوال گوت سے تھا۔ آپ کے دادا حضرت بابا دین محمد المعروف خواجہ دین محمد کو قطب الاقطاب غازی قلندر پیر پیرا شاہ غازی المشہور حضرت دمڑی والی سرکار نے گود میں لیا تھا کیونکہ آپ صاحب اولاد نہیں تھے۔ آپ نے کھڑی شریف میں ہی حضرت خواجہ دین محمدؒ کی روحانی تربیت فرمائی اور جب مرشد کا وصال ہوا تو آپ کے خلیفہ مجاز ہوئے۔ حضرت خواجہ دین محمد فرد یزدانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں خواجہ میاں جیونؒ ولی نے جنم لیا جن کے ہاں حضرت شمس الدین تولد ہوئے اور ان کے ہاں تین صاحبزادے میاں بہاول بخش، میاں محمد بخش اور میاں علی بخش پیدا ہوئے۔

ابتدائی گھریلو تعلیم و تربیت کے بعد حضرت میاں محمد بخش کو ان کے برادر کلاں حضرت میاں بہاول بخش کے ہمراہ سمال شریف کی مشہور دینی درسگاہ میں داخل کرا دیا جہاں آپ نے نظم و نثر، حدیث، فقہ اور منطق پڑھی۔ دوران تعلیم آپ کا معمول تھا کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کی یوسف زلیخا تنہائی میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز استاد گرامی حافظ محمد ناظمؒ نے اشعار پڑھنے کی فرمائش کی تو عرض کیا۔

"پہلے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جلد علم عطا فرمائے"

استاد نے آپ کے شوق و ذوق اور اشتیاق و ولولہ

ا فرمائی :

لے اللہ ! میاں محمد بخشؒ کو علم لدنی عطا فرما اور تمام پڑھی ہوئی
ب اور وہ کتابیں جو ابھی زیرِ مطالعہ نہیں آئیں اس پر آسان فرما۔"
دُعا بارگاہِ حمدیت میں قبول ہوئی۔ آپ نے بفضلِ ایزدی بہت
ربی اور فارسی زبان میں عبور حاصل کر لیا۔ علوم دینی میں بے حد
بوجھ پیدا ہوگئی یہاں تک کہ دقیق سے دقیق مسائل بھی آسانی
حل فرما دیا کرتے تھے۔

حضرت میاں صاحبؒ کو بچپن سے ہی قدرتی مناظر اور حسنِ
ت سے بے حد لگاؤ تھا۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ آپ کے
ر اقدس کے سرہانے کی جانب جو کنواں اب بھی موجود ہے اُسے
ن پاؤں کے انگوٹھے باندھ کر باسانی پھلانگ لیا کرتے تھے۔
ے کی سواری میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ایک عمدہ نسل کی
ی پال رکھی تھی۔ علاوہ ازیں عوامی مسائل، حالاتِ حاضرہ اور
یب و کلچر کا بھی کلی ادراک تھا۔ موسم گرما میں اکثر پنجن تشریف
جایا کرتے تھے۔ جو نہایت ہی خوبصورت مقام ہے۔ یہاں
ب مطالعہ و تدریس کے ہم آہنگ زیادہ تر عبادت و ریاضت
شغول رہتے تھے۔

احاطہ دربار میں چار دیواری کے متصل ایک معمولی سی کٹیا میں
ب نے چودہ سال بسر کیے۔ اور پھر صحرا نوردی اختیار کی۔ ایک
یائی تاریک رات کو یادِ الٰہی میں مشغول تھے کہ اچانک ایک
نی چہرہ بزرگ نمودار ہوا۔ چندے گفتگو فرمانے کے بعد وہ
ب کا ہاتھ تھام کر کٹیا سے باہر لے گیا اور ایک جنگلی بوٹی توڑ
پ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے گویا ہوا۔

" اس سے خالص سونا بن سکتا ہے۔ حکم ہو تو طریقہ بتاؤں۔"
ب نے سنا تو مسکراتے ہوئے فرمایا :۔

" حضرت ! اگر بتانا ہے تو بس قلب میں زرِ خالص کی سی
ت دمک پیدا کرنے کا گُر بتائیں۔"

بزرگ نے یہ سنا تو اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ چند دنوں
د پھر حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کیا۔

" ارشاد ہو تو ایسا عمل عرض کروں جس سے جنگلی جانور اور
ندے آپ کے تابع ہو جائیں۔"

— " اگر بتا سکتے ہو تو ایسا نسخہ بتاؤ جو توسنِ نفس پر سواری میں

نعت شریف

بہت خوب ہے آپؐ کی شان آقاؐ
بیاں سے ہے باہر، تصوّر سے بالا

ازل سے ابد تک، زمانے میں مدحت
جہاں بھر نے کی ہے، سو کرتا رہے گا

نئی زندگی پائی مُردہ دِلوں نے
ملا اہلِ عالم کو ایسا مسیحا

نوید سحر مل گئی شب زدوں کو
ہدایت کی مشعل ہوئی جب ہویدا

پخرد ہو کہ شوق و جنوں کی نہایت
حضورِ مقدس کی ہے ذات مبدا

رہی مجھ کو پروا نہ سُود و زیاں کی
میسّر وہ آیا ہے ملجا و ماویٰ

گناہوں کے دفتر ہے بند سارے
شفیعِ اُمم کو جو میں نے پکارا

فرشتوں نے بڑھ بڑھ کے لب میرے چومے
لیا نام جب میں نے احمدؐ کا پیارا

نظر میں سمایا ہے نقشِ کفِ پا
ہے منظور کے دِل میں اُن کا بسیرا

پروفیسر محمد منظور علی شیخ

ممد و مددگار ثابت ہو۔"

یہ سن کر وہ شخص چلا گیا اور کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔

حضرت میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ پندرہ سال کے تھے کہ مسندِ سجادگی پر جلوہ افروز ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۲۶۱ ہجری بمطابق عیسوی میں آپ کے والد بزرگوار حضرت میاں شمس الدین ؒ بسترِ مرگ پر دراز ہوئے تو انہوں نے مریدین خاص کو طلب فرمایا۔ پند و نصائح کیے۔ دنیائے دنی سے بے رغبی کی تلقین کی اور اپنے قربِ وصال کی خبر دینے کے بعد ارشاد فرمایا۔

" میں اپنے بعد (حضرت) میاں محمد بخش ؒ کو سجادہ نشیں کرنا چاہتا ہوں جو کہ سنتِ اولیاء اللہ ہے۔"

یہ فرما کر آپ نے حافظ محمد ناصر کا شعر پڑھا ؎

دند گھسے ہنگ ادھڑے ڈھولاں سٹے کن
لاہ نے خصماں ٹلیاں گل ہوری دے بنھ

حضرت میاں صاحب قدس سرہ نے خود کو سجادہ نشینی کے بارِ عظیم کا متحمل نہ ہونے کا اعتراف کیا اور برادرِ کلاں حضرت میاں بہاول بخش ؒ کو اس منصب پر بٹھانے کی درخواست کی تو والد گرامی نے فرمایا۔

" اس امر کے متعلق بزرگانِ دین بہتر جانتے ہیں کہ کون کس منصب کے لائق ہے۔" اور شدید علالت کے باوجود چارپائی سے اٹھ کر حضرت میاں محمد بخش ؒ کو دونوں بازوؤں سے زور سے پکڑ کر بآوازِ بلند اس طرح گویا ہوئے جیسے کسی سے مخاطب ہوں۔

" یا حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ! میرے اس بیٹے کو قبول فرمائیں۔"

ان الفاظ کا منہ سے نکلنا تھا کہ کمرے میں نہایت اعلیٰ قسم کی خوشبو پھیل گئی۔ عجیب طرح کی رونق کا احساس ہوا اور حاضرینِ محفل پر گریہ کا عالم طاری ہو گیا۔

حضرت میاں صاحب ؒ اکثر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن کسی مردِ کامل کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے کی تمنا ہنوز سینے میں کروٹیں لے رہی تھی۔ بعض اوقات بے ساختہ آپ کے ہونٹوں پر یہ اشعار مچل جاتے تھے ؎

رحمت دا مینہ پا خدایا باغ سُکا کر ہریا
بوٹا آس امید میری دا کر دے میوے بھریا

کدھرے نظر نہ آوے کوئی بھرے پیالے والا
جے دسے تاں ورتے ناہیں ناں ہک گھٹ نوالا

جب کوئی مرشد کامل نہ ملا تو آپ نے استخارہ کیا اور حضرت پیر پیرا شاہ غازی دمڑی والی سرکار قدس سرہُ العزیز کی خدمتِ عالیہ میں اپنا حال عرض کیا۔ انہوں نے خواب میں ارشاد فرمایا۔

" میاں محمد بخش ؒ! تم میرے مرید ہو لیکن ظاہری مراسمِ بیعت ادائیگی کے لیے سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت سائیں غلام محمد رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جاؤ۔"

چنانچہ بیدار ہوتے ہی آپ کلروڑی ضلع میرپور میں حضرت سائیں صاحب ؒ کی خدمت میں حاضری کے لیے چل پڑے جو حضرت بابا بدوح ؒ شاہ کے مرید تھے۔ انہوں نے خلافت حضرت بابا ؒ سے حاصل کی تھی اور وہ حضرت پیر پیرا غازی شاہ دمڑی والی ؒ کے خلیفہ تھے۔

حضرت سائیں غلام محمد رحمتہ اللہ علیہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت میاں صاحب ؒ حاضرِ خدمت ہو کر بیعت ہونے کے لیے عرض کیا اور حضرت دمڑی والی سرکار ؒ کا ارشاد بھی بتایا۔ حضرت سائیں صاحب ؒ نے چند دن انتظار کرنے کی تلقین فرمائی اور پاس ہی ٹھہرا لیا۔ جب کبھی موقع ملتا تو حضرت میاں صاحب ؒ تمنائے بیعت کا اظہار فرماتے۔ حضرت سائیں صاحب ؒ ہمیشہ صبر کرنے کے لیے کہتے۔ چند سال گزر گئے لیکن آپ نے صبر کا دامن نہ چھوڑا اور مرشد کے فرمان کے مطابق عمل کرتے رہے۔ اس طرح آپ کو تزکیہ نفس کی بے بہا دولت نصیب ہوئی۔

ایک دن حضرت سائیں غلام محمد رحمتہ اللہ علیہ اپنے مرشد حضرت بابا بدوح شاہ ؒ کے مزار کے قریب تشریف فرما تھے۔ حضرت میاں محمد بخش رحمتہ اللہ علیہ کو بلایا اور شرفِ بیعت سے سرفراز فرمایا۔ ضروری ہدایات دیں اور کشمیر میں حضرت شیخ احمد ولی کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے کا حکم سنتے ہی آپ پیدل ننگے پاؤں بجانب کشمیر چل پڑے۔ راستے میں ایسے افراد سے ملاقات ہوئی جو کافی عرصہ انتظار کرنے کے باوجود حضرت شیخ احمد ولی کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت سے محروم رہے تھے اور سینے میں حسرت کے داغ لیے واپس

تھے۔ انھوں نے آپ کو بھی واپس جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن
ے فرمان کے مطابق آپ نے سفر جاری رکھا۔
کافی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد وارد کشمیر ہوئے تو
حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش گاہ پر تشریف لے
ں ایک شخص چوبی تخت پوش پر بیٹھا تلاوت کلام اللہ میں
ف تھا۔ آپ کو دیکھا تو اس نے کہا۔
آپ حضرت شیخ کشمیریؒ سے شرف ملاقات چاہتے ہیں۔
مد کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کب تشریف
گے۔"

اس نے ابھی یہ فقرہ کہا ہی تھا کہ باہر کے دروازے سے
شیخ احمد وحیؒ کشمیری ہاتھ میں عصا تھامے نمودار ہوئے اور
میاںؒ صاحب سے اس طرح پُرتپاک ملے جیسے عرصۂ دراز
نتے ہوں۔ دورانِ گفتگو حضرت دمڑی والی سرکارؒ کا ذکر
د حضرت شیخ کشمیریؒ نے احتراماً اپنا سر خم کر دیا۔ حضرت میاں
ؒ کو نیا جوتا خریدنے کے لیے تھوڑی سی نقدی دی۔ اور فرمایا۔
ابھی کشمیر کی سیر کریں جب واپسی کا ارادہ ہو تشریف لائیں۔
للہ ملاقات ہو جائے گی۔" اور گھر کے اندر تشریف لے گئے۔
حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ بزرگانِ دین اور اولیا اللہ
رات کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک روز حضرت
رالدین ولی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر تھے کہ والیٔ کشمیر کے
مصاحب نے دیکھ لیا اور اُسے آپ کی موجودگی کے بارے
لاع دی۔ حاکم کشمیر نے حضرت سید باقر علی شاہؒ کی محافل میں
ر آپ کی بزرگی و عظمت کا تذکرہ سنا تھا۔ فوراً آپ کی خدمت
یں حاضر ہوا اور بصد انکسار و محبت شرفِ مہمانی کی درخواست

آپ ایک ماہ تک اس کے پاس رہے۔ اس دوران میں
ن کشمیر جوق در جوق آپ کی زیارت کے لیے آئے اور دین و
ی دولت سے فیضیاب ہوئے۔ ایک ماہ کے بعد آپ نے
کا ارادہ فرمایا۔ حسبِ ارشاد حضرت شیخ احمد وحیؒ کشمیری کے
لت پر حاضر ہوئے۔ اُسی لمحے وہ اندر تشریف لائے اور
ت میاں صاحبؒ کا ہاتھ پکڑ کر خلوت میں لے گئے جہاں انہوں
علم لدنی جو بطور امانت ان کے پاس تھا ایک ہی نظر میں حضرت
میاں صاحبؒ کے سینے میں منتقل فرما دیا۔ جب آپ حجرے سے
باہر تشریف لائے تو آپ پر محبتِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کا انوکھا
رنگ چڑھا ہوا تھا۔ آپ وطن واپس تشریف لے جانے کی بجائے
جنگلوں اور بیابانوں کی طرف نکل گئے جہاں آپ صبح و شام یادِ
الٰہی میں بسر کرتے تھے۔

حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ فرائض و سنت کے بے حد
پابند تھے۔ ساری عمر روزہ اور تکبیرِ اولیٰ قضا نہیں ہوئی تھی۔ ایک
مرتبہ ماہِ رمضان میں عارضہ اسہال میں مبتلا ہو گئے۔ علاج کے
لیے عرض کیا گیا تو انکار کر دیا کیونکہ روزہ کسی قیمت پر قضا کرنے
پر آمادہ نہ تھے۔ اسی اثنا میں حضرت پیر شیر شاہؒ قریشی جو حکیم
حاذق بھی تھے تشریف لے آئے۔ انھوں نے ایسا شربت تیار کر
دیا جو بوقتِ سحری و افطاری ہی استعمال کرنا تھا۔ الہٰذا اس کے
پینے سے چند ہی دنوں میں صحتیاب ہو گئے۔

ایک مرتبہ آپ آستانہ عالیہ آوان شریف حافظ قادر بخش
کے ہمراہ تشریف لے جا رہے تھے۔ دلاور پور گاؤں کے قریب شام
ہو گئی۔ شب باشی کے لیے آپ خود تو مسجد میں تشریف لے گئے
اور حافظ قادر بخش گھوڑیوں کو لے کر گاؤں کے چوہدریوں کی حویلی
کی طرف چلا گیا جہاں وہ اس وقت چوپٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں
نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ کون آیا ہے۔ حافظ صاحب کو یہ
بات ناگوار گزری۔ واپس آ گیا۔ راستے میں ایک شخص نے اُسے
پڑھا لکھا سمجھ کر گیارھویں شریف کے ختم کے لیے ساتھ لے گیا۔
ختم پڑھنے اور تبرک لینے کے بعد واپس جانے لگا تو وہ شخص
مسجد تک ساتھ آیا جہاں حضرت میاں صاحبؒ تھے۔ دریافت
کرنے کے باوجود حافظ صاحب نے حضرت میاں صاحبؒ کے
بارے میں کچھ نہ بتایا تو اس شخص نے سمجھا کہ یقیناً یہ کوئی بلند پایہ
محترم و بزرگ ہستی ہے جو اپنا نام تک بتانا پسند نہیں کرتی۔ بصد
عجز و انکسار اپنے ہمراہ لے گیا۔ راستے میں حافظ صاحب نے
چوہدریوں کی بے التفاتی کا ذکر کیا لیکن آپ خاموش رہے۔

اگلے روز صبح دم جب آپ روانہ ہونے لگے تو حافظ صاحب
نے اپنے میزبان کو حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کے بارے
میں بتایا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔ کفِ افسوس ملتے ہوئے
بولا :-

• قطبِ زماں میرے گھر میں رات بھر رہا اور میں خاطر خواہ طور پر خدمت بھی نہیں بجا لایا۔"

حضرت میاں صاحبؒ نے اس کا خلوص و محبت دیکھا تو اس کے حق میں دعائے خیر کی۔ اس شخص نے عرض کیا۔

• حضور میاں صاحبؒ! میرے گھر میں حد سے زیادہ غربت و افلاس ہے۔ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے میرے دن نہیں پھیرے۔"

" خدائے قدوس و غنی کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بعید نہیں کہ وہ چوہدریوں کے گھر کی شان و شوکت تمہیں بخش دے جو مسافروں کے ساتھ بے رُخی سے پیش آتے اور نجس کھیلوں میں مشغول رہتے ہیں اور تمہارے گھر کی غربت ان کے گھر میں ڈال دے۔"

آپ کی زبان ترجمان حق بیان سے یہ نکلنا تھا کہ حالات نے پلٹا کھانا شروع کیا اور قلیل مدت میں وہ شخص چوہدریوں کے مقام پر اور چوہدری اس کی حالت کو پہنچ گئے۔

کالا نامی بیلدار دربارِ اقدس کے لیے پتھر لایا کرتا تھا۔ ایک دن اس کا اکلوتا بیٹا قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ حضرت میاں صاحبؒ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

• حضور! اس دربار سے سینکڑوں بے اولاد آپ کی دُعا سے صاحبِ اولاد ہوئے ہیں۔ میرا ایک ہی لڑکا تھا جو فوت ہو گیا ہے۔ کیا دربار شریف کی خدمت کا یہی ثمر ہے؟"

" گھبراؤ نہیں اللہ تمہیں اور بیٹا دے گا۔ اس کے شانے پر سیاہ رنگ کا داغ ہو گا۔"

آپ نے فرمایا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اُسے لڑکا عطا فرمایا تو کندھے پر سیاہ نشان تھا۔

حضرت میاں محمد بخشؒ نے تاحیات شادی نہیں کی۔ ہمیشہ یادِ الٰہی اور مخلوق خدا کی غمگساری میں مصروف رہتے تھے۔ مقربین، احباب و رفقاء سے بے حد تلطف و محبت فرماتے تھے۔ ان کے غم کو اپنا غم اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی تصور کرتے تھے۔ جب کبھی کوئی رفیق داعی اجل کو لبیک کہتا تو دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا تھا۔ مولوی دین الدین تقریباً سات سال آپ کی خدمت میں رہا۔ جب علم ہوا کہ اس کے بوڑھے والدین بقیدِ حیات ہیں تو فوراً گھر جا کر ان کی خدمت بجا لانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

سات ذوالحجہ ۱۳۲۴ ہجری کو موسم انتہائی سرد تھا۔ حضرت میاں صاحبؒ نے نمازِ عصر کے وظائف و اوراد سے فارغ ہو کر نمازِ مغرب کے لیے تازہ وضو فرمایا۔ خادم نے آگ روشن کی تو آپ اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ معاً آپ کا جسم مبارک ایک طرف کو جھک گیا۔ خادم نے پریشانی کے عالم میں دوسرے خادم کو آواز دی تو وہ بھاگا آیا۔ دونوں نے آپ کو اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ جسم میں انتہائی لاغری و کمزوری کے باعث آپ بے ہوش تھے۔ اسی طرح آٹھ پہر گزر گئے اور پھر اسی حالت میں اپنے خالقِ حقیقی کے پاس تشریف لے گئے۔

آپ کے وصال کی خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ دور و نزدیک کہرام مچ گیا۔ انگنت مخلوقِ خدا آپ کے آخری دیدار کے لیے امڈ آئی۔ وصال سے چند روز قبل آپ نے فرمایا تھا کہ بعد از وفات وہ شخص غسل دے جس نے کبھی غیر محرم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو۔ لوگ بیتابی سے منتظر تھے کہ دیکھیں وہ کون اللہ کا بندہ ہے جو اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ چندے انتظار کے بعد جہلم شریف کے حضرت حافظ مطیع اللہ رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے۔ حضرت میاں صاحبؒ کو غسل دیا اور پھر کھڑی شریف میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ دربار کے احاطہ میں داخل ہوں تو سب سے پہلے آپ کا مزارِ اقدس ہے۔ اس سے آگے آپ کی نانی اور دادی صاحبہ کے مقابر ہیں۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر آپ کے جدِّ امجد حضرت خواجہ دین محمدؒ فریز واقی کا مزار ہے اور آگے حضرت پیر پیرا شاہ غازی دمڑی والی سرکار کا مزار ہے۔

حضرت میاں محمد بخشؒ کا عرس ہر سال سات ذوالحجہ کو تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ جس میں لوگ دور و نزدیک سے آکر شرکت کرتے اور فیوض و برکات سے مالا مال ہوتے ہیں۔

آپ کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے مشہور کتب بیس کے قریب ہیں لیکن سیف الملوک کو شہرتِ دوام حاصل ہے۔

ملتان سے چھیاسٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر غازی گھاٹ ہے جس سے
تقریباً بیس بائیس کلومیٹر کے علاقے میں دریائے سندھ
گاہ ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر دراہمہ کا قصبہ ہے
سے بذریعہ ویگن ڈیرہ غازی خان تیس پینتیس منٹوں کی
ت پر رہ جاتا ہے۔

ڈیرہ غازی خان کو اگرچہ ڈویژن کا درجہ حاصل ہے لیکن
ترقی بے حد پسماندہ ہے۔ قریبِ شام برلبِ سڑک قہوہ
اور ریستورانوں کے سامنے جب لوگ بیٹھے چائے پیتے
تے ہیں تو قبائلی علاقے کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں کی زبان
لی ہے جس میں بے حد مٹھاس اور شیرینی ہے۔ لوگ
ملنسار، مؤدب اور محبت کرنے والے ہیں۔ شاید یہ نمایاں
یات ان بزرگانِ دین کی تعلیمات کا ثمرہ ہیں جو اس علاقے
میں بطرف جنوب پچاسی میل کے فاصلے پر کوٹ مٹھن میں حضرت خواجہ غلام فریدؒ بجانب مشرق اڑتالیس میل دور تونسہ شریف میں حضرت سلیمان تونسویؒ اور مغرب کی سمت پچیس میل دور حضرت سید احمد سلطان سخی سرور شہید رحمۃ اللہ علیہ آسودہ خواب ہیں۔

سخی سرور میں صرف ایک ہی چھوٹا سا ٹیڑھا میڑھا بازار ہے جس کے شمالی کنارے پر بسوں کا اڈا اور جنوبی سرے پر حضرت سلطان سخی سرور شہیدؒ کے مزارِ اقدس کی عمارت کا صدر دروازہ کھلتا ہے۔ اس کے اوپر دو منزلہ کمرے بنے ہوئے ہیں اندر داخل ہوں تو سامنے کشادہ صحن اور تین کمرے ہیں جن میں سے ایک میں مزارِ مبارک پر چڑھائے گئے پرانے غلاف رکھے ہیں۔ اس کے ساتھ چھوٹے سے تاریک کمرے میں ہر وقت شمع روشن رہتی ہے۔ دیوار کے ساتھ اونچا سا تھڑا ہے

جس پر مصلیٰ بچھا ہوا ہے۔ اس پر حضرت صاحبؒ عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے۔ اس سے ملحق کشادہ کمرے میں دائیں کونے میں آپ کا مزار ہے۔ اس کے قریب چھوٹے سے چبوترے پر ہر وقت چراغ روشن رہتا ہے۔ مزارِ اقدس کے قدموں کی طرف نیچے زمین کے اندر ڈیڑھ دو بالشت چوڑا سوراخ ہے جو قبر مبارک کے اندر جاتا ہے۔ زائرین اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرتے ہیں۔ بعض اوقات کسی کو کوئی چیز مل بھی جاتی ہے تو وہ خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہے۔ مقامی لوگوں کے بقول آج سے سوا آٹھ صدیاں قبل جب حضرت سلطان سخی سرورؒ شہادت کے بعد یہاں دفن کئے گئے تو اس ویرانے میں آپ کی بیوی بی بی بائی اور دو بچے بھی ساتھ تھے۔ آپ کی بیوی نے بارگاہِ خداوندی میں فریاد کی کہ اب مجھے کس کا سہارا ہے تو حکم ایزدی سے اس جگہ سے زمین شق ہو گئی جس میں آپ کے بیوی بچے سما گئے۔ اس واقعہ کی کسی مستند کتاب سے تصدیق نہیں ہو سکی لیکن اتنا ضرور مندرج ہے کہ آپ کی محترمہ بیگم کی قبر یہیں ہے۔

مقبرے کے کمرے اور صحن کی بائیں جانب مسجد ہے جس کے تین محراب ہیں۔ درمیان میں چھت کے قریب چاروں طرف حضرت سلطان سخی سرور شہید رحمۃ اللہ علیہ کا شجرہ نسب حضرت سیّد احمد سخی سرور لعلاں والا بن سیّد زین العابدین بن سیّد عمر بن سیّد عبداللطیف بن سیّد شیخار بن سیّد اسمٰعیل بن امام موسےٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن زین العابدین بن حضرت حسینؓ بن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سر کونے میں آپ کے چار یاروں سخی بادشاہ سیّد علی شہید، سیّد نور شہید، سیّد عمر شہید اور سیّد اسحاق شہید کے اسمائے گرامی رقم ہیں۔

مسجد کے بالمقابل مشرقی سمت اونچی سی جگہ پر دو بہت بڑی دیگیں پڑی ہیں جن میں منوں اناج پک سکتا ہے کہتے ہیں جب حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے تو بغیر آگ جلائے ان دیگوں میں جو چاہتے پکا لیا کرتے تھے۔

بجانب مغرب جدھر آپ کا چہرۂ انور ہے آپ کے چار یاروں کی قبور ہیں۔ حضرت سیّد علی شہید اور حضرت سیّد نور شہیدؒ کی پختہ قبریں ایک پہاڑی کی چوٹی پر ہیں جبکہ حضرت سیّد عمر شہیدؒ اور حضرت اسحاق شہیدؒ کی کچی قبور اس کے بالمقابل دوسری پہاڑی کی چوٹی پر ہیں۔ چشمِ باطن سے دیکھنے والوں کو یوں احساس ہوتا ہے جیسے آپ اپنے یاروں کی طرف دیکھ رہے ہوں۔

حضرت سیّد احمد سلطان سخی سرور شہید رحمۃ اللہ علیہ کے والد بزرگوار حضرت زین العابدینؒ سرزمین پاک و ہند میں تشریف لانے سے قبل بائیس سال سے روضۂ رسولِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے چلے آرہے تھے۔ ایک روز سیّد الانبیاء ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم خواب میں ہندوستان جانے کا حکم دیا۔ آپ نے فوراً رختِ سفر باندھا اور ضلع شکرگڑھ میں شاہکوٹ میں توطن اختیار کیا۔ یہ ۵۲۰ ہجری (۱۱۲۶ء) کا واقعہ ہے۔ آپ ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ گزر اوقات کے لیے آپ نے زراعت کے علاوہ بھیڑ بکریاں بھی پال رکھی تھیں۔ دو سال کے بعد آپ کی اہلیہ محترمہ بی بی امنہ جنت الفردوس کو سدھاریں۔ ان کے بطن سے تین لڑکے حضرت سلطان قیصر، حضرت سیّد محمود اور حضرت سیّد سہراب تھے۔ شاہکوٹ کا نمبردار پیرا رہان آپ کا مرید تھا۔ اس نے اپنی برادری سے مشورہ کے بعد اپنی بڑی دختر بی بی عائشہ کو آپ کے حبالۂ عقد میں دے دیا۔ ان کے بطن سے ۵۲۴ ہجری (۱۱۳۰ء) میں حضرت سیّد احمد سلطانؒ پیدا ہوئے اور پھر ان کے بھائی حضرت عبدالغنی المعروف خان جٹی یا خان ڈھوڈا نے جنم لیا۔

آپ بچپن سے ہی بڑے ذہین و فہمیدہ تھے۔ اکثر اوقات اپنے والد مکرم سے شرعی مسائل سیکھتے رہتے تھے۔ ان دنوں میں مولانا سیّد محمد اسحاق مدظلہ العالی کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ آپ کو علوم ظاہری کے زیور سے آراستگی کے لیے لاہور بھیج دیا گیا۔ حضرت مولانا کی صحبت و تربیت و تعلیم کی بدولت آپ ان تمام صلاحیتوں اور صفات سے متصف ہو گئے جو ایک عالم دین کا خاصہ ہوتی ہیں۔ تحصیل علم کے بعد واپس آکر باپ کا پیشہ اختیار کیا لیکن زیادہ تر وقت یادِ الٰہی میں ہی بسر ہوتا تھا۔ ظاہری علوم کے ہم آہنگ علوم باطنی حاصل کرنے کے

اشتیاق سینے میں کروٹیں لینے لگا جس میں روز افزوں طغیانی آتی گئی۔ آپ کے والد محترم نے جب اپنے اس ہونہار بیٹے کا رجحان دیکھا تو اس طرح تربیت فرمانے لگے جیسے مرشد مرید کی کرتا ہے۔ لیکن دل کی خلش برقرار رہی۔ چاہتے تھے کہ سلوک و معرفت کی راہوں پر گامزن ہوں۔ علم لدنی سے مالا مال ہوں اور کسی صاحب حال بزرگ کے دست حق پرست پر بیعت ہوں۔

جب ۵۳۵ ہجری (۱۱۴۱ء) میں آپ کے والد گرامی نے رحلت فرمائی اور شاہکوٹ میں ہی مدفون ہوئے تو آپ کے ... بھائی ابی۔ جودھا۔ ساون۔ لکو اور ملکو نے آپ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ روز افزوں ان کی چیرہ دستیوں اور زیادتیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ انھوں نے پیر ابان کی وفات کے بعد زرخیز زمین اپنے پاس رکھ لی اور بنجر و ویران اراضی آپ کے حوالے کر دی لیکن اللہ کے کرم سے وہ زرخیز و شاداب ہو گئی تو وہ بڑے نالاں و افسردہ ہوئے اور حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ اس تاک میں رہتے تھے کہ حیلے بہانے آپ کو نقصان پہنچائیں۔

باپ کے وصال کے بعد آپ کی شادی گھنو خاں حاکم ملتان کی بیٹی بی بی بائی سے ہو گئی۔ امراء و رؤساء نے نذرانے پیش کیے۔ جب آپ دلہن کو گھر لائے تو آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مائی عائشہ نے گھی کے چراغ جلائے اور خوب خوشیاں منائیں۔ اس پر آپ کے خالہ زاد بھائی سیخ پا ہو گئے اور دل ہی دل میں آپ کو بے عزت کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ انھوں نے لاگیوں اور بھانڈ میراثیوں کو بہلا پھسلا اور لالچ دے کر بھیجا کہ وہ حضرت سید احمد سلطان کو بدنام و شرمسار کریں اور ترکیب یہ بتائی کہ اگر وہ سیر دے تو وہ سوا سیر مانگیں۔ انھوں نے ایسا کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ آپ نے نہ صرف لاگیوں، بھانڈوں، میراثیوں کو ہی نہیں بلکہ غرباء و مساکین اور محتاجوں کو بے شمار دولت جہیز کا سامان اور دیگر اشیاء سے خوب نوازا۔ اس دن سے آپ سخی سرور، لکھ داتا، لکھی خاں، لالانوالہ، پیر خانو، شیخ راہنکور وغیرہ مختلف القابات سے نوازے جانے لگے۔

لیکن سخی سرور کا لقب ان سب پر حاوی ہو گیا۔ آپ کے خالہ زاد بھائی بھلا یہ کب برداشت کر سکتے تھے لہٰذا ان کی آتش حسد و انتقام مزید بھڑک اٹھی۔ اسی اثنا میں آپ کی والدہ محترمہ اور سوتیلے بھائی سید محمود اور سید سہرا راہی ملک عدم ہوئے اور شاہکوٹ میں ہی دفن ہوئے تو آپ دل برداشتہ ہو گئے۔ کسی مرد حق کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا جذبہ بڑی شد و مد سے بیدار ہو گیا۔ چنانچہ تلاش حق کے لیے آپ بغداد شریف پہنچے جو ان دنوں روحانی علوم کا سرچشمہ تھا۔

آپ نے سلسلہ چشتیہ میں حضرت خواجہ مودود چشتی سلسلہ سہروردیہ میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی اور سلسلہ قادریہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ علیہم سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔

بغداد شریف سے واپسی پر آپ نے چند دن لاہور میں قیام فرمایا اور پھر وزیر آباد کے قریب سوہدرہ میں دریائے چناب کے کنارے یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ عشق، مشک اور اللہ کے اولیاء کبھی چھپے نہیں رہتے۔ یہ الگ بات ہے کہ عام دنیادار انسان ان کے قریب ہو کر بھی فیض یاب نہ ہو۔ آپ کی بزرگی و ولایت کا چرچا چار دانگ عالم میں ہو گیا۔ ہر وقت لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ جو بھی حاجت مند در اقدس پر پہنچ جاتا تہی دامن و بے مراد نہ لوٹتا تھا۔ آپ کو جو کچھ میسر آتا فوراً راہ خدا میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ ہر جگہ لوگ آپ کو سخی سرور اور سخی داتا کے نام نامی اسم گرامی سے یاد کرنے لگے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والے دنیا کے ساتھ دین کی دولت سے بھی مالا مال ہونے لگے۔ دن بدن آپ کے محبین، معتقدین اور مریدین میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دھونکل میں بھی آپ نے چند سال قیام فرمایا۔ جہاں آپ نے ڈیرہ ڈالا وہ بڑی اجاڑ و ویران جگہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے وہاں پانی کا چشمہ جاری فرما دیا۔ مخلوق خدا یہاں بھی جوق در جوق آنے لگی۔ میلوں کی مسافت طے کر کے لوگ آتے اور اپنے دکھوں، غموں اور محرومیوں کے مداوا کے بعد ہنسی خوشی واپس جاتے۔ ایک دن دھونکل کے نمبردار کا لڑکا مفقود الخبر ہو گیا۔ حاضر خدمت ہو کر عرض کیا تو

Kashif

SHAHZAD Ahmed

ارشاد فرمایا "مطمئن رہو، شام تک لوٹ آئے گا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

وطن مالوف سے نکلے کئی سال ہو گئے تھے لہذا واپس شاہکوٹ تشریف لے گئے۔ اس اثنا میں آپ کی شہرت و بزرگی کے چرچے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکے تھے۔ سینکڑوں میلوں کا سفر طے کر کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ کے خالہ زاد بھائیوں کو آپ کی یہ شہرت و مرتبہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے لہذا ان کی دیرینہ دشمنی پھر عود کر آئی۔

جب خالہ زاد بھائیوں کی عداوت انتہا کو پہنچ گئی تو آپ نقل مکانی فرما کر ڈیرہ غازی خاں تشریف لے گئے اور کوہ سلیمان کے دامن میں نگاہہ کے مقام پر قیام فرمایا اور عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں آج کل آپ کا مزار اقدس ہے اور اب سخی سرور کے نام سے مشہور ہے۔ لوگوں کا یہاں بھی اژدہام ہونے لگا۔ ہر مذہب و ملّت کے لوگ آپ کے درِ دولت پر حاضر ہونے لگے۔ کئی ہندو، سکھ اور ان کی عورتیں بھی آپ کے عقیدتمندوں اور معتقدوں میں شامل تھے جو سلطانی معتقد کہلاتے تھے اور اب بھی پاک و ہند میں موجود ہیں۔

آپ کے ارادتمند، عقیدت مند، معتقد اور مریدین بے شمار تھے لیکن ان میں سے چار اصحاب خاص الخاص تھے۔ یہ چار یاروں کے نام سے مشہور تھے۔ انہیں آپ سے بے حد عشق تھا۔ آپ بھی انہیں جانی جان تصوّر فرماتے تھے۔

آپ کے خالہ زاد بھائیوں نے آپ کو یہاں بھی سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔ انہوں نے اپنی قوم کے ان گنت لوگوں کو آپ سے بدظن کر دیا اور جم غفیر لے کر آپ کو شہید کرنے کے لیے چل پڑے۔ ان دنوں آپ کے سگے بھائی حضرت سید عبدالغنی المعروف خان ڈھوڈا نگاہہ سے بارہ کوس دور قصبہ وُووَد میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے خادم نے جب خالہ زاد بھائیوں کے عزائم کے بارے میں اطلاع دی تو تن تنہا ان کے مقابلے پر اتر آئے اور بہتر اشخاص کو حوالۂ موت کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔ اس کے بعد وہ سب لوگ نگاہہ پہنچے۔ اس وقت حضرت سید احمد سلطان سخی سرورؒ نماز پڑھنے میں مصروف تھے۔ چند ایک خادم اور چاروں یار موجود تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد جب آپ کو اطلاع دی گئی تو آپ گھوڑی پر سوار ہو گئے۔ بھائیوں نے حملہ کیا تو آپ نے بھی جنگ شروع کر دی اور یاروں سمیت مقام شہادت سے سرفراز ہوئے۔ دمِ واپسیں آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرے یاروں کو مجھ سے بلند مقام پر دفن کیا جائے۔ چنانچہ حسب الارشاد ایسا ہی کیا گیا۔

۲۲ رجب المرجب ۵۷۷ ہجری (۱۱۸۱ء) کو ترپن سال کی عمر میں جب آپ کی شہادت ہوئی تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر جگہ پھیل گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ پہنچ گئے۔ لاکھوں محبین کے قلوب دُکھ درد و غم اور ہجر و فراق سے فگار ہو گئے۔ مختلف محبین و مریدین نے آپ کے مزار اقدس کی تعمیر میں وقتاً فوقتاً حصہ لیا لیکن بستی سخی سرور کے مکینوں کے بقول مزار کی عمارت کی تعمیر بادشاہ بابر نے اپنی نگرانی میں کرائی تھی اور اس ضمن میں اس نے ایک مہر شدہ دستاویز بھی لکھی تھی۔ مغرب کی جانب ایک بہت بڑا حوض بنوایا تھا تاکہ اس میں پانی جمع رہے۔ مسجد کی محراب کے نیچے اور سطح زمین سے تقریباً پچاس فٹ اونچی بابا گوجر ماشکی سیالکوٹی کی قبر ہے کہتے ہیں کہ آپ پہاڑ پر سے پانی لا کر نمازیوں کو وضو کرایا کرتے تھے۔

حضرت سخی سرور شہید رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ہر سال مختلف شہروں میں میلہ لگتا ہے جس میں بے شمار لوگ حصہ لیتے ہیں۔ پشاور میں اسے جھنڈیوں والا میلہ کہتے ہیں۔ دھونکل میں جون جولائی کے مہینے میں بہت بڑے میلے کا اہتمام ہوتا ہے۔ لاہور میں اسے قدموں اور پار کا میلہ کہا جاتا ہے اور ڈیرہ غازی خان میں آپ کا عرس گیارہ اپریل کو بڑی دھوم دھوم سے منایا جاتا ہے۔ اس میں لوگ دور و نزدیک سے شریک ہو کر اپنی منتیں اور عقیدتوں کے چراغ روشن کرتے اور فیضیاب ہوتے ہیں۔